سیرتِ سرورِ عالم

صلی اللہ علیہ وسلم

جلد اوّل

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن
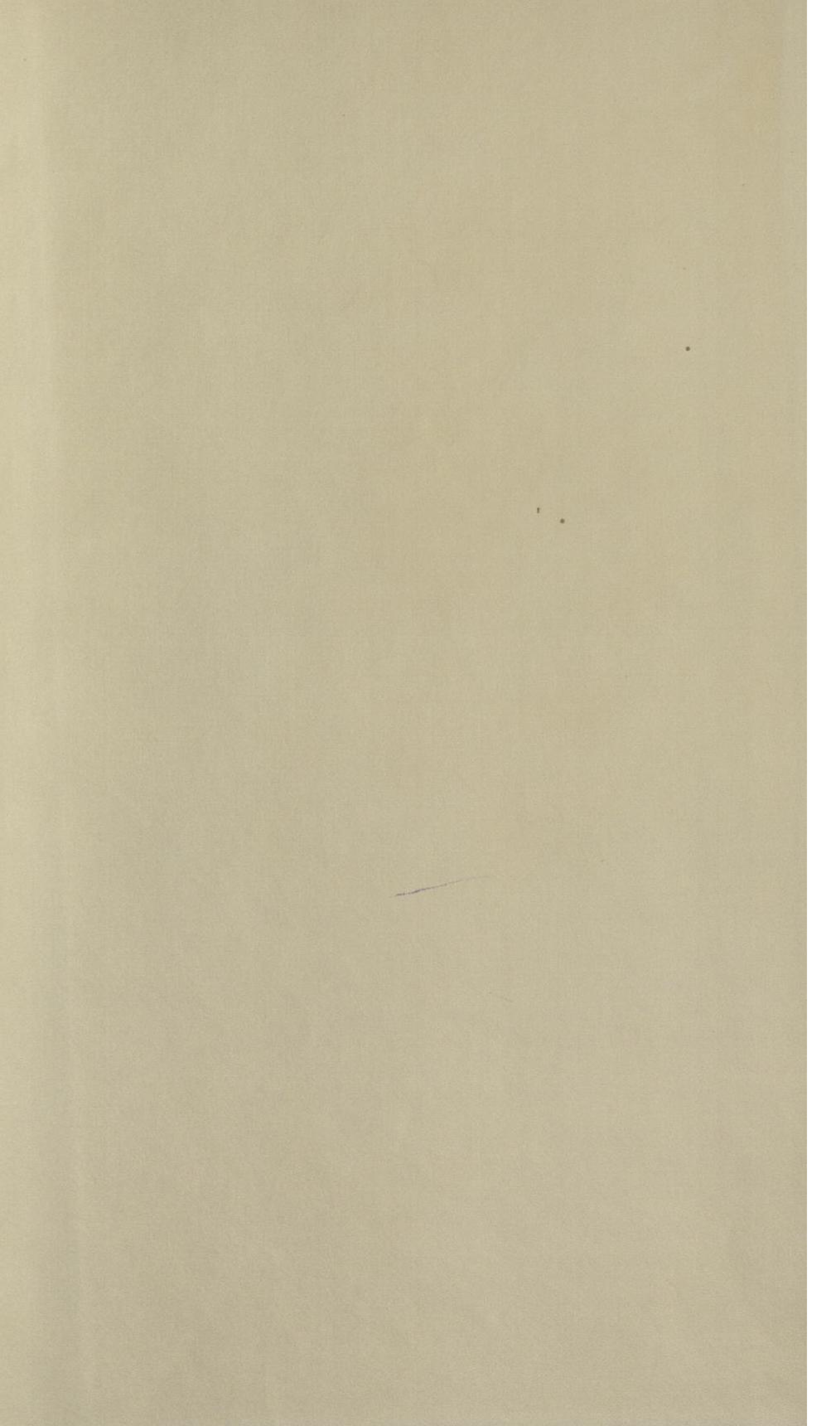
لاہور

سیرتِ سرورِ عالم

صلی اللہ علیہ وسلم

جلد اوّل

○

— تالیف —

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

— مُرتّبین —

نعیم صدّیقی ○ عبدالوکیل علوی

○

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

ناشر : سیّد حسین فاروق مودودی
ناظم ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور

مطبع : اللہ والا پرنٹرز۔ لاہور

اشاعت:

اوّل : ذیقعد ۱۳۹۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۸ء ـــــ ۶۰۰۰

دوم : رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ مطابق اگست ۱۹۷۹ء ـــــ ۷۰۰۰

قیمت :

قسم اوّل : -/۱۰۰ روپے

قسم دوم : -/۴۰ روپے

ـــ باہتمام ـــ
چودھری بشیر احمد خاں

کتابت : محمد صدیق خوشنویس۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِفتتاح

وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ ○

"کوئی قوم ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبّہ کرنے والا نہ آیا ہو" (فاطر۲۴)

○

وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ

وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ۚ

"اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا جس نے پیغام دیا کہ اللہ کی بندگی کرو

اور طاغوت کی بندگی سے پرہیز کرو" (النحل-۳۶)

○

ھٰذَا نَذِیۡرٌ مِّنَ النُّذُرِ الۡاُوۡلٰی ○

"یہ ایک ڈرانے والا ہے اگلے ڈرانے والوں میں سے" (النجم-۵۶)

○

اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ○

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یقیناً تم پیغمبروں میں سے ہو" (یٰسٓ-۳)

○

قُلۡ مَا کُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہو میں کوئی نرالا رسول نہیں ہوں" (احقاف۔۹)

○

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ

"محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کچھ نہیں ہیں مگر ایک رسول ہیں اور اِن سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔" (آلِ عمران - ۱۴۴)

○

قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَاۤ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ

"کہو، ہم ایمان لاتے اللہ پر اور اُس تعلیم پر جو ہماری طرف اُتاری گئی ہے اور اُس تعلیم پر جو ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، اور اُن کی اولاد پر اُتاری گئی تھی اور جو موسٰیؑ، عیسٰیؑ اور دُوسرے نبیوں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مُطیعِ فرمان ہیں۔ پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم لاتے ہو تو وہ سیدھے راستے پر ہیں۔" (بقرہ: ۱۳۶-۱۳۷)

○

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

"درحقیقت ایمان لانے والوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اُس نے اُن کے

درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا رسول اُٹھایا جو انہیں اُس کی آیات سُناتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور اُنہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔" (آلِ عمران-۱۶۴)

○
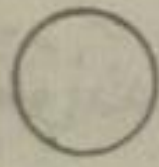
اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

"آج مَیں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمّل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کے طریقے کو پسند کیا۔" (المائدہ-۳)

○

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

"بخدا ہم نے (اے محمّد) تم سے پہلے مختلف اُمّتوں کی طرف ہدایت بھیجی مگر اس کے بعد شیطان نے اُن کے غلط اعمال کو اُن کے لیے خوشنما بنا دیا چنانچہ آج وہی ان کا سرپرست بنا ہوا ہے اور وہ دردناک عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں۔ اور ہم نے تم پر یہ کتاب صرف اِس لیے نازل کی ہے کہ تم اُس حقیقت کو اُن کے سامنے واضح کر دو جس میں اُن کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے، اور اس لیے کہ یہ کتاب ہدایت اور رحمت ہو اُن لوگوں کے لیے جو اِس کی پیروی قبول کر لیں۔" (النحل-۶۳-۶۴)

○

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

"اے اہلِ کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسُول آگیا ہے جو تمہارے سامنے بہت سی اُن چیزوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جنہیں تم کتاب میں سے چُھپاتے ہو اور بہت سی باتوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کتاب آگئی ہے جس کے ذریعہ وہ اُن لوگوں کو جو اس کی پسند کے مطابق چلتے ہیں، امن و سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور اپنے اِذن سے اُنہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔" (المائدہ - ۱۵-۱۶)

○

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ○

"اے نبی، ہم نے تم کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کے حُکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔" (احزاب - ۴۵-۴۶)

○

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ

عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

"وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، اُن کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے اور اُن بندشوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ دبے اور جکڑے ہوئے تھے۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی تائید و حمایت کریں اور اس نُور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وُہی فلاح پانے والے ہیں۔" (اعراف۔ ۱۵۷)

○

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۝

"اے مُحمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم پر حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم اللہ کے بتاتے ہوئے طریقہ پر لوگوں کے درمیان فیصلے کرو اور خیانت کرنے والوں کے وکیل نہ بنو۔" (النساء۔ ۱۰۵)

○

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسُول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پُوری جنسِ دین پر غالب کر دے۔" (الفتح ۲۸)

○

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

"اے محمّد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کہدو کہ اَے انسانو، مَیں تم سب کی طرف اُس خُدا کا رسُول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، جو مارنے اور جلانے والا ہے، پس ایمان لاؤ خُدا پر اور اُس کے رسُول نبیٔ اُمّی پر جو خُدا اور اُس کے فرامین پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہِ راست پالو۔" (اعراف - ۱۵۸)

○

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ

"اور کہو میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ مَیں اِس کے ذریعہ سے تم کو اور ہر اُس شخص کو خبردار کردوں جسے یہ پہنچے۔" (انعام - ۱۹)

○

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ○

"محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسُول اور نبیوں کے سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں۔" (احزاب - ۴۰)

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

دیباچہ

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ایک کارِ عظیم جس کو ہاتھ میں لیا گیا تھا، وہ بڑی حد تک تکمیل کو پہنچا اور توقع ہے کہ اُسی کی مدد سے بقیہ کام بھی سرانجام پا جائے۔

مولانا سید ابُوالاعلیٰ مودُودی سے جو جماعتی تعلّق مجھے رہا ہے اُس سے بالکل ہٹ کر بھی اگر دیانتداری سے اُن کی خدمات پر نظر ڈالی جائے تو بغیر کسی اندھی عقیدت کے یہ احساس اُبھرتا ہے کہ اِس دَور میں جس زورِ اِستدلال کے ساتھ نئی زبان میں، اور جس بڑے پیمانے پر موصُوف نے اِسلام کی بُنیادی صداقتوں اور اس کے مکمّل نظامِ تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے، اس کی مثال دُور دُور تک نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس دَور میں مغرب کی مُلحدانہ اور مادّہ پرستانہ فکر کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ کرنے میں جو حصّہ مولانا موصُوف نے لیا ہے اُس نے صدہا افراد کی زندگیوں کا نقشہ بدل ڈالا ہے اور یہ چیز مولانا کے لیے ایک گراں بہا سرمایۂ آخرت ہے۔

مجھے مولانا موصُوف سے مُتعارف ہونے کے وقت سے لے کر اب تک جس طرح کا مُخلصانہ تعلّق رہا ہے اُس کے ہوتے ہوئے جہاں میری یہ تمنا رہی ہے کہ مولانا کے علم و فکر کو فروغ دینے کے لیے مختلف اسالیب اختیار کیے جائیں، وہاں مجھے اِس بات سے بھی سخت اجتناب رہا ہے کہ کبھی مولانا کی ذات، اُن کے اسمِ گرامی، یا اُن کے کیے ہوئے کام کو حصُولِ مفاد کا ذریعہ بنایا جائے۔

اب سے کوئی دس بارہ برس پہلے کی بات ہے کہ مولانا سید ابُوالاعلیٰ مودُودی کے کمرے میں چند قریبی احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے بر سبیلِ تذکرہ مَیں نے اِس خیال کا اِظہار کیا تھا کہ اگر مولانا پسند فرمائیں تو موصُوف کی اپنی تحریروں سے سیرتِ نبویؐ مُرتّب کی جا سکتی ہے۔ اِس پر میرے ایک نہایت ہی مُخلص اور فاضل رفیق نے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ کام مَیں اُن کے لیے چھوڑ دوں۔ چنانچہ مَیں نے اُن کی اِس خواہش کو قبول کر لیا۔ لیکن جب کئی سال گزرنے کے بعد بھی وہ رفیق اِس کام کی انجام دہی کا موقع نہ پا سکے

تو اُن کی اجازت سے مَیں نے ایک بار پھر مولانا کے سامنے اِس تجویز کا ذکر کیا تو اُنھوں نے اس تجویز کے علاوہ بعض اور موضوعات پر بھی کام کرنے کے لیے مُجملاً چند ہدایات دیں۔

بالآخر کام شروع کر دیا گیا تو اندازہ ہُوا کہ بہ نسبت ایک ٹھوس اور تحقیقی کتاب اپنی طرف سے مُرتّب کرنے کے، مولانا کے پُورے لٹریچر میں سے عبارات نکال کر ایک کتاب مُرتّب کرنے کا کام بڑا بھاری اور محنت طلب ہے، کیونکہ تفہیم القرآن کی چھ جلدوں کے علاوہ ان کے وسیع لٹریچر کو پڑھنا، اس میں موضوع کے مُطابق ضروری اور مُفیدِ مطلب عبارات کو نشان زد کرنا، پھر ان کی نقول تیار کرنا، اور پھر سب سے آخر میں ان کو ابواب اور فصول میں مرتّب کرنا اور اُن کی عنوان بندی کرنا، یہ سارا کام اتنا کٹھن تھا کہ بار بار دامنِ ہمّت تار تار ہو جاتا کہ اِس بھاری منصوبے کو رُو بہ عمل لانا شاید اپنے بس میں نہ ہی ہو۔

خوش قسمتی سے مجھے اس کام میں متعدد رُفقاء کا تعاوُن حاصل ہو گیا اور خصوصیت سے مولانا عبدالوکیل علوی ایم اے نے تقریباً ڈیڑھ سال میرے ساتھ اِس طرح کام کیا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اِس خدمت میں سب سے زیادہ حصّہ اُنہی کا ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

خاموشی سے ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں انجام پانے والے اس کام کو جب تکمیلی مرحلے پر پہنچنے کے بعد مولانا محترم کی خدمت میں لے جا کر پیش کیا گیا، تو ایک حد تک اُن کو بھی اِس پر حیرت ہُوئی کہ اُنھوں نے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شخصیّت اور سیرت کے مُتعلّق اتنا وسیع مواد اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ اور پھر یہ چیز بھی اُن کے لیے کسی نہ کسی حد تک مسرّت کا باعث ہُوئی کہ ہمارے ناچیز ہاتھوں سے تقریباً تین مجلّدات کی ابتدائی ترتیب مکمّل ہو چکی ہے۔ ان میں سے پہلی جلد کا تعلّق بنیادی مباحث منصبِ نبوّت اور نظامِ وحی، بعثتِ آنحضورؐ اور ماقبلِ بعثت کے ماحول، اور دعوت کی مُخاطب قوم اور عرب کے مختلف گروہوں کے احوال سے ہے۔ دوسری جلد حضوؐر کی پیدائش سے لے کر ہجرتِ مدینہ تک کے احوال و واقعات پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد میں اُس انتہائی سرگرم تحریکی زندگی کا مُرقّع سامنے آتا ہے جو لمحۂ وصال تک حضوؐر نے مدینے میں گزاری۔ چوتھی جلد جو ابھی باقی ہے اس میں حضوؐر کی اِصلاحات، تعلیمات، اور نظامِ زندگی مختلف شعبوں میں لائے جانے والے تغیّرات کا نقشہ پیش کرنا مطلوب ہے۔ خُدا کرے کہ ہم اسے بھی جلد مکمّل کر سکیں۔

اِس کتاب کو اِس طرز پر مُرتّب کیا گیا ہے کہ جناب موصُوف کے مقالات اور مختلف عبارات

کو مختلف عنوانات کے تحت ایسی شکل سے ترتیب دیا جائے کہ مضمون پوری طرح مربوط ہو اور ضروری معلومات مناسب ترتیب کے ساتھ سامنے آتی جائیں۔ تھوڑے سے مقامات ایسے بھی ہیں جہاں مرتبین کو اپنی طرف سے یا کسی کتاب سے اخذ کر کے کوئی زائد عبارت شامل کرنی پڑی (اس کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے)۔ حواشی دو قسم کے ہیں: ایک وہ جو محترم مؤلف کی اپنی ہی تحریروں پر مشتمل ہیں، اور دُوسرے وہ ہیں جو مرتبین کی طرف سے لکھے گئے ہیں۔ اِن دونوں صُورتوں کو الگ الگ واضح کر دیا گیا ہے۔ ابواب اور فصول میں جو مختلف اقتباسات مؤلف کی تحریروں سے لے کر استعمال کیے گئے ہیں ان کے حوالے کتاب کے آخر میں یکجا دیئے جا رہے ہیں۔

یہ امر ہمارے لیے نہایت مسرت و اطمینان کا موجب ہے کہ خود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی علالت اور عدیم الفرصتی کے باوجود ہمارے کیے ہوئے کام کو پڑھ ڈالا۔ اور مختلف مقامات پر ترامیم بھی کیں۔ اور اپنی بعض عبارات کو شامل کرنے کے لیے نشاندہی بھی کی۔ اِس کے باوجود اِس کتاب کی ترتیب میں جہاں کہیں کوئی غلطی یا کوتاہی پائی جاتی ہے اس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔

اب یہ خدمت جو کچھ بھی ہے اور جیسی بھی ہے، اسے پیش کرتے ہوئے ہم دُعا کرتے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ قبول ہو اور پڑھنے والوں کے لیے باعثِ رُشد و ہدایت ہو۔ آخر میں ہم کتاب کے قارئین سے یہ درخواست بھی کریں گے کہ وہ ہمارے لیے دُعائے خیر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کام میں جہاں کہیں بھی غلطیاں اور کوتاہیاں پائیں، یا کسی مفید حذف و اضافہ کی نشاندہی کر سکیں تو وہ ہمارے ساتھ ضرور تعاون کریں۔ ہم انشاء اللہ ان کے مشوروں کی روشنی میں اگلے ایڈیشن سے پہلے مسودے کی نظرِ ثانی کر کے اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

نعیم صدیقی

عرضِ مُرتّبین

— بسلسلۂ ترتیب جلد اوّل —

جلد اوّل کے سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس میں بُنیادی مباحث کے زیرِ عنوان مولانائے محترم کی اُن تمام تحریروں اور تقریروں اور ضروری اقتباسات کو جمع کیا گیا ہے جو یا تو منصبِ نُبُوّت، نظامِ وحی، تصوُّرِ دین اور دوسرے متعلقہ موضوعات پر روشنی بہم پہنچاتے ہیں اور دوسری طرف بعثت کے دَور اور اُس سے پہلے کے تہذیبی، تاریخی، مذہبی اور سیاسی ماحول کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ مباحث اگرچہ براہِ راست سیرتِ پاک کے سلسلۂ واقعات کو پیش نہیں کرتے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی شخصیت، آپؐ کے منصب اور آپؐ کی جدّوجہد کو سمجھنے میں ان سے بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے ضروری سمجھا کہ واقعاتِ سیرت کا مُطالعہ کرنے سے پہلے قارئین اِن رہنما مباحث سے گزر جائیں۔

مُرتّبین
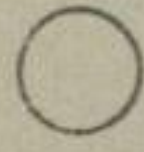
اسلام دراصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پُوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بُنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اِس کے رہنما وہ لوگ تھے جن کو رُسل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اِس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ اُنہی رہنماؤں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی کیونکہ اِس کے سوا کوئی اور طرزِ عمل اِس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اِس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سُراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقّت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاءؑ گزرے ہیں ان کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل اسکیم نہیں بن سکتی۔ بائبل کے عہدِ جدید (New Testament) میں سیّدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مُستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اِس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلے میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیحؑ کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی ہے۔ اِس طرف ہمارے رجُوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اِس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے اِسی طرف رجُوع کرنے پر ہم مجبُور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام رہنماؤں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہی وہ تنہا رہنما ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اُس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی اور نظمِ مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پُوری تفصیلات اور نہایت مُستند تفصیلات ملتی ہیں۔ [1]

فہرست

جلد اوّل ـ حصہ ۱

سِلسلۂ نُبوّت سے متعلق اُصولی حقیقتیں

فصل (۳) رسالت اور اس کے احکام ۲۶۰

فصل (۴) رسول کی حیثیتِ شخصی و حیثیتِ نبوی کا جائزہ ۲۸۲

فصل (۵) منصبِ نبوت اور اس کے فرائض از روئے قرآن ۲۸۹

باب ۱۱ — حضورؐ کی چند اہم پیشنگوئیاں ۴۲۵ تا ۴۷۳

فصل (۱) قرآن کی پیشین گوئیاں ۴۲۷

فصل (۲) احادیث میں پیشین گوئیاں ۴۵۲

— ظہورِ مہدی کے متعلق پیشین گوئیاں ۴۵۶ —

— مسیح علیہ السّلام کی آمدِ ثانی کے متعلق حضورؐ کی پیشینگوئیاں ۴۶۰ —

جلد اوّل — حصّہ ۲

بعثت سے پہلے کا ماحول

۱- اقوامِ ماضیہ

باب ۱۳ — سابق اُمّتوں کی تباہی اور اُنکے آثار ۴۸۹ تا ۵۶۶

جلد اول — حصّہ ۳

بعثت سے پہلے کا ماحول

(ب) مُروّجہ مذاہب

باب ۱۴ — مُشرکین ۵۶۷ تا ۵۹۴

فصل (۱) پُوری انسانی دُنیا پر ایک اِجمالی نظر ۵۶۹

فصل (۲) مُشرکینِ عرب کا مذہب اور معاشرتی رُسوم و اَطوار ۵۷۲

باب ۱۷ ۔ نصاریٰ اور عیسائیت ۶۴۱ تا ۷۰۹

فصل (۱) عیسائیت کا ظہور اور نشو و نما ۶۴۳

فصل (۲) انجیلی صحائف کی تاریخی حیثیت ۶۵۵

فصل (۳) حضرت عیسیٰؑ کی حقیقی تعلیمات ۶۵۹

جلد اوّل — حصّہ ۴

بعثت سے پہلے کا ماحول

ج ۔ جزیرۃُ العرب کی جُغرافی و تمدّنی اہمیّت

باب ۱۸۔ مختلف ممالک سے عربوں کے وسیع رابطے ۷۱۱ تا ۷۱۶

باب ۱۹۔ سیرت کا پیغام ۷۱۷ تا ۷۳۶

○

مُقدّمہ

(از مؤلّف)

اِسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے۔ ایک اللہ کا کلام، دُوسرے انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں، جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ اور تعلیم و تفہیم کا واسطہ بنایا، بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا، تاکہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشا پُورا کرنے کے لیے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہُوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیرِ صالح کر دکھائیں۔

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم و ملزوم رہی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہو سکا اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہو سکا۔ کتاب کو نبی سے الگ کر دیجیے تو وہ ایک کشتی ہے ناخدا کے بغیر، جسے لے کر اناڑی مُسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں، منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور نبی کو کتابُ اللہ سے الگ کر دیجیے تو خدا کا راستہ پانے کے بجائے آدمی ناخدا ہی کو خدا بنا بیٹھنے سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ یہ دونوں ہی نتیجے پچھلی قومیں دیکھ چکی ہیں۔ ہندوؤں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو گُم کیا اور صرف کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ انجام یہ ہُوا کہ کتابیں ان کے لیے لفظی گورکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں حتّیٰ کہ آخر کار خود کتابوں کو بھی وہ گُم کر بیٹھے۔ عیسائیوں نے کتاب کو نظر انداز کر کے نبی کا دامن پکڑا اور اُس کی شخصیت کے گرد گھُومنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ کوئی چیز اُنہیں نبی اللہ کو ابنُ اللہ بلکہ عین اللہ بنانے سے باز نہ رکھ سکی۔

پُرانے اَدوار کی طرح اب اِس نئے دَور میں بھی انسان کو نعمتِ اسلام میسّر آنے کے دو ہی ذرائع ہیں جو ازل سے چلے آ رہے ہیں۔ ایک خُدا کا کلام، جو اَب صرف قُرآن پاک کی صُورت ہی میں مل سکتا ہے۔ دُوسرے اُسوۂ نبوّت جو اب صرف محمدِ عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ پاک ہی میں محفُوظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی صُورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو قُرآن سے سمجھے۔ اِن دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا اس نے اسلام کو سمجھا، ورنہ فہمِ دین سے بھی محرُوم رہا اور نتیجۃً ہدایت سے بھی۔

پھر قرآن اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم دونوں چونکہ ایک مشن رکھتے ہیں، ایک مقصد و مُدّعا کو لیے ہوئے آتے ہیں،

اِس لیے ان کو سمجھنے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ان کے مشن اور مقصد و مُدعا کو کس حد تک سمجھتے ہیں۔ اِس چیز کو نظر انداز کر کے دیکھیے تو قرآن عبارتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرتِ پاک، واقعات و حوادث کا ایک مجموعہ ہے۔ آپ لُغت و روایات اور علمی تحقیق و کاوش کی مدد سے تفسیروں کے انبار لگا سکتے ہیں۔ اور تاریخی تحقیق کا کمال دکھا کر رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات اور آپؐ کے عہد کے متعلق صحیح ترین اور وسیع ترین معلومات کے ڈھیر لگا سکتے ہیں، مگر رُوحِ دین تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ یہ عبارات اور واقعات سے نہیں بلکہ اُس مقصد سے وابستہ ہے جس کے لیے قرآن اُتارا گیا اور جس کی علمبرداری کے لیے محمّد عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کھڑا کیا گیا۔ اِس مقصد کا تصوُّر جتنا صحیح ہو گا اُتنا ہی قرآن اور سیرت کا فہم صحیح، اور جتنا ناقص ہو گا اُتنا ہی اِن دونوں کا فہم ناقص رہے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرتِ محمّدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام دونوں ہی بحرِ ناپیدا کنار ہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کرے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی ان کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے رُوحِ دین تک رسائی پائے۔

مَیں اللہ تعالیٰ کے اِس فضل و احسان کا بے حد شکر گزار ہُوں کہ قرآن پاک کو سمجھانے کے لیے جو کوشش میرے بس میں تھی اُسے انجام دینے کے لیے اُس نے مجھے "تفہیم القرآن" مکمّل کرنے کی توفیق عطا فرما دی۔ اس کے بعد میری دِلی تمنّا تھی کہ سیرتِ رسولِ پاکؐ پر بھی ایک کتاب لِکھوں۔ لیکن پہلے کام ہی میں عُمر کے ۳۰ سال صرف ہو گئے اور اب مَیں اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتا کہ دوسرا کام شروع کر سکوں۔ میرے دل میں اِس کی حسرت ایک مستقل خلش بنی ہوئی تھی کہ یکایک جناب نعیم صدّیقی اور جناب عبدالوکیل علوی نے میری ہی مختلف کتابوں اور مضامین سے مُرتّب کیا ہُوا مقالاتِ سیرت کا یہ مجموعہ میرے سامنے لا کر رکھ دیا جسے دیکھ کر مَیں خود بھی حیران رہ گیا کہ اِس عظیم الشّان موضوع پر میری تحریروں میں اتنا کچھ مواد موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی اِن دونوں حضرات کی اس محنت و جانفشانی پر بے اختیار دل سے داد بھی نکلی اور دُعائے خیر بھی کہ انہوں نے جگہ جگہ بکھرے ہُوئے اِس مواد کا نہایت باریک بینی اور تجسُّس کے ساتھ جائزہ لیا اور اس کو بہترین طریقے سے مُرتّب کر دیا۔ اگرچہ یہ مجموعہ سیرت پر ایک مستقل کتاب کی ضرورت کو تو پُورا نہیں کرتا، لیکن اس میں جو مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں وہ انشاءاللہ لوگوں کو رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شخصیت اور آپؐ کے کارنامۂ عظیم کو سمجھنے میں کافی مدد دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ جو کچھ اِس کتاب میں درج کیا گیا ہے، میری کتابوں اور تحریروں کے ناظرین کی نگاہ سے وہ یا اس کا کم و بیش اچھا خاصا حصّہ پہلے ہی گزر چُکا ہے، اور پڑھی ہُوئی چیزوں کو دوبارہ پڑھنا ایک حد تک آدمی کو ناگوار گزرتا ہے۔ مگر پڑھنے والے جب اِس کتاب کو پڑھیں گے تو خود محسُوس کریں گے کہ سیرتِ پاک کے متعلق جو مضامین مختلف مقامات

پر بکھرے ہوئے تھے، اور تیس چالیس سال کے دوران میں مختلف مواقع پر لکھے گئے تھے، وہ یہاں ان کے سامنے یکجا ایک مرتّب صورت میں آگئے ہیں، اور اس مجموعی صورت میں ان کا مطالعہ اُس مطالعہ کی بہ نسبت اپنا ایک جداگانہ فائدہ رکھتا ہے جو متفرق صورت میں حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

مَیں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اِس کتاب کو بھی اپنے بندوں کی ہدایت اور میرے لیے اجرِ آخرت کا ذریعہ بنائے۔

لاہور - ۱۹ رذی القعدہ ۱۳۹۲ھ

۲۵ ردسمبر ۱۹۷۲ء

ابُوالاعلیٰ
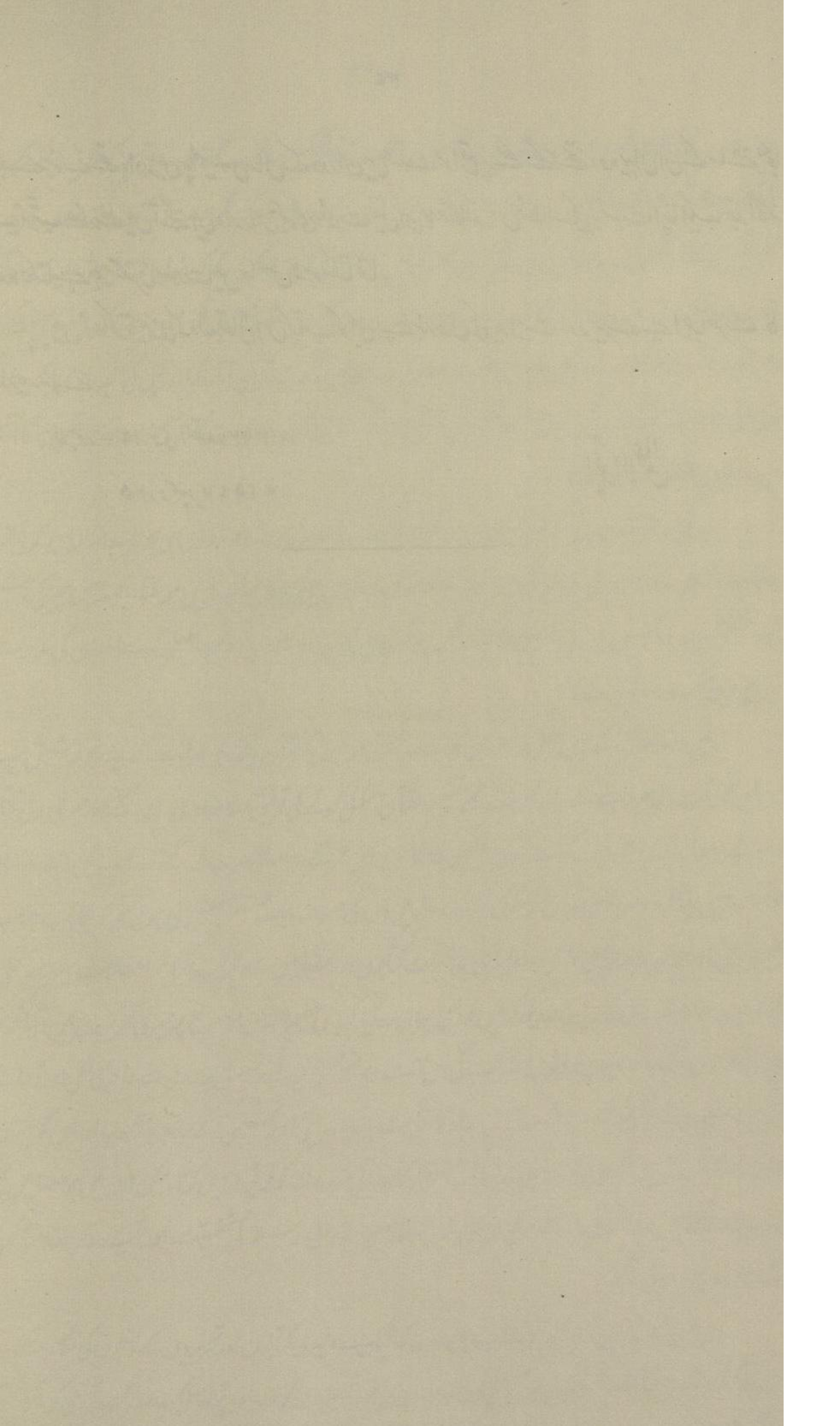
جلد اوّل — حصّہ ۱
سِلسلۂ نُبوّت سے متعلق چند اُصولی حقیقتیں

باب (۱)

حقیقتِ نُبوّت

فصل ۱

انسانیّت کے لیے خُدائی سلسلۂ ہدایت

خداوندِ عالم نے جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمانروا ہے، اپنی بے پایاں مملکت کے اِس حصّے میں جسے ہم زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا۔ اُسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور بُرائی کی تمیز دی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ تصرُّف کے اختیارات بخشے اور فی الجُملہ ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

اِس منصب پر انسان کو مقرّر کرتے وقت خداوندِ عالم نے اچھی طرح اُس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمہارا اور تمام جہان کا مالک، معبُود اور حاکم مَیں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو، نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل تمہارے لیے ایک امتحان کی مدّت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس آنا ہو گا اور مَیں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمہارے لیے صحیح رَوِیّہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبُود اور حاکم تسلیم کرو، جو ہدایات میں بھیجوں اُس کے مطابق دنیا میں کام کرو، اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اِس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمہارے لیے ہر وہ رویّہ غلط ہے جو اِس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویّہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو)، تو تمہیں دُنیا میں امن و اطمینان حاصل ہو گا، اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو مَیں تمہیں اَبدی راحت و مسرّت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنّت ہے۔ اور اگر دوسرے کسی رَوِیّہ پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دُنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہو گا اور دنیا سے گزر کر عالمِ آخرت میں جب آؤ گے تو اَبدی رنج و مصیبت کے اُس گڑھے میں پھینک دیتے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

"مُسلم" بن کر رہنے کی ہدایت

یہ فہمائش کر کے مالکِ کائنات نے نوعِ انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اِس نوع کے اوّلین افراد (آدمؑ و حوّا)

کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق انہیں اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ آدلین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوتے تھے بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انہیں اُن کا قانونِ حیات بتا دیا گیا تھا۔ اُن کا طریقِ زندگی خدا کی اطاعت (یعنی اسلام) تھا اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ مُطیعِ خدا (مُسلم) بن کر رہیں۔

انحراف

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریقِ زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف قسم کے غلط رَویوں کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے غفلت سے اُس کو گُم بھی کیا اور شرارت سے اس کو مَسخ بھی کر ڈالا۔ انہوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی، خیالی اور مادّی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھیرا لیا۔ انہوں نے خدا کے دیئے ہوئے علمِ حقیقت (العلم) میں طرح طرح کے اوہام اور نظریّوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے تعصّبات کے مطابق ایسے قوانینِ زندگی گھڑ لیے جن سے خدا کی زمین ظلم سے بھر گئی۔

خدا نے جو محدُود خود اختیاری انسانوں کو دی تھی اس کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان بگڑے ہوئے انسانوں کو زبردستی صحیح رَویّہ کی طرف موڑ دیتا۔ اور اس نے دنیا میں کام کرنے کے لیے جو مُہلت اِس نوع کے لیے اور اِس کی مختلف قوموں کے لیے مقرر کی تھی اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اِس بغاوت کے رونما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ پھر جو کام ابتدائے آفرنیش سے اُس نے اپنے ذمّہ لیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے، اُس کی مُہلتِ عمل کے دوران میں، اُس کی رہنمائی کا انتظام وہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی اِس خود عائد کردہ ذمّہ داری کو ادا کرنے کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اُس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیروی کرنے والے تھے۔ اُس نے اُن کو اپنا نمائندہ بنا دیا۔ اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے۔ اُن کو علمِ حقیقت بخشا۔ انہیں صحیح قانونِ حیات عطا کیا۔ اور اُنہیں اِس کام پر مامُور کیا کہ بنی آدم کو اُسی راہِ راست کی طرف پلٹنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

یہ پیغمبر مختلف قوموں اور ملکوں میں اُٹھتے رہے۔ ہزارہا برس تک اُن کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزارہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے۔ اُن سب کا ایک ہی دین تھا، یعنی وہ صحیح رَویّہ جو اوّل روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرو تھے، یعنی اخلاق و تمدّن کے وہ اَزَلی و اَبَدی اُصُول جو آغاز ہی میں انسان کے لیے تجویز کر دیئے گئے تھے۔ اور اُن سب کا ایک ہی مشن تھا، یعنی یہ کہ اس دین اور اِس ہدایت کی طرف اپنے ابنائے نوع کو دعوت دیں، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں ان کو منظّم کر کے ایک ایسی اُمّت بنائیں جو خود اللہ کے قانون

کی پابند ہو اور دُنیا میں قانونِ الٰہی کی اطاعت قائم کرے اور اس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لیے جدوجہد کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے اپنے دَور میں اپنے اِس مشن کو پوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی، اور جنہوں نے اسے قبول کرکے اُمّتِ مُسلمہ کی حیثیت اختیار کی وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے، حتیٰ کہ ان میں سے بعض اُمّتیں ہدایتِ الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں، اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مسخ کر دیا۔

آخر کار خداوندِ عالم نے سرزمینِ عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو اُسی کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیاء آتے رہے تھے۔ اُن کے مخاطب عام انسان بھی تھے اور پچھلے انبیاء کے بگڑے ہوئے پیرو بھی۔ سب کو صحیح رویّہ کی طرف دعوت دینا، سب کو از سرِ نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا، اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں انہیں ایک ایسی اُمّت بنا دینا اُن کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف دُنیا کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرے۔ ؎

نبوّت اور ازلی میثاق

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝

(الاعراف: ۱۷۳)

اور اَے نبیؐ، لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پُشتوں سے اُن کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اُوپر گواہ بناتے ہوئے پُوچھا تھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں"۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم تو اِس بات سے بے خبر تھے"، یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اُس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا"۔

اس آیت میں وہ غرض بیان کی گئی ہے جس کے لیے ازل میں پُوری نسلِ آدم سے اقرار لیا گیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت اختیار کریں وہ اپنے اِس جُرم کے پُوری طرح ذمّہ دار قرار پائیں۔ اُنہیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمّہ داری ڈال کر خود بری الذمّہ ہو سکیں گویا بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ اُس ازلی عہد و میثاق کو اِس بات پر دلیل قرار دیتا ہے

کہ نوعِ انسانی میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہِ واحد اور ربِّ واحد ہونے کی شہادت اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے، یا ایک گمراہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمہ داری سے بالکلیہ بری ہو سکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ازلی میثاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شعور اور حافظہ میں محفوظ ہے؟ کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغازِ آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا سوال ہوا تھا اور اس نے بَلٰی کہا تھا؟ اگر نہیں تو پھر اس اقرار کو جس کی یاد ہمارے شعور و حافظہ سے محو ہو چکی ہے ہمارے خلاف حُجّت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اُس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظہ میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہو جاتا کیونکہ اس کے بعد تو اس آزمائش و امتحان کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہ جاتے۔ لہٰذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تو تازہ نہیں رکھا گیا، لیکن وہ تحت الشعور (Sub Conscious mind) اور وجدان (Intuition) میں یقیناً محفوظ ہے۔ اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشعوری اور وجدانی عُلوم کا حال ہے۔ تہذیب و تمدّن اور اخلاق و معاملات کے تمام شعبوں میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا ہے وہ سب درحقیقت انسان کے اندر بالقوّہ (Potentially) موجود تھا۔ خارجی مُحرّکات اور داخلی تحریکات نے مِل جُل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بالقوہ تھا اسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربیت، کوئی ماحولی تاثیر اور کوئی داخلی تحریک انسان کے اندر کوئی چیز بھی، جو اس کے اندر بالقوہ موجود نہ ہو، ہرگز پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اسی طرح یہ سب مؤثرات اگر اپنا تمام زور بھی صرف کر دیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اُن چیزوں میں سے، جو انسان کے اندر بالقوہ موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اسے اصل فطرت سے منحرف (Pervert) کر دیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریفات و تمسیخات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اپیل کا جواب دینے کے لیے مستعد رہے گی۔ یہ معاملہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی عُلوم کے ساتھ عام ہے:

وہ سب ہمارے اندر بالقوۃ موجود ہیں اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت ان چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کے ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر (یاد دہانی)، تعلیم، تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بالقوۃ موجودات

کی طرف سے ملتا ہے۔

ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر، پردہ ڈال کر، منحرف اور مسخ کر کے کالعدم کر سکتی ہیں مگر بالکل معدوم نہیں کر سکتیں، اور اسی لیے اندرونی احساس اور بیرونی سعی دونوں سے اصلاح اور تبدیلی (Conversion) ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اُس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت، اور خالقِ کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے۔

اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر دَور میں، زمین کے ہر خطّہ میں، ہر بستی، ہر پُشت اور ہر نسل میں اُبھرتا رہا ہے اور کبھی دنیا کی کوئی طاقت اسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے مطابقِ حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ اُبھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کارفرما ہوا ہے اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو اُبھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صُورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے، چنانچہ انبیاء علیہم السّلام اور کتبِ آسمانی اور ان کی پیروی کرنے والے داعیانِ حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ اسی لیے اُن کو قرآن میں مذکّر (یاد دلانے والے) ذِکر (یاد) تذکرہ (یاد داشت) اور ان کے کام کو تذکیر (یاد دہانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء اور کتابیں اور داعیانِ حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ اُسی چیز کو اُبھارتے اور تازہ کرتے ہیں جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھی۔ ۳ے

فصل ۲

نبوّت کے متعلق عقل کا فیصلہ

بڑے بڑے شہروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں کارخانے بجلی کی قوت سے چل رہے ہیں، ریلیں اور ٹرام گاڑیاں رواں دواں ہیں، شام کے وقت دفعتہً ہزاروں قمقمے روشن ہو جاتے ہیں، گرمی کے زمانے میں گھر گھر پنکھے چلتے ہیں۔ مگر ان واقعات سے نہ تو ہمارے اندر حیرت و استعجاب کی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ اِن چیزوں کے روشن یا متحرک ہونے کی علّت میں کسی قسم کا اختلاف ہمارے درمیان واقع ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان قمقموں کا تعلق جن تاروں سے ہے ان کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان تاروں کا تعلق جس بجلی گھر سے ہے اس کا حال بھی ہم کو معلوم ہے۔ اس بجلی گھر میں جو لوگ کام کرتے ہیں ان کے وجود کا بھی ہم کو علم ہے۔ ان کام کرنے والوں پر جو انجینیر نگرانی کر رہا ہے اس کو بھی ہم جانتے ہیں۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ انجینیر بجلی کے کام سے واقف ہے، اس کے پاس بہت سی کلیں ہیں اور ان کلوں کو حرکت دے کر وہ اس قوّت کو پیدا کر رہا ہے جس کے جلوے ہم کو قمقموں کی روشنی، پنکھوں کی گردش، ریلوں اور ٹرام گاڑیوں کی سیر، چکیوں اور کارخانوں میں نظر آتے ہیں۔ پس بجلی کے آثار کو دیکھ کر اس کے اسباب کے متعلق ہمارے درمیان اختلافِ رائے واقع نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان اسباب کا پورا سلسلہ ہمارے محسوسات میں داخل ہے اور ہم اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ فرض کیجیے کہ یہی قمقمے روشن ہوتے، اسی طرح پنکھے گردش کرتے، یُونہی ریلیں اور ٹرام گاڑیاں چلتیں، چکیاں اور مشینیں حرکت کرتیں، مگر وہ تار جن سے بجلی ان میں پہنچتی ہے ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوتے، بجلی گھر بھی ہمارے محسوسات کے دائرے سے خارج ہوتا، بجلی گھر میں کام کرنے والوں کا بھی ہم کو کچھ علم نہ ہوتا، اور یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اس کارخانہ کا کوئی انجینیر ہے جو اپنے علم اور اپنی قدرت سے اس کو چلا رہا ہے۔ کیا اس وقت بھی بجلی کے اِن آثار کو دیکھ کر ہمارے دل ایسے ہی مطمئن ہوتے؟ کیا اس وقت بھی ہم اِسی طرح اِن مظاہر کی علّتوں میں اختلاف نہ کرتے؟ ظاہر ہے کہ آپ اس کا جواب نفی میں دیں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب آثار کے اسباب پوشیدہ ہوں اور مَظاہر کی علّتیں غیر معلوم ہوں تو دلوں میں حیرت کے ساتھ بے اطمینانی کا پیدا ہونا، دماغوں کا اس رازِ سربستہ کی جستجو میں لگ جانا، اور اس راز کے متعلق قیاسات و آراء کا مختلف ہونا ایک فطری بات ہے۔

اب ذرا اِسی مفروضہ پر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھائیے۔ مان لیجیے کہ یہ جو کچھ فرض کیا گیا ہے درحقیقت عالمِ واقعہ میں موجود ہے۔ ہزاروں لاکھوں قمقمے روشن ہیں، لاکھوں پنکھے چل رہے ہیں، گاڑیاں دوڑ رہی ہیں، کارخانے حرکت کر رہے ہیں اور ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان میں کونسی قوّت کام کر رہی ہے اور وہ کہاں سے آتی ہے۔ لوگ اِن مظاہر کو دیکھ کر حیران و ششدر ہیں۔

بھانت بھانت کی بولیاں

ہر شخص ان کے اسباب کی جستجو میں عقل کے گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں آپ سے آپ روشن اور متحرک ہیں، ان کے اپنے وجود سے خارج کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انہیں روشنی یا حرکت بخشنے والی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ چیزیں جن مادّوں سے بنی ہوئی ہیں انہی کی ترکیب نے ان کے اندر روشنی اور حرکت کی کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اِس عالمِ مادہ سے ماورا چند دیوتا ہیں جن میں سے کوئی قمقمے روشن کرتا ہے، کوئی ٹرام اور ریلیں چلاتا ہے، کوئی پنکھوں کو گردش دیتا ہے اور کوئی کارخانوں اور چکّیوں کا محرِّک ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو سوچتے سوچتے تھک گئے ہیں اور آخر میں عاجز ہو کر کہنے لگے ہیں کہ ہماری عقل اس طلسم کی کُنہ تک نہیں پہنچ سکتی، ہم صرف اُتنا ہی جانتے ہیں جتنا دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور جو کچھ ہماری سمجھ میں نہ آئے اُس کی نہ ہم تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب۔

یہ سب گروہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ مگر اپنے خیال کی تائید اور دوسرے خیالات کی تکذیب کے لیے ان میں سے کسی کے پاس بھی قیاس اور ظن و تخمین کے سوا کوئی ذریعۂ علم نہیں ہے۔

ایک جُداگانہ آواز

اِس دوران میں کہ یہ اختلافات برپا ہیں، ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائیو، میرے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ اُس ذریعے سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان سب قمقموں، پنکھوں، گاڑیوں، کارخانوں اور چکّیوں کا تعلق چند مخفی تاروں سے ہے جن کو تم محسوس نہیں کرتے۔ ان تاروں میں ایک بہت بڑے بجلی گھر سے وہ قوّت آتی ہے جس کا ظہور روشنی اور حرکت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس بجلی گھر میں بڑی بڑی عظیم الشان کلیں ہیں جنہیں بے شمار شخص چلا رہے ہیں۔ یہ سب اشخاص ایک بڑے انجنیر کے تابع ہیں، اور وہی انجنیر ہے جس کے علم اور قدرت نے اِس پُورے نظام کو قائم کیا ہے۔ اسی کی ہدایت اور نگرانی میں یہ کام ہو رہے ہیں۔

یہ شخص پُوری قوّت سے اپنے اس دعوے کو پیش کرتا ہے۔ لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں، سب گروہ مل کر اس کی مخالفت کرتے ہیں، اسے دیوانہ قرار دیتے ہیں، اس کو مارتے ہیں، تکلیفیں دیتے ہیں، گھر سے نکال دیتے ہیں مگر وہ اِن سب روحانی اور جسمانی مُصیبتوں کے باوجود اپنے دعوے پر قائم رہتا ہے۔ کسی خوف یا لالچ سے اپنے قول

میں ذرّہ برابر ترمیم نہیں کرتا۔کسی مصیبت سے اس کے دعوے میں کمزوری نہیں آتی۔اس کی ہر ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اپنے قول کی صداقت پر کامل یقین ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا شخص آتا ہے اور وہ بھی بجنسہٖ یہی قول اسی دعوے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں آتا ہے اور وہی بات کہتا ہے جو اس کے پیشرووں نے کہی تھی۔اس کے بعد آنے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں سے تجاوز کر جاتی ہے، اور یہ سب اسی ایک قول کو اسی ایک دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔زمان و مکان اور حالات کے اختلاف کے باوجود ان کے قول میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔سب کہتے ہیں کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔سب کو دیوانہ قرار دیا جاتا ہے، ہر طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، ہر طریقہ سے ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے قول سے باز آجائیں، مگر سب کے سب اپنی بات پر قائم رہتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کو اپنے مقام سے ایک انچ نہیں ہٹا سکتی۔اس عزم و استقامت کے ساتھ ان لوگوں کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں سے کوئی جھوٹا، چور، خائن، بدکار، ظالم اور حرام خور نہیں ہے۔ان کے دشمنوں اور مخالفوں کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ان سب کے اخلاق پاکیزہ ہیں، سیرتیں انتہا درجہ کی نیک ہیں، اور حسنِ خلق میں یہ اپنے دوسرے ابنائے نوع سے ممتاز ہیں۔پھر ان کے اندر جنون کا بھی کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔بلکہ اس کے برعکس وہ تہذیبِ اخلاق، تزکیۂ نفس، اور دنیوی معاملات کی اصلاح کے لیے ایسی ایسی تعلیمات پیش کرتے اور ایسے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کے مثل بنانا تو درکنار بڑے بڑے علماء و عقلاء کو ان کی باریکیاں سمجھنے میں پوری پوری عمریں صرف کر دینی پڑتی ہیں۔

معاملہ عقل کی عدالت میں

ایک طرف وہ مختلف الخیال مُکذِّبین ہیں، اور دوسری طرف یہ مُتّحد الخیال مُدّعی۔دونوں کا معاملہ عقلِ سلیم کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔جج کی حیثیت سے عقل کا فرض ہے کہ پہلے اپنی پوزیشن کو خوب سمجھ لے، پھر فریقین کی پوزیشن کو سمجھے، اور دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد فیصلہ کرے کہ کس کی بات قابلِ ترجیح ہے۔

جج کی اپنی پوزیشن یہ ہے کہ خود اس کے پاس امرِ واقعی کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔وہ خود حقیقت کا علم نہیں رکھتا۔اس کے سامنے صرف فریقین کے بیانات، ان کے دلائل، ان کے ذاتی حالات اور خارجی آثار و قرائن ہیں۔انہی پر تحقیق کی نظر ڈال کر اسے فیصلہ کرنا ہے کہ کس کا برحق ہونا اغلب ہے۔مگر اغلبیت سے بڑھ کر بھی وہ کوئی حکم نہیں لگا سکتا، کیونکہ مسل پر جو کچھ مواد ہے اس کی بنا پر یہ کہنا اس کے لیے مشکل ہے کہ امرِ واقعی کیا ہے۔وہ فریقین میں سے ایک کو ترجیح دے سکتا ہے لیکن قطعیت اور یقین کے ساتھ کسی کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتا۔

مکذّبین کی پوزیشن

مکذّبین کی پوزیشن یہ ہے:

۱۔ حقیقت کے متعلق ان کے نظریے مختلف ہیں۔ اور کسی ایک نکتہ میں بھی ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے، حتیٰ کہ ایک ہی گروہ کے افراد میں بسا اوقات اختلاف پایا گیا ہے۔

۲۔ وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو۔ ان میں سے کوئی گروہ اِس سے زیادہ کسی چیز کا مدّعی نہیں ہے کہ ہمارے قیاسات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ وزنی ہیں۔ مگر اپنے قیاسات کا قیاسات ہونا سب کو تسلیم ہے۔

۳۔ اپنے قیاسات پر اُن کا اعتقاد، ایمان و یقین اور غیر متزلزل وثوق کی حد تک نہیں پہنچا ہے۔ ان میں تبدیلی رائے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ ان میں کا ایک شخص کل تک جس نظریّے کو پورے زور کے ساتھ پیش کر رہا تھا، آج خود اسی نے اپنے پچھلے نظریّے کی تردید کر دی اور ایک دوسرا نظریّہ پیش کر دیا۔ عمر، عقل، علم اور تجربے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اکثر ان کے نظریّے بدلتے رہتے ہیں۔

۴۔ مدّعیوں کی تکذیب کے لیے ان کے پاس بجز اِس کے اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی صداقت کا کوئی یقینی ثبوت نہیں پیش کیا، انہوں نے وہ مخفی تار ہم کو نہیں دکھائے جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ قمقموں اور پنکھوں وغیرہ کا تعلق انہی سے ہے، نہ انہوں نے بجلی کا وجود تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا، نہ بجلی گھر کی ہمیں سَیر کرائی، نہ اس کی کلوں اور مشینوں کا معاینہ کرایا، نہ اس کے کارندوں میں سے کسی سے ہماری ملاقات کرائی، نہ کبھی انجینیئر سے ہم کو ملایا، پھر ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ سب کچھ حقائق ہیں؟

مدّعیوں کی پوزیشن

مدّعیوں کی پوزیشن یہ ہے:

۱۔ وہ سب آپس میں متفق القول ہیں۔ دعوے کے جتنے بنیادی نکات ہیں ان سب میں ان کے درمیان کامل اتفاق ہے۔

۲۔ ان سب کا متفقہ دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

۳۔ ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم اپنے قیاس یا گمان کی بنا پر ایسا کہتے ہیں بلکہ سب نے بالاتفاق کہا ہے کہ انجینیئر سے ہمارے خاص تعلّقات ہیں، اس کے کارندے ہمارے پاس آتے ہیں، اُس نے اپنے کارخانے کی سیر بھی ہم کو کرائی ہے اور ہم جو کچھ کہتے ہیں علم و یقین کی بنا پر کہتے ہیں، ظنّ و تخمین کی بنا پر نہیں کہتے۔

۴۔ ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی نے اپنے بیان میں ذرّہ برابر بھی کوئی تغیّر و تبدّل کیا ہو۔ ایک

ہی بات ہے جو ان میں کا ہر شخص دعوے کے آغاز سے زندگی کے آخری سانس تک کہتا رہا ہے۔

۵- ان کی سیرتیں انتہا درجہ کی پاکیزہ ہیں۔ جھوٹ، فریب، مکاری، دغا بازی کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے۔ اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جو لوگ زندگی کے تمام معاملات میں سچے اور کھرے ہوں، وہ خاص اسی معاملے میں بالاتفاق جھوٹ بولیں۔

۶- اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ دعویٰ پیش کرنے سے ان کے پیشِ نظر کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ برعکس اس کے یہ ثابت ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر نے اس دعوے کی خاطر انتہائی درجے کے مصائب برداشت کیے ہیں۔ جسمانی تکلیفیں سہیں، قید کیے گئے، مارے اور پیٹے گئے، جلاوطن کیے گئے۔ بعض قتل کر دیئے گئے حتیٰ کہ بعض کو آرے سے چیر ڈالا گیا۔ اور چند کے سوا کسی کو بھی خوش حالی و فارغ البالی کی زندگی میسر نہ ہوئی۔ لہٰذا کسی ذاتی غرض کا الزام ان پر نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ اُن کا ایسے حالات میں اپنے دعوے پر قائم رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اپنی صداقت پر انتہا درجہ کا یقین تھا، ایسا یقین کہ اپنی جان بچانے کے لیے بھی ان میں سے کوئی اپنے دعوے سے باز نہ آیا۔

۷- اُن کے متعلق مجنون اور فاتر العقل ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ زندگی کے تمام معاملات میں وہ سب کے سب غایت درجہ کے دانشمند اور سلیم العقل پائے گئے ہیں۔ ان کے مخالفین نے بھی اکثر ان کی دانشمندی کا لوہا مانا ہے۔ پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ان سب کو خاص اسی معاملے میں جنون لاحق ہو گیا ہو؟ اور وہ معاملہ بھی کیسا؟ جو اُن کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گیا ہو۔ جس کے لیے انہوں نے دنیا بھر کا مقابلہ کیا ہو۔ جس کی خاطر وہ سالہا سال دنیا سے لڑتے رہے ہوں۔ جو ان کی ساری عاقلانہ تعلیمات کا (جن کے عاقلانہ ہونے کا بہت سے مکذبین کو بھی اعتراف ہے) اصل الاصول ہو۔

۸- انہوں نے خود بھی یہ نہیں کہا کہ ہم انجینئر یا اس کے کارندوں سے تمہاری ملاقات کرا سکتے ہیں یا اس کا مخفی کارخانہ تمہیں دکھا سکتے ہیں یا تجربہ اور مشاہدہ سے اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ خود ان تمام امور کو "غیب" سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم پر اعتماد کرو اور جو کچھ ہم بتاتے ہیں اسے مان لو۔

عقل کی عدالت کا فیصلہ

فریقین کی پوزیشن اور ان کے بیانات پر غور کرنے کے بعد اب عقل کی عدالت اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے۔

وہ کہتی ہے کہ چند مظاہر و آثار کو دیکھ کر ان کے باطنی اسباب و علل کی جستجو دونوں فریقوں نے کی ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ بادی النظر میں سب کے نظریات اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ اوّلاً ان میں سے کسی میں استحالۂ عقلی نہیں ہے، یعنی قوانینِ عقلی کے لحاظ سے کسی نظریہ کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا

صحیح ہونا غیر ممکن ہے۔ ثانیاً ان میں سے کسی کی صحت تجربے یا مشاہدے سے ثابت نہیں کی جا سکتی۔ نہ فریقِ اوّل میں سے کوئی گروہ اپنے نظریات کا ایسا سائنٹفک ثبوت دے سکتا ہے جو ہر شخص کو یقین کرنے پر مجبور کر دے اور نہ فریقِ ثانی اس پر قادر یا اس کا مدعی ہے۔ لیکن مزید غور و تحقیق کے بعد چند امور ایسے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر تمام نظریات میں سے فریقِ ثانی کا نظریہ قابلِ ترجیح قرار پاتا ہے:

اوّلاً، کسی دوسرے نظریے کی تائید اتنے کثیر التعداد لوگوں کا مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں اس دعوے پر متفق ہو جانا کہ اُن سب کے پاس ایک غیر معمولی ذریعۂ علم ہے، اور ان سب نے اُس ذریعے سے خارجی مظاہر کے باطنی اسباب کو معلوم کر لیا ہے، ہم کو اِس دعوے کی تصدیق پر مائل کر دیتا ہے۔ خصوصاً اِس وجہ سے کہ اپنی معلومات کے متعلق ان کے بیانات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جو معلومات انہوں نے بیان کی ہیں ان میں کوئی استحالۂ عقلی بھی نہیں ہے، اور نہ یہ بات قوانینِ عقلی کی بنا پر محال قرار دی جا سکتی ہے کہ بعض انسانوں میں کچھ ایسی غیر معمولی قوتیں ہوں جو عام طور پر دوسرے انسانوں میں نہ پائی جاتی ہوں۔

ثانیاً، خارجی مظاہر کی حالت پر غور کرنے سے اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کا نظریہ صحیح ہو۔ اِس لیے کہ قمقمے، پنکھے، گاڑیاں، کارخانے وغیرہ نہ تو آپ سے آپ روشن اور متحرک ہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کا روشن اور متحرک ہونا ان کے اپنے اختیار میں ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نہ ان کی روشنی و حرکت ان کے مادۂ جسمی کی ترکیب کا نتیجہ ہے، کیونکہ جب وہ متحرک اور روشن نہیں ہوتے اُس وقت بھی یہی ترکیب جسمی موجود رہتی ہے۔ نہ ان کا الگ الگ قوتوں کے زیرِ اثر ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بسا اوقات جب قمقموں میں روشنی نہیں ہوتی تو پنکھے بھی بند ہوتے ہیں، ٹرام کاریں بھی موقوف ہو جاتی ہیں اور کارخانے بھی نہیں چلتے۔ لہٰذا خارجی مظاہر کی توجیہ میں فریقِ اوّل کی طرف سے جتنے نظریات پیش کیے گئے ہیں وہ سب بعید از عقل و قیاس ہیں۔ زیادہ صحیح یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ اِن تمام مظاہر میں کوئی ایک قوت کارفرما ہو اور اس کا سر رشتہ کسی ایسے حکیم و توانا کے ہاتھ میں ہو جو ایک مقررہ نظام کے تحت اس قوت کو مختلف مظاہر میں صرف کر رہا ہو۔

باقی رہا مُشککین کا یہ قول کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اور جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے اس کی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے، تو حاکمِ عقل اِس کو بھی درست نہیں سمجھتا، کیونکہ کسی واقعہ کا واقعہ ہونا اِس کا محتاج نہیں ہے کہ وہ سُننے والوں کی سمجھ میں بھی آ جائے۔ اُس کے وقوع کو تسلیم کرنے کے لیے معتبر اور متواتر شہادت کافی ہے۔ اگر ہم سے چند مُعتبر آدمی آ کر کہیں کہ ہم نے زمینِ مغرب میں آدمیوں کو لوہے کی گاڑیوں میں بیٹھ کر ہوا پر اُڑتے دیکھا ہے، اور ہم اپنے کانوں سے لندن میں بیٹھ کر امریکہ کا گانا سن آئے ہیں، تو ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ یہ لوگ جھوٹے اور مسخرے تو نہیں ہیں؟ ایسا بیان کرنے میں ان کی کوئی ذاتی غرض تو نہیں ہے؟ ان کے دماغ میں کوئی فتور تو نہیں ہے؟ اگر ثابت ہو گیا کہ وہ

نہ جھوٹے ہیں نہ مسخرے، نہ دیوانے، نہ ان کا کوئی مفاد اِس روایت سے وابستہ ہے، اور اگر ہم نے دیکھا کہ اس کو بلا اختلاف بہت سے سچے اور عقلمند لوگ پوری سنجیدگی کے ساتھ بیان کر رہے ہیں تو ہم یقیناً اس کو تسلیم کرلیں گے، خواہ لوہے کی گاڑیوں کا ہوا پر اُڑنا اور کسی مادّی واسطہ کے بغیر ایک جگہ کا گانا کئی ہزار میل کے فاصلہ پر سُنائی دینا کسی طرح ہماری سمجھ میں نہ آتا ہو۔

یہ اس معاملہ میں عقل کا فیصلہ ہے۔ مگر تصدیق و یقین کی کیفیّت جس کا نام "ایمان" ہے اِس سے پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے لیے وِجدان کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اندر سے ایک آواز آئے جو تکذیب، شک اور تذبذب کی تمام کیفیّتوں کا خاتمہ کر دے اور صاف کہہ دے کہ لوگوں کی قیاس آرائیاں باطل ہیں، سچ وہی ہے جو سچے لوگوں نے قیاس سے نہیں بلکہ علم و بصیرت کی رُو سے بیان کیا ہے۔[۱]

فصل ۳

نبوّت کی ضرورت و حقیقت

انسان کی سب سے بڑی ضرورت

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ ؕ (النحل آیت :۹)

اور اللہ ہی کے ذمّہ ہے سیدھا راستہ بتانا جبکہ ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔

توحید اور رحمت و ربوبیت کے دلائل پیش کرتے ہوتے یہاں اشارۃً نبوت کی بھی دلیل پیش کر دی گئی ہے۔ اس دلیل کا مختصر بیان یہ ہے۔

دُنیا میں انسان کے لیے فکر و عمل کے بہت سے مختلف راستے ممکن ہیں اور عملاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے راستے بیک وقت تو حق نہیں ہو سکتے۔ سچائی تو ایک ہی ہے اور صحیح طریقِ حیات صرف وہی ہو سکتا ہے جو صحیح نظریۂ حیات پر مبنی ہو۔

اس صحیح نظریے اور صحیح راہ سے واقف ہونا انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ بلکہ اصل بنیادی ضرورت یہی ہے۔ دوسری تمام چیزیں تو انسان کی صرف اُن ضرورتوں کو پُورا کرتی ہیں جو ایک اُونچے درجے کا جانور ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہُوا کرتی ہیں۔ مگر یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو انسان ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہے۔ یہ اگر پُوری نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی ساری زندگی ہی ناکام ہو گئی۔

اب غور کیجیے کہ جس خدا نے آپ کو وجود میں لانے سے پہلے آپ کے لیے یہ کچھ سرو سامان کر رکھا اور جس نے وجود میں لانے کے بعد آپ کی حیوانی زندگی کی ایک ایک ضرورت کو پُورا کرنے کا اتنی دقیقہ سنجی کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر انتظام کیا، کیا اُس سے آپ توقع رکھتے ہیں کہ اُس نے آپ کی انسانی زندگی کی اِس سب سے بڑی اور اصل ضرورت کو پُورا کرنے کا بندوبست نہ کیا ہو گا۔

یہی بندوبست تو ہے جو نبوت کے ذریعے کیا گیا ہے۔ اگر آپ نبوت کو نہیں مانتے تو بتائیے کہ آپ کے خیال میں خدا نے انسان کی ہدایت کے لیے اور کونسا انتظام کیا ہے؟ اِس کے جواب میں آپ نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ہمیں

راستہ تلاش کرنے کے لیے عقل و فکر دے رکھی ہے۔ کیونکہ انسانی عقل و فکر پہلے ہی بے شمار راستے ایجاد کر بیٹھی ہے جو راہِ راست کی صحیح دریافت میں اُس کی ناکامی کا کھلا ثبوت ہے۔ اور نہ آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے۔ کیونکہ خدا کے ساتھ اس سے بڑھ کر بدگمانی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ جانور ہونے کی حیثیت سے تو آپ کی پرورش اور نشوونما کا اتنا مفصّل اور مکمّل انتظام کرے، مگر انسان ہونے کی حیثیت سے آپ کو یُوں ہی تاریکیوں میں بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دے۔[۵]

جبری ہدایت کے بجائے الہامی ہدایت

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (النحل آیت ۹) — اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔

یعنی اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اِس ذمّہ داری کو (جو نوعِ انسانی کی رہنمائی کے لیے اس نے خود اپنے آپ پر عائد کی ہے) اِس طرح ادا کرتا کہ سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر دوسری تمام بے اختیار مخلوقات کی طرح برسرِ ہدایت بنا دیتا۔ لیکن یہ اُس کی مشیّت کا تقاضا نہ تھا۔ اُس کی مشیّت ایک ایسی ذی اختیار مخلوق کو وجود میں لانے کی متقاضی تھی جو اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے صحیح اور غلط، ہر طرح کے راستوں پر جانے کی آزادی رکھتی ہو۔ اِسی آزادی کے استعمال کے لیے اُس کو علم کے ذرائع دیئے گئے۔ عقل و فکر کی صلاحیتیں دی گئیں۔ خواہش اور ارادے کی طاقتیں بخشی گئیں۔ اپنے اندر اور باہر کی بے شمار چیزوں پر تصرّف کے اختیارات عطا کیے گئے۔ اور باطن و ظاہر میں ہر طرف بے شمار ایسے اسباب رکھ دیئے گئے جو اُس کے لیے ہدایت اور ضلالت دونوں کے موجب بن سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ بے معنی ہو جاتا اگر وہ پیدائشی طور پر راست رَو بنا دیا جاتا۔ اور ترقی کے اُن بلند ترین مدارج تک بھی انسان کا پہنچنا ممکن نہ رہتا جو صرف آزادی کے صحیح استعمال ہی میں اُس کو مل سکتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے جبری ہدایت کا طریقہ چھوڑ کر رسالت کا طریقہ اختیار فرمایا، تاکہ انسان کی آزادی بھی برقرار رہے، اور اس کے امتحان کا منشا بھی پورا ہو، اور راہِ راست بھی معقول طریقے سے اس کے سامنے پیش کر دی جائے۔[۶]

مادّی اور اخلاقی زندگی میں نشاناتِ ہدایت کی ضرورت

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (النحل ۔ ۱۶) — اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں۔

یعنی خدا نے ساری زمین بالکل یکساں بنا کر نہیں رکھ دی بلکہ ہر خطّے کو مختلف امتیازی علامات (Land marks) سے ممتاز کیا۔ اس کے بہت سے فوائد کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے راستے اور منزلِ مقصود کو الگ پہچان لیتا ہے۔ اس نعمت کی قدر آدمی کو اُس وقت معلوم ہوتی ہے، جبکہ

اسے کبھی ایسے ریگستانی علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہو جہاں اس طرح کے امتیازی نشانات تقریباً مفقود ہوتے ہیں اور آدمی ہر وقت بھٹک جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر بحری سفر میں آدمی کو اس عظیم نعمت کا احساس ہوتا ہے، کیونکہ وہاں نشاناتِ راہ بالکل ہی مفقود ہوتے ہیں۔ لیکن صحراؤں اور سمندروں میں بھی اس نے انسان کی رہنمائی کا ایک فطری انتظام کر رکھا ہے۔ اور وہ ہیں تارے جنہیں دیکھ دیکھ کر انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک اپنا راستہ معلوم کرتا رہا ہے۔

یہاں پھر توحید اور رحمت و ربوبیت کی دلیلوں کے درمیان ایک لطیف اشارہ دلیلِ رسالت کی طرف کر دیا گیا ہے۔ اس مقام کو پڑھتے وقت ذہن خود بخود اس مضمون کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جس خدا نے تمہاری مادّی زندگی میں تمہاری رہنمائی کے لیے یہ کچھ انتظامات کیے ہیں، کیا وہ تمہاری اخلاقی زندگی سے اتنا بے پروا ہو سکتا ہے کہ یہاں تمہاری ہدایت کا کچھ بھی انتظام نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ مادّی زندگی میں بھٹک جانے کا بڑے سے بڑا نقصان بھی اخلاقی زندگی میں بھٹکنے کے نقصانات سے بدرجہا کم ہے۔ پھر جس ربِّ رحیم کو ہماری فلاح کی اتنی فکر ہے کہ پہاڑوں میں ہمارے لیے راستے بناتا ہے، میدانوں میں نشاناتِ راہ کھڑے کرتا ہے، صحراؤں اور سمندروں میں ہم کو صحیح سمتِ سفر بتانے کے لیے آسمانوں پر قندیلیں روشن کرتا ہے، اُس سے یہ بدگمانی کیسے کی جا سکتی ہے کہ اس نے ہماری اخلاقی فلاح کے لیے کوئی راستہ نہ بنایا ہوگا، اُس راستے کو نمایاں کرنے کے لیے کوئی نشان نہ کھڑا کیا ہوگا، اور اُسے صاف صاف دکھانے کے لیے کوئی سراجِ مُنیر روشن نہ کیا ہوگا؟

انسان کے لیے شعوری رہنمائی کی اہمیت

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۔ (طٰہٰ۔ آیت: ۵۰)	موسیٰؑ نے فرعون کو جواب دیا، ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا۔

یعنی دُنیا کی ہر شے جیسی کچھ بھی بنی ہوئی ہے، اُسی کے بنانے سے بنی ہے۔ ہر چیز کو جو بناوٹ، جو شکل و صورت، جو قوت و صلاحیت، اور جو صفت و خاصیت حاصل ہے، اُسی کے عطیے اور بخشش کی بدولت حاصل ہے۔ ہاتھ کو دُنیا میں اپنا کام کرنے کے لیے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اُس کو دے دی، اور پاؤں کو جو مناسب ترین ساخت درکار تھی وہ اُس کو بخشی۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی، روشنی، ہر ایک چیز کو اُس نے وہ صورتِ خاص عطا کی ہے جو اُسے کائنات میں اپنے حصّے کا کام ٹھیک طور پر انجام دینے کے لیے مطلوب تھی۔

پھر اُس نے صرف یہی نہیں کیا کہ ہر چیز کو اس کی مخصوص بناوٹ دے کر یونہی چھوڑ دیا ہو۔ بلکہ اُس کے بعد وہی ان سب چیزوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کا طریقہ اُس نے نہ سکھایا ہو۔ کان کو سُننا اور آنکھ کو دیکھنا اُسی نے سکھایا ہے۔ مچھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اُڑنا

اُسی کی تعلیم سے آیا ہے۔ درخت کو پھل پھول دینے اور زمین کو نباتات اُگانے کی ہدایت اُسی نے دی ہے۔ غرض وہ ساری کائنات اور اُس کی ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں ہادی اور مُعلّم بھی ہے۔

مزید برآں اِسی ذرا سے فقرے میں حضرت موسیٰؑ نے اشارۃً رسالت کی دلیل بھی پیش کر دی جس کے ماننے سے فرعون کو انکار تھا۔ ان کی دلیل میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا ہادی ہے، اور جو ہر چیز کو اُس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت دے رہا ہے، اس کے عالمگیر منصبِ ہدایت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی شعوری زندگی کے لیے رہنمائی کی وہ شکل نہ اختیار کرے، جو مچھلی اور مُرغی کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے۔ اُس کی موزوں ترین شکل یہ ہے کہ ایک ذی شعور انسان اُس کی طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہو اور وہ اُن کی عقل و شعور کو اپیل کر کے اُنہیں سیدھا راستہ بتائے۔[۵]

فصل ۴

پیغمبری کیا ہے؟

دنیا میں انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اللہ نے اُن سب کا انتظام خود ہی کر دیا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کتنا سامان اس کو دے کر دنیا میں بھیجا جاتا ہے؟ دیکھنے کے لیے آنکھیں، سُننے کے لیے کان، سُونگھنے اور سانس لینے کے لیے ناک۔ محسوس کرنے کے لیے سارے جسم کی کھال میں قوتِ لامسہ۔ چلنے کے لیے پاؤں۔ کام کرنے کے لیے ہاتھ۔ سوچنے کے لیے دماغ۔ اور ایسی ہی بے شمار دوسری چیزیں جو پہلے سے اس کی سب ضرورتوں کا لحاظ کر کے اس کے چھوٹے سے جسم میں لپیٹ کر رکھ دی گئی ہیں۔ پھر جب وہ دنیا میں قدم رکھتا ہے تو زندگی بسر کرنے کے لیے اتنا سامان اس کو ملتا ہے جس کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہوا ہے، روشنی ہے، حرارت ہے، پانی ہے، زمین ہے، ماں کے سینے میں پہلے سے دُودھ موجود ہے، ماں اور باپ اور عزیزوں حتیٰ کہ غیروں کے دلوں میں اس کے لیے محبت اور شفقت پیدا کر دی گئی ہے جس سے اس کو پالا پوسا جاتا ہے۔ پھر جتنا جتنا وہ بڑھتا جاتا ہے اس کی ضرورتوں کو پُورا کرنے کے لیے ہر قسم کا سامان اس کو ملتا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا زمین و آسمان کی ساری قوتیں اس کی پرورش اور خدمت کے لیے کام کر رہی ہیں۔

دُنیا میں کام کرنے کے لیے جتنی قابلیتوں کی ضرورت ہے وہ سب انسانوں کو دی گئی ہیں۔ جسمانی قوت، عقل، سمجھ بوجھ، گویائی اور ایسی ہی بہت سی قابلیتیں تھوڑی یا بہت ہر انسان میں موجود ہیں لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے عجیب انتظام کیا ہے۔ ساری قابلیتیں سب انسانوں کو یکساں نہیں دیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی کسی کا محتاج نہ ہوتا۔ نہ کوئی کسی کی پروا کرتا۔ اس لیے اللہ نے تمام انسانوں کی مجموعی ضرورتوں کے لحاظ سے سب قابلیتیں پیدا تو انسانوں ہی میں کیں، مگر اس طرح کہ کسی کو ایک قابلیت زیادہ دے دی اور کسی دوسرے کو کوئی دوسری قابلیت۔ بعض لوگ جسمانی محنت کی قوتیں دوسروں سے زیادہ لے کر آتے ہیں۔ بعض لوگوں میں کسی خاص ہُنر یا پیشہ کی پیدائشی قابلیت ہوتی ہے جس سے دوسرے محروم ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں میں ذہانت اور عقل کی قوت دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ بعض پیدائشی سپہ سالار ہوتے ہیں۔ بعض میں حکمرانی کی خاص قابلیت ہوتی ہے۔ بعض تقریر کی

غیر معمولی قوّت لے کر پیدا ہوتے ہیں بعض میں انشا پردازی کا فطری ملکہ ہوتا ہے۔ کوئی ایسا شخص پیدا ہوتا ہے کہ اس کا دماغ ریاضی میں خوب لڑتا ہے حتیٰ کہ اس فن کے بڑے بڑے پیچیدہ سوالات اس طرح حل کر دیتا ہے کہ دوسروں کے ذہن وہاں تک نہیں پہنچتے۔ ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو عجیب عجیب چیزیں ایجاد کرتا ہے اور اس کی ایجادوں کو دیکھ کر دُنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک اور شخص ایسا بے نظیر قانونی دماغ لے کر آتا ہے کہ قانون کے جو نکتے برسوں غور کرنے کے بعد بھی دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتے اُس کی نظر خود بخود اُن تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ خدا کی دین ہے۔ کوئی شخص اپنے اندر خود یہ قابلیتیں[1] پیدا نہیں کر سکتا۔ نہ تعلیم و تربیت سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ دراصل یہ پیدائشی قابلیتیں ہیں اور خدا اپنی حکمت سے جس کو یہ چیزیں چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔

انسانی تمدّن کے لیے جن قابلیتوں کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، وہ زیادہ انسانوں میں پیدا کی جاتی ہیں۔ اور جن کی ضرورت جس قدر کم ہوتی ہے وہ اسی قدر کم آدمیوں میں پیدا کی جاتی ہیں۔ سپاہی بہت پیدا ہوتے ہیں۔ کسان اور بڑھئی اور لوہار اور ایسے ہی دوسرے کاموں کے آدمی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر علمی و دماغی قوتیں رکھنے والے اور سیاست اور سپہ سالاری کی قابلیتیں رکھنے والے کم پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہ لوگ اور بھی زیادہ کم یاب ہوتے ہیں جو کسی خاص فن میں غیر معمولی قابلیّت کے مالک ہوں۔ کیونکہ ان کے کارنامے صدیوں کے لیے انسانوں کو اپنے جیسے ماہرِ فن کی ضرورت سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔

انسانی زندگی کی اہم ترین ضرورت

اب سوچنا چاہیے کہ دنیا میں انسانی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے صرف یہی ایک ضرورت تو نہیں ہے کہ انسانوں میں انجینئر، ریاضی دان، سائنسدان، قانون دان، سیاست کے ماہر، معاشیات کے باکمال اور مختلف پیشوں کی قابلیت رکھنے والے لوگ ہی پیدا ہوں۔ ان سب سے بڑھ کر ایک اور ضرورت بھی تو ہے اور وہ یہ کہ کوئی ایسا ہو جو انسان کو خدا کا راستہ بتائے۔ دوسرے لوگ تو صرف یہ بتانے والے ہیں کہ اِس دنیا میں انسان کے لیے کیا ہے اور اس کو کس کس طرح برتا جا سکتا ہے۔ مگر کوئی یہ بتانے والا بھی تو ہونا چاہیے کہ انسان خود کس کے لیے ہے؟ اور انسان کو دنیا میں یہ سب سامان کس نے دیا ہے؟ اور اس دینے والے کی مرضی کیا ہے تاکہ انسان اسی کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کر کے یقینی اور دائمی کامیابی حاصل کرے؟ یہ انسان کی اصلی اور سب سے بڑی

---

[1] مراد ہیں غیر معمولی درجے کی قابلیتیں۔ معمولی درجے کی قابلیتیں تعلیم و تربیت یا مشق و تمرین سے نشو و نما پا سکتی ہیں۔ غیر معمولی قابلیتیں بسا اوقات بغیر کسی تربیت کے، اور کبھی معمولی درجے کی تربیت سے اُبھر آتی ہیں۔ اور اگر اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت سے ان کی آبیاری ہو تو وہ بہت بلند معیار تک پہنچ جاتی ہیں۔ (مُرتّبین)

ضرورت ہے۔اور عقل یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ جس خدا نے ہماری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیا ہے اُس نے ایسی اہم ضرورت کو پورا کرنے سے غفلت برتی ہوگی۔نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔

رسُولوں کا منصب

خدا نے جس طرح ایک ایک ہنر اور ایک ایک علم وفن کی خاص قابلیت رکھنے والے انسان پیدا کیے ہیں، اسی طرح ایسے انسان بھی پیدا کیے ہیں جن میں خود خدا کو پہچاننے کی اعلیٰ قابلیت تھی۔اس نے ان کو دین اور اخلاق اور شریعت کا علم اپنے پاس سے عطا کیا۔اور ان کو اس خدمت پر مقرر کیا کہ دوسرے لوگوں کو ان چیزوں کی تعلیم دیں یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہماری زبان میں نبی یا رسول یا پیغمبر کہا جاتا ہے۔

پیغمبر کی پہچان

جس طرح دوسرے علُوم وفنون کے باکمال لوگ ایک خاص قسم کا ذہن اور ایک خاص قسم کی طبیعت لے کر پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح پیغمبر بھی ایک خاص قسم کی طبیعت لے کر آتے ہیں۔

ایک پیدائشی شاعر کا کلام سُنتے ہی ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شاعری کی خاص قابلیت لے کر پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ دوسرے لوگ خواہ کتنی ہی کوشش کریں ویسا شعر نہیں کہہ سکتے۔اسی طرح ایک پیدائشی مقرر، ایک پیدائشی انشا پرداز، ایک پیدائشی مُوجد، ایک پیدائشی لیڈر بھی اپنے کارناموں سے صاف پہچان لیا جاتا ہے۔کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے کام میں غیر معمولی قابلیت کا اظہار کرتا ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتی۔ایسا ہی حال پیغمبر کا بھی ہے۔ اس کے ذہن میں وہ باتیں آتی ہیں جو دوسرے لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتیں۔وہ ایسے مضامین بیان کرتا ہے جو اس کے سوا کوئی دوسرا انسان بیان نہیں کر سکتا۔اس کی نظر ایسی باریک باتوں تک خود بخود پہنچ جاتی ہے جن تک دوسروں کی نظر برسوں کے غور وفکر کے بعد بھی نہیں پہنچتی۔وہ جو کچھ کہتا ہے ہماری عقل اس کو قبول کرتی ہے۔ہمارا دل اس کی گواہی دیتا ہے کہ ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے۔دنیا کے تجربات اور کائنات کے مشاہدوں سے اس کی ایک ایک بات سچی ثابت ہوتی ہے۔لیکن اگر ہم خود ویسی بات کہنا چاہیں تو نہیں کہہ سکتے۔پھر اس کی طبیعت ایسی پاکیزہ ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملہ میں سچا اور شریفانہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔وہ کبھی کوئی غلط بات نہیں کہتا۔کوئی بُرا کام نہیں کرتا۔ہمیشہ نیکی اور صداقت کی تعلیم دیتا ہے۔اور جو کچھ دوسروں سے کہتا ہے اس پر خود عمل کر کے دکھاتا ہے۔اس کی زندگی میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ وہ جو کچھ کہے اس کے خلاف عمل کرے۔اس کے قول یا عمل میں کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی۔وہ دوسروں کے بھلے کی خاطر خود نقصان اٹھاتا ہے اور اپنے بھلے کے لیے دوسروں کا نقصان نہیں کرتا۔اس کی ساری زندگی سچائی، شرافت، پاک طینتی، بلند خیالی اور اعلیٰ درجہ کی انسانیت کا نمونہ ہوتی ہے جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب نظر نہیں آتا۔انہی چیزوں کو دیکھ کر صاف پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ شخص خدا کا سچا پیغمبر ہے۔

پیغمبر کی اطاعت

جب یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص خدا کا سچا پیغمبر ہے تو اس کی بات ماننا، اس کی اطاعت کرنا اور اس کے طریقہ کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ یہ بات بالکل خلافِ عقل ہے کہ ایک شخص کو پیغمبر بھی تسلیم کیا جائے اور پھر اس کی بات بھی نہ مانی جائے۔ اِس لیے کہ پیغمبر تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مان لیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے خدا کی طرف سے کہہ رہا ہے اور جو کچھ کر رہا ہے خدا کی مرضی کے مطابق کر رہا ہے۔ اب ہم جو کچھ اس کے خلاف کہیں گے یا کریں گے وہ خدا کے خلاف ہوگا۔ اور جو بات خدا کے خلاف ہو وہ کبھی حق نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کسی کو پیغمبر تسلیم کرنے سے یہ بات خود بخود لازم ہو جاتی ہے کہ اس کی بات کو بے چون وچرا مان لیا جائے۔ اور اس کے حکم کے آگے سر جھکا دیا جائے خواہ اس کی حکمت اور اس کا فائدہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جو بات پیغمبر کی طرف سے ہے اُس کا پیغمبر کی طرف سے ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سچی ہے اور تمام مصلحتیں اور حکمتیں اس میں موجود ہیں۔ اگر ہماری سمجھ میں کسی بات کی مصلحت نہیں آتی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اُس بات میں کوئی خرابی ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خود ہماری سمجھ میں کوئی خرابی ہے۔

جو شخص کسی فن کا ماہر نہیں ہے، ظاہر ہے کہ وہ اُس فن کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتا لیکن وہ کتنا بے وقوف ہوگا اگر وہ ماہرِ فن کی بات کو محض اس وجہ سے نہ مانے کہ اس کی سمجھ میں وہ بات نہیں آتی۔ دیکھو، دنیا کے ہر کام میں اس کے ماہر کی ضرورت ہوتی ہے، اور ماہر کی طرف رجوع کرنے کے بعد اس پر پُورا بھروسہ کیا جاتا ہے اور اس کے کام میں دخل نہیں دیا جاتا، کیوں کہ سب لوگ سب کاموں کے ماہر نہیں ہو سکتے اور نہ دُنیا بھر کی تمام چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی تمام عقل اور ہوشیاری صرف یہ اطمینان حاصل کرنے میں صرف کرنی چاہیے کہ ایک شخص ماہرِ فن ہے یا نہیں۔ پھر جب کسی کے متعلق ہمیں معلوم ہو جائے کہ وہ ایک بہترین ماہرِ فن ہے تو اس پر ہم کو کامل بھروسہ کرنا چاہیے، پھر اس کے کاموں میں دخل دینا اور ایک ایک بات کے متعلق یہ کہنا کہ پہلے ہمیں سمجھا دو ورنہ ہم نہ مانیں گے، عقلمندی نہیں بلکہ سراسر بے وقوفی ہے۔ کسی وکیل کو مقدمہ سپرد کرنے کے بعد آپ ایسی حجّتیں کریں گے تو وہ آپ کو اپنے دفتر سے نکال دے گا۔ کسی ڈاکٹر سے اس کی ایک ایک ہدایت پر دلیل پوچھی جانے لگے تو وہ مریض کا علاج چھوڑ دے گا۔ ایسا ہی معاملہ مذہب کا بھی ہے۔ ہمیں خدا کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ ہمارے پاس خود ان چیزوں کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ خدا کے سچے پیغمبر کی تلاش کریں۔ اس تلاش میں ہم کو بلا شبہ نہایت ہوشیاری اور سمجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ اگر کسی غلط آدمی کو ہم نے پیغمبر سمجھ لیا تو وہ ہمیں غلط راستہ پر لگا دے گا۔ مگر جب ہمیں خوب جانچ پڑتال کرنے کے بعد یہ یقین ہو جائے کہ فلاں شخص خدا کا سچا پیغمبر ہے تو اس پر ہمیں پُورا اعتماد کرنا چاہیے اور اس کے ہر حکم

کی اطاعت کرنی چاہیے۔

پیغمبروں پر ایمان لانے کی ضرورت

جب یہ معلوم ہو گیا کہ سچا اور سیدھا راستہ وہی ہے جو خدا کا پیغمبر بتائے تو یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ پیغمبر پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت اور پیروی کرنا تمام انسانوں کے لیے ضروری ہے، اور جو شخص پیغمبر کے طریقے کو چھوڑ کر خود اپنی عقل سے کوئی طریقہ نکالتا ہے وہ یقیناً گمراہ ہے۔

اس معاملہ میں لوگ عجیب عجیب غلطیاں کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو پیغمبر کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر نہ اس پر ایمان لاتے ہیں نہ اس کی پیروی قبول کرتے ہیں۔ یہ صرف کافر ہی نہیں احمق بھی ہیں۔ آدمی جان بُوجھ کر جھوٹ کی پیروی کرے، ظاہر ہے اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں پیغمبر کی پیروی کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم خود اپنی عقل سے حق کا راستہ معلوم کر لیں گے۔ یہ بھی سخت غلطی ہے۔ جس کسی نے ریاضی پڑھی ہے وہ یہ جانتا ہے کہ ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک سیدھا خط صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنے بھی خط کھینچے جائیں گے وہ سب یا تو ٹیڑھے ہوں گے یا اس دُوسرے نقطے تک نہ پہنچیں گے۔ ایسی ہی کیفیت حق کے راستے کی بھی ہے جس کو اسلام کی زبان میں صراطِ مستقیم (یعنی سیدھا راستہ) کہا جاتا ہے۔ یہ راستہ انسان سے شروع ہو کر خدا تک جاتا ہے۔ اور ریاضی کے اسی قاعدہ کے مطابق یہ بھی ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنے راستے ہونگے یا تو سب ٹیڑھے ہونگے یا خدا تک نہ پہنچیں گے۔ اب ذرا اس بات پر غور کریں کہ جو سیدھا راستہ ہے وہ تو پیغمبر نے بتا دیا اور اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ صراطِ مستقیم ہے ہی نہیں۔ اس راستہ کو چھوڑ کر جو شخص خود کوئی راستہ تلاش کرے گا، اس کو دو صُورتوں میں سے کوئی ایک صورت ضرور پیش آئے گی۔ یا تو اس کو خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ ملے گا ہی نہیں یا اگر ملا بھی تو بہت پھیر کا راستہ ہو گا۔ خطِ مستقیم نہ ہو گا بلکہ خطِ مُنحنی ہو گا۔ پہلی صورت میں تو اُس کی تباہی ظاہر ہے۔ رہی دوسری صُورت تو اُس کے بھی حماقت ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بے عقل جانور بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے خطِ مُنحنی کو چھوڑ کر خطِ مستقیم ہی اختیار کرتا ہے۔ پھر اُس انسان کو کیا کہا جائے جس کو خدا کا ایک نیک بندہ سیدھا راستہ بتائے اور وہ کہے کہ نہیں میں تیرے بتائے ہوئے راستے پر نہیں چلوں گا بلکہ خود ٹیڑھے راستوں پر بھٹک بھٹک کر منزلِ مقصود تلاش کر لُوں گا۔

یہ تو وہ بات ہے جو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر زیادہ غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو شخص پیغمبر پر ایمان لانے سے انکار کرتا ہے اس کو خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ بھی نہیں مل سکتا، نہ ٹیڑھا نہ سیدھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص سچے آدمی کی بات ماننے سے انکار کرتا ہے اس کے دماغ میں ضرور کوئی ایسی خرابی ہوگی

جس کے سبب سے وہ سچائی سے مُنہ موڑتا ہے۔ یا تو اس کی سمجھ بوجھ ناقص ہوگی، یا اس کے دل میں تکبّر ہوگا، یا اس کی طبیعت ایسی ٹیڑھی ہوگی کہ وہ نیکی اور صداقت کی باتوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوگی، یا وہ باپ دادا کی اندھی تقلید میں گرفتار ہوگا اور جو غلط باتیں رسم کے طور پر پہلے سے چلی آتی ہیں ان کے خلاف کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا، یا وہ اپنی خواہشات کا بندہ ہوگا پیغمبر کی تعلیم کو ماننے سے اس لیے انکار کرے گا کہ اس کے مان لینے کے بعد گناہوں اور ناجائز باتوں کی آزادی باقی نہیں رہتی۔ یہ تمام اسباب ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی سبب بھی کسی شخص میں موجود ہو تو اس کو خدا کا راستہ ملنا غیر ممکن ہے۔ اور اگر کوئی سبب موجود نہ ہو تو یہ ناممکن ہے کہ ایک سچا غیر متعصب اور نیک آدمی ایک سچے پیغمبر کی تعلیم قبول کرنے سے انکار کر دے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پیغمبر خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوتا ہے اور خدا ہی کا یہ حکم ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کی اطاعت کرو۔ اب جو کوئی پیغمبر پر ایمان نہیں لاتا وہ خدا کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ ہم انسان جس سلطنت کی رعیت ہوں اس کی طرف سے جو حاکم بھی مقرر ہوگا ہمیں اس کی اطاعت کرنی پڑیگی۔ اگر ہم اس کو حاکم تسلیم کرنے سے انکار کرینگے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے خود سلطنت کے خلاف بغاوت کی ہے۔ سلطنت کو ماننا اور اس کے مقرر کیے ہوئے حاکم کو نہ ماننا دونوں بالکل متضاد باتیں ہیں۔ ایسی ہی مثال خدا اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی بھی ہے۔ خدا تمام انسانوں کا حقیقی بادشاہ ہے۔ جس شخص کو اس نے انسان کی ہدایت کے لیے بھیجا ہو اور اس کی اطاعت کا حکم دیا ہو، ہر انسان کا فرض ہے کہ اس کو پیغمبر تسلیم کرے اور ہر دوسری چیز کی پیروی چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی اختیار کرے۔ اس سے مُنہ موڑنے والا بہرحال کافر ہے خواہ وہ خدا کو مانتا ہو یا نہ مانتا ہو۔

تاریخِ سلسلۂ نبوّت ایک نظر میں

اب دیکھیے کہ نوعِ انسانی میں پیغمبری کا سلسلہ کس طرح شروع ہوا اور کس طرح ترقی کرتے کرتے ایک آخری اور سب سے بڑے پیغمبر پر ختم ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ایک انسان کو پیدا کیا۔ پھر اسی انسان سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اس جوڑے کی نسل چلائی۔ جو بے شمار صدیوں میں پھیلتے پھیلتے تمام روئے زمین پر چھا گئی۔ دنیا میں جتنے انسان بھی پیدا ہوئے ہیں وہ سب اسی ایک جوڑے کی اولاد ہیں۔ تمام قوموں کی مذہبی اور تاریخی روایات متفق ہیں کہ نوعِ انسانی کی ابتدا ایک ہی انسان سے ہوئی ہے۔ سائنس کی تحقیقات سے بھی ثابت نہیں ہوا کہ زمین کے مختلف حصوں میں الگ الگ انسان بنائے گئے تھے۔ بلکہ سائنس کے اکثر علماء بھی یہی قیاس کرتے ہیں کہ پہلے ایک ہی انسان پیدا ہوا ہوگا اور انسان کی موجودہ نسل دنیا میں جہاں کہیں بھی پائی جاتی ہے اسی ایک شخص کی اولاد ہے۔

ہماری زبان میں اُس پہلے انسان کو آدمؑ کہتے ہیں۔ اسی سے لفظ آدمی نکلا ہے جو انسان کا ہم معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا پیغمبر حضرت آدمؑ ہی کو بنایا، اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنی اولاد کو اسلام کی تعلیم دیں یعنی ان کو یہ بتائیں کہ تمہارا اور تمام دنیا کا خدا ایک ہے، اُسی کی تم عبادت کرو، اسی کے آگے سر جھکاؤ، اسی سے مدد مانگو اور اُسی کی مرضی کے مطابق دنیا میں نیکی اور انصاف کی زندگی بسر کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم کو اچھا انعام ملے گا۔ اور اگر اس کی اطاعت سے منہ موڑو گے تو بُری سزا پاؤ گے۔

حضرت آدمؑ کی اولاد میں جو لوگ اچھے تھے وہ اپنے باپ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلتے رہے، مگر جو لوگ بُرے تھے انہوں نے اُسے چھوڑ دیا۔ رفتہ رفتہ ہر قسم کی بُرائیاں پیدا ہوگئیں۔ کسی نے سورج اور چاند اور تاروں کو پوجنا شروع کر دیا۔ کسی نے درختوں اور جانوروں اور دریاؤں کی پرستش شروع کر دی۔ کسی نے خیال کیا کہ ہوا اور پانی اور آگ، اور بیماری و تندرستی، اور قدرت کی دوسری نعمتوں اور قوتوں کے خدا الگ الگ ہیں ہر ایک کی پرستش کرنی چاہیے تاکہ سب خوش ہو کر ہم پر مہربان ہوں۔ اِسی طرح جہالت کی وجہ سے شرک اور بُت پرستی کی بہت سی صورتیں پیدا ہوگئیں جن سے بیسیوں مذہب نکل آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حضرت آدمؑ کی نسل دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل چکی تھی مختلف قومیں بن گئی تھیں۔ ہر قوم نے اپنا ایک نیا مذہب بنا لیا تھا۔ اور ہر ایک کی رسمیں الگ تھیں۔ خدا کو بھولنے کے ساتھ لوگ اُس قانون کو بھی بھول گئے تھے جو حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد کو سکھایا تھا۔ لوگوں نے خود اپنی خواہشات کی پیروی شروع کر دی۔ ہر قسم کی بُری رسمیں پیدا ہوئیں ہر قسم کے جاہلانہ خیالات پھیلے۔ اچھے اور بُرے کی تمیز میں غلطیاں کی گئیں۔ بہت سی بُری چیزیں اچھی سمجھ لی گئیں اور بہت سی اچھی چیزوں کو بُرا ٹھیرا لیا گیا۔[۹]

اس سلسلے میں قرآن مجید کی یہ آیت حقیقتِ نبوّت پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ۔ (البقرہ - ۲۱۳)

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کجروی کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں ان لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا (نہیں)، اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں

حق کا علم دیا جا چکا تھا، انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔[1]

ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بنیاد پر "مذہب" کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا اُس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسلِ آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک اُمت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ اِس وجہ سے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی۔ بلکہ اس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہشمند تھے۔ اسی خرابی کو دُور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور اپنی ایک نئی اُمت بنا لے۔ بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہِ حق کو واضح کر کے انہیں پھر سے ایک اُمت بنا دیں۔[1]

پیغمبروں کا کام

پیغمبروں نے اپنی اپنی قوموں کو بھُولا ہُوا سبق یاد دلایا۔ انہیں ایک خدا کی پرستش سکھائی۔ شرک اور بُت پرستی سے روکا۔ جاہلانہ رسموں کو توڑا۔ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتایا اور صحیح قوانین بتا کر اُن کی پیروی کی ہدایت کی۔ ہندوستان، چین، عراق، ایران، مصر، افریقہ، یورپ، غرض دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں خدا کی طرف سے اس کے سچے پیغمبر نہ آئے ہوں۔ ان سب کا مذہب ایک ہی تھا اور وہ یہی مذہب تھا جس کو ہم اپنی زبان میں اسلام کہتے ہیں۔[2] البتہ تعلیم کے طریقے اور زندگی کے قوانین ذرا مختلف تھے۔ ہر قوم میں جس قسم کی جہالت پھیلی ہوئی

---

[1] کان الناس امۃ واحدۃ کے بعد اختلاف کے ظہور کا تذکرہ محذوف ہے۔ اسے آیت کے آخر میں واضح کر دیا گیا ہے۔ (مرتبین)

[2] عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلام کی ابتدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی ہے یہاں تک کہ آنحضرت کو بانیٔ اسلام تک کہہ دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جسے ذہن سے قطعی طور پر نکال دینا چاہیے۔ ہر طالب علم کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اسلام ہمیشہ سے نوعِ انسانی کا ایک ہی حقیقی مذہب ہے اور دنیا میں جب اور جہاں بھی کوئی پیغمبر خدا کی طرف سے آیا ہے وہ یہی مذہب لے کر آیا ہے۔ (مؤلف)

تھی اُسی کو دُور کرنے پر زور دیا گیا جس قسم کے غلط خیالات رائج تھے اُنہی کی اصلاح پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ تہذیب و تمدّن اور علم و عقل کے لحاظ سے جب قومیں ابتدائی درجہ میں تھیں تو ان کو سادہ تعلیم اور سادہ شریعت دی گئی۔ جیسی جیسی ترقی ہوتی گئی تعلیم اور شریعت کو بھی وسیع کیا جاتا رہا۔ مگر یہ اختلاف صرف ظاہری شکلوں میں تھا۔ روح سب کی ایک تھی، یعنی اعتقاد میں توحید، اعمال میں نیکی و سلامت روی، اور آخرت کی جزا و سزا پر یقین۔

پیغمبروں کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا؟

پیغمبروں کے ساتھ بھی انسان نے عجیب معاملہ کیا۔ پہلے تو اُن کو تکلیفیں دی گئیں۔ ان کی ہدایت کو ماننے سے انکار کیا گیا۔ کسی کو وطن سے نکالا گیا۔ کسی کو قتل کیا گیا۔ کسی کو عمر بھر کی تعلیم و تلقین کے بعد مشکل سے پانچ دس پیرو میسّر آسکے۔ مگر خدا کے برگزیدہ بندے برابر کام کیے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کی تعلیمات نے اثر کیا اور بڑی بڑی قومیں اُن کی پیرو بن گئیں۔ اس کے بعد گمراہی نے دوسری صورت اختیار کی۔ پیغمبروں کی وفات کے بعد اُن کی اُمّتوں نے ان کی تعلیمات کو بدل ڈالا۔ ان کی لائی ہوئی کتابوں میں اپنی طرف سے ہر قسم کے خیالات ملا دیئے۔ عبادتوں کے نئے نئے طریقے اختیار کیے۔ بعضوں نے خود پیغمبروں کی پرستش شروع کر دی۔ کسی نے اپنے پیغمبر کو خدا کا اوتار قرار دیا (یعنی یہ کہ خدا خود انسان کی شکل میں اُتر آیا تھا)۔ کسی نے اپنے پیغمبر کو خدا کا بیٹا کہا۔ کسی نے اپنے پیغمبر کو خدائی میں شریک ٹھیرایا۔ غرض انسان نے عجیب ستم ظریفی کی کہ جن لوگوں نے بتوں کو توڑا تھا انسان نے خود ان ہی کو بُت بنا لیا۔ پھر جو شریعتیں یہ پیغمبر اپنی اُمّتوں کو دے گئے تھے ان کو بھی طرح طرح سے بگاڑا گیا۔ ان میں ہر قسم کی جاہلانہ رسمیں ملا دی گئیں۔ افسانوں اور جھوٹی روایتوں کی آمیزش کر دی گئی۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو ان کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ چند صدیوں کے بعد یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہا کہ پیغمبر کی اصل تعلیم اور اصل شریعت کیا تھی۔ اور بعد والوں نے اس میں کیا کیا ملا دیا[1]۔ خود پیغمبروں کی زندگی کے حالات بھی روایتوں میں ایسے گم ہو گئے کہ اُن کے متعلق کوئی چیز بھی قابلِ اعتبار نہ رہی۔

تاہم پیغمبروں کی کوششیں سب کی سب رائیگاں نہیں گئیں۔ تمام ملاوٹوں کے باوجود کچھ نہ کچھ اصل صداقت ہر قوم میں باقی رہ گئی۔ خدا کا خیال اور آخرت کی زندگی کا خیال کسی نہ کسی صورت میں تمام قوموں کے اندر پھیل گیا۔ نیکی اور سچائی اور اخلاق کے چند اصول عام طور پر دنیا میں تسلیم کر لیے گئے اور تمام قوموں کے پیغمبروں نے الگ الگ ایک ایک قوم کو اس حد تک تیار کر دیا کہ دُنیا میں ایک ایسے مذہب کی تعلیم پھیلائی جا سکے جو بلا امتیاز ساری نوعِ انسانی کا مذہب ہو[2]۔

---

[1] پیغمبروں کی اُمّتوں نے اِسی طرح اپنے اصل مذہب (یعنی اسلام) کو بگاڑ کر وہ مذہب بنائے ہیں جو اِس وقت مختلف ناموں سے دنیا میں پائے جاتے ہیں، مثلاً عیسیٰ علیہ السلام نے جس مذہب کی تعلیم دی تھی، وہ تو اسلام ہی تھا، مگر ان کے بعد ان کے پیرؤوں نے خود حضرت عیسیٰؑ کو معبود بنا ڈالا اور ان کی دی ہوتی تعلیم کے ساتھ کچھ دوسری باتیں ملا جُلا کر وہ مذہب ایجاد کر لیا جس کا نام آج عیسائیت ہے۔ (مؤلف)

فصل ۵

انبیاء کی مشترک دعوت اور اُن کا منصب

قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے :

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"

بابل کی سرزمین ہو، یا ارضِ سدوم، یا ملکِ مَدیَن، یا حِجر کا علاقہ، یا نیل کی وادی۔ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو یا بیسویں یا دسویں۔ غلام قوم ہو یا آزاد، خستہ و درماندہ ہو یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے بامِ عروج پر۔ غرض ہر جگہ، ہر دَور میں، ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے رہبروں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی اِلٰہ (معبودِ حقیقی یا خدا) نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے پاس جا کر اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کا مطالبہ کرنے سے پہلے اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا اعلان کیا، اور هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى کی دعوت دی، اور اسے آگاہ کیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى [1]۔ حضرت عیسیٰؑ نے جن کی قوم رومیوں کی غلام ہو چکی تھی بنی اسرائیل اور آس پاس کی قوموں کو رومی امپیریلزم کے خلاف جنگِ آزادی کے جھنڈے کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی

---

[1] یعنی حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی دراصل اسی خدمت پر مامور ہوئے تھے جس پر حضرت نوحؑ اور ان کے بعد کے تمام انبیاء سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک مامور ہوتے رہے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ صرف اللہ رب العٰلمین کو اپنا رب اور اِلٰہ مانو اور یہ تسلیم کرو کہ تم کو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں اللہ کے سامنے حاضر ہونا اور اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔ نہ صرف تمہاری فلاح کا بلکہ ہمیشہ سے تمام انسانوں کی فلاح کا انحصار اسی ایک بات پر رہا ہے کہ اس عقیدۂ توحید و آخرت کی دعوت کو جسے ہر زمانے میں خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا ہے، قبول کیا جائے اور اپنا پورا نظامِ زندگی اسی بنیاد پر قائم کر لیا جائے۔ (مؤلف) ۱۲

طرف دی کہ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۔ظاہر ہے کہ یہ واقعات جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں کسی اور دنیا کے نہیں، اِسی دنیا کے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی، معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی پس جب یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر رہنما نے ہر ملک اور ہر زمانہ میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظر انداز کر کے اِسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ اُمّ المسائل تھا اور وہ اِسی کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے[۱۳]

حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے ان کو بتایا کہ ان کی بعثت کی غرض کیا ہے:

وَلِاُحِلَّ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْکُمْ وَجِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۔ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ، هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۔ (آل عمران - ۵۰-۵۱)	"اور مَیں اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں دیکھو، مَیں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ۔ لہٰذا تم اُسی کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے:[۱]

ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ، جس کے مقابلے میں بندگی کا رویّہ اختیار کیا جاتا ہے، اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تمدّن کا پُورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلّت و حُرمت اور جواز و عدمِ جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو۔ دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیئے جائیں[۲]

---

[۱] عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر خصوصی توجہ اس لیے ضروری ہے کہ حضورؐ سے پہلے کے انبیاءؑ میں سے وہی آخری نبی تھے اور ان کے پیغام کو مسخ کر دیا گیا۔ (مرتبین)

[۲] ملاحظہ ہو آلِ عمران کی آیت ۵۱ — اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۔

پس درحقیقت حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اور دوسرے انبیاء کے مشن میں یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیتے ہیں، اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے، انہوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اُس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا، اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔[۱۳۹]

قرآن میں انبیاء کے مقصدِ بعثت کو ایک اور انداز سے بھی بیان کیا گیا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ (آیت ۱۶۵)	یہ سارے رسُول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حُجّت نہ رہے۔

یعنی اِن تمام پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک ہی غرض تھی، اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی پر اتمامِ حُجّت کرنا چاہتا تھا تاکہ آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم اُس کے سامنے یہ عُذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور آپ نے ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اسی غرض کے لیے خدا نے دُنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر التعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ یا تو اُس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا، یا اُن لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہِ راست معلوم تھی اور انہوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو انہیں آگاہ نہ کیا۔[۱۴۰]

انبیاء و رُسل داعیٔ حق ہونے کے ساتھ مُطاع بھی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن نے واضح کیا ہے کہ:

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ - (النساء: ۶۴)	ہم نے جو رسُول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔

یعنی خدا کی طرف سے رسُول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اُسی کی پیروی کی جائے، اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر

عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسُول کو رسُول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا[۱۵]

غلبۂ دین کی جد و جہد کرنا بھی انبیاء کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ملاحظہ ہو آیت :

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (التوبہ: ۱۹۰)	وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسُول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے۔

متن میں اَلدِّین کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے جنسِ دین کیا ہے۔ دین کا لفظ عربی زبان میں اُس نظامِ زندگی یا طریقِ زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مُطاع تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے پس بعثتِ رسُول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دینِ حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بعثت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوتی کہ جو نظامِ زندگی لے کر وہ آیا ہے وہ کسی دوسرے نظامِ زندگی کا تابع اور اس سے مغلوب بن کر اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہے۔ بلکہ وہ بادشاہِ ارض و سما کا نمائندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظامِ زندگی دنیا میں رہے بھی تو اُسے خدائی نظام کی بخشی ہوئی گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے جیسا کہ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں ذمیوں کا نظامِ زندگی رہتا ہے[۱۶]

ازالۂ فساد انبیاء کا کام

انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اس حقیقت پر بھی متنبّہ کرتا ہے کہ زمین کے انتظام میں اصل چیز فساد نہیں ہے جس پر صلاح عارض ہوئی ہو بلکہ اصل چیز صلاح ہے جس پر فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی سے عارض ہوتا رہا ہے۔ بالفاظ دیگر یہاں انسان کی زندگی کی ابتدا جہالت و وحشت اور شرک و بغاوت اور اخلاقی بدنظمی سے نہیں ہوئی ہے جس کو دُور کرنے کے لیے بعد میں تدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی الحقیقت انسان کی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے اور بعد میں اس درست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں۔ اسی فساد کو مٹانے اور نظامِ حیات کو ازسرِنو درست کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے اور انہوں نے ہر زمانے میں انسان کو یہی دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس صلاح پر قائم

کیا گیا تھا اس میں فساد برپا کرنے سے باز آؤ۔[1]

دعوائے نبوت اپنے اندر خود ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دراصل پورے نظامِ زندگی کو بحیثیتِ مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کُلّی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے، کیونکہ ربُ العالمین کا نمائندہ کبھی مُطیع اور رعیّت بن کر رہنے کے لیے نہیں آتا بلکہ مُطاع اور راعی بننے ہی کے لیے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حقِ حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیتِ رسالت کے قطعاً منافی ہے۔[2]

رسُولوں کے بھیجنے کی غایت

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (القصص : ۴۷)	(اور یہ ہم نے اس لیے کیا کہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کیے کرتُوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب اُن پر آئے تو وہ کہیں "اے پروردگار، تو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی رسُول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہلِ ایمان میں سے ہوتے۔"

اسی چیز کو قرآن مجید متعدد مقامات پر رسُولوں کے بھیجے جانے کی وجہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اس غرض کے لیے ہر وقت ہر جگہ ایک رسُول آنا چاہیے۔ جب تک دُنیا میں ایک رسُول کا پیغام اپنی صحیح صورت میں موجود ہے اور لوگوں تک اس کے پہنچنے کے ذرائع موجود ہیں، کسی نئے رسُول کی حاجت نہیں رہتی، اِلّا یہ کہ پچھلے پیغام میں کسی اضافے کی اور کوئی نیا پیغام دینے کی ضرورت ہو۔ البتہ جب انبیاء کی تعلیمات محو ہو جائیں، یا گمراہیوں میں خلط ملط ہو کر وسیلۂ ہدایت بننے کے قابل نہ رہیں، تب لوگوں کے لیے یہ عذر پیش کرنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمیں حق و باطل کے فرق سے آگاہ کرنے اور صحیح راہ بتانے کا کوئی انتظام سرے سے موجود ہی نہیں تھا، پھر بھلا ہم کیسے ہدایت پا سکتے تھے۔ اِسی عذر کو

---

[1] اس معاملہ میں قرآن کا نقطۂ نظر اُن لوگوں کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے جنہوں نے ارتقاء کا ایک غلط تصوّر لے کر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بنتی اور بنتی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر بسایا تھا اور ایک صالح نظام سے اس کی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ پھر انسان خود شیطانی رہنمائی قبول کرنے کے بعد بار بار تاریکی میں جاتا رہا اور اس صالح نظام کو بگاڑتا رہا اور خدا بار بار اپنے پیغمبروں کو اس غرض کے لیے بھیجتا رہا کہ اسے تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دیں۔[2]

قطع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے حالات میں نبی مبعوث فرماتا ہے تاکہ اس کے بعد جو شخص بھی غلط راہ پر چلے وہ اپنی کجروی کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے[21]

خدا کی طرف سے رسُول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو بلکہ رسُول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے (جیسا کہ ہم صفحہ ۴۸ پر بیان کر چکے ہیں) کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے، اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی شخص نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسُول کو رسُول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا[22]

فیصلے کے وقت رسُولوں کی بعثت

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا۔ (الکہف: ۵۶)

رسُولوں کو ہم اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجتے کہ وہ بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دے دیں، مگر کافروں کا حال یہ ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہوں نے میری آیات کو اور اُن تنبیہات کو جو انہیں کی گئیں مذاق بنا لیا۔

رسُولوں کو ہم اس لیے بھیجتے ہیں کہ فیصلے کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو فرماں برداری کے اچھے اور نافرمانی کے بُرے انجام سے خبردار کر دیں[23]

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ۔ (آلِ عمران: ۱۹)

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کیے جنہیں کتاب دی گئی تھی، ان کے اس طرزِ عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانہ میں آیا ہے، اس کا دین اسلام ہی تھا اور جو کتاب بھی دُنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی ہے، اُس نے اسلام ہی کی تعلیم دی ہے۔ اس اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی و بیشی کر کے جو بہت سے مذاہب نوعِ انسانی میں رائج کیے گئے، ان کی پیدائش کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حدود سے بڑھ کر حقوق، فائدے اور امتیازات

حاصل کرنے چاہے اور اپنی خواہشات کے مطابق اصل دین کے عقائد، اُصول اور احکام میں ردّ و بدل کر ڈالا۔[۲۴]

جملہ انبیاء ایک ہی دین کے علمبردار تھے۔

وَ تَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ۔ (الانبیاء: ۹۳)

مگر (یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ) انہوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔

دنیا میں جتنے نبی بھی آئے وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے، اور وہ اصل دین یہ تھا کہ صرف ایک اللہ ہی انسان کا رب ہے اور اکیلے اللہ ہی کی بندگی و پرستش کی جانی چاہیے۔ بعد میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے وہ اسی دین کو بگاڑ کر بنا لیے گئے۔ اُس کی کوئی چیز کسی نے لی، اور کوئی دوسری چیز کسی اور نے، اور پھر ہر ایک نے ایک جز اُس کا لے کر بہت سی چیزیں اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا ڈالیں۔ اس طرح یہ بے شمار ملتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ خیال کرنا کہ فلاں نبی فلاں مذہب کا بانی تھا اور فلاں نبی نے فلاں مذہب کی بنا ڈالی، اور انسانیت میں یہ ملتوں اور مذہبوں کا تفرقہ انبیاء کا ڈالا ہوا ہے، محض ایک غلط خیال ہے۔ محض یہ بات کہ یہ مختلف ملتیں اپنے آپ کو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے انبیاء کی طرف منسوب کر رہی ہیں، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ملتوں اور مذہبوں کا اختلاف، انبیاء کا ڈالا ہوا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء دس مختلف مذہب نہیں بنا سکتے تھے اور نہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی بندگی سکھا سکتے تھے۔[۲۵]

بعثت سے پہلے انبیاء کا تفکّر

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اُس کی نوعیّت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی۔ ان کے پاس نزولِ وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعۂ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا: مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ (الشوریٰ ۵) "تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے"۔ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ) "اور اللہ نے تم کو ناواقفِ راہ پایا، پھر تمہیں راستہ بتایا"۔

اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام نبوّت سے پہلے علم و معرفت کے انہی عام ذرائع سے، جو دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں۔ ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے ہوتے تھے۔ وحی آ کر جو کچھ بھی کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر ان کا دل گواہی دیتا تھا، اب انہی کے متعلق وحی یقینی اور قطعی شہادت دے دیتی تھی کہ وہ حق ہیں، اور انہی صداقتوں کا عینی مشاہدہ کرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے وثوق سے دنیا کے سامنے اُن کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون سورۂ ہود میں بتکرار بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے متعلق فرمایا:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰىٓ اِمَامًا وَّ رَحْمَةً۔ (رکوع ۲)	پھر کیا وہ شخص جو پہلے اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا (یعنی عقلی وفطری ہدایت پر) اس کے بعد خدا کی طرف سے ایک گواہ بھی اُس کے پاس آگیا (یعنی قرآن) اور اس سے پہلے موسیٰؑ

کی کتاب بھی رہنما اور رحمت کے طور پر موجود تھی (کیا وہ اِس صداقت کے بارے میں شک کر سکتا ہے؟)

پھر اس کے بعد یہی مضمون رکوع ۳ میں حضرت نوحؑ کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ۔	اے میری قوم کے لوگو! غور تو کرو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا، اور اس کے بعد اُس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت (وحی ونبوت) سے بھی نوازا، اور وہ چیز تم کو

نظر نہیں آتی، تو اب کیا ہم اسے زبردستی تمہارے سر چپیک دیں؟

پھر اسی مضمون کو چھٹے رکوع میں حضرت صالحؑ اور آٹھویں رکوع میں حضرت شعیبؑ دُہراتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے حقیقت کا براہِ راست علم پانے سے پہلے انبیاء علیہم السلام مشاہدے اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر استعمال کر کے (جسے اوپر کی آیات میں بَيِّنَةٍ مِّنَ الرَّبِّ سے تعبیر کیا گیا ہے)، توحید و معاد کی حقیقتوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اور اُن کی یہ رسائی وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انہیں علمِ وحی عطا کرتا تھا، اور یہ چیز کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی تھی۔ یہ مشاہدۂ آثار، اور غور و فکر، اور عقلِ عام (Common Sensce) کا استعمال ان قیاس آرائیوں اور اُس خرص و تخمین (Speculation) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے جس کا ارتکاب فلاسفہ کیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر قرآن مجید ہر انسان کو خود آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اس سے کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر خدا کی قدرت کے آثار کو دیکھو اور ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرو۔[۲۶]

عِلمِ غیبِ رُسل

یہ خیال درست نہیں ہے کہ رسولوں کو بس اتنا ہی علمِ غیب دیا گیا تھا جتنا بندوں کو پہنچانا مطلوب تھا۔ یہ بات قرآن اور حدیث کی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یعقوبؑ کے متعلق ارشاد

ہوا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا:

اِنِّیٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (یوسف-۱۱) "مَیں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔

علاوہ بریں قرآن مجید کے بکثرت مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر عذاب بھیجنے سے پہلے ان کے نبیوں کو خبریں دے دی گئیں۔ مگر انہوں نے عذاب کے وقت اور اس کی تفصیلی کیفیت سے اپنی قوم کو مطلع نہ کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو تو اتنے پہلے عذاب کی خبر دے دی گئی تھی کہ انہوں نے طوفان آنے سے پہلے کشتی بنالی۔ لیکن انہوں نے اپنی قوم کو یہ نہیں بتایا کہ تم پر پانی کا عذاب آنے والا ہے۔ پھر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلّم کو غیب کے ایسے ایسے حالات بتائے گئے تھے جو آپ کی امّت کو نہیں بتائے گئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ: یَا اُمَّۃَ مُحَمَّدٍ وَاللّٰہِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا وَّلَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا (بخاری۔ باب الصدقۃ فی الکسوف)۔

"اے محمدؐ کی قوم! خدا کی قسم اگر تم کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو مَیں جانتا ہوں تو تم کم ہنستے اور بہت روتے"۔

ایک اور موقع پر حضورؐ نے فرمایا:

لَاَرَاکُمْ مِّنْ وَّرَائِیْ کَمَا اَرَاکُمْ۔ (بخاری، باب عظۃ امام الناس) "مَیں تم کو پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے دیکھتا ہوں۔

غرض بکثرت آیات اور روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسُولوں کو جو علمِ غیب دیا گیا تھا وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو ان کے واسطے سے بندوں تک پہنچا۔ اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔ کیونکہ بندوں کو تو غیب کی صرف وہی باتیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے، جن کا تعلق عقائدِ ایمانیہ سے ہے۔ لیکن رسولوں کو ان کے سوا اور بہت سی ایسی معلومات حاصل ہونی چاہییں جو فرائضِ رسالت انجام دینے میں ان کے لیے مددگار ہوں، جس طرح سلطنت کی پالیسی اور اس کے اسرار سے نائب السلطنت اور گورنروں کا ایک خاص حد تک واقف ہونا ضروری ہے اور عام رعایا تک ان رازوں کا پہنچ جانا بجائے مفید ہونے کے اُلٹا مضر ہوتا ہے۔ اسی طرح ملکوتِ الٰہی کے بھی بہت سے اسرار ہیں جو خدا کے خاص نمائندے اور اس کے رسُول جانتے ہیں اور عام رعیّت اُن سے بے خبر ہے۔ یہ علمِ غیب رسُولوں کو تو اپنے فرائض انجام دینے میں مدد دیتا ہے لیکن عام رعایا نہ اس علم کی ضرورت ہی رکھتی ہے اور نہ اس کا تحمل ہی کر سکتی ہے۔ زیادہ صحت کے ساتھ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ مجملاً بس اسی قدر ہے کہ نبی کا علم خدا کے علم سے کم اور بندوں کے علم سے زیادہ ہوتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ کتنا ہوتا ہے اور کتنا نہیں تو اس کو ناپنے کا کوئی پیمانہ ہمارے پاس نہیں ہے[۱]

انبیاء کی کڑی نگرانی

انسانی معاشرے میں نبی کا مقام انتہائی نازک مقام ہے۔ ایک معمولی بات بھی جو کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پیش آئے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتی، نبی کی زندگی میں اگر پیش آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السّلام کی زندگی پر ایسی کڑی نگرانی رکھی گئی ہے کہ ان کا کوئی ادنیٰ اقدام بھی منشاءِ الٰہی سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ ایسا کوئی فعل بھی اگر نبی سے صادر ہوا ہے تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی ہے تاکہ اسلامی قانون اور اس کے اصول اپنی بالکل صحیح صورت میں نہ صرف خدا کی کتاب، بلکہ نبی کے اُسوۂ حسنہ کی صورت میں بھی خدا کے بندوں تک پہنچ جائیں اور ان میں ذرّہ برابر بھی کوئی چیز ایسی شامل نہ ہونے پائے جو منشاءِ الٰہی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔[۲۸]

براہِ راست علم و مشاہدہ

انبیاء علیہم السّلام میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے ان کے منصب کی مناسبت سے ملکوتِ سموات و ارض کا مشاہدہ کرایا ہے اور مادی حجابات بیچ میں سے ہٹا کر آنکھوں سے وہ حقیقتیں دکھائی ہیں جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت دینے پر وہ مامور کیے گئے تھے، تاکہ ان کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالکل ممیز ہو جائے۔ فلسفی جو کچھ بھی کہتا ہے قیاس اور گمان سے کہتا ہے، وہ خود اگر اپنی حیثیت سے واقف ہو تو کبھی اپنی کسی رائے کی صداقت پر شہادت نہ دے گا۔ مگر انبیاء جو کچھ کہتے ہیں وہ براہِ راست علم اور مشاہدے کی بنا پر کہتے ہیں، اور وہ خلق کے سامنے یہ شہادت دے سکتے ہیں کہ ہم ان باتوں کو جانتے ہیں اور یہ ہماری آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں۔[۲۹]

غیر معمولی قوتیں[۱]

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّىْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنَ۔ (یوسف-۹۴)	جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا "میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں۔"

اس سے انبیاء علیہم السّلام کی غیر معمولی قوتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی قافلہ حضرت یوسفؑ کا قمیص لے کر مصر سے چلا ہے اور ادھر سینکڑوں میل کے فاصلے پر حضرت یعقوبؑ اس کی مہک پا لیتے ہیں۔ مگر اس سے یہ بھی

---

[۱] انبیاء کی غیر معمولی قوتوں اور صلاحیتوں اور ان کی خصوصی تربیت کے اہتمام کے بارے میں چند تفصیلی عبارات زیرِ باب رسالت آنحضورؐ کی شخصی اور نبوی حیثیت کی فصل رسالت اور اس کے احکام میں درج ہیں۔ (مرتّبین)

معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی یہ قوتیں کچھ ان کی ذاتی نہ تھیں بلکہ اللہ کی بخشش سے ان کو ملی تھیں اور اللہ جب اور جس قدر چاہتا تھا انہیں کام کرنے کا موقع دیتا تھا۔ حضرت یوسفؑ برسوں مصر میں موجود رہے اور کبھی حضرت یعقوبؑ کو اُن کی خوشبو نہ آئی۔ مگر اب یکایک قوتِ ادراک کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ ابھی قمیص مصر سے چلا ہے اور ان کو مہک آنی شروع ہو گئی۔[۳۱]

بشریّتِ انبیاء

تمام پچھلے انبیاء بھی بشر ہی تھے، کوئی نرالی مخلوق نہ تھے۔ تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ آج پہلی مرتبہ ہی پیش نہیں آیا ہے کہ ایک بشر کو رسُول بنا کر بھیجا گیا ہے۔

پہلے انبیاء بھی اسی کام کے لیے آتے تھے جو کام اب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کر رہے ہیں۔ یہی ان کا مشن تھا اور یہی ان کی تعلیم تھی۔

انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ رہا ہے۔ بڑے بڑے مصائب سے وہ گزرے ہیں، سالہا سال مصائب میں مبتلا رہے ہیں شخصی اور ذاتی مصائب میں بھی اور اپنے مخالفوں کے ڈالے ہوئے مصائب میں بھی، مگر آخر کار اللہ کی نصرت و تائید ان کو حاصل ہوئی ہے، اس نے اپنے فضل و رحمت سے اُن کو نوازا ہے، ان کی دعاؤں کو قبول کیا ہے، ان کی تکلیفوں کو رفع کیا ہے، ان کے مخالفوں کو نیچا دکھایا ہے، اور معجزانہ طریقوں پر ان کی مدد کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبُول بارگاہ ہونے کے باوجود، اور اس کی طرف سے بڑی بڑی حیرت انگیز طاقتیں پانے کے باوجود، تھے وہ بندے اور بشر ہی۔ اُلوہیت ان میں سے کسی کو حاصل نہ تھی۔[۱۳۲]

عصمتِ انبیاء کا مفہوم

انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں، اور کوئی انسان بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ہر وقت اُس بلند ترین معیارِ کمال پر قائم رہے جو مومن کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے لیکن جونہی کہ اسے یہ احساس ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے احساس کرا دیا جاتا ہے کہ اس کا قدم معیارِ مطلوب سے نیچے جا رہا ہے، وہ فوراً توبہ کرتا ہے اور اپنی غلطی کی اصلاح کرنے میں اسے ایک لمحہ کے لیے تامّل نہیں ہوتا۔ حضرتِ نوحؑ کی اخلاقی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی جان جوان بیٹا آنکھوں کے سامنے غرق ہُوا ہے اور اس نظارہ سے کلیجہ مُنہ کو

ا۔ انبیاء کی بشریّت کے موضوع پر آگے ایک مستقل فصل دی جا رہی ہے۔ (مُرتّبین)

آرہا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ اُنہیں مُتنبّہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لیے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہاری صُلب سے پیدا ہوا ہے محض ایک جاہلیّت کا جذبہ ہے، تو وہ فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پروا ہو کر اُس طرزِ فکر کی طرف پلٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضا ہے[۳۲]

نبی کی معصومیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ اور لغزش و خطا کی قوت و استعداد سلب کر لی گئی ہے حتیٰ کہ گناہ کا صدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن بشریت کی تمام صفات سے متصف ہونے کے باوجود، اور جُملہ انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات رکھتے ہوتے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خدا ترس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر میں اپنے رب کی ایسی ایسی زبردست حُجّتیں اور دلیلیں رکھتا ہے جن کے مقابلہ میں خواہشِ نفس کبھی کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نادانستہ اُس سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً وحیِ جلی کے ذریعہ سے اُس کی اصلاح فرما دیتا ہے، کیونکہ اُس کی لغزش تنہا ایک شخص کی لغزش نہیں ہے، ایک پُوری اُمّت کی لغزش ہے۔ وہ راہِ راست سے بال برابر ہٹ جائے تو دُنیا گمراہی میں میلوں دُور نکل جائے[۳۳]

اوصافِ انبیاء کے متعلق چند آیات

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ (مریم -۴۱)	اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو بیشک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔
وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۔	اور ذکر کرو اس کتاب میں مُوسیٰؑ کا۔ وہ ایک چیدہ شخص تھا اور رسول نبی تھا۔
وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا۔ (مریم ۵۱-۵۲)	اور ہم نے اُس کو طُور کے داہنی جانب سے پکارا اور راز کی گفتگو سے اس کو تقرّب عطا کیا۔
وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا۔	اور اس کتاب میں اسماعیلؑ کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچّا تھا اور رسُول نبی تھا وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا۔
وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا۔ (مریم - ۵۴ تا ۵۷)	اور اس کتاب میں ادریسؑ کا ذکر کرو وہ ایک راستباز انسان اور رسول نبی تھا اور اسے ہم نے بلند مقام پر اٹھایا تھا۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ
مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَ
مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّ مِنْ
ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ
هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَآ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ
اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا۔

(مریم - ۵۸)

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ
مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ - (الانبیاء-۵۱)
وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ
بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ - وَ وَهَبْنَا لَهٗ
اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَّ كُلًّا
جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ - وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً
يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ
وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ
وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ -

(الانبیاء ۷۲-۷۳)

وَ لُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ
نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ
الْخَبٰٓئِثَ - اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ
فٰسِقِيْنَ - وَ اَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ط
اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ - (الانبیاء-۷۵)
وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا
لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ
الْعَظِيْمِ - وَ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ

یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، آدمؑ کی
اولاد میں سے، اور اُن لوگوں کی نسل سے جنہیں
ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا اور ابراہیمؑ
کی نسل سے اور اسرائیل کی نسل سے۔ اور یہ ان لوگوں
میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ
کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمان کی آیات ان کو
سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔

اس سے پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی ہوشمندی
بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے۔

اور ہم اُسے اور لوطؑ کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف
نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے
برکتیں رکھی ہیں۔ اور ہم نے اسے اسحٰق عطا کیا اور
یعقوب اس پر مزید، اور ہر ایک کو صالح بنایا۔
اور ہم نے اُن کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی
کرتے تھے۔ اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ نیک کاموں
کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی
اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم بخشا اور اُسے اُس بستی
سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی۔
درحقیقت وہ بڑی ہی بُری فاسق قوم تھی۔ لوطؑ کو
ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ صالح لوگوں
میں سے تھا۔

اور یہی نعمت ہم نے نوحؑ کو دی۔ یاد کرو کہ
ان سب سے پہلے اُس نے ہمیں پکارا تھا ہم نے
اس کی دعا قبول کی، اور اسے اور اس کے گھر والوں

كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔

(الانبیاء-۷۶-۷۷)

کو کربِ عظیم سے نجات دی اور اس قوم کے مقابلے میں اُس کی مدد کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا تھا۔ وہ بڑے بُرے لوگ تھے پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ۔ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ۔ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ۔ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا۔ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ۔ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ۔ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ۔

(الانبیاء: ۷۸ تا ۸۲)

اور اسی نعمت سے ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو سرفراز کیا۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ وہ دونوں ایک کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں اور ہم اُن کی عدالت خود دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا، حالانکہ دونوں کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا تھا۔ اور داؤدؑ کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے۔ اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے! اور ہم نے اُس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی، تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے، پھر کیا تم شکر گزار ہو؟ اور سلیمٰنؑ کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اُس کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں، ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے۔ اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ ان سب کے نگران ہم ہی تھے۔

اِس سیاق و سباق میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے اس خاص واقعے کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام نبی ہونے اور اللہ کی طرف سے غیر معمولی طاقتیں اور قابلیتیں پانے کے باوجود ہوتے انسان ہی تھے، الوہیّت کا کوئی شائبہ اُن میں نہ ہوتا تھا۔ اس مقدمے میں حضرت داؤدؑ کی رہنمائی وحی کے ذریعہ سے نہ کی گئی اور وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کر گئے، حضرت سُلیمانؑ کی رہنمائی کی گئی اور انہوں نے صحیح فیصلہ کیا، حالانکہ نبی دونوں ہی تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے جن کمالات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی یہی بات سمجھانے کے لیے ہے

کہ یہ وہبی کمالات تھے اور اس طرح کے کمالات کسی کو خدا نہیں بنا دیتے۔[۳۴]

وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ۔ (الانبیاء: ۸۳-۸۴)

اور یہی (ہوشمندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوبؑ کو دی تھی۔ یاد کرو، جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے"۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اُسے تھی اُس کو دُور کر دیا، اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیئے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیئے، اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے۔

وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِدْرِیْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا۔ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ (الانبیاء: ۸۶)

اور یہی نعمت اسماعیلؑ اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے۔ اور ان کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے۔

وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَ كَذٰلِكَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (الانبیاء: ۸۷-۸۸)

اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا۔ یاد کرو جبکہ وہ بگڑ کر چلا گیا تھا اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔ آخر کو اس نے تاریکیوں میں سے پکارا "نہیں ہے کوئی خدا مگر تُو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا"۔ تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی اور اسی طرح ہم مومنوں کو بچا لیا کرتے ہیں۔

وَ زَكَرِیَّاۤ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَ وَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ اِنَّهُمْ كَانُوْا

اور زکریاؑ کو جبکہ اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ اے پروردگار مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور بہترین وارث تو تو ہی ہے۔ پس ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور اسے یحیٰی عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے

يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ط وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ (الانبیاء: ۹۰)

درست کر دیا۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دُھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

حضرت زکریاؑ کے واقعے کا ذکر کرنے سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ یہ سارے نبی محض بندے اور انسان تھے، اُلوہیت کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ دوسروں کو اولاد بخشنے والے نہ تھے بلکہ خود اللہ کے آگے اولاد کے لیے ہاتھ پھیلانے والے تھے۔ حضرت یونسؑ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ایک نبی اولوالعزم ہونے کے باوجود جب ان سے قصور سرزد ہوا تو اُنہیں پکڑ لیا گیا۔ اور جب وہ اپنے رب کے آگے جُھک گئے تو ان پر فضل بھی ایسا کیا گیا کہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال لائے گئے۔ حضرت ایوبؑ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ نبی کا مبتلائے مصیبت ہونا کوئی نرالی بات نہیں ہے، اور نبی بھی جب مُصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو خدا ہی کے آگے شفا کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ وہ دوسروں کو شفا دینے والا نہیں، خدا سے شفا مانگنے والا ہوتا ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ساتھ ایک طرف یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ یہ سارے انبیاء توحید کے قائل تھے اور اپنی حاجات ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ لے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ بھی جتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ غیر معمولی طور پر اپنے نبیوں کی مدد کرتا رہا ہے، آغاز میں خواہ کیسی ہی آزمائشوں سے ان کو سابقہ پیش آیا ہو مگر آخر کار ان کی دعائیں معجزانہ شان کے ساتھ پوری ہوئی ہیں[۳۵]

باب-۲

وحُی

فصل ۱

وَحی کا مفہُوم، صُورتیں اور اَقسام

لُغوی اور اصطلاحی معنی

وحی کے معنی ہیں اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات ڈالنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا یا پیغام بھیجنا ہے[36]

وحی کے لغوی معنی ہیں "اشارۂ سریع" اور "اشارۂ خفی"، یعنی ایسا اشارہ جو سُرعت کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ بس اشارہ کرنے والا جانے یا وہ شخص جسے اشارہ کیا گیا ہے۔ باقی کسی اور شخص کو اُس کا پتہ نہ چلنے پاتے اس لفظ کو اصطلاحاً اُس ہدایت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو بجلی کی کوند کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے کسی بندے کے دل میں ڈالی جاتے۔

اللہ تعالیٰ کے کسی کے پاس آنے یا اُس کے پاس کسی کے جانے اور رُو برو اُس سے گفتگو کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ غالب اور حکیم ہے۔ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جب بھی وہ کسی بندے سے رابطہ قائم کرنا چاہے، کوئی دشواری اس کے ارادے کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتی، اور وہ اپنی حکمت سے اس کام کے لیے وحی کا طریقہ اختیار فرما لیتا ہے[37]

اقسامِ وحی

"وحی" کا لفظ اگرچہ اب صرف اس وحی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انبیاء پر آتی ہے، لیکن قرآن میں یہ اصطلاحی فرق نہیں پایا جاتا۔ یہاں آسمانوں پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق ان کا سارا نظام چلتا ہے (وَ اَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا۔ حٰمٓ السجدہ)۔ زمین پر بھی وحی ہوتی ہے جس کا اشارہ پاتے ہی وہ اپنی سرگزشت سنانے لگتی ہے۔ (یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا۔ الزلزال)۔ ملائکہ پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ کام کرتے ہیں۔ (اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ۔ الانفال)۔ شہد کی مکھی کو اس کا پُورا کام وحی (فطری تعلیم) کے ذریعہ سے سکھایا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت ۶۸ میں آپ دیکھتے ہیں اور یہ وحی صرف شہد کی مکھی تک ہی محدود نہیں ہے۔ مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اُڑنا اور نوزائیدہ بچے کو دُودھ پینا بھی وحیِ خداوندی ہی سکھایا کرتی ہے۔ پھر ایک انسان کو

غور وفکر اور تحقیق و تجسّس کے بغیر جو صحیح تدبیر یا صائب رائے، یا فکر وعمل کی صحیح راہ سمجھائی جاتی ہے وہ بھی وحی ہے (وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْہِ۔ القصص)۔ اور اس وحی سے کوئی انسان بھی محروم نہیں ہے دنیا میں جتنے اکتشافات ہوتے ہیں، جتنی مفید ایجادیں ہوئی ہیں، بڑے بڑے مدبرین، فاتحین، مفکّرین اور مُصنّفین نے جو معرکے کے کام کیے ہیں اُن سب میں اس وحی کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کو آئے دن اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کبھی بیٹھے بیٹھے دل میں ایک بات آئی، یا کوئی تدبیر سُوجھ گئی، یا خواب میں کچھ دکھائی دیا اور بعد میں تجربے سے پتہ چلا کہ وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو غیب سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔ ان بہت سی اقسام میں سے ایک خاص قسم کی وحی وہ ہے جس سے انبیاء علیہم السلام نوازے جاتے ہیں، اور یہ وحی اپنی خصوصیات میں دوسری اقسام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی کیے جانے والے کو پُورا شعُور ہوتا ہے کہ یہ وحی خُدا کی طرف سے آرہی ہے، اُسے اِس کے من جانب اللہ ہونے کا پُورا یقین ہوتا ہے۔ وہ عقائد اور احکام اور قوانین اور ہدایات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی اس کے ذریعہ سے نوعِ انسانی کی رہنمائی کرے[۳۸]

غلط فہمی

سُورہ شوریٰ کی آیت اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ میں وحی کے آنے کی وہ صورت مذکور ہے جس کے ذریعہ سے تمام کتبِ آسمانی انبیاء علیہم السلام تک پہنچی ہیں یعنی اللہ اپنے ایک فرشتے کے ذریعہ سے رسُول کے پاس وحی بھیجتا ہے بعض لوگوں نے اس فقرے کی غلط تاویل کر کے اس کو یہ معنی پہنائے ہیں کہ "اللہ کوئی رسول بھیجتا ہے، جو اُس کے حُکم سے عام لوگوں تک اُس کا پیغام پہنچاتا ہے" لیکن قرآن کے الفاظ فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ (پھر وہ یعنی فرشتہ وحی کرتا ہے ـــــ یا پہنچاتا ہے ـــــ اسی کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے) اُن کی اِس تاویل کا غلط ہونا بالکل عیاں کر دیتے ہیں۔ عام انسانوں کے سامنے انبیاء کی تبلیغ کو "وحی کرنے" سے نہ قرآن میں کہیں تعبیر کیا گیا ہے اور نہ عربی زبان میں انسان کی انسان سے علانیہ گفتگو کو "وحی" کے لفظ سے تعبیر کرنے کی کوئی گنجائش ہے لغت میں وحی کے معنی ہی خفیہ اور سریع اشارے کے ہیں۔ انبیاء کی تبلیغ پر اس لفظ کا اطلاق صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو عربی زبان سے بالکل نابلد ہو[۳۹]

اقسامِ وحی کی مزید توضیح

ایک قسم کی وحی وہ ہے جسے وحیِ جبلّی یا طبعی کہا جا سکتا ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کو اس کے کرنے کا کام سکھاتا ہے۔ یہ وحی انسانوں سے بڑھ کر جانوروں پر اور شاید اُن سے بڑھ کر نباتات و جمادات پر ہوتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جسے وحیِ جُزئی کہا جا سکتا ہے، جس کے ذریعے کسی خاص موقع پر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو امُورِ زندگی میں سے کسی امر کے متعلق کوئی علم یا کوئی ہدایت دیتا ہے یا کوئی تدبیر سُجھا دیتا

ہے۔ یہ وحی آئے دن عام انسانوں پر ہوتی رہتی ہے۔ دُنیا میں بڑی بڑی ایجادیں اسی وحی کی بدولت ہوئی ہیں۔ بڑے بڑے علمی انکشافات اسی وحی کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے اہم تاریخی واقعات میں اسی وحی کی کارفرمائی نظر آتی ہے جب کہ کسی اہم موقع پر کوئی خاص تدبیر بلا غور و فکر اچانک سُوجھ گئی اور اس نے تاریخ کی رفتار پر ایک فیصلہ کُن اثر ڈال دیا۔ ایسی ہی وحی حضرت موسیٰ کی والدہ پر بھی ہوئی تھی۔ اِن دونوں قسم کی وحیوں سے بالکل مختلف وحی وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو حقائقِ غیبیہ پر مطلع فرماتا ہے، اور اسے نظامِ زندگی کے متعلق ہدایت بخشتا ہے تاکہ وہ اُس علم اور اس ہدایت کو عام انسانوں تک پہنچائے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔ یہ وحی انبیاء کے لیے خاص ہے۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس نوعیت کا علم، خواہ اس کا نام اِلقاء رکھیے، اِلہام رکھیے، کشف رکھیے یا اصطلاحاً اسے وحی سے تعبیر کیجیے، انبیاء و رُسل کے سوا کسی کو نہیں دیا جاتا۔ اور یہ علم صرف انبیاء ہی کو اس طور پر دیا جاتا ہے کہ انہیں اس کے مِن جانب اللہ ہونے اور شیطان کی دراندازی سے بالکل محفوظ ہونے اور خود اپنے ذاتی خیالات، تصوّرات اور خواہشات کی آلائشوں سے بھی پاک ہونے کا پُورا یقین ہوتا ہے۔ نیز یہی علم حجّتِ شرعی ہے۔ اس کی پابندی ہر انسان پر فرض ہے اور اس کے دوسرے انسانوں تک پہنچانے اور اس پر ایمان کی دعوت سب بندگانِ خدا کو دینے پر انبیاء علیہم السلام مامور ہوتے ہیں۔ اور پھر یہی وہ وحی ہے کہ جس پر ایمان لانا لازمۂ نجات اور جس سے روگردانی کرنا قطعی طور پر مُوجبِ خُسران ہوتا ہے۔

انبیاء کے سوا دوسرے انسانوں کو اگر اس تیسری قسم کے علم کا کوئی جزء نصیب بھی ہوتا ہے تو وہ ایسے دھندلے اشارے کی حد تک ہوتا ہے جسے ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے وحیِ نبوت کی روشنی سے مدد لینا یعنی کتاب و سُنّت پر پیش کر کے اس کی صحت اور عدمِ صحت کو جانچنا اور بصورتِ صحت اس کا منشا متعین کرنا ضروری ہے۔ جو شخص اپنے الہام کو ایک مستقل بالذات ذریعۂ ہدایت سمجھے اور وحیِ نبوّت کی کسوٹی پر اُس کو پرکھے بغیر اُس پر خود عمل کرے اور دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے۔ اس کے ایسے طرزِ عمل کو از روئے شریعت کوئی سندِ جواز نہیں دی جاسکتی۔ قرآن میں اس حقیقت کو متعدد مقامات پر صاف صاف بیان کیا گیا ہے۔ خصوصاً سُورۂ جِنّ کی آخری آیات میں تو اسے بالکل ہی کھول کر فرما دیا گیا ہے کہ:

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا	وہ عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، سوائے اُس رسول کے جسے اُس نے غیب کا کوئی علم دینے کے لیے پسند کر لیا ہو تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے

رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَىْءٍ عَدَدًا ـ (جن: ۲۷-۲۸)

کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے، اور وہ اُن کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے۔"

اگر ہم غور کریں تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اُمّت کے صالح و مُصلح آدمیوں کو نبی کا سا کشف و الہام نہ دینے اور اس سے کم تر ایک طرح کا تابعانہ کشف و الہام دینے میں کیا مصلحت ہے۔ پہلی چیز عطا نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی چیز نبی اور اُمّتی کے درمیان بنائے فرق ہے، اسے دُور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری چیز دینے کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ نبی کے بعد اس کے کام کو جاری رکھنے کی کوشش کریں وہ اس بات کے محتاج ہوتے ہیں کہ دین میں اُن کو حکیمانہ بصیرت اور اقامتِ دین کی سعی میں ان کو صحیح رہنمائی اللہ کی طرف سے حاصل ہو۔ وہ چیز غیر شعوری طور پر تو ہر مُخلص اور صحیح الفکر خادمِ دین کو بخشی جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی کو شعوری طور پر بھی دے دی جائے تو یہ اللہ کا انعام ہے[۱۶]

وحی بصورتِ خواب

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْىَ قَالَ يٰبُنَىَّ اِنِّىْۤ اَرٰى فِى الْمَنَامِ اَنِّىْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ـ (الصّافّات: ۱۰۲)

"وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا، "بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا، تیرا کیا خیال ہے" اُس نے کہا، ابا جان جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے۔"

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پیغمبر باپ کے خواب کو بیٹے نے محض خواب نہیں بلکہ خدا کا حکم سمجھا تھا۔ اب اگر یہ فی الواقع حکم نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ صراحۃً یا اشارۃً اس امر کی تصریح فرما دیتا کہ فرزندِ ابراہیمؑ نے غلط فہمی سے اُس کو حکم سمجھ لیا۔ لیکن پورا سیاق و سباق ایسے کسی اشارے سے خالی ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انبیاء کا خواب محض خواب نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بات سے ایک اتنا بڑا قاعدہ خدا کی شریعت میں شامل ہو سکتا ہو، وہ اگر مبنی بر حقیقت نہ ہوتی بلکہ محض ایک غلط فہمی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تردید نہ فرماتا۔ قرآن کو کلام الٰہی ماننے والے کے لیے یہ تسلیم کرنا محال ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی بھول چوک بھی صادر ہو سکتی ہے۔[۱۷]

شہد کی مکھّی پر وحی

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ

اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھّی پر یہ بات

مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا۔ (النحل - ۶۸) وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اپنے گھر بنا۔

لُغت کے رُو سے وحی کے معنی ہیں خُفیہ اور لطیف اشارے کے، جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا کوئی اور محسوس نہ کرے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ اِلقاء (دل میں بات ڈال دینے) اور الہام (مخفی تعلیم و تلقین) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے وہ چونکہ کسی مکتب و درسگاہ میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیف طریقوں سے دی جاتی ہے کہ بظاہر کوئی تعلیم دیتا اور کوئی تعلیم پاتا نظر نہیں آتا، اِس لیے اس کو قرآن میں وحی، الہام اور اِلقاء کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب یہ تینوں الفاظ الگ الگ اصطلاحوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لفظ وحی انبیاء کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ اِلہام کو اولیاء اور بندگانِ خاص کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ اور اِلقاء نسبتاً عام ہے[۲۷]

اُمِّ مُوسیٰ پر وحی

اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى (طٰہٰ: ۳۸) "یاد کر وہ وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعہ سے ہی کیا جاتا ہے۔"

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ۔ (القصص: ۷) "ہم نے مُوسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا کہ اس کو دُودھ پلا۔ پھر جب تجھے اُس کی جان کا خطرہ ہو تو اُسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف اور غم نہ کر۔"

یعنی حضرت مُوسیٰؑ کی والدہ نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ اس طریقے پر عمل کرنے میں نہ صرف یہ کہ تمہارے بچے کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے، بلکہ ہم بچے کو تمہارے پاس ہی پلٹا لائیں گے اور یہ کہ تمہارا یہ بچہ آگے چل کر ہمارا رسُول ہونے والا ہے[۲۸]

شیاطین کا اپنے ساتھیوں کو وحی کرنا

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ:

وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (الانعام: ۱۲۱) "شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات اِلقاء کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔"

حضورؐ پر وحی آنا انوکھا واقعہ نہیں

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ "اے محمدؐ! ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی

اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ (النساء: ۱۶۳)

طرف بھیجی تھی۔ اور ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحٰقؑ یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ پر بھی وحی کی۔

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی چیز لے کر نہیں آئے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔ ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مَیں دُنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں بلکہ دراصل اُن کو بھی اُسی ایک منبعِ علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام پچھلے انبیاء کو ہدایت ملتی رہی ہے۔ اور وہ بھی اُسی ایک صداقت و حقیقت کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔[۴۴]

حضورؐ پر قرآن کا وحی کیا جانا

وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ (الانعام۔ ۱۹)

"اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبّہ کر دُوں۔"

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۔ (یونس: ۱۵)

"جب اُنہیں ہماری صاف صاف باتیں سُنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ اے محمدؐ، ان سے کہو میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں۔ مَیں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس آتی ہے"۔

اِس میں رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہنے کا حکم دیا گیا کہ مَیں اس کتاب کا مُصنّف نہیں ہوں بلکہ یہ وحی کے ذریعہ سے میرے پاس آئی ہے جس میں کسی ردّ و بدل کا مجھے اختیار نہیں۔ اور یہ بھی کہ اس معاملہ میں مصالحت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ قبول کرنا ہو تو اِس پُورے دین کو جُوں کا تُوں قبول کرو ورنہ پُورے کو ردّ کر دو۔[۴۵]

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَ ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ ۔ (ہود: ۱۲)

"تو اے پیغمبر! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اُن چیزوں میں سے کسی چیز کو چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہیں اور اس سے دل تنگ ہو۔"

یعنی ہماری نگاہ میں قیمتی انسان وہ ہے جو نیک ہو اور نیکی کے راستے پر صبر و ثبات اور پامردی کے ساتھ چلنے والا ہو۔ لہٰذا جس تعصب سے، جس بے رُخی سے، جس تضحیک و استہزاء سے اور جن جاہلانہ اعتراضات

سے تمہارا مقابلہ کیا جارہا ہے ان کی وجہ سے تمہارے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ جو صداقت تم پر بذریعۂ وحی منکشف کی گئی ہے اس کے اظہار و اعلان میں اور اس کی طرف دعوت دینے میں تمہیں قطعاً کوئی باک نہ ہو۔ تمہارے دل میں اس خیال کا کبھی گزر تک نہ ہو کہ فلاں بات کیسے کہوں جبکہ لوگ سنتے ہی اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں اور فلاں حقیقت کا اظہار کیسے کروں جبکہ کوئی اس کے سننے تک کا روادار نہیں ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، تم جسے حق پاتے ہو اسے بے کم و کاست اور بے خوف بیان کیے جاؤ آگے سب معاملات اللہ کے حوالہ ہیں۔[۶۶]

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۔ (ہود: ۴۹)

"اے محمدؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں۔ جو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔"

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۔ (یوسف: ۱)

"الرٰ۔ یہ اُس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم (اہل عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔ اے محمدؐ! ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں۔"

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۔ (یوسف: ۱۰۲)

"اے محمدؐ! یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں ورنہ تم اُس وقت موجود نہ تھے جب یوسفؑ کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کر کے سازش کی تھی۔"

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۔ (الرعد: ۳۰)

"اے محمدؐ! اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر بذریعۂ وحی نازل کیا ہے اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوتے ہیں۔"

حضورؐ پر وحی آنے کے مختلف طریقے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ:

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (الشوریٰ - ۵۱)

"کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اُس سے رُوبرُو بات کرے۔ اُس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ وہ برتر اور حکیم ہے۔

یہ بات قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو ان تینوں طریقوں سے ہدایات دی گئی ہیں۔

۱۔ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر وحی آنے کی ابتداء ہی سچے خوابوں سے ہوتی تھی (بخاری و مسلم)۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا ہے، چنانچہ احادیث میں آپ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے، یا کسی بات پر مطلع کیا گیا ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی آپ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے (الفتح - ۲۷)۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا فلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے یا مجھے یہ بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اِس سے منع کیا گیا ہے۔ ایسی تمام چیزیں وحی کی پہلی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور احادیثِ قدسیہ بھی زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔

۲۔ معراج کے موقع پر حضورؐ کو وحی کی دوسری قسم سے بھی مشرف فرمایا گیا۔ متعدد صحیح احادیث میں حضورؐ کو پنج وقتہ نماز کا حکم دیئے جانے، اور حضورؐ کے اُس پر بار بار عرض معروض کرنے کا ذکر جس طرح آیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اللہ اور اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان ایسا ہی مکالمہ ہُوا تھا جیسا دامنِ طُور میں حضرت مُوسیٰؑ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوا۔

۳۔ رہی تیسری قسم، تو اُس کے متعلق قرآن خود ہی شہادت دیتا ہے کہ اُسے جبریلِ امین کے ذریعے سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچایا گیا، جیسا کہ البقرہ ۹۷، اور الشعراء ۱۹۲ تا ۱۹۵) میں ارشاد ہُوا ہے۔[1]

مزید توضیح

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر وحی مختلف طریقوں سے آتی تھی۔ اس کی تفصیل علّامہ ابنِ قیّم نے زاد المعاد میں اس طرح کی ہے:

۱۔ سچّا خواب، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر وحی کی ابتدائی صُورت تھی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے تھے وہ اس طرح صاف صاف نظر آتا تھا جیسے سپیدہ صبح۔

۲۔ فرشتہ آپؐ کے ذہن و قلب میں ایک بات ڈالتا تھا۔ بغیر اس کے کہ وہ آپ کو نظر آتے۔ اس کی مثال

وہ حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ رُوح القدس (جبریلؑ) نے میرے ذہن میں یہ بات ڈالی ہے (یا پھُونکی ہے)، کہ کوئی متنفس ہرگز نہ مرے گا جب تک کہ اپنے حصّے کا پُورا رزق نہ پالے، لہٰذا اللہ سے ڈر کر کام کرو اور طلبِ رزق کا اچھا طریقہ اختیار کرو اور رزق میں تاخیر تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اسے اللہ کی نافرمانی کے ساتھ طلب کرنے لگو، کیونکہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے (یعنی اُس کا انعام) وہ صرف اس کی اطاعت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

۳- فرشتہ آپ کے سامنے بصورتِ انسان نمودار ہو کر بات کرتا تھا اور اُس وقت تک مخاطب رہتا تھا جب تک کہ آپ اس کی بات پُوری طرح ذہن نشین نہ کرلیں۔ اس صورت میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ صحابہؓ نے بھی اُس کو دیکھا ہے۔

۴- وحی سے پہلے آپ کے کان میں ایک گھنٹی سی بجنی شروع ہوتی تھی اور اس کے ساتھ پھر فرشتہ بات کرتا تھا۔ یہ وحی کی شدید ترین شکل تھی جس سے سخت جاڑے میں بھی آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے۔ اگر آپ اونٹ پر سوار ہوتے تھے تو وہ بوجھ کے مارے بیٹھ جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس حال میں وحی آئی کہ آپ زید بن ثابتؓ کے زانو پر سر رکھے لیٹے تھے۔ اس وقت ان پر اتنا بوجھ پڑا کہ ان کی ران ٹوٹنے لگی تھی۔

۵- آپ فرشتے کو اس کی اصلی صورت میں دیکھتے تھے جس میں اللہ نے اسے پیدا کیا ہے، پھر جو کچھ اللہ کا حکم ہوتا تھا۔ اسے وہ آپ پر وحی کرتا تھا۔ یہ شکل دو مرتبہ پیش آئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نجم میں بیان کیا ہے۔

۶- براہِ راست اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر وحی کی جبکہ آپ معراج میں آسمانوں پر تھے اور وہاں نماز فرض کی اور دوسری باتیں ارشاد فرمائیں۔

۷- اللہ تعالیٰ نے فرشتے کے توسّط کے بغیر آپ سے گفتگو کی جس طرح مُوسیٰ علیہ السّلام سے کی تھی۔ حضرت مُوسیٰؑ کے لیے تو یہ مرتبہ قرآن سے ثابت ہے۔ رہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، تو آپؐ کے حق میں اس کا ذکر معراج کی حدیث میں آیا ہے۔

ان کے علاوہ بعض لوگوں نے ایک آٹھویں شکل بھی بیان کی ہے اور وہ یہ کہ اللہ نے بے پردہ ہو کر آپ سے گفتگو کی۔ یہ اُن لوگوں کا مذہب ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا۔ مگر اس مسئلے میں سلف اور خلف کے درمیان اختلاف ہے۔"

(زاد المعاد۔ ج اوّل ص ۲۴-۲۵)

سُیوطی نے اِتقان جلد اوّل میں ایک پُوری فصل اسی مضمون پر لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:-

"چالیس سال کی عمر میں جب آپؐ نبی ہوئے تو ابتدائی تین سال تک اسرافیل آپ کی تعلیم و تربیت پر مامور رہے اور اُن کے ذریعہ سے قرآن کا کوئی حصّہ نازل نہیں ہوا۔ پھر جبریل وحی لانے پر مقرر ہوئے اور وہ ۲۰ سال تک قرآن لاتے رہے۔ وحی کی صُورتیں حسبِ ذیل تھیں:۔

۱۔ کان میں گھنٹی بجنی شروع ہوتی اور پھر فرشتے کی آواز آتی۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ پہلے آپ سب طرف سے توجہ ہٹا کر اس آواز کو سننے کے لیے ہمہ تن متوجہ ہو جائیں۔ حضورؐ کا بیان ہے کہ یہ شکل آپ کے لیے سب سے زیادہ شدید تھی۔

۲۔ آپؐ کے ذہن و قلب میں ایک بات ڈالی جاتی تھی، جیسا کہ آپؐ نے خود بیان فرمایا ہے۔

۳۔ فرشتہ آپؐ سے انسانی شکل میں آکر بات کرتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ وحی کی یہ صورت میرے لیے سب سے زیادہ ہلکی ہوتی تھی۔

۴۔ فرشتہ خواب میں آکر آپ سے بات کرتا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ آپ سے براہِ راست کلام کرتا، خواہ بیداری میں یا خواب میں[۴۸]۔"

(الاتقان۔ جلد اوّل، ص ۴۴۔ ۴۵)

قرآن کا چیلنج کہ وہ وحیِ الٰہی ہے

نبوّت سے پہلے کی پُوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی تھی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوّت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھُوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہُوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہُوئے، اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے جو اب قرآن کی پے در پے سُورتوں میں زیرِ بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پُورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اُس عظیم الشّان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو جو آپؐ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپؐ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خارج سے آپؐ کے اندر آئی ہُوئی چیز ہے[۴۹]۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّٰهِدِينَ وَلَٰكِنَّآ أَنْشَأْنَا قُرُونًا	اے محمدؐ! تم اس وقت مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب ہم نے مُوسیٰ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا، اور نہ تم شاہدین میں شامل تھے، بلکہ اس کے بعد (تمہارے

فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلَٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۝ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَٰكِنْ رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أَتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ۔

(القصص ۴۴ - ۴۶)

زمانے تک ہم بہت سی نسلیں اُٹھا چکے ہیں اور ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے تم اہلِ مَدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ اُن کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے، مگر (اُس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور تم طُور کے دامن میں بھی اُس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے (مُوسیٰ کو پہلی مرتبہ) پکارا تھا مگر تمہارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں) تاکہ تم ان لوگوں کو متنبّہ کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی متنبّہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہوش میں آئیں۔

یہ تینوں باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ جس وقت یہ باتیں کہی گئی تھیں اس وقت مکّہ کے تمام سردار اور عام کُفّار اس بات پر پُوری طرح تُلے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کو غیر نبی اور معاذ اللہ جھوٹا مدّعی ثابت کر دیں۔ ان کی مدد کے لیے یہود کے علماء اور عیسائیوں کے راہب بھی حجاز کی بستیوں میں موجود تھے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کہیں عالمِ بالا سے آکر یہ قرآن نہیں سُنا جاتے تھے، بلکہ اُسی مکّہ کے رہنے والے تھے اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ آپ کی بستی اور آپ کے قبیلے کے لوگوں سے چھپا ہوا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت اس کھُلے چیلنج کے انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت کے ثبوت کے طور پر یہ تین باتیں ارشاد فرمائی گئیں، اُس وقت مکّے اور حجاز، اور پُورے عرب میں کوئی ایک شخص بھی اُٹھ کر وہ بیہودہ بات نہ کہہ سکا جو آج کے مستشرقین کہتے ہیں۔ اگرچہ جھوٹ گھڑنے میں وہ لوگ اِن سے کچھ کم نہ تھے، لیکن ایسا دروغِ بے فروغ آخر وہ کیسے بول سکتے تھے جو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چل سکتا ہو۔ وہ کیسے کہتے کہ اَے محمدؐ، تم فلاں فلاں یہودی عالموں اور عیسائی راہبوں سے یہ معلومات حاصل کر لاتے ہو، کیونکہ پُورے ملک میں وہ اِس غرض کے لیے کسی کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ جس کا نام بھی وہ لیتے، فوراً ہی یہ ثابت ہو جاتا کہ اس سے آنحضرتؐ نے کوئی معلومات حاصل نہیں کی ہیں۔ وہ کیسے کہتے کہ اَے محمدؐ، تمہارے پاس پچھلی تاریخ اور عُلوم و آداب کی ایک لائبریری موجود ہے جس کی مدد سے تم یہ ساری تقریریں کر رہے ہو، کیونکہ لائبریری تو درکنار، محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے آس پاس کہیں سے وہ ایک کاغذ کا پرزہ بھی برآمد نہیں کر سکتے تھے جس میں یہ معلومات لکھی ہوئی ہوں۔ مکّے کا بچّہ بچّہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم لکھے پڑھے آدمی نہیں ہیں، اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ نے کچھ مترجمین کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو عبرانی اور سُریانی اور یونانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے آپ کو دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی بڑے سے بڑا بے حیا آدمی

بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا کہ شام و فلسطین کے تجارتی سفروں میں آپ یہ معلومات حاصل کر آئے تھے۔ کیونکہ یہ سفر تنہا نہیں ہوئے تھے۔ مکّے ہی کے تجارتی قافلے ہر سفر میں آپ کے ساتھ لگے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس وقت ایسا دعویٰ کرتا تو سینکڑوں زندہ شاہد یہ شہادت دے دیتے کہ وہاں آپ نے کسی سے کوئی درس نہیں لیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد تو دو سال کے اندر ہی رومیوں سے مسلمان برسرِ پیکار ہو گئے تھے۔ اگر کہیں جھوٹوں بھی شام و فلسطین میں کسی عیسائی راہب یا یہودی ربّی سے حضورؐ نے کوئی مذاکرہ کیا ہوتا تو رومی سلطنت رائی کا پہاڑ بنا کر یہ پروپیگنڈہ کرنے میں ذرا دریغ نہ کرتی کہ محمدؐ، معاذاللہ سب کچھ یہاں سے سیکھ گئے تھے اور مکّے جا کر نبی بن بیٹھے۔ غرض اُس زمانے میں جبکہ قرآن کا یہ چیلنج قریش کے کفّار و مُشرکین کے لیے پیامِ موت کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کو جھٹلانے کی ضرورت موجُودہ زمانے کے مُستشرقین کی بہ نسبت اُن لوگوں کو بدرجہا زیادہ لاحق تھی، کوئی شخص بھی کہیں سے ایسا کوئی مواد فراہم کر کے نہ لا سکا جس سے وہ یہ ثابت کر سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کے سوا ان معلومات کے حصُول کا کوئی دُوسرا ذریعہ موجود ہے جس کی نشان دہی کی جا سکتی ہو۔

یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ قرآن نے یہ چیلنج اِسی ایک جگہ نہیں دیا ہے بلکہ متعدد مقامات پر مختلف قصّوں کے سلسلہ میں دیا ہے۔ حضرت زکریاؑ اور حضرت مریمؑ کا قصّہ بیان کر کے فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ۔

(آل عمران: ۴۴)

"یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعہ سے تمہیں دے رہے ہیں، تم اُن لوگوں کے پاس کہیں موجود نہ تھے جبکہ وہ اپنے قرعے یہ طے کرنے کے لیے پھینک رہے تھے کہ مریمؑ کی کفالت کون کرے۔ اور نہ تم اس وقت موجود تھے جبکہ وہ جھگڑ رہے تھے۔"

حضرت یُوسفؑ کا قصّہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ۔

(یوسف: ۱۰۲)

"یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعہ سے تمہیں دے رہے ہیں، تم ان کے (یعنی یوسفؑ کے بھائیوں کے) آس پاس کہیں موجود نہ تھے جبکہ انہوں نے اپنی تدبیر پر اتفاق کیا اور جب کہ وہ اپنی چال چل رہے تھے۔"

اسی طرح حضرت نُوحؑ کا مفصل قصّہ بیان کر کے فرمایا:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۔ (ہود - ۴۹)

یہ باتیں غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں، تمہیں اور تمہاری قوم کو اس سے پہلے ان کا کوئی علم نہ تھا۔"

اس چیز کی بار بار تکرار سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن مجید اپنے من جانب اللہ ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے رسول اللہ ہونے پر جو بڑے بڑے دلائل دیتا تھا ان میں سے ایک یہ دلیل تھی کہ سینکڑوں ہزاروں برس پہلے کے گزرے ہوئے واقعات کی جو تفصیلات ایک اُمّی کی زبان سے بیان ہو رہی ہیں اُن کے علم کا کوئی ذریعہ اُس کے پاس وحی کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ چیز اُن اہم اسباب میں سے ایک تھی جن کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہم عصر لوگ اس بات پر یقین لاتے چلے جا رہے تھے کہ واقعی آپؐ اللہ کے نبی ہیں اور آپؐ پر وحی آتی ہے۔ اب یہ ہر شخص خود تصوّر کر سکتا ہے کہ اسلامی تحریک کے مخالفین کے لیے اُس زمانے میں اس چیلنج کی تردید کرنا کیسی کچھ اہمیت رکھتا ہوگا، اور انہوں نے اس کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کی کوششوں میں کیا کسر اٹھا رکھی ہوگی۔ نیز یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر معاذ اللہ اس چیلنج میں ذرا سی بھی کوئی کمزوری ہوتی تو اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے شہادتیں فراہم کرنا ہم عصر لوگوں کے لیے مشکل نہ تھا۔[۵۰]

وحی کی تشبیہ بارش سے

قرآن میں دو مقامات پر اشارۃً نبیٔ اکرم پر نازل ہونے والی وحی کو بارانِ رحمت سے تشبیہ دی گئی ہے:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا ۔ (الرعد - ۱۷)

"اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔"

اِس تمثیل میں اُس علم کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر وحی کے ذریعے سے نازل کیا گیا تھا آسمانی بارش سے تشبیہ دی گئی ہے اور ایمان لانے والے سلیم الفطرت لوگوں کو ان ندی نالوں کے مانند ٹھہرایا گیا ہے جو اپنے اپنے ظرف کے مطابق بارانِ رحمت سے بھرپور ہو کر رواں دواں ہو جاتے ہیں، اور اُسی ہنگامہ و شورش کو جو تحریکِ اسلامی کے خلاف منکرین و مخالفین نے برپا کر رکھی تھی۔ اُس جھاگ اور خس و خاشاک سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہمیشہ سیلاب کے اُٹھتے ہی سطح پر اپنی اُچھل کود دکھانی شروع کر دیتا ہے۔[۵۱]

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ۔ (الحج - ۶۳)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔"

یہاں پھر ظاہر مفہوم کے پیچھے ایک اشارہ چُھپا ہوا ہے۔ ظاہر مفہوم تو محض اللہ کی قدرت کا بیان ہے مگر لطیف اشارہ اس میں یہ ہے کہ جس طرح خدا کی برسائی ہوئی بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی تم دیکھتے ہو کہ سوکھی

پڑی ہوئی زمین یکایک لہلہا اٹھتی ہے۔ اسی طرح یہ وحی کا بارانِ رحمت جو آج ہو رہا ہے عنقریب تم کو یہ منظر دکھانے والا ہے کہ یہی عرب کا بنجر ریگستان علم اور اخلاق اور تہذیبِ صالح کا وہ گلزار بن جائے گا جو چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔[۵۲]

وحیِ رسالت خدا کی رحمت ہے

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰنِیْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِہٖ۔ (ہود: ۲۸)

"اے برادرانِ قوم! ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا۔"

یہ وہی بات ہے، جو پچھلے رکوع میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوائی جا چکی ہے کہ پہلے میں خود آفاق و انفس میں خدا کی نشانیاں دیکھ کر توحید کی حقیقت تک پہنچ چکا تھا، پھر خدا نے اپنی رحمت (یعنی وحی) سے مجھے نوازا، اور ان حقیقتوں کا براہِ راست علم مجھے بخش دیا جن پر میرا دل پہلے سے گواہی دے رہا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام پیغمبر نبوت سے قبل اپنے غور و فکر سے ایمان بالغیب حاصل کر چکے ہوتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو منصبِ نبوت عطا کرتے وقت ایمان بالشہادۃ عطا کرتا تھا۔[۵۳]

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰنِیْ مِنْہُ رَحْمَۃً۔ (ہود - ۶۳)

صالح نے کہا "اے برادرانِ قوم تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا، اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی نواز دیا۔"

وحیِ رسالت کے لیے لفظ روح کا استعمال

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ۔ (النحل: ۲)

وہ اس روح کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے، اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے (اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو) آگاہ کر دو کہ میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے لہٰذا تم مجھ سے ڈرو۔

یعنی روحِ نبوت کو جس سے بھر کر نبی کام اور کلام کرتا ہے۔ یہ وحی اور یہ پیغمبرانہ اسپرٹ چونکہ اخلاقی زندگی میں وہی مقام رکھتی ہے۔ جو طبعی زندگی میں روح کا مقام ہے، اس لیے قرآن میں متعدد مقامات پر

اس کے لیے رُوح کا لفظ استعمال کیا گیا ہے[۵۴]۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۸۵)

یہ لوگ تم سے رُوح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو یہ رُوح میرے رب کے حکم سے آتی ہے مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہاں رُوح سے مراد جان ہے، یعنی لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رُوحِ حیات کے متعلق پوچھا تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے لیکن ہمیں یہ معنی تسلیم کرنے میں سخت تامل ہے۔ اِس لیے کہ یہ معنی صرف اس صورت میں لیے جا سکتے ہیں۔ جبکہ سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا جائے اور سلسلۂ کلام سے بالکل الگ کر کے اس آیت کو ایک منفرد جملے کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ ورنہ اگر سلسلۂ کلام میں رکھ کر دیکھا جائے تو رُوح کو جان کے معنی میں لینے سے عبارت میں سخت بے ربطی محسوس ہوتی ہے اور اس امر کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جہاں پہلے تین آیتوں میں قرآن کے نسخۂ شفا ہونے اور منکرینِ قرآن کے ظالم اور کافرِ نعمت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، اور جہاں بعد کی آیتوں میں پھر قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، وہاں آخر کس مناسبت سے یہ مضمون آ گیا کہ جانداروں میں جان خدا کے حکم سے آتی ہے؟

ربطِ عبارت کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں رُوح سے مراد وحی یا "وحی لانے والا فرشتہ" ہی ہو سکتا ہے۔ مشرکین کا سوال دراصل یہ تھا کہ یہ قرآن تم کہاں سے لاتے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَے محمدؐ، تم سے یہ لوگ رُوح، یعنی ماخذِ قرآن، یا ذریعۂ حصولِ قرآن کے بارے میں دریافت کرتے ہیں انھیں بتا دو کہ یہ رُوح میرے رب کے حکم سے آتی ہے۔ مگر تم لوگوں نے علم سے اتنا کم بہرہ پایا ہے۔ کہ تم انسانی ساخت کے کلام اور وحیِ ربّانی کے ذریعہ سے نازل ہونے والے کلام کا فرق نہیں سمجھتے اور اس کلام پر یہ شبہ کرتے ہو کہ اسے کوئی انسان گھڑ رہا ہے۔

یہ تفسیر نہ صرف اِس لحاظ سے قابلِ ترجیح ہے کہ تقریرِ ماسبق اور تقریرِ مابعد کے ساتھ آیت کا ربط اسی تفسیر کا متقاضی ہے، بلکہ خود قرآن مجید میں بھی دوسرے مقامات پر یہ مضمون قریب قریب ان ہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سُورہ مومن میں ارشاد ہُوا ہے۔ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ (آیت ۱۵) "وہ اپنے حکم سے اپنے جس بندے پر چاہتا ہے رُوح نازل کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے اکٹھے ہونے کے دن سے آگاہ کر دے۔" اور سُورۂ شوریٰ میں فرمایا: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ "اور اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک رُوح اپنے حکم سے بھیجی۔ تو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہے۔"

سلف میں سے ابن عباس، قتادہ اور حسن بصری رحمہم اللہ نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو قتادہ کے حوالہ سے ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے، مگر یہ عجیب بات لکھی ہے کہ ابن عباس اس بات کو چھپا کر بیان کرتے تھے۔ اور صاحبِ روح المعانی حسن اور قتادہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "روح سے مراد جبریلؑ ہیں اور سوال دراصل یہ تھا کہ وہ کیسے نازل ہوتے ہیں اور کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر وحی کا القاء ہوتا ہے"[٥٥]

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا۔ (الشوریٰ - ٥٢)

"اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔"

روح سے مراد وحی، یا وہ تعلیم ہے جو وحی کے ذریعہ سے حضورؐ کو دی گئی[٥٦]

وحی کردہ کلام کے شواہد و دلائل

جو کلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ اِس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے (قرآن میں) چار باتیں شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں:-

ایک یہ کہ یہ کتاب بڑی خیر و برکت والی ہے، یعنی اس میں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین اصول پیش کیے گئے ہیں۔ عقائدِ صحیحہ کی تعلیم ہے۔ بھلائیوں کی ترغیب ہے۔ اخلاقِ فاضلہ کی تلقین ہے۔ پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے۔ اور پھر یہ جہالت، خود غرضی، تنگ نظری، ظلم، فحش اور دوسری اُن برائیوں سے، جن کا انبار تم لوگوں نے کتبِ مقدسہ کے مجموعہ میں بھر رکھا ہے، بالکل پاک ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے پہلے خدا کی طرف سے جو ہدایت نامے آئے تھے یہ کتاب اُن سے الگ ہٹ کر کوئی مختلف ہدایت پیش نہیں کرتی بلکہ اُسی چیز کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو ان میں پیش کی گئی تھی۔

تیسرے یہ کہ یہ کتاب اُسی مقصد کے لیے نازل ہوئی ہے جو ہر زمانہ میں اللہ کی طرف سے کتابوں کے نزول کا مقصد رہا ہے، یعنی غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانا اور کج روی کے انجامِ بد سے خبردار کرنا۔

چوتھے یہ کہ اس کتاب کی دعوت نے انسانوں کے گروہ میں سے ان لوگوں کو نہیں سمیٹا جو دنیا پرست اور خواہشِ نفس کے بندے ہیں، بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا ہے جن کی نظر حیاتِ دنیا کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے، اور پھر اس کتاب سے متاثر ہو کر جو انقلاب ان کی زندگی میں رونما ہوا ہے اُس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ کیا یہ خصوصیت اور یہ نتائج کسی ایسی کتاب کے ہو سکتے ہیں جسے کسی جھوٹے انسان نے گھڑ لیا ہو، جو اپنی تصنیف کو خدا کی طرف منسوب کر دینے کی انتہائی مجرمانہ جسارت تک کر گزرے؟[٥٧]

باب ۳

نبوّتِ محمدیؐ کی ضرورت

اور

اُس کے دلائل

فصل ا

پچھلے انبیاء کے بعد آپؐ کے مبعوث کیے جانے کی وجہ

وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مُرِیْبٍ۔ (الشوریٰ - ۱۴)

"اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوتے ہیں۔"

ہر نبی اور اس کے قریبی تابعین کا دور گزر جانے کے بعد جب پچھلی نسلوں تک کتاب اللہ پہنچی تو انہوں نے اسے یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں لیا، بلکہ وہ اس کے متعلق سخت شکوک اور ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہو گئیں۔ اس حالت میں اُن کے مُبتلا ہو جانے کے بہت سے وجوہ تھے جنہیں ہم اُس صورتِ حال کا مطالعہ کر کے بآسانی سمجھ سکتے ہیں جو توراۃ و انجیل کے معاملہ میں پیش آئی ہے۔ ان دونوں کتابوں کو اگلی نسلوں نے ان کی اصلی حالت پر اُن کی اصل عبارت اور زبان میں محفوظ رکھ کر پچھلی نسلوں تک نہیں پہنچایا۔ ان میں خدا کے کلام کے ساتھ تفسیر و تاریخ اور سماعی روایات اور فقہاء کے نکالے ہوئے جزئیات کی صورت میں انسانی کلام گڈمڈ کر دیا۔ ان کے ترجموں کو اتنا رواج دیا کہ اصل غائب ہو گئی اور صرف ترجمے باقی رہ گئے۔ ان کی تاریخی سند بھی اس طرح ضائع کر دی کہ اب کوئی شخص بھی پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جو کتاب اُس کے ہاتھ میں ہے وہ وہی ہے جو حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کے ذریعہ سے دنیا والوں کو ملی تھی۔ پھر اُن کے اکابر نے وقتاً فوقتاً مذہب، الٰہیات، فلسفہ، قانون، طبعیات، نفسیات اور اجتماعیات کی ایسی بحثیں چھیڑیں اور ایسے نظاماتِ فکر کی بنا ڈالی جن کی بھُول بھلیّوں میں پھنس کر لوگوں کے لیے یہ طے کرنا محال ہو گیا کہ ان پیچیدہ راستوں کے درمیان حق کی سیدھی شاہراہ کونسی ہے۔ اور چونکہ کتاب اللہ اپنی اصلی حالت اور قابلِ اعتماد صورت میں موجود نہ تھی اس لیے لوگ کسی ایسی سند کی طرف رجوع بھی نہ کر سکتے تھے، جو حق کو باطل سے متمیز کرنے میں ان کی مدد کرتی۔[۵۸]

واضح رہے کہ عرب میں دینِ حق کی روشنی سب سے پہلے حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کے ذریعہ سے پہنچی تھی جو زمانہ قبل تاریخ میں گزرے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام آئے جن کا زمانہ حضورؐ سے ڈھائی ہزار

برس قبل گزرا ہے۔ اس کے بعد آخری پیغمبر جو عرب کی سرزمین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے بھیجے گئے وہ حضرت شعیب علیہ السّلام تھے [۵۹]

اہلِ عرب پہلے سے خود ایک نبی مانگ رہے تھے

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۔ (فاطر۔ ۴۲)

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رَو ہوتے۔"

یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے عرب کے لوگ عموماً اور قریش کے لوگ خصوصاً یہود و نصاریٰ کی بگڑی ہوئی اخلاقی حالت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے [۶۰]

اسی طرح سورۂ انعام میں آیا ہے:

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۔ (الانعام: ۱۵۶-۱۵۷)

اس کتاب کے آنے کے بعد اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی۔ اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے، اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راست رَو ثابت ہوتے۔"

سورۂ صٰفّٰت میں اس طرح ارشاد ہے:

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۔ (الصّٰفّٰت: ۱۶۷ تا ۱۶۹)

"یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس وہ "ذکر" ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے۔"

ایک "روشن دلیل" کے ظہور کی ضرورت

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۔ (البیّنہ: ۱-۲)

اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیلِ روشن نہ آجائے (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔

یعنی ان کے حالتِ کفر سے نکلنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ ایک دلیلِ روشن آکر انہیں کفر کی ہر صورت کا غلط اور خلافِ حق ہونا سمجھاتے اور راہِ راست کو واضح اور مدلّل طریقہ سے ان کے سامنے پیش کر دے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس دلیلِ روشن کے آجانے کے بعد وہ سب کفر سے باز آجانے والے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دلیل کی غیر موجودگی میں تو ان کا اس حالت سے نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ البتہ اس کے آنے کے بعد بھی ان میں جو لوگ اپنے کفر پر قائم رہیں اس کی ذمہ داری پھر انہی پر ہے، اس کے بعد وہ اللہ سے یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ آپ نے ہماری ہدایت کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ نحل میں فرمایا: وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ "سیدھا راستہ بتانا اللہ کے ذمہ ہے" (آیت ۹)۔ سورۂ لیل میں فرمایا اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى "راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے" (آیت ۱۲)۔ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ "(اے نبی) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی۔ ان رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنایا گیا تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت نہ رہے" (النساء: ۱۶۴-۱۶۵)۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ، فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ۔ (المائدہ - ۱۹)

اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول حقیقت واضح کرنے کے لیے رسولوں کا سلسلہ ایک مدت تک بند رہنے کے بعد آگیا ہے تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس نہ کوئی بشارت دینے والا آیا نہ خبردار کرنے والا۔ سو لو اب تمہارے پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا آگیا۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ۔ (البیّنہ - ۴)

پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس راہِ راست کا بیانِ واضح آچکا تھا۔

یعنی اس سے پہلے اہلِ کتاب جو مختلف گمراہیوں میں بھٹک کر بے شمار فرقوں میں بٹ گئے اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اُن کی رہنمائی کے لیے دلیلِ روشن بھیجنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی۔ بلکہ یہ روش انہوں نے اللہ کی جانب سے رہنمائی آجانے کے بعد اختیار کی تھی، اسی لیے اپنی گمراہی کے وہ خود ذمہ دار تھے، کیونکہ ان پر حجت تمام کی جا چکی تھی۔ اسی طرح اب چونکہ ان کے صحیفے پاک نہیں رہے ہیں اور ان کی کتابیں بالکل راست اور

درست تعلیمات پر مشتمل نہیں رہی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک دلیلِ روشن کی حیثیت سے اپنا ایک رسول بھیج کر اور اس کے ذریعہ سے پاک صحیفے بالکل راست اور درست تعلیمات پر مشتمل پیش کر کے ان پر حجت تمام کر دی ہے، تاکہ اس کے بعد بھی اگر وہ متفرق رہیں تو اسکی ذمہ داری انہی پر ہے اللہ کے مقابلہ میں وہ کوئی حجت پیش نہ کر سکیں۔ یہ بات قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو البقرہ، آیات ۲۱۳۔۲۵۳۔ آل عمران، ۱۹۔ المائدہ، ۴۴ تا ۵۰۔ یونس، ۹۳۔ الشوریٰ، ۱۳ تا ۱۵۔ الجاثیہ، ۱۶ تا ۱۸۔ اس کے ساتھ اگر وہ حواشی بھی پیشِ نظر رکھے جائیں جو تفہیم القرآن میں ان آیات پر ہم نے لکھے ہیں تو بات سمجھنے میں مزید آسانی ہو گی۔[۶۲]

رسول بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ دنیا کے لوگ، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، جس کفر کی حالت میں مبتلا تھے اُس سے ان کا نکلنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایک ایسا رسول بھیجا جائے جس کا وجود خود اپنی رسالت پر دلیلِ روشن ہو، اور وہ لوگوں کے سامنے خدا کی کتاب کو اس کی اصلی اور صحیح صورت میں پیش کرے جو باطل کی ان تمام آمیزشوں سے پاک ہو جن سے پچھلی کتبِ آسمانی کو آلودہ کر دیا گیا ہے اور بالکل راست اور درست تعلیمات پر مشتمل ہو۔[۶۳]

مقامِ بعثت کا انتخاب

دنیا کا جغرافیہ اٹھا کر دیکھو، تم ایک ہی نظر میں محسوس کر لو گے کہ تمام جہان کی پیغمبری کے لیے رُوئے زمین میں عرب سے زیادہ موزوں مقام اور کوئی نہیں ہے اور نہ کوئی ہو سکتا ہے۔ یہ ملک ایشیا اور افریقہ کے عین وسط میں واقع ہے اور یورپ بھی یہاں سے بہت قریب ہے خصوصاً اُس زمانہ میں یورپ کی متمدن قومیں زیادہ تر یورپ کے جنوبی حصہ میں آباد تھیں اور یہ حصہ عرب سے اتنا ہی قریب ہے جتنا ہندوستان ہے۔

پھر اس زمانہ کی تاریخ پڑھو۔ تم کو معلوم ہو گا کہ اس نبوت کے لیے اُس زمانہ میں عربی قوم سے زیادہ موزوں کوئی قوم نہ تھی۔ دوسری بڑی بڑی قومیں اپنا اپنا زور دکھا کر گویا بے دم ہو چکی تھیں اور عربی قوم تازہ دم تھی۔ تمدن کی ترقی سے دوسری قوموں کی عادتیں بگڑ گئی تھیں اور عربی قوم میں اُس وقت کوئی ایسا تمدن نہیں تھا جو اس کو آرام طلب اور عیش پسند اور رذیل بنا دیتا۔ چھٹی صدی عیسوی کے عرب اُس زمانے کی متمدن قوموں کے بُرے اثرات سے بالکل پاک تھے۔ ان میں وہ تمام انسانی خوبیاں موجود تھیں جو ایک ایسی قوم میں ہو سکتی ہیں جس کو تمدن کی ہوا نہ لگی ہو۔ وہ بہادر تھے۔ بے خوف تھے۔ فیاض تھے۔ عہد کے پابند تھے۔ آزاد خیال اور آزادی کو پسند کرنے والے تھے کسی قوم کے غلام نہ تھے۔ اپنی عزت کے لیے جان دے دینا ان کے لیے آسان تھا۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور عیش و عشرت سے بیگانہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں بہت سی بُرائیاں بھی تھیں کیونکہ ڈھائی ہزار برس سے اُن کے ہاں کوئی پیغمبر نہ آیا تھا[۱]۔ نہ کوئی ایسا رہنما پیدا ہوا تھا جو اُن کے اخلاق کو درست کرتا، اور انہیں

---

[۱] حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہا السلام کا زمانہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈھائی ہزار برس پہلے گزر چکا تھا۔ اس لمبی مدت کے اندر

تہذیب سکھاتا۔ صدیوں تک ریگستان میں آزادی کی زندگی بسر کرنے کے سبب سے ان میں جہالت پھیل گئی تھی، اور وہ اپنی جہالت میں اس قدر سخت ہو گئے تھے کہ اُن کو آدمی بنانا کسی معمولی انسان کے بس کا کام نہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ان میں یہ قابلیت ضرور موجود تھی کہ اگر کوئی زبردست انسان ان کی اصلاح کر دے اور اُس کی تعلیم کے اثر سے وہ کسی اعلیٰ درجہ کے مقصد کو لے کر اُٹھ کھڑے ہوں تو دنیا کو زیر و زبر کر ڈالیں۔ پیغمبرِ عالم کی تعلیم کو پھیلانے کے لیے ایسی ہی جوان اور طاقتور قوم کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد عربی زبان کو دیکھو۔ تم جب اس زبان کو پڑھو گے اور اس کے علم و ادب کا مطالعہ کرو گے تو تم کو معلوم ہو گا کہ بلند خیالات کو ادا کرنے اور خدائی علم کی نہایت نازک اور باریک باتیں بیان کرنے اور دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور زبان نہیں ہے۔ اِس زبان کے مختصر جُملوں میں بڑے بڑے مضامین ادا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان میں ایسا زور ہوتا ہے کہ دلوں میں تیر و نشتر کی طرح اثر کرتے ہیں۔ ایسی شیرینی ہوتی ہے کہ کانوں میں رَس ٹپکتا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نغمہ ہوتا ہے کہ آدمی بے اختیار جھُومنے لگتا ہے۔ قرآن جیسی کتاب کے لیے ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی۔

پس اللہ تعالیٰ کی یہ بہت بڑی حکمت تھی کہ اُس نے تمام جہانوں کی پیغمبری کے لیے عرب کے مقام کو منتخب کیا۔[۶۴]

جہالت زدہ قوم کے لیے بہترین رہنما

ایک قوم صدیوں سے سخت جہالت، پستی، اور بدحالی میں مبتلا چلی آتی ہے۔ یکایک اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت اُس پر ہوتی ہے اور وہ اس کے اندر ایک بہترین رہنما اٹھاتا ہے اور اُسے جہالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے خود اپنا کلام اس رہنما پر نازل کرتا ہے، تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہو، جاہلانہ اوہام کے چکر سے آگاہ ہو کر زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرے۔

مگر اُس قوم کے نادان لوگ اور اس کے خود غرض قبائلی سردار اُس رہنما کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں اور اسے ناکام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ جُوں جُوں سال پر سال گزرتے جاتے ہیں ان کی عداوت اور شرارت بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اُسے قتل کر دینے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کیا تمہاری نالائقی کی وجہ سے ہم تمہاری اصلاح کی کوشش چھوڑ دیں؟ اِس درسِ نصیحت کا سلسلہ روک دیں؟ اور تمہیں اُسی پستی میں پڑا رہنے دیں جس میں تم صدیوں سے گرے ہوئے ہو؟ کیا تمہارے نزدیک واقعی ہماری رحمت کا تقاضا یہی ہونا چاہیے؟ تم نے کچھ سوچا بھی کہ خدا کے فضل کو ٹھکرانا اور حق سامنے آجانے کے بعد باطل پر اصرار کرنا تمہیں کس انجام سے دوچار کرے گا۔[۶۵]

ھ۔ کوئی پیغمبر عرب میں پیدا نہیں ہوا۔

فصل ۲

نبوّتِ محمدیؐ کا عقلی ثبوت

تھوڑی دیر کے لیے جسمانی آنکھیں بند کر کے تصوّر کی آنکھیں کھول لیجیے اور ایک ہزار چار سو برس پیچھے پلٹ کر دنیا کی حالت پر نظر ڈالیے۔ یہ کیسی دنیا تھی؟

۱۴ صدیوں پہلے کی دُنیا

انسان اور انسان کے درمیان تبادلۂ خیالات کے وسائل کس قدر کم تھے۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلق کے ذرائع کتنے محدود تھے۔ انسان کی معلومات کس قدر کم تھیں۔ اس کے خیالات کس قدر ناقص تھے۔ اس پر وہم اور توحّش کا کس قدر غلبہ تھا۔ جہالت کے اندھیرے میں علم کی روشنی کتنی دھندلی تھی اور اس اندھیرے کو دھکیل دھکیل کر کتنی دِقّتوں کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ دُنیا میں نہ تار تھا، نہ ٹیلیفون تھا، نہ ریڈیو تھا، نہ ریل اور ہوائی جہاز، نہ مطابع نہ اشاعت خانے۔ نہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت تھی۔ نہ اخبارات اور رسالے شائع ہوتے تھے نہ کتابیں کثرت سے لکھی جاتی تھیں۔ نہ کثرت سے اُن کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے ایک عالم کی معلومات بعض حیثیات سے موجودہ زمانے کے ایک عام آدمی کی بہ نسبت کم تھیں۔ اس زمانے کی اونچی سوسائٹی کا آدمی بھی موجودہ زمانے کے ایک مزدور کی بہ نسبت کم شائستہ تھا۔ اُس زمانے کا ایک نہایت روشن خیال آدمی بھی آج کل کے تاریک خیال آدمی سے زیادہ تاریک خیال تھا۔ جو باتیں آج ہر کس و ناکس کو معلوم ہیں وہ اُس زمانے میں برسوں کی محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد بمشکل معلوم ہو سکتی تھیں۔ جو معلومات آج روشنی کی طرح فضا میں پھیلی ہوتی ہیں اور ہر بچّے کو ہوش سنبھالتے ہی حاصل ہو جاتی ہیں، ان کے لیے اُس زمانے میں سینکڑوں میل کے سفر کیے جاتے تھے، اور عمریں اس کی جستجو میں بیت جاتی تھیں۔ جن باتوں کو آج اوہام و خرافات سمجھا جاتا ہے، وہ اُس زمانے کے "حقائق" تھے۔ جن افعال کو آج ناشائستہ اور وحشیانہ کہا جاتا ہے، وہ اُس زمانہ کے عام معمولات تھے۔ جن طریقوں سے آج انسان کا ضمیر نفرت کرتا ہے، وہ اُس زمانہ کے اخلاقیات میں نہ صرف جائز تھے بلکہ کوئی شخص یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ ان کے خلاف بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔ انسان کی عجائب پرستی اس قدر بڑھی ہوتی تھی کہ

وہ کسی چیز میں اُس وقت تک کوئی صداقت، کوئی بزرگی تسلیم ہی نہ کر سکتا تھا جب تک وہ فوق الفطرت نہ ہو، خلافِ عادت نہ ہو، غیر معمولی نہ ہو۔ حتیٰ کہ انسان خود اپنے آپ کو اس قدر ذلیل سمجھتا تھا کہ کسی انسان کا خدا رسیدہ ہونا یا کسی خدا رسیدہ کا انسان ہونا اُس کے تصوّر کی رسائی سے بہت دُور تھا۔

سرزمینِ عرب کے احوال

اِس تاریک دَور میں زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تاریکی کا تصرّف اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ جو ممالک اُس زمانے کے معیارِ تمدّن کے لحاظ سے مُتمدّن تھے ان کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ اس کے اِرد گِرد ایران، رُوم اور مصر کے ملکوں میں علُوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی کچھ روشنی پائی جاتی تھی۔ مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جُدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی مسافت طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے، اور صرف اموال کا تبادلہ کر کے واپس آجاتے تھے۔ علم و تہذیب کی کوئی روشنی ان کے ساتھ نہ آتی تھی۔ اُن کے ملک میں نہ کوئی مدرسہ تھا، نہ کتب خانہ۔ نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا، نہ عُلُوم و فنون سے کوئی دلچسپی تھی۔ تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنہیں لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ مگر وہ بھی اِتنا نہیں کہ وہ اس زمانے کے علوم و فنون سے آشنا ہوں۔ ان کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی باقاعدہ زبان ضرور تھی جس میں بلند خیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ اُن میں بہترین ادبی مذاق بھی موجود تھا۔ مگر اُن کے لٹریچر کے جو کچھ باقیات ہم تک پہنچے ہیں ان کو دیکھنے سے معلُوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کس قدر محدُود تھیں۔ تہذیب و تمدّن میں ان کا درجہ کس قدر پست تھا۔ اُن پر اوہام کا کس قدر غلبہ تھا۔ ان کے خیالات اور ان کی عادات میں کتنی جہالت اور وحشت تھی۔ ان کے اخلاقی تصوّرات کتنے بھدّے تھے۔

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ کوئی ضابطہ نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا اور صرف "جنگل کے قانون" کی پیروی کی جاتی تھی۔ جس کا جس پر بس چلتا اسے مار ڈالتا اور اس کے مال پر قابض ہو جاتا۔ یہ بات ایک عرب بدوی کے فہم سے بالاتر تھی کہ جو شخص اُس کے قبیلے کا نہیں ہے اُسے وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اس کے مال پر کیوں نہ متصرّف ہو جائے۔

اخلاق و تہذیب و شائستگی کے جو کچھ بھی تصوّرات ان لوگوں میں تھے وہ نہایت ادنیٰ اور سخت ناتراشیدہ تھے۔ پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً ناآشنا تھے۔ ان کی زندگی نہایت گندی تھی۔ ان کے طریقے وحشیانہ تھے۔ زنا، جوا، شراب، رہزنی اور قتل و خونریزی، ان کی زندگی کے معمولات تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلّف برہنہ ہو جاتے تھے۔ ان کی عورتیں تک ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ وہ اپنی

اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں زندہ دفن کر دیتے تھے محض اِس جاہلانہ خیال کی بنا پر کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے۔ وہ اپنے باپوں کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ انہیں کھانے اور لباس اور طہارت کے معمولی آداب تک معلوم نہ تھے۔

مذہب کے باب میں وہ اُن تمام جہالتوں اور ضلالتوں کے حصہ دار تھے جن میں اُس زمانے کی دنیا مبتلا تھی۔ بت پرستی، اَرْواح پرستی، کواکب پرستی، غرض ایک خدا کی پرستش کے سوا اس وقت دنیا میں جتنی "پرستیاں" پائی جاتی تھیں، وہ سب ان میں رائج تھیں۔ انبیائے قدیم اور ان کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم اُن کے پاس نہ تھا۔ وہ اِتنا ضرور جانتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ ان کے باپ ہیں۔ مگر یہ نہ جانتے تھے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عاد اور ثمود کے قصّے بھی ان میں مشہور تھے۔ مگر ان کی جو روایات عرب کے مؤرّخین نے نقل کی ہیں ان کو پڑھ جائیے، کہیں آپ کو صالحؑ اور ہودؑ کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ ان کو یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے انبیائے بنی اسرائیل کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں۔ مگر وہ جیسی کچھ تھیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک نظر اُن اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے جو مفسّرین اسلام نے نقل کی ہیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہلِ عرب اور خود بنی اسرائیل جن انبیاء سے واقف تھے وہ کیسے انسان تھے اور نبوت کے متعلق ان لوگوں کا تصوّر کس قدر گھٹیا درجہ کا تھا۔

ایک شخصیت سامنے آتی ہے!

ایسے زمانہ میں، ایسے ملک میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے۔ بچپن ہی میں ماں، باپ اور دادا کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ جاتا ہے۔ اِس لیے اِس گئی گذری حالت میں ایک عرب بچے کو جو تھوڑی بہت تربیت مل سکتی تھی وہ بھی اُس کو نہیں ملتی۔ ہوش سنبھالتا ہے تو بدوی لڑکوں کے ساتھ بکریاں چرانے لگتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو سوداگری میں لگ جاتا ہے۔ اُٹھنا، بیٹھنا، ملنا جُلنا، سب کچھ انہی عربوں کے ساتھ ہے جن کا حال اُوپر آپ نے دیکھ لیا ہے۔ تعلیم کا نام تک نہیں، حتّیٰ کہ پڑھنا لکھنا تک نہیں آتا۔ کسی عالم کی صُحبت بھی میسّر نہ ہوئی کہ "عالم" کا وجود اُس وقت تمام عرب میں کہیں نہ تھا۔ چند مرتبہ اُسے عرب سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق ضرور ہوا۔ مگر یہ سفر صرف شام کے علاقے تک تھے اور ویسے ہی تجارتی سفر تھے جیسے اُس زمانے میں عرب کے تجارتی قافلے کیا کرتے تھے۔ بالفرض اگر اِن اَسفار کے دَوران میں اس نے کچھ آثارِ علم و تہذیب کا مشاہدہ کیا اور کچھ اہلِ علم سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا تو ظاہر ہے کہ ایسے منتشر مشاہدات اور ایسی ہنگامی ملاقاتوں سے کسی انسان کی سیرت نہیں بن جاتی۔ اُن کا اثر کسی شخص پر اتنا زبردست نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل آزاد، بالکل مختلف اور اتنا بلند ہو جائے کہ اس میں اور اس کے ماحول میں کچھ نسبت ہی نہ رہے۔ اُن سے ایسا علم حاصل ہونا ممکن نہیں ہے جو ایک اَن پڑھ بدوی کو ایک ملک کا نہیں تمام دنیا کا، اور ایک زمانہ

کا نہیں تمام زمانوں کا لیڈر بنا دے۔ اگر کسی درجہ میں اُس نے باہر کے لوگوں سے علمی استفادہ کیا بھی تو جو معلومات اُس وقت دُنیا میں کسی کو حاصل ہی نہ تھیں۔ مذہب، اخلاق، تہذیب اور تمدّن کے جو تصوّرات اور اصُول اُس وقت دنیا میں کہیں موجود ہی نہ تھے، انسانی سیرت کے جو نمونے اُس وقت کہیں پائے ہی نہ جاتے تھے، اُن کے حصُول کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اُس کا کردار

صرف عرب ہی کا نہیں دُنیا کا ماحول پیشِ نظر رکھیے اور دیکھیے۔

یہ شخص جن لوگوں میں پیدا ہوُا، جن میں بچپن گزارا، جن کے ساتھ پل کر جوان ہوُا، جن سے اس کا میل جول رہا، جن سے اُس کے معاملات رہے، ابتدا ہی سے عادات میں، اخلاق میں وہ اُن سب سے مختلف نظر آتا ہے۔ وہ کبھی جھُوٹ نہیں بولتا، اُس کی صداقت پر اس کی ساری قوم گواہی دیتی ہے۔ اس کے کسی بدترین دُشمن نے کبھی اُس پر یہ الزام نہیں لگایا کہ اُس نے فلاں موقع پر جھُوٹ بولا تھا۔ وہ کسی سے بدکلامی نہیں کرتا۔ کسی نے اس کی زبان سے کبھی گالی یا کوئی فحش بات نہیں سُنی۔ وہ لوگوں سے ہر قسم کے معاملات کرتا ہے، مگر کبھی کسی سے تلخ کلامی اور تُو تُو مَیں مَیں کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اُس کی زبان میں سختی کے بجائے شیرینی ہے اور وہ بھی ایسی کہ جو اس سے ملتا ہے گرویدہ ہو جاتا ہے۔ وہ کسی سے بدمعاملگی نہیں کرتا۔ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ برسوں سوداگری کا پیشہ کرنے کے باوجود کسی کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقہ سے نہیں لیتا۔ جن لوگوں سے اُس کے معاملات پیش آتے ہیں وہ سب اس کی ایمانداری پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ ساری قوم اس کو امین کہتی ہے۔ دُشمن تک اپنے قیمتی مال اُس کے پاس رکھواتے ہیں اور وہ اُن کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ بے حیا لوگوں کے درمیان وہ ایسا حیادار ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد کسی نے اس کو برہنہ نہیں دیکھا۔ بداخلاقوں کے درمیان وہ ایسا پاکیزہ اخلاق ہے کہ کسی بدکاری میں مبتلا نہیں ہوتا۔ شراب اور جوُئے کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ ناشائستہ لوگوں کے درمیان وہ ایسا شائستہ ہے کہ ہر بدتمیزی اور گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کے ہر کام میں پاکیزگی اور سُتھرائی پائی جاتی ہے۔ سنگدلوں کے درمیان وہ ایسا نرم دل ہے کہ ہر ایک کے دُکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتا ہے۔ مسافروں کی میزبانی کرتا ہے کسی کو اس سے دُکھ نہیں پہنچتا اور وہ دوسروں کی خاطر دُکھ اُٹھاتا ہے۔ وحشیوں کے درمیان وہ ایسا صلح پسند ہے کہ اپنی قوم میں فساد اور خونریزی کی گرم بازاری دیکھ کر اس کو اذیت ہوتی ہے۔ اپنے قبیلہ کی لڑائیوں سے دامن بچاتا ہے اور مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش رہتا ہے۔ بُت پرستوں کے درمیان وہ ایسا سلیم الفطرت اور صحیح العقل ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز اُسے پُوجنے کے لائق نظر نہیں آتی۔ کسی مخلوق کے آگے اُس کا سر نہیں جھُکتا۔ بتوں کے چڑھاوے کا کھانا بھی وہ قبول نہیں کرتا۔ اس کا دل خود بخود شرک اور مخلوق پرستی سے نفرت کرتا ہے۔

اِس ماحول میں یہ شخص ایسا ممتاز نظر آتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک شمع روشن ہے، یا پتھروں کے ڈھیر میں ایک ہیرا چمک رہا ہے۔

ذہنی و رُوحانی تغیُّر

تقریباً چالیس سال تک ایسی پاک صاف، شریفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے۔ وہ اُس تاریکی سے گھبرا اٹھتا ہے جو اُس کے ہر طرف مُحیط نظر آرہی تھی۔ وہ جہالت، بداخلاقی، بدکرداری، بدنظمی، شرک اور بُت پرستی کے اِس ہولناک سمندر سے نکل جانا چاہتا ہے جو اُسے گھیرے ہوئے تھا۔ اس ماحول میں اُس کو کوئی چیز بھی اپنی طبیعت کے مناسب نظر نہیں آتی۔ وہ سب سے الگ ہو کر آبادی سے دُور پہاڑوں کی صحبت میں جا جا کر بیٹھنے لگتا ہے۔ تنہائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گزار دیتا ہے۔ روزے رکھ رکھ کر اپنی رُوح اور اپنے دل و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف کرتا ہے۔ سوچتا ہے۔ غور و فکر کرتا ہے۔ کوئی ایسی روشنی ڈھونڈھتا ہے جس سے وہ اِس چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی کو دُور کر دے۔ ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے اِس بگڑی ہوئی دُنیا کو توڑ پھوڑ کر پھر سے سنوار دے۔

پیغامِ انقلاب

یکایک اُس کی حالت میں ایک عظیم الشان تغیُّر رونما ہوتا ہے۔ ایک دم سے اُس کے دل میں وہ روشنی آجاتی ہے جو پہلے اُس میں نہ تھی۔ اچانک اُس کے اندر وہ طاقت بھر جاتی ہے جس سے وہ اس وقت تک خالی تھا۔ وہ غار کی تنہائی سے نکل آتا ہے۔ اپنی قوم کے پاس آتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ یہ بُت جن کے آگے تم جھکتے ہو یہ سب بے حقیقت چیزیں ہیں، اِنہیں چھوڑ دو۔ کوئی انسان، کوئی درخت، کوئی پتھر، کوئی رُوح، کوئی سیّارہ، اس قابل نہیں کہ تم اس کے آگے سر جھکاؤ اور اس کی بندگی و عبادت کرو اور اس کی فرمانبرداری و اطاعت کرو۔ یہ زمین، یہ چاند، یہ سُورج، یہ ستارے، یہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ وہی تمہارا اور سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہی مارنے اور جلانے والا ہے۔ اُسی کی بندگی کرو۔ اُسی کا حکم مانو اور اُسی کے آگے سر جُھکاؤ۔ یہ چوری، یہ لوٹ مار، یہ قتل و غارت، یہ ظلم و ستم، یہ بے حیائیاں اور بدکاریاں جو تم کرتے ہو، سب گناہ ہیں۔ اِنہیں چھوڑ دو۔ خدا اِنہیں پسند نہیں کرتا۔ سچ بولو۔ انصاف کرو۔ نہ کسی کی جان لو نہ کسی کا مال چھینو۔ جو کچھ بھی لو حق کے ساتھ لو، جو کچھ دو حق کے ساتھ دو۔ تم سب انسان ہو۔ انسان اور انسان سب برابر ہیں۔ نہ کوئی ذلّت کا داغ لے کر پیدا ہوا۔ اور نہ کوئی عزّت کا تمغہ لے کر دُنیا میں آیا۔ بزرگی اور شرف نسل اور نسب میں نہیں صرف خدا پرستی اور نیکی اور پاکیزگی میں ہے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے اور نیک اور پاک ہے، وہی اعلیٰ درجے کا انسان ہے۔ اور جو ایسا نہیں وہ کچھ بھی نہیں۔ مرنے کے بعد تم سب کو اپنے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے۔ تم میں سے ہر ہر شخص اپنے اعمال کے لیے خدا

کے سامنے جوابدہ ہے، اُس خدا کے سامنے جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔ تم کوئی چیز اُس سے چھپا نہیں سکتے۔ تمہاری زندگی کا پُورا کارنامہ اُس کے سامنے بے کم و کاست پیش ہوگا، اور اسی کارنامہ کے لحاظ سے وہ تمہارے انجام کا فیصلہ کرے گا۔ اُس عادلِ حقیقی کے ہاں نہ کوئی سفارش کام آئے گی، نہ رشوت چلے گی، نہ کسی کا نسب پوچھا جائے گا۔ وہاں صرف ایمان اور نیک عمل کی پوچھ ہوگی۔ جس کے پاس یہ سامان ہوگا وہ جنت میں جائے گا۔ اور جس کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہ ہوگا وہ نامراد دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

یہ تھا وہ پیغام جسے لے کر وہ غار سے نکلا۔

قوم کا ردِّ عمل

جاہل قوم اُس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے۔ پتھر مارتی ہے۔ ایک دو دن نہیں اکٹھے تیرہ برس تک اس پر سخت سے سخت ظلم توڑتی ہے۔ یہاں تک کہ اُسے وطن سے نکال باہر کرتی ہے۔ اور پھر نکالنے پر بھی دم نہیں لیتی۔ جہاں وہ جا کر پناہ لیتا ہے وہاں بھی اسے ہر طرح ستاتی ہے۔ تمام عرب کو اس کے خلاف اُبھار دیتی ہے اور کامل آٹھ برس اس کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہے۔ وہ ان سب تکلیفوں کو سہتا ہے مگر اپنی بات سے نہیں ٹلتا۔

یہ قوم اُس کی دشمن کیوں ہوئی؟ کیا زر اور زمین کا جھگڑا تھا؟ کیا خون کا کوئی دعویٰ تھا؟ کیا وہ ان سے دنیا کی کوئی چیز بھی مانگ رہا تھا؟ نہیں، ساری دشمنی صرف اس بات پر تھی کہ وہ ایک خدا کی بندگی اور پرہیزگاری اور نیکوکاری کی تعلیم کیوں دیتا ہے۔ بُت پرستی اور شرک اور بدعملی کے خلاف تبلیغ کیوں کرتا ہے۔ پُجاریوں اور پروہتوں کی پیشوائی پر کیوں ضرب لگاتا ہے۔ سرداروں کی سرداری کا طلسم کیوں توڑتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان سے اُونچ نیچ کا فرق کیوں مٹانا چاہتا ہے۔ قبائلی اور نسلی تعصّبات کو جاہلیت کیوں قرار دیتا ہے۔ زمانۂ قدیم سے سوسائٹی کا جو نظام بندھا چلا آرہا ہے، اُسے کیوں توڑنا چاہتا ہے۔ قوم کہتی تھی کہ یہ باتیں جو تُو کہہ رہا ہے، یہ سب خاندانی روایات اور قومی طریقہ کے خلاف ہیں۔ تو ان کو چھوڑ دے۔ ورنہ ہم تیرا جینا مشکل کر دیں گے۔

تحمّلِ شدائد کیوں؟

اچھا تو اس شخص نے یہ تکلیفیں کیوں اٹھائیں؟ قوم اس کو بادشاہی دینے پر آمادہ تھی، دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں ڈالنے کو تیار تھی، بشرطیکہ وہ اِس تعلیم سے باز آجائے۔ مگر اُس نے ان سب کو ٹھکرا دیا اور اپنی تعلیم کی خاطر پتھر کھانا اور ظلم سہنا قبول کیا۔ یہ آخر کیوں؟ کیا ان کے خدا پرست اور نیکوکار بن جانے میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ تھا؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کے مقابلے میں ریاست اور امارت اور دولت اور عیش کے سارے لالچ بھی ناقابلِ التفات تھے؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کی خاطر ایک شخص سخت سے سخت جسمانی اور روحانی اذیّتوں

میں مبتلا ہونا اور کامل ۱۲ سال مبتلا رہنا بھی گوارا کر سکتا ہو؟ غور کرو کیا نیک نفسی، ایثار اور ہمدردیِ بنی نوع کا اِس سے بھی بلند تر کوئی مرتبہ تمہارے تصوّر میں آسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فائدہ کی خاطر نہیں، دوسروں کے بھلے کی خاطر تکلیفیں اٹھاتے؛ جن کی بھلائی اور بہتری کے لیے وہ کوشش کرتا ہے وہی اس کو پتھر ماریں، گالیاں دیں، گھر سے بے گھر کر دیں، غریب الوطنی میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑیں، اور ان سب باتوں پر بھی وہ ان کا بھلا چاہنے سے باز نہ آئے۔

پھر دیکھو! کیا کوئی جھوٹا شخص کسی بے اصل بات کے پیچھے ایسی مصیبتیں برداشت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی تیر تکے لڑانے والا شخص محض گمان اور قیاس سے کوئی بات کہہ کر اس پر اتنا جم سکتا ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ اس پر ٹوٹ جائیں، زمین اس پر تنگ کر دی جائے، تمام ملک اس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو، بڑی بڑی فوجیں اس پر اُمنڈ امنڈ کر آئیں، مگر وہ اپنی بات سے یک سرِ مُو ہٹنے پر آمادہ نہ ہو؟ یہ استقامت، یہ عزم، یہ ثبات، خود گواہی دے رہا ہے کہ اس کو اپنی صداقت پر یقین تھا۔ اگر اس کے دل میں شک و شبہ کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو وہ مسلسل ۱۲ سال تک مصائب کے ان پے در پے طوفانوں کے مقابلہ میں کبھی نہ ٹھیر سکتا۔

یہ تو اس کے انقلابِ حال کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔

انقلابِ حال کا دُوسرا پہلو

چالیس برس کی عمر تک وہ ایک عرب تھا، عام عربوں کی طرح۔ اِس دوران میں کسی نے اس سوداگر کو ایک جادُو بیان مقرّر کی حیثیّت سے نہ جانا۔ کسی نے اس کو اٰلٰہیات اور فلسفۂ اخلاق اور قانون اور سیاسیات اور معاشیات اور عمرانیات کے مسائل پر بحث کرتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس سے خدا اور ملائکہ اور آسمانی کتابوں اور پچھلے انبیاء اور اُمم قدیمہ اور قیامت اور حیات بعد الموت اور دوزخ اور جنت کے متعلق ایک لفظ بھی نہ سُنا۔ وہ پاکیزہ اخلاق، شائستہ اطوار اور بہترین سیرت و کردار تو ضرور رکھتا تھا، مگر چالیس برس کی عمر تک پہنچنے تک اس کی ذات میں کوئی بھی غیر معمولی بات نہ پائی گئی جس سے لوگ متوقع ہوتے کہ یہ شخص اَب کچھ بننے والا ہے۔ اُس وقت تک جاننے والے اس کو محض ایک خاموش امن پسند اور نہایت شریف انسان کی حیثیّت سے جانتے تھے۔ مگر چالیس برس کے بعد جب وہ اپنے غار سے ایک نیا پیغام لے کر نکلا تو یک لخت اس کی کایا ہی پلٹی ہوئی تھی۔

اب وہ ایک حیرت انگیز کلام سُنا رہا تھا جس کو سُن کر سارا عرب مبہوت ہو گیا۔ اس کلام کی شدّتِ تاثیر کا یہ حال تھا کہ اس کے کٹّے سے کٹّے دشمن بھی اس کو سُنتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں یہ دل میں اُتر نہ جائے۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان کا یہ عالَم تھا کہ تمام قوم عرب کو جس میں بڑے بڑے شاعر، خطیب اور زبان آوری کے مدعی موجود تھے، اُس نے چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا کہ تم سب مل کر ایک ہی سُورت اس کی مانند بنا لاؤ۔ مگر کوئی اس کے مقابلے کی جرأت نہ کر سکا۔ ایسا بے مثل کلام کبھی عرب کے کانوں نے سُنا ہی نہ تھا۔

اب یکایک وہ ایک بے مثل حکیم، ایک لاجواب مُصلحِ اخلاق و تمدّن، ایک حیرت انگیز ماہرِ سیاست، ایک زبردست مُقنّن، ایک اعلیٰ درجہ کا جج، ایک بے نظیر سپہ سالار بن کر ظاہر ہوا۔ اُس نے، اُس اَن پڑھ صحرانشین نے، حکمت اور دانائی کی وہ باتیں کہنی شروع کر دیں جو نہ اس سے پہلے کسی نے کہی تھیں، نہ کوئی اس کے بعد کہہ سکا۔ وہ اُمّی الٰہیات پر فیصلہ کُن تقریریں کرنے لگا۔ تاریخِ اقوام سے عروج و زوالِ اُمَم کے فلسفہ پر لیکچر دینے لگا۔ پُرانے مُصلحین کے کارناموں پر تبصرے اور مذاہبِ عالم پر تنقید اور اختلافاتِ اقوام کے فیصلے کرنے لگا۔ اخلاق اور تہذیب اور شائستگی کا درس دینے لگا۔

اس نے معاشرت اور معیشت اور اجتماعی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات کے متعلق قوانین بنانے شروع کر دئیے اور ایسے قوانین بنائے کہ بڑے بڑے علماء اور عقلاء غور و خوض اور عمر بھر کے تجربات کے بعد بمشکل ان کی حکمتوں کو سمجھ سکتے ہیں، اور دنیا کے تجربات جتنے بڑھتے جاتے ہیں، اُن کی حکمتیں اور زیادہ کُھلتی جاتی ہیں۔

وہ خاموش پُرامن سوداگر، جس نے کبھی تمام عمر تلوار نہ چلائی تھی، کبھی کوئی فوجی تربیت نہ پائی تھی، حتیٰ کہ جو عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ ایک لڑائی میں محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا، دیکھتے دیکھتے ایک بہادر سپاہی بن گیا جس کا قدم سخت سے سخت معرکوں میں بھی اپنے مقام سے ایک انچ نہ ہٹا۔ ایسا زبردست جنرل بن گیا جس نے ۹ سال کے اندر تمام ملک عرب کو فتح کر لیا۔ ایسا حیرت انگیز ملٹری لیڈر بن گیا کہ اس کی پیدا کی ہوئی فوجی تنظیم اور جنگی رُوح کے اثر سے بے سر و سامان عربوں نے چند سال میں دُنیا کی دو عظیم الشان فوجی طاقتوں کو اُلٹ کر رکھ دیا۔

وہ الگ تھلگ رہنے والا سکون پسند انسان، جس کے اندر کسی نے چالیس برس تک سیاسی دلچسپی کی بُو بھی نہ پائی تھی، یکایک اتنا زبردست ریفارمر اور مُدبّر بن کر ظاہر ہوا کہ ۲۳ سال کے اندر اُس نے ۱۲ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہوئے ریگستان کے منتشر، جنگجو، جاہل، سرکش، غیر متمدّن اور ہمیشہ آپس میں لڑنے والے قبائل کو، ریل اور تار اور ریڈیو اور پریس کی مدد کے بغیر، ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک قانون اور ایک نظامِ حکومت کا تابع بنا دیا۔ اُس نے اُن کے خیالات بدل دیئے، ان کے اخلاق بدل دیئے، اُن کی ناشائستگی کو اعلیٰ درجہ کی شائستگی میں، ان کی وحشیّت کو بہترین مدنیت میں، ان کی بدکرداری اور بداخلاقی کو صلاح و تقویٰ اور مکارمِ اخلاق میں، اُن کی سرکشی اور انارکی کو انتہا درجہ کی پابندئ قانون اور اطاعتِ امر میں تبدیل کر دیا۔ اُس بانجھ قوم کو، جس کی گود میں صدیوں سے کوئی ایک بھی قابلِ ذکر انسان پیدا نہ ہوا تھا، اُس نے ایسا مردم خیز بنا دیا کہ اس میں ہزار در ہزار اَعاظمِ رجال اُٹھ کھڑے ہوئے اور دُنیا کو دین اور اخلاق اور تہذیب کا درس دینے کے لیے چار دانگِ عالم میں پھیل گئے۔

اخلاقی طریقِ کار

اور یہ کام اُس نے ظلم اور جبر اور دغا اور فریب سے انجام نہیں دیا، بلکہ دل موہ لینے والے اخلاق اور رُوحوں کو مُسخّر

کر لینے والی شرافت اور دماغوں پر قبضہ کر لینے والی تعلیم سے انجام دیا۔ اس نے اپنے اخلاق سے دشمنوں کو دوست بنایا۔ رحم اور شفقت سے دلوں کو موم کیا۔ عدل اور انصاف سے حکومت کی۔ حق اور صداقت سے کبھی یک سرِ مو انحراف نہ کیا۔ جنگ میں بھی کسی سے بدعہدی اور دغا نہ کی۔ اپنے بدترین دشمنوں پر بھی ظلم نہ کیا۔ جو اُس کے خون کے پیاسے تھے، جنہوں نے اس کو پتھّر مارے تھے، اس کو وطن سے نکالا تھا، اُس کے خلاف سارے عرب کو کھڑا کیا تھا، حتیٰ کہ جنہوں نے جوشِ عداوت میں اس کے چچا کا کلیجہ تک نکال کر چبا ڈالا تھا، اُن کو بھی اُس نے فتح پا کر بخش دیا۔ اپنی ذات کے لیے کبھی اس نے کسی سے بدلہ نہ لیا۔

ان سب باتوں کے ساتھ اُس کے ضبطِ نفس، بلکہ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ تمام ملک کا بادشاہ ہو گیا اس وقت بھی وہ جیسا فقیر پہلے تھا ویسا ہی فقیر رہا۔ پھُونس کے چھپّر میں رہتا تھا۔ بوریے پر سوتا تھا۔ موٹا جھوٹا پہنتا تھا۔ غریبوں کی سی غذا کھاتا تھا۔ فاقے تک کر گزرتا تھا۔ رات رات بھر اپنے خدا کی عبادت میں کھڑا رہتا تھا۔ غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت کرتا تھا۔ ایک مزدور کی طرح اسے کام کرنے میں تامّل نہ تھا۔ آخر وقت تک اس کے اندر شاہانہ تمکنت اور امیرانہ ترفّع اور بڑے آدمیوں کے سے تکبّر کی ذرا سی بُو بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ ایک عام آدمی کی طرح لوگوں سے مِلتا جُلتا تھا۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ عوام کے درمیان اس طرح بیٹھتا تھا کہ اجنبی آدمی کو یہ معلوم کرنا مُشکل ہوتا تھا کہ اس محفل میں قوم کا سردار، ملک کا بادشاہ کون ہے۔ اتنا بڑا آدمی ہونے کے باوجود چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا تھا کہ گویا وہ بھی اُسی جیسا انسان ہے۔ تمام عمر کی جدوجہد کے بعد اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اپنا پُورا ترکہ اپنی قوم پر وقف کر دیا۔ اپنے پیرووں پر اس نے اپنے یا اپنی اولاد کے کچھ بھی حقوق قائم نہ کیے، حتیٰ کہ اپنی اولاد کو زکوٰۃ لینے کے حق سے بھی محروم کر دیا محض اِس خوف سے کہ آگے چل کر اس کے پیرو اس کی اولاد ہی کو ساری زکوٰۃ نہ دینے لگیں۔

دَورِ جدید کا بانی

ابھی اِس عظیم الشان آدمی کے کمالات کی فہرست ختم نہیں ہوئی۔ اُس کے مرتبہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے آپ کو تاریخِ عالم پر بحیثیّتِ مجموعی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ آپ دیکھیں گے کہ صحرائے عرب کا یہ اَن پڑھ بادیہ نشین، جو چودہ سو برس پہلے اُس تاریک دَور میں پیدا ہُوا تھا، دراصل دورِ جدید کا بانی اور تمام دُنیا کا لیڈر ہے۔ وہ صرف انہی کا لیڈر نہیں جو اُس کو لیڈر مانتے ہیں۔ بلکہ اُن کا بھی لیڈر ہے جو اُسے نہیں مانتے۔ اُن کو اِس امر کا احساس تک نہیں ہے کہ جس کے خلاف وہ زبان کھولتے ہیں اُس کی رہنمائی کس طرح اُن کے خیالات میں، اُن کے اصولِ حیات اور قوانینِ عمل میں اور اُن کے عصرِ جدید کی رُوح میں پیوست ہو گئی ہے۔

یہی شخص ہے جس نے دُنیا کے تصوّرات کا رُخ وہمیّت اور عجائب پرستی اور رہبانیت کی طرف سے ہٹا کر

عقلیت اور حقیقت پسندی اور متقیانہ دنیاداری کی طرف پھیر دیا۔ اس نے محسوس معجزے مانگنے والی دنیا میں عقلی معجزوں کو سمجھنے اور انہی کو معیارِ صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔ اُس نے خَرقِ عادت میں خُدا کی خدائی کے آثار ڈھونڈنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور اُنہیں آثارِ فطرت (Natural Phenomena) میں خدا کی نشانیاں دیکھنے کا خوگر بنایا۔ اُس نے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو قیاس آرائی (Speculation) سے ہٹا کر تعقّل اور تفکّر، مشاہدہ اور تحقیق کے راستے پر لگایا۔ اُس نے عقل اور حِس کے امتیازی حُدود انسان کو بتائے۔ مادّیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی۔ دین سے علم و عمل کا اور علم و عمل سے دین کا ربط قائم کیا۔ مذہب کی طاقت سے دنیا میں سائنٹفک اسپرٹ اور سائنٹفک اسپرٹ سے صحیح مذہبیت پیدا کی۔ اُس نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا اور علم کی طاقت سے توحید کا اعتقاد ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا کہ مُشرکوں اور بُت پرستوں کے مذہب بھی وحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اُس نے اخلاق اور رُوحانیّت کے بنیادی تصوّرات کو بدلا۔ جو لوگ ترکِ دُنیا اور نفس کُشی کو عین اخلاق سمجھتے تھے، جن کے نزدیک نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے اور دنیاوی زندگی کے معاملات میں حصّہ لینے سے روحانی ترقی اور نجات ممکن ہی نہ تھی، ان کو اُسی نے تمدّن اور سماج اور دنیوی عمل کے اندر فضیلتِ اخلاق ارتقائے رُوحانی اور حصُولِ نجات کا راستہ دکھایا۔ پھر وہی ہے جس نے انسان کو اُس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ جو لوگ بھگوان اور اوتار اور ابنُ اللہ کے سوا کسی کو ہادی اور رہنما تسلیم کرنے کو تیار ہی نہ تھے، ان کو اُسی نے بتایا کہ انسان اور تمہارے ہی جیسا انسان آسمانی بادشاہت کا نمائندہ اور خداوندِ عالم کا خلیفہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ ہر طاقتور انسان کو اپنا خدا بناتے تھے۔ اُن کو اُسی نے سمجھایا کہ انسان بجز انسان کے اور کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص تقدّس اور حکمرانی اور آقائی کا پیدائشی حق لے کر آیا ہے، اور نہ کسی پر ناپاکی اور محکومیّت اور غلامی کا پیدائشی داغ لگا ہوا ہے۔ اسی تعلیم نے دنیا میں وحدتِ انسانی اور مساوات اور جمہُوریّت اور آزادی کے تخیلات پیدا کیے ہیں۔

تصوُّرات سے آگے بڑھیے۔ آپ کو اُس اُمّی کی لیڈر شپ کے عملی نتائج دنیا کے قوانین اور طریقوں اور معاملات میں اِس کثرت سے نظر آئیں گے کہ ان کا شمار مشکل ہو جاتے گا۔ اخلاق اور تہذیب، شائستگی اور طہارت و نظافت کے کتنے ہی اصُول ہیں جو اس کی تعلیم سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ معاشرت کے جو قوانین اس نے بنائے تھے دُنیا نے کس قدر اُن کی خوشہ چینی کی، اور اب تک کیے جا رہی ہے۔ معاشیات کے جو اصول اس نے سکھائے تھے، اُن سے دنیا میں کتنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور اب تک پیدا ہوتے جا رہی ہیں۔ حکومت کے جو طریقے اُس نے اختیار کیے تھے، ان سے دنیا کے سیاسی نظریات میں کتنے انقلاب برپا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ عدل اور قانون کے جو اصُول اُس نے وضع کیے تھے، انہوں نے دنیا کے عدالتی نظامات اور قانونی افکار کو کس قدر متاثر کیا اور اب

تک ان کی تاثیر خاموشی سے جاری ہے۔ جنگ اور صلح اور بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب جس شخص نے عملاً دنیا میں قائم کی وہ دراصل یہی عرب کا اُمّی ہے۔ ورنہ پہلے دنیا اِس سے ناواقف تھی کہ جنگ کی بھی کوئی تہذیب ہو سکتی ہے، اور مختلف قوموں میں مشترک انسانیت کی بنیاد پر بھی معاملات ہونے ممکن ہیں۔

جامعِ کمالات شخصیّت

انسانی تاریخ کے منظر میں اس حیرت انگیز انسان کی بلند و بالا شخصیت اتنی اُبھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک کے بڑے سے بڑے تاریخی انسان، جن کو دنیا اکابر (Heroes) میں شمار کرتی ہے جب اُس کے مقابلے میں لائے جاتے ہیں تو اس کے آگے بَونے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے اکابر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے کمال کی چمک دمک انسانی زندگی کے ایک دو شعبوں سے آگے بڑھ سکی ہو۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے، مگر عملی قوت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل کا پتلا ہے، مگر فکر میں کمزور ہے۔ کسی کے کمالات سیاسی تدبّر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہانت کا مظہر ہے۔ کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے ایک پہلو پر اتنی زیادہ گہری جمی ہے کہ دوسرے پہلو اوجھل ہو گئے۔ کسی نے اخلاق اور روحانیت کو لیا تو معیشت و سیاست کو بُھلا دیا۔ کسی نے معیشت و سیاست کو لیا تو اخلاق و روحانیت کو نظر انداز کر دیا۔ غرض تاریخ میں ہر طرف یک رُخے ہیرو ہی نظر آتے ہیں۔ مگر تنہا یہی ایک شخصیت ایسی ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔ وہ خود ہی فلسفی اور حکیم بھی ہے اور خود ہی اپنے فلسفہ کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والا بھی۔ وہ سیاسی مُدبّر بھی ہے، فوجی لیڈر بھی ہے، واضعِ قانون بھی ہے، مُعلّمِ اخلاق بھی ہے، مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے۔ اس کی نظر انسان کی پوری زندگی پر پھیلتی ہے اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک جاتی ہے۔ کھانے اور پینے کے آداب اور جسم کی صفائی کے طریقوں سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک ایک ایک چیز کے متعلق وہ احکام اور ہدایات دیتا ہے۔ اپنے نظریات کے مطابق ایک تہذیب (Civilization) وجود میں لا کر دکھا دیتا ہے۔ اور زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں میں ایسا صحیح توازُن (Equilibrium) قائم کرتا ہے کہ افراط و تفریط کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ کیا اِس جامعیت کا کوئی دوسرا شخص تمہاری نظر میں ہے۔

ماحول سے مافوق ہستی

دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو کم و بیش اپنے ماحول کی پیدا کردہ نہ ہو۔ مگر اس شخص کی شان سب سے نرالی ہے۔ اس کے بنانے میں اس کے ماحول کا کوئی حصّہ نظر نہیں آتا اور نہ کسی دلیل سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عرب کا ماحول اُس وقت تاریخی طور پر ایسے ایک انسان کی پیدائش کا مقتضی تھا۔ بہت کھینچ تان کر تم جو کچھ کہہ سکتے ہو وہ اِس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ تاریخی اسباب عرب میں ایک ایسے لیڈر کے ظہور کا

تقاضا کر رہے تھے، جو قبائلی انتشار کو مٹا کر ایک قوم بناتا، اور ممالک کو فتح کر کے عربوں کی معاشی فلاح و بہبود کا سامان کرتا ــــ یعنی ایک نیشنلسٹ لیڈر، جو اُس وقت کی تمام عربی خصوصیات کا حامل ہوتا ظلم، بیرحمی، خوں ریزی اور مکر و دغا، غرض ہر ممکن تدبیر سے اپنی قوم کو خوش حال بناتا، اور ایک سلطنت پیدا کر کے اپنے پسماندوں کے لیے چھوڑ جاتا۔ اِس کے سوا اُس وقت کی عربی تاریخ کا کوئی تقاضا تم ثابت نہیں کر سکتے۔ ہیگل کے فلسفۂ تاریخ یا مارکس کی مادّی تعبیرِ تاریخ کے نقطۂ نظر سے تم حد سے حد یہی حکم لگا سکتے ہو کہ اس ماحول میں ایک قوم اور سلطنت بنانے والا ظاہر ہونا چاہیے تھا یا ظاہر ہو سکتا تھا۔ مگر ہیگلی یا مارکسی فلسفہ اس واقعہ کی توجیہ کیوں کر کرے گا کہ اُس وقت اس ماحول میں ایسا شخص پیدا ہُوا جو بہترین اخلاق سکھانے والا اور انسانیت کو سنوارنے اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا، اور جاہلیت کے اوہام و تعصبات کو مٹانے والا تھا۔ جس کی نظر قوم اور نسل اور ملک کی حدیں توڑ کر پُوری انسانیت پر پھیل گئی۔ جس نے اپنی قوم کے لیے نہیں بلکہ عالمِ انسانی کے لیے ایک اخلاقی و روحانی اور تمدنی و سیاسی نظام کی بنا ڈالی۔ جس نے معاشی معاملات اور سیاستِ مُدن اور بین الاقوامی تعلقات کو عالمِ خیال میں نہیں بلکہ عالمِ واقعہ میں اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے دکھا دیا اور روحانیت اور مادّیت کی ایسی معتدل اور متوازن آمیزش کی جو آج بھی حکمت و دانائی کا ویسا ہی شاہکار ہے جیسا اُس وقت تھا؟ کیا ایسے شخص کو تم عرب جاہلیت کے ماحول کی پیداوار کہہ سکتے ہو؟

تاریخ ساز شخصیّت

یہی نہیں کہ وہ شخص اپنے ماحول کی پیداوار نظر نہیں آتا بلکہ جب ہم اس کے کارنامے پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اس کی نظر وقت اور حالات کی بندشوں کو توڑتی ہوئی صدیوں اور ہزاریوں (Millenniums) کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ وہ انسان کو ہر زمانے اور ہر ماحول میں دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کے لیے ایسی اخلاقی و عملی ہدایات دیتا ہے جو ہر حال میں یکساں مناسبت کے ساتھ ٹھیک بیٹھتی ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جن کو تاریخ نے پُرانا کر دیا ہے، جن کی تعریف ہم صرف اِس حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ اپنے زمانے کے اچھے رہنما تھے۔ سب سے الگ اور سب سے ممتاز، وہ انسانیت کا ایسا رہنما ہے جو تاریخ کے ساتھ حرکت (March) کرتا ہے اور ہر دَور میں ویسا ہی جدید (Modern) نظر آتا ہے جیسا اس سے پہلے دَور کے لیے تھا۔

تم جن لوگوں کو فیاضی کے ساتھ "تاریخ بنانے والے" (Makers of History) کا لقب دیتے ہو وہ حقیقت میں تاریخ کے بنائے ہوتے (Creatures of History) ہیں۔ دراصل تاریخ بنانے والا پُوری انسانی تاریخ میں صرف یہی ایک شخص ہے۔ دنیا کے جتنے لیڈروں نے تاریخ میں انقلاب برپا کیے ہیں ان کے حالات پر تحقیقی نگاہ ڈالو تو دیکھو گے کہ اس موقع پر پہلے سے انقلاب کے اسباب پیدا ہو رہے تھے اور وہ اسباب خود ہی اُس

انقلاب کا رُخ اور راستہ بھی معیّن کر رہے تھے جس کے پیدا ہونے کے وہ مقتضی تھے۔ انقلابی لیڈر نے صرف اتنا کیا کہ حالات کے اقتضاء کو قوّت سے فعل میں لانے کے لیے اس ایکٹر کا پارٹ ادا کر دیا جس کے لیے سٹیج اور کام دونوں پہلے سے معیّن ہوں۔ مگر تاریخ بنانے والوں یا انقلاب برپا کرنے والوں کی پُوری جماعت میں یہ اکیلا ایسا شخص ہے کہ جہاں انقلاب کے اسباب موجود نہ تھے وہاں اس نے خود اسباب کو پیدا کیا۔ جہاں انقلاب کا مواد موجُود نہ تھا وہاں اس کا مواد خود تیار کیا۔ جہاں اس انقلاب کی اسپرٹ اور عملی استعداد لوگوں میں نہ پائی جاتی تھی، یہاں اس نے خود اپنے مطلب کے آدمی تیار کیے۔ اپنی زبردست شخصیت کو پگھلا کر ہزارہا انسانوں کے قالب میں اُتار دیا اور ان کو ویسا بنایا جیسا وہ بنانا چاہتا تھا۔ اُس کی طاقت اور قوتِ ارادی نے خود ہی انقلاب کا سامان کیا، خود ہی اس کی صورت اور نوعیت معیّن کی، اور خود ہی اپنے ارادے کے زور سے حالات کی رفتار کو موڑ کر اُس راستے پر چلایا جس پر وہ اُسے چلانا چاہتا تھا۔ اِس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبے کا انقلاب انگیز تم کو اور کہاں نظر آتا ہے؟

اس کی کمال درجہ راستبازی

آئیے اب اس سوال پر غور کیجیے کہ ۱۴ سو برس پہلے کی تاریک دنیا میں، عرب جیسے تاریک تر ملک کے ایک گوشہ میں ایک گلہ بانی اور سوداگری کرنے والے اَن پڑھ بادیہ نشین کے اندر یکایک اِتنا علم، اتنی روشنی، اِتنی طاقت، اتنے کمالات، اتنی زبردست تربیت یافتہ قوّتیں پیدا ہو جانے کا کونسا ذریعہ تھا؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ سب اس کے اپنے دل و دماغ کی پیداوار تھی۔ مَیں کہتا ہوں کہ اگر یہ اُسی کے دل و دماغ کی پیداوار تھی تو اس کو نبوت کا نہیں خدائی کا دعوٰی کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر وہ ایسا دعوی کرتا تو وہ دنیا جس نے رام کو خدا بنا لیا، جس نے کرشن کو بھگوان قرار دینے میں تامّل نہ کیا، جس نے بُودھ کو خود بخود معبُود بنا لیا، جس نے مسیح کو آپ اپنی مرضی سے ابنُ اللہ مان لیا، جس نے آگ اور پانی اور ہوا تک کو پُوج ڈالا، وہ ایسے زبردست باکمال شخص کو خدا مان لینے سے کبھی انکار نہ کرتی۔ مگر دیکھو وہ خود کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے کمالات میں سے کسی ایک کا کریڈٹ بھی خود نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ مَیں ایک انسان ہُوں تم ہی جیسا انسان۔ میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں سب کچھ خدا کا ہے اور خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ کلام جس کی نظیر لانے سے تمام نوعِ انسانی عاجز ہے، میرا کلام نہیں ہے۔ میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے، لفظ بلفظ خدا کی طرف سے میرے پاس آیا ہے اور اس کی تعریف خدا ہی کے لیے ہے۔ یہ کارنامے جو مَیں نے دکھائے، یہ قوانین جو مَیں نے وضع کیے، یہ اصول جو مَیں نے تمہیں سکھائے، ان میں سے کوئی چیز بھی مَیں نے خود نہیں گھڑی ہے۔ مَیں کچھ بھی اپنی ذاتی قابلیت سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ ہر ہر چیز میں خدا کی رہنمائی کا محتاج ہوں۔ اُدھر سے جو اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں۔

دیکھو یہ کیسی حیرت انگیز صداقت ہے۔ کیسی امانت اور راست بازی ہے۔ جھُوٹا انسان تو بڑا بننے کے لیے

دوسروں کے ایسے کمالات کا کریڈٹ بھی لے لینے میں تامل نہیں کرتا جن کے اصل ماخذ کا پتہ بآسانی چل جاتا ہے۔ لیکن یہ شخص اُن کمالات کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا جن کو اگر وہ اپنے کمالات کہتا تو کوئی اس کو جھٹلا نہ سکتا تھا، کیونکہ کسی کے پاس ان کے اصلی ماخذ تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ سچائی کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟ اُس شخص سے زیادہ سچّا اور کون ہوگا جس کو ایک نہایت مخفی ذریعہ سے ایسے بے نظیر کمالات حاصل ہوں اور وہ بلا تکلّف اپنے اصلی ماخذ کا حوالہ دے دے؟ بتاؤ کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق نہ کریں؟[۲۶]

فصل ۳

نبوّتِ محمّدی پر قرآن میں اِستدلال

(چند اہم نکات)[1]

قرآن کہتا ہے:

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (العنکبوت: ۴۸-۴۹)

اے نبیؐ! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے۔

اِس آیت میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اَن پڑھ تھے آپ کے اہلِ وطن اور رشتہ و برادری کے لوگ جن کے درمیان روزِ پیدائش سے سنِ کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اِس بات سے خوب واقف تھے کہ آپؐ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔

اُمّی ہونے سے نبوّت پر استدلال

اِس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اِس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات؛ انبیاءِ سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدّن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل

---

[1] قرآن میں نبوتِ محمّدی پر بحث و استدلال کا سلسلہ اتنا وسیع ہے کہ اس کو اس کتاب کے ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ پھر قرآنی استدلال کی جو توضیحات مولانا مودودی نے کی ہیں، ان سب کو یکجا کیا جائے تو یہ مضمون خود ایک کتاب بن جائے گا۔ پس چند اہم نکات کے متعلق مولانا کی مختصر بحثیں یہاں درج کی جا رہی ہیں۔

(مُرتّب)

پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اِس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا[1] اور لوگوں نے کبھی اسے کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا

---

[1] قرآن مجید کے اس بیان و استدلال کے بعد اُن لوگوں کی جسارت حیرت انگیز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن صاف الفاظ میں حضورؐ کے ناخواندہ ہونے کو آپؐ کی نبوت کے حق میں ایک طاقتور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ جن روایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضورؐ پڑھے لکھے تھے، یا بعد میں آپؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا وہ اوّل تو پہلی ہی نظر میں رد کر دینے کے لائق ہیں کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی پھر وہ بجائے خود بھی اتنی کمزور ہیں کہ ان پر کسی استدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک بخاری کی یہ روایت ہے کہ صلح حُدیبیہ کا معاہدہ جب لکھا جا رہا تھا تو کفّارِ مکہ کے نمائندے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نام کے ساتھ رسُول اللہ لکھے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضورؐ نے کاتب (یعنی حضرت علیؓ) کو حکم دیا کہ اچھا رسُول اللہ کا لفظ کاٹ کر محمدؐ بن عبداللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے لفظ رسُول اللہ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضورؐ نے ان کے ہاتھ سے لے کر وہ الفاظ خود کاٹ دیے اور محمدؐ بن عبداللہ لکھ دیا۔

لیکن یہ روایت براءؓ بن عازب سے بخاری میں چار جگہ اور مُسلم میں دو جگہ وارد ہوئی ہے اور ہر جگہ الفاظ مختلف ہیں:

(۱) بخاری کتاب الصلح میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: قال لعلیؓ امحہ فقال علیؓ ما انا بالذی امحاہ فمحاہ رسُول اللہ بیدہٖ۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا یہ الفاظ کاٹ دو، انہوں نے عرض کیا مَیں تو نہیں کاٹ سکتا۔ آخر کار حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے اُنہیں کاٹ دیا۔

(۲) اسی کتاب میں دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ثم قال لعلیؓ امح رسول اللہ قال لا واللہ لا امحوك ابداً فاخذ رسول اللہ الکتاب فکتب ھٰذا ما قاضیٰ علیہ محمد بن عبد اللہ۔ پھر علیؓ سے کہا "رسول اللہ" کاٹ دو۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم مَیں آپ کا نام کبھی نہ کاٹوں گا۔ آخر حضورؐ نے تحریر لے کر لکھا یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبداللہ نے طے کیا۔

(۳) تیسری روایت انہی براءؓ بن عازب سے بخاری کتاب الجزیہ میں یہ ہے: وکان لا یکتب فقال لعلیؓ امح رسول اللہ فقال علیؓ واللہ لا امحاہ ابداً قال فارنیہ قال فاراہ ایاہ فمحاہ النبی صلی اللہ علیہ وسلّم بیدہٖ۔ حضورؐ خود نہ لکھ سکتے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا رسول اللہ کاٹ دو۔ انہوں نے عرض کیا خدا کی قسم مَیں یہ الفاظ ہرگز نہ کاٹوں گا۔ اِس پر حضورؐ نے فرمایا مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ انہوں نے آپؐ کو جگہ بتائی اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے وہ الفاظ کاٹ دیئے۔

(۴) چوتھی روایت بخاری کتاب المغازی میں یہ ہے فاخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم الکتاب ولیس

ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل

یحسن یکتب فکتب ھٰذا ما قاضیٰ محمد بن عبد اللہ - پس حضورؐ نے وہ تحریر لے لی، درآنحالیکہ آپؐ لکھنا نہ جانتے تھے اور آپؐ نے لکھا "یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبداللہ نے طے کیا۔

(۵) انہی براء ابن عازب سے مُسلم کتاب الجہاد میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے انکار کرنے پر حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے "رسولُ اللہ" کے الفاظ مٹا دیئے۔

(۶) دوسری روایت اِسی کتاب میں ان سے یہ منقول ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا مجھے بتاؤ رسولُ اللہ کا لفظ کہاں ہے، حضرت علیؓ نے آپ کو جگہ بتائی، اور آپؐ نے اسے مٹا کر ابن عبداللہ لکھ دیا۔

روایات کا یہ اضطراب صاف بتا رہا ہے کہ بیچ کے راویوں نے حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ کے الفاظ جوں کے توں نقل نہیں کیے ہیں، اِس لیے ان میں سے کسی ایک کی نقل پر بھی ایسا مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ یقینی طور پر یہ کہا جاسکے کہ حضورؐ نے "محمدؐ بن عبداللہ" کے الفاظ اپنے دستِ مبارک ہی سے لکھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ صحیح صورتِ واقعہ یہ ہو کہ جب حضرتِ علیؓ نے "رسُول اللہ" کا لفظ مٹانے سے انکار کیا تو آپؐ نے اس کی جگہ اُن سے پُوچھ کر یہ لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا دیا ہو اور پھر ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے ابن عبداللہ کے الفاظ لکھوا دیئے ہوں۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صلح نامہ دو کاتب لکھ رہے تھے۔ ایک حضرتِ علیؓ، دوسرے محمد بن مَسْلَمہ (فتح الباری، جلد ۵، ص ۲۱۷)۔ اس لیے یہ امر بعید نہیں ہے کہ جو کام ایک کاتب نے نہ کیا تھا وہ دوسرے کاتب سے لے لیا گیا ہو۔

دوسری روایت جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے خواندہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے مجاہد سے ابن ابی شَیْبَہ اور عمر بن شَیْبَہ نے نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتیٰ کتب وقرأ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے)۔ لیکن اوّل تو یہ سنداً بہت ضعیف روایت ہے، جیسا کہ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں فضعیف لا اصل لہ۔ دوسرے اس کی کمزوری یُوں بھی واضح ہے کہ اگر حضورؐ نے فی الواقع بعد میں پڑھنا لکھنا سیکھا ہوتا تو یہ بات مشہور ہو جاتی، بہت سے صحابہ اس کو روایت کرتے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ حضورؐ نے کس شخص یا کن اشخاص سے یہ تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن سوائے ایک عَون بن عبداللہ کے، جن سے مُجاہد نے یہ بات سُنی، اور کوئی شخص اسے روایت نہیں کرتا۔ اور یہ عَون بھی صحابہ نہیں بلکہ تابعی ہیں جنہوں نے قطعاً یہ نہیں بتایا کہ انہیں کس صحابی یا کن صحابیوں سے اس واقعہ کا علم ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمزور روایتوں کی بنیاد پر کوئی ایسی بات قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی جو مشہور و معروف واقعات کی تردید کرتی ہو۔

کیا گیا ہے۔ لیکن اُس کی اُمیّت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص ہٹ دھرمی کے سوا اس کی نبوّت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجہ میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔[68]

ایک اُمّی کا قرآن جیسی کتاب پیش کرنا اور یکایک اُن غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کے لیے کسی سابقہ تیاری کے آثار کبھی کسی کے مشاہدے میں نہیں آئے، یہی دانش و بینش رکھنے والوں کی نگاہ میں اس کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن ترین نشانیاں ہیں[1]۔ دُنیا کی تاریخی ہستیوں میں سے جس کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے، آدمی اس کے اپنے ماحول میں اُن اسباب کا پتہ چلا سکتا ہے جو اس کی شخصیت بنانے اور اس سے ظاہر ہونے والے کمالات کے لیے اس کو تیار کرنے میں کارفرما تھے۔ اُس کے ماحول اور اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ایک کھلی مناسبت پائی جاتی ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت جن حیرت انگیز کمالات کی مظہر تھی اُن کا کوئی ماخذ آپؐ کے ماحول میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں نہ اس وقت کے عربی معاشرے میں، اور نہ گردوپیش کے جن ممالک سے عرب کے تعلقات تھے اُن کے معاشرے میں، کہیں دُور دراز سے بھی وہ عناصر ڈھونڈ کر نہیں نکالے جا سکتے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے کوئی مناسبت رکھتے ہوں۔ یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر یہاں فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک نشانی نہیں[2] بلکہ بہت سی روشن نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ جاہل آدمی کو اس میں کوئی نشانی نظر نہ آتی ہو تو نہ آئے، مگر جو لوگ علم رکھنے والے ہیں وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں قائل ہو گئے ہیں کہ یہ شان ایک پیغمبر ہی کی ہو سکتی ہے۔[69]

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ "کیوں نہ اُتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں اُس کے رب کی طرف سے" کہو "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور مَیں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر" ـــ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؛ درحقیقت اس

---

[1] "نبوتِ محمدی کا عقلی ثبوت" میں بھی یہ استدلال شامل ہے۔ مگر وہاں قرآنی استدلال کو سامنے لائے بغیر ایک حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ (مرتب)

[2] اس موقع پر قرآن اُن معترضین کو بھی جواب دے رہا ہے جو حضورؐ کی نبوّت کو تسلیم کرنے کی شرط کے طور پر محیرالعقول نشانی یعنی معجزہ طلب کرتے تھے۔ (مرتب)

(العنکبوت : ۵۰-۵۱) میں رحمت ہے اور نصیحت اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"

یعنی اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا، کیا یہ بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمہاری رسالت پر یقین لانے کے لیے یہ کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنہوں نے دیکھے ان کے لیے وہ معجزے تھے۔ مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمہارے سامنے ہے۔ تمہیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔

نبوّت سے پہلے کی زندگی سے استشہاد

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ (یُونس - ۱۶) "آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تم لوگوں کے درمیان گزار چکا ہوں۔"

یہ ایک زبردست دلیل ہے مشرکین قریش کے اِس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مصنّف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر دُور کی چیز تھے۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی تو ان کے سامنے کی چیز تھی۔ آپؐ نے نبوّت سے پہلے پُورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے آپؐ کا بچپن گزرا، جوان ہوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے۔ رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق اُنہی کے ساتھ تھا اور آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو اُن سے چھُپا ہوا نہیں تھا۔ ایسی جانی بُوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھُلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔ آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنہیں مکّہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا۔

ایک یہ کہ نبوّت سے پہلے کی پُوری چالیس سالہ زندگی میں آپؐ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صُحبت نہیں پائی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوّت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے اور اُن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے، جو اب قرآن کی ان پے در پے سُورتوں میں زیرِ بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پُورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپؐ کی باتوں اور آپؐ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اُس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو جو آپؐ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی، یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپؐ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خارج سے آپ کے اندر آتی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی

عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کرسکتا جس کے نشو ونما اور ارتقاء کے واضح نشانات اس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکّہ کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپؐ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمدؐ کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ مکّہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنّف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے؟

دوسری بات جو آپؐ کی سابق زندگی میں نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکّاری، عیّاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپؐ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں آپؐ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اسے ہوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپؐ سے سابقہ پیش آیا تھا وہ آپؐ کو ایک نہایت سچے، بے داغ اور قابلِ اعتماد (امین) انسان کی حیثیّت ہی سے جانتے تھے۔ نبوّت سے پانچ ہی سال پہلے تعمیر کعبہ کے سلسلہ میں وہ مشہور واقعہ پیش آچکا تھا جس میں حجرِ اسود کو نصب کرنے کے معاملہ پر قریش کے مختلف خاندان جھگڑ پڑے تھے اور آپس میں طے ہُوا تھا کہ کل صبح پہلا شخص جو حرم میں داخل ہوگا اُسی کو پنچ مان لیا جائے گا۔ دوسرے روز وہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلّم تھے جو وہاں داخل ہوئے۔ آپؐ کو دیکھتے ہی سب لوگ پکار اُٹھے ھٰذا الامین رضینا، ھٰذا محمّد "یہ بالکل راست باز آدمی ہے، ہم اس پر راضی ہیں، یہ تو محمدؐ ہے"۔ اس طرح آپ کو نبی مقرر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پورے قبیلۂ قریش سے بھرے مجمع میں آپ کے "امین" ہونے کی شہادت لے چکا تھا۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ، جعل اور فریب سے کام نہ لیا تھا، وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل فریب لے کر اٹھ کھڑا ہُوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور تحدّی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا	اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک
مِّنْ اَمْرِنَا ط مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا	رُوح تمہاری طرف وحی کی۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ
الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ۔ (الشوریٰ ۵۲)	کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔

نبوّت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضور علیہ السّلام کے ذہن میں یہ تصوّر تک نہ آیا تھا کہ آپ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے یا ملنی چاہیے۔ بلکہ آپ سرے سے کتبِ آسمانی اور ان کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اسی طرح آپ کو اللہ پر ایمان تو ضرور تھا مگر یہ نہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کتبِ الٰہی اور آخرت کے

متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفارِ مکہ سے بھی چھپی ہوئی نہ تھیں۔ مکۂ معظّمہ کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اس نے نبوّت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضورؐ کی زبان سے کتابِ الٰہی کا ذکر سُنا ہو یا آپ سے اس طرح کی کوئی بات سُنی ہو کہ لوگوں کو فلاں فلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے سے خود نبی بن بیٹھنے کی تیاری کر رہا ہو تو اس کی یہ حالت تو کبھی نہیں ہو سکتی کہ چالیس سال تک اس کے ساتھ شب و روز کا میل جول رکھنے والے اس کی زبان سے کتاب اور ایمان کا لفظ تک نہ سُنیں اور چالیس سال کے بعد یکایک وہ انہی موضوعات پر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے۔[۱۲]

وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ۔ (القصص - ۸۶)	تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی، یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے (تم پر نازل ہوئی ہے) پس تم کافروں کے مددگار نہ بنو۔

یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کے ثبوت میں پیش کی جا رہی ہے۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام بالکل بے خبر تھے کہ انہیں نبی بنایا جانے والا ہے اور ایک عظیم الشان مشن پر وہ مامور کیے جانے والے ہیں، اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی اِس کا ارادہ یا خواہش تو درکنار اس کی توقع تک کبھی نہ گزری تھی، بس یکایک راہ چلتے انہیں کھینچ بلایا گیا اور نبی بنا کر وہ حیرت انگیز کام ان سے لیا گیا جو ان کی سابق زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا، ٹھیک ایسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکہ کے لوگ خود جانتے تھے کہ غارِ حراء سے جس روز آپ نبوّت کا پیغام لے کر اُترے اُس سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی کیا تھی، آپ کے مشاغل کیا تھے، آپ کی بات چیت کیا تھی، آپ کی گفتگو کے موضوعات کیا تھے، آپ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں یہ پوری زندگی صداقت، دیانت، امانت اور پاکبازی سے لبریز ضرور تھی۔ اس میں انتہائی شرافت، امن پسندی، پاسِ عہد، اداتے حقوق اور خدمتِ خلق کا رنگ بھی غیر معمولی شان کے ساتھ نمایاں تھا۔ مگر اس میں کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال گزر سکتا ہو کہ یہ نیک بندہ کل نبوّت کا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ آپ سے قریب ترین ربط ضبط رکھنے والوں میں، آپ کے رشتہ داروں اور ہمسایوں اور دوستوں میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپؐ پہلے سے نبی بننے کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے اُن مضامین اور مسائل اور موضوعات کے متعلق کبھی ایک لفظ تک آپ کی زبان سے نہ سُنا تھا جو غارِ حرا کی اُس انقلابی ساعت کے بعد یکایک آپؐ کی زبان پر جاری ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے آپ کو وہ مخصوص زبان اور وہ الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتے نہ سُنا تھا جو اچانک قرآن کی صورت میں لوگ آپ سے سننے لگے۔ کبھی آپؐ وعظ کہنے کھڑے نہ ہوئے تھے۔

کبھی کوئی دعوت اور تحریک لے کر نہ اُٹھے تھے۔ بلکہ کبھی آپ کی کسی سرگرمی سے یہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ آپ اجتماعی مسائل کے حل، یا مذہبی اصلاح یا اخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کام شروع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس انقلابی ساعت سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی ایک ایسے تاجر کی زندگی نظر آتی تھی جو سیدھے سادھے جائز طریقوں سے اپنی روزی کماتا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا ہے، مہمانوں کی تواضع، غریبوں کی مدد اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرتا ہے، اور کبھی کبھی عبادت کے لیے خلوت میں جا بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کا یکایک ایک عالمگیر زلزلہ ڈال دینے والی خطابت کے ساتھ اٹھنا، ایک انقلاب انگیز دعوت شروع کر دینا، ایک نرالا لٹریچر پیدا کر دینا، ایک مستقل فلسفۂ حیات اور نظامِ فکر و اخلاق و تمدن لے کر سامنے آجانا، اتنا بڑا تغیّر ہے جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے کسی بناوٹ اور تیاری اور ارادی کوشش کے نتیجے میں قطعاً رُونما نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے کہ ایسی ہر کوشش اور تیاری بہرحال تاریخی ارتقاء کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل اُن لوگوں سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتے جن کے درمیان آدمی شب و روز گزارتا ہو۔ اگر آنحضرتؐ کی زندگی اِن مراحل سے گزری ہوتی تو مکہ میں سینکڑوں زبانیں یہ کہنے والی ہوتیں کہ ہم نہ کہتے تھے، یہ شخص ایک دن کوئی بڑا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کُفّارِ مکہ نے آپؐ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر یہ اعتراض کرنے والا اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تھا۔

پھر یہ بات کہ آپ خود بھی نبوّت کے خواہش مند، یا اس کے لیے متوقع اور منتظر نہ تھے، بلکہ پُوری بے خبری کی حالت میں اچانک آپ کو اس معاملہ سے سابقہ پیش آگیا، اِس کا ثبوت اُس واقعہ سے ملتا ہے جو احادیث میں آغازِ وحی کی کیفیت کے متعلق منقول ہوا ہے۔ جبریلؑ سے پہلی ملاقات اور سورۂ علق کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد آپ غارِ حراء سے کانپتے اور لرزتے ہوتے گھر پہنچتے ہیں۔ گھر والوں سے کہتے ہیں کہ "مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ"۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوتی ہے تو اپنی رفیقِ زندگی کو سارا ماجرا سُنا کر کہتے ہیں کہ "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"۔ وہ فوراً جواب دیتی ہیں "ہرگز نہیں۔ آپؐ کو اللہ کبھی رنج میں نہ ڈالے گا۔ آپ تو قرابت داروں کے حق ادا کرتے ہیں۔ بے کس کو سہارا دیتے ہیں۔ بے زر کی دستگیری کرتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ ہر کارِ خیر میں مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں"۔ پھر وہ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس جاتی ہیں جو اُن کے چچازاد بھائی اور اہلِ کتاب میں سے ایک ذی علم اور راستباز آدمی تھے۔ وہ آپ سے سارا واقعہ سننے کے بعد بلا تأمل کہتے ہیں کہ "یہ جو آپ کے پاس آیا ہے وہی ناموس (کارِ خاص پر مامور فرشتہ) ہے جو موسیٰؑ کے پاس آتا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا اور اُس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی"۔ آپ پوچھتے ہیں "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" وہ جواب دیتے ہیں "ہاں، کوئی شخص ایسا نہیں گزرا کہ وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لاتے ہیں اور لوگ اس کے دشمن نہ ہو گئے ہوں"۔

یہ پورا واقعہ اُس حالت کی تصویر کشی کر دیتا ہے جو بالکل فطری طور پر یکایک خلافِ توقع ایک انتہائی غیر معمولی تجربہ پیش آجانے سے کسی سیدھے سادھے انسان پر طاری ہو سکتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مراقبے کر کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے، تو غارِ حراء والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اُچھل پڑتے اور بڑے دم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اُتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوّت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھیرتا ہے تو بیوی کو چُپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غار کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے، مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوّت کے کسی اُمیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے۔

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے؟ اگر اُن کے تجربے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوتی ہوتی کہ میاں نبوّت کے امیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں، تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو، جس چیز کی مدّتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو، اب پیری کی دُکان چمکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں۔ لیکن وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں اس کی بنا پر انہیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آسکتا، نہ اللہ اس کو کسی بُری آزمائش میں ڈال سکتا ہے، اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر حقیقت ہے۔

اور یہی معاملہ وَرَقہ بن نوفل کا بھی ہے۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضورؐ کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادرِ نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبُوّت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنّع سے ممیّز کر سکتے تھے۔ عُمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپ کی پوری زندگی بچپن سے اُس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے بھی آپ کی زبان سے حراء کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو مُوسیٰ علیہ السّلام پر وحی لاتا تھا۔ کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو مُوسیٰؑ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادھا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوّت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اس کے حصُول کا تصوّر تک اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے، اور اچانک وہ پورے ہوش و حواس کی حالت میں عَلانیہ اس تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی چیز نے اُن کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تامّل اِس نتیجہ تک پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریبِ نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے، بلکہ اِس سچّے انسان نے اپنے کسی

ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے وہ دراصل حقیقت ہی کا مشاہدہ ہے۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیلِ نبوّت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں فرمایا:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (آیت: ۱۶)

اے نبیؐ ان سے کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا تو میں کبھی یہ قرآن تمہیں نہ سناتا بلکہ اس کی خبر تک وہ تم کو نہ دیتا۔ آخر میں اس سے پہلے ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو۔

اور شوریٰ میں فرمایا:

مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (آیت: ۵۲)

اے نبیؐ تم تو جانتے تک نہ تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، مگر ہم نے اس وحی کو ایک نُور بنا دیا جس سے ہم رہنمائی کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یُونس، حاشیہ ۲۱۔ جلد سوم، عنکبوت: ۸۸ تا ۹۲، جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۸۴۔ ۷۳

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی پاکیزہ زندگی اور صحابۂ کرام کی زندگیوں پر آپؐ کی تعلیم و تربیت کے حیرت انگیز اثرات اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہو رہے تھے یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص انبیاء کے احوال اور کتبِ آسمانی کی تعلیم سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرتؐ کی نبوّت میں شک کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ (البیّنہ: ۲۔۳)

یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسُول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔

یہاں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بذاتِ خود ایک دلیل روشن کہا گیا ہے، اس لیے کہ آپؐ کی نبوّت سے پہلے کی اور بعد کی زندگی، آپ کا اُمّی ہونے کے باوجود قرآن جیسی کتاب پیش کرنا، آپ کی تعلیم اور صحبت کے اثر سے

ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں غیر معمولی انقلاب رونما ہو جانا، آپ کا بالکل معقول عقائد، نہایت ستھری عبادات کمال درجہ کے پاکیزہ اخلاق، اور انسانی زندگی کے لیے بہترین اصول و احکام کی تعلیم دینا، آپ کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت کا پایا جانا، اور آپ کا ہر قسم کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں انتہائی اولوالعزمی کے ساتھ اپنی دعوت پر ثابت قدم رہنا، یہ ساری باتیں اس بات کی کھلی علامات تھیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

قرآن ایک معجزانہ کلام اور نبوت کی دلیل ہے

تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (السجدہ: ۱-۲)

اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العٰلمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔

یہاں صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے بلکہ مزید براں پورے زور کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ لا ریب فیہ، بے شک یہ خدا کی کتاب ہے۔ اس کے منزل من اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس تاکیدی فقرے کو اگر نزولِ قرآن کے واقعاتی پس منظر اور خود قرآن کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے، اور یہ دلیل مکۂ معظمہ کے باشندوں سے پوشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اِس کتاب کے پیش کرنے والے کی پوری زندگی ان کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی زندگی بھی اور اس کے بعد کی بھی . . . . وہ اس کتاب کی زبان اور طرزِ بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرزِ بیان میں نمایاں فرق پاتے تھے اور اس بات کو بداہۃً جانتے تھے کہ ایک ہی شخص کے دو اسٹائل اتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ اِس کتاب کے انتہائی معجزانہ ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہلِ زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ ان کے سارے ادیب اور شاعر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ ان کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور اِس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے، اور جو پاکیزہ مضامین اس کلام میں پیش کیے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ انہیں اس کتاب میں، اور اس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دُور دُور بھی اُس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی جھوٹے مدعی کا کام

ؔ قرآن کو جس چیلنج کے ساتھ پیش کیا گیا ہے (فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ) وہ اس کی معجزانہ حیثیت کو نمایاں کرتا ہے اور اس چیلنج کے جواب میں عاجز رہ کر مخالفین نے بہ زبانِ سکوت یہ اعتراف کر لیا کہ یہ کلام انسانی کاوشوں کا ماحصل نہیں ہے۔ قرآن کی اس معجزانہ اور فوق الانسانی حیثیت کو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی نبوت کی دلیل قرار دیا ہے۔ (مرتب)

اور کلام کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ خوردبین لگا کر بھی اس امر کی نشان دہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت کا یہ دعویٰ کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم یا قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کام میں ان کی اپنی کیا غرض پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف ان کی قوم کے کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں اور اس سے وابستہ ہو کر ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ یہ ساری باتیں مل جل کر خود دلیلِ دعویٰ بنی ہوئی تھیں اسی لیے اِس پس منظر میں یہ کہنا بالکل کافی تھا کہ اس کتاب کا رب العٰلمین کی طرف سے نازل شدہ ہونا ہر شک و شُبہ سے بالاتر ہے۔[۵]

فصل ۴

بعثتِ سرورِ عالمؐ کے متعلق تورات و انجیل کی پیشگوئیاں

حضرتِ عیسیٰؑ کا ایک اہم قول

وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ (الصف : ۶)

اور یاد کرو عیسیٰ ابنِ مریمؑ کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ ”اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف بھیجا ہُوا رسُول ہوں، تصدیق کرنے والا ہُوں اُس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے۔

اِس فقرے کے تین معنی ہیں اور تینوں صحیح ہیں :

ایک یہ کہ مَیں کوئی الگ اور نرالا دین نہیں لایا ہوں، بلکہ وہی دین لایا ہوں جو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے۔ میں توراۃ کی تردید کرتا ہُوا نہیں آیا ہوں بلکہ اس کی تصدیق کر رہا ہوں، جس طرح ہمیشہ سے خدا کے رسول اپنے سے پہلے آئے ہوئے رسُولوں کی تصدیق کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ تم میری رسالت کو تسلیم کرنے میں تامّل کرو۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ مَیں اُن بشارتوں کا مصداق ہوں جو میری آمد کے متعلق توراۃ میں موجود ہیں۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ تم میری مخالفت کرو، تمہیں تو اس بات کا خیر مقدم کرنا چاہیے کہ جس کے آنے کی خبر پچھلے انبیاء نے دی تھی وہ آگیا۔

اور اس فقرے کو بعد والے فقرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے تیسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ مَیں اللہ کے رسول احمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی آمد کے متعلق توراۃ کی دی ہوئی بشارت کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی ان کے آنے کی بشارت دیتا ہوں۔ اس تیسرے معنی کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے اس قول کا اشارہ اُس بشارت کی طرف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے دی تھی۔

توراۃ کی صریح پیشگوئی

اُس میں وہ فرماتے ہیں :

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ یہ تیری اُس درخواست کے مطابق ہوگا جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سُننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ مَیں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ مَیں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ مَیں اُسے حکم دُوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے گا تو مَیں ان کا حساب اس سے لُوں گا۔" (اِستثنار، باب ۱۸۔ آیات ۱۵-۱۹)

یہ توراۃ کی صریح پیشین گوئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔ اس میں حضرت مُوسیٰ اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سُنا رہے ہیں کہ "میں تیرے لئے تیرے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا" ظاہر ہے کہ ایک قوم کے "بھائیوں" سے مُراد خود اسی قوم کا کوئی قبیلہ یا خاندان نہیں ہو سکتا بلکہ کوئی دوسری ایسی قوم ہی ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اُس کا قریبی نسلی رشتہ ہو۔ اگر مُراد خود بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی آمد ہوتی تو الفاظ یہ ہوتے کہ مَیں تمہارے لیے خود تم ہی میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ لہٰذا بنی اسرائیل کے بھائیوں سے مراد لامحالہ بنی اسمٰعیل ہی ہو سکتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کی بنا پر اُن کے نسبی رشتہ دار ہیں۔ مزید برآں اس پیشین گوئی کا مصداق بنی اسرائیل کا کوئی نبی اس وجہ سے بھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت مُوسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں کوئی ایک نبی نہیں، بہت سارے نبی آئے ہیں جن کے ذکر سے بائبل بھری پڑی ہے۔

دوسری بات اِس بشارت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جو نبی برپا کیا جائے گا وہ حضرت موسیٰؑ کے مانند ہوگا۔ اس سے مراد ظاہر ہے کہ شکل و صُورت یا حالاتِ زندگی میں مشابہ ہونا تو نہیں ہے، کیونکہ اِس لحاظ سے کوئی فرد بھی کسی دوسرے فرد کے مانند نہیں ہوا کرتا۔ اور اس سے مُراد محض وصفِ نبوت میں مماثلت بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ وصف اُن تمام انبیاء میں مشترک ہے جو حضرت مُوسیٰؑ کے بعد آئے ہیں، اس لیے کسی ایک نبی کی یہ خصوصیت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس وصف میں اُن کے مانند ہو۔ پس ان دونوں پہلوؤں سے مشابہت کے خارج از بحث ہو جانے کے بعد کوئی اور وجہ مماثلت جس کی بنا پر آنے والے ایک نبی کی تخصیص قابلِ فہم ہو، اِس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ وہ نبی ایک مستقل شریعت لانے کے اعتبار سے حضرت مُوسیٰؑ کے مانند ہو۔ اور یہ خصوصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ آپ سے پہلے بنی اسرائیل میں جو نبی بھی آئے تھے وہ شریعتِ موسوی کے پیرو تھے، ان میں سے کوئی بھی ایک مستقل شریعت لے کر نہ آیا تھا۔

اِس تعبیر کو مزید تقویت پیشین گوئی کے ان الفاظ سے ملتی ہے کہ "یہ تیری (یعنی بنی اسرائیل کی) اس درخواست

کے مُطابق ہوگا جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مُجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سُننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ مَیں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ مَیں ان کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا"۔ اِس عبارت میں حورب سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو پہلی مرتبہ احکامِ شریعت دیئے گئے تھے۔ اور بنی اسرائیل کی جس درخواست کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ اگر کوئی شریعت ہم کو دی جائے تو اُن خوفناک حالات میں نہ دی جائے جو حورب پہاڑ کے دامن میں شریعت دیتے وقت پیدا کیے گئے تھے۔ اُن حالات کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے اور بائیبل میں بھی۔ (ملاحظہ ہو، البقرہ، آیات ۵۵-۵۶-۶۳۔ الاعراف، آیات ۱۵۵-۱۷۱۔ بائبل، کتاب خروج ۱۹: ۱۷-۱۸)۔ اس کے جواب میں حضرت مُوسیٰ بنی اسرائیل کو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری یہ درخواست قبول کر لی ہے، اُس کا ارشاد ہے کہ میں اُن کے لیے ایک ایسا نبی برپا کرونگا جس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالونگا یعنی آئندہ شریعت دینے کے وقت وہ خوفناک حالات پیدا نہ کیے جائینگے جو حورب پہاڑ کے دامن میں پیدا کیے گئے تھے، بلکہ اب جو نبی اس منصب پر مامور کیا جائے گا اُس کے مُنہ میں بس اللہ کا کلام ڈالا جائے گا اور وہ اسے خلقِ خدا کو سُنا دے گا۔ اس تصریح پر غور کرنے کے بعد کیا اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے سوا اس کا مصداق کوئی اور نہیں ہے؟ حضرت مُوسیٰ کے بعد مستقل شریعت صرف آپ ہی کو دی گئی، اس کے عطا کرنے کے وقت کوئی ایسا مجمع نہیں ہوا جیسا حورب پہاڑ کے دامن میں بنی اسرائیل کا ہوا تھا اور کسی وقت بھی احکامِ شریعت دینے کے موقع پر وہ حالات پیدا نہیں کیے گئے جو وہاں پیدا کیے گئے تھے[۲۶]

انجیل میں نبوّتِ محمدؐی کی بشارت

حضرت عیسیٰؑ نے نبوّتِ محمدؐی کی جو بشارت دی تھی اس کا ذکر قرآن میں یُوں آیا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۔ (الصف۔۶)

اور یاد کرو عیسیٰ بن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ "اے بنی اسرائیل مَیں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہُوا رسُول ہوں، تصدیق کرنے والا ہُوں اس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔

یہ قرآن مجید کی ایک بڑی اہم آیت ہے جس پر مخالفینِ اسلام کی طرف سے بڑی لے دے بھی کی گئی ہے اور بدترین خیانتِ مجرمانہ سے بھی کام لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا صاف صاف نام لے کر آپ کی آمد کی بشارت[1] دی تھی۔ اِس لیے ضروری ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔

۱۔ "محمّد" اور "احمد"

اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا اسمِ گرامی احمد بتایا گیا ہے۔ احمد کے دو معنی ہیں۔ ایک، وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ دوسرے، وہ شخص جس کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو، یا جو بندوں میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہو۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ بھی حضورؐ کا ایک نام تھا۔ مُسلم اور ابوداؤد طیالسی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ انا محمد و انا احمد وانا الحاشر۔۔۔ "مَیں محمّد ہوں اور مَیں احمد ہوں اور مَیں حاشر ہوں۔۔۔"۔ اِسی مضمون کی روایات حضرت جُبَیر بن مُطْعِم سے امام مالک، بخاری، مُسلم، دارمی، ترمذی، اور نسائی نے نقل کی ہیں۔ حضورؐ کا یہ اسمِ گرامی صحابہ میں معروف تھا، چنانچہ حضرت حسّان بن ثابت کا شعر ہے:

صلی الالٰہ ومن یحف بعرشہ　　　والطیبون علی المبارک احمد

"اللہ نے اور اس کے عرش کے گرد جمگھٹا لگاتے ہوئے فرشتوں نے اور سب پاکیزہ ہستیوں نے بابرکت احمد پر درُود بھیجا ہے"۔

تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ حضورؐ کا نام مبارک صرف محمّد ہی نہ تھا بلکہ احمد بھی تھا۔ عرب کا پُورا لٹریچر اس بات سے خالی ہے کہ حضورؐ سے پہلے کسی کا نام احمد رکھا گیا ہو۔ اور حضورؐ کے بعد احمد اور غلام احمد اتنے لوگوں کے نام رکھے گئے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ زمانۂ نبوت سے لے کر آج تک تمام اُمّت میں آپ کا یہ اسمِ گرامی معلوم و معروف رہا ہے۔ اگر حضورؐ کا یہ اسمِ گرامی نہ ہوتا تو اپنے بچّوں کے نام غلام احمد رکھنے والوں نے آخر کس احمد کا غلام اُن کو قرار دیا تھا؟

---

[1] علاوہ ازیں مجموعی طور پر بائبل میں جا بجا حضورؐ کی بعثت کی پیشینگوئی مذکور ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن نے اجمالاً یہ بیان کر دیا کہ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (الاعراف - ۱۵۷) مثال کے طور پر توراۃ اور انجیل کے حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی آمد کے متعلق صاف اشارات موجود ہیں:۔
استثناء باب ۱۸، آیت ۱۵ تا ۱۹۔ متّی، باب ۲۱، آیت ۳۳ تا ۴۶۔ یُوحنّا، باب ۱، آیت ۱۰ تا ۲۱۔ یُوحنّا، باب ۱۴، آیت ۱۵ تا ۱۷ و آیت ۲۵ تا ۳۰۔ یُوحنّا، باب ۱۵، آیت ۲۵-۲۶۔ یُوحنّا، باب ۱۶، آیت ۷ تا ۱۵۔ (مؤلّف و مُرتّبین)

۲۔ حضرت مسیحؑ، حضرت الیاسؑ اور "وہ نبی"

انجیلِ یُوحنّا اِس بات پر گواہ ہے کہ مسیحؑ کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ ایک مسیح، دوسرے ایلیاہ (یعنی حضرت الیاس کی آمدِ ثانی)، اور تیسرے "وہ نبی"۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

"اور یُوحنّا (حضرت یحییٰ علیہ السّلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پُوچھنے کو اُس کے پاس بھیجے کہ تُو کون ہے، تو اُس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ مَیں تو مسیحؑ نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پُوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا مَیں نہیں ہُوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ . . . اُس نے کہا مَیں بیابان میں ایک پُکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو . . . . انہوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟" (باب ۱۔ آیات ۱۹۔۲۵)

یہ الفاظ اس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیحؑ اور حضرت الیاسؑ کے علاوہ ایک اور نبی کے منتظر تھے، اور وہ حضرت یحییٰؑ نہ تھے۔ اُس نبی کی آمد کا عقیدہ بنی اسرائیل کے ہاں اس قدر مشہور و معروف تھا کہ "وُہ نبی" کہہ دینا گویا اُس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بالکل کافی تھا، یہ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ "جس کی خبر توراۃ میں دی گئی ہے"۔ مزید برآں اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ جس نبی کی طرف وہ اشارہ کر رہے تھے اس کا آنا قطعی طور پر ثابت تھا، کیونکہ جب حضرت یحییٰؑ سے یہ سوالات کیے گئے تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے، تم کس نبی کے متعلق پُوچھ رہے ہو؟

۳۔ انجیلِ یُوحنّا کی عبارات

اب وہ پیشین گوئیاں دیکھیے جو انجیل یُوحنّا میں مسلسل باب ۱۴ سے ۱۶ تک منقول ہوئی ہیں:-

"اور مَیں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے، یعنی رُوحِ حق جسے دُنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے نہ جانتی ہے۔ تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر رہے۔" (۱۴: ۱۶۔۱۷)

"مَیں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ مَیں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔" (۱۴: ۲۵۔۲۶)

"اِس کے بعد مَیں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دُنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" (۱۴: ۳۰)۔

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو مَیں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا" (۱۵: ۲۶)

"لیکن مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر مَیں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا" (۱۶: ۷)

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس لیے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے اور تمہیں خبریں دیگا" (۱۶: ۱۲-۱۵)

۴۔ مذکرہ عبارات کے مفہوم کا تعیُّن

ان عبارتوں کے معنی متعیّن کرنے کے لیے سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کے ہم عصر اہلِ فلسطین کی عام زبان آرامی زبان کی وہ بولی تھی جسے سُریانی (Syriac) کہا جاتا ہے۔ مسیحؑ کی پیدائش سے دو ڈھائی سو برس پہلے ہی سلوقی (Seleucide) اقتدار کے زمانے میں اِس علاقے سے عبرانی رخصت ہو چکی تھی اور سُریانی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اگرچہ سلوقی اور پھر رُومی سلطنتوں کے اثر سے یُونانی زبان بھی اس علاقے میں پہنچ گئی تھی، مگر وہ صرف اُس طبقے تک محدود رہی جو سرکار دربار میں رسائی پا کر، یا رسائی حاصل کرنے کی خاطر یونانیت زدہ ہو گیا تھا۔ فلسطین کے عام لوگ سُریانی کی ایک خاص بولی (Dialect) استعمال کرتے تھے جس کے لہجے اور تلفّظات اور محاورات دمشق کے علاقے میں بولی جانے والی سُریانی سے مختلف تھے، اور اِس مُلک کے عوام یونانی سے اِس قدر ناواقف تھے کہ جب ۷۰ء میں یروشلم پر قبضہ کرنے کے بعد رُومی جنرل ٹیٹس (Titus) نے اہلِ یروشلم کو یونانی میں خطاب کیا تو اس کا ترجمہ سُریانی زبان میں کرنا پڑا۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے جو کچھ کہا تھا وہ لامحالہ سُریانی زبان ہی میں ہو گا۔

دوسری بات یہ جاننی ضروری ہے کہ بائیبل کی چاروں انجیلیں اُن یونانی بولنے والے عیسائیوں کی لکھی ہوئی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد اس مذہب میں داخل ہوئے تھے۔ اُن تک حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے اقوال و اعمال کی تفصیلات سُریانی بولنے والے عیسائیوں کے ذریعہ سے کسی تحریری صُورت میں نہیں بلکہ زبانی روایات کی شکل میں پہنچی تھیں اور اُن سُریانی روایات کو انہوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے درج کیا تھا۔ ان میں سے کوئی انجیل بھی ۷۰ء سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہے، اور انجیل یُوحنّا تو حضرت عیسیٰؑ کے ایک صدی بعد غالباً ایشیائے کوچک کے شہر

اِفسس میں لکھی گئی ہے۔ مزید یہ کہ ان انجیلوں کا بھی کوئی اصل نسخہ اُس یونانی زبان میں محفوظ نہیں ہے جس میں ابتداءً یہ لکھی گئی تھیں۔ مطبع کی ایجاد سے پہلے کے جتنے یونانی مسودات جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ اِس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ تین صدیوں کے دوران میں ان کے اندر کیا کچھ ردّو بدل ہوتے ہوں گے۔ اس معاملہ کو جو چیز خاص طور پر مشتبہ بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ عیسائی اپنی انجیلوں میں اپنی پسند کے مطابق دانستہ تغیرّ و تبدّل کرنے کو بالکل جائز سمجھتے رہے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون "بائیبل" کا مُصنّف لکھتا ہے:

"اناجیل میں ایسے نمایاں تغیرّات دانستہ کیے گئے ہیں جیسے مثلاً بعض پُوری پُوری عبارتوں کو کسی دُوسرے ماخذ سے لے کر کتاب میں شامل کر دینا ...... یہ تغیرّات صریحًا کچھ ایسے لوگوں نے بالقصد کیے ہیں جنہیں اصل کتاب کے اندر شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا، اور وہ اپنے آپ کو اِس کا مجاز سمجھتے رہے کہ کتاب کو بہتر یا زیادہ مفید بنانے کے لیے اس کے اندر اپنی طرف سے اس مواد کا اضافہ کر دیں ... ... بہت سے اضافے دوسری صدی ہی میں ہو گئے تھے اور کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ماخذ کیا تھا۔"

اِس صورتِ حال میں قطعی طور پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے جو اقوال ہمیں ملتے ہیں وہ بالکل ٹھیک ٹھیک نقل ہوتے ہیں اور ان کے اندر کوئی ردّو بدل نہیں ہوا ہے۔

تیسری اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد بھی تقریباً تین صدیوں تک فلسطین کے عیسائی باشندوں کی زبان سُریانی رہی اور کہیں نویں صدی عیسوی میں جا کر عربی زبان نے اُس کی جگہ لی۔ اُن سُریانی بولنے والے اہلِ فلسطین کے ذریعہ سے عیسائی روایات کے متعلق جو معلومات ابتدائی تین صدیوں کے مسلمان علماء کو حاصل ہوئیں وہ اُن لوگوں کی معلومات کی بہ نسبت زیادہ معتبر ہونی چاہییں جنہیں سُریانی سے یُونانی اور پھر یونانی سے لاطینی زبانوں میں ترجمہ در ترجمہ ہو کر یہ معلومات پہنچیں۔ کیونکہ مسیحؑ کی زبان سے نکلے ہوئے اصل سُریانی الفاظ اُن کے ہاں محفوظ رہنے کے زیادہ امکانات تھے۔

۵۔ وہ دُنیا کا سردار ہو گا

اِن ناقابلِ انکار تاریخی حقائق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ انجیل یُوحنّا کی مذکورۂ بالا عبارات میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دے رہے ہیں جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ "دُنیا کا سردار" (سرورِ عالم) ہو گا، "ابد تک" رہے گا، "سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا"، اور خود اُن کی (یعنی حضرت عیسیٰؑ کی) "گواہی دیگا"۔ یُوحنّا کی اِن عبارتوں میں "روح القدس" اور "سچائی کی رُوح" وغیرہ الفاظ شامل کر کے مدّعا کو خبط کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، مگر اس کے باوجود ان سب عبارتوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس آنے والے کی خبر دی گئی

ہے وہ کوئی رُوح نہیں بلکہ کوئی انسان اور خاص شخص ہے جس کی تعلیم عالمگیر، ہمہ گیر، اور قیامت تک باقی رہنے والی ہوگی۔ اُس شخصِ خاص کے لیے اردو ترجمے میں "مددگار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یُوحنا کی اصل انجیل میں یونانی زبان کا جو لفظ استعمال کیا گیا تھا، اس کے بارے میں عیسائیوں کو اصرار ہے کہ وہ Paracletus تھا۔ مگر اس کے معنی متعیّن کرنے میں خود عیسائی علماء کو سخت زحمت پیش آئی ہے۔ اصل یونانی زبان میں Paraclete کے کئی معنی ہیں: کسی جگہ کی طرف بلانا، مدد کے لیے پکارنا، اِنذار و تنبیہ، ترغیب، اُکسانا، التجا کرنا، دُعا مانگنا۔ پھر یہ لفظ ہیلینی Helenic مفہوم میں یہ معنی دیتا ہے: تسلّی دینا، تسکین بخشنا، ہمّت افزائی کرنا۔ بائبل میں اس لفظ کو جہاں جہاں استعمال کیا گیا ہے، ان سب مقامات پر اس کے کوئی معنی بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اوراُنجن (Origen) نے کہیں اس کا ترجمہ Consolator کیا ہے اور کہیں Deprecator۔ مگر دوسرے مفسّرین نے ان دونوں ترجموں کو رد کر دیا کیونکہ اوّل تو یہ یُونانی گرامر کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں، دوسرے تمام عبارتوں میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، یہ معنی نہیں چلتے۔ بعض اور مترجمین نے اس کا ترجمہ Teacher کیا ہے، مگر یونانی زبان کے استعمالات سے یہ معنی بھی اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ ترتولیان اور آگسٹائن نے لفظ Advocate کو ترجیح دی ہے، اور بعض اور لوگوں نے Assistant، اور Comforter، اور Consoler وغیرہ الفاظ اختیار کیے ہیں (ملاحظہ ہو سائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، لفظ پیریکلیٹس)۔

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ یُونانی زبان ہی میں ایک دوسرا لفظ Periclytos موجود ہے جس کے معنی ہیں "تعریف کیا ہُوا"۔ یہ لفظ بالکل "مُحمّد" کا ہم معنی ہے، اور تلفّظ میں اس کے اور Paracletus کے درمیان بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیا بعید ہے کہ جو مسیحی حضرات اپنی مذہبی کتابوں میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بے تکلّف ردّ و بدل کر لینے کے خوگر رہے ہیں اُنہوں نے یُوحنّا کی نقل کردہ پیشین گوئی کے اس لفظ کو اپنے عقیدے کے خلاف پڑتا دیکھ کر اس کے اِملا میں یہ ذرا سا تغیّر کر دیا۔ اس کی پڑتال کرنے کے لیے یُوحنّا کی لکھی ہوئی ابتدائی یُونانی انجیل بھی کہیں موجود نہیں ہے جس سے یہ تحقیق کیا جا سکے کہ وہاں ان دونوں الفاظ میں سے دراصل کونسا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔

۶۔ مُنْحَمَنَّا

لیکن فیصلہ اس پر بھی موقوف نہیں ہے کہ یُوحنّا نے یونانی زبان میں دراصل کونسا لفظ لکھا تھا، کیونکہ بہر حال وہ بھی ترجمہ ہی تھا اور حضرت مسیحؑ کی زبان، جیسا کہ اُوپر ہم بیان کر چکے ہیں فلسطین کی سُریانی تھی، اِس لیے انہوں نے اپنی بشارت میں جو لفظ استعمال کیا ہوگا وہ لامحالہ کوئی سُریانی لفظ ہی ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے وہ اصل سُریانی لفظ ہمیں ابنِ ہشام کی سیرت میں مل جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اسی کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی

یونانی لفظ کیا ہے۔ محمد بن اسحاق کے حوالہ سے ابن ہشام نے یُحنّس (یُوحنّا) کی انجیل کے باب ۱۵، آیات ۲۳ تا ۲۷، اور باب ۱۶ آیت ۱ کا پُورا ترجمہ نقل کیا ہے اور اس میں یُونانی "فارقلیط" کے بجائے سُریانی زبان کا لفظ مُنحمنّا استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ابن اسحاق یا ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ "مُنحمنّا کے معنی سُریانی میں محمدؐ اور یُونانی میں برقلیطُس ہیں" (ابن ہشام، جلد اوّل، ص ۲۴۸)۔

اب دیکھیے کہ تاریخی طور پر فلسطین کے عام عیسائی باشندوں کی زبان نویں صدی عیسوی تک سُریانی تھی۔ یہ علاقہ ساتویں صدی کے نصف اوّل سے اسلامی مقبوضات میں شامل تھا۔ ابنِ اسحاق نے ۷۶۸ء میں اور ابن ہشام نے ۸۲۸ء میں وفات پائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کے زمانے میں فلسطینی عیسائی سُریانی بولتے تھے، اور ان دونوں کے لیے اپنے مُلک کی عیسائی رعایا سے ربط پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ نیز اُس زمانے میں یُونانی بولنے والے عیسائی بھی لاکھوں کی تعداد میں اسلامی مقبوضات کے اندر رہتے تھے، اس لیے ان کے لیے یہ معلوم کرنا بھی مُشکل نہ تھا کہ سُریانی کے کس لفظ کا ہم معنی یُونانی زبان کا کونسا لفظ ہے۔ اب اگر ابنِ اسحاق کے نقل کردہ ترجمے میں سُریانی لفظ مُنحمنّا استعمال ہوا ہے، اور ابن اسحاق یا ابنِ ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ عربی میں اس کا ہم معنی لفظ مُحَمّد اور یُونانی میں برقلیطُس ہے، تو اِس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عیسٰیؑ نے حضورؐ کا نام مبارک لے کر آپؐ ہی کے آنے کی بشارت دی تھی، اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یوحنّا کی یونانی انجیل میں دراصل لفظ Periclytos استعمال ہوا تھا جسے عیسائی حضرات نے بعد میں کسی وقت Paracletus سے بدل دیا۔

۷۔ نجاشی کی شہادت

اس سے بھی قدیم تر تاریخی شہادت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کو جب نجاشی نے اپنے دربار میں بُلایا، اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات سُنیں تو اس نے کہا: مَرحبًا بِکم و بمَن جِئتم من عندہٖ، اشھد انّہ رسول اللّٰہ وانہ الذی نجدُ فی الاِنجیل و انہ الذی بَشّرَ بہٖ عیسیٰ بنُ مَرْیَمَ (مُسند احمد)۔ یعنی "مرحبا تم کو اور اُس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسُول ہیں، اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسٰی ابنِ مریمؑ نے دی تھی"۔ یہ قصّہ احادیث میں خود حضرت جعفرؓ اور اُمّ سَلَمہؓ سے بھی منقول ہوا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں نجاشی کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام ایک نبی کی پیشین گوئی کر گئے ہیں، بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُس نبی کی ایسی صاف نشاندہی انجیل میں موجود تھی جس کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تامّل نہ ہُوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہی وہ نبی ہیں۔ البتہ اس روایت

سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عیسیٰ کی اس بشارت کے متعلق نجاشی کا ذریعۂ معلومات یہی انجیلِ یُوحنّا تھی یا کوئی اور ذریعہ بھی اس کو جاننے کا اُس وقت موجود تھا۔

۸ - انجیل برنباس

حقیقت یہ ہے کہ صرف رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ کی پیشین گوئیوں کو نہیں خود حضرت عیسیٰؑ کے اپنے صحیح حالات اور آپ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا بھی معتبر ذریعہ وہ چار انجیلیں نہیں ہیں جن کو مسیحی کلیسا نے معتبر و مسلّم اناجیل (Canonical Gospels) قرار دے رکھا ہے، بلکہ اس کا زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ وہ انجیل برنباس ہے جسے کلیسا غیر قانونی اور مشکوک الصحت Apocryphal کہتا ہے۔ عیسائیوں نے اسے چھپانے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ صدیوں تک یہ دنیا سے ناپید رہی ہے۔ سولھویں صدی میں اس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سکسٹس (Sixtus) کے کتب خانے میں پایا جاتا تھا اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ لگا۔ پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرتا ہوا ۱۷۳۸ء میں ویانا کی امپیریل لائبریری میں پہنچ گیا۔ ۱۹۰۷ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس سے شائع ہو گیا تھا مگر غالباً اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دُنیا میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ کتاب تو اُس مذہب کی جڑ ہی کاٹے دے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰؑ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے اس لیے اس کے مطبوعہ نسخے کسی خاص تدبیر سے غائب کر دیئے گئے اور پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔ دوسرا ایک نسخہ اِسی اطالوی ترجمہ سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہوا اٹھارویں صدی میں پایا جاتا تھا جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مگر وہ بھی کہیں غائب کر دیا گیا اور آج اس کا بھی کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ انگریزی ترجمے کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور مَیں نے اسے لفظ بلفظ پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے عیسائیوں نے محض تعصّب اور ضد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

مسیحی لٹریچر میں اس انجیل کا جہاں کہیں ذکر آتا ہے، اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برنباس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صرف اِس بنا پر بول دیا گیا کہ اس میں جگہ جگہ بصراحت نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اوّل تو اس انجیل کو پڑھنے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے، اگر یہ کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت سے پھیلی ہوئی ہوتی اور علمائے اسلام کی تصنیفات میں بکثرت اس کا ذکر پایا جاتا۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی مقدمۂ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک

کا علم نہ تھا۔ طبری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابنِ حزم، ابنِ تیمیہ اور دوسرے مُصنّفین، جو مسلمانوں میں مسیحی لٹریچر پر وسیع اطلاع رکھنے والے تھے، ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل برنا باس کی طرف اشارۃً تک نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں ان کی بہترین فہرستیں ابن ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ہیں، اور وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برنا باس کا نام تک نہیں لیا ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی دلیل اس بات کے جھوٹ ہونے کی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیدائش سے بھی ۷۵ سال پہلے پوپ گلاسیئس اوّل Gelasius کے زمانے میں بدعقیدہ اور گمراہ کن (Heretical) کتابوں کی جو فہرست مُرتّب کی گئی تھی، اور ایک پاپائی فتوے کے ذریعہ سے جن کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا، اُن میں انجیل برنا باس (Evangelium Barnabe) بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت کونسا مسلمان تھا جس نے یہ جعلی انجیل تیار کی تھی؟

۹۔ انجیل برنباس کا تعارُف

قبل اس کے کہ اِس انجیل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی بشارتیں نقل کی جائیں، اس کا مختصر تعارف کرا دینا ضروری ہے، تاکہ اس کی اہمیّت معلوم ہو جائے اور یہ بھی سمجھ میں آ جائے کہ عیسائی حضرات اس سے اتنے ناراض کیوں ہیں۔

بائیبل میں جو چار انجیلیں قانونی اور مُعتبر قرار دے کر شامل کی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسیٰؑ کا صحابی نہ تھا۔ اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ اس نے آنحضرتؑ کے صحابیوں سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہیں۔ جن ذرائع سے ان لوگوں نے معلومات حاصل کی ہیں ان کا کوئی حوالہ انہوں نے نہیں دیا ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ راوی نے آیا خود وہ واقعات دیکھے اور وہ اقوال سُنے ہیں جنہیں وہ بیان کر رہا ہے یا ایک یا چند واسطوں سے یہ باتیں اسے پہنچی ہیں۔ بخلاف اس کے انجیل برنا باس کا مُصنّف کہتا ہے کہ مَیں مسیحؑ کے اوّلین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں، شروع سے آخر وقت تک مسیحؑ کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سُنے اقوال اس کتاب میں درج کر رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت مسیحؑ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور صحیح حالات دنیا کے سامنے لانا تیری ذمّہ داری ہے۔

یہ برنا باس کون تھا؟ بائیبل کی کتاب اعمال میں بڑی کثرت سے اِس نام کے ایک شخص کا ذکر آتا ہے جو قُبرُص کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مسیحیّت کی تبلیغ اور پیروانِ مسیحؑ کی مدد و اعانت کے سلسلے میں اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کہیں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ کب دینِ مسیحؑ میں داخل ہوا، اور ابتدائی بارہ حواریوں

کی جو فہرست تین انجیلوں میں دی گئی ہے اس میں بھی کہیں اُس کا نام درج نہیں ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس انجیل کا مُصنّف وہی برناباس ہے یا کوئی اور۔ متی، اور مرقس نے حواریوں (Apostles) کی جو فہرست دی ہے، برناباس کی دی ہوئی فہرست اس سے صرف دو ناموں میں مختلف ہے۔ ایک تو ما، جس کے بجائے برناباس خود اپنا نام دے رہا ہے، دوسرا شمعون قنانی، جس کی جگہ وہ یہوداہ بن یعقوب کا نام لیتا ہے۔ لُوقا کی انجیل میں یہ دوسرا نام بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ بعد میں کسی وقت صرف برناباس کو حواریوں سے خارج کرنے کے لیے تو ما کا نام داخل کیا گیا ہے تاکہ اُس کی انجیل سے پیچھا چھڑایا جا سکے، اور اس طرح کے تغیّرات اپنی مذہبی کتابوں میں کر لینا اِن حضرات کے ہاں کوئی ناجائز کام نہیں رہا ہے۔

اِس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصّب کے بغیر کھُلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اُن چاروں سے بدرجہا برتر ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور اس طرح بیان ہوئے ہیں جیسے کوئی شخص فی الواقع وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ان واقعات میں خود شریک تھا۔ چاروں انجیلوں کی بے ربط داستانوں کے مقابلہ میں یہ تاریخی بیان زیادہ مربُوط بھی ہے اور اس سے سلسلۂ واقعات بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اس میں چاروں انجیلوں کی بہ نسبت زیادہ واضح اور مفصّل اور مُوثّر طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔ توحید کی تعلیم شرک کی تردید، صفاتِ باری تعالیٰ، عبادات کی رُوح، اور اَخلاقِ فاضلہ کے مضامین اس میں بڑے ہی پُرزور اور مدلّل اور مفصّل ہیں۔ جن سبق آموز تمثیلات کے پیرایہ میں مسیح نے یہ مضامین بیان کیے ہیں ان کا عُشرِ عَشیر بھی چاروں انجیلوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کس حکیمانہ طریقے سے فرماتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی زبان، طرزِ بیان اور طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر کچھ بھی آشنا ہو تو وہ اِس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبُور ہوگا کہ یہ کوئی جعلی داستان نہیں ہے جو بعد میں کسی نے گھڑ لی ہو، بلکہ اس میں حضرت مسیحؑ اناجیلِ اربعہ کی بہ نسبت اپنی اصلی شان میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں، اور اس میں تضادات کا نام و نشان بھی نہیں ہے جو اناجیلِ اربعہ میں ان کے مختلف اقوال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

اِس انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات ٹھیک ٹھیک ایک نبی کی زندگی اور تعلیمات کے مطابق نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ تمام پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ صاف کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السّلام کی تعلیمات کے سوا معرفتِ حق کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور جو انبیاء کو چھوڑتا ہے وہ دراصل خدا کو چھوڑتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتے ہیں

جن کی تعلیم تمام انبیاء نے دی ہے۔ نماز، روزے اور زکوٰۃ کی تلقین کرتے ہیں۔ اُن کی نمازوں کا جو ذکر بکثرت مقامات پر برناباس نے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا اور تہجد کے اوقات تھے جن میں وہ نماز پڑھتے تھے، اور ہمیشہ نماز سے پہلے وضو فرماتے تھے۔ انبیاء میں سے وہ حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کو نبی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کو انبیاء کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کو وہ ذبیح قرار دیتے ہیں اور ایک یہودی عالم سے اقرار کراتے ہیں کہ فی الواقع ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی تھے اور بنی اسرائیل نے زبردستی کھینچ تان کر کے حضرت اسحاقؑ کو ذبیح بنا رکھا ہے۔ آخرت اور قیامت اور جنت و دوزخ کے متعلق ان کی تعلیمات قریب قریب وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

۱۰۔ عیسائی انجیل برنباس کے کیوں مخالف ہیں؟

عیسائی جس وجہ سے انجیل برناباس کے مخالف ہیں، وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جگہ جگہ صاف اور واضح بشارتیں ہیں، کیونکہ وہ تو حضورؐ کی پیدائش سے بھی بہت پہلے اِس انجیل کو رد کر چکے تھے۔ ان کی ناراضی کی اصل وجہ کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تفصیلی بحث درکار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے تھے، عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح تسلیم کر کے ان پر ایمان لاتے تھے اور وہ اُن کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اِس جماعت میں داخل ہوا تو اُس نے رومیوں، یونانیوں اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اِس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی اور اِس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد اور اصول اور احکام اُس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اِس شخص نے حضرت عیسیٰؑ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی بلکہ ان کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیروؤں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اِس جماعت میں داخل ہو کر اُس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا اُس وقت بھی اس نے حضرت عیسیٰؑ کے کسی قول کی سند نہیں پیش کی بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا۔ اور اس نئے دین کی تشکیل میں اُس کے پیشِ نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہودی دنیا (Gentile) قبول کرے۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی شریعت یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام و حلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے ختنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا جو غیر یہودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا۔ حتیٰ کہ اُس نے مسیحؑ کی اُلوہیت اور اُن کے ابنِ خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر اولادِ آدمؑ کے پیدائشی گناہ کا کفّارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت

مناسبت رکھتا تھا۔ مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے اِن بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھہر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیح کی اُلوہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز (۳۲۵ء) میں نیقیہ (Nicaea) کی کونسل نے پولوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مسلّم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈوسیس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں، مردُود قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھیرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس (Athanasius) کے ایک خط کے ذریعہ معتبر و مسلّم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا، پھر اس کی توثیق ۳۸۲ء میں پوپ ڈمیسیس (Damasius) کے زیرِ صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس (Gelasius) نے اِس مجموعہ کو مسلّم قرار دینے کے ساتھ ساتھ اُن کتابوں کی ایک فہرست مُرتّب کر دی جو غیر مُسلّم تھیں۔ حالانکہ جن پولوسی عقائد کو بنیاد بنا کر مذہبی کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا یہ فیصلہ کیا گیا تھا، ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعوٰی نہیں کر سکا ہے کہ ان میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰؑ کے اپنے کسی قول سے اِن عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔

انجیل برناباس ان غیر مسلّم کتابوں میں اس لیے شامل کی گئی کہ وہ مسیحیت کے اِس سرکاری عقیدے کے بالکل خلاف تھی۔ اس کا مُصنّف کتاب کے آغاز ہی میں اپنا مقصدِ تصنیف یہ بیان کرتا ہے کہ "اُن لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جائے جو شیطان کے دھوکے میں آکر یسُوع کو ابنُ اللہ قرار دیتے ہیں، ختنہ کو غیر ضروری ٹھیراتے ہیں اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں، جن میں سے ایک دھوکہ کھانے والا پولوس بھی ہے۔" وہ بتاتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ دنیا میں موجود تھے اُس زمانے میں اُن کے معجزات کو دیکھ کر سب سے پہلے مشرک رومی سپاہیوں نے ان کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا، پھر یہ جھوٹ بنی اسرائیل کے عوام کو بھی لگ گئی۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ سخت پریشان ہوئے۔ انہوں نے بار بار نہایت شدّت کے ساتھ اپنے متعلق اس غلط عقیدے کی تردید کی، اپنے شاگردوں کو بھیجا اور اُن کی دُعا سے شاگردوں کے ہاتھوں بھی وہی معجزے صادر کرائے گئے جو خود حضرت عیسیٰؑ سے صادر ہوتے تھے، تاکہ لوگ اس غلط خیال سے باز آجائیں کہ جس شخص سے یہ معجزے صادر ہو رہے ہیں وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت عیسیٰؑ کی مُفصّل تقریریں نقل کرتا ہے جن میں انہوں نے بڑی سختی کے ساتھ اس غلط عقیدے کی تردید کی

تھی، اور جگہ جگہ یہ بتاتا ہے کہ آنجناب اس گمراہی کے پھیلنے پر کس قدر پریشان تھے - مزید براں وہ اِس پولوسی عقیدے کی بھی صاف صاف تردید کرتا ہے کہ مسیح علیہ السّلام نے صلیب پر جان دی تھی - وہ اپنے چشم دید حالات یہ بیان کرتا ہے کہ جب یہوداہ اسکریوتی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آنجنابؑ کو اٹھا لے گئے، اور یہوداہ اسکریوتی کی شکل اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو حضرت عیسیٰؑ کی تھی صلیب پر وہی چڑھایا گیا تھا نہ کہ حضرت عیسیٰؑ - اِس طرح یہ انجیل پولوسی مسیحیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور قرآن کے بیان کی پوری توثیق کرتی ہے - حالانکہ نزولِ قرآن سے ۱۱۵ سال پہلے اُس کے اِن بیانات ہی کی بنا پر مسیحی پادری اسے ردّ کر چکے تھے -

۱۱- انجیل برنباس کی مفصل پیشین گوئیاں

اِس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انجیل برناباس درحقیقت اناجیلِ اربعہ سے زیادہ معتبر انجیل ہے، مسیح علیہ السّلام کی تعلیمات اور سیرت اور اقوال کی صحیح ترجمانی کرتی ہے، اور یہ عیسائیوں کی اپنی بدقسمتی ہے کہ اس انجیل کے ذریعہ سے اپنے عقائد کی تصحیح اور حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا جو موقع ان کو ملا تھا اسے محض ضد کی بنا پر انھوں نے کھو دیا - اس کے بعد ہم پورے اطمینان کے ساتھ وہ بشارتیں نقل کر سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں برناباس نے حضرت عیسیٰؑ سے روایت کی ہیں - ان بشارتوں میں کہیں حضرت عیسیٰؑ حضورؐ کا نام لیتے ہیں، کہیں "رسول اللہ" کہتے ہیں، کہیں آپ کے لیے "مسیح" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، کہیں "قابلِ تعریف" Admirable کہتے ہیں، اور کہیں صاف صاف ایسے فقرے ارشاد فرماتے ہیں جو بالکل لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ہم معنی ہیں ہمارے لیے ان ساری بشارتوں کو نقل کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ اتنی زیادہ ہیں، اور جگہ جگہ مختلف پیرایوں اور سیاق و سباق میں آئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا رسالہ مرتب ہو سکتا ہے - یہاں ہم محض بطور نمونہ ان میں سے چند کو نقل کرتے ہیں:

"تمام انبیاء جن کو خدا نے دنیا میں بھیجا جن کی تعداد ایک لاکھ ۴۴ ہزار تھی، انہوں نے ابہام کے ساتھ بات کی - مگر میرے بعد تمام انبیاء اور مقدس ہستیوں کا نور آئے گا جو انبیاء کی کہی ہوئی باتوں کے اندھیرے پر روشنی ڈال دیگا کیونکہ وہ خدا کا رسول ہے" (باب ۱۷)

"فریسیوں اور لاویوں نے کہا اگر تو نہ مسیح ہے، نہ الیاس، نہ کوئی اور نبی، تو کیوں تو نئی تعلیم دیتا ہے اور اپنے آپ کو مسیح سے بھی زیادہ بنا کر پیش کرتا ہے؟ یسوع نے جواب دیا جو معجزے خدا میرے ہاتھ سے دکھاتا ہے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مَیں وہی کچھ کہتا ہوں جو خدا چاہتا ہے، ورنہ درحقیقت مَیں اپنے آپ کو اُس (مسیح) سے بڑا شمار کیے جانے کے قابل نہیں قرار دیتا جس کا تم ذکر کر رہے ہو - مَیں تو اُس خدا کے رسول

کے موزے کے بند یا اس کی جوتی کے تسمے کھولنے کے لائق بھی نہیں ہوں جس کو تم مسیح کہتے ہو، جو مجھ سے پہلے بنایا گیا تھا اور میرے بعد آئے گا اور صداقت کی باتیں لے کر آئے گا تاکہ اس کے دین کی کوئی انتہا نہ ہو" (باب ۴۲)

"بالیقین مَیں تم سے کہتا ہوں کہ ہر نبی جو آیا ہے وہ صرف ایک قوم کے لیے خدا کی رحمت کا نشان بن کر پیدا ہوا ہے۔ اِس وجہ سے ان انبیاء کی باتیں اُن لوگوں کے سوا کہیں اور نہیں پھیلیں جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ مگر خدا کا رسول جب آئے گا، خدا گویا اس کو اپنے ہاتھ کی مُہر دے دیگا یہاں تک کہ وہ دُنیا کی تمام قوموں کو جو اس کی تعلیم پائیں گی، نجات اور رحمت پہنچا دیگا۔ وہ بے خدا لوگوں پر اقتدار لے کر آئے گا اور بُت پرستی کا ایسا قلع قمع کرے گا کہ شیطان پریشان ہو جائے گا" (اِس کے آگے شاگردوں کے ساتھ ایک طویل مکالمہ میں حضرت علیٰؑ تصریح کرتے ہیں کہ وہ بنی اسماعیل میں سے ہو گا۔ باب ۴۳)

"اس لیے مَیں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کا رسول وہ رونق ہے جس سے خدا کی پیدا کی ہوئی قریب قریب تمام چیزوں کو خوشی نصیب ہو گی کیونکہ وہ فہم اور نصیحت، حکمت اور طاقت، خشیت اور محبت، حزم اور وَرع کی رُوح سے آراستہ ہے۔ وہ فیاضی اور رحمت، عدل اور تقویٰ، شرافت اور صبر کی رُوح سے مزین ہے جو اُس نے خدا سے اُن تمام چیزوں کی بہ نسبت تین گُنی پائی ہے جنہیں خدا نے اپنی مخلوق میں سے یہ رُوح بخشی ہے۔ کیسا مبارک وقت ہو گا جب وہ دُنیا میں آئے گا۔ یقین جانو، مَیں نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے جس طرح ہر نبی نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے۔ اس کی رُوح کو دیکھنے ہی سے خدا نے اُن کو نبوّت دی۔ اور جب مَیں نے اس کو دیکھا تو میری رُوح سکینت سے بھر گئی یہ کہتے ہوئے کہ اَے محمدؐ، خدا تمہارے ساتھ ہو، اور وہ مجھے تمہاری جوتی کے تسمے باندھنے کے قابل بنا دے، کیونکہ یہ مرتبہ بھی پا لُوں تو مَیں ایک بڑا نبی اور خدا کی ایک مقدس ہستی ہو جاؤں گا" (باب ۴۴)۔

"(میرے جانے سے) تمہارا دل پریشان نہ ہو، نہ تم خوف کرو، کیونکہ مَیں نے تم کو پیدا نہیں کیا ہے بلکہ خدا ہمارا خالق جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔ رہا میں، تو اِس وقت مَیں دُنیا میں اُس رسولِ خدا کے لیے راستہ تیار کرنے آیا ہوں جو دُنیا کے لیے نجات لے کر آئے گا ..... اندریاس نے کہا، اُستاد ہمیں اس کی نشانی بتا دیجے تاکہ ہم اسے پہچان لیں۔ یسُوع نے جواب دیا، وہ تمہارے زمانے میں نہیں آئے گا بلکہ تمہارے کچھ سال بعد آئے گا جبکہ میری انجیل ایسی مسخ ہو چکی ہوگی کہ مشکل سے کوئی ۳۰ آدمی مومن باقی رہ جائیں گے۔ اُس وقت اللہ دُنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنے رسول کو بھیجے گا جس کے سر پر سفید بادل کا سایہ ہو گا جس سے وہ خدا کا برگزیدہ جانا جائے گا اور اس کے ذریعہ سے خدا کی

معرفت دنیا کو حاصل ہوگی۔ وہ بے خدا لوگوں کے خلاف بڑی طاقت کے ساتھ آئے گا اور زمین پر بُت پرستی کو مٹا دے گا۔ اور مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ سے ہمارا خدا پہچانا جائیگا اور اس کی تقدیس ہوگی اور میری صداقت دنیا کو معلوم ہوگی اور وہ ان لوگوں سے انتقام لے گا جو مجھے انسان سے بڑھ کر کچھ قرار دیں گے . . . . وہ ایک ایسی صداقت کے ساتھ آئے گا جو تمام انبیاء کی لائی ہوئی صداقت سے زیادہ واضح ہوگی" (باب ۷۲)

"خدا کا عہد یروشلم میں، معبدِ سلیمان کے اندر کیا گیا تھا نہ کہ کہیں اور۔ بلکہ میری بات کا یقین کرو کہ ایک وقت آئے گا جب خدا اپنی رحمت ایک اور شہر میں نازل فرمائے گا، پھر ہر جگہ اس کی صحیح عبادت ہو سکے گی، اور اللہ اپنی رحمت سے ہر جگہ سچی نماز کو قبول فرمائے گا . . . . مَیں دراصل اسرائیل کے گھرانے کی طرف نجات کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، مگر میرے بعد مسیح آئے گا، خدا کا بھیجا ہوُا، تمام دنیا کی طرف، جس کے لیے خدا نے یہ ساری دنیا بنائی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں اللہ کی عبادت ہوگی، اور اس کی رحمت نازل ہوگی" (باب ۸۳)

"یسُوع نے سردار کاہن سے کہا، زندہ خدا کی قسم جس کے حضور میری جان حاضر ہے، مَیں وہ مسیح نہیں ہوں جس کی آمد کا تمام دنیا کی قومیں انتظار کر رہی ہیں، جس کا وعدہ خدا نے ہمارے باپ ابراہیمؑ سے یہ کہہ کر کیا تھا کہ "تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی" (پیدائش، ۲۲ : ۱۸)۔ مگر جب خدا مجھے دنیا سے لے جائے گا تو شیطان پھر یہ بغاوت برپا کرے گا کہ نا پرہیزگار لوگ مجھے خدا اور خدا کا بیٹا مانیں۔ اس کی وجہ سے میری باتوں اور میری تعلیمات کو مسخ کر دیا جائے گا یہاں تک کہ مشکل ۳۰ صاحبِ ایمان باقی رہ جائیں گے۔ اس وقت خُدا دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنا رسول بھیجے گا جس کے لیے اس نے دنیا کی یہ ساری چیزیں بنائی ہیں، جو قوت کے ساتھ جنوب سے آئے گا اور بتوں کو بُت پرستوں کے ساتھ برباد کر دے گا، جو شیطان سے وہ اقتدار چھین لے گا جو اس نے انسانوں پر حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کی رحمت اُن لوگوں کی نجات کے لیے اپنے ساتھ لائے گا جو اس پر ایمان لائیں گے، اور مبارک ہے وہ جو اس کی باتوں کو مانے" (باب ۹۶)

"سردار کاہن نے پُوچھا کیا خدا کے اُس رسول کے بعد دوسرے نبی بھی آئیں گے ؟ یسُوع نے جواب دیا اس کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے سچے نبی نہیں آئیں گے مگر بہت سے جھوٹے نبی آجائیں گے جن کا مجھے بڑا غم ہے۔ کیونکہ شیطان خدا کے عادلانہ فیصلے کی وجہ سے اُن کو اٹھائے گا اور وہ میری انجیل کے پردے میں اپنے آپ کو چھپائیں گے" (باب ۹۷)

"سردار کاہن نے پوچھا کہ وہ مسیح کس نام سے پکارا جائے گا اور کیا نشانیاں اس کی آمد کو ظاہر کریں گی؟ یسوع نے جواب دیا اس مسیح کا نام "قابلِ تعریف" ہے، کیونکہ خدا نے جب اس کی روح پیدا کی تھی اس وقت اُس کا یہ نام خود رکھا تھا اور وہاں اسے ایک ملکوتی شان میں رکھا گیا تھا۔ خدا نے کہا "اے محمدؐ، انتظار کر، کیونکہ تیری ہی خاطر میں جنت، دنیا اور بہت سی مخلوق پیدا کردوں گا اور اُس کو تجھے تحفہ کے طور پر دوں گا، یہاں تک کہ جو تیری تبریک کرے گا اسے برکت دی جائے گی اور جو تجھ پر لعنت کرے گا اس پر لعنت کی جائے گی۔ جب میں تجھے دنیا کی طرف بھیجوں گا تو میں تجھ کو اپنے پیغامبرِ نجات کی حیثیت سے بھیجوں گا۔ تیری بات سچی ہوگی یہاں تک کہ زمین و آسمان ٹل جائیں گے مگر تیرا دین نہیں ٹلے گا" سو اُس کا مبارک نام محمدؐ ہے"۔ (باب ۹۷)

برناباس لکھتا ہے کہ ایک موقع پر شاگردوں کے سامنے حضرت عیسیٰؑ نے بتایا کہ میرے ہی شاگردوں میں سے ایک (جو بعد میں یہوداہ اسکریوتی نکلا) مجھے ۳۰ سکوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے گا، پھر فرمایا:-

"اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ جو مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے مارا جائے گا، کیونکہ خدا مجھے زمین سے اُوپر اُٹھائے گا اور اُس غدار کی صورت ایسی بدل دیگا کہ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ وہ میں ہی ہوں۔ تاہم جب وہ ایک بُری موت مرے گا تو ایک مدت تک میری ہی تذلیل ہوتی رہے گی۔ مگر جب محمدؐ، خدا کا مقدس رسول آئے گا تو میری وہ بدنامی دُور کردی جائے گی۔ اور خدا یہ اس لیے کرے گا کہ میں نے اُس مسیح کی صداقت کا اقرار کیا ہے۔ وہ مجھے اِس کا یہ انعام دے گا کہ لوگ یہ جان لیں گے کہ میں زندہ ہُوں اور اُس ذلّت کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے"۔ (باب ۱۱۲)

"(شاگردوں سے حضرت عیسیٰؑ نے کہا) بے شک میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر موسٰیؑ کی کتاب سے صداقت مسخ نہ کردی گئی ہوتی تو خدا ہمارے باپ داؤدؑ کو ایک دوسری کتاب نہ دیتا۔ اور اگر داؤدؑ کی کتاب میں تحریف نہ کی گئی ہوتی تو خدا مجھے انجیل نہ دیتا، کیونکہ خداوند ہمارا خدا بدلنے والا نہیں ہے اور اس نے سب انسانوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے۔ لہٰذا جب اللہ کا رسُول آئے گا تو وہ اس لیے آئے گا کہ ان ساری چیزوں کو صاف کردے جن سے بے خدا لوگوں نے میری کتاب کو آلودہ کردیا ہے"۔ (باب ۱۲۴)

دو شُبہات کا جواب

ان صاف اور مفصّل پیشین گوئیوں میں صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو بادی النظر میں نگاہ کو کھٹکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اِن میں، اور انجیل برناباس کی متعدد دوسری عبارتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے اپنے مسیح ہونے کا انکار کیا ہے۔ دوسری یہ کہ صرف انہی عبارتوں میں نہیں بلکہ اِس انجیل کے بہت سے مقامات پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اصل

عربی نام "محمدؐ" لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ انبیاء کی پیشین گوئیوں کا عام طریقہ نہیں ہے کہ بعد کی آنے والی کسی ہستی کا اصل نام لیا جائے۔ تیسری یہ کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو مسیح کہا گیا ہے۔

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ صرف انجیل برنا باس ہی میں نہیں بلکہ لُوقا کی انجیل میں بھی یہ ذکر موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے شاگردوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ وہ آپ کو مسیح کہیں۔ لُوقا کے الفاظ یہ ہیں: "اُس نے اُن سے کہا لیکن تم مجھے کیا کہتے ہو؟ پطرس نے جواب میں کہا خدا کا مسیح۔ اس نے ان کو تاکید کر کے حکم دیا کہ یہ کسی سے نہ کہنا" (۹: ۲۰-۲۱)۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل جس مسیح کے منتظر تھے اس کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ تلوار کے زور سے دشمنانِ حق کو مغلوب کرے گا، اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا کہ وہ مسیح میں نہیں ہوں بلکہ وہ میرے بعد آنے والا ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ برنا باس کا جو اطالوی ترجمہ اِس وقت دنیا میں موجود ہے اس کے اندر تو حضورؐ کا نام بے شک محمدؐ لکھا ہوا ہے، مگر یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ کتاب کن کن زبانوں سے ترجمہ در ترجمہ ہوتی ہوئی اطالوی زبان میں پہنچی ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل انجیل برنا باس سُریانی زبان میں ہوگی، کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی زبان تھی۔ اگر وہ اصل کتاب دستیاب ہوتی تو دیکھا جا سکتا تھا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا اسمِ گرامی کیا لکھا گیا تھا۔ اب جو کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اصل میں تو حضرت عیسیٰؑ نے لفظ مُنْحَمَنّا استعمال کیا ہوگا جیسا کہ ہم ابنِ اسحاق کے دیئے ہوئے انجیلِ یُوحنّا کے حوالہ سے بتا چکے ہیں، پھر مختلف مترجموں نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے کر دیئے ہوں گے۔ اس کے بعد غالباً کسی مترجم نے یہ دیکھ کر کہ پیشین گوئی میں آنے والے کا جو نام بتایا گیا ہے وہ بالکل لفظ "محمدؐ" کا ہم معنی ہے، آپ کا ہی اسمِ گرامی لکھ دیا ہوگا۔ اس لیے صرف اس نام کی تصریح یہ شُبہ پیدا کر دینے کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے کہ پُوری انجیل برنا باس کسی مسلمان نے جعلی تصنیف کر دی ہے۔

تیسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ لفظ "مسیح" درحقیقت ایک اسرائیلی اصطلاح ہے جسے قرآن مجید میں مخصوص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے لیے صرف اِس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ یہودی ان کے مسیح ہونے کا انکار کرتے تھے، ورنہ یہ نہ قرآن کی اصطلاح ہے نہ قرآن میں کہیں اس کو اسرائیلی اصطلاح کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حق میں اگر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے لفظ مسیح استعمال کیا ہو اور قرآن میں آپ کے لیے یہ لفظ استعمال نہ کیا گیا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ انجیل برنا باس آپ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرتی ہے جس سے قرآن انکار کرتا ہے۔ دراصل بنی اسرائیل کے ہاں قدیم طریقہ یہ تھا کہ کسی چیز یا کسی شخص کو جب کسی مقدس مقصد کے لیے مختص کیا جاتا تھا تو اس چیز پر یا اس شخص کے سر پر تیل مل کر اُسے متبرک (Consecrate) کر دیا جاتا تھا۔ عبرانی زبان میں تیل ملنے کے اس فعل کو مسح کہتے تھے اور جس پر یہ ملا جاتا تھا اُسے مسیح کہا جاتا تھا۔ عبادت

گاہ کے ظروف اِسی طریقہ سے مسح کر کے عبادت کے لیے وقف کیے جاتے تھے۔ کاہنوں (Preasts) کو کہانت (Priest hood) کے منصب پر مامور کرتے وقت بھی مسح کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور نبی بھی جب خدا کی طرف سے بادشاہت یا نبوّت کے لیے نامزد کیے جاتے تو انہیں مسح کیا جاتا۔ چنانچہ بائیبل کی رُو سے بنی اسرائیل کی تاریخ میں بکثرت مسیح پائے جاتے ہیں۔ حضرت ہارُونؑ کاہن کی حیثیت سے مسیح تھے۔ حضرت مُوسیٰ کاہن اور نبی کی حیثیت سے، طالوت بادشاہ کی حیثیت سے، حضرت داؤدؑ بادشاہ اور نبی کی حیثیت سے، مَلکِ صَدق بادشاہ اور کاہن کی حیثیت سے، اور حضرت الیَسَعؑ نبی کی حیثیت سے مسیح تھے۔ بعد میں یہ بھی ضروری نہ رہا تھا کہ تیل مَل کر ہی کسی کو مامور کیا جائے، بلکہ محض کسی کا مامور من اللہ ہونا ہی مسیح ہونے کا ہم معنی بن گیا تھا۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔ ۱۔ سلاطین، باب ۱۹ میں ذکر آیا ہے کہ خدا نے حضرت الیاسؑ (ایلیاہ) کو حکم دیا کہ حزائیل کو مسح کر کہ آرام (دمشق) کا بادشاہ ہو، اور نمشی کے بیٹے یاہُو کو مسح کر کہ اسرائیل کا بادشاہ ہو، اور الیَسَعؑ (الیشع) کو مسح کر کہ تیری جگہ نبی ہو۔ ان میں سے کسی کے سر پر بھی تیل نہیں ملا گیا۔ بس خدا کی طرف سے ان کی ماموریّت کا فیصلہ سنا دینا گویا انہیں مسح کر دینا تھا۔ پس اسرائیلی تصوّر کے مطابق لفظ مسیح درحقیقت "مامور من اللہ" کا ہم معنی تھا اور اسی معنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس لفظ کو استعمال کیا تھا۔ (لفظ "مسیح" کے اسرائیلی مفہوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سائکلو پیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، لفظ "میسّیاہ")۔ ۴۸

باب ۴

سرورِ عالمؐ

فصل ۱

سرورِ عالم[1]

(پوری دُنیا کی مُشترک میراث)

ہم مُسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اس کا مطلب ہے "دُنیا کا سردار"۔ ہندی میں اس کا ترجمہ "جگت گرو" ہوگا اور انگریزی میں (Leader of the World)۔ بظاہر بہت بڑا خطاب ہے، مگر جس بلند پایہ ہستی کو یہ خطاب دیا گیا ہے، اس کا کارنامہ واقعی ایسا ہے کہ اس کو سرورِ عالم کہنا مبالغہ نہیں عین حقیقت ہے۔

دیکھیے! کسی شخص کو دنیا کا لیڈر کہنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اُس نے کسی خاص قوم یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ تمام دُنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا ہو۔ ایک مُحبِ وطن یا ایک قوم پرست لیڈر کی آپ اِس حیثیت سے جتنی چاہیں قدر کر لیں کہ اُس نے اپنے لوگوں کی بڑی خدمت کی، لیکن اگر آپ اس کے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں تو وہ آپ کا لیڈر بہر حال نہیں ہوسکتا۔ جس شخص کی محبت، خیر خواہی اور کارگزاری سب کچھ چین یا ہسپانیہ تک محدود ہو، ایک ہندوستانی کو اُس سے کیا تعلق کہ وہ اسے اپنا لیڈر مانے؟ اگر وہ اپنی قوم کو دوسروں سے افضل ٹھیراتا ہو اور دوسروں کو گرا کر اپنی قوم کو چڑھانا چاہتا ہو تب تو دوسری قوموں کے لوگ اُلٹی اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہیں۔ ساری قوموں کے انسان کسی ایک شخص کو اپنا لیڈر صرف اُسی صورت میں مان سکتے ہیں جبکہ اس کی نگاہ میں سب قومیں اور سب آدمی یکساں ہوں، وہ سب کا یکساں خیر خواہ ہو، اور اپنی خیر خواہی میں کسی طرح ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔

دوسری اہم شرط جو دُنیا کا لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ایسے اصول پیش

---

[1] یہ ایک نشری تقریر ہے جو تقسیم سے کئی سال پہلے ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی گئی تھی اس کے مخاطب صرف مسلمان نہ تھے، بلکہ ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی سب تھے۔ (مرتبین)

کیسے ہوں جو ساری دُنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوں اور جن میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہو۔ لیڈر کے معنی ہی رہنما کے ہیں۔ لیڈر کی ضرورت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ وہ فلاح اور بہتری کا راستہ بتائے۔ لہٰذا دنیا کا لیڈر وہی ہو سکتا ہے جو ساری دنیا کے لوگوں کو ایسا طریقہ بتائے جس میں سب کی فلاح ہو۔

تیسری لازمی شرط دُنیا کا لیڈر ہونے کے لیے یہ ہے کہ اس کی رہنمائی کسی خاص زمانے کے لیے نہ ہو، بلکہ ہر حال اور ہر زمانے میں یکساں مفید، یکساں صحیح اور یکساں قابلِ پیروی ہو۔ جس لیڈر کی رہنمائی ایک زمانے میں کار آمد اور دوسرے زمانے میں بیکار ہو اس کو دنیا کا لیڈر نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کا لیڈر تو وہی ہے کہ دنیا جب تک قائم رہے اس کی رہنمائی بھی کار آمد رہے۔

چوتھی اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس نے صرف اصول پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھایا ہو اور اُن کی بنیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کر دی ہو۔ محض اصول پیش کرنے والا زیادہ سے زیادہ ایک مُفکّر (Thinker) ہو سکتا ہے، لیڈر نہیں ہو سکتا۔ لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اصولوں کو عمل میں لا کر دکھائے۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ یہ چاروں شرطیں اُس ہستی میں کہاں تک پائی جاتی ہیں جس کو ہم "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔

پہلی شرط کو پہلے لیجیے۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک ہی نظر میں محسوس کریں گے کہ یہ کسی قوم پرست یا مُحبِّ وطن کی زندگی نہیں ہے بلکہ ایک مُحبِّ انسانیت اور ایک عالمگیر نظریہ رکھنے والے انسان کی زندگی ہے۔ اُن کی نگاہ میں تمام انسان یکساں تھے۔ کسی خاندان، کسی طبقے، کسی قوم، کسی نسل یا کسی ملک کے خاص مفاد سے انہیں دلچسپی نہ تھی۔ امیر اور غریب اُونچ اور نیچ، کالے اور گورے، عرب اور غیر عرب، مشرقی اور مغربی، سامی اور آرین، سب کو وہ اِس حیثیّت سے دیکھتے تھے کہ یہ سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ اُن کی زبان سے تمام عمر کوئی ایک لفظ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلا، اور نہ زندگی بھر میں کوئی کام انہوں نے ایسا کیا جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہو کہ اُنہیں ایک طبقۂ انسانی کے مفاد سے زیادہ تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی ہی میں حبشی، ایرانی، رومی، مصری اور اسرائیلی، اُسی طرح اُن کے رفیق کار بنے جس طرح عرب۔ اور اُن کے بعد زمین کے ہر گوشے میں ہر نسل اور ہر قوم کے انسانوں نے اُن کو اُسی طرح اپنا رہنما تسلیم کیا جس طرح خود اُن کی اپنی قوم نے۔ یہ اُسی خالص انسانیت ہی کا کرشمہ تو ہے کہ آج آپ ایک ہندوستانی کی زبان[۱]

---

[۱] خیال رہے کہ یہ تقریر اُس زمانے میں ہوئی تھی جب ہندوستان اور پاکستان دونوں ایک ملک تھے۔ (مُرتّبین)

سے اُس شخص کی تعریف سُن رہے ہیں جو صدیوں پہلے عرب میں پیدا ہُوا تھا۔

اب دوسری اور تیسری شرط کو ایک ساتھ لیجیے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے مخصوص قوموں اور مخصوص ملکوں کے وقتی اور مقامی مسائل سے بحث کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی پُوری قوت دُنیا میں انسانیت کے اُس بڑے مسئلے کو حل کرنے میں صرف کر دی جس سے تمام انسانوں کے سارے چھوٹے چھوٹے مسائل خود حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑا مسئلہ کیا ہے؟ وہ صرف یہ ہے کہ:

"کائنات کا نظام فی الواقع جس اصول پر قائم ہے، انسان کی زندگی کا نظام بھی اُسی کے مطابق ہو۔ کیونکہ انسان اِس کائنات کا ایک جُزء ہے اور جُزء کی حرکت کا کُل کے خلاف ہونا ہی خرابی کا موجب ہے"۔

اگر آپ اِس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی نگاہ کو ذرا کوشش کر کے زمان اور مکان کی قیود سے آزاد کر لیجیے اور پُورے کُرۂ زمین پر اس طرح نظر ڈالیے کہ ابتداء سے آج تک اور آئندہ غیر محدُود زمانہ تک بسنے والے تمام انسان بہ یک وقت آپ کے سامنے ہوں۔ پھر دیکھیے کہ انسان کی زندگی میں خرابی کی جتنی صورتیں پیدا ہوئی ہیں یا ہونی ممکن ہیں اُن سب کی جڑ کیا ہے، یا کیا ہو سکتی ہے۔ اِس سوال پر آپ جتنا غور کریں گے، جتنی چھان بین اور تحقیق کریں گے، حاصل یہی نکلے گا کہ:

"انسان کی خدا سے بغاوت تمام خرابیوں کی جڑ ہے"۔

اِس لیے کہ خدا سے باغی ہو کر انسان لازمی طور پر دو صُورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت اختیار کرتا ہے: یا تو وہ اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمّہ دار سمجھ کر من مانی کارروائیاں کرنے لگتا ہے، اور یہ چیز اُسے ظالم بنا دیتی ہے۔ یا پھر وہ خدا کے سوا دوسروں کے حکم کے آگے سر جھکانے لگتا ہے، اور اس سے دُنیا میں فساد کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اِن دونوں صورتوں میں خراب نتائج کیوں نکلتے ہیں؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لیے اس کا نتیجہ بُرا نکلتا ہے۔ یہ ساری کائنات فی الواقع خدا کی سلطنت ہے۔ زمین، سُورج، چاند، ہوا، پانی، روشنی، سب خدا کی مِلک ہیں اور انسان اِس سلطنت میں پیدائشی بندے (Born Subject) کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پُوری سلطنت جس نظام پر چل رہی ہے، اگر انسان اس کا ایک جُزء ہونے کے باوجود اُس سے مختلف رویّہ اختیار کرے تو لامحالہ اس کا ایسا رَوّیہ تباہ کُن نتائج ہی پیدا کرے گا۔ اُس کا یہ سمجھنا کہ مجُھ سے اُوپر کوئی مقتدرِ اعلیٰ نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دِہ ہوں، واقعہ کے خلاف ہے۔ اس لیے جب وہ خود مختار بن کر غیر ذمّہ دارانہ طریقہ پر کام کرتا ہے اور اپنا قانونِ زندگی آپ تجویز کرتا ہے تو نتیجہ بُرا نکلتا ہے۔ اسی طرح اس کا خدا کے سوا کسی اور کو صاحبِ اختیار و اقتدار ماننا اور اُس سے خوف یا لالچ رکھنا، اُس کی آقائی کے آگے جُھک جانا بھی حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ وہ

یہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس کا نتیجہ بھی بُرا ہی نکلتا ہے۔ صحیح نتیجہ برآمد ہونے کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ زمین و آسمان میں جو حقیقی حکومت ہے، انسان اُس کے سامنے سر جھکا دے، اپنی خودی و خودسری کو اس کے آگے تسلیم کر دے، اپنی اطاعت اور بندگی کو اس کے لیے خالص کر دے، اور اپنی زندگی کا ضابطہ و قانون خود بنانے یا دوسروں سے لینے کے بجائے اُس سے لے۔

یہ بنیادی اصلاح کی تجویز ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے لیے پیش کی ہے۔ یہ مشرق اور مغرب کی قید سے آزاد ہے۔ روئے زمین میں جہاں جہاں انسان آباد ہیں، یہی ایک اصلاحی تجویز ان کی زندگی کی بگڑی ہوئی کل کو درست کر سکتی ہے۔ اور یہ ماضی و مستقبل کی قید سے بھی آزاد ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے یہ جتنی صحیح اور کارگر تھی اتنی ہی آج ہے اور اتنی ہی دس ہزار برس بعد بھی ہوگی۔

اب آخری شرط باقی رہ جاتی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے صرف خیالی نقشہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اُس نقشہ پر ایک زندہ سوسائٹی پیدا کر کے دکھا دی۔ انہوں نے ۲۳ برس کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدا کی حکومت کے آگے سرِ اطاعت جھکانے پر آمادہ کر لیا۔ ان سے خودپرستی بھی چھڑائی اور خدا کے سوا دوسروں کی بندگی بھی۔ پھر اُن کو جمع کر کے خالص خدا کی بندگی پر ایک نیا نظامِ اخلاق، نیا نظامِ تمدّن، نیا نظامِ معیشت، اور نیا نظامِ حکومت بنایا، اور تمام دنیا کے سامنے اس بات کا عملی مظاہرہ کر کے دکھا دیا کہ جو اصول وہ پیش کر رہے ہیں اس پر کیسی زندگی بنتی ہے، اور دوسرے اصولوں کی زندگی کے مقابلہ میں وہ کتنی اچھی کتنی پاکیزہ اور کتنی صالح ہے۔

یہ وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرورِ عالم یا سارے جہاں کا لیڈر کہتے ہیں۔ اُن کا یہ کام کسی خاص قوم کے لیے نہ تھا تمام انسانوں کے لیے تھا۔ یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے جس پر کسی کا حق کسی دوسرے سے کم یا زیادہ نہیں ہے۔ جو چاہے اس میراث سے فائدہ اٹھائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے خلاف کسی کو تعصّب رکھنے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

فصل : ۲

سرورِ عالم کا اصلی کارنامہ[1]

دنیا جانتی ہے کہ نبی عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم انسانیت کے اُس برگزیدہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو قدیم ترین زمانہ سے نوعِ انسانی کو خدا پرستی اور حُسنِ اخلاق کی تعلیم دینے کے لیے اُٹھتا رہا ہے۔ ایک خدا کی بندگی اور پاکیزہ اخلاقی زندگی کا درس جو ہمیشہ سے دُنیا کے پیغمبر، رِشی اور مُنی دیتے رہے ہیں وہی آنحضرت ؐ نے بھی دیا ہے، اُنہوں نے کسی نئے خدا کا تصوّر پیش نہیں کیا ہے اور نہ کسی نرالے اخلاق ہی کا سبق دیا ہے جو اُن سے پہلے کے رہبرانِ انسانیّت کی تعلیم سے مختلف ہو۔ پھر سوال یہ ہے کہ اُن کا وہ اصلی کارنامہ کیا ہے جس کی بنا پر ہم انہیں تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا آدمی قرار دیتے ہیں؟ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ بے شک آنحضرت ؐ سے پہلے انسان خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت سے آشنا تھا، مگر اس بات سے پوری طرح واقف نہ تھا کہ اِس فلسفیانہ حقیقت کا انسانی اخلاق سے کیا تعلّق ہے۔ بلاشُبہ انسان کو اخلاق کے عمدہ اصُولوں سے آگاہی حاصل تھی، مگر اسے واضح طور پر یہ معلُوم نہیں تھا کہ زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں میں اِن اخلاقی اصُولوں کی عملی ترجمانی کس طرح ہونی چاہیے۔ خدا پر ایمان، اصولِ اخلاق اور عملی زندگی، یہ تین الگ الگ چیزیں تھیں جن کے درمیان کوئی منطقی رابطہ، کوئی گہرا تعلق، اور کوئی نتیجہ خیز رشتہ موجود نہ تھا۔ یہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے ان تینوں کو ملا کر ایک نظام میں سمو دیا اور ان کے امتزاج سے ایک مکمّل تہذیب و تمدّن کا نقشہ محض خیال کی دُنیا میں نہیں بلکہ عمل کی دُنیا میں بھی قائم کر کے رکھ دیا۔

ایمان عمل انگیز قوّت ہے!

انہوں نے بتایا کہ خدا پر ایمان محض ایک فلسفیانہ حقیقت کے مان لینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس ایمان کا مزاج اپنی عین فطرت کے لحاظ سے ایک خاص قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اسی اخلاق کا ظہور انسان کی عملی زندگی کے رویّہ میں ہونا چاہیے۔ ایمان ایک تخم ہے جو نفسِ انسانی میں جڑ پکڑتے ہی اپنی فطرت کے مطابق عملی زندگی کے ایک پورے درخت کی تخلیق شروع کر دیتا ہے۔ اور اس درخت کے تنے سے لے کر اُس کی شاخ شاخ اور پتّی پتّی

[1] یہ بھی ایک نشری تقریر ہے جو تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان ریڈیو سے نشر کی گئی تھی۔ (مرتبین)

تک میں اخلاق کا وہ حیوانی رس جاری و ساری ہو جاتا ہے جس کی سوتیں تخم کے ریشوں سے اُبلتی ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ زمین میں بوئی تو جائے آم کی گٹھلی اور اس سے نکل آئے لیموں کا درخت، اُسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دل میں بویا تو گیا ہو خدا پرستی کا بیج اور اس سے رونما ہو جائے ایک مادہ پرستانہ زندگی جس کی رگ رگ میں بد اخلاقی کی رُوح سرایت کیے ہوئے ہو۔ خدا پرستی سے پیدا ہونے والے اخلاق اور شرک، دہریت یا رہبانیت سے پیدا ہونے والے اخلاق یکساں نہیں ہو سکتے۔ زندگی کے یہ سب نظریے اپنے الگ الگ مزاج رکھتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج دوسرے سے مختلف قسم کے اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔

پوری زندگی کے لیے خدا پرستانہ اخلاق

پھر جو اخلاق خدا پرستی سے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف ایک خاص عابد و زاہد گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہیں کہ صرف خانقاہ کی چار دیواری اور عُزلت کے گوشے ہی میں ان کا ظہور ہو سکے۔ ان کا اطلاق وسیع پیمانے پر پوری انسانی زندگی اور اس کے ہر ہر پہلو میں ہونا چاہیے۔ اگر ایک تاجر خدا پرست ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی تجارت میں خدا پرستانہ اخلاق ظاہر نہ ہو۔ اگر ایک جج خدا پرست ہے تو عدالت کی کرسی پر، اور ایک پولیس مَین خدا پرست ہے تو پولیس پوسٹ پر اس سے غیر خدا پرستانہ اخلاق ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اگر کوئی قوم خدا پرست ہے تو اس کی شہری زندگی میں، اس کے انتظامِ ملکی میں، اُس کی خارجی سیاست میں، اور اس کی صلح و جنگ میں خدا پرستانہ اخلاق کی نمود ہونی چاہیے۔ ورنہ اس کا ایمان باللہ محض ایک لفظِ بے معنی ہے۔

حضورؐ کی تعلیم کے چند اسباق

اب رہی یہ بات کہ خدا پرستی کس قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتی ہے اور اُن اخلاقیات کا ظہور کس طرح انسان کی عملی زندگی میں، اور انفرادی و اجتماعی رویّہ میں ہونا چاہیے، تو یہ ایک وسیع مضمون ہے جسے ایک مختصر گفتگو میں سمیٹنا مشکل ہے۔ مگر مَیں نمونے کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات آپ کو سناؤں گا جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ آنحضرتؐ کے مرتّب کیے ہوئے نظامِ زندگی میں ایمان، اخلاق اور عمل کا امتزاج کس نوعیت کا ہے۔ سُنیئے حضورؐ فرماتے ہیں:۔

الایمان بضع وسبعون شعبۃ افضلھا قول لا الٰہ الا اللہ وادناھا اماطۃ الاذیٰ عن الطریق والحیاء شعبۃ من الایمان۔

"ایمان کے بہت سے شعبے ہیں۔ اُس کی جڑ یہ ہے کہ تم خدا کے سوا کسی کو معبود نہ مانو، اور اُس کی آخری شاخ یہ ہے کہ راستے میں اگر تم کوئی ایسی چیز دیکھو جو بندگانِ خدا کو تکلیف دینے والی ہو تو اُسے ہٹا دو۔ اور حیا بھی ایمان ہی کا ایک شعبہ ہے۔"

الطّهورُ شطر الایمان

"جسم و لباس کی پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔"

اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَہُ النَّاسُ علیٰ دِمائِھِم و اَمْوالِھِم۔

"مومن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنی جان و مال کا کوئی خطرہ نہ ہو۔"

لا ایمانَ لِمَنْ لا اَمانۃَ لہ ولا دینَ لمن لا عھدَ لہ۔

"اُس شخص میں ایمان نہیں ہے جس میں امانت داری نہیں اور وہ شخص بے دین ہے جو عہد کا پابند نہیں۔"

اذا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَساءَتْکَ سَیِّأَتُکَ فَانْتَ مُؤمِنٌ۔

"جب نیکی کر کے تجھے خوشی ہو اور بُرائی کر کے تجھے پچھتاوا ہو تو تُو مومن ہے۔"

الایمانُ الصبرُ والسماحۃُ۔

"ایمان تحمُّل اور فراخ دلی کا نام ہے۔"

افضل الایمانِ ان تحبَّ للہ و تبغض للہ وتعملَ لسانک فی ذکر اللہ و ان تُحبَّ للنّاس ما تحبُّ لنفسِک و تکرہَ لھم ما تکرہ لنفسِک۔

"بہترین ایمانی حالت یہ ہے کہ تیری دوستی اور دُشمنی خدا واسطے کی ہو، تیری زبان پر خدا کا نام جاری ہو اور تو دوسروں کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور اُن کے لیے وہی کچھ ناپسند کرے جو اپنے لیے ناپسند کرتا ہے۔"

اکمل المؤمنینِ ایماناً احسنہم خُلُقاً والطفھم باھلہ۔

"اہلِ ایمان میں سب سے زیادہ کامل ایمان اُس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں اور جو اپنے گھر والوں کے ساتھ حُسنِ سلوک میں سب سے بڑھا ہُوا ہے۔"

مَنْ کَانَ یُؤمِنُ بِاللہِ وَالْیَوْمِ الاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ ولا یُوذِ جارہٗ ومن کان یومن باللہ والیومِ الاٰخر فَلْیَقُلْ خیراً اَوْ لِیَصْمُتْ۔

"جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے اپنے مہمان کی عزّت کرنی چاہیے، اپنے ہمسائے

۱؎ واضح رہے کہ یہ عربی عبارات نشر نہیں کی گئی تھیں بلکہ ان کا صرف ترجمہ نشر کیا گیا تھا، بعد میں جب یہ شائع ہوئی تو ترجمہ کے ساتھ اصل عربی عبارتیں بھی درج کر دی گئیں۔ (مرتّبین)

کو تکلیف نہ دینی چاہیے اور اس کی زبان کھلے تو بھلائی پر کھلے ورنہ چپ رہے۔"

لیس المومن باللعّان ولا باللعّان ولا الفاحش ولا البذی۔

"مومن کبھی طعنے دینے والا لعنت کرنے والا اور بدگو اور زباں دراز نہیں ہوا کرتا۔"

یطبع المومن علی الخصال کلھا الا الخیانۃ والکذب۔

"مومن سب کچھ ہو سکتا ہے مگر جھوٹا اور خائن نہیں ہو سکتا۔"

وَاللهِ لَا یُؤمن، واللہ لا یؤمن، واللہ لا یؤمن الذی لا یامن جارہٗ بوائقہٗ۔

"خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی بدی سے اس کا ہمسایہ امن میں نہ ہو۔"

لَیْسَ الْمُؤمِنُ بِالَّذِی یَشْبَعُ وَجَارُہٗ جَائِعٌ اِلٰی جَنْبِہٖ۔

"جو شخص خود پیٹ بھر کھالے اور اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا رہ جائے وہ ایمان نہیں رکھتا۔"

مَنْ کَظَمَ غَیْضًا وھو یَقْدِرُ عَلٰی ان ینفذہٗ ملأ اللہُ قلبہٗ اَمْنًا وَّاِیْمَانًا۔

"جو شخص اپنا غصہ نکال لینے کی طاقت رکھتا ہو اور پھر ضبط کر جائے، اس کے دل کو خدا ایمان اور اطمینان سے لبریز کر دیتا ہے۔"

مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ۔

"جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، اور جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے خیرات کی اس نے شرک کیا۔"

اَرْبَعٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ کَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا۔ اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔

"چار صفات ایسی ہیں کہ جس میں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے۔ امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ بولے تو جھوٹ بولے۔ عہد کرے تو اسے توڑ دے۔ اور لڑے تو شرافت کی حد سے گزر جائے۔"

عدلت الشّھادۃُ الزُّوْرُ بِالْاِشْرَاکِ بِاللہِ۔

"جھوٹی گواہی اتنا بڑا گناہ ہے کہ شرک کے قریب جا پہنچتا ہے۔"

اَلْمُجَاھِدُ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَہٗ فِیْ طَاعَۃِ اللہِ وَالْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ مَا نَھَی اللہُ عَنْہُ۔

"اصلی مجاہد وہ ہے جو خدا کی فرماں برداری میں خود اپنے نفس سے لڑے اور اصلی مہاجر وہ ہے جو

اُن کاموں کو چھوڑ دے جنہیں خدا نے منع فرمایا ہے۔"

اَتَدْرُوْنَ مَنِ السَّابِقُوْنَ اِلٰی ظِلِّ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ؟ قَالُوا اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔ قَالَ الَّذِیْنَ اِذَا اُعْطُوا الْحَقَّ قَبِلُوْہُ وَاِذَا سُئِلُوْہُ بَذَلُوْہُ وَ حَکَمُوْا لِلنَّاسِ کَحُکْمِھِمْ لِاَنْفُسِھِمْ۔

"جانتے ہو قیامت کے روز خدا کے سائے میں سب سے پہلے جگہ پانے والے لوگ کون ہونگے؟ وہ جن کا حال یہ رہا کہ جب بھی حق ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے مان لیا، اور جب بھی حق اُن سے مانگا گیا تو انہوں نے کھلے دل سے دیا، اور دوسروں کے معاملہ میں انہوں نے وہی فیصلہ کیا جو وہ خود اپنے معاملہ میں چاہتے تھے۔"

اِضْمَنُوْا لِیْ سِتًّا مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَضْمَنْ لَکُمُ الْجَنَّۃَ۔ اُصْدُقُوْا اِذَا حَدَّثْتُمْ، وَاَوْفُوْا اِذَا وَعَدْتُّمْ، وَاَدُّوْا اِذَا ائْتُمِنْتُمْ، وَاحْفَظُوْا فُرُوْجَکُمْ، وَغُضُّوْا اَبْصَارَکُمْ وَکُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ۔

"تم چھ باتوں کی مجھے ضمانت دو میں تمہیں جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔ بولو تو سچ بولو۔ وعدہ کرو تو وفا کرو۔ امانت میں پُورے اُترو۔ بدکاری سے پرہیز کرو۔ بدنظری سے بچو۔ اور ظلم سے ہاتھ روکو۔"

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ خِبٌّ وَلَا بَخِیْلٌ وَلَا مَنَّانٌ۔

"دھوکہ باز اور بخیل اور احسان جتانے والا آدمی جنّت میں نہیں جا سکتا۔"

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَکُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ کَانَتِ النَّارُ اَوْلٰی بِہٖ۔

"جنت میں وہ گوشت نہیں جا سکتا جو حرام کے لقموں سے بنا ہو۔ حرام خوری سے پلے ہوئے جسم کے لیے تو آگ ہی زیادہ موزوں ہے۔"

مَنْ بَاعَ عَیْبًا لَمْ یُنَبِّہْہُ لَمْ یَزَلْ فِیْ مَقْتِ اللّٰہِ وَلَمْ تَزَلِ الْمَلٰئِکَۃُ تَلْعَنُہٗ

"جس شخص نے عیب دار چیز بیچی اور خریدار کو عیب سے آگاہ نہ کیا اس پر خدا کا غصہ بھڑکتا رہتا ہے اور فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔"

لَوْ اَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ عَاشَ وَعَلَیْہِ دَیْنٌ مَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یُقْضٰی دَیْنُہٗ۔

"کوئی شخص خواہ کتنی ہی بار زندگی پائے اور خدا کی راہ میں جہاد کر کر کے جان دیتا رہے مگر وہ جنّت

میں نہیں جاسکتا اگر اس پر قرض ہو اور وہ ادا نہ کیا گیا ہو۔"

اِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ وَالْمَرْأَةُ بِطَاعَةِ اللّٰهِ سِتِّيْنَ سَنَةً ثُمَّ يَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَيُضَارَّانِ فِي الْوَصِيَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ۔

"مرد ہو یا عورت، اگر انہوں نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال بھی اللہ کی فرمانبرداری میں بسر کیے ہوں لیکن جب ان کی موت کا وقت آیا تو وصیت میں کسی کی حق تلفی کر کے اُسے نقصان پہنچایا تو دونوں دوزخ کے مستحق ہوں گے۔"

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ سَيِّئُ الْمَلَكَةِ۔

"وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جو اپنے ماتحتوں پر بُری طرح افسری کرے گا۔"

اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّدَقَةِ وَالصَّلٰوةِ؟ اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ۔ وَاِفْسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ۔

"میں تمہیں بتاؤں کہ روزے اور خیرات اور نماز سے بھی افضل کیا چیز ہے؟ وہ ہے بگاڑ میں صلح کرانا۔ اور لوگوں کے باہمی تعلقات میں فساد ڈالنا وہ فعل ہے جو آدمی کی ساری نیکیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔"

اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِيْ مَنْ يَّاْتِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِصَلٰوةٍ وَّصِيَامٍ وَّزَكٰوةٍ وَّيَاْتِيْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَكَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ يُّقْضٰى مَا عَلَيْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ۔

"اصل مُفلس وہ ہے جو قیامت کے روز خدا کے حضور اس حال میں حاضر ہُوا کہ اس کے ساتھ نماز، روزہ، زکوٰۃ سب ہی کچھ تھا، مگر اس کے ساتھ وہ کسی کو گالی دے کر آیا تھا، کسی پر بہتان لگا کر آیا تھا، کسی کا مال مار کھایا تھا، کسی کا خون بہایا تھا، اور کسی کو پیٹ کر آیا تھا۔ پھر خدا نے اس کی ایک ایک نیکی ان مظلوموں پر بانٹ دی اور جب اس سے بھی حساب چُکتا نہ ہُوا تو ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے اور اسے دوزخ میں جھونک دیا۔"

لَنْ يَّهْلِكَ النَّاسُ حَتّٰى يَعْذِرُوْا مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔

"لوگ کبھی نجات سے محروم نہ ہوں اگر اپنی بُرائیوں کی تاویلیں کر کر کے اپنے نفس کو بُرائیوں پر مطمئن نہ کرتے رہیں۔"

اَلْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ

"جو تاجر قیمتیں چڑھانے کے لیے مال روک رکھے وہ ملعون ہے"۔

مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا يُرِيْدُ بِهِ الْغَلَاءَ فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللهِ۔

"جس نے چالیس دن غلّہ اس نیت سے روک رکھا کہ قیمتیں چڑھ جائیں تو خدا کا اُس سے اور اس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں"۔

مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ تَصَدَّقَ بِهٖ لَمْ يَكُنْ لَهٗ كَفَّارَةً۔

"چالیس دن غلّہ روکنے کے بعد اگر آدمی اُس غلّہ کو خیرات بھی کر دے تو معاف نہ کیا جائیگا"۔

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بہت سے اقوال میں سے چند ہیں جو مَیں نے محض نمونے کے طور پر آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ حضوؐر نے ایمان سے اخلاق کا اور اخلاق سے زندگی کے تمام شعبوں کا تعلق کس طرح قائم کیا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آپؐ نے ان باتوں کو صرف باتوں کی حد تک ہی نہ رکھا بلکہ عمل کی دنیا میں ایک پُورے ملک کے نظامِ تمدن وسیاست کو انہی بنیادوں پر قائم کر کے دکھا دیا۔ اور آپ کا یہی وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر آپؐ نوعِ انسانی کے سب سے بڑے رہنما ہیں۔ ۵۰ء

باب ۵

ختمِ نبوّت

فصل (۱)

ختمِ نبوّت کی حقیقت اور اُس کے دلائل

ختمِ نبوّت کی صحیح توجیہ

جب تک انسانی تمدّن اِس حد پر نہیں پہنچا تھا کہ کسی نبی کا پیغام عام ہو سکے اور انسانوں کی کوئی ایسی اُمّت تیار نہ ہوتی تھی کہ نبی کے پیغام اور اس کی تعلیم اور اس کے اُسوہ کو محفوظ رکھ سکے اور دُنیا کے گوشے گوشے میں اسے پھیلا سکے، اس وقت تک سلسلۂ نبوت جاری رہا اور مختلف قوموں اور ملکوں میں نبی بھیجے جاتے رہے۔ مگر جب ایک طرف تو تمدّن اس حد تک ترقی کر گیا کہ ایک نبی کا پیغام عالمگیر ہو سکتا تھا، اور دوسری طرف ہدایتِ حق قبول کرنے والوں کی ایک ایسی اُمّت بھی بن گئی جو کتاب الٰہی کو اور کتاب کے لانے والے کی سیرت اور اس کی مکمل عملی رہنمائی کو جُوں کی تُوں محفوظ رکھنے کے قابل تھی تو نبوّت کی خدمت پر کسی مزید آدمی کو مامور کرنے کی حاجت باقی نہ رہی۔[۱]

حضورؐ سے پہلے کے دَور کے مخصوص احوال

ابتداءً ہر قوم میں الگ الگ پیغمبر آتے تھے اور ان کی تعلیم ان کی قوم ہی کے اندر محدُود رہتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت سب قومیں ایک دوسرے سے الگ تھیں۔ ان کے درمیان زیادہ میل جول نہ تھا۔ ہر قوم اپنے وطن کی حدُود میں گویا مقیّد تھی۔ ایسی حالت میں کوئی عام اور مشترک تعلیم تمام قوموں میں پھیلنی بہت مشکل تھی۔ اس کے علاوہ مختلف قوموں کے حالات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ جہالت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس جہالت کی بدولت اعتقاد اور اخلاق کی جو خرابیاں پیدا ہوئی تھیں وہ ہر جگہ مختلف صورت کی تھیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ خدا کے پیغمبر ہر قوم کو الگ الگ تعلیم و ہدایت دیں۔ آہستہ آہستہ غلط خیالات کو مٹا کر صحیح خیالات کو پھیلائیں۔ رفتہ رفتہ جاہلانہ طریقوں

---

[۱] جو لوگ ختمِ نبوّت کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ انسانی شعُور کو اس کی ضرورت نہیں رہی، وہ دراصل سلسلۂ نبوّت کی توہین اور اس پر حملہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کے معنی یہ ہیں کہ صرف ایک خاص شعُوری حالت تک ہی اُس ہدایت کی ضرورت ہے جو نبی لاتے ہیں۔ اُس کے بعد انسان نبوّت کی رہنمائی سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ (مؤلف)

کو چھوڑ کر اعلیٰ درجہ کے قوانین کی پیروی سکھائیں اور اُس طرح ان کی تربیت کریں جیسے بچّوں کی کی جاتی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اِس طریقہ سے قوموں کی تعلیم میں کتنے ہزار برس صرف ہوتے ہوں گے۔ بہرحال ترقی کرتے کرتے آخر کار وہ وقت آیا جب نوعِ انسانی بچپن کی حالت سے گزر کر سِن بلوغ کو پہنچنے لگی۔ تجارت و صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ قوموں کے تعلقات ایک دوسرے سے قائم ہو گئے۔ چین و جاپان سے لے کر یورپ و افریقہ کے دُور دراز ملکوں تک جہاز رانی اور خشکی کے سفروں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اکثر قوموں میں تحریر کا رواج ہوا۔ علوم و فنون پھیلے اور قوموں کے درمیان خیالات اور علمی مضامین کا تبادلہ ہونے لگا۔ بڑے بڑے فاتح پیدا ہوئے اور انہوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کر کے کئی کئی ملکوں اور کئی کئی قوموں کو ایک سیاسی نظام میں ملا دیا۔ اس طرح وہ دُوری اور جدائی جو پہلے انسانی قوموں میں پائی جاتی تھی رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی اور یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کی ایک ہی تعلیم اور ایک ہی شریعت تمام دنیا کے لیے بھیجی جائے۔ اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے انسان کی حالت اس حد تک ترقی کر چکی تھی کہ گویا وہ خود ہی ایک مشترک مذہب مانگ رہا تھا۔ بودھ مت اگرچہ کوئی پُورا مذہب نہ تھا اور اس میں محض چند اخلاقی اصول ہی تھے، مگر ہندوستان سے نکل کر وہ ایک طرف جاپان اور منگولیا تک اور دُوسری طرف افغانستان اور بخارا تک پھیل گیا اور اس کی تبلیغ کرنے والے دُور دُور ملکوں تک جا پہنچے۔ اس کے چند صدی بعد عیسائی مذہب پیدا ہُوا۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسلام ہی کی تعلیم لے کر آئے تھے، مگر ان کے بعد عیسائیت کے نام سے ایک ناقص مذہب بنا لیا گیا اور عیسائیوں نے اس مذہب کو ایران سے لے کر افریقہ اور یورپ کے دُور دراز ملکوں میں پھیلا دیا۔ یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ اُس وقت دنیا خود ایک عام انسانی مذہب مانگ رہی تھی اور اس کے لیے یہاں تک تیار ہو گئی تھی کہ جب اسے کوئی پُورا اور صحیح مذہب نہ ملا تو اس نے کچّے اور نا تمام مذہبوں ہی کو انسانی قوموں میں پھیلانا شروع کر دیا۔

تکمیلِ دین اور ختمِ نبوّت

یہ وقت تھا جب تمام دنیا اور تمام انسانی قوموں کے لیے ایک پیغمبر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو عرب کی سرزمین میں پیدا کیا گیا اور ان کو اسلام کی پُوری تعلیم اور مکمّل قانون دے کر اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ اسے سارے جہاں میں پھیلا دیں۔

خوب سمجھ لیجیے کہ اِس زمانہ میں اسلام کا سچّا اور سیدھا راستہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم اور قرآن مجید کے سوا نہیں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم تمام نوعِ انسانی کے لیے خدا کے پیغمبر ہیں۔ اُن پر پیغمبری کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو جس قدر ہدایت دینا چاہتا تھا وہ سب کی سب اس نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعہ بھیج دی۔ اب جو شخص حق کا طالب ہو اور خدا کا مُسلم بندہ بننا چاہتا ہو اس پر لازم ہے کہ خدا کے آخری پیغمبر پر ایمان

لاتے۔ جو کچھ تعلیم انہوں نے دی ہے اس کو مانے اور جو طریقہ انہوں نے بتایا ہے اس کی پیروی کرے۔ ۸۲؎

ختمِ نبوت پر دلائل

پیغمبری کی حقیقت کو جو شخص بھی سمجھتا ہو اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ پیغمبر روز روز پیدا نہیں ہوتے، نہ یہ ضروری ہے کہ ہر قوم کے لیے ہر وقت ایک پیغمبر ہو۔ پیغمبر کی زندگی دراصل اس کی تعلیم و ہدایت کی زندگی ہے۔ جب تک اس کی تعلیم اور ہدایت زندہ ہے، اس وقت تک گویا وہ خود زندہ ہے۔ پچھلے پیغمبروں کا دَور ختم ہو گیا، کیونکہ جو تعلیم انہوں نے دی تھی دنیا نے اس کو بدل ڈالا۔ جو کتابیں وہ لائے تھے اُن میں سے ایک بھی آج اصل صورت میں موجود نہیں۔ خود ان کے پیرو بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہمارے پاس پیغمبروں کی دی ہوئی اصلی کتابیں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی سیرتوں کو بھی بُھلا دیا۔ پچھلے پیغمبروں میں سے کسی ایک کے بھی صحیح اور معتبر حالات آج کہیں نہیں ملتے۔ یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس زمانہ میں پیدا ہوئے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ کیا کام انہوں نے کیے؟ کس طرح زندگی بسر کی؟ کِن باتوں کی تعلیم دی؟ اور کن باتوں سے روکا؟ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دَورِ نبوت جاری ہے، کیونکہ ان کی تعلیم و ہدایت زندہ ہے۔ جو قرآن انہوں نے دیا تھا وہ اپنے اصلی الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں ایک حرف، ایک نقطہ، ایک زیر و زبر کا بھی فرق نہیں آیا۔ ان کی زندگی کے حالات، اُن کے اقوال، اُن کے افعال، سب کے سب محفوظ ہیں اور تیرہ سو برس سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد بھی تاریخ میں اُن کا نقشہ ایسا صاف نظر آتا ہے کہ گویا ہم خود آنحضرتؐ کو دیکھ رہے ہیں۔ دُنیا کے کسی شخص کی زندگی بھی اتنی محفوظ نہیں جتنی آنحضرتؐ کی زندگی محفوظ ہے۔ ہم اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ہر وقت آنحضرتؐ کی زندگی سے سبق لے سکتے ہیں۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کسی دوسرے پیغمبر کی ضرورت نہیں۔

ایک پیغمبر کے بعد دوسرا پیغمبر آنے کی صرف تین ہی وجہیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ یا تو پہلے پیغمبر کی تعلیم و ہدایت مٹ گئی ہو اور اس کو پھر پیش کرنے کی ضرورت ہو۔

۲۔ یا پہلے پیغمبر کی تعلیم مکمل نہ ہو اور اس میں ترمیم یا اضافہ کی ضرورت ہو۔

۳۔ یا پہلے پیغمبر کی تعلیم ایک خاص قوم تک محدود ہو اور دوسری قوم یا قوموں کے لیے ایک الگ پیغمبر کی ضرورت ہو۔[1]

یہ تینوں وجہیں اب باقی نہیں رہیں۔

---

[1] ایک چوتھی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک پیغمبر کی موجودگی میں اس کی مدد کے لیے ایک دوسرا پیغمبر بھیجا جائے۔ لیکن ہم نے اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ قرآن مجید میں اس کی صرف دو مثالیں مذکور ہیں۔ اور ان مستثنیٰ مثالوں سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مددگار پیغمبر بھیجنے کا کوئی عام قاعدہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ (مؤلف)

۱- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم وہدایت زندہ ہے اور وہ ذرائع پوری طرح محفوظ ہیں جن سے ہر وقت یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ کا دین کیا تھا، کیا ہدایت لے کر آپ آئے تھے، کس طریقِ زندگی کو آپ نے رائج کیا، اور کن طریقوں کو آپ نے مٹانے اور بند کرنے کی کوشش فرمائی۔ پس جب کہ آپ کی تعلیم وہدایت مٹی ہی نہیں تو اس کو ازسرِ نو پیش کرنے کے لیے کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعہ سے دنیا کو اسلام کی مکمّل تعلیم دی جا چکی ہے۔ اب نہ اس میں کچھ گھٹانے بڑھانے کی ضرورت ہے اور نہ کوئی ایسا نقص باقی رہ گیا ہے جس کی تکمیل کے لیے کسی نبی کے آنے کی حاجت ہو۔ لہٰذا دوسری وجہ بھی دُور ہو گئی۔

۳- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاص قوم کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اور تمام انسانوں کے لیے آپ کی تعلیم کافی ہے۔ لہٰذا اب کسی خاص قوم کے لیے الگ نبی آنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح تیسری وجہ بھی دُور ہو گئی۔

اِسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو خاتم النبیّین کہا گیا ہے، یعنی سلسلہ نبوت کو ختم کر دینے والا۔ اب دنیا کو کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے طریقہ پر خود چلیں اور دوسروں کو چلائیں۔ آپ کی تعلیمات کو سمجھیں، ان پر عمل کریں۔ اور دنیا میں اُس قانون کی حکومت قائم کریں جس کو لے کر آنحضرتؐ تشریف لائے تھے۔ ۵۸۳

تمام نوعِ انسانی کے لیے ذریعہ ہدایت

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (سبا: ۲۸)

(اے نبیؐ) "ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

یعنی تم صرف اِسی شہر، یا اِسی ملک، یا اسی زمانے کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہو مگر یہ تمہارے ہم عصر اہلِ وطن تمہاری قدر ومنزلت کو نہیں سمجھتے اور ان کو احساس نہیں ہے کہ کیسی عظیم ہستی کی بعثت سے ان کو نوازا گیا ہے۔ یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم صرف اپنے ملک یا اپنے زمانے کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک پوری نوعِ بشری کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے، مثلاً:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ۔ (الانعام-۱۹)

اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے مَیں تم کو اور ہر اُس شخص کو متنبہ کروں جسے یہ پہنچے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (الاعراف: ۱۵۸)

اے نبی کہدو کہ اے انسانو، مَیں تم سب کی طرف اللہ کا رسُول ہوں۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (الانبیاء: ۱۰۷)

اور اے نبی، ہم نے نہیں بھیجا تم کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت کے طور پر

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ (الفرقان-۱)

بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے متنبّہ کرنے والا ہو۔

یہی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود بھی بہت سی احادیث میں مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے مثلاً:

بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ۔ (مسند احمد، مرویات ابوموسیٰ اشعریؓ)

مَیں گورے اور کالے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

اَمَّا اَنَا فَاُرْسِلْتُ اِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ عَامَّةً وَكَانَ مَنْ قَبْلِيْ اِنَّمَا يُرْسَلُ اِلٰى قَوْمِهٖ۔ (مسند احمد، مرویات عبداللہ بن عمرو)

مَیں عمومیّت کے ساتھ تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں حالانکہ مجھ سے پہلے جو نبی بھی گزرا ہے وہ اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔

وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً (بخاری، مسلم، من حدیث جابرؓ بن عبداللہ)

پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور مَیں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہُوا ہوں

بُعِثْتُ انا والساعة کھاتین یعنی اصبعین۔ (بخاری ومسلم)

میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں۔ یہ فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی دو انگلیاں اٹھائیں۔

مطلب یہ تھا کہ جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی حائل نہیں ہے اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان بھی کوئی نبوت نہیں ہے۔ میرے بعد بس قیامت ہی ہے۔ اور قیامت تک مَیں ہی نبی رہنے والا ہوں۔

ساری انسانیت کے لیے بشیر و نذیر

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ (فاطر: ۲۴)

تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی اُمّت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبّہ کرنے والا نہ آیا ہو۔

پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی تمہارا کام لوگوں کو خبردار کر دینے سے زائد کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی ہوش میں نہیں آتا اور اپنی گمراہیوں ہی میں بھٹکتا رہتا ہے تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اندھوں کو دکھانے اور بہروں کو سنانے کی خدمت تمہارے سپرد نہیں کی گئی ہے۔

اور دوسری آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ارشاد ہوئی ہے یعنی یہ کہ دنیا میں کوئی اُمت ایسی نہیں گزری ہے جس کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی مبعوث نہ فرمائے ہوں۔ سورۂ رعد میں فرمایا۔ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (آیت ۷)۔ سورۂ حجر میں فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ (آیت ۱۰)۔ سورۂ نحل میں فرمایا: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (آیت ۳۶)۔ سورۂ شعراء میں فرمایا وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ (آیت ۲۰۸)۔ مگر اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینی چاہییں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اول یہ کہ ایک نبی کی تبلیغ جہاں جہاں تک پہنچ سکتی ہو وہاں کے لیے وہی نبی کافی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر بستی اور ہر ہر قوم میں الگ الگ ہی انبیاء بھیجے جائیں۔ دوم یہ کہ ایک نبی کی دعوت وہدایت کے آثار اور اس کی رہنمائی کے نقوشِ قدم جب تک دُنیا میں محفوظ رہیں اُس وقت تک کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر نسل اور ہر پُشت کے لیے الگ نبی بھیجا جاتے۔ ۸۵ھ

آپ نوعِ انسانی کے لیے خدا کی رحمت ہیں

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء۔ آیت ۱۰۷)

"اے محمدؐ، ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔"

دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔" دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت دراصل نوعِ انسانی کے لیے خدا کی رحمت اور مہربانی ہے کیونکہ آپؐ نے آکر غفلت میں پڑی ہوئی دُنیا کو چونکایا ہے، اور اسے وہ علم دیا ہے جو حق اور باطل کا فرق واضح کرتا ہے اور اس کو بالکل غیر مُشتبہ طریقہ سے بتا دیا ہے کہ اس کے لیے تباہی کی راہ کونسی ہے اور سلامتی کی راہ کونسی۔ کفارِ مکہ حضورؐ کی بعثت کو اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس شخص نے ہماری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے، ناخن سے گوشت جُدا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر فرمایا گیا کہ نادانو، تم جسے زحمت سمجھ رہے ہو، یہ درحقیقت تمہارے لیے خدا کی رحمت ہے۔ ۸۶ھ

آپ تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

اے محمدؐ کہو کہ "اے انسانو! میں تم سب کی طرف اُس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین و آسمانوں کی بادشاہی

وَ الْاَرْضِ ۔ (الاعراف ۔ ۱۵۸) کا مالک ہے ۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۔ ۴۷) ہر اُمّت کے لیے ایک رسُول ہے ۔

"اُمّت" کا لفظ یہاں محض قوم کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایک رسُول کی آمد کے بعد اس کی دعوت جن جن لوگوں تک پہنچے وہ سب اس کی اُمّت ہیں ۔ نیز اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ رسُول ان کے درمیان زندہ موجود ہو، بلکہ رسُول کے بعد بھی جب تک اس کی تعلیم موجُود رہے اور ہر شخص کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن ہو کہ وہ درحقیقت کس چیز کی تعلیم دیتا ہے، اس وقت تک دنیا کے سب لوگ اس کی اُمّت ہی قرار پائیں گے اور ان پر وہ حکم ثابت ہو گا جو آگے بیان کیا جا رہا ہے ۔ اس لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشریف آوری کے بعد تمام دُنیا کے انسان آپ کی اُمّت ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک قرآن اپنی خالص صورت میں شائع ہوتا رہے گا ۔ اسی وجہ سے آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ "ہر قوم میں ایک رسُول ہے ۔" بلکہ ارشاد یہ ہوا ہے کہ "ہر اُمت کے لیے ایک رسُول ہے ۔" [۴۷]

اللہ نے ہر بستی میں ایک ایک نبی بھیجنے کے بجائے ساری دنیا کے لیے آپ ہی کو نبی متقرر کیا ہے ۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۔ (الفرقان : ۵۱) اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک نذیر اُٹھا کھڑا کرتے ۔

یعنی ایسا کرنا ہماری قدرت سے باہر نہ تھا ۔ ہم چاہتے تو جگہ جگہ نبی پیدا کر سکتے تھے ۔ مگر ہم نے ایسا نہیں کیا اور دنیا بھر کے لیے ایک نبی مبعوث کر دیا ۔ جس طرح ایک سوُرج سارے جہان کے لیے کافی ہو رہا ہے اُسی طرح یہ اکیلا آفتابِ ہدایت ہی سب جہان والوں کے لیے کافی ہے ۔ [۴۸]

قرآن پاک میں حضوُر کو "خبردار کرنے والا"، "متنبہ کرنے والا"، "غفلت اور گمراہی کے بُرے نتائج سے ڈرانے والا" کے خطاب سے نوازا گیا ہے اور ساتھ ہی سارے جہاں والوں کے لیے نذیر کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی دعوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کسی ایک ملک کے لیے نہیں، پوری دُنیا کے لیے ہے اور اپنے ہی زمانے کے لیے نہیں، آنے والے تمام زمانوں کے لیے ہے ۔ یہ مضمون متعدد مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہوا ہے ۔ مثلاً يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۔ "اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسُول ہوں" (الاعراف، آیت ۱۵۸) ۔ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۔ "میری طرف یہ قرآن بھیجا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے مَیں تم کو خبردار کروں اور جس جس کو بھی یہ پہنچے" (الانعام ۱۹) ۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔ "ہم نے تم کو سارے ہی انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے" (سبا ۔ آیت ۲۸) ۔ اور اسی مضمون کو خوب کھول کھول کر نبی صلی اللہ

علیہ وسلّم نے احادیث میں بار بار بیان فرمایا ہے کہ بُعِثْتُ اِلَی الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ "میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں"۔ اور کَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِہٖ خَاصَّۃً وَّبُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ عَامَّۃً۔ "پہلے ایک نبی خاص طور پر اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ اور میں عام طور پر تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں" (بخاری و مسلم)۔ وَاُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَآفَّۃً وَّخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ۔ "میں ساری خلقت کی طرف بھیجا گیا ہوں اور ختم کر دیئے گئے میری آمد پر انبیاء"۔ ۸۹

آپؐ ہی خدا کے آخری نبی ہیں

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُھُمْ وَھُمْ فِیْ غَفْلَۃٍ مُّعْرِضُوْنَ۔ (الانبیاء۔ ۱)

قریب آگیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں مُنہ موڑے ہوتے ہیں۔

مُراد ہے قُربِ قیامت۔ یعنی اب وہ وقت دُور نہیں ہے جب لوگوں کو اپنا حساب پیش کرنے کے لیے اپنے رب کے آگے حاضر ہونا پڑے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت اِس بات کی علامت ہے کہ نوعِ انسانی کی تاریخ اب اپنے آخری دَور میں داخل ہو رہی ہے۔ اب وہ اپنے آغاز کی بہ نسبت اپنے انجام سے قریب تر ہے۔ آغاز اور وسط کے مرحلے گزر چکے ہیں اور آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ آپؐ نے اپنی دو اُنگلیاں کھڑی کرکے فرمایا: بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَۃُ کَھَاتَیْنِ "میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہُوں کہ میں اور قیامت اِن دو اُنگلیوں کی طرح ہیں"۔ یعنی میرے بعد اب بس قیامت ہی ہے، کسی اور نبی کی دعوت بیچ میں حائل نہیں ہے۔ سنبھلنا ہے تو میری دعوت پر سنبھل جاؤ۔ کوئی اور ہادی اور بشیر و نذیر آنے والا نہیں ہے۔ ۹۰

آپؐ پر نبوت کے ختم ہونے کے متعلق ایک اہم اشارہ

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا۔ (آل عمران۔ ۸۱)

یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسُول تمہارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنی ہو گی" یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا "کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو؟ اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمّہ داری اٹھاتے ہو؟" انہوں نے کہا "ہاں ہم اقرار کرتے ہیں"۔

مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے ——— اور جو عہد پیغمبر سے لیا گیا ہو وہ لامحالہ

اس کے پیروؤں پر بھی آپ سے آپ عائد ہو جاتا ہے ـــــ کہ جو نبی ہماری طرف سے اُس دین کی تبلیغ و اقامت کے لیے بھیجا جائے جس کی تبلیغ و اقامت پر تم مامور ہوئے ہو، اس کا تمہیں ساتھ دینا ہوگا۔ اُس کے ساتھ تعصّب نہ برتنا۔ اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا۔ حق کی مخالفت نہ کرنا۔ بلکہ جہاں جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے اٹھایا جائے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے۔ اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی اُمّت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے ایسا کوئی عہد لیا گیا ہو، یا آپؐ نے اپنی اُمّت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔[له][۹۱]

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (الاعراف: ۳۵)	اے بنی آدم، یاد رکھو، اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سُنا رہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویّہ کی اصلاح کر لیگا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

یہ بات قرآن مجید میں ہر جگہ اُس موقع پر ارشاد فرمائی گئی ہے جہاں آدم و حوا علیہما السّلام کے جنت سے اُتارے جانے کا ذکر آیا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ، آیات ۳۸-۳۹۔ طٰہٰ، آیات ۱۲۳-۱۲۴)، لہٰذا یہاں بھی اس کو اِسی موقع سے متعلق سمجھا جائے گا، یعنی نوعِ انسانی کی زندگی کا آغاز جب ہو رہا تھا اُسی وقت یہ بات صاف طور پر سمجھا دی گئی تھی۔[۹۲]

له نبوت کا معاملہ جیسا کچھ نازک ہے، ظاہر ہے۔ اس کو ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے ایمان و کفر اور اس کی نجات یا بربادی کا انحصار ہے۔ لیکن قرآن میں بجائے اس کے کہ حضورؐ کے بعد کسی نبی کے آنے کی خبر دی جاتی، اُلٹا یہ فرمایا گیا کہ آپؐ خاتم النبیین ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بجائے اس کے کہ اپنی اُمّت کو جمع کر کے بعد کے آنے والے کسی نبی پر ایمان لانے کی ہدایت کی ہوتی، بکثرت احادیث میں آپؐ نے تصریح فرمائی کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے اور آپؐ پر نبوت ختم ہو گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کو ہمارے دین و ایمان سے آخر کیا دشمنی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا، مگر اللہ اور رسول دونوں ایسی باتیں فرماتے جن کی وجہ سے ہم اس کو نہ مان کر کفر اور عذابِ آخرت میں مبتلا ہوتے؟ (مؤلف)

منکرینِ ختمِ نبوّت کے خلاف چند آیات سے استدلال

(۱) وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا۔ (الاحزاب آیت ۷)

اور (اے نبیؐ)، یاد رکھو اُس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے، تم سے بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسٰیؑ اور عیسٰیؑ بن مریم سے بھی۔ سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ بات یاد دلاتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السّلام کی طرح آپؐ سے بھی اللہ تعالیٰ ایک پختہ عہد لے چکا ہے جس کی آپ کو سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اِس عہد سے کونسا عہد مُراد ہے؟ اُوپر سے جو سلسلۂ کلام چلا آرہا ہے اُس پر غور کرنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مُراد یہ عہد ہے کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی خود اطاعت کرے گا اور دوسروں سے کرائے گا، اللہ کی باتوں کو بے کم و کاست پہنچائے گا اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی سعی و کوشش میں کوئی دریغ نہ کرے گا۔ قرآن مجید میں اس عہد کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

(۲) شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (الشورٰی: ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تمہارے لیے وہ دین جس کی ہدایت کی تھی اُس نے نوحؑ کو، اور جس کی وحی کی گئی، (اے محمدؐ) تمہاری طرف اور جس کی ہدایت کی گئی ابراہیمؑ اور موسٰیؑ اور عیسٰیؑ کو اس تاکید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ کرو۔

(۳) وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران ۔۱۸۷)

اور یاد کرو اس بات کو کہ اللہ نے عہد لیا تھا اُن لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لوگ اس کی تعلیم کو بیان کروگے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔

(۴) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ۔ (البقرہ ۔۸۳)

اور یاد کرو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کروگے۔

(۵) اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ ... خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (الاعراف: ۱۶۹-۱۷۱)

کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا؟ مضبوطی کے ساتھ تھامو اُس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے اور یاد رکھو اُس ہدایت کو جو اس میں ہے، توقع ہے کہ تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہوگے۔

(۶) وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ (المائدہ - ۷)

اور اے مسلمانو، یاد رکھو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے اور اس عہد کو جو اس نے تم سے لیا ہے جبکہ تم نے کہا، ہم نے سُنا اور اطاعت کی"

اس عہد کو اس سیاق و سباق میں اللہ تعالیٰ جس وجہ سے یاد دلا رہا ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم شماتتِ اعداء کے اندیشے سے مُنہ بولے رشتوں کے معاملہ میں جاہلیت کی رسم توڑتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ آپ کو بار بار یہ شرم لاحق ہو رہی تھی کہ معاملہ ایک خاتون سے شادی کرنے کا ہے۔ مَیں خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ محض اصلاحِ معاشرہ کی خاطر یہ کام کروں، مگر دشمن یہی کہیں گے کہ یہ کام دراصل نفس پرستی کی خاطر کیا گیا ہے اور مصلح کا لبادہ اس شخص نے محض فریب دینے کے لیے اوڑھ رکھا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ حضورؐ سے فرما رہا ہے کہ تم ہمارے مقرر کیے ہوئے پیغمبر ہو، تمام پیغمبروں کی طرح تم سے بھی ہمارا یہ پختہ معاہدہ ہے کہ جو کچھ بھی حکم ہم دیں گے اس کو خود بجا لاؤ گے اور دوسروں کو اس کی پیروی کا حکم دو گے، لہٰذا تم کسی کے طعن و تشنیع کی پروا نہ کرو، کسی سے شرم اور خوف نہ کرو، اور جو خدمت ہم تم سے لینا چاہتے ہیں اسے بلا تامل انجام دو۔

ایک گروہ اس میثاق سے وہ میثاق مُراد لیتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے کے تمام انبیاء اور ان کی اُمتوں سے اس بات کے لیے لیا گیا تھا کہ وہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے اس تاویل کی بنیاد پر اس گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد بھی نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حضورؐ سے بھی یہ میثاق لیا گیا ہے کہ آپ کے بعد جو نبی آئے آپ کی اُمت اس پر ایمان لائے گی۔ لیکن آیت کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ یہ تاویل بالکل غلط ہے۔ جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت آئی ہے اُس میں یہ کہنے کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے کہ آپؐ کے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور آپؐ کی اُمت کو ان پر ایمان لانا چاہیے۔ یہ مفہوم اس کا لیا جائے تو یہ آیت یہاں بالکل بے جوڑ اور بے محل ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں کوئی صراحت ایسی نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہاں میثاق سے کونسا میثاق مُراد ہے۔ لامحالہ اس کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے ہم کو قرآن مجید کے دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرنا ہوگا جہاں انبیاء سے لیے ہوئے مواثیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگر سارے قرآن میں صرف ایک ہی میثاق کا ذکر ہوتا اور وہ بعد کے آنے والے انبیاء پر ایمان لانے کے بارے میں ہوتا تو یہ خیال کرنا درست ہوتا کہ یہاں بھی میثاق سے مراد وہی میثاق ہے۔ لیکن قرآن پاک کو جس شخص نے بھی آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کتاب میں بہت سے میثاقوں کا ذکر ہے جو انبیاء علیہم السّلام اور ان کی امتوں سے لیے گئے ہیں۔ لہٰذا اُن مختلف مواثیق میں سے وہ میثاق یہاں مراد لینا صحیح ہوگا جو اس سیاق و سباق سے مناسبت رکھتا ہو، نہ کہ وہ میثاق جس کے ذکر کا یہاں کوئی موقع نہ ہو۔ اسی طرح کی غلط تاویلوں سے

یہ بات کھل جاتی ہے کہ بعض لوگ قرآن سے ہدایت لینے نہیں بیٹھتے بلکہ اُسے ہدایت دینے بیٹھ جاتے ہیں۔[۹۳]

(۷) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ۔

(یونس : ۱۷)

پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔"

بعض نادان لوگ "فلاح" کو طویل عمر، یا دنیوی خوشحالی، یا دنیوی فروغ کے معنی میں لے لیتے ہیں، اور پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص نبوّت کا دعویٰ کر کے جیتا رہے، یا دنیا میں پھلے پھولے، یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو، اسے نبی برحق مان لینا چاہیے کیونکہ اس نے فلاح پائی۔ اگر وہ نبی برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعویٰ کرتے ہی مار ڈالا جاتا، یا بھوکوں مار دیا جاتا اور دنیا میں اس کی بات چلنے ہی نہ پاتی۔ لیکن یہ احمقانہ استدلال صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاح "فلاح" کا مفہوم جانتا ہو، نہ اُس قانونِ امہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لیے مُقرّر فرمایا ہے، اور نہ یہی سمجھتا ہو کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ فقرہ کس معنی میں آیا ہے۔

اوّل تو یہ بات کہ "مجرم فلاح نہیں پا سکتے"، اس سیاق میں اس حیثیت سے فرمائی ہی نہیں گئی ہے کہ یہ کسی کے دعوائے نبوت کو پرکھنے کا معیار ہے جس سے عام لوگ جانچ کر خود فیصلہ کرلیں کہ جو مدعی نبوّت "فلاح" پا رہا ہو اس کے دعوے کو مانیں اور جو فلاح نہ پا رہا ہو اس کا انکار کر دیں۔ بلکہ یہاں تو یہ بات اس معنی میں کہی گئی ہے کہ "میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی، اس لیے میں خود تو یہ جُرم نہیں کر سکتا کہ نبوّت کا جُھوٹا دعویٰ کروں، البتہ تمہارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم سچّے نبی کو جھٹلانے کا جرم کر رہے ہو اس لیے تمہیں فلاح نصیب نہیں ہو گی۔"

پھر فلاح کا لفظ بھی قرآن میں دنیوی فلاح کے محدود معنی میں نہیں آیا ہے، بلکہ اس سے مُراد وہ پائیدار کامیابی ہے جو کسی خُسران پر منتج ہونے والی نہ ہو، قطع نظر اس سے کہ دنیوی زندگی کے اِس ابتدائی مرحلہ میں اس کے اندر کامیابی کا کوئی پہلو ہو یا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک داعیٔ ضلالت دنیا میں مزے سے جیے، خوب پھلے پھولے اور اس کی گمراہی کو بڑا فروغ نصیب ہو، مگر یہ قرآن کی اصطلاح میں فلاح نہیں، عین خُسران ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک داعیٔ حق دنیا میں سخت مصیبتوں سے دوچار ہو، شدّتِ آلام سے نڈھال ہو کر یا ظالموں کی دست درازیوں کا شکار ہو کر دُنیا سے جلدی رخصت ہو جائے، اور کوئی اسے مان کر نہ دے، مگر یہ قرآن کی زبان میں خُسران نہیں، عین فلاح ہے۔

علاوہ بریں قرآن میں جگہ جگہ یہ بات پوری تشریح کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کیا کرتا بلکہ انہیں سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے، اور اگر وہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور زیادہ بگڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے اور بسا اوقات ان کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی تمام شرارتوں کو پوری طرح ظہور میں لے آئیں اور اپنے عمل کی بنا پر اس سزا کے مستحق ہو جائیں جس کے وہ اپنی بُری صفات کی وجہ سے فی الحقیقت مستحق ہیں۔ پس اگر کسی جھوٹے مدعی کی رسی دراز ہو رہی ہو اور اس پر دنیوی "فلاح" کی برسات برس رہی ہو تو سخت غلطی ہو گی اگر اس کی اس حالت کو اس کے برسرِ ہدایت ہونے کی دلیل سمجھا جائے۔ خدا کا قانونِ امہال و استدراج جس طرح تمام مجرموں کے لیے عام ہے اسی طرح جھوٹے مدعیانِ نبوت کے لیے بھی ہے اور ان کے اس سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ پھر شیطان کو قیامت تک کے لیے جو مہلت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس میں بھی یہ استثنا کہیں مذکور نہیں ہے کہ تیرے اور تو سارے فریب چلنے دیتے جائیں گے لیکن اگر تو اپنی طرف سے کوئی نبی کھڑا کرے گا تو یہ فریب نہ چلنے دیا جائیگا۔

ممکن ہے کوئی شخص ہماری اس بات کے جواب میں وہ آیت پیش کرے جو سورۃ الحاقہ آیات ۴۴-۴۶ میں ارشاد ہوئی ہے کہ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ۔ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ۔ یعنی "اگر محمدؐ نے خود گھڑ کر کوئی بات ہمارے نام سے کہی ہوتی تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگِ دل کاٹ ڈالتے"۔ لیکن اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ جو شخص فی الواقع خدا کی طرف سے نبی مقرر کیا گیا ہو وہ اگر جھوٹی بات گھڑ کر وحی کی حیثیت سے پیش کرے تو فوراً پکڑا جائے۔ اس سے یہ استدلال کرنا کہ جو مدعیٔ نبوت پکڑا نہیں جا رہا ہے وہ ضرور سچا ہے، ایک منطقی مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خدا کے قانونِ امہال و استدراج میں جو استثناء اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے وہ صرف سچے نبی کے لیے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے وہ بھی اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سرکاری ملازموں کے لیے حکومت نے جو قانون بنایا ہو اس کا اطلاق صرف انہی لوگوں پر ہوگا جو واقعی سرکاری ملازم ہوں۔ رہے وہ لوگ جو جعلی طور پر اپنے آپ کو ایک سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے پیش کریں، تو ان پر ضابطۂ ملازمت کا نفاذ نہ ہوگا بلکہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو ضابطۂ فوجداری کے تحت عام بدمعاشوں اور مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں سورۃ الحاقہ کی اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ بھی اس غرض کے لیے نہیں فرمایا گیا کہ لوگوں کو نبی کے پرکھنے کا معیار بتایا جائے کہ اگر پردۂ غیب سے کوئی ہاتھ نمودار ہو کر اس کی رگِ دل اچانک کاٹ دے تو سمجھیں جھوٹا ہے ورنہ مان لیں کہ سچا ہے۔ نبی کے صادق یا کاذب ہونے کی جانچ اگر اس کی سیرت، اس کے کام اور اس چیز سے جو وہ پیش کر رہا ہو، ممکن نہ ہوتی تو ایسے غیر معقول معیار تجویز کرنے

کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔[92]

خاتم النبیین کے بعد دعواتے نبوت

سوال: "ترجمان القرآن" (جنوری، فروری) کے ص ۲۳۶ پر آپ نے لکھا ہے کہ "میرا تجربہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی جھوٹ کو فروغ نہیں دیتا۔ میرا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ ...... جن لوگوں کو میں صداقت و دیانت سے بے پروا اور خوف خدا سے خالی پاتا ہوں، ان کی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیتا...... خدا ہی ان سے بدلہ لے سکتا ہے۔ ...... اور ان کا پردہ انشاءاللہ دنیا ہی میں فاش ہوگا۔"

میں عرض کر دوں کہ میں نے جماعت احمدیہ کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کام سے دلچسپی لی ہے۔ میرے مندرجہ ذیل استفسارات اسی ضمن میں ہیں:

۱۔ یہ صرف آپ ہی کا تجربہ نہیں، بلکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "اللہ تعالیٰ کاذبوں سے محبت نہیں کرتا۔" اور "اللہ کی لعنت ہے جھوٹوں پر۔" اور پھر اس قسم کے جھوٹوں پر کہ "وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ......" ان کی سزا تو فوری گرفت اور وصال جہنم ہے (لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ۔ الحاقہ: ۸۶)۔ اس صورت میں اگر مرزا صاحب جھوٹے تھے تو کیا وجہ ہے کہ (ا) ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی گرفت نہیں کی؛ (ب) ان کی جماعت بڑھ رہی ہے اور مرزا صاحب کے مشن کو جو مسلمانوں کے نزدیک گمراہ کن ہے تقویت پہنچ رہی ہے اور اب تو اس جماعت کی جڑیں بیرونی ممالک میں مضبوط ہوگئی ہیں (ج) مرزا صاحب کے پیغام کو ساٹھ سال ہوگئے ہیں۔ ہم کب تک خدائی فیصلے کا انتظار کریں؟ فی الحال تو وہ ترقی کر رہے ہیں (د) جو جماعتیں یا افراد اس گروہ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ کیوں اسے ترک نہیں کر دیتے اور معاملہ خدا پر نہیں چھوڑ دیتے؟

۲۔ صفحہ ۲۴۲ پر آپ کی جماعت کے ایک جرمنی نژاد ہمدرد نے برلن میں جماعت احمدیہ کے ساتھ تبلیغ اسلام میں تعاون کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ بھی ان کی تبلیغ اسلام کو صحیح سمجھتے ہیں تو پاکستان میں ان کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے؟

جواب: آپ سرسری نظر سے ایک مدعی نبوت کے معاملے کو دیکھ رہے ہیں یہ طریقہ ایسے اہم معاملے پر رائے قائم کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ تو سراسر ایک جھوٹے الزام کے بارے میں تھا جو بعض خود غرض لوگوں نے میرے اوپر لگایا تھا۔ اس بات کو آپ چسپاں کر رہے ہیں ایک ایسے شخص کے معاملے پر جس نے فی الواقع نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ ایک مدعی نبوت کے معاملے میں لامحالہ دو صورتوں میں سے ایک صورت پیش آتی ہے: اگر وہ سچا ہے تو اس کو نہ ماننے والا کافر، اور اگر وہ جھوٹا ہے

تو اس کو ماننے والا کافر۔ ایک ایسے نازک معاملے کا فیصلہ آپ صرف اتنی سی بات پر کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی تک ان پر کوئی گرفت نہیں کی، اور ان کی جماعت بڑھ رہی ہے، اور یہ کہ "ہم کب تک خدائی فیصلہ کا انتظار کریں"۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے اور اس کی جماعت ترقی کرتی نظر آئے اور آپ کی تجویز کردہ مدتِ انتظار کے اندر اس پر خدا کی طرف سے گرفت نہ ہو تو بس یہ باتیں اس کو نبی مان لینے کے لیے کافی ہیں؟ کیا آپ کے ذہن میں نبوت کو جانچنے کے یہی معیار ہیں؟

آیت وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ سے جو استدلال آپ نے کیا ہے وہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم جو حقیقت میں اللہ کے نبی ہیں، اگر خدا کی وحی کے بغیر کوئی بات خود تصنیف کر کے خدا کے نام سے پیش کریں تو ان کی رگِ گلو کاٹ دی جائے گی۔ اس سے یہ معنی نکالنا صحیح نہیں ہے کہ جو شخص حقیقت میں نبی نہ ہو اور غلط طور پر اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کرے اس کی رگِ گلو بھی کاٹی جاتی ہے۔ نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سچے اور جھوٹے نبی کی پہچان کے لیے یہ بات ایک معیار کے طور پر پیش نہیں کی ہے کہ جس مدعیٔ نبوت کی رگِ گلو نہ کاٹی جائے وہ سچا نبی ہے اور جس کی رگ کاٹ دی جائے وہ جھوٹا مدعی۔ قرآن کی آیتوں میں تاویل کی یہ کھینچ تان، جو ظاہر ہے کہ آپ کی اپنی اُپج کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ مرزا صاحب کی جماعت سے ہی آپ نے سیکھی ہے، بجائے خود اس بات کی علامت ہے کہ یہ جماعت خوفِ خدا سے کس قدر خالی ہے۔

محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اُس کی بات کو اُن معیاروں پر نہیں جانچا جائے گا جو آپ نے پیش کیے ہیں بلکہ اسے پورے اطمینان کے ساتھ اس بنیاد پر رد کر دیا جائے گا کہ قرآن و احادیثِ صحیحہ اس معاملے میں قطعی ناطق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ میں ان دلائل سے بھی واقف ہوں جو مرزا صاحب اور ان کے متبعین نے بابِ نبوت کے کھلے ہونے پر قائم کیے ہیں۔ مگر آپ سے صاف عرض کرتا ہوں کہ ان دلائل سے اگر کوئی متاثر ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایک بے علم یا کم علم آدمی ہی ہو سکتا ہے، ایک صاحبِ علم آدمی کو تو ان کے دلائل دیکھ کر صرف ان کے جہل ہی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

ترجمان القرآن میں جرمنی کا جو مکتوب شائع ہوا ہے اس کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ہر بات ہمارے نزدیک سچی ہے۔ ہمارا مدعا تو یہ تھا کہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کو اپنے جرمن نو مسلم بھائیوں کی حالت سے آگاہ کیا جائے اور ان کی مدد پر اُکسایا جائے۔ وہ لوگ بیچارے نئے نئے مسلمان ہیں، ان کو کیا خبر کہ دنیائے اسلام میں کس کس قسم کے فتنے اٹھ رہے ہیں۔ ان کو تو اسلام کے نام سے جو چیز جہاں سے بھی ملے گی وہ اس سے اپنی تشنگی بجھانے کی کوشش کریں گے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ انہیں اسلام کے متعلق صحیح لٹریچر فراہم کر کے دیں۔

ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ بے چارے ناواقفیت میں کسی فتنے کا شکار نہ ہو جائیں۔

سوال :"آپ کا جواب ملا۔ افسوس کہ وہ میری تشفی کے لیے کافی نہیں ہے۔ مَیں نے آپ ہی کی دی ہوئی حقیقت "خدا تعالیٰ خود جھوٹے کو سزا دے گا" کی روشنی میں پوچھا تھا کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی جو سب مسلمانوں کے نزدیک کاذب ہیں ان پر کیوں خدا تعالیٰ کی گرفت نہیں ہوتی، اور یہ کہ خدا تعالیٰ کس طرح اپنے بندوں کو اتنے عرصے سے گمراہ ہوتے دیکھ رہا ہے۔

مَیں مرزا صاحب کی تصنیف کردہ تقریباً ۲۵ کتب تحقیقی نظر سے دیکھ چکا ہوں، اور اس کے بعد علمائے اسلام کی بعض کتب بھی ان کے ردّ میں دیکھی ہیں مجھے اعتراف ہے کہ مَیں نے آپ کی کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں پڑھی۔ ویسے علماء کی کتب کے متعلق میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ:

انہوں نے مرزا صاحب کی تحریروں میں تحریف کر کے غلط مطالب ان کی طرف منسوب کیے ہیں۔

جس موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اس پر انہیں عبور نہیں تھا۔ بعد میں میری خط و کتابت پر یہ لوگ عموماً خاموش رہے ہیں۔ مرزا صاحب کی کتب سے مَیں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کی ذات اور اقوال یعنی ظاہر و باطن آنحضور صلعم کے عشق سے پُر ہے، مَیں اس بنیاد کو لے کر مرزا صاحب کے دعوے کی طرف بڑھا تھا اور اب مجھ پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ:

۱۔ مرزا صاحب کے دعاوی قرآن اور اقوال نبوی کے خلاف نہیں۔

۲۔ مرزا صاحب کی نبوّت آنحضرتؐ کی شان گھٹانے کے لیے نہیں، بلکہ اگر موسوی فیضان سے قریہ قریہ نبی ہو سکتے ہیں تو مقامِ محمدیؐ کے مطابق گاؤں گاؤں ایسے لوگ ہونے چاہییں جو بتائیں کہ ہم نے شریعتِ محمدیہؐ پر عمل کر کے مکالمۂ الٰہیہ حاصل کیا ہے۔ خود مرزا صاحب نے فرمایا ہے کہ ؎

اِیں چشمۂ رواں کہ بخلقِ خدا دہم
یک قطرۂ زبحرِ کمالِ محمدؐ است

اب آپ نے پھر مجھے مرزا صاحب کے دعوے کو پرکھنے کی اجازت دی ہے، کیا آپ براہِ کرم قرآنِ کریم سے میری رہنمائی کے لیے مرزا صاحب کے کسی ایک دعوے کو جھوٹا ثابت کر دیں گے"؟

جواب : پچھلا خط آپ کی تشفی کے لیے کافی ہو جاتا، اگر آپ تشفی چاہتے۔ مَیں نے ترجمان القرآن میں جو کچھ لکھا تھا وہ تو ان لوگوں کے بارے میں تھا جو مجھ پر ایک جھوٹا بُہتان لگا رہے ہیں، اور اس میں اللہ تعالیٰ پر یہ اعتماد ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ ضرور جھوٹوں کو سزا دے گا۔ مگر آپ اسے ایک مدعیٔ نبوّت کے دعوے کو جانچنے کے لیے معیار ٹھیرا رہے ہیں اور معیار بھی اس شان کے ساتھ کہ اگر مدّعی کو سزا ملتی ہوتی نظر نہ آئے تو ضرور

سچّا ہے؟ کیا واقعی لوگوں کے صادق و کاذب اور راہ یاب و گمراہ ہونے کے لیے یہ کوئی صحیح معیار ہے کہ جسے دُنیا میں سزا مل جائے وہ جُھوٹا اور گمراہ، اور جسے سزا نہ ملے وہ سچّا اور ہدایت یافتہ؟

آپ عجیب بات فرما رہے ہیں کہ مرزا صاحب کے دعوے کو ۶۰ سال گزر چکے ہیں، آخر کب تک کوئی انتظار کرے۔ دعوائے نبوت کی صداقت کو پرکھنے کی یہ عجیب کسوٹی جو آپ نے تجویز فرمائی ہے ذرا اس کی توضیح تو فرمائیے کہ ایک جھوٹے مدعی کو آپ کے نزدیک کس قسم کی سزا ملنی چاہیے؟ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ غیب سے ایک ہاتھ بڑھے اور اس کی رگِ گلو کاٹ دے، تو مَیں عرض کروں گا کہ یہ سزا تو مُسیلمہ تک کو نہیں ملی جس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں نبوّت کا دعوٰی کیا تھا۔ اور اگر آپ کی مُراد یہ ہے کہ جو مدّعیٔ نبوّت انسانوں کے ہاتھ سے مارا جائے وہ جھوٹا ہے تو ان انبیاء کے متعلق آپ کیا فرمائیں گے جن کی نبوّت کی تصدیق خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا ہے کہ ان کی قوم نے انہیں قتل کر دیا؟ قرآن میں یہ آیات تو آپ کی نظر سے گزری ہی ہوں گی کہ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آل عمران: ۱۸۳) اور فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ (النساء: ۱۵۵)۔ ان آیات کی روشنی میں آپ کو ایک مرتبہ پھر اپنے اندازِ فکر پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ نبی کا دعوٰی اس طرح کے معیاروں پر نہیں جانچا جاتا۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ اس سے پہلے آئے ہوئے کلامِ الٰہی کی روشنی میں اُس کا مقام کیا ہے؟ وہ چیز کیا لایا ہے؟ اور اُس کی زندگی کیسی ہے؟ ان معیاروں پر کوئی شخص پُورا نہ اترتا ہو تو آپ سخت غلطی کریں گے اگر اس کے دعوے کو صرف اِس بنا پر مان لیں گے کہ آپ کی آنکھوں نے اسے اس دنیا میں سزا ملتے نہیں دیکھا۔

جو تین معیار مَیں نے اوپر بیان کیے ہیں ان میں سے مؤخّر الذکر دو معیار ایسی صورت میں سرے سے قابلِ لحاظ ہی نہیں رہتے جبکہ پہلے ہی معیار سے کسی مدّعیٔ نبوّت کا دعوٰی بخیریت نہ گزر سکے۔ جب قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے یہ ثابت ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد اب کوئی نیا نبی نہیں آسکتا تو یہ دیکھنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے کہ حضورؐ کے بعد دعوائے نبوّت کرنے والا کیا لایا ہے اور کیسا انسان ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب میرے نزدیک دوسرے اور تیسرے معیار کے لحاظ سے بھی مقامِ نبوّت سے اس قدر فروتر ہیں کہ بابِ نبوّت کُھلا بھی ہوتا تو کم از کم کوئی معقول آدمی تو ان پر نبوّت کا گمان نہیں کر سکتا تھا، لیکن مَیں اس بحث کو قرآن و حدیث کے ناطق فیصلے کے بعد غیر ضروری بھی سمجھتا ہوں اور خدا و رسول کے مقابلے میں گستاخی بھی۔

یہ سوال کہ قرآن و حدیث سے بابِ نبوّت کے قطعی طور پر بند ہونے کے دلائل کیا ہیں، اس کا متحمل نہیں ہے کہ ایک خط میں اس کا جواب دیا جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے فرصت دی تو انشاء اللہ اِس موضوع پر

ایک مفصّل مضمون لکھوں گا، ورنہ سورۂ احزاب کی تفسیر میں تو یہ بحث آ ہی گئی ہے۔[1]

ختمِ نبوّت کے خلاف قادیانیوں کی ایک اور دلیل

سوال: "تفہیم القرآن، سورۂ آلِ عمران ص ۲۶۸، آیت" وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ . . . الخ کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے حاشیہ نمبر ۶۹ یوں درج کیا ہے کہ "یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے، اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی اُمّت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نہ قرآن میں، نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم سے ایسا عہد لیا گیا ہو، یا آپؐ نے اپنی اُمّت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔"

اس عبارت کا مطالعہ کرنے کے بعد دل میں یہ بات آئی کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے تو نہیں فرمایا، لیکن خود قرآن مجید میں سورۂ احزاب میں ایک میثاق کا ذکر یوں آتا ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ . . . . . الخ یہاں لفظ "مِنْكَ" کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے خطاب ہے۔ میثاق وہی ہے کہ جس کا ذکر سورۂ آلِ عمران میں ہو چکا ہے۔ ہر دو سورتوں یعنی آلِ عمران اور الاحزاب کی مذکورۂ بالا آیات میں میثاق کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی میثاق جو دوسرے انبیاء سے لیا گیا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بھی لیا گیا ہے۔

دراصل یہ سوال احمدیوں کی ایک کتاب پڑھنے سے پیدا ہوا ہے جس میں ان دونوں سورتوں کی محولہ بالا آیات کی تفسیر ایک دوسرے کی مدد سے کی گئی ہے اور لفظ "مِنْكَ" پر بڑی بحث درج ہے۔"

جواب: آیت وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ . . . . (الاحزاب) سے قادیانی حضرات جو استدلال کرتے ہیں وہ اگر مبنی بر اخلاص ہے تو ان کی جہالت پر دلالت کرتا ہے اور اگر قصداً دھوکا دینے کی نیت سے ہے تو یہ ان کی ضلالت پر دال ہے۔ وہ ایک مضمون تو سورۂ آلِ عمران کی آیت وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ سے لیتے ہیں جس میں انبیاء اور اُن کی اُمّتوں سے کسی آنیوالے نبی کی پیروی کا عہد لیا گیا ہے، اور دوسرا مضمون سُورۂ احزاب کی مذکورۂ بالا آیت سے لیتے ہیں جس میں دوسرے انبیاء کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے بھی ایک عہد لیے جانے کا ذکر ہے۔ پھر دونوں کو جوڑ کر اس سے یہ تیسرا مضمون خود بنا ڈالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے بھی کسی آنے والے نبی پر ایمان لانے اور اس کی تائید و نصرت کرنے کا عہد لیا گیا تھا۔ حالانکہ جس آیت میں آنیوالے نبی پر ایمان لانے کے میثاق کا ذکر ہے اُس میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ عہد ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے بھی لیا ہے، اور جس آیت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے ایک عہد لیے جانے کا ذکر ہے اس میں کوئی تصریح اس امر کی نہیں ہے کہ یہ عہد کسی آنیوالے نبی کی پیروی

---

[1] تفصیل اسی باب میں "عقیدۂ ختمِ نبوّت پر جامع تحقیقی بحث" کے زیرِ عنوان آگے آ رہی ہے۔ (مُرتّبین)

کا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر ان دو مختلف مضمونوں کو جوڑ کر ایک تیسرا مضمون جو قرآن میں کہیں نہ تھا، کس دلیل سے پیدا کر لیا گیا؟ اس کے لیے اگر ہو سکتی تھیں تو تین ہی دلیلیں ہو سکتی تھیں: یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نزول کے بعد صحابہؓ کو جمع کر کے اعلان فرمایا ہوتا کہ "لوگو! اللہ نے مجھ سے یہ عہد لیا ہے کہ میرے بعد جو نبی آئے اس پر میں ایمان لاؤں اور اس کی تائید و نصرت کروں، لہٰذا میرے متبع ہونے کی حیثیت سے تم بھی اس کا عہد کرو" ——— مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث کے پورے ذخیرے میں اس مضمون کا کہیں نام و نشان تک نہیں، بلکہ اُلٹی بکثرت روایات ایسی موجود ہیں جن سے یہ مضمون نکلتا ہے کہ حضورؐ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا اور آپ کے بعد اب کوئی نبی پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسا اہم میثاق لیا گیا ہوتا اور آپؐ نے اسے یوں نظر انداز کر دیا ہوتا، اور اُلٹی ایسی باتیں فرمائی ہوتیں جن سے حجت پکڑ کر آپ کی اُمت کا سوادِ اعظم خدا کے کسی فرستادہ نبی پر ایمان لانے سے محروم رہ جاتا؟

دوسری دلیل اس مضمون کو پیدا کرنے کے لیے یہ ہو سکتی تھی کہ قرآن میں انبیاء اور ان کی اُمتوں سے بس ایک ہی میثاق لیے جانے کا ذکر ہوتا، یعنی یہ کہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لانا۔ اس کے سوا کسی اور میثاق کا پورے قرآن میں کہیں ذکر ہی نہ ہوتا۔ اس صورت میں یہ استدلال کیا جا سکتا تھا کہ سورۂ احزاب والی آیتِ میثاق میں بھی لامحالہ یہی میثاق مراد ہو گا۔ لیکن اس دلیل کے لیے بھی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ قرآن میں ایک نہیں بلکہ متعدد میثاقوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ رکوع ۱۰ میں بنی اسرائیل سے اللہ کی بندگی اور والدین سے حسنِ سلوک اور آپس کی خونریزی سے پرہیز وغیرہ کا میثاق لیا جاتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران رکوع ۱۹ میں تمام اہلِ کتاب سے اس بات کا میثاق لیا جاتا ہے کہ خدا کی جو کتاب تمہارے حوالے کی گئی ہے اس کی تعلیمات کو چھپاؤ گے نہیں بلکہ اس کی عام اشاعت کرو گے۔ سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں بنی اسرائیل سے عہد لیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی بات نہ کہیں گے، اور اللہ کی دی ہوئی کتاب کو مضبوط ہاتھوں سے تھامیں گے، اور اس کی تعلیمات کو یاد رکھیں گے۔ سورۂ مائدہ رکوع ۱ میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو ایک میثاق یاد دلایا جاتا ہے جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ "تم اللہ سے سمع و طاعت کا عہد کر چکے ہو۔" اب سوال یہ ہے کہ اگر سورۂ احزاب والی آیت میں میثاق کے مضمون کی تصریح کے بغیر مجرد میثاق کا ذکر آیا تھا، تو اس خلاء کو ان بہت سے میثاقوں میں سے کسی ایک سے بھرنے کے بجائے بالخصوص سورۂ آلِ عمران رکوع ۹ والے میثاق ہی سے کیوں بھرا جاتا ہے؟ اس ترجیح کے لیے خود ایک دلیل درکار ہے جو کہیں موجود نہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ دونوں جگہ چونکہ نبیوں سے میثاق لینے کا ذکر ہے اس لیے ایک آیت کی تشریح دوسری آیت سے کر لی گئی، تو میں عرض کروں گا کہ دوسرے جتنے میثاق بھی انبیاء کی اُمتوں سے لیے گئے ہیں وہ براہِ راست

کسی اُمّت سے نہیں لیے گئے بلکہ انبیاء کے واسطے ہی سے لیے گئے ہیں۔ اور آخر قرآن میں بصیرت رکھنے والا کون شخص اس بات سے ناواقف ہے کہ ہر نبی سے کتابُ اللہ کو مضبوط تھامنے اور اس کے احکام کی پیروی کرنے کا عہد لیا گیا ہے؟

تیسری دلیل یہ ہو سکتی تھی کہ سورۂ احزاب کا سیاق و سباق یہ بتا رہا ہوتا کہ یہاں میثاق سے مُراد آنے والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق ہی ہو سکتا ہے لیکن یہاں معاملہ بالکل ہی برعکس ہے۔ سیاق و سباق تو اُلٹا اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ سُورۂ احزاب شروع ہی اس فقرے سے ہوتی ہے کہ: "اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں سے نہ دبو، اور جو وحی تمہارا رب بھیجتا ہے اسی کے مطابق عمل کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔" اس کے بعد یہ حکم سنایا جاتا ہے کہ جاہلیّت کے زمانے سے متبنّٰی بنانے کا جو طریقہ چلا آ رہا ہے اُس کو اور اُس سے تعلق رکھنے والے تمام اوہام اور رسموں کو توڑ ڈالو۔ اس کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ غیر خُونی رشتوں میں صرف ایک ہی رشتہ ایسا ہے جو خونی رشتوں سے بھی بڑھ کر حرمت والا ہے، اور وہ ہے نبی اور مومنین کا رشتہ، جس کی بنا پر نبیؐ کی بیویاں ان کی ماؤں کی طرح ان پر حرام ہیں، ورنہ باقی تمام معاملات میں رحمی اور خونی رشتے ہی اللہ کی کتاب کی رُو سے حرمت اور استحقاقِ وراثت کے لیے اولیٰ اور انسب ہیں۔ یہ احکام بیان فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو وہ میثاق یاد دلاتا ہے جو اس نے تمام انبیاء سے ہمیشہ لیا ہے اور ان کی طرح آپؐ سے بھی لیا ہے۔ اب ہر معقول آدمی خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اِس سلسلۂ کلام میں آخر کس مناسبت سے ایک آنے والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق یاد دلایا جا سکتا تھا؟ یہاں تو اگر یاد دلایا جا سکتا تھا تو وہی میثاق یاد دلایا جا سکتا تھا جو خدا کی کتاب کو مضبوط تھامنے اور اس کے احکام کو یاد رکھنے اور ان پر عمل کرنے اور دنیا پر ان کا اظہار کرنے کے لیے تمام انبیاء سے لیا گیا ہے۔ پھر آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو صاف صاف حکم دیتا ہے کہ آپ خود اپنے متبنّٰی زیدؓ بن حارثہ کی مطلّقہ بیوی سے نکاح کر کے جاہلیّت کے اس وہم کو توڑ دیں جس کی بنا پر لوگ منہ بولے بیٹے کو بالکل صُلبی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ اور جب کفّار و منافقین اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو علی الترتیب تین جواب دیتا ہے:

(۱) اوّل تو محمدؐ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں کہ اس کی مطلّقہ بیوی اُن پر حرام ہوتی،

(۲) اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ وہ اُن کے لیے حلال تھی بھی تو اُس سے نکاح کرنا کیا ضرور تھا، تو یہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اللہ کے رسُول ہیں جن کا کام یہی ہے کہ جس چیز کو اللہ مٹانا چاہتا ہے، اُسے خود آگے بڑھ کر مٹائیں،

(۳) اور مزید برآں ان کو ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ محض رسُول ہی نہیں ہیں بلکہ خاتم النّبیّین ہیں، اگر وہ جاہلیّت کی ان رسموں کو مٹا کر نہ جائیں گے تو پھر کوئی ایسا نبی آنے والا بھی نہیں ہے جو انہیں مٹائے

اس مضمونِ لاحق کو اگر کوئی شخص مضمونِ سابق کے ساتھ ملا کر پڑھے تو وہ یقین کے ساتھ یہ کہہ دے گا کہ اس سیاق و سباق میں جو میثاقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو یاد دلایا گیا ہے اُس سے مُراد اور جو میثاق بھی ہو، بہرحال کسی آنے والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔

دیکھ لیجیے، آیت زیرِ بحث سے قادیانیوں کے بیان کردہ معنی لینے کے لیے یہی تین دلیلیں ہو سکتی تھیں، اور یہاں ان میں سے ہر دلیل اُن کے مُدعا کے لیے غیر مفید، بلکہ اُلٹی ان کے مُدعا کے خلاف ہے۔ اب اگر اُن کے پاس کوئی چوتھی دلیل ہو تو وہ ان سے دریافت کیجیے، اور ان تینوں دلیلوں کا جواب بھی ان سے لیجیے ورنہ یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں کہ اس آیت سے جو معنی انہوں نے لیے ہیں وہ یا تو جہالت کی بنا پر نکالے ہیں، یا پھر خدا سے بے خوف ہو کر خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کے لیے نکالے ہیں۔ بہرحال ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر مرزا صاحب نبی تھے تو آخر کیا معاملہ ہے کہ ابھی اُن کے "صحابہ" کا دَور بھی ختم نہیں ہوا ہے اور اُن کی ساری اُمّت اس وقت "تابعین اور تبع تابعین" پر مشتمل ہے۔ پھر بھی حال یہ ہے کہ کتاب اللہ سے ان کی اُمّت میں علی الاعلان ایسے غلط استدلال کیے جاتے ہیں اور پوری اُمّت میں ایک آواز بھی اس جہالت یا ناخدا ترسی کے خلاف بلند نہیں ہوتی۔ ۹۶ھ

آیت ختمِ نبوّت میں تین دلائل

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔ (الاحزاب: ۴۰)

(لوگو!) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیّین ہیں اور اللہ ہر چیز پر علم رکھنے والا ہے۔

ختمِ نبوّت کا جو ذکر اس سورہ (الاحزاب) میں آیا ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ عرب میں مُنہ بولے بیٹے کو بالکل حقیقی بیٹے کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ وہ حقیقی بیٹے کی طرح میراث پاتا تھا۔ مُنہ بولے باپ کی بیوی اور بیٹیوں سے اُسی طرح خلا ملا رکھتا تھا جس طرح ماں، بیٹے اور بھائی بہنوں میں ہُوا کرتا ہے۔ اور متبنّٰی بن جانے کے بعد وہ ساری حُرمتیں اس کے اور مُنہ بولے باپ کے درمیان قائم ہو جاتی تھیں جو نسبی رشتے کی بنا پر قائم ہُوا کرتی تھیں۔ اللہ اس رسم کو توڑنا چاہتا تھا۔ اُس نے پہلے حکم دیا کہ مُنہ سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے کوئی شخص حقیقی بیٹا نہیں ہو جاتا" (آیت ۴-۵)۔ لیکن دلوں میں صدیوں کے رواج کی وجہ سے حُرمت کا جو تخیّل بیٹھا ہُوا تھا وہ آسانی سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس رسم کو عملاً توڑ دیا جائے۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آگیا کہ حضرت زیدؓ نے (جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے مُنہ بولے بیٹے تھے) حضرت زینبؓ کو (جو اُن کے نکاح میں تھیں) طلاق دے دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے محسوس فرمایا کہ یہ موقع ہے اِس سخت قسم کی جاہلی رسم کو توڑنے کا۔ جب تک آپؐ خود

اپنے متبنّیٰ کی مطلّقہ بیوی سے نکاح نہ کریں گے، متبنّیٰ کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کا جاہلی تخیّل نہ مٹ سکے گا۔ لیکن آپؐ یہ بھی جانتے تھے کہ مدینہ کے منافقین اور اطرافِ مدینہ کے یہود اور مکّہ کے کفّار اس فعل پر ایک طوفانِ عظیم برپا کر دیں گے اور آپ کو بدنام کرنے اور اسلام کو رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے۔ اس لیے آپ عملی اقدام کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود ہچکچا رہے تھے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا اور آپؐ نے حضرت زینبؓ کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس پر جیسا کہ اندیشہ تھا، اعتراضات اور بہتان طرازی اور افترا پردازی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور خود مسلمان عوام کے دلوں میں بھی طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ انہی اعتراضات اور وسوسوں کو دُور کرنے کے لیے سُورۂ احزاب کے پانچویں رکوع کی آیات (۳۷-۴۰) نازل ہوئیں۔

ان آیات میں پہلے تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ یہ نکاح ہمارے حکم سے ہوا ہے اور اس لیے ہوا ہے کہ مومنوں کے لیے اپنے متبنّیٰ لڑکوں کی بیوہ اور مطلّقہ بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے۔ پھر فرماتا ہے کہ ایک نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کا حکم بجا لانے میں وہ کسی کے خوف سے ہچکچائے۔ اس کے بعد اس بحث کو اس بات پر ختم فرماتا ہے کہ:

"محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں"۔

اس موقع پر یہ فقرہ جو ارشاد فرمایا اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ معترضین کے جواب میں تین دلائل دینا چاہتا ہے۔ اس ایک فقرے میں ان تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جو مخالفین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح پر کر رہے تھے۔

ان کا اوّلین اعتراض یہ تھا کہ آپؐ نے اپنی بہو سے نکاح کیا ہے حالانکہ آپؐ کی اپنی شریعت میں بھی بیٹے کی منکوحہ باپ پر حرام ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ یہ نکاح بجائے خود قابلِ اعتراض نہیں ہے کیونکہ جس شخص کی مطلّقہ بیوی سے نکاح کیا گیا ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کا واقعی بیٹا نہ تھا اور آپ اس کے حقیقی باپ نہ تھے۔ اسی لیے فرمایا: "محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں"۔ یعنی جس شخص کی مطلّقہ سے نکاح کیا گیا ہے وہ بیٹا تھا کب کہ اُس کی مطلّقہ سے نکاح حرام ہوتا؟ تم لوگ تو خود جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کا سرے سے کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اچھا، اگر مُنہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہے، تب بھی اس کی چھوڑی ہوئی عورت سے نکاح کر لینا زیادہ سے زیادہ بس جائز ہی ہو سکتا تھا، آخر اس کا کرنا کیا ضرور تھا؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا "مگر وہ اللہ کے رسُول ہیں"۔ یعنی رسول ہونے کی حیثیت سے اُن پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس حلال چیز کو تمہاری رسموں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے اس کے بارے میں تمام تعصّبات کا خاتمہ کر دیں اور اس کی حِلّت کے معاملے میں کسی

شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

تیسرے یہ کہ یہ کام اس لیے اور بھی ضروری تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم محض نبی ہی نہیں بلکہ آخری نبی ہیں اس لیے مزید تاکید کے لیے فرمایا "اور وہ خاتم النبیّین ہیں"۔ یعنی ان کے بعد کوئی رسُول تو درکنار کوئی نبی تک آنے والا نہیں ہے کہ اگر قانون اور معاشرے کی کوئی اصلاح اُن کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جائے تو بعد کا آنے والا نبی یہ کسر پُوری کر دے۔ لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس رسمِ جاہلیّت کا خاتمہ وہ خود ہی کر کے جائیں، کیونکہ اب اگر آپ کے ہاتھوں میں یہ جاہلانہ رسم نہ ٹوٹی تو پھر قیامت تک نہ ٹوٹ سکے گی۔ آپؐ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے کہ جو کسر آپ سے چھوٹ جائے اُسے وہ آکر پُورا کر دے۔

اس کے بعد مزید زور دیتے ہوئے فرمایا کہ "اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے" یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھوں اس رسمِ جاہلیّت کو ختم کرا دینا کیوں ضروری تھا اور ایسا نہ کرنے میں کیا قباحت تھی۔ وہ جانتا ہے کہ اب اُس کی طرف سے کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے اُس نے اس رسم کا خاتمہ اب نہ کرا دیا تو پھر کوئی دوسری ہستی دنیا میں ایسی نہ ہو گی جس کے توڑنے سے یہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے۔ بعد کے مُصلحین اگر اسے توڑیں گے بھی تو ان میں کسی کا فعل بھی اپنے پیچھے ایسا دائمی اور عالمگیر اقتدار نہ رکھے گا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں لوگ اس کا اتباع کرنے لگیں، اور ان میں سے کسی کی شخصیّت بھی اپنے اندر اس تقدس کی حامل نہ ہو گی کہ کسی فعل کا محض اس کی سُنّت ہونا ہی لوگوں کے دلوں سے کراہت کے ہر تصوّر کا قلع قمع کر دے۔

افسوس ہے کہ موجودہ زمانے میں ایک گروہ نے اس آیت کی غلط تاویلات کر کے ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ کھول دیا ہے اس لیے ختمِ نبوّت کے مسئلے کی پُوری توضیح اور اس گروہ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی تردید کے لیے ہم پُوری وضاحت سے مسئلہ ختمِ نبوّت بیان کرتے ہیں۔ ۹۷

فصل ۲

عقیدۂ ختمِ نبوّت پر جامع تحقیقی بحث

ایک گروہ، جس نے اِس دور میں نئی نبوّت کا فتنۂ عظیم کھڑا کیا ہے، آیت مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کے لفظ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کے معنی "نبیوں کی مُہر" کرتا ہے، اور اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد جو انبیاء بھی آئیں گے وہ آپؐ کی مُہر لگنے سے نبی بنیں گے، یا بالفاظِ دیگر جب تک کسی کی نبوّت پر آپؐ کی مُہر نہ لگے وہ نبی نہ ہو سکے گا۔

لیکن جس سلسلۂ بیان میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کے اندر رکھ کر اسے دیکھا جائے تو اِس لفظ کا یہ مفہوم لینے کی قطعاً کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، بلکہ اگر یہی اس کے معنی ہوں تو یہاں یہ لفظ بے محل ہی نہیں مقصودِ کلام کے بھی خلاف ہو جاتا ہے۔ آخر اس بات کا کیا تُک ہے کہ اُوپر سے تو نکاحِ زینبؓ پر معترضین کے اعتراضات اور ان کے پیدا کیے ہوئے شکوک و شُبہات کا جواب دیا جا رہا ہو اور یکایک یہ بات کہہ ڈالی جائے کہ محمدؐ نبیوں کی مُہر ہیں، آئندہ جو نبی بھی بنے گا، ان کی مُہر لگ کر بنے گا۔ اِس سیاق و سباق میں یہ بات نہ صرف یہ کہ بالکل بے تُکی ہے، بلکہ اس سے وہ استدلال اُلٹا کمزور ہو جاتا ہے جو اُوپر سے معترضین کے جواب میں چلا آ رہا ہے۔ اس صورت میں تو معترضین کے لیے یہ کہنے کا اچھا موقع تھا کہ آپ یہ کام اِس وقت نہ کرتے تو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اِس رسم کو مٹانے کی ایسی ہی کچھ شدید ضرورت ہے تو آپؐ کے بعد آپؐ کی مُہر لگ کر جو انبیاء آتے رہیں گے اُن میں سے کوئی اسے مٹا دے گا۔

ایک دوسری تاویل اِس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ "خاتم النبیّین" کے معنی افضل النبیّین کے ہیں، یعنی نبوّت کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، البتہ کمالاتِ نبوّت حضورؐ پر ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ مفہوم لینے میں بھی وہی قباحت ہے جو اوپر ہم نے بیان کی ہے۔ سیاق و سباق سے یہ مفہوم بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا، بلکہ اُلٹا اس کے خلاف پڑتا ہے۔ کفّار و منافقین کہہ سکتے تھے کہ حضرت، کم تر درجے کے ہی سہی، بہر حال آپ کے بعد بھی نبی آتے رہیں گے۔ پھر کیا ضرور تھا کہ اس رسم کو بھی آپ ہی مٹا کر تشریف لے جاتے؟

خاتم النبیّین کے لغوی معنی

پس جہاں تک سیاق و سباق کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النبیّین کے معنی سلسلۂ نبوّت کو ختم کر دینے والے ہی کے لیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے لیکن یہ صرف سیاق ہی کا تقاضا نہیں ہے، لُغت بھی اسی معنی کی مقتضی ہے۔ عربی لُغت اور محاورے کی رُو سے "ختم" کے معنی مُہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے، اور کسی کام کو پُورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔

خَتَمَ الْعَمَلَ کے معنی ہیں فَرَغَ مِنَ الْعَمَلِ "کام سے فارغ ہو گیا۔"

خَتَمَ الْاِنَاءَ کے معنی ہیں "برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر مُہر لگا دی تاکہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو۔"

خَتَمَ الْکِتَابَ کے معنی ہیں "خط بند کر کے اس پر مُہر لگا دی تاکہ خط محفوظ ہو جائے۔"

خَتَمَ عَلَی الْقَلْبِ "دل پر مُہر لگا دی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے، نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے۔"

خِتَامُ کُلِّ مَشْرُوْبٍ "وہ مزا جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے۔"

خَاتِمَۃُ کُلِّ شَیْءٍ، عاقبتہ و اخرتہ "ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت۔"

خَتَمَ الشَّیْءَ، بلغ اٰخرہ "کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا۔" اسی معنی میں ختمِ قرآن بولتے ہیں اور اسی معنی میں سُورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔

خَاتَمُ الْقَوْمِ، اٰخرھم "خاتم القوم سے مُراد ہے قبیلے کا آخری آدمی۔" (ملاحظہ ہو لسان العرب، قاموس اور اقرب الموارد[1])

---

[1] یہاں ہم نے لغت کی صرف تین کتابوں کا حوالہ دیا ہے لیکن بات انہی تین کتابوں پر منحصر نہیں ہے۔ عربی زبان کی کوئی معتبر لغت اُٹھا کر دیکھ لی جائے، اس میں لفظ خاتم کی یہی تشریح ملے گی۔ لیکن منکرینِ ختمِ نبوّت خدا کے دین میں نقب لگانے کے لیے لغت کو چھوڑ کر اس بات کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی شخص کو خاتم الشعراء، یا خاتم الفقہاء یا خاتم المفسّرین کہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس شخص کو یہ لقب دیا گیا ہے اس کے بعد کوئی شاعر یا فقیہ یا مفسّر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فن کے کمالات اُس شخص پر ختم ہو گئے۔ حالانکہ مبالغے کے طور پر اس طرح کے القاب کا استعمال یہ معنی ہرگز نہیں رکھتا کہ لغت کے اعتبار سے خاتم کے اصل معنی ہی کامل یا افضل کے ہو جائیں اور آخری کے معنی میں یہ لفظ استعمال کرنا سرے سے غلط قرار پائے۔ یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو زبان کے قواعد سے ناواقف ہو۔ کسی زبان میں بھی یہ قاعدہ نہیں ہے کہ اگر کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی کے بجائے

اسی بنا پر تمام اہلِ لُغت اور اہلِ تفسیر نے بالاتفاق خاتم النبیّین کے معنی آخر النبیّین کے لیے ہیں۔ عربی لغت و محاورے کی رُو سے خاتم کے معنی ڈاک خانے کی مُہر کے نہیں ہیں جسے لگا لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مُہر ہے جو لفافے پر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے نہ باہر کی کوئی چیز اندر جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات

قرآن کے سیاق و سباق اور لغت کے لحاظ سے اس لفظ کا جو مفہوم ہے اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشریحات کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند صحیح ترین احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلّم کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی، وانہ لانبی بعدی وسیکون خلفاء (بخاری، کتاب المناقب باب ما ذکر عن بنی اسرائیل)	نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفاء ہوں گے۔
(۲) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلّم	نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے

کبھی کبھی مجازاً کسی دوسرے معنی میں بولا جاتا ہو تو وہی معنی اس کے اصل معنی بن جائیں اور لُغت کی رُو سے جو اُس کے حقیقی معنی ہیں اُن میں اس کا استعمال ممنوع ہو جائے۔ آپ کسی عرب کے سامنے جب کہیں گے کہ جَاءَ خَاتَمُ الْقَوْمِ، تو وہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لے گا کہ قبیلے کا فاضل و کامل آدمی آگیا، بلکہ اس کا مطلب وہ یہی لے گا کہ پُورا کا پُورا قبیلہ آگیا ہے حتیٰ کہ آخری آدمی جو رہ گیا تھا وہ بھی آگیا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ خاتم الشعراء، خاتم الفقہاء اور خاتم المحدثین وغیرہ القاب جو بعض لوگوں کو دیے گئے ہیں ان کے دینے والے انسان تھے اور انسان کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ جس شخص کو وہ کسی صفت کے اعتبار سے خاتم کہہ رہا ہے اس کے بعد پھر کوئی اس صفت کا حامل پیدا نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے انسانی کلام میں ان القاب کی حیثیت مبالغے اور اعترافِ کمال سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کے متعلق یہ کہہ دے کہ فلاں صفت اُس پر ختم ہو گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے بھی انسانی کلام کی طرح مجازی کلام سمجھ لیں۔ اللہ نے اگر کسی کو خاتم الشعراء کہہ دیا ہوتا تو یقیناً اس کے بعد کوئی شاعر نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس نے جسے خاتم النبیین کہہ دیا، غیر ممکن ہے کہ اس کے بعد کوئی نبی ہو سکے۔ اس لیے کہ اللہ عالم الغیب ہے اور انسان عالم الغیب نہیں ہیں۔ اللہ کا کسی کو خاتم النبیین کہنا اور انسانوں کا کسی کو خاتم الشعراء اور خاتم الفقہاء وغیرہ کہہ دینا آخر ایک درجہ میں کیسے ہو سکتا ہے۔

ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنیٰ بیتاً فاحسنه و اجمله الّا موضع لبنة من زاویة فجعل الناس یطوفون به و یعجبون له و یقولون ھلّا وُضِعَتْ ھٰذہ اللبنة، فانا اللبنة وانا خاتم النبیّین (بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین)

گزرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہارِ حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے، اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پُر کرنے کے لیے کوئی نبی آئے۔)

اسی مضمون کی چار حدیثیں مُسلم، کتاب الفضائل، باب خاتم النبیین میں ہیں اور آخری حدیث میں یہ الفاظ زائد ہیں: فَجِئْتُ فختمت الانبیاء "پس میں آیا اور میں نے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا"

یہی حدیث انہی الفاظ میں ترمذی، کتاب المناقب، باب فضل النبی، اور کتاب الآداب، باب الامثال میں ہے۔

مُسند ابوداؤد طیالسی میں یہ حدیث جابرؓ بن عبداللہ کی روایت کردہ احادیث کے سلسلے میں آئی ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: خُتِمَ بی الانبیاء "میرے ذریعہ سے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا"۔

مُسند احمد میں تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ اس مضمون کی احادیث حضرت اُبَیّ بن کعبؓ، حضرت ابوسعید خُدریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی گئی ہیں۔

(۳) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قال فُضِّلْتُ علی الانبیاء بستٍ، اعطیت جوامع الکلم، ونصرت بالرعب واُحِلّت لی الغنائم، وجُعِلَت لی الارضُ مَسجداً وطھوراً، واُرْسِلتُ الی الخلق کافة، وخُتِمَ بی النبیّون۔ (مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: مجھے چھ باتوں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے (۱) مجھے جامع و مختصر بات کہنے کی صلاحیت دی گئی (۲) مجھے رُعب کے ذریعہ سے نُصرت بخشی گئی (۳) میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کیے گئے (۴) میرے لیے زمین کو مسجد بھی بنا دیا گیا اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی (یعنی میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں میں ہی نہیں بلکہ رُوئے زمین پر ہر جگہ پڑھی جا سکتی ہے اور پانی نہ ملے تو میری شریعت میں تیمم کر کے وضو کی حاجت بھی پوری کی جا سکتی ہے اور غسل کی حاجت بھی)۔ (۵) مجھے تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا (۶) اور میرے اوپر انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

(۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: رسالت اور

ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول ولا نبی (ترمذی، کتاب الرؤیا، باب ذہاب النبوۃ۔ مُسند احمد، مرویات انس بن مالکؓ)

نبوّت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔

(۵) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا محمدؐ وانا احمد وانا الماحی الذی یُمحٰی بی الکفر، وانا الحاشر الذی یحشر الناس علٰی عقبی وانا العاقب الذی لیس بعدہٗ نبی۔ (بخاری و مسلم، کتاب الفضائل، باب اسماء النبی۔ ترمذی کتاب الآداب، باب اسماء النبی۔ مؤطا، کتاب اسماء النبی۔ المستدرک للحاکم، کتاب التاریخ، باب اسماء النبی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَیں محمدؐ ہوں۔ مَیں احمدؐ ہوں۔ مَیں ماحی ہوں کہ میرے ذریعہ سے کفر محو کیا جائے گا۔ مَیں حاشر ہوں کہ میرے بعد لوگ حشر میں جمع کیے جائیں گے (یعنی میرے بعد اب بس قیامت ہی آنی ہے)۔ اور مَیں عاقب ہوں، اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔

(۶) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لم یبعث نبیًّا الا حذر امتہ الدجال وانا اٰخر الانبیاء و انتم اٰخر الامم وھو خارج فیکم لا محالۃ (ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الدجال)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے اپنی اُمّت کو دجّال کے خروج سے نہ ڈرایا ہو (مگر اُن کے زمانے میں وہ نہ آیا)۔ اب میں آخری نبی ہوں اور تم آخری اُمّت ہو۔ لامحالہ اب اُس کو تمہارے اندر ہی نکلنا ہے

(۷) عن عبد الرحمٰن بن جُبَیْر قال سمعت عبدَ اللہ بنَ عمرو بنِ العاص یقول خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومًا کالمودّع فقال انا محمد النبی الاُمّی ثلاثًا ولا نبی بعدی۔ (مُسند احمد، مرویاتِ عبد اللہ بن عمرو بن العاص)

عبد الرحمٰن بن جُبیر کہتے ہیں کہ مَیں نے عبد اللہ بن عمرو بن عاص کو یہ کہتے سُنا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر ہمارے درمیان تشریف لائے اس انداز سے کہ گویا آپؐ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا: "مَیں محمد نبی اُمّی ہوں"۔ پھر فرمایا: "اور میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔

(۸) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نبوۃ بعدی الا المبشرات۔ قیل وما المبشرات یا رسول اللہ؟ قال الرؤیا الحسنۃ۔ او قال الرؤیا الصالحۃ۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے بعد کوئی نبوّت نہیں ہے، صرف بشارت دینے والی باتیں ہیں"۔ عرض کیا گیا وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں یا رسُول اللہ؟ فرمایا اچھا خواب یا فرمایا

(مسند احمد، مرویات ابوالطفیل۔ نسائی۔ ابوداؤد) صالح خواب۔ (یعنی وحی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اشارہ ملے گا بھی تو بس اچھے خواب کے ذریعہ سے مل جائے گا)۔

(۹) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلّم لو کان بعدی نبیّ لکان عمر بن الخطاب (ترمذی، کتاب المناقب)

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب ہوتے۔"

(۱۰) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم لِعَلِیٍّ انت منّی بمنزلۃ ھارون من مُوسیٰ الا انہ لا نبی بعدی (بخاری و مسلم، کتاب فضائل الصحابہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت علیؓ سے فرمایا "میرے ساتھ تمہاری نسبت وہی ہے جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔"

بخاری و مسلم نے یہ حدیث غزوۂ تبوک کے ذکر میں بھی نقل کی ہے مُسند احمد میں اس مضمون کی دو حدیثیں حضرت سعد بن ابی وقّاص سے روایت کی گئی ہیں جن میں سے ایک کا آخری فقرہ یوں ہے: الا انہ لا نبوۃ بعدی، "مگر میرے بعد کوئی نبوّت نہیں ہے۔" ابوداؤد طیالسی، امام احمد اور محمد بن اسحاق نے اس سلسلے میں جو تفصیلی روایات نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے جاتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت علیؓ کو مدینہ طیّبہ کی حفاظت و نگرانی کے لیے اپنے پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ منافقین نے اس پر طرح طرح کی باتیں ان کے بارے میں کہنی شروع کر دیں۔ انہوں نے جا کر حضورؐ سے عرض کیا: "یا رسُولَ اللہ، کیا آپ مجھے عورتوں اور بچّوں میں چھوڑے جا رہے ہیں"؟ اس موقع پر حضورؐ نے ان کو تسلّی دیتے ہوئے فرمایا کہ "تم میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہو جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ رکھتے تھے۔" یعنی جس طرح حضرت مُوسیٰؑ نے کوہِ طُور پر جاتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑا تھا اسی طرح مَیں تم کو مدینے کی حفاظت کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ کو اندیشہ ہُوا کہ حضرت ہارونؑ کے ساتھ یہ تشبیہ کہیں بعد میں کسی فتنے کی موجب نہ بن جائے، اس لیے فوراً آپؐ نے یہ تصریح فرما دی کہ میرے بعد کوئی شخص نبی ہونے والا نہیں ہے۔

(۱۱) عن ثوبان قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔۔ وانہ سیکون فی اُمّتی کذّابون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبیٌّ وانا خاتم النبیّین لا نبی بعدی۔ (ابوداؤد، کتاب الفتن)

ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔۔۔۔ اور یہ کہ میری اُمّت میں تیس کذّاب ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا، حالانکہ مَیں خاتم النبیّین ہُوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ابوداؤد نے کتاب الملاحم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ ترمذی نے بھی حضرت ثوبان اور حضرت ابوہریرہؓ سے یہ دونوں روایتیں نقل کی ہیں اور دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: حتی یبعث دجالون کذابون قریب من ثلاثین کلھم یزعم انه رسول اللہ۔ "یہاں تک کہ اٹھیں گے تیس کے قریب جھوٹے فریبی جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔"

(۱۲) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لقد کان فیمن کان قبلکم من بنی اسرائیل رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن من امتی احد فعمر (بخاری کتاب المناقب)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے جو بنی اسرائیل گزرے ہیں ان میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جن سے کلام کیا جاتا تھا بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں۔ میری امت میں اگر کوئی ہوا تو وہ عمرؓ ہوگا۔

مُسلم میں اس مضمون کی جو حدیث ہے اس میں یکلمون کے بجائے مُحدَّثون کا لفظ ہے۔ لیکن مکلَّم اور محدَّث، دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی ایسا شخص جو مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہو، یا جس کے ساتھ پردۂ غیب سے بات کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کے بغیر مخاطبۂ الٰہی سے سرفراز ہونے والے بھی اس اُمت میں اگر کوئی ہوتے تو وہ حضرت عمرؓ ہوتے۔

(۱۳) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نبی بعدی ولا امة بعد اُمتی۔ (بیہقی، کتاب الرؤیا طبرانی)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری اُمت کے بعد کوئی اُمت (یعنی کسی نئے آنے والے نبی کی اُمت) نہیں۔
(۱۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانی آخر الانبیاء وانّ مسجدی آخر المساجد (مسلم، کتاب الحج، باب فضل الصلوٰۃ بمسجد مکة والمدینة)۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد (یعنی مسجدِ نبوی) ہے۔[1]

---

[1] منکرینِ ختمِ نبوت اس حدیث سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جس طرح حضورؐ نے اپنی مسجد کو آخر المساجد فرمایا، حالانکہ وہ آخری مسجد نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی بے شمار مسجدیں دنیا میں بنی ہیں، اسی طرح جب آپؐ نے فرمایا کہ میں آخر الانبیاء ہوں تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ آپؐ کے بعد نبی آتے رہیں گے، البتہ فضیلت کے اعتبار سے آپؐ آخری نبی ہیں اور آپؐ کی مسجد آخری مسجد ہے لیکن درحقیقت اسی طرح کی تاویلیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ لوگ خدا اور رسُول کے کلام کو سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ صحیح مسلم کے جس مقام پر یہ حدیث وارد ہوئی ہے اس کے سلسلے کی تمام احادیث کو ایک نظر ہی دیکھ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ حضورؐ نے اپنی مسجد کو آخری مسجد کس معنی میں فرمایا ہے۔ اس مقام پر حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور اُم المومنین حضرت میمونہؓ کے حوالہ سے جو روایات امام مسلم نے نقل کی ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں صرف تین مساجد ایسی ہیں جن کو عام مساجد پر فضیلت حاصل ہے، جن میں نماز پڑھنا دوسری مساجد میں نماز پڑھنے سے ہزار گنا زیادہ ثواب رکھتا ہے، اور اسی بنا پر صرف انہی تین مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کر کے جانا جائز ہے، باقی کسی مسجد کا یہ حق نہیں ہے کہ آدمی دوسری مسجدوں کو چھوڑ کر خاص طور پر اس میں نماز

یہ احادیث بکثرت صحابہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بکثرت محدثین نے ان کو بہت سی قوی سندوں سے نقل کیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر، مختلف طریقوں سے، مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپؐ آخری نبی ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، نبوّت کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے، اور آپؐ کے بعد جو لوگ بھی رسُول یا نبی ہونے کا دعویٰ کریں وہ دجّال و کذّاب ہیں۔ قرآن کے الفاظ "خاتم النبیین" کی اس سے زیادہ مستند و معتبر اور قطعی الثبوت تشریح اور کیا ہو سکتی ہے۔ رسولِ پاکؐ کا ارشاد تو بجائے خود سند و حجّت ہے۔ مگر جب وہ قرآن کی ایک نص کی شرح کر رہا ہو تب تو وہ اور بھی زیادہ قوی حجّت بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن کو سمجھنے والا اور اس کی تفسیر کا حق دار اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ ختمِ نبوّت کا کوئی دوسرا مفہوم بیان کرے اور ہم اُسے قبول کرنا کیا معنی قابلِ التفات بھی سمجھیں؟

صحابۂ کرام کا اجماع

قرآن و سُنّت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابۂ کرام کے اجماع کی ہے۔ یہ بات تمام معتبر تاریخی

نماز پڑھنے کے لیے سفر کرے۔ ان میں سے پہلی مسجد، مسجد الحرام ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ دوسری مسجد، مسجد اقصیٰ ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ اور تیسری مسجد، مدینۂ طیّبہ کی مسجد نبوی ہے جس کی بنا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی۔ حضورؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اب چونکہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اس لیے میری اس مسجد کے بعد دنیا میں کوئی چوتھی مسجد ایسی بننے والی نہیں ہے جس میں نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مسجدوں سے زیادہ ہو اور جس کی طرف نماز کی غرض سے سفر کر کے جانا درست ہو۔

ؔ منکرینِ ختمِ نبوّت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِن ارشادات کے مقابلہ میں اگر کوئی چیز پیش کرتے ہیں تو وہ یہ روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا قولوا انہ خاتم الانبیاء ولا تقولوا لانبی بعدہٗ "یہ تو کہو کہ حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں مگر یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں"۔ لیکن اوّل تو حضورؐ کے صاف صاف ارشادات کے مقابلہ میں حضرت عائشہؓ کے کسی قول کو پیش کرنا ہی سخت گستاخی و بے ادبی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ حضرت عائشہؓ کی طرف جس روایت میں یہ قول منسوب کیا گیا ہے وہ بجائے خود غیر مستند ہے۔ اسے حدیث کی کسی معتبر کتاب میں کسی قابلِ ذکر محدّث نے نقل نہیں کیا ہے۔ تفسیر کی ایک کتاب دُرِ منثور اور لغتِ حدیث کی ایک کتاب تکملۂ مجمع البحار سے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔ مگر اس کی سند کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ ایسی ایک ضعیف ترین روایت اور وہ بھی ایک صحابیہ کے قول کو لا کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن ارشادات کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا ہے جنہیں تمام اکابر محدثین نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوّت کا دعویٰ کیا، اور جن لوگوں نے ان کی نبوّت تسلیم کی، اُن سب کے خلاف صحابہ کرام نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔

اِس سلسلے میں خصوصیّت کے ساتھ مُسیلمۂ کذّاب کا معاملہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کا مُنکر نہ تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اُسے حضورؐ کے ساتھ شریکِ نبوّت بنایا گیا ہے۔ اُس نے حضورؐ کی وفات سے پہلے جو عریضہ آپؐ کو لکھا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

من مُسیلمۃ رسول اللہ الیٰ محمدٍ	مُسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف۔
رسُول اللہ سلام علیك فانی اُشرکتُ فی	آپ پر سلام ہو۔ آپ کو معلوم ہو کہ مَیں آپؐ کے ساتھ
الامر معك (طبری، جلد دوم، ص ۳۹۹، طبع مصر)	نبوّت کے کام میں شریک کیا گیا ہوں۔

علاوہ بریں مؤرخ طبری نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ مُسیلمہ کے ہاں جو اذان دی جاتی تھی اس میں اشھد ان محمّدًا رسول اللہ کے الفاظ بھی کہے جاتے تھے۔ اِس صریح اقرارِ رسالتِ محمّدی کے باوجود اسے کافر اور خارج از ملّت قرار دیا گیا اور اس سے جنگ کی گئی۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ بنو حَنیفہ نیک نیتی کے ساتھ (In Good Faith) اُس پر ایمان لاتے تھے اور انہیں واقعی اس غلط فہمی میں ڈالا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو خود شریکِ رسالت کیا ہے۔ نیز قرآن کی آیات، کو اُن کے سامنے مُسیلمہ پر نازل شدہ آیات کی حیثیت سے ایک ایسے شخص نے پیش کیا تھا جو مدینۂ طیبہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کرکے گیا تھا (البدایہ والنہایہ لابن کثیر، جلد ۵، ص ۵۱)۔ مگر اس کے باوجود صحابہ کرام نے ان کو مسلمان تسلیم نہیں کیا اور ان پر فوج کشی کی۔ پھر یہ کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ صحابہؓ نے ان کے خلاف ارتداد کی بنا پر نہیں بلکہ بغاوت کے جُرم میں جنگ کی تھی۔ اسلامی قانون کی رُو سے باغی مسلمانوں کے خلاف اگر جنگ کی نوبت آئے تو ان کے اسیرانِ جنگ غلام نہیں بنائے جاسکتے۔ بلکہ مسلمان تو درکنار ذمّی بھی اگر باغی ہوں تو گرفتار ہونے کے بعد ان کو غلام بنانا جائز نہیں ہے لیکن مُسیلمہ اور اس کے پیروؤں پر جب چڑھائی کی گئی تو حضرت ابو بکرؓ نے اعلان فرمایا کہ اُن کی عورتوں اور بچّوں کو غلام بنایا جائے گا۔ اور جب وہ لوگ اسیر ہوئے تو فی الواقع ان کو غلام بنایا گیا، چنانچہ انہی میں سے ایک لونڈی حضرت علیؓ کے حصے میں آئی جس کے بطن سے تاریخِ اسلام کی مشہور شخصیّت محمد بن حَنَفیہ[1] نے جنم لیا (البدایہ والنّہایہ، جلد ۶، ص ۳۱۶، ۳۲۵)۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ صحابہؓ نے جس جُرم کی بنا پر ان سے جنگ کی تھی وہ بغاوت کا جُرم نہ تھا بلکہ یہ جُرم تھا کہ ایک شخص نے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد نبوّت کا دعویٰ کیا اور دوسرے لوگ اس کی نبوّت پر ایمان لائے۔ یہ کارروائی

---

[1] حنفیہ سے مراد ہے قبیلۂ بنو حنیفہ کی عورت۔

حضورؐ کی وفات کے فوراً بعد ہوئی ہے، ابوبکرؓ کی قیادت میں ہوئی ہے، اور صحابہؓ کی پوری جماعت کے اتفاق سے ہوئی ہے۔ اجماعِ صحابہؓ کی اس سے زیادہ صریح مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

عُلمائے اُمّت کا اِجماع

اِجماعِ صحابہؓ کے بعد چوتھے نمبر پر مسائلِ دین میں جس چیز کو حجّت کی حیثیت حاصل ہے وہ دَورِ صحابہؓ کے بعد کے علمائے اُمّت کا اجماع ہے۔ اِس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے، اور پوری دنیائے اسلام میں ہر ملک کے علماء اس عقیدے پر متفق ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ جو بھی آپؐ کے بعد اس منصب کا دعویٰ کرے، یا اس کو مانے، وہ کافر خارج از ملّتِ اسلام ہے۔ اِس سلسلہ کے بھی چند شواہد ملاحظہ ہوں:

(۱) امام ابوحنیفہؒ (۸۰ھ۔ ۱۵۰ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوّت کا دعویٰ کیا اور کہا "مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوّت کی علامات پیش کروں۔" اس پر امام اعظمؒ نے فرمایا کہ "جو شخص اس سے نبوّت کی کوئی علامت طلب کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فرما چکے ہیں کہ لا نبی بعدی" (مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ لابن احمد المکی، ج ۱، ص ۱۶۱۔ مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۲۱ھ)

(۲) علامہ ابن جریر طبری (۲۲۴ھ۔ ۳۱۰ھ) اپنی مشہور تفسیر قرآن میں آیت وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کا مطلب بیان کرتے ہیں: الذی ختم النبوۃ فطبع علیہا فلا تفتح لاحد بعدہ الی قیام الساعۃ "جس نے نبوّت کو ختم کر دیا اور اس پر مُہر لگا دی، اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھُلے گا" (تفسیر ابنِ جریر، جلد ۲۲، صفحہ ۱۲)

(۳) امام طحاوی (۲۳۹ھ۔ ۳۲۱ھ) اپنی کتاب "عقیدۃ سلفیہ" میں سلف صالحین، اور خصوصاً امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمد رحمہم اللہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے نبوّت کے بارے میں یہ عقیدہ تحریر فرماتے ہیں: "اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے برگزیدہ بندے، چیدہ نبی اور پسندیدہ رسُول ہیں اور وہ خاتم الانبیاء، امام الاتقیا، سیّد المرسلین اور حبیب ربّ العٰلمین ہیں، اور ان کے بعد نبوّت کا ہر دعوٰی گمراہی اور خواہشِ نفس کی بندگی ہے۔" (شرح الطحاویہ فی العقیدۃ السّلفیہ، دار المعارف مصر، صفحات ۱۵، ۸۷، ۹۶، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۲)

(۴) علامہ ابن حزم اَندلسی (۳۸۴ھ۔ ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: "یقیناً وحی کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف، اور اللہ عزّوجلّ فرما چکا ہے کہ محمد نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ، مگر وہ اللہ کے رسُول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔" (المحلّی، ج ۱، ص ۲۶)

(۵) امام غزالی (۴۵۰ھ۔ ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں[۱]:

---

[۱] امام غزالیؒ کی اس رائے کو ہم ان کی اصل عبارت کے ساتھ اس لیے نقل کر رہے ہیں کہ منکرین ختمِ نبوّت نے اس حوالے کی صحت کو بڑے زور شور سے چیلنج کیا ہے۔

لو فتح هٰذا الباب (اى باب انكار
كون الاجماع حجة) انجر الى امور شنيعة
وهو ان قائلا لو قال يجوز ان يبعث رسول
بعد نبينا محمد صلى الله عليه وسلم
فيبعد التوقف فى تكفيره، ومستبعد
استحالة ذالك عند البحث تستمد من
الاجماع لامحالة، فان العقل لا يحيله
وما نقل فيه من قوله لا نبى بعدى
ومن قوله تعالىٰ خاتم النبيين، فلا
يعجز هذا القائل عن تاويله، فيقول
خاتم النبيّين اراد به اولوا العزم من
الرسل، فان قالوا النبيّين عام، فلا يبعد
تخصيص العام، وقوله لا نبى بعدى
لم يرد به الرسول وفرق بين النبى و
الرسول والنبى اعلىٰ مرتبة من الرسول
الىٰ غير ذالك من انواع الهذيان، فهٰذا
وامثاله لا يمكن ان ندعى استحالته
من حيث مجرد اللفظ، فانا فى تاويل
ظواهر التشبيه قضينا باحتمالات ابعد
من هٰذه، ولم يكن ذالك مبطلا للنصوص
ولكن الرد على هٰذا القائل ان الامة
فهمت بالاجماع من هٰذا اللفظ ومن
قرائن احواله انه افهم عدم نبى بعده
ابدًا وعدم رسول الله ابدًا وانه ليس
فيه تاويل ولا تخصيص فمنكر هٰذا لا

اگر یہ دروازہ (یعنی اجماع کو حجّت ماننے سے انکار
کا دروازہ) کھول دیا جائے تو بُری قبیح باتوں تک
نوبت پہنچ جاتی ہے ۔ مثلاً اگر کہنے والا کہے کہ ہمارے
نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کسی رسول کی بعثت
ممکن ہے تو جو اس کی تکفیر میں تامّل کو ناجائز ثابت کرنا
چاہتا ہو اسے لامحالہ اجماع سے مدد لینی پڑے گی۔
کیونکہ عقل اس کے عدمِ جواز کا فیصلہ نہیں کرتی ۔ اور
جہاں تک نقل کا تعلق ہے اس عقیدے کا قائل لانبی
بعدی اور خاتم النبیّین کی تاویل کرنے سے عاجز نہ ہوگا۔
وہ کہے گا کہ خاتم النبیّین سے مراد اولوالعزم رسُولوں
کا خاتم ہونا ہے ۔ اور اگر کہا جائے کہ نبیّین کا لفظ
عام ہے تو عام کو خاص قرار دے دینا اس کے لیے کچھ
مشکل نہ ہوگا ۔ اور لانبی بعدی کے متعلق وہ کہہ
دیگا کہ لارسول بعدی تو نہیں کہا گیا ہے ، رسُول
اور نبی میں فرق ہے ، اور نبی کا مرتبہ رسُول سے بلند تر
ہے ۔ غرض اس طرح کی بکواس بہت کچھ کی جاسکتی
ہے ۔ اور محض لفظ کے اعتبار سے ایسی تاویلات
کو ہم محال نہیں سمجھتے ، بلکہ ظواہرِ تشبیہ کی تاویل میں
ہم اس سے بھی زیادہ بعید احتمالات کی گنجائش
مانتے ہیں ۔ اور اس طرح کی تاویلیں کرنے والے کے
متعلق ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ نصوص کا انکار
کر رہا ہے ۔ لیکن اس قول کے قائل کی تردید میں
ہم یہ کہیں گے کہ اُمّت نے بالاتفاق اس لفظ
(یعنی لانبی بعدی) سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم
کے قرائنِ احوال سے یہ سمجھا ہے کہ حضورؐ کا مطلب

یکون الا منکر الاجماع - (انتصاد فی الاعتقاد المطبعۃ الادبیہ، مصر، ص ۱۱۴) یہ تھا کہ آپ کے بعد کبھی نہ کوئی نبی آئے گا نہ رسول۔ نیز اُمّت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس میں کسی تاویل اور تخصیص کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو منکرِ اجماع کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(۶) مُحی السُّنّہ بَغَوی (متوفی ۵۱۰ھ) اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں: "اللہ نے آپؐ کے ذریعہ سے نبوّت کو ختم کیا، پس آپؐ انبیاء کے خاتم ہیں . . . . اور ابنِ عبّاس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اِس آیت میں) یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔" (جلد ۳، ص ۱۵۸)

(۷) عَلّامہ زَمَخشَری (۴۶۷ھ - ۵۳۸ھ) تفسیر کشّاف میں لکھتے ہیں: "اگر تم کہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم آخری نبی کیسے ہوئے جبکہ حضرت عیسیٰؑ آخر زمانے میں نازل ہونگے؟ تو میں کہوں گا کہ آپؐ کا آخری نبی ہونا اس معنی میں ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائے گا، اور عیسیٰ علیہ السّلام اُن لوگوں میں سے ہیں جو آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے، اور جب وہ نازل ہونگے تو شریعت محمّدیہ کے پیرو اور آپؐ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہونگے، گویا کہ وہ آپ ہی کی اُمّت کے ایک فرد ہیں۔" (جلد ۲، ص ۲۱۵)

(۸) قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ) لکھتے ہیں: "جو شخص خود اپنے حق میں نبوّت کا دعویٰ کرے، یا اس کو جائز رکھے کہ آدمی نبوّت کا اکتساب کر سکتا ہے اور صفائی قلب کے ذریعہ سے مرتبۂ نبوّت کو پہنچ سکتا ہے، جیسا کہ بعض فلسفی اور غالی صوفی کہتے ہیں، اور اسی طرح جو شخص نبوّت کا دعویٰ تو نہ کرے مگر یہ دعویٰ کرے کہ اس پر وحی آتی ہے . . . . ایسے سب لوگ کافر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے جھٹلانے والے ہیں۔ کیونکہ آپؐ نے خبر دی ہے کہ آپؐ خاتم النبییّن ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر پہنچائی ہے کہ آپؐ نبوّت کے ختم کرنے والے ہیں اور تمام انسانوں کی طرف آپؐ کو بھیجا گیا ہے۔ اور تمام اُمّت کا اِس پر اجماع ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر مفہوم پر محمول ہے، اس کے معنی و مفہوم میں کسی تاویل و تخصیص کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ان تمام گروہوں کے کافر ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں، بربنائے اِجماع بھی اور بربنائے نقل بھی۔" (شفاء، جلد ۲، ص ۲۷۰ - ۲۷۱)

(۹) علامہ شَہرستانی (متوفی ۵۴۸ھ) اپنی مشہور کتاب المِلَل و النِّحَل میں لکھتے ہیں: "اور اسی طرح جو کہے . . . . . . کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہے (بجز عیسیٰ علیہ السّلام کے)، تو اس کے کافر ہونے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں ہے۔" (جلد ۳، ص ۲۴۹)

(۱۰) امام رازی (۵۴۳ھ - ۶۰۶ھ) اپنی تفسیر کبیر میں آیت خاتم النبییّن کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اُس سلسلہ بیان میں وخاتم النبیّین اس لیے فرمایا کہ جس نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی ہو وہ اگر نصیحت اور توضیحِ احکام میں کوئی کسر چھوڑ جائے تو اس کے بعد آنے والا نبی اُسے پورا کر سکتا ہے۔ مگر جس کے بعد کوئی آنے والا نبی نہ ہو وہ اپنی اُمّت پر زیادہ شفیق ہوتا ہے اور اس کو زیادہ واضح رہنمائی دیتا ہے کیونکہ اس کی مثال اُس باپ کی ہوتی ہے جو جانتا ہے کہ اس کے بیٹے کا کوئی ولی و سرپرست اُس کے بعد نہیں ہے۔"
(جلد ۶، ص ۵۸۱)

(۱۱) علّامہ بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) اپنی تفسیر "انوار التنزیل" میں لکھتے ہیں: یعنی آپؐ انبیاء میں سب سے آخری نبی ہیں جس نے اُن کا سلسلہ ختم کر دیا، یا جس سے انبیاء کے سلسلے پر مُہر کر دی گئی۔ اور عیسٰی علیہ السلام کا آپؐ کے بعد نازل ہونا اِس ختمِ نبوّت میں خارج نہیں ہے کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپؐ ہی کے دین پر ہوں گے۔" (جلد ۴۔ ص ۱۶۴)

(۱۲) علّامہ حافظ الدین النَّسَفی (مُتوفی ۷۱۰ھ) اپنی تفسیر "مدارک التنزیل" میں لکھتے ہیں: "اور آپؐ خاتم النبیّین ہیں . . . یعنی نبیوں میں سب سے آخری۔ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں بنایا جائے گا۔ رہے عیسٰیؑ تو وہ اُن انبیاء میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر عمل کرنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے گویا کہ وہ آپؐ کی اُمّت کے افراد میں سے ہیں۔" (ص ۴۷۱)

(۱۳) علّامہ علاؤ الدین بغدادی (مُتوفی ۷۲۵ھ) اپنی تفسیر "خازن" میں لکھتے ہیں: "وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ یعنی اللہ نے آپؐ پر نبوّت ختم کر دی، اب نہ آپؐ کے بعد کوئی نبوّت ہے نہ آپؐ کے بعد کوئی اُس میں شریک . . . . . . وَکَانَ اللہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا یعنی یہ بات اللہ کے علم میں ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔" (ص ۴۷۱)

(۱۴) علّامہ ابنِ کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں: "پس یہ آیت اس باب میں نصِّ صریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور جب آپؐ کے بعد نبی کوئی نہیں تو رسول بدرجۂ اَولیٰ نہیں ہے، کیوں کہ رسالت کا منصب خاص ہے اور نبوّت کا منصب عام، ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسُول نہیں ہوتا . . . . حضورؐ کے بعد جو شخص بھی اِس مقام کا دعوٰی کرے وہ جھوٹا، مُفتری دجّال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے خواہ وہ کیسے ہی خرقِ عادت اور شعبدے اور جادو اور طلسم اور کرشمے بنا کر لے آئے . . . . یہی حیثیت ہر اُس شخص کی ہے جو قیامت تک اس منصب کا مدعی ہو۔"
(جلد ۳۔ ص ۴۹۳-۴۹۴)

(۱۵) علّامہ جلالُ الدّین سُیُوطی (متوفی ۹۱۱ھ) تفسیر جلالین میں لکھتے ہیں: "وَکَانَ اللہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا یعنی

اللہ اِس بات کو جانتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور عیسٰیؑ جب نازل ہوں گے تو آپؐ کی شریعت کے مطابق عمل کریں گے۔" (ص ۷۶۸)

(۱۶) علامہ ابنِ نُجیم (متوفی سنہ ۹۷۰ھ) اُصُولِ فقہ کی مشہور کتاب الأشباہ والنظائر، کتاب السیر، باب الردّہ میں لکھتے ہیں: "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ اُن باتوں میں سے ہے جن کا جاننا اور ماننا ضروریاتِ دین میں سے ہے۔" (ص ۱۷۹)

(۱۷) ملّا علی قاری (متوفی سنہ ۱۰۱۶ھ) شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: "ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد نبوّت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے۔" (ص ۲۰۲)

(۱۸) شیخ اسماعیل حقی (متوفی سنہ ۱۱۳۷ھ) تفسیر رُوح البیان میں اِس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "عاصم نے لفظ خاتَم ت کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی ہیں آلۂ ختم کے جس سے مُہر کی جاتی ہے جیسے طابع اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے ٹھپّا لگایا جائے۔ مُراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم انبیاء میں سب سے آخر تھے جن کے ذریعہ سے نبیوں کے سلسلے پر مُہر لگا دی گئی۔ فارسی میں اِسے "مُہرِ پیغمبراں" کہیں گے، یعنی آپؐ سے نبوّت کا دروازہ سر بمُہر کر دیا گیا اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باقی قاریوں نے اسے ت کے زیر کے ساتھ خاتِم پڑھا ہے، یعنی آپؐ مُہر کرنے والے تھے۔ فارسی میں اِسے "مُہر کنندۂ پیغمبراں" کہیں گے۔ اِس طرح یہ لفظ بھی خاتَم کا ہم معنی ہی ہے ۔ ۔ ۔ اب آپ کی اُمّت کے علماء آپؐ سے صرف ولایت ہی کی میراث پائیں گے، نبوّت کی میراث آپؐ کی خَتمیّت کے باعث ختم ہو چکی۔ اور عیسٰیؑ علیہ السّلام کا آپؐ کے بعد نازل ہونا آپؐ کے خاتم النبیّین ہونے میں قادح نہیں ہے کیونکہ خاتم النبیّین ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ بنایا جائے گا ۔ ۔ ۔ اور عیسٰیؑ آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیرو کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ آپؐ ہی کے قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں گے۔ آپؐ کی اُمّت کے ایک فرد کی طرح ہوں گے۔ نہ اُن کی طرف وحی آئے گی اور نہ وہ نئے احکام دیں گے، بلکہ وہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلیفہ ہوں گے ۔ ۔ ۔ اور اہلِ سُنّت والجماعت اس بات کے قائل ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔ اور رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرما دیا لانبی بعدی۔ اب جو کوئی کہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی ہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا، کیونکہ اُس نے نص کا انکار کیا۔ اور اِسی طرح اُس شخص کی بھی تکفیر کی جائے گی جو اِس میں شک کرے، کیونکہ حُجّت نے حق کو باطل سے مُمیّز کر دیا ہے۔ اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے

بعد نبوّت کا دعویٰ کرے اس کا دعویٰ باطل کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔" (جلد ۲۲، صفحہ ۱۸۸)

(۱۹) فتاویٰ عالمگیری، جسے بارھویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ہندوستان کے بہت سے اکابر علماء نے مرتب کیا تھا، اس میں لکھا ہے: "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم آخری نبی ہیں تو وہ مسلم نہیں ہے۔ اور اگر وہ کہے کہ میں اللہ کا رسُول ہوں یا میں پیغمبر ہوں تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔"

(جلد ۲، ص ۲۶۳)

(۲۰) عَلّامہ شوکانی (متوفی ۱۲۵۵ھ) اپنی تفسیر فتح القدیر میں لکھتے ہیں: "جمہور نے لفظ خاتم کو ت کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے اور عاصم نے زبر کے ساتھ۔ پہلی قراءت کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ نے انبیاء کو ختم کیا، یعنی سب کے آخر میں آئے۔ اور دوسری قراءت کے معنی یہ ہیں کہ آپ اُن کے لیے مہر کی طرح ہو گئے جس کے ذریعہ سے ان کا سلسلہ سر بمہر ہو گیا اور جس کے شمول سے ان کا گروہ مزیّن ہوا۔ (جلد ۴، ص ۲۷۵)

(۲۱) عَلّامہ آلوسی (متوفی ۱۲۷۰ھ) تفسیر رُوح المعانی میں لکھتے ہیں: "نبی کا لفظ رسُول کی بہ نسبت عام ہے۔ لہٰذا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خاتم النبیّین ہونے سے خود بخود لازم آتا ہے کہ آپؐ خاتم المرسلین بھی ہوں۔ اور آپؐ کے خاتم انبیاء و رُسل ہونے سے مُراد یہ ہے کہ اِس دنیا میں وصفِ نبوّت سے آپؐ کے متصف ہونے کے بعد اب جِنّ و انس میں سے ہر ایک کے لیے نبوّت کا وصف منقطع ہو گیا۔" (جلد ۲۲۔ ص ۳۲) "رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد جو شخص وحیِ نبوّت کا مدّعی ہو اُسے کافر قرار دیا جائے گا۔ اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔" (جلد ۲۲۔ ص ۳۸) "رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا خاتم النبیّین ہونا ایک ایسی بات ہے جسے کتابُ اللہ نے صاف صاف بیان کیا، سُنّت نے واضح طور پر اس کی تصریح کی، اور اُمّت نے اس پر اجماع کیا۔ لہٰذا جو اس کے خلاف کوئی دعویٰ کرے اُسے کافر قرار دیا جائے گا۔" (جلد ۲۲۔ ص ۳۹)

یہ ہندوستان سے لے کر مراکش اور اَنْدُلس تک، اور ٹرکی سے لے کر یمن تک ہر مُسلمان ملک کے اکابر عُلماء و فقہاء اور مُحدّثین و مفسّرین کی تصریحات ہیں۔ ہم نے ان کے ناموں کے ساتھ ان کے سنینِ ولادت و وفات بھی دے دیے ہیں جن سے ہر شخص بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ پہلی صدی سے تیرھویں صدی تک تاریخِ اسلام کی ہر صدی کے اکابر اُن میں شامل ہیں۔ اگرچہ ہم چودھویں صدی کے علمائے اسلام کی تصریحات بھی نقل کر سکتے تھے، مگر ہم نے قصداً انہیں اس لیے چھوڑ دیا کہ اُن کی تفسیر کے جواب میں ایک شخص یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ اِن لوگوں نے اِس دَور کے مدّعیِ نبوّت کی ضد میں ختمِ نبوّت کے یہ معنی بیان کیے ہیں۔ اِس لیے ہم نے پہلے علماء کی تحریریں نقل کی ہیں جو ظاہر ہے کہ آج کے کسی شخص سے کوئی ضد نہ رکھ سکتے تھے۔ اِن تحریروں سے یہ بات قطعی طور پر

ثابت ہو جاتی ہے کہ پہلی صدی سے آج تک پوری دنیائے اسلام متفقہ طور پر "خاتم النبیین" کے معنی "آخری نبی" ہی سمجھتی رہی ہے، حضورؐ کے بعد نبوت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند تسلیم کرنا ہر زمانے میں تمام مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ رہا ہے، اور اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کرے اور جو اُس کے دعوے کو مانے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اب یہ دیکھنا ہر صاحبِ عقل آدمی کا اپنا کام ہے کہ لفظ خاتم النبیین کا جو مفہوم لغت سے ثابت ہے، جو قرآن کی عبارت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے، جس کی تصریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرما دی ہے، جس پر صحابۂ کرامؓ کا اجماع ہے، اور جسے صحابۂ کرامؓ کے زمانے سے لے کر آج تک تمام دنیا کے مسلمان بلا اختلاف مانتے رہے ہیں، اس کے خلاف کوئی دوسرا مفہوم لینے اور کسی نئے مدعی کے لیے نبوت کا دروازہ کھولنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے، اور ایسے لوگوں کو کیسے مسلمان تسلیم کیا جاسکتا ہے جنہوں نے بابِ نبوت کے مفتوح ہونے کا محض خیال ہی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اس دروازے سے ایک صاحب حریمِ نبوت میں داخل بھی ہو گئے ہیں اور یہ لوگ اُن کی نبوت پر ایمان بھی لے آئے ہیں۔

اس سلسلے میں تین باتیں اور قابلِ غور ہیں:

ایک اہم سوال

پہلی بات یہ ہے کہ نبوت کا معاملہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے یہ اسلام کے اُن بنیادی عقائد میں سے ہے جن کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور آدمی اس کو نہ مانے تو کافر، اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے ایک نازک معاملے میں تو اللہ تعالیٰ سے کسی بے احتیاطی کی بدرجۂ اولیٰ توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود قرآن میں صاف صاف اُس کی تصریح فرماتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اُس کا کھُلا کھُلا اعلان کراتا اور حضورؐ دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے جب تک اپنی اُمّت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور تمہیں اُن کو ماننا ہوگا۔ آخر اللہ اور اس کے رسُول کو ہمارے دین و ایمان سے کیا دشمنی تھی کہ حضورؐ کے بعد نبوت کا دروازہ تو کھُلا ہوتا اور کوئی نبی آنے والا بھی ہوتا جس پر ایمان لائے بغیر ہم مسلمان نہ ہوسکتے، مگر ہم کو نہ صرف یہ کہ اس سے بے خبر رکھا جاتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ اور اس کا رسول، دونوں ایسی باتیں فرما دیتے جن سے تیرہ سو برس تک ساری اُمّت یہی سمجھتی رہی اور آج بھی سمجھ رہی ہے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

اب اگر بفرضِ محال نبوّت کا دروازہ واقعی کھلا بھی ہو اور کوئی نبی آبھی جائے تو ہم بے خوف وخطر اس کا انکار کر دیں گے۔ خطرہ ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی باز پرس ہی کا تو ہو سکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز ہم سے پوچھے گا تو ہم یہ سارا ریکارڈ برسرِ عدالت لاکر رکھ دیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسُول کی سُنّت ہی نے ہمیں ڈالا تھا۔ ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ ہمیں کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالے گا۔ لیکن اگر نبوّت کا دروازہ فی الواقع بند ہے اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اور اس کے باوجود کوئی شخص کسی مدعی کی نبوت پر ایمان لاتا ہے تو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اِس کفر کی پاداش سے بچنے کے لیے وہ کونسا ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش کر سکتا ہے جس سے وہ رہائی کی توقع رکھتا ہو۔ عدالت میں پیشی ہونے سے پہلے اُسے اپنی صفائی کے مواد کا یہیں جائزہ لے لینا چاہیے، اور ہمارے پیش کردہ مواد سے مقابلہ کر کے خود ہی دیکھ لینا چاہیے کہ جس صفائی کے بھروسے پر وہ یہ کام کر رہا ہے کیا ایک عقلمند آدمی اُس پر اعتماد کر کے کفر کی سزا کا خطرہ مُول لے سکتا ہے؟

اب نئے نبی کی آخر ضرورت کیا ہے؟

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبوّت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو ہر اُس شخص میں پیدا ہو جایا کرے جس نے عبادت اور عملِ صالح میں ترقی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی ایسا انعام ہے جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ وہ ضرورت جب داعی ہوتی ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے، اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا باقی نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیاء پر انبیاء نہیں بھیجے جاتے۔

قرآن مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاء مبعوث ہوتے ہیں:

اوّل یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اُس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اِس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بھلا دی گئی ہو، یا اس میں تحریف ہو گئی ہو اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعہ مکمّل تعلیم وہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیلِ دین کے لیے مزید انبیاء کی ضرورت ہو۔

چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اُس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔

قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضورؐ کو تمام دُنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دُنیا کی تمدنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپؐ کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپؐ کی دعوت سب قوموں کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیاء آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔

قرآن اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث و سیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں مسخ و تحریف کا کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ جو کتاب آپ لائے تھے اس میں ایک لفظ کی بھی کمی و بیشی آج تک نہیں ہوئی، نہ قیامت تک ہو سکتی ہے۔ جو ہدایت آپؐ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اس طرح ہمیں مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپؐ کے زمانے میں موجود ہیں۔ اِس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی۔

پھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضورؐ کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر دی گئی۔ لہٰذا تکمیلِ دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا۔

اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضورؐ کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی۔

اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کونسی ہے جس کے لیے آپؐ کے بعد ایک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے، تو ہم اُس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اِس کام کے لیے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اُس پر وحی کی جائے، اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے، یا پچھلے پیغام کی تکمیل کرنے کے لیے، یا اُس کو تحریفات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن اور سُنّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمّل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں، تو اب اصلاح کے لیے صرف مُصلحین کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیاء کی۔

نئی نبوّت اب اُمّت کے لیے رحمت نہیں

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نبی جب بھی کسی قوم میں آئے گا فوراً اس میں کفر و ایمان کا سوال اُٹھ کھڑا ہو گا۔ جو اُس کو مانیں گے وہ ایک اُمّت قرار پائیں گے اور جو اُس کو نہ مانیں گے وہ لامحالہ دوسری اُمّت ہوں گے۔ اِن دونوں اُمّتوں کا اختلاف محض فروعی اختلاف نہ ہو گا بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا

ایسا بنیادی اختلاف ہوگا جو انہیں اُس وقت تک جمع نہ ہونے دیگا جب تک ان میں سے کوئی اپنا عقیدہ نہ چھوڑ دے۔ پھر ان کے لیے عملاً بھی ہدایت اور قانون کے ماخذ الگ الگ ہوں گے، کیونکہ ایک گروہ اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیش کی ہوئی وحی اور اس کی سُنّت سے قانون لے گا اور دوسرا گروہ اس کے ماخذِ قانون ہونے کا سرے سے منکر ہوگا۔ اِس بنا پر ان کا ایک مشترک معاشرہ بن جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا۔

اِن حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھے تو اُس پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ختمِ نبوت اُمّتِ مُسلمہ کے لیے اللہ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے جس کی بدولت ہی اِس اُمّت کا ایک دائمی اور عالمگیر برادری بننا ممکن ہُوا ہے۔ اِس چیز نے مُسلمانوں کو ایسے ہر بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے جو ان کے اندر مستقل تفریق کا مُوجب ہو سکتا ہو۔ اب جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنا ہادی و رہبر مانے اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے سوا کسی اور ماخذِ ہدایت کی طرف رجُوع کرنے کا قائل نہ ہو وہ اس برادری کا فرد ہے اور ہر وقت ہو سکتا ہے۔ یہ وحدت اس اُمّت کو کبھی نصیب نہ ہو سکتی تھی اگر نبوّت کا دروازہ بند نہ ہو جاتا۔ کیونکہ ہر نبی کے آنے پر یہ پارہ پارہ ہوتی رہتی۔

آدمی سوچے تو اس کی عقل خود یہ کہہ دے گی کہ جب تمام دنیا کے لیے ایک نبی بھیج دیا جائے، اور جب اس نبی کے ذریعہ سے دین کی تکمیل بھی کر دی جائے، اور جب اس نبی کی تعلیم کو پُوری طرح محفوظ بھی کر دیا جائے، تو نبوّت کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے تاکہ اُس آخری نبی کی پیروی پر جمع ہو کر تمام دُنیا میں ہمیشہ کے لیے اہلِ ایمان کی ایک ہی اُمّت بن سکے اور بلا ضرورت نئے نئے نبیوں کی آمد سے اس اُمّت میں بار بار تفرقہ نہ برپا ہوتا رہے۔ نبی خواہ "ظلّی" ہو یا "برُوزی"، اُمّتی ہو یا صاحبِ شریعت اور صاحبِ کتاب، بہر حال جو شخص نبی ہوگا اور خدا کی طرف سے بھیجا ہُوا ہوگا، اس کے آنے کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کے ماننے والے ایک اُمّت بنیں اور نہ ماننے والے کافر قرار پائیں۔ یہ تفریق اُس حالت میں تو ناگزیر ہے جبکہ نبی کے بھیجے جانے کی فی الواقع ضرورت ہو، مگر جب اس کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے تو خدا کی حکمت اور اس کی رحمت سے یہ بات قطعی بعید ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو کفر و ایمان کی کشمکش میں مبتلا کرے اور انہیں کبھی ایک اُمّت نہ بننے دے۔ لہٰذا جو کچھ قرآن سے ثابت ہے اور جو کچھ سُنّت اور اِجماع سے ثابت ہے عقل بھی اسی کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اب نبوّت کا دروازہ بند ہی رہنا چاہیے۔

فصل ۳

"مسیحِ موعود" کی حقیقت احادیث کی روشنی میں

نئی نبوت کی طرف بلانے والے حضرات عام طور پر ناواقف مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ احادیث میں "مسیح موعود" کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اور مسیح نبی تھے، اس لیے اُن کے آنے سے ختمِ نبوّت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ختمِ نبوت بھی برحق اور اس کے باوجود مسیح موعود کا آنا بھی برحق۔

اسی سلسلے میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "مسیح موعود" سے مراد عیسیٰ ابن مریم نہیں ہیں۔ ان کا تو انتقال ہو چکا۔ اب جس کے آنے کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ مثیلِ مسیح، یعنی حضرت عیسیٰؑ کے مانند ایک مسیح ہے، اور وہ فلاں شخص ہے جو آچکا ہے۔ اُس کا ماننا عقیدۂ ختمِ نبوت کے خلاف نہیں ہے۔

اِس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ہم یہاں پورے حوالوں کے ساتھ وہ مستند روایات نقل کیے دیتے ہیں جو اس مسئلے کے متعلق حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ اِن احادیث کو دیکھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا اور آج اس کو کیا بنایا جا رہا ہے[1]۔

احادیث درباب نزولِ عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام

(۱) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہٖ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلاً فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الحرب ویُفیض المال حتیٰ لا یقبلہٗ	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اُتریں گے تمہارے درمیان ابنِ مریمؑ حاکمِ عادل بن کر، پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور خنزیر کو ہلاک

[1] واضح رہے کہ مسیح موعود کے آنے یا نہ آنے کا معاملہ قرآن سے تو تعلق ہی نہیں رکھتا۔ اس کا سارا دارو مدار احادیث پر ہے۔ اب اگر کوئی مسیح آنا ہے تو وہ مسیح آنا ہے جس کا ذکر صحیح و معتبر احادیث میں ہے۔ اور اگر کوئی ان احادیث کو نہیں مانتا تو سرے سے کسی مسیح کو آنا ہی نہیں ہے۔ یہ محض مسخرہ پن ہو گا کہ اس عقیدے کی بنا تو احادیث پر ہو، اور پھر اُن احادیث میں سے منیخ نکالی جاتے جو مسیحؑ کی آمد کے بارے میں صحیح ترین اور معتبر ترین ہیں۔ (مؤلف)

احدُ حتیٰ تکون السجدة الواحدة خیرًا من الدنیا وما فیھا (بخاری کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ ابن مریم۔ مسلم، باب بیان نزول عیسیٰؑ۔ ترمذی ابواب الفتن، باب فی نزول عیسیٰ۔ مسند احمد، مرویاتِ ابوہریرۃؓ)

کر دیں گے،[1] اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے (دوسری روایت میں حرب کے بجائے جزیہ کا لفظ ہے، یعنی جزیہ ختم کر دیں گے)[2] اور مال کی وہ کثرت ہو گی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا اور (حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور) ایک سجدہ کر لینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہو گا۔"

(۲) ایک اور روایت حضرت ابوہریرۃؓ سے ان الفاظ میں ہے کہ لاتقوم الساعۃ حتیٰ ینزل عیسیٰ ابن مریم ....." قیامت قائم نہ ہو گی جب تک نازل نہ ہو لیں عیسیٰؑ ابن مریم ....." اور اس کے بعد وہی مضمون ہے جو اوپر کی حدیث میں بیان ہوا ہے (بخاری، کتاب المظالم، باب کسر الصلیب۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن باب فتنۃ الدجال)

(۳) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم و امامکم منکم۔ (بخاری

حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیسے ہو گے تم جبکہ تمہارے درمیان ابنِ مریمؑ اُتریں گے اور تمہارا

---

[1] صلیب کو توڑ ڈالنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ دینِ عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (یعنی حضرت عیسیٰؑ) کو صلیب پر "لعنت" کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفارہ بن گیا۔ اور انبیاء کی اُمتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی تھی کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا جو تمام انبیاء کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ کر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دی نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بنا تو عیسائی عقیدے کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے تو نہ اپنے پیروؤں کے لیے سؤر حلال کیا تھا اور نہ ان کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھیرایا تھا، تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

[2] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس وقت ملّتوں کے اختلافات ختم ہو کر سب لوگ ایک ملّتِ اسلام میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح نہ جنگ ہو گی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اسی بات پر آگے احادیث نمبر ۵ و ۱۵ دلالت کر رہی ہیں۔

کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ مسلم، بیان نزول عیسیٰ مسند احمد، مرویات ابی ہریرہؓ

امام اُس وقت خود تم میں سے ہوگا۔[1]"

(۴) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ینزل عیسیٰ ابن مریم فیقتل الخنزیر ویمحو الصلیب وتجمع لہ الصلوٰۃ ویعطی المال حتی لا یقبل ویضع الخراج وینزل الرّوحاء فیحج منھا، او یعتمر، او یجمعھما (مسند احمد بسلسلۂ مرویات ابی ہریرۃؓ مسلم، کتاب الحج۔ باب جواز التمتع فی الحج والقران)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ ابن مریمؑ نازل ہوں گے پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو مٹا دیں گے اور ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا اور وہ خراج ساقط کر دیں گے اور رَوحاء[2] کے مقام پر منزل کر کے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے، یا دونوں کو جمع کریں گے[3] (راوی کو شک ہے کہ حضورؐ نے ان میں سے کونسی بات فرمائی تھی)

(۵) عن ابی ھریرۃ (بعد ذکر خروج الدجّال) فبینما ھم یعدّون للقتال یسوّون الصفوف اذا اقیمت الصلوٰۃ فینزل عیسیٰ ابن مریم فامّھم فاذا راٰہ عدو اللّٰہ یذوب کما یذوب الملح فی الماء فلو ترکہ لانذاب حتیٰ یھلك ولکن یقتلہ اللّٰہ بیدہٖ فیریھم دمہ فی حربتہٖ۔ (مشکوٰۃ، کتاب الفتن، باب الملاحم، بحوالہ مسلم)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے (دجّال کے خروج کا ذکر کرنے کے بعد حضورؐ نے فرمایا) اس اثنا میں کہ مسلمان اُس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے، صفیں باندھ رہے ہوں گے اور نماز کے لیے تکبیر اقامت کہی جا چکی ہوگی کہ عیسیٰ ابنِ مریم نازل ہو جائیں گے اور نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ اور اللہ کا دشمن (یعنی دجّال) ان کو دیکھتے ہی اس طرح گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام اُس کو اُس کے حال پر ہی چھوڑ دیں تو وہ آپ ہی گھل کر مر جائے۔ مگر اللہ اُس کو اُن کے ہاتھ سے قتل کرائے گا اور وہ اپنے نیزے میں اُس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔"

---

[1] یعنی نماز میں حضرت عیسیٰؑ امامت نہیں کرائیں گے بلکہ مسلمانوں کا جو امام پہلے سے ہوگا اسی کے پیچھے وہ نماز پڑھیں گے۔

[2] مدینہ سے ۳۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

[3] واضح رہے کہ اس زمانے میں جن صاحب کو مثیلِ مسیح قرار دیا گیا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں نہ حج کیا اور نہ عُمرہ۔

(۶) عن ابی ھُریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلّم قال لیس بینی وبینہٗ نبی (یعنی عیسٰی) وانہٗ نازل فاذا رأیتموہ فاعرفوہ رجل مربوع الی الحمرۃ و البیاض، بین ممصرتین کان رأسہ یقطر وان لم یصبہ بلل فیقاتل الناس علی الاسلام فیدق الصلیب و یقتل الخنزیر ویضع الجزیۃ ویھلک اللہ فی زمانہ الملل کلھا الا الاسلام ویھلک المسیح الدجال فیمکث فی الارض اربعین سنۃ ثم یتوفی فیصلی علیہ المسلمون ۔ (ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال۔ مُسنداحمد، مرویات ابوہریرہؓ)

ابُوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا میرے اور اُن (یعنی عیسٰی علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اُترنے والے ہیں، پس جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا، وہ ایک میانہ قد آدمی ہیں، رنگ مائل بسرخی و سپیدی ہے، دو زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر کے بال ایسے ہوں گے گویا اب ان سے پانی ٹپکنے والا ہے، حالانکہ وہ بھیگے ہُوئے نہ ہوں گے۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے، صلیب کو پاش پاش کر دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، اور اللہ ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام ملّتوں کو مٹا دے گا، اور وہ مسیح دجّال کو ہلاک کر دیں گے، اور زمین میں وہ چالیس سال ٹھیریں گے۔ پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔"

(۷) عن جابر بن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔ فینزل عیسٰی بن مریم صلی اللہ علیہ وسلّم فیقول امیرھم تعال صلّ لنا فیقول لا ان بعضکم علی بعض امراء تکرمۃ اللہ ھٰذہ الامۃ ۔ (مسلم، بیان نزول عیسٰی ابن مریم۔ مُسنداحمد بسلسلہ مرویات جابرؓ بن عبداللہ)

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا کہ ۔۔۔ پھر عیسٰی ابن مریم نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر اُن سے کہے گا کہ آیئے، آپ نماز پڑھایئے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو۔ یہ وہ اُس عزّت کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اِس اُمّت کو دی ہے۔"

(۸) عن جابر بن عبد اللہ (فی قصّۃ ابن صیاد) فقال عمر بن الخطاب ائذن لی فاقتلہٗ یا رسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یکن ھو فلست صاحبہ

جابر بن عبداللہ (قصّۂ ابنِ صیّاد کے سلسلہ میں) روایت کرتے ہیں کہ پھر عمر بن خطّاب نے عرض کیا، یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسے قتل کر دُوں۔ اس پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے

انما صاحبه عیسیٰ ابن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام، وان لایکن فلیس لك ان تقتل رجلا من اھل العھد (مشکوٰۃ کتاب الفتن باب قصۂ ابن صیاد، بحوالہ شرح السنۃ لبغوی)

فرمایا کہ اگر یہ وہی شخص (یعنی دجال) ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو بلکہ اسے تو عیسیٰ ابنِ مریم ہی قتل کریں گے۔ اور اگر یہ وہ شخص نہیں ہے تو تمہیں اہلِ عہد (یعنی ذمیوں) میں سے ایک آدمی کو قتل کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

(۹) عن جابر بن عبد اللہ (فی قصۃ الدجال) فاذا ھم بعیسی ابن مریم علیہ السلام فتقام الصلوٰۃ فیقال لہ تقدم یا روح اللہ فیقول لیتقدم امامکم فلیصل بکم فاذا صلی صلوٰۃ الصبح خرجوا الیہ قال فحین یری الکذاب ینماث کما ینماث الملح فی الماء فیمشی الیہ فیقتلہ حتی ان الشجر والحجر ینادی یا روح اللہ ھذا الیھودی، فلا یترك ممن کان یتبعہ احد الا قتلہ۔ (مسند احمد، بسلسلۂ روایات جابر بن عبد اللہ)

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ دجال کا قصہ بیان کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اُس وقت یکایک عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام مسلمانوں کے درمیان آجائیں گے۔ پھر نماز کھڑی ہوگی اور ان سے کہا جائے گا کہ اے روح اللہ آگے بڑھیے مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تمہارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے، وہی نماز پڑھائے۔ پھر صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمان دجال کے مقابلے پر نکلیں گے۔ فرمایا، جب وہ کذاب حضرت عیسیٰ کو دیکھے گا تو گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھیں گے اور اسے قتل کر دیں گے اور حالت یہ ہوگی کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے کہ اے روح اللہ یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ دجال کے پیروؤں میں سے کوئی نہ بچے گا جسے وہ (یعنی عیسیٰ) قتل نہ کر دیں۔

(۱۰) عن النواس بن سمعان (فی قصۃ الدجال) فبینما ھو کذلك اذ بعث اللہ المسیح ابن مریم فینزل عند المنارۃ البیضاء شرقی دمشق بین مھروذتین واضعًا کفیہ علی اجنحۃ ملکین اذا طاطا راسہ قطر واذا رفعہ تحدر منہ جمان کاللؤلؤ فلا یحل لکافر یجد ریح نفسہ الامات و

حضرت نواس بن سمعان کلابی (قصہ دجال بیان کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں: اس اثناء میں کہ دجال یہ کچھ کر رہا ہوگا، اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو بھیج دے گا اور وہ دمشق کے مشرقی حصے میں، سفید مینار کے پاس، زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے، دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اُتریں گے۔ جب

نفسہ ینتہی الیٰ حیث ینتہی طرفہ فیطلبہ حتیٰ یدرکہ بباب لُدٍّ فیقتلہٗ۔ (مسلم، ذکر الدجال۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی فتنۃ الدجال۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجال)

وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں، اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی، اور وہ ان کی حدِ نظر تک جائے گی، وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابن مریمؑ دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ[1] کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔

(۱۱) عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخرج الدجال فی اُمتی فیمکث اربعین (لا ادری اربعین یومًا او اربعین شھرًا او اربعین عامًا)، فیبعث اللہ عیسیٰ ابن مریم کانہٗ عروۃ بن مسعود فیطلبہ فیھلکہ ثم یمکث الناس سبع سنین لیس بین اثنین عداوۃ (مسلم، ذکر الدجال)

عبد اللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دجال میری اُمت میں نکلے گا اور چالیس (میں نہیں جانتا چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال)[2] رہے گا۔ پھر اللہ عیسیٰ ابن مریمؑ کو بھیجے گا۔ ان کا حلیہ عروہ بن مسعودؓ (ایک صحابی) سے مشابہ ہوگا۔ وہ اس کا پیچھا کریں گے اور اسے ہلاک کر دیں گے، پھر سات سال تک لوگ اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان بھی عداوت نہ ہوگی۔

(۱۲) عن حُذیفۃ بن اَسید الغِفاری قال اطلع النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم علینا ونحن نتذاکر فقال ما تذکرون قالوا نذکر الساعۃ قال انھا لن تقوم حتیٰ ترون قبلھا عشر اٰیات فذکر الدُّخان

حُذیفہ بن اَسید الغِفاری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مجلس میں تشریف لائے اور ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا کیا بات ہو رہی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ فرمایا وہ ہرگز قائم

---

[1] واضح رہے کہ لُدّ (Lydda) فلسطین میں ریاست اسرائیل کے دار السلطنت تل اَبیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہودیوں نے وہاں بہت بڑا ہوائی اڈا بنا رکھا ہے۔

[2] یہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص کا اپنا قول ہے۔

والدجال والدابة وطلوع الشمس من مغربها ونزول عیسی ابن مریم ویاجوج وماجوج وثلثة خسوف، خسف بالمشرق وخسف بالمغرب، وخسف بجزیرة العرب وآخر ذلك نار تخرج من الیمن تطرد الناس الی محشرهم (مسلم: کتاب الفتن واشراط الساعة۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب امارات الساعة)

نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے دس نشانیاں ظاہر نہ ہو جائیں۔ پھر آپ نے وہ دس نشانیاں یہ بتائیں (۱) دُھوآں، (۲) دجّال، (۳) دابۃ الارض (۴) سُورج کا مغرب سے طلوع ہونا، (۵) عیسٰی ابنِ مریم کا نزول، (۶) یاجوج وماجوج، (۷) تین بڑے خَسف[1]، ایک مشرق میں، (۸) دوسرا مغرب میں (۹) تیسرا جزیرۃ العرب میں (۱۰) سب سے آخر میں ایک زبردست آگ جو یمن سے اُٹھے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔

(۱۳) عن ثوبان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم عصابتان من امتی احرزهما اللہ تعالیٰ من النار۔ عصابة تغزوا الهند، وعصابة تکون مع عیسی ابن مریم علیه السلام (نسائی، کتاب الجهاد۔ مسند احمد، بسلسلہ روایات ثوبانؓ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "میری اُمّت کے دو لشکر ایسے ہیں جن کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچالیا۔ ایک وہ لشکر جو ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا وہ جو عیسٰیؑ ابن مریمؑ کے ساتھ ہوگا۔"

(۱۴) عن مُجمّع بن جاریة قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول یقتل ابنُ مریم الدجّال بباب لُدّ (مسند احمد۔ ترمذی، ابواب الفتن)

مُجمّع بن جاریہ انصاری کہتے ہیں، مَیں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ابن مریم دجّال کو لُدّ کے دروازے پر قتل کریں گے۔

(۱۵) عن ابی اُمامة الباهلی (فی حدیث طویل فی ذکر الدجال) فبینما امامهم قد تقدم یصلّی بهم الصبح اذ نزل علیهم عیسی بن مریم فرجع ذلك الامام ینکص یمشی

ابواُمامہ باہلی (ایک طویل حدیث میں دجّال کا ذکر کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں کہ عین اُس وقت جب مسلمانوں کا امام صبح کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکا ہوگا عیسٰی ابن مریم اُن پر اتر آئیں گے۔

---

[1] زمین میں دھنس جانا (Landslide)

فهتری لیتقدم عیسیٰ فیضع عیسیٰ یده
بین کتفیه ثم یقول له تقدم فصلّ فانها
لك اقیمت فیصلّی بهم امامهم فاذا
انصرف قال عیسیٰ علیه السلام افتحوا
الباب فیفتح ووراءه الدجّال ومعه
سبعون الف یهودی کلّهم ذوسیف
محلّی وساج فاذا نظر الیه الدجال ذاب کما
یذوب الملح فی الماء وینطلق هاربًا و
یقول عیسیٰ ان لی فیك ضربة لن تسبقنی
بها فیدرکه عند باب اللُّدّ الشرقی فیهزم
الله الیهود . . . وتملأ الارض من
المسلم کما یملأ الاناء من الماء وتکون
الکلمة واحدة فلا یعبد الا الله تعالیٰ
(ابن ماجه، کتاب الفتن، باب فتنة الدجال)

امام پیچھے پلٹے گا تاکہ عیسیٰ آگے بڑھیں، مگر عیسیٰ اس کے
شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ نہیں تم ہی
نماز پڑھاؤ کیونکہ یہ تمہارے ہی لیے کھڑی ہوئی ہے
چنانچہ وہی نماز پڑھائے گا۔ سلام پھیرنے کے بعد عیسیٰ
علیہ السلام کہیں گے کہ دروازہ کھولو، چنانچہ وہ
کھولا جائے گا۔ باہر دجال ۷۰ ہزار مسلح یہودیوں کے
ساتھ موجود ہوگا۔ جونہی کہ عیسیٰ علیہ السلام پر اس کی
نظر پڑے گی وہ اس طرح گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی
میں گھلتا ہے اور وہ بھاگ نکلے گا عیسیٰ کہیں گے میرے
پاس تیرے لیے ایک ایسی ضرب ہے جس سے تو
بچ کر نہ جا سکے گا۔ پھر وہ اسے لُدّ کے مشرقی دروازے
پر جا لیں گے اور اللہ یہودیوں کو ہرا دے گا۔
. . . اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی
جیسے برتن پانی سے بھر جائے۔ سب دنیا کا کلمہ ایک
ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔"

(۱۶) عن عثمان بن ابی العاص قال سمعت رسول
الله صلی الله علیه وسلم یقول . . . و
ینزل عیسیٰ ابن مریم علیه السلام عند
صلوٰة الفجر فیقول له امیرهم یا روح
الله تقدم صلّ . فیقول هٰذه الامة
بعضهم امراء علیٰ بعض . فیتقدم امیرهم
فیصلی، فاذا قضیٰ صلوٰته اخذ عیسیٰ
حربته فیذهب نحو الدجال فاذا یراه
الدجّال ذاب کما یذوب الرصاص فیضع
حربته بین ثندوته فیقتله وینهزم

عثمان بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے . . . .
اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام فجر کی نماز کے
وقت اتر آئیں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے
کہے گا کہ اے روح اللہ! آپ نماز پڑھائیے۔
وہ جواب دیں گے کہ اس امت کے لوگ خود ہی
ایک دوسرے پر امیر ہیں۔ تب مسلمانوں کا امیر آگے
بڑھ کر نماز پڑھائے گا۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر عیسیٰ
اپنا حربہ لے کر دجال کی طرف چلیں گے۔ وہ جب
ان کو دیکھے گا تو اس طرح پگھلے گا جیسے سیسہ پگھلتا ہے

اصحابه ليس يومئذ شئ يوارى منهم احدا حتىٰ ان الشجر ليقول يا مومن هٰذا كافر (مُسند احمد - طبرانی - حاکم)

عیسیٰ علیہ السلام اپنے حربے سے اس کو ہلاک کر دیں گے اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگیں گے مگر کہیں انہیں چھپنے کو جگہ نہ ملے گی، حتیٰ کہ درخت پکاریں گے اے مومن، یہ کافر یہاں موجود ہے۔

(۱۷) عن سمرة بن جُندُب عن النبی صلی اللہ علیه وسلّم (فی حدیث طویل) فیصبح فیهم عیسیٰ ابن مریم فیهزمه اللہ و جنوده حتیٰ ان اجذم الحائط واصل الشجر لینادی یا مومن هٰذا کافر یستتر بی فتعال اقتله - (مُسند احمد - حاکم)

سَمُرہ بن جُندُب (ایک طویل حدیث میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں: پھر صبح کے وقت مسلمانوں کے درمیان عیسیٰ ابن مریم آ جائیں گے اور اللہ دجّال اور اس کے لشکروں کو شکست دے گا یہاں تک کہ دیواریں اور درختوں کی جڑیں پکار اٹھیں گی کہ اے مومن، یہ کافر میرے پیچھے چھپا ہُوا ہے، آ اور اسے قتل کر۔

(۱۸) عن عمران بن حصین ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلّم قال لاتزال طائفة من اُمتی علی الحق ظاهرین علیٰ من ناوأهم حتیٰ یاتی امر اللہ تبارک وتعالیٰ وینزل عیسیٰ ابن مریم علیه السّلام -
(مُسند احمد)

عمران بن حُصَین سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: میری اُمت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا موجود رہے گا جو حق پر قائم اور مخالفین پر بھاری ہوگا یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فیصلہ آجائے اور عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السّلام نازل ہو جائیں۔

(۱۹) عن عائشةؓ (فی قصة الدجّال) فینزل عیسیٰ علیه السّلام فیقتله ثم یمکث عیسیٰ علیه السّلام فی الارض اربعین سنة اماماً عادلاً وحَکَماً مُقسِطاً -
(مُسند احمد)

حضرت عائشہؓ (دجّال کے قصّے میں) روایت کرتی ہیں: پھر عیسیٰ علیہ السّلام اُتریں گے اور دجّال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السّلام چالیس سال تک زمین میں ایک امامِ عادل اور حاکمِ منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔

(۲۰) عن سُفَینة مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلّم (فی قصّة الدجال) فینزل عیسیٰ علیه السّلام فیقتله اللہ تعالیٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے آزاد کردہ غلام سُفَینہ (دجّال کے قصّے میں) روایت کرتے ہیں: پھر عیسیٰ علیہ السّلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ

عند عقبة اَفیق (مُسند احمد)

(۲۱) عن حُذیفة (فی ذکر الدجّال) فلمّا قاموا یصلّون نزل عیسیٰ بن مریم اماٰمهم فصلّی بهم فلما انصرف قال هٰکذا افرجوا بینی وبین عدو الله ... ویسلط الله علیهم المسلمین فیقتلونهم حتّٰی ان الشجر والحجر لینادی یاعبدالله یاعبدالرحمٰن یامسلم هٰذا الیهودیّ فاقتلهم فیفنیهم الله تعالیٰ ویظهر المسلمون فیکسرون الصلیب ویقتلون الخنزیر ویضعون الجزیة (مستدرک حاکم۔ مسلم میں بھی یہ روایت اختصار کے ساتھ آئی ہے اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری جلد ۶ ص ۴۵۰ میں اسے صحیح قرار دیا ہے)۔

دجّال کو اَفیق[1] کی گھاٹی کے قریب ہلاک کردے گا۔

حضرت حُذیفہ بن یمان (دجّال کا ذکر کرتے ہوئے) بیان کرتے ہیں: "پھر جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہونگے تو اُن کی آنکھوں کے سامنے عیسیٰ ابن مریم اُتر آئیں گے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے پھر سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے کہیں گے کہ میرے اور اس دشمنِ خدا کے درمیان سے ہٹ جاؤ... ... اور اللہ دجّال کے ساتھیوں پر مسلمانوں کو مسلط کردے گا اور مسلمان انہیں خوب ماریں گے یہاں تک کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے اَے عبداللہ، اے عبدالرحمٰن، اَے مسلمان، یہ رہا ایک یہودی، مار اسے۔ اِس طرح اللہ ان کو فنا کردے گا اور مسلمان غالب ہوں گے اور صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے اور جزیہ ساقط کردیں گے۔

یہ جُملہ ۲۱ روایات ہیں جو ۱۴ صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے، لیکن طولِ کلام سے بچنے کے لیے ہم نے ان سب کو نقل نہیں کیا ہے بلکہ صرف وہ روایتیں لے لی ہیں جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں۔

اِن احادیث سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

جو شخص بھی اِن احادیث کو پڑھے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی "مسیح موعُود" یا "مثیلِ مسیح" یا "بُروزِ مسیح" کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ ان میں اِس امر کی کوئی گنجائش ہے کہ کوئی شخص اِس زمانے میں کسی ماں کے پیٹ

---

[1] اَفیق، جسے آج کل فیق کہتے ہیں، شام اور اسرائیل کی سرحد پر موجودہ ریاستِ شام کا آخری شہر ہے۔ اس کے آگے مغرب کی جانب چند میل کے فاصلہ پر طَبَریّہ نامی جھیل ہے جس میں سے دریائے اُرْدُن نکلتا ہے، اور اس کے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے درمیان ایک نشیبی راستہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ دو ہزار فیٹ تک گہرائی میں اُتر کر اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے دریائے اُرْدُن طَبَریّہ میں سے نکلتا ہے۔ اسی پہاڑی راستے کو عَقَبۂ اَفیق (اَفیق کی گھاٹی) کہتے ہیں۔ (مؤلف)

اور کسی باپ کے نطفے سے پیدا ہو کر یہ دعویٰ کر دے کہ میں ہی وہ مسیح ہوں جس کے آنے کی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں اُن عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں جو اب سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوتے تھے۔ اس مقام پر یہ بحث چھیڑنا بالکل لاحاصل ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں یا زندہ کہیں موجود ہیں۔ بالفرض وہ وفات ہی پا چکے ہوں تو اللہ انہیں زندہ کر کے اُٹھا لانے پر قادر ہے[1]۔ ورنہ یہ بات بھی اللہ کی قدرت سے ہرگز بعید نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو اپنی کائنات میں کہیں ہزارہا سال تک زندہ رکھے اور جب چاہے دنیا میں واپس لے آئے۔ بہر حال اگر کوئی شخص حدیث کو مانتا ہو تو اُسے یہ ماننا پڑے گا کہ آنے والے وہی عیسیٰ ابن مریمؑ ہوں گے۔ اور اگر کوئی شخص حدیث کو نہ مانتا ہو تو وہ سرے سے کسی آنے والے کی آمد کا قائل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ تو لے لیا جائے احادیث سے اور پھر انہی احادیث کی اِس تصریح کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ آنے والے عیسیٰ ابن مریمؑ ہوں گے نہ کہ کوئی مثیلِ مسیح۔

دوسری بات جو اتنی ہی وضاحت کے ساتھ ان احادیث سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا یہ دوبارہ نزول نبی مقرر ہو کر آنے والے شخص کی حیثیت سے نہیں ہو گا۔ نہ ان پر وحی نازل ہو گی، نہ وہ خدا کی طرف سے کوئی نیا پیغام یا نئے احکام لائیں گے، نہ وہ شریعتِ محمدی میں کوئی اضافہ یا کوئی کمی کریں گے، نہ ان کو تجدیدِ دین کے لیے دنیا میں لایا جائے گا، نہ وہ آکر لوگوں کو اپنے اُوپر ایمان لانے کی دعوت دیں گے، اور نہ وہ اپنے ماننے والوں کی ایک الگ اُمت بنائیں گے[2]۔ وہ صرف ایک کارِ خاص کے لیے بھیجے جائیں گے، اور وہ یہ ہو گا کہ

---

[1] جو لوگ اس بات کا انکار کرتے ہیں انہیں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۹ ملاحظہ فرمالینی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بندے کو ۱۰۰ برس تک مُردہ رکھا اور پھر زندہ کر دیا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ۔ (مؤلف)

[2] علمائے اسلام نے اس مسئلے کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ علامہ تفتازانی (۷۲۲ھ - ۷۹۲ھ) شرح عقائد نسفی میں لکھتے ہیں:

ثبت انہ آخر الانبیاء... فان قیل قد روی فی الحدیث نزول عیسیٰ علیہ السلام بعدہ، قلنا نعم لکنہ یتابع محمداً علیہ السلام لان شریعتہ قد نسخت فلا یکون الیہ وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفۃ رسول	یہ ثابت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں... اگر کہا جائے کہ آپ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر احادیث میں آیا ہے، تو ہم کہیں گے کہ ہاں آیا ہے، مگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے کیونکہ ان کی شریعت تو منسوخ ہو چکی ہے اس لیے نہ

دجّال کے فتنے کا استیصال کر دیں۔ اِس غرض کے لیے وہ ایسے طریقے سے نازل ہونگے کہ جن مسلمانوں کے درمیان اُن کا نزول ہوگا انہیں اس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ یہ عیسیٰ ابنِ مریم ہی ہیں جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیشنگوئیوں کے مطابق ٹھیک وقت پر تشریف لائے ہیں۔ وہ آکر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے، جو بھی مسلمانوں کا امام اُس وقت ہوگا اسی کے پیچھے نماز پڑھیں گے[1] اور جو بھی اس وقت مسلمانوں کا امیر ہوگا اسی کو آگے رکھیں گے، تاکہ اِس شبہ کی کوئی ادنیٰ سی

اللہ علیہ السلام (طبع مصر، ص ۱۳۵) | ان کی طرف وحی ہوگی اور نہ وہ احکام مقرر کریں گے، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نائب کی حیثیت سے کام کریں گے۔

اور یہی بات علامہ آلوسی تفسیر رُوح المعانی میں کہتے ہیں:

ثم انه علیه السلام حین ینزل باق علی نبوته السابقة لم یعزل عنها بحال لکنه لا یتعبد بها لنسخها فی حقه وحق غیره وتکلیفه باحکام هٰذه الشریعة اصلاً وفرعاً فلا یکون الیه علیه السلام وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفة لرسول اللہ صلی اللہ علیه وسلّم وحاکما من حکام ملته بین امته۔ (جلد ۲۲ ص ۳۲)

پھر عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو وہ اپنی سابق نبوت پر باقی ہوں گے، بہر حال اُس سے معزول تو نہ ہو جائیں گے، مگر وہ اپنی پچھلی شریعت کے پیرو نہ ہوں گے کیونکہ وہ ان کے اور دوسرے سب لوگوں کے حق میں منسوخ ہو چکی ہے اور اب وہ اصُول اور فروع میں اِس شریعت کی پیروی پر مکلّف ہونگے، لہٰذا اُن پر نہ اب وحی آئیگی اور نہ اُنہیں احکام مقرر کرنے کا اختیار رہوگا، بلکہ وہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نائب اور آپ کی اُمّت میں ملّتِ محمدؐیہ کے حاکموں میں سے ایک حاکم کی حیثیت سے کام کریں گے۔

امام رازیؒ اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

انتهاء الانبیاء الی مبعث محمد صلی اللہ علیه وسلّم فعند مبعثه انتهت تلك المدة فلا یبعد ان یصیر(ا) ای عیسی ابن مریم بعد نزوله تبعاً لمحمدؐ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۳۴۳)

انبیاء کا دَور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت تک تھا جب آپ مبعوث ہو گئے تو انبیاء کی آمد کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ نازل ہونے کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے تابع ہونگے۔

[1] اگرچہ دو روایتوں (نمبر ۵ و ۲۱) میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد پہلی نماز خود پڑھائیں گے، لیکن بیشتر اور قوی تر روایات (نمبر ۳-۷-۹-۱۵-۱۶) یہی کہتی ہیں کہ وہ نماز میں امامت کرانے سے انکار کریں گے اور جو اس وقت مسلمانوں کا امام ہوگا اسی کو آگے بڑھائیں گے۔ اسی بات کو محدّثین اور مفسّرین نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔

گنجائش بھی نہ رہے کہ وہ اپنی سابق پیغمبرانہ حیثیت کی طرح اب پھر پیغمبری کے فرائض انجام دینے کے لیے واپس آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی جماعت میں اگر خدا کا پیغمبر موجود ہو تو نہ اس کا کوئی امام دوسرا شخص ہو سکتا ہے اور نہ امیر۔ پس جب وہ مسلمانوں کی جماعت میں آکر محض ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہوں گے تو یہ گویا خود بخود اس امر کا اعلان ہوگا کہ وہ پیغمبر کی حیثیت سے تشریف نہیں لائے ہیں، اور اس بنا پر ان کی آمد سے مُہرِ نبوّت کے ٹوٹنے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔

اُن کا آنا بلاتشبیہ اُسی نوعیّت کا ہوگا جیسے ایک صدرِ ریاست کے دَور میں کوئی سابق صدر آئے اور وقت کے صدر کی ماتحتی میں مملکت کی کوئی خدمت انجام دے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ بات بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک صدر کے دَور میں کسی سابق صدر کے محض آجانے سے آئین نہیں ٹوٹتا۔ البتہ دو صورتوں میں آئین کی خلاف ورزی لازم آتی ہے۔ ایک یہ کہ سابق صدر آکر پھر سے فرائض صدارت سنبھالنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص اس کی سابق صدارت کا بھی انکار کر دے، کیونکہ یہ اُن تمام کاموں کے جواز کو چیلنج کرنے کا ہم معنی ہوگا جو اس کے دَورِ صدارت میں انجام پائے تھے۔ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی نہ ہو تو بجائے خود سابق صدر کی آمد آئینی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ یہی معاملہ حضرت عیسیٰؑ کی آمدِ ثانی کا بھی ہے کہ ان کے محض آجانے سے ختمِ نبوّت نہیں ٹوٹتی۔ البتہ اگر وہ آکر پھر نبوّت کا منصب سنبھال لیں اور فرائضِ نبوّت انجام دینے شروع کر دیں، یا کوئی شخص اِن کی سابق نبوّت کا بھی انکار کر دے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے آئینِ نبوّت کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ احادیث نے پوری وضاحت کے ساتھ دونوں صُورتوں کا سدِّباب کر دیا ہے۔ ایک طرف وہ تصریح کرتی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبوّت نہیں ہے۔ اور دوسری طرف وہ خبر دیتی ہیں کہ عیسیٰ ابن مریمؑ دوبارہ نازل ہوں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کی یہ آمدِ ثانی منصبِ نبوّت کے فرائض انجام دینے کے لیے نہ ہوگی۔

اسی طرح ان کی آمد سے مسلمانوں کے اندر کفر و ایمان کا بھی کوئی نیا سوال پیدا نہ ہوگا۔ اُن کی سابقہ نبوّت پر تو آج بھی اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کافر ہو جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم خود ان کی اُس نبوّت پر ایمان رکھتے تھے اور آپ کی ساری اُمّت ابتدا سے اُن کی مومن ہے۔ یہی حیثیت اُس وقت بھی ہوگی۔ مسلمان کسی تازہ نبوّت پر ایمان نہ لائیں گے بلکہ عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السّلام کی سابقہ نبوّت ہی پر ایمان رکھیں گے جس طرح آج رکھتے ہیں۔ یہ چیز نہ آج ختمِ نبوّت کے خلاف ہے نہ اُس وقت ہوگی۔

آخری بات جو اِن احادیث سے، اور بکثرت دوسری احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دجّال، جس کے فتنۂ عظیم کا استیصال کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السّلام کو بھیجا جائے گا، یہودیوں میں سے ہوگا اور اپنے آپ کو "مسیح" کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ اس معاملے کی حقیقت کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ

یہودیوں کی تاریخ اور ان کے مذہبی تصوّرات سے واقف نہ ہو۔ حضرت سُلیمان علیہ السّلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل پے درپے تنزُّل کی حالت میں مبتلا ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخر کار بابل اور آسیریا کی سلطنتوں نے ان کو غلام بنا کر زمین میں تِتّر بِتّر کر دیا، تو انبیائے بنی اسرائیل نے ان کو خوشخبری دینی شروع کی کہ خدا کی طرف سے ایک "مسیح" آنے والا ہے جو ان کو اِس ذلّت سے نجات دلائے گا۔ ان پیشین گوئیوں کی بنا پر یہودی ایک ایسے مسیح کی آمد کے متوقع تھے جو بادشاہ ہو، لڑ کر ملک فتح کرے، بنی اسرائیل کو ملک ملک سے لاکر فلسطین میں جمع کر دے، اور ان کی ایک زبردست سلطنت قائم کر دے۔ لیکن ان کی اِن توقعات کے خلاف جب حضرت عیسٰی ابن مریم علیہ السّلام خدا کی طرف سے مسیح ہو کر آئے اور کوئی لشکر ساتھ نہ لائے تو یہودیوں نے ان کی مسیحیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں ہلاک کرنے کے درپے ہو گئے۔ اُس وقت سے آج تک دنیا بھر کے یہودی اُس مسیحِ موعود (Promised Messiah) کے منتظر ہیں جس کے آنے کی خوشخبریاں ان کو دی گئی تھیں۔ اُن کا لٹریچر اُس آنے والے دَور کے سُہانے خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔ تلمود اور ربّیوں کے ادبیات میں اُس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اُس کی خیالی لذّت کے سہارے صدیوں سے یہودی جی رہے ہیں اور یہ اُمید لیے بیٹھے ہیں کہ یہ مسیحِ موعود ایک زبردست جنگی و سیاسی لیڈر ہوگا جو دریائے نیل سے دریائے فرات تک کا علاقہ (جسے یہودی اپنی میراث کا ملک سمجھتے ہیں) انہیں واپس دلائے گا، اور دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لاکر اس ملک میں پھر سے جمع کر دے گا۔

اب اگر کوئی شخص مشرقِ وُسطیٰ کے حالات پر ایک نگاہ ڈالے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیشینگوئیوں کے پس منظر میں اُن کو دیکھے تو وہ فوراً یہ محسوس کرے گا کہ اُس دجّالِ اکبر کے ظہُور کے لیے اسٹیج بالکل تیار ہو چکا ہے جو حضُور کی دی ہوئی خبروں کے مطابق یہودیوں کا "مسیحِ موعُود" بن کر اُٹھے گا۔ فلسطین کے بڑے حصّے سے مسلمان بے دخل کیے جا چکے ہیں اور وہاں اسرائیل کے نام سے ایک یہودی ریاست قائم کر دی گئی ہے۔ اس ریاست میں دنیا بھر کے یہودی کھِچ کھِچ کر چلے آ رہے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اس کو ایک زبردست جنگی طاقت بنا دیا ہے۔ یہودی سرمایے کی بے پایاں امداد سے یہودی سائنس داں اور ماہرینِ فنون اُس کو روز افزوں ترقی دیتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اُس کی یہ طاقت گرد و پیش کی مسلمان قوموں کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن گئی ہے۔ اس ریاست کے لیڈروں نے اپنی اس تمنا کو کچھ چھپا کر نہیں رکھا ہے کہ وہ اپنی "میراث کا ملک" حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مستقبل کی یہودی سلطنت کا جو نقشہ وہ ایک مدّت سے کھلّم کھلا شائع کر رہے ہیں اُسے مقابل کے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پُورا شام، پُورا لبنان، پُورا اردُن اور تقریباً سارا عراق لینے کے علاوہ ٹرکی سے اسکندرون، مصر سے سینا اور ڈیلٹا کا علاقہ اور سعُودی عرب سے بالائی حجاز و نجد کا علاقہ لینا چاہتے ہیں جس میں مدینۂ منوّرہ بھی شامل ہے۔ اِن

وہ یہودی ریاست جس کا خواب اسرائیل کے لیڈر دیکھ رہے ہیں:-

تحقیقی مسیحؑ کے نزول کا مقام
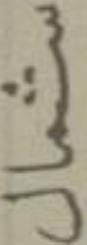
شمال
مغرب
مشرق
جنوب
دمشق
لبنان
شام
یہودی ریاست
جھیل طبریہ
اُفیق
دریائے اُردُن
بحر ابیض
تَلِّ اَبِیب
لُد
بَیتُ المقدس
فلسطین کا وہ حصہ جو ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے عربوں کے قبضہ میں تھا اور جس پر اب یہودی قابض ہیں۔
بحرِ لُوط یا بحرِ مُردار
اُردُن
مِصر

۵۰ پیمانہ بحساب میل ۰
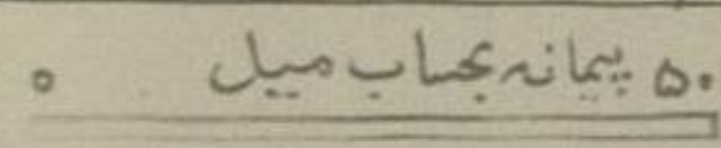
حالات کو دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ کسی عالمگیر جنگ کی ہڑلونگ سے فائدہ اٹھا کر وہ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے اور ٹھیک اُس موقع پر وہ دجالِ اکبر اُن کا مسیح موعود بن کر اُٹھے گا جس کے ظہور کی خبر دینے ہی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اکتفا نہیں فرمایا ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اُس زمانے میں مسلمانوں پر مصائب کے ایسے پہاڑ ٹوٹیں گے کہ ایک دن ایک سال کے برابر محسوس ہوگا۔ اسی بنا پر آپ فتنۂ مسیحِ دجال سے خود بھی خدا کی پناہ مانگتے تھے اور اپنی اُمت کو بھی پناہ مانگنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اِس مسیحِ دجّال کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی مثیلِ مسیحؑ کو نہیں بلکہ اُس اصلی مسیحؑ کو نازل فرمائے گا جسے دو ہزار برس پہلے یہودیوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا اور جسے وہ اپنی دانست میں صلیب پر چڑھا کر ٹھکانے لگا چکے تھے۔ اِس حقیقی مسیحؑ کے نزول کی جگہ ہندوستان یا افریقہ یا امریکہ میں نہیں بلکہ دمشق میں ہوگی کیونکہ یہی مقام اُس وقت عین محاذِ جنگ پر ہوگا۔ براہِ کرم دوسرے صفحے پر نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اسرائیل کی سرحد سے دمشق بمشکل ۵۰-۶۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلے جو احادیث ہم نقل کر آئے ہیں ان کا مضمون اگر آپ کو یاد ہے تو آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہ ہوگی کہ مسیحِ دجال ۷۰ ہزار یہودیوں کا لشکر لے کر شام میں گھسے گا، اور دمشق کے سامنے جا پہنچے گا۔ ٹھیک اُس نازک موقع پر دمشق کے مشرقی حصے میں ایک سفید مینار کے قریب حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام صبحدم نازل ہوں گے اور نمازِ فجر کے بعد مسلمانوں کو اس کے مقابلے پر لے کر نکلیں گے۔ اُن کے حملے سے دجّال پسپا ہو کر افیق کی گھاٹی سے (ملاحظہ ہو حدیث نمبر ۲۱) اسرائیل کی طرف پلٹے گا اور وہ اس کا تعاقب کریں گے۔ آخر کار لُدّ کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر وہ اُن کے ہاتھ سے مارا جائے گا (حدیث نمبر ۱۰-۱۴-۱۵)۔ اس کے بعد یہودی چُن چُن کر قتل کیے جائیں گے اور ملتِ یہود کا خاتمہ ہو جائے گا (حدیث نمبر ۹-۱۵-۲۱)۔ عیسائیت بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے اظہارِ حقیقت ہو جانے کے بعد ختم ہو جائے گی (حدیث نمبر ۱-۲-۴-۶) اور تمام ملّتیں ایک ہی ملتِ مسلمہ میں ضم ہو جائیں گی (حدیث نمبر ۶-۱۵)

یہ ہے وہ حقیقت جو کسی اشتباہ کے بغیر احادیث میں صاف نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اس امر میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ "مسیح موعود" کے نام سے جو کاروبار ہمارے ملک میں پھیلایا گیا ہے وہ ایک جعل سازی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

اس جعل سازی کا سب سے زیادہ مضحکہ انگیز پہلو یہ ہے کہ جو صاحب اپنے آپ کو ان پیش گوئیوں کا مصداق قرار دیتے ہیں انہوں نے خود عیسیٰ ابنِ مریمؑ بننے کے لیے یہ دلچسپ تاویل فرمائی ہے:

"اُس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) براہینِ احمدیہ کے تیسرے حصے میں میرا نام مریم رکھا۔ پھر جیسا کہ براہینِ احمدیہ سے ظاہر ہے، دو برس تک صفتِ مریمیت میں مَیں نے پرورش پائی . . . . پھر . . . . مریمؑ کی طرح عیسیٰ کی

روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھیرایا گیا، اور آخر کئی مہینے کے بعد، جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اُس الہام کے جو سب سے آخر براہینِ احمدیہ کے حصّہ چہارم میں درج ہے، مجھے مریمؑ سے عیسٰیؑ بنایا گیا۔ پس اِس طور سے مَیں ابنِ مریم ٹھیرا۔" (کشتی نوح، ص ۸۷-۸۸-۸۹)

یعنی پہلے مریم بنے، پھر خود ہی حاملہ ہوئے، پھر اپنے پیٹ سے آپ عیسٰی ابن مریم بن کر تولّد ہو گئے! اس کے بعد یہ مشکل پیش آئی کہ عیسٰی ابن مریمؑ کا نزول تو احادیث کی رُو سے دمشق میں ہونا تھا جو کئی ہزار برس سے شام کا ایک مشہور و معروف مقام ہے اور آج بھی دنیا کے نقشے پر اسی نام سے موجود ہے۔ یہ مشکل ایک دوسری پر لطف تاویل سے یُوں رفع کی گئی:

"واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر منجانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبے کا نام دمشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کی عادات اور خیالات کے پیرو ہیں . . . . یہ قصبہ قادیان بوجہ اس کے کہ اکثر یزیدی الطبع لوگ اس میں سکونت رکھتے ہیں دمشق سے ایک مشابہت اور مناسبت رکھتا ہے"۔ (حاشیۂ ازالۂ اوہام ص ۶۳ تا ۷۳)

پھر ایک اور اُلجھن یہ باقی رہ گئی کہ احادیث کی رُو سے ابنِ مریمؑ کو ایک سفید منارہ کے پاس اُترنا تھا چنانچہ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ مسیح صاحب نے آکر اپنا منارہ خود بنوا لیا۔ اب اسے کون دیکھتا ہے کہ احادیث کی رُو سے منارہ وہاں ابنِ مریمؑ کے نُزول سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا، اور یہاں وہ مسیح موعود صاحب کی تشریف آوری کے بعد تعمیر کیا گیا۔

آخری اور زبردست اُلجھن یہ تھی کہ احادیث کی رُو سے تو عیسٰی ابنِ مریمؑ کو لُد کے دروازے پر دجّال کو قتل کرنا تھا۔ اِس مُشکل کو رفع کرنے کی فکر میں پہلے طرح طرح کی تاویلیں کی گئیں۔ کبھی تسلیم کیا گیا کہ لُد بیتُ المَقدس کے دیہات میں سے ایک گاؤں کا نام ہے (ازالۂ اوہام، شائع کردہ انجمن احمدیہ لاہور، تقطیعِ خورد صفحہ ۲۲۰) پھر کہا گیا کہ لُد اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو بے جا جھگڑا کرنے والے ہوں . . . جب دجّال کے بیجا جھگڑے کمال تک پہنچ جائیں گے تب مسیح موعود ظہور کرے گا اور اس کے تمام جھگڑوں کا خاتمہ کر دے گا" (ازالۂ اوہام صفحہ ۷۳۰)۔ لیکن جب اس سے بھی بات نہ بنی تو صاف کہہ دیا گیا کہ لُد سے مراد لدھیانہ ہے اور اس کے دروازے پر دجّال کے قتل سے مُراد یہ ہے کہ اشرار کی مخالفت کے باوجود وہیں سب سے پہلے مرزا صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ (الہُدیٰ ص ۹۱)

اِن تاویلات کو جو شخص بھی کھلی آنکھوں سے دیکھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹے بہروپ (False Impersonation) کا صریح ارتکاب ہے جو علی الاعلان کیا گیا ہے۔

فصل ۴

قادیانیوں کی مزید تاویلاتِ باطلہ

صریح نصوص سے گریز

جب کسی مسئلے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے بالکل صاف اور صریح نصوص میں کر دیا ہو تو پھر اُسی سلسلے میں اُن نصوص کو چھوڑ کر دوسری آیات واحادیث سے، جو دراصل اُس خاص مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے وارد نہیں ہوئی ہیں۔ اپنے مطلب کے معنی نکالنا اور نصوصِ قطعیہ کے بالکل خلاف عقیدہ یا عمل اختیار کر لینا درحقیقت انتہائی گمراہی بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بدترین بغاوت ہے۔ جو شخص علانیہ اللہ اور اس کے فرمان کے خلاف کوئی مسلک اختیار کرتا ہے وہ تو کم تر درجے کی بغاوت کرتا ہے۔ مگر یہ بہت بڑے درجے کی بغاوت ہے کہ آدمی اللہ اور رسول کے فیصلے کے خلاف خود اللہ اور رسول ہی کے ارشادات کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے لگے۔ یہ کام جو لوگ کرتے ہیں اُن کے متعلق ہم کسی طرح بھی یہ فرض نہیں کر سکتے کہ وہ سچے دل سے اللہ اور اُس کے رسول کو مانتے ہیں۔ یہ سوال کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم آخری نبی ہیں یا نہیں؟ اور آپؐ کے بعد کوئی نبی آسکتا ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم آیت وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ (النساء: ۶۹) اور آیت یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ۔ (اعراف۔ ۳۵) اور ایسی ہی دوسری آیتوں کی طرف صرف اُس صورت میں رجوع کر سکتے تھے جب کہ اللہ اور اُس کے رسول نے خاص طور پر اسی سوال کا جواب کسی خاص نص میں نہ دے دیا ہوتا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت خاتم النبیّین میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے بکثرت احادیثِ صحیحہ میں ہم کو خاص طور پر اسی سوال کا واضح جواب مل چکا ہے تو آیت وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ اور یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اور ایسی ہی دوسری آیات کی طرف رجوع کرنا، اور پھر اُن سے نصوصِ قطعیہ صریحہ کے خلاف مطالب نکالنا صرف اُس شخص کا کام ہو سکتا ہے جو خدا سے بالکل بے خوف ہو چکا ہو اور جسے یہ بھی یقین نہ ہو کہ کبھی مر کر خدا کے سامنے جواب دہی بھی کرنی ہوگی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تعزیراتِ پاکستان کی ایک خاص دفعہ میں ایک فعل کو بالفاظِ صریح جُرم قرار دیا گیا ہو۔ اور کوئی شخص اُس دفعہ کو چھوڑ کر قانون کی دوسری غیر متعلق دفعات کا جائزہ اِس غرض کے لیے لیتا پھرے کہ کہیں سے کوئی اشارہ اور کہیں سے کوئی نکتہ نکال کر اور پھر اُنہیں جوڑ جاڑ کر اُسی فعل کو جائز ثابت کر دے جسے قانون کی ایک صریح دفعہ جُرم قرار دے رہی ہے۔ اِس طرح

کا استدلال اگر دُنیا کی پولیس اور عدالت کے سامنے نہیں چل سکتا، تو آخر یہ خدا کے ہاں کیسے چل جائے گا؟

زبردستی کا استدلال

پھر جن آیات سے قادیانی استدلال کرتے ہیں بجائے خود ان کو پڑھ کر دیکھا جائے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ان میں سے وہ مضمون آخر کہاں نکلتا ہے جو یہ لوگ زبردستی اُن سے نچوڑنا چاہتے ہیں جن مختلف آیات کو یہ لوگ تختۂ مشق بناتے ہیں، ان کے صحیح مفہوم پر غور کرنا ضروری ہے:-

آیت مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ (النساء-۶۹) میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے انبیاء و صدیقین اور شہداء و صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ اس سے یہ مضمون کیسے نکل آیا کہ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ یا تو نبی ہو جائیں گے یا صدیق یا شہید یا صالح؟ پھر ذرا سورۂ حدید کی آیت ۱۹ ملاحظہ فرمائیے۔ اِس میں ارشاد ہوا ہے کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۔ "اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولوں پر وہی صدیقین اور شہداء ہیں اپنے رب کے نزدیک"۔ اِس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ایمان کے نتیجے میں جو دولت کسی کو مل سکتی ہے وہ صرف صدیق اور شہید ہو جانے کی ہے۔ رہے انبیاء تو اُن کی معیت نصیب ہو جانا ہی اہلِ ایمان کے لیے کافی ہے کسی عمل کے انعام میں کسی شخص کا نبی ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اسی بنا پر سورۂ نساء کی آیت میں فرمایا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے انبیاء اور صدیقین و شہداء کے ساتھ ہوں گے۔ اور سورۂ حدید کی آیت میں فرمایا کہ اللہ اور رسول پر ایمان لانے والے خود صدیق اور شہداء بن جائیں گے۔

رہی آیت یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ الخ (اعراف-۳۵) تو وہ ایک سلسلۂ بیان سے تعلق رکھتی ہے جو سورۂ اعراف میں آیت ۱۱ سے ۳۶ تک مسلسل چل رہا ہے۔ اِس سیاق و سباق میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی آدم سے یہ خطاب آغازِ تخلیقِ انسانی میں کیا گیا تھا اِس کو پڑھ کر یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ ان آیات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کے آنے کا ذکر ہے۔ اِس میں تو اس وقت کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے جب حضرت آدمؑ اور اُن کی بیوی کو جنت سے نکال کر زمین پر لایا گیا تھا۔ ۹۹ھ

سورۂ اعراف کی آیت کا صحیح مفہوم

سورۂ اعراف کی آیت ۳۵ کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے جو نتیجہ قادیانی حضرات نکالتے ہیں وہ اس نتیجے کے برعکس ہے جو سلسلۂ کلام میں اسے رکھ کر دیکھنے سے نکلتا ہے۔ دراصل یہ آیت جس سلسلۂ کلام میں وارد ہوئی ہے وہ سورۂ اعراف کے رکوع دوم سے رکوع چہارم کے وسط تک مسلسل بیان ہوا ہے۔ پہلے رکوع دوم میں آدمؑ و حواؑ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر رکوع سوم و چہارم میں اُن نتائج پر تبصرہ کیا گیا ہے جو اس قصے سے نکلتے ہیں! اس

سیاق و سباق کو ذہن میں رکھ کر آیت ۳۵ کو پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ" کے الفاظ سے مخاطب کر کے جو بات کہی گئی ہے اس کا تعلق آغازِ آفرینش کے وقت سے ہے نہ کہ نزولِ قرآن کے وقت سے۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ آغازِ آفرینش ہی میں اولادِ آدمؑ کو اس بات پر متنبہ کر دیا گیا تھا کہ تمہاری نجات اس ہدایت کی پیروی پر موقوف ہے جو خدا کی طرف سے تم کو بھیجی جائے۔

اِس مضمون کی آیات قرآن میں تین مقامات پر آئی ہیں اور تینوں مقامات پر قصۂ آدمؑ و حوّاؑ کے سلسلے ہی میں اس کو وارد کیا گیا ہے۔ پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے (آیت نمبر ۳۸)۔ دوسری آیت سورۂ اعراف میں ہے (آیت ۳۵) اور تیسری آیت سورۂ طٰہٰ میں ہے (آیت ۱۲۳)۔ اِن تینوں آیتوں کا مضمون بھی باہم مشابہ ہے اور موقع و محل بھی مشابہ۔

مُفسّرینِ قرآن بھی دوسری آیتوں کی طرح سورۂ اعراف کی اِس آیت کو قصّۂ آدمؑ و حوّاؑ ہی سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ضمن میں حضرت ابو سیّار السُّلمی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت آدمؑ اور ان کی ذُرّیت کو یکجا اور ایک ہی وقت میں خطاب کیا ہے"۔ امام رازیؒ اپنی تفسیر کبیر میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اگر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف ہو، حالانکہ وہ خاتم الانبیاء ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ یہاں اُمتوں کے بارے میں اپنی سُنّت بیان فرما رہا ہے"۔ علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر رُوح المعانی میں فرماتے ہیں کہ "یہاں ہر قوم کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہے اُسے حکایۃً بیان کیا جا رہا ہے۔ یہاں بنی آدم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمّت مُراد لینا مستبعد اور ظاہر کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہاں جمع کا لفظ "رُسُل" استعمال ہوا ہے"۔ علامہ آلوسیؒ کے ارشاد کے آخری حصّے کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں اُمّتِ محمدیہ سے خطاب ہو تو پھر اس اُمّت کو یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ "کبھی تم میں رُسُل آئیں"۔ کیوں کہ اِس اُمّت میں ایک رسُول (محمد صلی اللہ علیہ وسلّم) کے سوا مزید رسُولوں کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سُورۂ مومنون کی آیت کا مفہوم

آیت یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ (مومنون - ۵۱)، کو بھی اگر اس کے سیاق و سباق سے الگ نہ کیا جائے تو اس سے وہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا جو قادیانی حضرات نے نکالا ہے۔ یہ آیت جس سلسلۂ کلام میں وارد ہوئی ہے وہ رکوع دوم سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ اس میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ بن مریمؑ تک مختلف زمانوں کے انبیاء علیہم السّلام اور ان کی قوموں کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں انبیاء ایک ہی تعلیم دیتے رہے ہیں، ایک ہی ان سب کا طریقہ رہا ہے، اور ایک ہی طرح سے ان سب پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوتا رہا ہے۔ اس کے برعکس گمراہ قومیں ہمیشہ خدا کے رستے کو چھوڑ کر غلط کاری میں مبتلا ہوتی رہی ہیں۔ اِس سلسلۂ بیان میں یہ آیت اس معنی میں نہیں آئی ہے کہ "اے رسُولو! جو

محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد آنے والے ہو، تم پاک رزق کھاؤ اور نیک عمل کرو"۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن تمام رسُولوں کو، جو نوح علیہ السّلام کے وقت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم تک آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہی ہدایت فرمائی تھی کہ پاک رزق کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

اِس آیت سے بھی مفسّرینِ قرآن نے کبھی یہ مطلب نہیں لیا کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد انبیاء کی آمد کا دروازہ کھولتی ہے۔ اگر کوئی مزید تحقیق و اطمینان کرنا چاہے تو مختلف تفسیروں میں اِس مقام کو دیکھ سکتا ہے۔

احادیث سے قادیانیوں کا غلط اِستدلال

حدیث لَوْ عَاشَ اِبْرَاھِیْمُ لَکَانَ نَبِیًّا (اگر ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلّم زندہ رہتے تو نبی ہوتے) سے قادیانی حضرات جو استدلال کرتے ہیں وہ چار وجوہ سے غلط ہے۔

اوّل یہ کہ جس روایت میں اسے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے قول کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے اس کی سند ضعیف ہے اور محدّثین میں سے کسی نے بھی اس کو قوی تسلیم نہیں کیا ہے۔

دوم یہ کہ نَوَوِیؒ اور ابنِ عبدالبرّؒ جیسے اکابر محدّثین اس مضمون کو بالکل ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں۔ امام نَوَوِیؒ اپنی کتاب "تہذیب الاسماء واللغات" میں لکھتے ہیں:

اما ماروی عن بعض المتقدمین "لو عاش ابراھیم لکان نبیًّا فباطل وجسارۃ علی الکلام علی المغیبات ومجازفۃ وھجومٌ علیٰ عظیمٍ۔

"رہی وہ بات جو بعض متقدمین سے منقول ہے کہ اگر ابراہیم زندہ ہوتے تو نبی ہوتے، تو وہ باطل ہے اور غیب کی باتوں پر کلام کرنے کی بے جا جسارت ہے اور بے سوچے سمجھے ایک بڑی بات منہ سے نکال دینا ہے۔"

اور علّامہ ابنِ عبدالبرؒ "تمہید" میں لکھتے ہیں:

لا ادری ماھٰذا فقد ولد نوح علیہ السلام غیرنبی ولولم یلد النبی الانبیاء لکان کل احد نبیًّا لانھم من نوحٍ علیہ السلام۔

"میں نہیں جانتا کہ یہ کیا مضمون ہے۔ نوح علیہ السلام کے ہاں غیر نبی اولاد ہو چکی ہے۔ حالانکہ اگر نبی کا بیٹا نبی ہی ہونا ضروری ہوتا تو آج سب نبی ہوتے کیونکہ سب کے سب نوح علیہ السّلام کی اولاد ہیں۔"

سوم یہ کہ اکثر روایات میں اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بجائے بعض صحابیوں کے قول کی حیثیت سے نقل کیا گیا ہے اور وہ اس کے ساتھ یہ تصریح بھی کر دیتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد چونکہ کوئی نبی نہیں اِس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے صاحبزادے کو اُٹھا لیا۔ مثال کے طور پر بخاری کی روایت یہ ہے:

عن اسمٰعیل بن ابی خالد قال قلت

اسماعیل بن ابی خالد کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ

لعبد اللہ بن ابی اوفیٰ ارأیتَ ابراھیم ابن النبی صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال مات صغیراً ولو قضیَ ان یکون بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبیٌّ عاش ابنہٗ ولکن لانبی بعدہٗ - (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب من سمی باسماء الانبیاء)

بن ابی اوفیٰ (صحابی) سے پوچھا کہ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم کو دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو تو آپؐ کا صاحبزادہ زندہ رہتا مگر حضورؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہے۔"

اسی سے ملتی جلتی روایت حضرت انسؓ سے بھی منقول ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

ولو بقی لکان نبیاً لکن لم یبق لان نبیکم اٰخر الانبیاء۔ (تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۲ صفحہ ۳۱)

"اگر وہ زندہ رہ جاتے تو نبی ہوتے مگر وہ زندہ نہ رہے کیونکہ تمہارے نبی آخری نبی ہیں۔"

چہارم یہ کہ اگر بالفرض صحابہ کرام کی یہ تصریحات بھی نہ ہوتیں، اور محدثین کے اقوال بھی موجود نہ ہوتے جن میں اس روایت کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے منقول ہوئی ہے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار قرار دیا گیا ہے، تب بھی وہ کسی طرح قابلِ قبول نہ ہوتی۔ کیونکہ یہ بات علمِ حدیث کے مُسلّمہ اُصولوں میں سے ہے کہ اگر کسی ایک روایت سے کوئی ایسا مضمون نکلتا ہو جو بکثرت صحیح احادیث کے خلاف پڑتا ہو تو اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اب ایک طرف وہ کثیر التعداد صحیح اور قوی السند احادیث ہیں جن میں صاف صاف تصریح کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اور دوسری طرف یہ اکیلی روایت ہے جو بابِ نبوت کے کھلے ہونے کا امکان ظاہر کرتی ہے۔ آخر کس طرح جائز ہے کہ اس ایک روایت کے مقابلے میں ان سب روایتوں کو ساقط کر دیا جائے۔ انتہیٰ

خاتمۂ کلام

قرآنِ مجید اور حدیث، دونوں کی رُو سے نبوت کا معاملہ دین میں اساسی حیثیت رکھتا ہے یعنی اس پر آدمی کے کفر و ایمان کا مدار اور آخرت میں اس کی فلاح و خُسران کا انحصار ہے۔ اگر آدمی ایک سچے نبی کو نہ مانے تو کافر، اور جھوٹے نبی کو مان لے تو کافر۔ اس طرح کی اہمیت اور نزاکت رکھنے والے کسی معاملے کو بھی اللہ اور اس کے رسُول نے مُبہم اور پیچیدہ اور مشکوک نہیں رکھا ہے، بلکہ صاف اور واضح طریقہ سے رہنمائی دی ہے تاکہ انسان کا دین و ایمان خطرے میں نہ پڑے اور اُس کے گمراہ ہونے کی ذمہ داری اللہ اور اُس کے رسُول پر نہ عائد ہو۔ اب دیکھیے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کبھی کسی نبی کے زمانہ میں یہ نہیں کہا گیا کہ نبوّت کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ انبیاء کی آمد کا دروازہ اُس وقت کھلا ہوا تھا، کوئی شخص اس بنیاد پر کسی مدعیٔ نبوت

کا انکار کر دینے میں حق بجانب نہ تھا کہ اب کسی نبی کے آنے کا امکان ہی نہیں ہے۔ پھر اُس زمانے میں انبیاء علیہم السلام اپنے بعد آنے والے نبیوں کی آمد کے لیے پیش گوئی بھی کرتے رہتے تھے اور اپنے پیروؤں سے عہد لیتے تھے کہ بعد میں جو نبی آئیں ان کی بھی وہ پیروی کریں گے۔ یہ چیز اور بھی اس بات کو مؤکد کر دیتی تھی کہ جو شخص نبی کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرے اُسے بلا تأمل رَدّ نہ کر دیا جائے بلکہ اس کی دعوت اور شخصیت اور اس کے کام اور احوال کو بنظرِ غائر دیکھ کر جاننے کی کوشش کی جائے کہ آیا وہ واقعی نبی ہے یا جھوٹا مدّعی نبوّت ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی آمد کے بعد یہ معاملہ بالکل اُلٹ ہو گیا۔ اب صرف یہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے کسی نبی کی آمد کی پیش گوئی نہیں کی اور نہ اپنی اُمّت سے اس کے اتّباع کا عہد لیا، بلکہ اس کے برعکس قرآن میں اعلان کیا گیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم خاتم النبیّین ہیں۔ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے ایک دو نہیں بلکہ متعدد حدیثیں نہایت واضح اور غیر مُبہم الفاظ میں بکثرت مُستند و مُعتبر واسطوں سے اُمّت کو ملیں کہ اب نبوّت کا دروازہ بند ہے، اب کوئی نبی آنے والا نہیں، اب جو مدّعی نبوّت اُٹھیں گے وہ دجّال ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول کی نگاہ میں لوگوں کے کفر و ایمان کا معاملہ نازک اور اہم نہیں رہا؟ کیا حضورؐ سے پہلے ہی کے مومنین اس کے مستحق تھے کہ اُنہیں کفر کے خطرے میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسوؐل واضح طور پر بابِ نبوّت کے مفتوح ہونے اور انبیاء کی آمد کے متعلق خبریں دینے کا اہتمام فرماتے رہے، مگر اب ہمیں انہوں نے جان بُوجھ کر اس خطرے میں مبتلا کیا ہے کہ ایک طرف تو نبی کے آنے کا امکان بھی ہو جس کے ماننے یا نہ ماننے پر ہمارے کافر یا مومن ہونے کا انحصار ہے، اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسولؐ نے صرف اتنے پر ہی اکتفا نہ کیا ہو کہ ہمیں اس کی آمد سے آگاہ نہ کیا، بلکہ اس سے گزر کر پے در پے وہ ایسی باتیں ارشاد فرماتے چلے گئے جن کی بنا پر ہم بابِ نبوّت کو بند سمجھیں اور ہر مدّعی نبوّت کو ماننے سے انکار کر دیں؟ کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ اللہ اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلّم واقعی ہم سے ایسی دھوکہ بازی کر سکتے ہیں؟

خاتم النبیّین کے معنی کی جو تاویل بھی قادیانی چاہیں کرتے رہیں، مگر کم از کم ایک بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے معنی سلسلۂ نبوّت کو ختم کرنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اُمّت کے ننانوے لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے فی کروڑ علماء اور عوام اس کے یہی معنی لیتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نبوّت جیسے نازک معاملے میں جس پر مسلمانوں کے کفر و ایمان کا مدار ہے کیا اللہ میاں کو ایسی ہی زبان استعمال کرنی چاہیے تھی جس سے چند قادیانیوں کے سوا ساری اُمّت یہی سمجھے کہ اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے اپنے ارشادات تو کسی تاویل کی گنجائش بھی نہیں چھوڑتے۔ ان میں تو صاف صاف مختلف طریقوں سے اس بات کو کھول کر ہی کہہ دیا گیا ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ کے رسُول کو ہم سے ایسی ہی دشمنی تھی کہ

نبی تو آپؐ کے بعد آنے والا ہو اور آپ ہمیں اُلٹی یہ ہدایت دے جائیں کہ ہم اسے نہ مانیں اور کافر ہو کر جہنّم میں جائیں
اس صُورت میں کوئی چاہے کیسی ہی بھولی بھالی دل موہنے والی صورت رکھتا ہو، اور خواہ اُس کی پیشین گوئیاں سو فیصدی ہی دُرست ہوں، اور خواہ اس کے کارنامے کیسے ہی ہوں، ہم اُس کے دعوائے نبوّت کو قابلِ غور بھی نہیں سمجھتے کیوں کہ یہ چیزیں غور طلب اُسی صورت میں ہو سکتی تھیں کہ نبی کی آمد کا امکان ہوتا ہم تو پُورے اطمینان کے ساتھ ہر مدّعیٔ نبوّت کے دعوے کو سُنتے ہی اس کی تکذیب کریں گے اور اس کے دلائلِ نبوّت پر سرے سے کوئی توجّہ نہ دیں گے۔ یہ اگر کفر بھی ہو تو ہم پر اس کی کوئی ذمّہ داری نہیں ہے، کیونکہ ہمارے پاس قیامت کے روز اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے قرآن اور ارشاداتِ رسولؐ موجود ہیں۔ ۲۱۰ھ

باب ۶

آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی

حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی

فصل ۱

اِتّباع و اطاعتِ رسُولؐ

جو لوگ اسلام قبول کر لیں اور اُمتِ مُسلمہ میں داخل ہو جائیں، اُن کے لیے رسُول کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے، بلکہ رسُول اُن کے لیے مُعلّم اور مُربّی بھی ہے، اسلامی زندگی کا نمونہ بھی ہے اور ایسا امیر بھی ہے جس کی اطاعت ہر زمانے میں بے چُون و چرا کی جانی چاہیے۔

مُعلّم، مُربّی اور نمونہ

مُعلّم کی حیثیت سے رسُول کا کام یہ ہے کہ پیغامِ الٰہی کی تعلیمات اور اس کے قوانین کی تشریح و توضیح کرے (وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ)۔ مُربّی ہونے کی حیثیت سے اس کا کام یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات اور قوانین کے مطابق مسلمانوں کی تربیت کرے اور ان کی زندگیاں اسی سانچے میں ڈھالے (وَيُزَكِّيْهِمْ)۔ نمونہ ہونے کی حیثیت سے اس کا کام یہ ہے کہ خود قرآنی تعلیم کا عملی مجسّمہ بن کر دکھائے تاکہ اس کی زندگی اُس زندگی کی ٹھیک ٹھیک تصویر ہو جو کتابُ اللہ کے مقصود کے مطابق ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیے، اور اس کے ہر قول اور ہر فعل کو دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ زبان کو اِس طرح استعمال کرنا، اور اپنی قوتوں سے یُوں کام لینا، اور دُنیا کی زندگی میں ایسا برتاؤ رکھنا کتاب اللہ کے مقصود کے مُطابق ہے، اور جو کچھ اس کے خلاف ہے وہ منشائے کتاب کے خلاف ہے (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ اور وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى)۔ اس کے ساتھ ہی رسُول کی حیثیت مسلمانوں کے امیر کی بھی ہے۔ ایسا امیر نہیں جس سے نزاع کی جا سکے، بلکہ ایسا امیر جس کے حکم کو بے چون و چرا ماننا ویسا ہی فرض ہے جیسا قرآن کی آیات کو ماننا فرض ہے (فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اور وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ)۔ ایسا امیر نہیں جو صرف اپنی زندگی ہی میں امیر ہوتا ہے، بلکہ ایسا امیر جو قیامت تک کے لیے اُمتِ مُسلمہ کا امیر ہے جس کے احکام مسلمانوں کے لیے ہر زمانے اور ہر حال میں مرجع ہیں۔

صرف پیغام بری نہیں

جو لوگ آیت اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ اور اس کی ہم معنی آیات سے استدلال کر کے رسُول کے کام کو صرف "پیغام بَری" تک محدود کرتے ہیں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ رسُول کی خالص مبلّغانہ حیثیت صرف اُس وقت

تک رہتی ہے جب تک کہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوں، اور وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے رسول کی تعلیم کو ابھی قبول نہ کیا ہو۔ رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کر کے اُمّتِ مُسلمہ میں داخل ہو جائیں، تو اُن کے لیے رسول کی حیثیت محض مُبلّغ کی نہیں ہے بلکہ وہ ان کا لیڈر ہے، فرماں روا ہے، مُقنّن ہے، قاضی ہے، مُعلّم ہے، مُربّی ہے اور واجب التقلید نمونہ ہے۔

جو تفریق انہوں نے محمد بن عبداللہ بحیثیتِ انسان، اور محمّد رسولُ اللہ بحیثیتِ مبلّغ کے درمیان کی ہے، یہ قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اُس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسُول تھے۔ آپؐ کا ہر فعل اور ہر قول رسُولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اِسی حیثیت میں آپ مُبلّغ اور مُعلّم بھی تھے، مُربّی اور مُزکّی بھی تھے، قاضی اور حاکم بھی تھے، امام اور امیر بھی تھے، حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اِس حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔ اور ان تمام حیثیتوں میں آپ کی پاک زندگی ایک انسانِ کامل اور مُسلمِ قانت اور مومنِ صادق کی زندگی کا ایسا نمونہ تھی جس کو حق تعالیٰ نے ہر اُس شخص کے لیے بہترین قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا تھا جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ (احزاب۔ ۲۱)۔ قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسانی اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ اور یہ فرق کیسے کیا جا سکتا ہے، جب آپؐ خدا کے رسُول تھے تو لازم تھا کہ آپؐ کی پُوری زندگی خدا کی شریعت کے ماتحت ہو، اِس شریعت کی نمائندہ ہو، اور آپؐ سے کوئی ایسا فعل اور کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔

ہوائے نفس سے محفُوظ

اِسی بات کی طرف سُورۃ النّجم کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی۔ "تمہارا صاحب (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلّم) نہ بدراہ ہُوا، نہ گمراہ ہُوا"۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ "اور جو کچھ وہ کہتا ہے ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا"۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ "اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی ہے"۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى۔ "اس کو ایسے اُستاد نے تعلیم دی ہے جس کی قوّتیں بڑی زبردست ہیں"۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اِن آیات میں محض قرآن کے وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کُفّار انکار کرتے تھے۔ لیکن مجھے اِن آیات میں کہیں کوئی خفیف سا اشارہ بھی قرآن کی طرف نظر نہیں آتا۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى میں هُوَ کی ضمیر نطقِ رسُول کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى میں کیا گیا ہے۔ اِن آیات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی

بنا پر نُطقِ رسُول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہو۔ ہر وہ بات جس پر نُطقِ رسُول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے، آیاتِ مذکورہ کی بنا پر وحی ہوگی اور ہوائے نفس سے پاک ہوگی۔ یہ تصریح قرآن میں اسی لیے کی گئی ہے کہ رسُول کو جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے ان کو رسُول کے بدراہی اور گمراہی اور ہوائے نفس سے محفوظ ہونے کا کامل اطمینان ہو جائے اور وہ جان لیں کہ رسُول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے۔ ورنہ اگر اس کی کسی ایک بات کے بارے میں بھی یہ شُبہ ہو جائے کہ وہ خواہشِ نفس پر مبنی ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہے، تو رسُول کی رسالت پر سے اعتماد اُٹھ جائے۔ کُفّار اسی چیز کے مُنکر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نعوذ باللہ رسُول کو جنون ہے، یا کوئی آدمی اس کو پڑھا جاتا ہے، یا وُہ اپنے دل سے باتیں بنا کر کہتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر اس غلط خیال کی تردید کی ہے اور صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ نہ تمہارا صاحب بدراہ ہے نہ گمراہ، اور نہ خواہشِ نفس کی بنا پر کچھ کہتا ہے۔ اُس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے جو خاص ہماری طرف سے ہے۔ اس کو کوئی انسان یا جن یا شیطان نہیں پڑھاتا بلکہ وہ مُعلّم سبق دیتا ہے جو شدیدُ القوٰی ہے۔ یہی بات خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی اپنی زبانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمائی کہ فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ اِلّا حقٌّ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق ہی نکلتا ہے۔"

ہر حال میں واجب الاطاعت نمونہ

افسوس ہے کہ کچھ لوگوں کو اس حقیقت سے انکار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت اپنے گھر میں ازواجِ مطہرات سے، یا باہر دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے، اُس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا نہ کُفّار کو کوئی بحث تھی۔ مَیں کہتا ہوں کہ آنحضرتؐ جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسُول کی حیثیت سے کرتے تھے۔ سب کچھ ضلالت وغوایت اور ہوائے نفس سے پاک تھا۔ اللہ نے جو فطرتِ سلیمہ آپؐ کو عنایت فرمائی تھی، اور تقوٰی و پاکیزگی کے جو حدود آپؐ کو بتائے تھے، آپؐ کے تمام اقوال و افعال اُسی فطرت سے صادر اور انہی حدُود سے محدُود ہوتے تھے۔ ان کے اندر تمام عالمِ انسانی کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ تھا۔ اور انہی سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز ہے، کونسی چیز حرام ہے اور کونسی حلال، کونسی باتیں حق تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہیں اور کونسی اُس کے خلاف ہیں، کن اُمُور میں ہم کو رائے اور اجتہاد کی آزادی حاصل ہے اور کن اُمُور میں نہیں ہے، کس طرح ہم اطاعتِ امر کریں، کس طرح شُوریٰ سے معاملات طے کریں، اور کیا معنی ہیں ہمارے دین میں جمہوریّت کے۔

آپؐ خدا کے مامور کردہ امیر تھے

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم لوگوں کے بنائے ہوئے امیر نہیں تھے، نہ خود بن گئے تھے، بلکہ آپؐ خدا کے مقرر کیے ہوئے امیر تھے۔ آپؐ کی امارت آپؐ کی رسالت سے الگ نہ تھی۔ دراصل آپؐ رسولِ خدا ہونے کی

حیثیت ہی سے امیر تھے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ آپؐ امیر نہیں بلکہ مامور من اللہ تھے۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، مگر وہ اس لیے تھا کہ آپ اپنی اُمّت کے لیے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے جمہوریت (Democracy) کے صحیح اصول کی طرف رہنمائی فرما دیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپ کی حیثیت دوسرے امیروں کی سی ہے۔ دوسرے اُمراء کے لیے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورے سے کام کریں، وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸)۔ اور یہ کہ اگر شوریٰ میں نزاع ہو تو خدا اور رسول کی طرف رجوع کیا جائے۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء: ۵۹)۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کرکے عمل کا اقدام فرمائیں۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران: ۱۵۹)۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے، بلکہ آپؐ کو شوریٰ کا حکم صرف اس لیے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرزِ حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔

رسول کی اطاعت بہ حیثیتِ امیر

رہی یہ بات کہ امیر کی حیثیت سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت صرف آپؐ کے عہد تک تھی، تو یہ بھی غلط ہے، اور جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ سورۂ انفال کی آیت ۲۰ کے الفاظ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ سے یہ مطلب لے لیا گیا ہے کہ اطاعتِ رسولؐ کا حکم صرف اُن لوگوں کو دیا گیا تھا۔ جو اُس وقت حضورؐ کا حکم سُن رہے تھے۔ لیکن سورۂ انفال ہی کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ "اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو"۔ پھر آیت ۵ میں اُن لوگوں کو ڈانٹا گیا ہے جو رسولؐ اللہ کی دعوتِ جہاد پر دلوں میں کُڑھتے تھے۔ پھر آیت ۱۳ میں فرمایا گیا کہ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ "اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ سے جھگڑا کرتا ہے اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد ہُوا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (آیت ۲۰) "اے ایمان لانے والو اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور رسولؐ کے حکم سے مُنہ نہ موڑو جبکہ تم سُن رہے ہو"۔ اِس آیت میں اور پچھلی آیات میں رسُول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جس سے یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ رسُول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ پھر ہر جگہ لفظ رسول آیا ہے، امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا اور نہ کوئی مخفی سے مخفی اشارہ ایسا موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں رسول سے مُراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو رسالت سے مختلف ہو۔ پھر رسُول کے حکم سے مُنہ موڑنے کو منع کیا گیا ہے جس پر سخت عذاب کی دھمکی اوپر دی جا چکی ہے۔

اس کے بعد وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ کہنے کا منشا صاف یہ ہے کہ تم ہمارے اِن تاکیدی احکام کو سنتے ہوئے ہمارے رسول کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑو۔ یہاں اَنْتُمْ اور تَسْمَعُوْنَ کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے، بلکہ قیامت تک جو لوگ ایمان کے ساتھ قرآن کو سنیں گے اُن سب پر لازم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم ان کو پہنچے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

ایک عجیب طرزِ استدلال

یہ کہنا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ امارت اُسی طرح ہنگامی ہیں جس طرح دوسرے اُمراء کے ہُوا کرتے ہیں، کیونکہ آج ہم جہاد میں بدر و اُحد کی طرح نیزہ و شمشیر سے نہیں لڑ سکتے"، ایک بہت ہی عجیب طرزِ استدلال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں جن اسلحہ سے کام لیا وہ اسلحہ تو ضرور ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتے تھے، لیکن حضورؐ نے اپنی لڑائیوں میں جو اخلاقی ضوابط برتے تھے، اور جن ضوابط کو برتنے کی ہدایت آپؐ نے فرمائی تھی، وہ کسی عہد کے لیے مخصوص نہ تھے بلکہ اُنھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک دائمی قانونِ جنگ بنا دیا ہے شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ سوال اہمیت نہیں رکھتا کہ آپ تلوار استعمال کرتے ہیں یا بندوق یا توپ، بلکہ اہمیت اِس سوال کی ہے کہ آپ اپنے اسلحہ کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں؟ اور کس طرح اُن سے خونریزی کا کام لیتے ہیں؟ اس باب میں جو نمونہ آنحضرتؐ نے اپنے غزوات میں پیش فرمایا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسلامی جہاد کا ایک مکمل نمونہ ہے اور معنوی حیثیت سے سرورِ عالمؐ قیامت تک کے لیے ہر مسلمان فوج کے سالارِ اعظم ہیں۔

حضورؐ کی امارت کی امتیازی شان

ایک صاحب نے امارت اور رسالت میں خود یہ فرق بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اُمراء سے نزاع اور اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے درآنحالیکہ رسول سے نزاع نہیں کی جا سکتی۔ اب مَیں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امیرانہ حیثیت ویسی ہی ہے جیسی دوسرے اُمراء کی ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی مسلمان کو نزاع کا حق حاصل تھا؟ جس امیر کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے تک کی اجازت نہ تھی، اور جس کے مقابلہ میں محض اُونچی آواز سے بولنے پر تمام عمر کے اعمال غارت ہو جانے کی دھمکی دی گئی تھی (الحجرات، آیت ۲) اور جس سے جھگڑا کرنے والے کو دوزخ میں جھونک دیئے جانے کا خوف دلایا گیا تھا (النساء۔ آیت ۱۱۵) کیا اس امیر سے منازعت کرنے کا حق کسی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کہاں اُس امیر کی امارت اور کہاں اُن اُمراء کی امارت جن سے منازعت کا حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

اطاعت کے تین مراتب

اُن تمام احکام کو جو اطاعتِ رسول سے متعلق ہیں، اطاعتِ امیر کے احکام قرار دینا اور یہ کہنا کہ:

"اللہ اور رسُول کے الفاظ قرآن میں اکثر جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں ان سے مُراد امارت ہے جس کا قانون کتاب اللہ ہے اور جس کے نافذ کرنے والے رسُول اللہ یا اُن کے جانشین ہیں ۔ مثلاً يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۔ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۔ مالِ غنیمت کا حکم عہدِ رسالت تک محدود نہ تھا بلکہ آئندہ کے لیے بھی ہے جس کی تعمیل خلافت کا فریضہ ہے ...... آخری اختیار اللہ و رسُول یعنی امارت ہے ۔ اس لیے رسُول اللہ کا جو منصب بحیثیت امیر کے ہے وہی ان کے خلفاء کا بھی ہوگا"

یہ حق سے صریح تجاوز ہے ۔ قرآن مجید میں اطاعتِ خدا ، اطاعتِ رسُول اور اطاعتِ اولی الامر کے تین مراتب بیان کیے گئے ہیں ۔ اطاعتِ خدا سے مُراد قرآن مجید کے احکام کی اطاعت ہے ۔ اطاعتِ رسُول سے مُراد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم کے قول اور عمل کی پیروی ہے ۔ اور اطاعت اولی الامر سے مُراد مسلمانوں کے اُمراء اور اربابِ حل و عقد کی اطاعت ہے ۔ پہلے دونوں مراتب کے متعلق قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ خدا اور رسُول کے احکام میں کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے ۔ مسلمانوں کا کام سُننا اور اطاعت کرنا ہے ۔ خدا اور رسُول کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرے ۔ رہا تیسرا مرتبہ تو اس کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسُول کے احکام کے تابع ہے ، اور نزاع کی صورت میں خدا اور رسُول کی طرف رجُوع کرنا لازم ہے ۔ ایسے صاف اور کھُلے ہوئے احکام کے موجود ہونے ہوئے اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا اور رسُول سے مُراد امارت لی جائے ، اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے منصبِ امارت کو اُس امارت کے ساتھ ملا دیا جائے جو مسلمانوں کے عام اُمراء کو حاصل ہے ۔ اس معاملہ میں قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے ۔ "اموالِ غنیمت خدا اور رسُول کے ہیں" کہنے کا مدعا یہ ہے کہ خدا اور رسُول نے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کیا ہے اُس کے مصالح میں غنائم صرف کیے جائیں ۔ اِس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ اور رسُول سے مُراد امارت ہے ۔

مذہبی اور تمدّنی امُور کی غلط تفریق

قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ حکم نکلتا ہو کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے محض مذہبی اعمال ہی دائماً قابلِ تقلید ہیں ، رہے تمدّنی و اجتماعی امُور میں آپ کے فیصلے اور آپ کے نافذ کردہ قوانین تو وہ صرف اُس عہد کے لیے مخصوص تھے جس میں وہ نافذ کیے گئے تھے ۔ اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں موجود ہو جس سے اِن دونوں قسم کے اعمال میں فرق کیا جاسکتا ہے اور دونوں کے احکام مختلف قرار دیئے جاسکتے ہیں تو اس کو پیش کیا جاتے ۔ مجھ کو تو قرآن میں صاف حکم یہ ملتا ہے کہ :

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى "کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ

اللہُ وَرَسُولُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ ۔ وَمَنْ یَّعْصِ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا ۔ (احزاب: ۳۶)

اور اُس کا رسُول کسی امر کا فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسُول کی نافرمانی کرے گا وہ کھُلی گمراہی میں مبتلا ہو گا"۔

اِس آیت میں زمانہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مومن مردوں اور عورتوں سے خاص عہدِ رسالت کے مومن مرد و عورت مُراد نہیں لیے جا سکتے۔ امر کا لفظ نہایت عام ہے جو ہر قسم کے معاملات پر حاوی ہے خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی۔ اللہ اور رسُول سے مراد اللہ اور رسول ہی ہیں، امارت ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ امیر یا اولی الامر بھی بہر حال مومن ہی ہونگے اور یہاں تمام مومنین و مومنات سے یہ حق سلب کر لیا گیا ہے کہ خدا اور رسُول نے جس معاملہ کا فیصلہ کر دیا ہو اس میں انہیں مجتمعاً یا منفرداً خود فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار باقی رہے۔ پھر فرمایا گیا کہ جو اس کے خلاف عمل کرے گا وہ کھُلی گمراہی میں مبتلا ہو گا۔ یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ تعالیٰ نے اور اُس کی ہدایت سے اُس کے رسُول نے اپنے احکام اور اپنے قوانین سے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کر دیا ہے، اس کا قیام منحصر ہی اس پر ہے کہ جو احکام دیے گئے ہیں اور جو قوانین مقرر کر دیے گئے ہیں ان کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جائے۔ اگر خدا اور اس کے رسُول کی قولی اور عملی رہنمائی سے قطع نظر کر کے لوگ خود اپنی رائے اور اپنے اختیار سے کچھ طریقے اختیار کریں گے تو یہ نظام باقی نہ رہے گا۔ [۱۰۳]

فصل ۲

نبیؐ کی اطاعت اور آزادیِ رائے کا اسلامی تصور

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"سورۂ احزاب میں حضرت زید بن حارثہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کے سلسلہ میں ایک اہم شُبہ پیدا ہوتا ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے فرمایا اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر) مگر حضرت زیدؓ نے اس حکمِ نبویؐ کی خلاف ورزی کی اور حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔ اس فعل کے خلافِ حکم ہونے میں تو کوئی شُبہ نہیں اور قرآن کے اندازِ بیان میں صراحتہً یا کنایتہً ایسی کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زیدؓ کی اس حرکت کو ادنیٰ درجہ میں بھی ناپسند کیا ہو، بلکہ بیانِ واقعہ کی ابتدا میں ان کا ذکر لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (جس پر اللہ نے انعام کیا) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے شُبہ پیدا ہوتا ہے کہ نبیؐ کے حکم کی خلاف ورزی بھی کی جا سکتی ہے اور نبی کا قول اگر ثابت بھی ہو جائے کہ وہ نبی ہی کا قول ہے تب بھی وہ اُس طرح واجب الاطاعت نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان واجب الاطاعت ہے۔"

سوال میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ چند لفظوں میں شُبہ کو رفع کیا جا سکتا تھا۔ لیکن دراصل شُبہ جہاں سے پیدا ہوتا ہے، وہاں متعدّد غلط فہمیوں کا منبع ہے، اور ان غلط فہمیوں کا سلسلہ دُور تک پہنچا ہُوا ہے، اِس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شُبہ کو رفع کرنے کے ساتھ اس کی اصل اور اس کے فروع کی طرف بھی کچھ اشارات کر دیئے جائیں۔

حاکم صرف اللہ ہے

قرآنِ حکیم تمام آسمانی کتابوں سے زیادہ صراحت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ حاکمِ مطلق بجز اللہ کے اور کوئی نہیں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (خدا کے سوا حکم کسی کے لیے نہیں ہے)۔ صرف اُسی کو یہ حق ہے کہ جیسا چاہے حکم دے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (اللہ جو چاہے حکم دے)۔ وہی ایک ایسا حاکم ہے جس کے احکام میں کسی چُون وچرا کی گنجائش نہیں لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (اس کے کسی کام کے بارے میں سوال نہیں کیا جا سکتا)۔ اطاعت اسی کی فرض ہے اور اس لیے فرض ہے کہ انسان اپنی عین خلقت کے لحاظ سے اس کا بندہ ہے اور دراصل صرف اسی کی بندگی کے لیے

پیدا کیا گیا ہے، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (میں نے جن اور انسان کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں)۔ اُس کے سوا انسان نہ کسی کا مخلوق ہے نہ بندہ نہ پروردہ۔ اسی لیے دراصل کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کی اطاعت فرض نہیں۔ یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (وہ پوچھتے ہیں کہ حکم میں ہمارا بھی کچھ حصّہ ہے؟ کہہ دو کہ حکم پورا کا پورا اللہ کے لیے ہے)۔ کسی انسان کو نہ تو دوسرے انسان پر حاکمیتِ مُطلقہ (Absolute Authority) حاصل ہے اور نہ کسی انسان پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے حکم کی اطاعت کرے محض اس بنا پر کہ اُس خاص شخص کا حکم ہے۔

انسانوں پر انسانوں کی حکمرانی

قرآن کے نزول کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلادہ نکال دے اور اللہ یعنی مُطاعِ حقیقی (Real Sovereign) کا بندہ بنانے کے بعد اس کو رائے اور ضمیر کی پوری آزادی عطا کرے۔ چنانچہ انسانی غلامی کے خلاف سب سے بڑھ کر جس کتاب نے جہاد کیا ہے وہ قرآن ہی ہے۔ یہ کتاب کسی انسان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتی کہ بطورِ خود اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھا جائے اور اس کے حکم اور اس کی ممانعت کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ گویا وہ اپنے محکوموں کے لیے بمنزلۂ خدا ہے۔ اس قسم کی اطاعت اور محکومی کو قرآن شرک کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے اور جو لوگ اپنے علماء و مشائخ کو، پنڈتوں اور پروہتوں کو، پوپوں اور پادریوں کو اور دنیوی حاکموں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (gods other than God) بنا لیتے ہیں، انہیں مشرک ٹھہراتا ہے، کیونکہ انسان جب کبھی کسی انسان کی ایسی اطاعت کرے گا تو لامحالہ اس کی تہ میں الوہیّت کا تصوّر اور عبودیّت کا جذبہ ہی کارفرما ہوگا۔ ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں اپنے دل اور دماغ اور رُوح اور جسم کی آزادی سے کلیتہً دست بردار ہوتا ہی اُس وقت ہے جب وہ اس کو یا تو خطا سے بَری اور عیوب و نقائص سے پاک اور جزو کُل کا عالم سمجھ لیتا ہے، یا یہ سمجھتا ہے کہ وہ ذاتی حق کی بنا پر امر و نہی کا مالک ہے اور اُسے حکومت کا طبعی حق حاصل ہے، یا یہ گمان کرتا ہے کہ وہی دراصل نفع اور نقصان پہنچانے والا اور رزق دینے اور رزق روکنے والا ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کو ان صفات کا حامل سمجھنا ہی شرک اور غلامی کی جڑ ہے اور توحید جس کا لازمی نتیجہ مخلوق کی غلامی سے انسان کی آزادی ہے، یہ ہے کہ خدا کے سوا تمام چیزوں کو اُن صفات سے خالی سمجھا جائے اور اُن کے حقِ حکمرانی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

نبی کی اطاعت کس حیثیت سے؟

یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد، اب اِس امر کی تحقیق کیجیے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے، یہ کس حیثیت سے ہے۔ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں ہے کہ نبی وہ خاص شخص،

مثلاً ابن عمران، یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے، اور یہ شخص خاص ہونے کی بنا پر اس کو حکم دینے اور منع کرنے کا، حلال کرنے اور حرام ٹھہرانے کا حق حاصل ہے۔ اگر ایسا ہو تو معاذ اللہ نبی خود بھی "ارباب من دون اللہ" میں سے ایک ہو جائے گا، اور اس طرح خود اسی کے ہاتھوں وہ مقصد فوت ہو کر رہے گا جس کے لیے وہ نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم بشر ہو۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا (اے نبی ان سے کہو کہ پاک ہے میرا رب۔ کیا میں اس کے سوا بھی کچھ ہوں کہ ایک انسان ہوں جسے پیغمبر بنایا گیا ہے؟) وَقَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ (اور اُن سے اُن کے پیغمبروں نے کہا کہ ہم تو تمہارے ہی جیسے انسان ہیں)۔ البتہ نبی ہونے کی حیثیت سے اس میں اور تم میں عظیم الشان فرق ہے۔ اس کو خدا کی طرف سے جب نبوّت عطا کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ "حکم" بھی عطا ہوتا ہے۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (یہ پیغمبر وہ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکم اور نبوّت عطا کی)۔ حکم کے مفہوم میں قوتِ فیصلہ (Judgement) اور اقتدارِ حکومت (Authority) دونوں شامل ہیں۔ پس نبی کو جو اقتدار حاصل ہے وہ ذاتی اقتدار نہیں بلکہ تفویض کردہ اقتدار ہے۔ اس لیے اس کی اطاعت دراصل خدا کی اطاعت ہے۔ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی)۔ وہ بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کے احکام نافذ کرے اور تم ان احکام کی اطاعت کرو، وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (ہم نے جو نبی بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے)۔ اس حیثیت میں اس کا حکم خدا کا حکم ہے اور کسی کو اس میں چون و چرا کرنے کا حق نہیں، وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد نبی سے جھگڑا کرے اور ایسا طریق اختیار کرے جو ایمان لانے والوں کے طریقہ سے مختلف ہو تو جدھر وہ مڑے گا ہم بھی اسے اسی طرف موڑ دیں گے۔ اور اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بہت ہی بری جائے قرار ہے)۔

بے چون و چرا اطاعت

عمل تو درکنار اگر دل میں بھی اس کی نافرمانی کا خیال آجائے تو قطعاً ایمان سلب ہو جاتا ہے، فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (خدا کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے آپس کے اختلافات میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں اور جو کچھ تو فیصلہ کرے اس پر اپنے دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں) اور اس نافرمانی کا نتیجہ ابدی خسران و نامرادی ہے۔ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ (جن لوگوں نے کفر

کیا ہے اور رسُول کی نافرمانی کی ہے قیامت کے روز اُن پر ایسی مصیبت پڑے گی کہ وہ چاہیں گے کہ زمین ان پر پاٹ دی جاتے)۔

نبی لوگوں کو اپنا بندہ نہیں بناتا

جیسا کہ اُوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ اطاعت اور کامل سپُردگی جس پر دین و ایمان کا مدار رکھا گیا ہے اور جس کے متعلق صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ہدایت سرا سر نبی کی اطاعت پر منحصر ہے، (وَاِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا) اس کا مرجع نبی کی انسانی اور شخصی حیثیت نہیں ہے۔ کسی نبی کو اللہ نے اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ لوگوں کو خدا کے بجائے اپنا غلام اور اپنا بندہ بنائے، بلکہ صرف اس لیے بھیجا ہے کہ وہ ان کو خدا کا تابع فرمان بنائے، مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ (کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اس کو کتاب اور حکم اور نبوّت بخشے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ نہیں، بلکہ وہ کہے گا کہ تم خدا کے بندے بنو)۔ وہ اس لیے نہیں آیا کہ لوگوں کو اپنی ذاتی خواہشات کی پیروی پر مجبور کرے، اپنی شخصی عظمت و بزرگی کا سکّہ اُن پر جمائے اور اُن کو اپنے شخصی اقتدار کے شکنجہ میں کس کر اس قدر بے بس کر دے کہ وہ اس کی رائے کے مقابلہ میں خود کوئی رائے رکھنے کے حق سے بالکل دستبردار ہو جائیں اور اپنے دل و دماغ کو اس کے سامنے معطل کر دیں۔ یہ تو وہی غیر اللہ کی بندگی ہوئی جس کو مٹانے کے لیے نبی بھیجا جاتا ہے۔ انسان کی گردن میں جتنے طوق انسان نے ڈالے ہیں ان سب کو کاٹ دینا ہی تو نبی کی بعثت کا مقصود ہے، وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (اور یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو توڑتا ہے جن میں وہ بندھے ہوئے تھے)۔ انسان نے انسان کے لیے فرائض اور حقوق مقرر کرنے اور جائز و ناجائز کی من مانی حدیں ٹھہرانے کے جن اختیارات پر قبضہ کر رکھا تھا ان کو سلب کرنے ہی کے لیے تو نبی مامور کیا جاتا ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ" (تم کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنی زبان سے جس چیز کو چاہو حلال کر دو اور جسے چاہو ممنوع ٹھہرا دو)۔ انسانی حکم اور فیصلہ کے سامنے سر جھکانے کی جو ذلّت انسان نے اختیار کر لی تھی اس سے نجات دلانے ہی کے لیے تو نبوّت قائم کی جاتی ہے وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" ہم میں سے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اللہ کے بجائے اپنا خدا نہ بنائے)۔ پھر کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ نبی ان کی گردنوں سے دوسروں کا طوق اُتار کر اپنا طوق ڈال دے اور تحریم و تحلیل کے اختیارات دوسروں سے چھین کر خود اپنے قبضہ میں کر لے، اور استبداد کی مسند سے دوسروں کو ہٹا کر خود اس پر متمکن ہو جائے۔ اس نے تو یہود و نصاریٰ کو اسی پر ملامت کی تھی کہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے بجائے اپنا خدا بنا لیا)۔ پھر وہ کیسے کہتا کہ اب

تم خدا کو چھوڑ کر مجھ کو ربّ بنا لو اور میری خواہشاتِ نفس کی پابندی کرو۔

نبی بہ حیثیت نبی کی اطاعت

اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے، جو اصلِ ایمان ہے، اور جس سے کسی مومن کو سرتابی کیا معنی یک سرِ مُو انحراف کا بھی حق نہیں، وہ دراصل نبی بحیثیت انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بحیثیت نبی کی اطاعت ہے یعنی اُس علم، اُس ہدایت، اُس حکم اور اُس قانون کی اطاعت جسے اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ پس درحقیقت اسلام جس اطاعت کی بندش میں انسان کو باندھتا ہے، وہ دراصل انسان کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہے۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۔ (النساء: آیت ۱۰۵)

اے نبی، ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق اُتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اُس حق کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تم کو دکھایا ہے۔

وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡكُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۔ (المائدہ - ۴۵)

اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

اِس آیت میں جس طرح دوسرے انسان بندھے ہوئے ہیں اسی طرح خود نبی بحیثیت انسان بھی بندھا ہُوا ہے۔

اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ (الانعام: ۵۰)

میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

نبی کی اطاعت خدا کے حکم کے تحت

یہ اور ایسی ہی بہت سی آیات اس امر پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ اطاعت دراصل صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کی ہے اور اسلام آیا ہی اِس لیے ہے کہ غیر اللہ کی بندگی اور انسان پر انسان کی خداوندی کا قلع قمع کر دے۔ اسلام میں کسی انسان کی اطاعت بحیثیت، انسان ہونے کے نہیں ہے۔ نبی کی اطاعت ہے تو اس بنا پر ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کو حکم عطا کیا گیا ہے۔ حکّام کی اطاعت ہے تو اِس بنا پر کہ وہ اللہ اور رسُول کے احکام کو نافذ کرنے والے ہیں۔ علماء کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ خدا اور رسُول کے امر و نہی اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدُود سے آگاہ کرنے والے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شخص خدا کا حکم پیش کرے تو مسلمان پر واجب ہے کہ اس کے آگے سر جُھکا دے۔ وہ اس میں ہرگز چون و چرا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کو خدا کے مقابلے میں حُرّیتِ فکر اور آزادیٔ رائے حاصل نہیں لیکن اگر کوئی انسان خدا کا نہیں، خود اپنا کوئی خیال پیش کرے، تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کو آزادانہ اتفاق کرنے کا بھی اختیار ہے۔ اور آزادانہ

اختلاف کرنے کا بھی۔ اس معاملہ میں علماء اور حکّام تو درکنار، خود نبی کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

حضورؐ کے مشن کے دو حصّے

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے مشن کا ایک حصّہ یہ تھا کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ انسان کی گردن میں ڈال دیں۔ اور دُوسرا حصّہ یہ تھا کہ انسان کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ اس کی گردن سے اُتار پھینکیں۔ یہ دونوں کام آپؐ کے مقصدِ بعثت میں شامل تھے، اور دونوں کی اہمیّت یکساں تھی۔ پہلے کام کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپؐ تمام مسلمانوں کو اپنی کامل اور غیر مشروط اطاعت پر مجبور کریں کیونکہ آپؐ کی اطاعت ہی پر خدا کی اطاعت موقوف تھی۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے کام کی تکمیل کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری تھا کہ سب سے پہلے آپؐ خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین کر دیں کہ کسی انسان کی، حتیٰ کہ خود محمدؐ بن عبداللہ بحیثیت انسان کی اطاعت بھی ان پر واجب نہیں ہے اور ان کی رُوحیں انسان کی بندگی سے قطعی آزاد ہیں۔ یہ دراصل ایک نہایت نازک کام تھا۔ ایک ہی ذات میں حیثیتِ نبوّت اور حیثیتِ بشریّت دونوں جمع تھیں۔ اور ان کو کسی واضح خطِ امتیاز کے ساتھ ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر اللہ کے رسُول پاکؐ نے اللہ کی بخشی ہوئی حکمت سے اس کام کو بہترین طریق پر انجام دیا۔ آپؐ نے ایک طرف نبی ہونے کی حیثیت سے اپنی ایسی اطاعت کرائی کہ تاریخِ عالم میں کبھی کسی امیر کی ایسی اطاعت نہیں کی گئی۔ اور دوسری طرف انسان ہونے کی حیثیت سے آپ نے اپنے جاں نثار متبعین کو ایسی آزادیٔ رائے عطا کی کہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے جمہوریّت پسند سردار نے بھی اپنے ماتحتوں کو ایسی آزادی نہیں بخشی۔ اگر کوئی شخص اس امر پر غور کرے کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپ کو اپنے پیروؤں پر کتنا بڑا اقتدار حاصل تھا اور مسلمان کتنی گہری عقیدت آپ کے ساتھ رکھتے تھے، اور پھر یہ دیکھے کہ اتنا زبردست اقتدار رکھنے کے باوجود آپ کس طرح معاشرت اور معاملات میں ہمیشہ اور ہر وقت اپنی پیغمبرانہ حیثیت اور انسانی حیثیت کو الگ الگ رکھتے تھے، اور پیغمبرانہ حیثیت میں اپنی بے چون و چرا اطاعت کرانے کے ساتھ انسانی حیثیت میں لوگوں کو کتنی مکمل آزادیٔ رائے عطا فرماتے اور خود اپنی ذاتی آراء سے اختلاف کرنے میں کس طرح اُن کی ہمّت افزائی کرتے تھے، تو اسے ماننا پڑے گا کہ یہ کمال درجہ کا ضبطِ نفس، یہ حیرت انگیز قوتِ امتیاز، اور ایسی مکمل بصیرت صرف ایک نبی ہی کو میسّر آسکتی ہے۔ اِس مقام پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی کی شخصی حیثیت الگ ہونے کے باوجود اس کی پیغمبرانہ حیثیت میں گم ہو جاتی ہے۔ نبی اپنی شخصی حیثیت میں بھی پیغمبری کے فرائض انجام دیتا ہے۔ وہ جب اپنی شخصی حیثیت میں کام کرتا ہے تو اس وقت وہ اپنے پیروؤں میں آزادیٔ فکر کی رُوح پھونکتا ہے، انہیں سکھاتا ہے کہ انسان کے مقابلہ میں ان کو کس طرح آزادیٔ رائے

استعمال کرنی چاہیے، اور انہیں بتاتا ہے کہ آزادی رائے کا حق ان کو ہر انسان کے مقابلہ میں حاصل ہے حتیٰ کہ اُس انسانِ کامل، اُس عظیم الشان شخصیّت کے مقابلہ میں بھی وہ رائے کی پوری آزادی رکھتے ہیں جس کو وہ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے بلند ترین اقتدار کا درجہ دینے پر مجبور ہیں۔ نبی کے سوا کسی دوسرے کو لوگوں پر ایسا مکمل اقتدار نصیب ہو تو وہ ضرور ان کو اپنا بندہ بنائے اور ان پر اپنے وہی حقوق جمائے جو دنیا میں پوپوں اور پیروں اور پنڈتوں اور بادشاہوں نے جما کر دکھا دیئے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ:

انّما انا بشرٌ اذا امرتکم بشیءٍ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیءٍ من رائی فانما انا بشرٌ۔

مَیں بھی ایک انسان ہی ہوں۔ جب مَیں تم کو تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دُوں تو اُسے مانو، اور جب مَیں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو بس میں بھی ایک انسان ہی ہُوں۔

آزادیٔ رائے کو نشوونما دینے کی چند مثالیں

ایک دفعہ حضورؐ نے مدینے کے باغبانوں کو کھجور کی کاشت کے متعلق ایک مشورہ دیا۔ لوگوں نے اس پر عمل کیا مگر وہ مفید ثابت نہ ہوا۔ آپؐ سے اس بارے میں عرض کیا گیا تو جواب میں آپؐ نے فرمایا:

انی انما ظننت ظنًّا ولا تواخذونی بالظنّ ولٰکن اذا حدّثتکم عن اللہ شیئًا فخذوا بہ فانّی لم اکذب علی اللہ۔

مَیں نے تو اندازہ سے ایک بات کہی تھی۔ تم میری ان باتوں کو نہ لو جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں۔ ہاں جب مَیں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اس کو لے لو۔ کیونکہ مَیں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا۔

جنگِ بدر کے موقع پر حضورؐ ابتدا میں جہاں خیمہ زن ہوتے تھے وہ جگہ مناسب نہ تھی حضرت حُبّاب بن مُنذرؓ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ اِس مقام کا انتخاب وحی کے ذریعہ کیا گیا ہے یا محض ایک تدبیر جنگ کے طور پر ہے؟ فرمایا وحی نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اگر ایسا ہے تو میری رائے میں آگے بڑھ کر فلاں مقام پر خیمہ زن ہونا چاہیے حضورؐ نے ان کی رائے کو قبول فرمایا اور اسی پر عمل کیا۔

اسیرانِ جنگِ بدر کے مسئلہ میں حضورؐ نے صحابہ کی جماعت سے مشورہ لیا اور خود بھی ایک عام رکن جماعت کی حیثیت سے رائے دی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے آپؐ کی اور صدّیقِ اکبر کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا جس کا واقعہ تمام تاریخوں میں مشہور ہے۔ اسی مجلس میں حضورؐ نے خود اپنے داماد ابوالعاص کا مسئلہ بھی پیش کیا اور صحابہؓ سے فرمایا اگر تمہاری مرضی ہو تو ان سے فدیہ میں جو ہار لیا گیا ہے وہ انہیں واپس کر دیا جائے۔ جب صحابہؓ نے بخوشی اس کی اجازت دی، تب آپؐ نے ہار انہیں واپس کیا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر حضورؐ نے بنی غطفان سے صلح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ انصار کے سرداروں نے عرض کیا کہ اگر یہ ارادہ وحی کی بنا پر ہے تو مجالِ کلام نہیں، اور اگر حضورؐ اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اِس تجویز سے اختلاف ہے۔ حضورؐ نے انہی کی رائے قبول فرمائی اور اپنے ہاتھ سے صلحنامہ کا مسودہ چاک کر ڈالا۔

صلح حُدیبیہ کے موقع پر تمام مسلمانوں کو بظاہر دب کر صلح کرنا پسند نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے علانیہ اس سے اختلاف کیا، مگر جب حضورؐ نے فرمایا کہ یہ کام مَیں خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے کر رہا ہُوں تو باوجودیکہ غیرتِ اسلامی کی بنا پر سب مَلُول تھے، کسی نے دم مارنے کی جرأت نہ کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مرتے دم تک اِس غلطی کے کفارے طرح طرح سے ادا کرتے رہے کہ وہ ایک ایسے امر میں حضورؐ سے اختلاف کر بیٹھے جو بحیثیتِ رسولؐ کیا جا رہا تھا۔

جنگِ حُنین کے موقع پر تقسیم غنائم میں آپؐ نے مؤلفۃ القلوب کے ساتھ جو فیاضی ظاہر فرمائی تھی اس پر انصار چین بجبیں ہُوئے۔ حضورؐ نے ان کو بلایا۔ اپنے فعل کی تائید میں یہ نہیں فرمایا کہ مَیں خدا کا نبی ہُوں جو چاہوں کروں، بلکہ ایک تقریر کی جس طرح ایک جمہوری حکومت کا سردار اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کے سامنے کرتا ہے۔ ان کے ایمان بالرسالت سے اپیل نہیں کی بلکہ ان کی عقل اور ان کے جذبات سے اپیل کی اور انہیں مطمئن کر کے واپس فرمایا۔

یہ تو خیر اُن لوگوں کے ساتھ معاملہ تھا جو سوسائٹی میں بڑی اُونچی پوزیشن رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں اور لونڈیوں تک میں استقلالِ رائے کی رُوح پھونک دی تھی۔ بُریرہ ایک لونڈی تھی جو اپنے شوہر سے متنفر ہو گئی تھی، مگر شوہر اس کا عاشقِ زار تھا۔ وہ اس کے پیچھے روتا پھرتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ تو اپنے شوہر سے رجُوع کر لیتی تو اچھا تھا۔ اس نے پوچھا "یا رسولَ اللہ کیا آپ حکم دیتے ہیں؟" آپؐ نے جواب دیا "حکم نہیں بلکہ سفارش کرتا ہوں"۔ اس نے کہا "اگر یہ سفارش ہے تو مَیں اُس کے پاس جانا نہیں چاہتی"۔

اِس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب قرینہ سے یا خود حضورؐ کی تصریح سے لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ کوئی بات اپنی رائے سے فرما رہے ہیں تو وہ آزادی کے ساتھ اس میں اظہارِ رائے کرتے تھے اور آپؐ خود اس آزادانہ اظہارِ رائے میں اُن کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔ ایسے موقع پر اختلاف کرنا نہ صرف جائز تھا، بلکہ آپؐ کے نزدیک پسندیدہ تھا، اور آپؐ خود بسا اوقات اپنی رائے سے رجوع فرماتے تھے۔

حضرت زیدؓ کے واقعہ کی حقیقت

اب حضرت زیدؓ کے واقعہ کی طرف رجوع کیجیے۔ حضورؐ کے ساتھ ان کے تعلقات کئی طرح کے تھے۔ ایک تعلق یہ تھا کہ آپؐ اُن کے پیشوا تھے اور وہ آپؐ کے پیرو تھے۔ دوسرا تعلق یہ تھا کہ آپؐ ان کے برادرِ نسبتی تھے اور وہ آپؐ کے بہنوئی تھے[1]۔ تیسرا تعلق یہ تھا کہ آپؐ ان کے مُربّی تھے اور وہ آپؐ کے پروردہ تھے۔ بیوی سے اُن کا

[1] کیونکہ حضرت زینبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور وہ حضرت زیدؓ کے نکاح میں تھیں۔ (مؤلف)

نباہ نہ ہو سکا۔ اُنہوں نے طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ آپؐ نے ان کو وہی مشورہ دیا جو ہر برادرِ نسبتی اپنے بہنوئی کو اور ہر سرپرست اپنے پروردہ کو دے گا، یعنی یہ کہ خدا کا خوف کرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ مگر جس اختلافِ مزاج کی بنا پر زوجین میں باہم نفرت پیدا ہو گئی تھی اس کو حضرت زیدؓ خود زیادہ محسوس کر سکتے تھے۔ یہ معاملہ ان کے دین و ایمان کا نہیں بلکہ ان کے حسیّاتِ نفس کا تھا۔ اس لیے انہوں نے حضورؐ کے مشورے کو قبول نہ کیا اور طلاق دے دی۔ یہ خلاف ورزی رسولؐ کے مقابلہ میں نہ تھی، نہ حضورؐ نے جو مشورہ دیا تھا وہ رسُولِ خدا کی حیثیت سے تھا، اس لیے نہ آپ ناراض ہوئے نہ خدا ناراض ہوا۔ اگر حضورؐ کی جگہ کوئی اور ایسا شخص ہوتا جس نے کسی کو بچپن میں پالا ہو اور اس پر احسانات کیے ہوں اور آخر میں غلامی سے داغدار ہونے کے باوجود اپنی بہن کی شادی اس سے کی ہو اور پھر اس نے باوجود منع کرنے کے اس کی بہن کو طلاق دے دی ہو، تو وہ ضرور ناراض ہوتا۔ مگر حضورؐ صرف مُربّی اور برادرِ نسبتی ہی نہ تھے، بلکہ رسولِ خدا بھی تھے، اور رسُول ہونے کی حیثیت سے یہ بھی آپ کا فرض تھا کہ انسان کو انسان کی بندگی سے آزاد کریں اور انسان کو انسان کے مقابلہ میں آزادی کا کھویا ہُوا حق واپس دلوائیں۔ اس لیے آپؐ نے حکم نہیں بلکہ مشورہ دیا اور اس مشورہ کے خلاف عمل کرنے پر قطعاً کسی ناراضی کا اظہار نہ فرمایا۔ اسی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپؐ کی ذات میں حیثیتِ نبوی اور حیثیتِ بشری الگ الگ بھی تھیں اور باہم پیوستہ بھی تھیں۔ آپؐ نے ان دونوں کے استعمال میں ایسا حیرت انگیز توازن قائم کیا تھا کہ ایک نبی ہی ایسے توازن پر قادر ہو سکتا ہے۔ حیثیتِ بشری میں بھی آپ اس طرح عمل فرماتے تھے کہ نبوّت کے فرائض اس کے ضمن میں ادا ہوتے رہتے تھے۔

حضورؐ کی تعلیم کردہ حُریّتِ فکر

سرکارِ رسالت مآبؐ نے جس حُریّتِ فکر کی تخم ریزی کی تھی، اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسان کے مقابلہ میں آزادیِ رائے استعمال کرنے کا جو سبق اپنے متبعین کو خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے سکھایا تھا، اسی کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرام تمام انسانوں سے زیادہ احکامِ الٰہی کے اطاعت کیش اور تمام انسانوں سے زیادہ آزاد خیال و جمہوریّت پسند تھے۔ وہ بڑے سے بڑے شخص کے مقابلہ میں بھی اپنی رائے کی آزادی کو قربان نہ کرتے تھے۔ ان کی ذہنیت سے یہ بات بالکل بعید تھی کہ کسی رائے کو محض اِس بنا پر تنقید سے بالاتر سمجھیں کہ وہ فلاں بڑے آدمی کی رائے ہے۔ ان میں سے جو بڑے آدمی تھے، جن کی بڑائی کو وہ خود تسلیم کرتے تھے اور جن کی بڑائی آج ایک دُنیا تسلیم کر رہی ہے، ان کی رائے کو بھی انہوں نے محض ان کی بڑائی کی بنا پر قبول نہ کیا بلکہ آزادی کے ساتھ رد بھی کیا اور قبول بھی کیا۔ خلفائے راشدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد سب سے زیادہ اس آزادیٔ رائے کے حامی تھے۔ انہوں نے اپنے آقا کی پیروی میں لوگوں کی آزادی کو نہ صرف گوارا کیا بلکہ اس کی ہمّت افزائی کی اور کبھی کسی چھوٹے سے

چھوٹے . . . . سے بھی یہ مطالبہ نہ کیا کہ ہم بڑے آدمی ہیں اس لیے ہماری بات بے چون و چرا تسلیم کرو۔

حُرّیتِ فکر خلافتِ راشدہ کے بعد

خلفائے راشدین کے بعد بنی اُمیّہ اور بنی عبّاس نے حُرّیتِ فکر کو خوف اور طمع دلا کر ظلم و ستم اور زرپاشی کی طاقتوں سے ہر طرح کچلنے کی کوشش کی، مگر تابعین اور تبع تابعین میں اور ان کے بعد بھی ایک مدت تک مسلمانوں میں یہ رُوح باقی رہی۔ ابتدائی دو تین صدیوں تک آپ کو تاریخِ اسلامی میں اس کے نہایت روشن نشانات نظر آئیں گے۔ اُمراء اور حکّام کے مقابلہ میں آزادی تو نسبتاً ایک چھوٹی چیز ہے۔ رُوح اور دماغ کی آزادی کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ انسان جس کو مقدس سمجھے، جس کی عزت و عظمت اس کے نہاں خانۂ قلب میں جاگزیں ہو، اس کی بھی اندھی تقلید سے انکار کر دے، اور اس کے مقابلہ میں آزادی کے ساتھ سوچے اور آزادی کے ساتھ رائے قائم کرے۔ یہی سپرٹ ہم کو اُس دَور کے اہلِ علم میں نظر آتی ہے۔

ائمۂ فقہاء کی حُرّیتِ فکر

صحابۂ کرام سے بڑھ کر مقدس ہستیاں اور کون ہوں گی؟ اور حضراتِ تابعین سے بڑھ کر کس کے دل میں ان کا احترام ہو گا؟ مگر یہ لوگ آزادی کے ساتھ صحابۂ کرام کی آراء پر نقد کرتے تھے، ان کے اختلافات میں محاکمہ کرتے تھے، اور ایک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے قبول کرتے تھے۔ اختلافِ صحابہؓ کے معاملہ میں امام مالکؒ کس صفائی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خطاء وصواب فانظر فی ذالك . . . "صحابہؓ کی آراء میں خطا بھی ہے اور صواب بھی۔ تم خود غور کر کے رائے قائم کرو۔" اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد ہے: احد القولین خطاء والمأثم فیه موضوع۔ "دو مختلف اقوال میں سے ایک بہر حال غلط ہو گا۔"

خود ان بزرگوں میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم خطا سے بری ہیں، اور تم اپنی فکر و نظر کو بالکل معطّل کر کے صرف ہماری رائے کی پیروی کرو۔ سیدنا ابو بکر صدیقؓ جب کسی مسئلہ میں اپنی رائے سے کچھ فرماتے تو ساتھ ہی یہ بھی فرما دیتے کہ ھٰذا رأیی فان یکن صوابا فمن الله وان یکن خطاءً فمنّی واستغفر الله "یہ میری رائے ہے، اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اگر غلط ہے تو میری خطاء ہے اور مَیں خدا سے مغفرت چاہتا ہوں۔"

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں لا تجعلوا خطاء الرای سنّة للأمة "رائے کی غلطی کو اُمّت کے لیے سُنّت نہ بناؤ۔"

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے الا لا یقلّدنّ احدکم دینه رجلاً، ان امن امن وان کفر کفر، فانه لا اسوة فی الشر۔ "خبردار کوئی شخص اپنے دین کے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کی اندھی تقلید نہ کرے کہ وہ مومن ہُوا تو یہ بھی مومن ہُوا اور وہ کافر ہُوا تو یہ بھی کافر ہو گیا۔ بُرائی اور غلطی میں کسی کی پیروی نہیں ہے۔"

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

انما انا بشر اخطی واصیب فانظروا فی رائی فکلما وافق الکتاب والسنۃ فخذوہ وکلما لم یوافق الکتاب والسنۃ فاترکوہ۔

"مَیں ایک انسان ہُوں۔ میری رائے غلط بھی ہوتی ہے اور درست بھی۔ تم میری رائے پر غور کرو۔ جو کچھ کتاب وسُنّت کے موافق پاؤ اُسے قبول کرو اور جو بات خلاف دیکھو اسے چھوڑ دو۔"

امام مالکؒ کا یہ واقعہ تاریخوں میں موجود ہے کہ خلیفہ منصُور عباسی ان کی کتاب الموطا کو تمام عالمِ اسلامی کا دستور العمل بنانا چاہتا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ تمام مذاہبِ فقہیہ کو موقوف کر کے صرف مذہب مالکیؒ کو رائج کر دے۔ مگر امام صاحبؒ نے خود اس کو ایسا کرنے سے روک دیا کیونکہ وہ دوسروں سے تحقیق و آزادیٔ رائے اور اجتہاد کا حق سلب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

امام ابو یُوسفؒ فرماتے ہیں:

لا یحلّ لاحد ان یقول مقالتنا حتی یعلم من این قلنا۔

"کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول کا قائل ہو تا وقتیکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے قول کا ماخذ کیا ہے۔"

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

مثل الذی یطلب العلم بلا حجّۃ کمثل حاطب لیلٍ یحمل حزمۃ حطبٍ وفیہ افعٰی تلدغہ وھو لا یدری۔

"جو شخص دلیل کے بغیر علم حاصل کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو رات کو لکڑیاں چُن رہا ہو۔ وہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھاتا ہے اور اس کو خبر نہیں کہ اس گٹھے میں کہیں سانپ بھی چھپا ہُوا ہے جو اُسے ڈس لے گا۔"

اسلامی حُرّیتِ فکر و نظر کی تباہی کا دَور

تقریباً تین صدیوں تک تحقیق و اجتہاد اور حُرّیتِ فکر و نظر اور آزادانہ طلبِ حق کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں پُوری شان کے ساتھ باقی رہی جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تبعین میں پیدا کر گئے تھے۔ اس کے بعد اُمراء و حکّام اور علماء و مشائخ کے استبداد نے اس رُوح کو کھانا شروع کر دیا۔ سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے کا حق اور بولنے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کر لیا گیا۔ درباروں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی، دل اور دماغ، رُوح اور جسم کی غلامی اُن پر پُوری طرح مُسلّط ہو گئی۔ دربار والوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کرا کے غلامانہ ذہنیت پیدا کی۔

مدرسے والوں نے خدا پرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر دماغوں میں اُتارا۔ خانقاہ والوں نے "بیعت" کے مسنون طریقے کو مسخ کر کے "مقدس غلامی" کا وہ طوق مسلمانوں کی گردنوں میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور بھاری طوق انسان نے انسان کے لیے کبھی ایجاد نہ کیا ہو گا۔ جب غیر اللہ کے سامنے زمین تک سر جھکنے لگیں، جب غیر اللہ کے آگے نماز کی طرح ہاتھ باندھے جانے لگیں، جب انسان کے سامنے نظر اٹھا کر دیکھنا سُوءِ ادبی ہو جائے، جب انسان کے ہاتھ اور پاؤں چُومے جانے لگیں، جب انسان، انسان کا خداوند اور اَن داتا بن جائے، جب انسان بذاتِ خود امر و نہی کا مُختار اور کتابُ اللہ و سُنّتِ رسول اللہ کی سند سے بے نیاز قرار دیا جائے، جب انسان خطا سے پاک اور نقص سے بَری اور عیب سے منزّہ سمجھ لیا جائے، جب انسان کا حکم اور اس کی رائے اعتقاداً نہ سہی عملاً اسی طرح واجب الاطاعت قرار دے لی جائے جس طرح خدا کا حکم واجب الاطاعت ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اُس دعوت سے مُنہ موڑ لیے گئے جو اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کے الفاظ میں دی گئی تھی۔ اس کے بعد کوئی علمی، اخلاقی، روحانی ترقی ممکن ہی نہیں۔ پستی اور زوال اس کا لازمی نتیجہ ہے۔[۱۰۴]

فصل ۳

رسالت اور اُس کے احکام

اطاعتِ رسُول کے مسئلہ میں یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ کوئی رسُول اپنی ذاتی حیثیت میں مُطاع اور متبُوع نہیں ہو سکتا۔ نہ موسیٰ علیہ السّلام کی اطاعت اور پیروی اِس بنا پر ہے کہ وہ مُوسیٰ بن عمران ہیں، نہ عیسیٰ بن مریم علیہا السّلام اِس وجہ سے لائقِ اطاعت و اتباع ہیں کہ وہ عیسیٰ بن مریم ہیں، اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع اس حیثیت سے لازم ہے کہ آپ محمد بن عبداللہ ہیں۔ اطاعت اور پیروی جو کچھ بھی ہے صرف اِس حیثیت سے ہے کہ یہ حضرات اللہ کے رسُول ہیں۔ اللہ نے ان کو وہ علمِ حق عطا کیا جو عام انسانوں کو عطا نہیں کیا اور ان کو وہ ہدایت بخشی جو عام انسانوں کو نہیں بخشی، اور ان کو دنیا میں اپنی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کے وہ صحیح طریقے بتائے جن کو عام لوگ اپنی رائے و عقل یا انبیاء کے سوا دوسرے لوگوں کی رہنمائی سے معلوم نہیں کر سکتے۔ اب اختلاف جس امر میں واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسُول کی اطاعت اور پیروی کس امر میں ہے اور کس حد تک ہے۔

ایک گروہ کا نقطۂ نظر

ایک گروہ کہتا ہے کہ اطاعت اور پیروی صرف اُس کتاب کی ہے جو اللہ کی طرف سے اس کا رسُول لے کر آتا ہے۔ تبلیغِ کتاب کے بعد رسُول کی حیثیتِ رسالت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ بھی ویسا ہی ایک انسان ہے جیسے اور دوسرے انسان۔ اگر دوسرے انسان امیر اور سردارِ قوم ہوں تو محض نظم و ضبط (Discipline) کے لیے ان کی اطاعت لازم ہو گی، مگر مذہبی فریضہ نہ ہو گی۔ دوسرے اگر عالم، حکیم اور مُقنّن ہوں تو ان کے اوصاف (Merits) کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی پیروی کی جائے گی، اور یہ پیروی اختیاری ہو گی، واجب نہ ہو گی۔ یہی معاملہ رسولِ خدا کا بھی ہے تبلیغِ کتاب کے سوا دوسرے تمام معاملات میں رسُول کی حیثیت محض شخصی ہے۔ بحیثیت ایک شخص کے اگر وہ امیر ہے تو اس کی اطاعت بالمشافہہ ہے نہ کہ دائمی۔ اگر وہ قاضی ہے تو اس کے فیصلے وہیں تک نافذ ہوں گے جہاں تک اس کے حدُودِ قضا (Jurisdiction) ہیں۔ ان سے باہر زیادہ سے زیادہ ایک فاضل جج کی حیثیت سے اس کے فیصلے بطور ایک نظیر کے لیے جائیں گے نہ کہ

ایک شارع اور واضعِ قانون کی حیثیت سے۔ اگر وہ حکیم ہے تو اس کی زبان سے جو حکمت اور اخلاق کی باتیں نکلیں گی وہ اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے قبول کی جائیں گی جس طرح دوسرے علماء و عقلاء کی ایسی ہی باتیں قبول کی جاتی ہیں۔ محض اِس بنا پر کہ وہ حاملِ منصبِ رسالت کی زبان سے نکلی ہیں وہ داخلِ دین نہیں سمجھی جائیں گی۔ اسی طرح اگر وہ ایک نیک سیرت انسان ہے اور اس کی زندگی اپنے اطوار، آداب اور معاملات کے اعتبار سے ایک بہترین زندگی ہے تو ہم بالاختیار اس کو نمونہ (Model) بنائیں گے، جس طرح ایک غیر نبی کی اچھی زندگی نمونہ قرار دینے میں ہم مختار ہیں۔ لیکن اُس کا کوئی عمل اور قول ہمارے لیے اخلاق، معاشرت، معیشت اور معاملات میں ایسا قانون نہ ہوگا جس کی پیروی ہم پر واجب ہو۔

دوسرے گروہ کا نقطۂ نظر

ایک دوسرا گروہ اِس خیال میں تھوڑی سی ترمیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے رسُول کے ذمّہ صرف کتاب پہنچا دینا ہی نہ تھا بلکہ کتاب کے احکام پر عمل کر کے دکھا دینا بھی تھا کہ اُمّت اُسی نمونہ پر عامل ہو۔ لہٰذا عبادات و طاعات وغیرہ کے متعلق احکامِ کتاب کی جو تفصیلی عملی صورت رسُول نے بتائی ہے، اس کی پیروی بھی کتاب ہی کی پیروی ہے، اور دینی فرض ہے۔ باقی رہے وہ معاملات جو احکامِ کتاب کے علاوہ رسُول اپنی شخصی حیثیت میں ایک امیر، ایک قاضی، ایک مُصلحِ قوم، ایک حکیم، ایک شہری، اور ایک فردِ جماعت کی حیثیت سے انجام دے، تو ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ایک دائمی اور عالمگیر ضابطہ و قانون بنانے والی ہو اور جس کی پیروی ہمیشہ کے لیے ایک دینی فرض ہو۔

تیسرے گروہ کا نقطۂ نظر

ایک تیسرا گروہ ہے جو رسُول کی حیثیتِ رسالت کو اس کی زندگی کے ایک بہت بڑے حصّے پر حاوی سمجھتا ہے۔ اخلاق، معاشرت، معاملات، احکام و قضایا، اور بہت سے دوسرے معاملات میں اس کے قول اور فعل کا خدا کی جانب سے ہونا تسلیم کرتا ہے۔ اور یہ بھی مانتا ہے کہ یہ سب چیزیں اُمّت کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں۔ مگر وہ حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی میں فرق ضرور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ رسُول کی زندگی کے بعض معاملات ایسے ضرور ہیں جو حیثیتِ رسالت سے خارج ہیں اور قابلِ تقلید نمونہ نہیں۔ اگرچہ وہ کوئی ایسا واضح خط نہیں کھینچ سکتا جو حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی میں تین امتیاز کر دیتا ہو، اور ایسی حد مقرر کرتا ہو جہاں پہنچ کر رسول کی حیثیت محض ایک انسان کی رہ جاتی ہے۔

چوتھے گروہ کا نقطۂ نظر

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ رسُول کی شخصی حیثیت اور رسالت کی حیثیت اگرچہ اعتبار میں دو جُداگانہ حیثیتیں ہیں، مگر وجُود میں یہ دونوں ایک ہی ہیں اور ان کے درمیان عملاً کوئی فرق کرنا ممکن نہیں ہے۔ منصبِ رسالت دنیاوی عہدوں کی طرح نہیں ہے کہ عہدہ دار جب تک اپنے عہدہ کی کُرسی پر بیٹھا ہے، عہدہ دار رہے، اور جب اُس سے اُترا تو

ایک عام انسان ہے۔ بلکہ رسُول جس وقت منصبِ رسالت پر سرفراز ہوتا ہے، اُس وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن مامور (On Duty) ہوتا ہے اور وہ کوئی ایسا فعل نہیں کر سکتا جو اُس سلطنت کی پالیسی کے خلاف ہو جس کا وہ نمائندہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کی زندگی کے معاملات، عام اِس سے کہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے، سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوں یا ایک شوہر، باپ، بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے، سب پر اُس کی حیثیتِ رسالت اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ اس کی ذمّہ داریاں کسی حال میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے منفک نہیں ہوتیں، حتیٰ کہ جب وہ اپنی خلوت میں اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے، اُس وقت بھی وہ اُسی طرح اللہ کا رسُول ہوتا ہے جس طرح وہ مسجد میں نماز پڑھاتے ہوتے ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی ہدایت کے تحت کرتا ہے۔ اس پر ہر آن اللہ کی طرف سے سخت نگرانی ہوتی ہے جس کے تحت وہ اُن ہی حدُود کے اندر رہ کر چلنے پر مجبُور ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں، اور اپنے اقوال میں، اعمال میں، اور زندگی کے پُورے رویّے میں دُنیا کے سامنے اِس امر کا مظاہرہ کرتا ہے کہ یہ ہیں وہ اصول جن پر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام قائم ہونا چاہیے، اور یہ ہیں وہ حُدُود جن کے دائرے میں انسان کی آزادئ عمل کو محدُود ہونا چاہیے۔ اِس خدمت کو نبی اپنی شخصی و خانگی زندگی میں اُسی طرح انجام دیتا رہتا ہے جس طرح اپنی سرکاری حیثیت میں، اور کسی معاملہ میں بھی اگر اس کے قدم کو ذرا سی لغزش ہو جاتی ہے تو اس کو فوراً تنبیہ کی جاتی ہے، کیونکہ اس کی خطا صرف اُسی کی خطا نہیں بلکہ ایک پُوری اُمّت کی خطا ہے۔ اس کو بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر کے ان کے سامنے ایک "مُسلم" کی زندگی کا نمونہ پیش کر دے اور صرف یہی نہیں کہ انفرادی معاملات میں ان کی رہنمائی کر کے ان کو فرداً فرداً مسلمان بنائے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلام کا تمدّنی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام قائم کر کے صحیح معنوں میں ایک مُسلم سوسائٹی بھی وجود میں لے آئے۔ لہٰذا اس کا خطا اور غلطی سے محفوظ ہونا لازم ہے تاکہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کی جا سکے اور اس کے قول و فعل کو بالکلیہ اسلام کی تعلیم اور اسلامیت کا معیار قرار دیا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ نبیؐ کے اقوال و افعال میں تقلید و تاسّی کے لحاظ سے فرقِ مراتب ضرور ہے بعض وجوب اور فرضیت کے درجہ میں ہیں، بعض استحباب کے درجہ میں، اور بعض ایسے ہیں جن کی حیثیت درجۂ استکمال کی ہے۔ لیکن فی الجملہ نبی کی پُوری زندگی ایک ایسا نمونہ (Model) ہے جس کو اِسی لیے پیش کیا گیا ہے کہ بنی آدم اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ جو شخص اس نمونہ کی مطابقت میں جتنا بڑھا ہوا ہوگا وہ اُتنا ہی کامل انسان اور مسلمان ہوگا۔ اور جو اس کی مطابقت کے کم از کم ناگزیر مرتبہ سے بھی گھٹ جائے گا وہ اپنی کوتاہی کے لحاظ سے فاسق و فاجر، گمراہ اور مغضوب ہوگا۔

میرے نزدیک یہی آخری گروہ حق پر ہے، اور مَیں قرآن اور عقل کی روشنی میں جتنا زیادہ غور کرتا ہوں اِس

مسلک کی حقانیت پر میرا یقین بڑھتا جاتا ہے۔

بچپن سے انبیاء کی تربیت کا خصوصی اہتمام

انبیاء علیہم السلام کے جو حالات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اُن کو دیکھنے سے مُجھ کو نبوّت کی حقیقت یہ نہیں معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ یکایک راہ چلتے کسی کو پکڑ کر اپنی کتاب پہنچانے کے لیے مامُور کر دیتا ہو، یا کسی شخص کو اس طور پر اپنی پیغام بَری کے لیے مقرر کرتا ہو کہ وہ ایک جُز وقتی مزدُور (Part Time Worker) ہے جو مقررہ اوقات میں ایک مقررہ کام کر دیتا ہے اور اس کام کو ختم کرنے کے بعد آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ برعکس اس کے میں دیکھتا ہوں کہ اللہ نے جب کسی قوم میں نبی بھیجنا چاہا ہے تو خاص طور پر ایک شخص کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ نبوّت کی خدمت انجام دے۔ اس کے اندر انسانیت کی وہ بلند ترین صفات اور وہ اعلیٰ درجہ کی ذہنی و روحانی قوتیں ودیعت کی ہیں جو اِس اہم ترین منصب کو سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں۔ پیدائش کے وقت سے خاص اپنی نگرانی میں اس کی پرورش اور تربیت کرائی ہے۔ نبوّت عطا کرنے سے پہلے اس کو اخلاقی عیوب سے، گمراہیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھا ہے۔ خطرات اور مہلکوں سے اس کو بچایا ہے۔ اور ایسے حالات میں اُس کی پرورش کی ہے جن میں اس کی استعدادِ نبوّت قوّت سے ترقی کر کے فعلیت کی طرف بڑھتی رہی ہے۔ پھر جب وہ اپنے کمال کو پہنچ گیا ہے تو اس کو خاص اپنے پاس سے علم اور قوتِ فیصلہ (Judgement) اور نورِ ہدایت عطا کر کے منصبِ نبوّت پر مامُور کیا ہے اور اس سے اِس طرح یہ کام لیا ہے کہ اِس منصب پر آنے کے بعد سے آخری سانس تک اس کی پوری زندگی اِسی کام کے لیے وقف رہی ہے۔ اس کے لیے دُنیا میں تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس کے سوا کوئی مشغلہ نہیں رہا ہے۔ رات، دن، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اس کو یہی دُھن رہی ہے کہ گمراہوں کو راہِ راست پر لائے، اور راہ راست پر آجانے والوں کو ترقی کی اعلیٰ منزلوں پر جانے کے قابل بنائے۔ وہ ہمیشہ ایک ہمہ وقتی ملازم (Whole Time Servant) رہا ہے جس کو کبھی چھٹی نہیں ملی۔ اور نہ کبھی اس کے لیے اوقاتِ کار (Working Hours) مقرر کیے گئے۔ اس پر خدا کی طرف سے شدید نگرانی مقرر رہی ہے کہ خطا نہ کرنے پائے۔ ہوائے نفس کے اتباع اور شیطانی وساوس سے اس کی سخت حفاظت کی گئی ہے۔ اور معاملات کو بالکل اس کی بشری عقل اور اس کے انسانی اجتہاد پر نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ جہاں بھی اس کی خواہش یا اس کے اجتہاد نے خدا کے مقرر کیے ہوئے خطِ مستقیم سے بال برابر بھی جنبش کی ہے، وہیں اس کو ٹوک کر سیدھا کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اُس کی پیدائش اور اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ رہا ہے کہ خدا کے بندوں کو سواءُ السبیل اور صراطِ مستقیم پر چلائے۔ اگر وہ اِس خط سے یک سرِ مُو بھی ہٹتا تو عام انسان میلوں اس سے دُور نکل جاتے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے لفظ لفظ پر قرآن گواہ ہے۔

۱۔ یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام پیدائش سے پہلے ہی نبوّت کے لیے نامزد کر دیئے جاتے تھے اور ان کو خاص طور پر اسی مقصد کے لیے پیدا کیا جاتا تھا متعدد انبیاء کے احوال سے معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے پہلے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی پیدائش اور نبوّت کی خوشخبری دے دی جاتی ہے۔ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ (الصّٰفّٰت: آیات ۱۱۰-۱۱۲) حضرت یوسفؑ کے متعلق بچپن ہی میں حضرت یعقوبؑ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو برگزیدہ کرنے اور ابراہیم و اسحٰق علیہما السّلام کی طرح ان پر اپنی نعمت کا اتمام کرنے والا ہے۔ حضرت زکریاؑ بیٹے کے لیے دعا کرتے ہیں تو ان کو حضرت یحییٰ علیہ السّلام کی خوشخبری ان الفاظ میں دی جاتی ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (آل عمران: آیت ۳۹) حضرت مریم کے پاس خاص طور پر فرشتہ بھیجا جاتا ہے کہ ان کو ایک پاک طینت لڑکے (غلامِ زکی) کی خوشخبری دے۔ اور جب ان کے وضعِ حمل کا وقت آتا ہے تو خاص حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی زچگی کے انتظامات ہوتے ہیں (ملاحظہ ہو سورۂ مریم رکوع دوم)۔ پھر اُس اسرائیلی چرواہے کو بھی دیکھیے جس سے وادیٔ مقدّس طُوٰی میں بُلا کر باتیں کی گئیں۔ وہ بھی عام چرواہوں کی طرح نہ تھا۔ اسے مصر میں خاص طور پر فرعونیت کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا کیا گیا۔ اس کو قتل سے بچوانے کے لیے ایک تابوت میں رکھوا کر دریا میں ڈلوا دیا گیا۔ اسے خاص اُسی فرعون کے گھر میں پہنچا دیا گیا جس کو وہ تباہ کرنے والا تھا۔ اس کو پیاری صورت دی گئی کہ فرعون کے گھر والوں کے دل میں گھر کر لے۔ (وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ)۔ اس کے مُنہ کو تمام عورتوں کے دُودھ سے روک دیا گیا۔ اور اس کی پرورش کا انتظام خاص طور پر حق تعالیٰ کی نگرانی میں ہوا (وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ)۔ یہ چند مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام خاص طور پر نبوّت ہی کے لیے پیدا کیے جاتے تھے۔

غیر معمولی قابلیتیں اور خصوصی صلاحیتیں

پھر دیکھیے کہ اس طرح جن لوگوں کو پیدا کیا جاتا ہے وہ عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ غیر معمولی قابلیتوں کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ ان کی فطرت نہایت پاکیزہ ہوتی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے جو بات نکلتی ہے سیدھی نکلتی ہے۔ غلط روی اور کج بینی کی استعداد ہی ان میں نہیں ہوتی۔ وہ جبلّی طور پر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ بلا ارادہ اور بلا کسی غور و فکر کے محض حواس اور وجدان (Intuition) سے وہ اُن صحیح نتائج پر پہنچ جاتے ہیں جن پر دوسرے انسان غور و فکر کے بعد بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے علوم کسبی نہیں ہوتے بلکہ جبلّی و وَہبی ہوتے ہیں۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط کا امتیاز اُن کی عین سرشت میں ودیعت کیا جاتا ہے۔ وہ فطرتاً صحیح سوچتے ہیں، صحیح بولتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یعقوبؑ کو دیکھیے۔ حضرت یُوسفؑ کا خواب سُنتے ہی اُن کے دل میں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے کہ

اِس بچے کو اِس کے بھائی جینے نہ دیں گے۔ برادرانِ یُوسفؑ ان کو کھیل کے لیے لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت یعقوبؑ نہ صرف اُن کی بُری نیت کو بھانپ جاتے ہیں، بلکہ ان کو ٹھیک وہ بہانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے جو بعد میں وہ بنانے والے تھے۔ فرماتے ہیں وَاَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ۔ پھر جب یُوسفؑ کے بھائی خون کا بھرا ہُوا کرتا لاکر دکھاتے ہیں تو حضرت یعقوبؑ دیکھ کر فرماتے ہیں بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا۔ اِسی طرح جب برادرانِ یُوسفؑ مصر سے واپس آکر کہتے ہیں کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور یقین دلانے کے لیے یہاں تک عرض کرتے ہیں کہ اُس بستی کے لوگوں سے پُوچھ لیجیے جہاں سے ہم آرہے ہیں تو حضرت یعقوبؑ پھر وہی جواب دیتے ہیں کہ یہ تمہارے نفس کا دھوکہ ہے۔ بیٹوں کو پھر مصر بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اِذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ "جاؤ اور جاکر یوسفؑ اور اس کے بھائی کا پتہ چلاؤ۔" گویا سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی ان کو یقین ہے کہ حضرت یُوسفؑ زندہ ہیں اور مصر ہی میں موجود ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ کا قمیص لے کر مصر سے چلتے ہیں تو ان کو دُور ہی سے حضرت یُوسفؑ کی خوشبُو آنے لگتی ہے۔ اِن باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی نفسی و رُوحانی قوتیں کس قدر غیر معمولی ہوتی ہیں۔ یہ صرف حضرت یعقوبؑ ہی کی خصوصیت نہیں تمام انبیاء کا یہی حال ہے۔ حضرت یحییٰؑ کے متعلق ارشاد ہے:

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً۔ (مریم: ۱۲-۱۳)	ہم نے بچپن ہی میں اس کو قوتِ فیصلہ اور رحم دلی اور پاک طینتی اپنی طرف سے عطا کی۔

حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے گہوارے میں کہلوایا جاتا ہے کہ:

وَجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا۔ (مریم: ۳۱-۳۲)	اور اُس نے مجھ کو برکت والا بنایا جہاں بھی مَیں رہوں اور اس نے مجھ کو وصیت کی کہ جب تک جیوُں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دُوں اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا اور مجھ کو جبّار اور شقی نہیں بنایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ (القلم: ۴)	اور تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

یہ سب اُن جبلّی اور فطری کمالات کی طرف اشارات ہیں جن کو لے کر انبیاء علیہم السلام پیدا ہوتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ اُن کی اِنہی فطری استعدادات کو ترقی دے کر فعلیّت کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ ان کو وہ چیز عطا کرتا ہے جس کو قرآن میں علم اور حکم (قوتِ فیصلہ) اور ہدایت اور بیّنہ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں:

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (اعراف: ۶۲)
میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوتِ سمٰوات وارض کا مشاہدہ کرادیا جاتا ہے (انعام: ۷۵)، اور جب وہ اس مشاہدہ سے علم یقین لے کر پلٹتے ہیں تو اپنے باپ سے کہتے ہیں:

یٰاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِکَ فَاتَّبِعْنِیْٓ اَھْدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا۔ (مریم: ۴۳)
اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا، لہٰذا میری پیروی کر میں تجھے سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

حضرت یعقوبؑ کے متعلق ارشاد ہے:

وَاِنَّہٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰہُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (یوسف: ۶۸)
اور یقیناً وہ علم رکھتا تھا جو ہم نے اس کو تعلیم کیا تھا مگر اکثر لوگ یہ راز نہیں جانتے۔

حضرت یوسفؑ کے حق میں فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗٓ اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّعِلْمًا۔ (یوسف۔ ۲۲)
اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو دانش اور قوتِ فیصلہ عطا کی۔

یہی بات حضرت موسٰیؑ کے حق میں بھی فرمائی (قصص: ۱۴)، یہی حکم اور علم حضرت لوطؑ کو عطا کیا گیا (انبیاء: ۷۴) اور اسی غیر معمولی علم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سرفراز ہوئے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (النساء۔ ۱۱۳)
اور اللہ نے تیرے اوپر کتاب اور حکمت اُتاری اور تجھے وہ علم دیا جو پہلے تو نہ جانتا تھا۔

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ۔ (انعام: ۵۷)
کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح اور روشن راستے پر ہوں۔

قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ۔ (یوسف: ۱۰۸)
کہو کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں بھی بصیرت پر ہوں اور وہ بھی جو میرے پیرو ہیں۔

اِس علم اور حکم سے نبی اور عام انسانوں کے درمیان اتنا عظیم تفاوت واقع ہو جاتا ہے جتنا ایک آنکھوں والے اور ایک نابینا کے درمیان ہوتا ہے۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ۔ (انعام: ۵۰)
میں تو اُسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ کہو اے محمدؐ! کیا اندھا اور آنکھوں والا

دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

اِن آیات میں جس چیز کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ ایک روشنی ہے جو انبیاء علیہم السّلام کے نفس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ اِسی لیے اس کا ذکر کتاب سے الگ کیا گیا ہے اور اسے انبیاء کی صفت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس روشنی سے حقائق کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی سے اُن امور میں نظر کرتے ہیں جو ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ علماء نے اسی چیز کا نام "وحی خفی" رکھا ہے، یعنی وہ اندرونی ہدایت و بصیرت جو ہر وقت ان بزرگوں کو حاصل رہتی ہے اور جس سے وہ ہر موقع پر کام لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ غور و فکر کے بعد جن باتوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے اور جن امُور میں حق و صواب معلوم نہیں کر سکتے ان میں نبی کی نظر اللہ کی دی ہوئی بصیرت اور روشنی کے زور سے آنِ واحد میں تہ تک پہنچ جاتی تھی۔

خدا کی طرف سے نگرانی اور حفاظت کا انتظام

اِس کے بعد قرآن مجید ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ نے انبیاء علیہم السّلام کو نہ صرف حکمت اور قوتِ فیصلہ اور غیر معمولی دانش و بینش عطا کی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ اُن پر خاص نظر رکھتا ہے۔ غلطیوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ گمراہیوں سے اُن کو بچاتا ہے خواہ وہ انسانی اثرات کے تحت ہوں، یا شیطانی وساوس کے تحت، یا خود ان کے اپنے نفس سے پیدا ہوں۔ حتیٰ کہ اگر بمقتضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں بھی غلطی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصّے میں دیکھیے۔ جب قریب تھا کہ عزیزِ مصر کی بیوی ان کو اپنے جال میں پھنسائے، اللہ تعالیٰ نے اپنی "بُرہان" دکھا کر اُن کو بدکاری سے محفوظ کر دیا۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۔كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف: ۲۴)	اُس نے یُوسفؑ سے ارادہ بد کر ڈالا اور وہ بھی اس کی طرف ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا ایسا ہُوا تا کہ ہم اُس کو بُرائی اور بے حیائی سے پھیر دیں کیونکہ وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جن کو ہم نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔

حضرت مُوسیٰ اور ہارُون علیہما السّلام کو جب فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا تو انہیں خوف ہُوا کہ کہیں فرعون اُن پر زیادتی نہ کرے۔ اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ کچھ خوف نہ کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، اور سب کچھ سُن اور دیکھ رہا ہوں (طٰہٰ: ۴۵-۴۶)۔ خوفِ بشریت کی بنا پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس بَشری کمزوری کو اپنی وحی سے دُور کیا۔

حضرت نوحؑ بیٹے کو ڈُوبتے دیکھ کر چیخ اٹھے "رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ" "خدایا یہ میرا بیٹا ہے"۔ یہ بشری کمزوری تھی۔ اللہ نے اُسی وقت اُن پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ وہ تیرے نطفہ سے ہو تو ہُوا کرے، مگر تیرے "اہل" سے نہیں ہے

کیونکہ عمل غیر صالح ہے۔ بشریت نے محبتِ پدری کے جوش میں ذرا سی دیر کے لیے نبی کی نظر سے اِس حقیقت کو چھپا دیا تھا کہ حق کے معاملہ میں باپ، بیٹا، بھائی، کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے اسی وقت آنکھوں پر سے پردہ اُٹھا دیا اور حضرت نوحؑ مطمئن ہو گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعدد مرتبہ ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔ اپنی فطری رحمت و رأفت، کفار کو مسلمان بنانے کی حرص، کفار کی تالیفِ قلب، لوگوں کے چھوٹے سے چھوٹے احسان کا بدلہ دینے کی کوشش، منافقین کے دلوں میں ایمان کی رُوح پھونکنے کی خواہش، اور کبھی کبھی اقتضائے بشریت کی بنا پر جب کبھی آپ سے کوئی اجتہادی لغزش ہوئی وحیِ جلی سے اس کی اصلاح کی گئی۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (عبس: ۱) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى (انفال: ۶۷) ۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (توبہ: ۴۳) ۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ: ۸۰) ۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (توبہ: ۸۴)۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (تحریم: ۱) ۔ یہ سب آیات اِسی امر کی شہادت دیتی ہیں۔ لوگ اِن آیات کو اِس بات کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غلطیاں سرزد ہوتی تھیں اور آپ غلطیوں سے مبرّا نہ تھے۔ خصوصاً حضراتِ اہلِ قرآن کو تو اِن آیات کے ذریعہ سے اللہ کے رسُول کی غلطیاں پکڑنے میں خاص مزہ آتا ہے۔ لیکن دراصل یہی تو وہ آیتیں ہیں جن سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنے نبی کو غلطیوں سے بچانے اور اُس کی زندگی کو ٹھیٹھ معیارِ حق پر قائم رکھنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ اور یہ حقیقت صرف مذکورہ بالا آیات ہی میں بیان نہیں ہوئی ہے، بلکہ قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اسے اصولی حیثیت سے بھی بیان فرمایا ہے۔ مثلاً فرمایا:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ۔ (النساء: ۱۱۳)

اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ تم کو راہِ راست سے ہٹا دینے کا عزم کر ہی چکا تھا مگر وہ خود اپنے آپ کو بہکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ کیونکہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اُتاری ہے اور تم کو وہ علم دیا ہے جو تم پہلے نہ جانتے تھے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ

قریب تھا کہ وہ تم کو اُس بات سے جو ہم نے تم پر وحی کی ہے منحرف کر دیتے تاکہ تم اُس کے سوا کچھ اور ہم پر بنا لو اور اُس وقت وہ تم کو دوست بنا لیتے۔ اگر

اِلَيۡهِمۡ شَيۡـًٔا قَلِيۡلًا۔ (بنی اسرائیل: ۷۳-۷۴)

ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو کسی قدر تم ان کی طرف جُھک ہی جاتے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ‌ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ‌۔ (الحج: ۵۲)

ہم نے تم سے پہلے جو نبی یا رسُول بھی بھیجا ہے اُس نے جب کبھی کسی بات کی تمنّا کی شیطان نے اس کی تمنّا میں وسوسہ ڈال دیا۔ مگر اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ (نبی کے دل میں) شیطان جو وسوسہ بھی ڈالتا ہے اللہ اسے مٹا دیتا ہے اور پھر اپنی آیات کو مضبوط کر دیتا ہے۔

اِن اُصولی ارشادات اور اُوپر کی واقعاتی مثالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زندگی کو ٹھیک ٹھیک معیارِ مطلوب پر قائم رکھنے کی ذمّہ داری خود اپنے اُوپر لی ہے اور اس نے اس بات کا سخت اہتمام کیا ہے کہ نبی سے جو لغزش بھی سرزد ہو جائے اس کی فوراً اصلاح کر دے، خواہ وہ لغزش کسی ذاتی معاملہ میں ہو یا پبلک معاملہ میں۔ پھر اگر اصولی طور پر یہ بات مان لی جائے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ نبی کے جن کاموں پر اللہ تعالیٰ نے گرفت نہیں کی ہے وہ سب کے سب اللہ کے معیارِ مطلوب پر پُورے اُترتے ہیں، اور گویا اُن پر خود اللہ ہی کی مُہرِ توثیق ثبت ہے۔

محاکمہ

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اِس امر کی توضیح کے لیے بالکل کافی ہے کہ نبوّت کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ ایک انسان جو تمام حیثیات سے دوسرے انسانوں جیسا ایک انسان ہو، ایک عمر کو پہنچنے کے بعد یکایک خدا کی طرف سے نزُولِ وحی کے لیے چُن لیا جائے اور بجز اُس کتاب کے جو اس پر نازل کی گئی ہو اور کسی بات میں بھی اس کی رائے، اس کے خیالات، اُس کے اعمال، اس کے احکام اور اس کے فیصلے غیر نبی انسانوں سے ممتاز نہ ہوں، جیسا کہ پہلے گروہ کا گمان ہے، یا یہ کہ اس میں اور عام انسانوں میں صرف اتنا ہی فرق ہو کہ تنزیلِ کتاب کے ساتھ ساتھ اُس کو احکامِ کتاب کی عملی تفصیلات بھی بتا دی گئی ہوں اور اِس خاص امتیازی حیثیت سے قطع نظر کر کے وہ محض عام امیروں جیسا ایک امیر اور عام قاضیوں جیسا ایک قاضی اور عام لیڈروں جیسا ایک لیڈر ہو، جیسا کہ دوسرے گروہ کا خیال ہے۔ اِسی طرح نبوّت کی حقیقت یہ بھی نہیں ہے کہ نبی کی ذاتِ بشریہ پر نبوّت عارض ہوتی ہو، اور اس کے عروض کے بعد بھی نبی کی بشریّت اور اُس کی نبوّت دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ رہتی ہوں، حتیٰ کہ ہم اس کی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے صرف اُس شعبہ کو اطاعت و اِتّباع کے لیے منتخب کر سکیں جو نبوّت سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ تیسرے گروہ کا نظریہ ہے۔ یہ تینوں خیالات بے اصل ہیں۔

نبی کامل و اکمل بشریّت سے آراستہ ہوتا ہے

ان کے برعکس قرآن مجید سے نبوّت کی حقیقت پر جو روشنی پڑتی ہے، اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ نبی اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گزرنے کے بعد نبوّت کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا ہے بلکہ وہ کارِ نبوّت ہی کے لیے پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ اگرچہ بشر ہی ہوتا ہے، اور اُن تمام حدُود سے محدود ہوا کرتا ہے جو حق تعالیٰ نے فطرتِ بشریہ کے لیے مقرر فرمائی ہے، لیکن اِن حدُود میں اُس کی بشریّت آخری اور انتہادرجہ کی کامل و اکمل بشریّت ہوتی ہے جس میں وہ تمام قوّتیں بدرجۂ اَتَم موجود ہوتی ہیں جو زیادہ سے زیادہ ایک انسان کو حاصل ہونی ممکن ہیں۔ اُس کے جسمانی، نفسانی، عقلی اور رُوحانی قوٰی عدل و تسویہ (Balance & Moderation) کے انتہائی مقام پر ہوتے ہیں۔ اس کے ادراکات اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ وہ بلا کسی غور و فکر کے اپنے وِجدان سے اُس الہامِ الٰہی کو پالیتا ہے جس کی طرف فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰىهَا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اُس کی فطرت اِتنی صحیح ہوتی ہے کہ وہ کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر صرف اپنے مَیلِ طبعی سے فجور کی راہ چھوڑ کر تقوٰی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا قلب اتنا سلیم ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں جو اُس کے سامنے آئے اُس الٰہی ہدایت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا ہے جس کی طرف وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اُس کے قلب کی سلامت اور اس کی فطرت کی صحت اُس کو خود بخود اُن راستوں سے ہٹا دیتی ہے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہیں۔ اور وہ آپ سے آپ اُن راستوں پر چلتا ہے جو مرضاتِ الٰہی کے عین مطابق ہیں۔ یہی کامل و اکمل بشریّت ہے جس کے ساتھ وہ صحیح معنوں میں بالفعل خدا کا خلیفہ ہوتا ہے، اور یہی چیز ہے جو اپنی پختگی اور اپنے کمال کو پہنچ جانے کے بعد ہدایتِ عام کے منصب پر سرفراز کی جاتی ہے، حق تعالیٰ کی طرف سے علم کی مزید روشنی پاکر سراجِ مُنیر بنتی ہے، مصالحِ عامۂ بشریہ کے لیے تعلیمات اور احکام کا مَہبط قرار پاتی ہے، اور اصطلاح میں نبوّت و رسالت سے موسوم ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ نبوّت ایک عرض ہے جو ایک خاص وقت میں نبی کے جوہرِ انسانیّت پر عارض ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی انسانیتِ کاملہ کا جوہر ہے جو نبوّت کی استعداد کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے اور فعلیّت کی طرف ترقی کرتے کرتے آخر کار نبوّت بنا دیا جاتا ہے۔ نبوّت کا منصب ایسا نہیں ہے کہ ایک انسان تھا جو وائسرائے بنا دیا گیا، حتیٰ کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا انسان ہوتا تو وہ بھی اُسی طرح وائسرائے بنا دیا جا سکتا تھا۔ بلکہ دراصل نبوّت ایک پیدائشی چیز ہے اور نبی کی حیثیتِ ذاتی ہی اُس کی حیثیتِ نبوی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ بعثت سے قبل اُس کی حیثیتِ نبوی بِالقُوّۃ ہوتی ہے اور بعثت کے بعد بالفعل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے میٹھا پھل کہ وہ بالذّات میٹھا پھل ہی پیدا ہوا ہے، لیکن اس کی مٹھاس پختگی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر ہی ظاہر ہوتی ہے۔

بحث سے متعلق چند آیات

اب اُن آیات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبوت اور ذاتِ نبوی کے حق میں متعدد مقامات پر ارشاد فرمائی ہیں۔ مَیں توضیحِ مُدعا کے لیے اِن آیات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے نقل کرتا ہوں:

(۱) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ۔ (آل عمران - ۱۷۹)

اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ تم کو براہِ راست غیب کا علم دے، بلکہ وہ اِس کام کے لیے اپنے رسُولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چُن لیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسُولوں پر۔

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء: ۶۴)

اور ہم نے جو رسُول بھی بھیجا ہے اِسی لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے[۱]۔

(۳) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء - ۸۰)

جس نے رسُول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

(۴) وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى۔ (النجم: ۱ تا ۴)

تارے کی قسم جب وہ ٹوٹتا ہے، تمہارا صاحب (یعنی نبی) نہ گُم کردہ راہ ہے اور نہ کج راہ، اور نہ وہ ہوائے نفس سے بولتا ہے۔ وہ صرف وحی ہے جو اُس پر کی جاتی ہے۔

(۵) اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ۔ (انعام - ۵۰)

مَیں صرف اُس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔

(۶) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب - ۲۱)

تمہارے لیے رسولِ خدا میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

(۷) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آلِ عمران - ۳۱)

اَے محمدؐ! کہہ دو کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

(۸) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ..... وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (النور - ۵۱ تا ۵۴)

اہلِ ایمان کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسُول کی طرف بلایا جائے تاکہ (رسول) اُن کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور مان لیا۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ..... اور اگر تم اُس کی (یعنی رسُول کی) اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔

---

[۱] یعنی رسول بذاتِ خود مُطاع نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے اذن یا اس کے حکم کی بنا پر مُطاع ہوتا ہے۔ (مؤلف)

(۹) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء: ۶۵)

پس قسم ہے تیرے پروردگار کی، نہیں! وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اے نبیؐ وہ اپنے آپس کے جھگڑے میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں، پھر تو جو فیصلہ کرے اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں بلکہ سر بسر تسلیم کریں۔

(۱۰) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (احزاب: ۳۶)

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو اُس کے لیے اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی ہے جس نے اللہ اور اس کے رسُول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

اِن آیات پر غور کیجیے تو تمام حقیقت آپ پر کھل جائے گی۔

نبی اور عام انسانوں کا فرق

پہلی آیت میں نبی اور عام انسانوں کے درمیان فرق ظاہر کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ نبی پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ اپنے غیب[1] کا علم ہر انسان پر فرداً فرداً ظاہر نہیں کرتا بلکہ اپنے بندوں میں سے کسی خاص بندے پر ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے عام انسانوں پر لازم ہے کہ وہ اُس بندے پر ایمان لائیں۔

اطاعتِ نبیؐ کا حکم مطلق ہے

(۲) دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول پر ایمان لانے کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو رسُولِ خدا مان لیا جائے بلکہ اس کے ساتھ رسُول کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ یہ اطاعت کا حکم نہ صرف اِس آیت میں، بلکہ قرآن کریم میں جہاں

---

[1] غیب یعنی وہ غیر محسوس حقیقتیں جن سے واقف ہوئے بغیر دنیا میں انسانی زندگی کے لیے کوئی صحیح طریقہ اور نظام نہیں بن سکتا۔ مثلاً یہ کہ انسان کی اصلیت کیا ہے؛ وہ آزاد ہے یا کسی کا محکوم؛ محکوم ہے تو کس کا محکوم ہے؟ اپنے حاکم سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؛ اسے کبھی اپنے حاکم کو جواب دینا ہے یا نہیں؛ جواب دینا ہے تو کہاں؛ کس شکل میں؛ کس معیار پر؛ کن معاملات میں؛ اور اس جواب دہی میں کامیاب یا ناکام ہونے کا کیا نتیجہ ہوگا؟ اِن سوالات کا جب تک کوئی جواب، اور وہ بھی قیاسی و گمانی جواب نہیں بلکہ علمی اور یقینی جواب معلوم نہ ہو، انسانی زندگی کے لیے کوئی اسکیم نہیں بن سکتی۔ اور یہی وہ علم ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں "غیب کے علم" سے تعبیر فرما رہا ہے (مؤلف)

جہاں بھی دیا گیا ہے، مُطلق ہے، مُقید نہیں ہے۔ کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ رسُول کی اطاعت فلاں فلاں اُمور میں ہے اور اُن امور کے سوا کسی دوسرے امر میں نہیں ہے۔ پس قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کا رسُول ایک حاکمِ عام ہے۔ جو حکم بھی وہ دے، مومنوں پر اس کا ماننا لازم ہے۔ یہ خود رسُول کے اپنے اختیار میں ہے کہ الٰہی ہدایت کے ماتحت اپنی حکومت کے اقتدار کو مخصوص حدود کے اندر محدُود کر دے، اور اُن حدُود سے باہر لوگوں کو رائے اور عمل کی آزادی بخش دے۔ لیکن مومنوں کو یہ حق ہرگز نہیں دیا گیا کہ وہ خود رسُول کے اختیارات کی حدبندی کریں۔ وہ تو قطعاً محکوم و مامُور ہیں۔ اگر رسُول ان کو زراعت اور نجاری اور حدادی وغیرہ کے طریقوں میں سے بھی کسی خاص طریقے کو اختیار کرنے کا حکم دیتا تو ان کا فرض یہی تھا کہ بے چون وچرا اس کے حکم کی اطاعت کرتے۔

نبی کی اطاعت معمولی انسان کی اطاعت نہیں

جب غیر مشروط اور غیر محدُود اطاعت کا حکم دے دیا گیا تو یہ اطمینان دلانا بھی ضروری تھا کہ نبی کی اطاعت اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت نہیں ہے، جیسا کہ اُن جاہل کُفار کا خیال تھا جو کہتے تھے کہ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ "کیا یہ تمہیں جیسا ایک بشر نہیں ہے"؟ اور مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ "یہ کچھ نہیں ہے مگر تمہارے ہی جیسا ایک بشر، اور اس پر چاہتا یہ ہے کہ تم پر فضیلت حاصل کرے"۔ اور لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ "اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو تم ضرور ٹوٹے میں رہو گے"۔ بلکہ دراصل یہ خدا کی اطاعت ہے، کیونکہ نبی جو کچھ کہتا ہے خدا کی طرف سے کہتا ہے، اور جو کچھ عمل کرتا ہے خدا کی ہدایت کے ماتحت کرتا ہے۔ وہ خود اپنے نفس کی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتا، بلکہ خدا کی وحی کا اتباع کرتا ہے۔ اس لیے تم کو مطمئن ہو جانا چاہیے کہ اس کی پیروی میں کسی قسم کی گمراہی اور غلط روی کا خطرہ نہیں ہے۔

نبی کی رہنمائی کے لیے وحی غیر مَتْلُو

یہی بات ہے جو تیسری چوتھی اور پانچویں آیت میں بیان کی گئی ہے۔ چوتھی اور پانچویں آیت میں جس چیز کو وحی کہا گیا ہے اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد کتاب اللہ ہے، اور کتاب کے سوا کوئی وحی نبی پر نہیں آتی۔ لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کی جاتی تھی بلکہ اُن کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل کرتا رہتا تھا اور اسی وحی کی روشنی میں وہ سیدھی راہ چلتے تھے، معاملات میں صائب رائے قائم کرتے تھے اور تدبیریں عمل میں لاتے تھے۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔ نوح علیہ السلام طوفان کی پیش بندی کے لیے اللہ کی نگرانی میں اور اس کی وحی کے ماتحت کشتی بناتے ہیں۔ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ حضرت ابراہیمؑ کو ملکوتِ سمٰوات وارض کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے اور مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت دکھائی جاتی ہے حضرت یوسفؑ کو خوابوں کی تعبیر بتائی جاتی ہے (ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ) حضرت موسیٰؑ سے طور پر باتیں کی جاتی ہیں۔ پُوچھا

جاتا ہے کہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ میری لاٹھی ہے، اِس سے بکریاں چراتا ہوں حکم ہوتا ہے کہ اس کو پھینک دو۔ جب لاٹھی اژدہا بن جاتی ہے اور حضرت موسٰیؑ ڈر کر بھاگتے ہیں تو فرمایا جاتا ہے یَامُوسٰیٓ اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّکَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ "موسٰیؑ ڈرو نہیں، آگے بڑھو، تم امن میں ہو" پھر حکم دیا جاتا ہے اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی "فرعون کی طرف جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے" وہ اپنی مدد کے لیے ہارون علیہ السلام کو مانگتے ہیں اور یہ درخواست قبول کی جاتی ہے۔ دونوں بھائی فرعون کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے: لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی "ڈرو نہیں، مَیں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ مَیں سُنتا اور دیکھتا ہوں" فرعون کے دربار میں جادُوگروں کے بناتے ہوتے سانپوں کو دیکھ کر حضرت موسٰیؑ ڈر جاتے ہیں تو وحی آتی ہے لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی "مت ڈرو تمہارا ہی بول بالا ہو گا" جب فرعون پر اتمامِ حُجّت ہو چکتا ہے تو اُن کو حکم دیا جاتا ہے کہ اَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ "میرے بندوں کو لے کر راتوں رات چل پڑو۔ تمہارا تعاقب کیا جائے گا" دریا پر پہنچتے ہیں تو فرمان آتا ہے اِضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ "دریا پر اپنا عصا مارو" کیا اِن میں سے کوئی وحی بھی ایسی ہے جو کتاب کی صورت میں ہدایتِ عامّہ کے لیے نازل ہوئی ہو؟ یہ مثالیں اس امر کے ثبوت میں کافی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ تعالٰی متوجہ رہتا ہے اور ہر ایسے موقع پر جہاں بشری فکر و رائے کے غلطی کرنے کا امکان ہو اپنی وحی سے اُن کی رہنمائی کرتا رہتا ہے، اور یہ وحی اُس وحی سے ماسوا ہوتی ہے جو ہدایتِ عام کے لیے اُن کے واسطے سے بھیجی جاتی اور کتاب میں ثبت کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لیے ایک الٰہی ہدایت نامے اور دستور العمل کا کام دے۔

حضورؐ پر وحیِ غیر مَتلُو ہونے کی چند مثالیں

ایسی ہی وحیِ غیر مَتلُو اور وحیِ خفی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل ہوتی تھی جس کی طرف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں۔ حضورِ انور نے پہلے بَیْتُ الْمَقْدِس کو قبلہ بنایا تھا۔ اس کے متعلق کوئی حکم کتاب اللہ میں نہیں آیا۔ مگر جب اس قبلہ کو منسوخ کر کے بیتُ الحرام کو قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا اُس وقت ارشاد ہُوا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْھَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْہِ۔ (البقرہ - ۱۴۲)	جس قبلے پر تم تھے اس کو ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا کہ رسُول کا اِتباع کرنے والے اور اتباع سے منہ موڑنے والے کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

اِس سے معلوم ہُوا کہ پہلے جو بیتُ المقدِس کو قبلہ بنایا گیا تھا، وہ وحی کی بنا پر تھا۔

جنگِ اُحُد کے موقع پر حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اللہ تعالٰی تمہاری مدد کے لیے فرشتے بھیجے گا۔ بعد میں اللہ تعالٰی نے حضورؐ کے اس ارشاد کا ذکر قرآن میں اِس طرح فرمایا:

وَمَا جَعَلَہُ اللّٰہُ اِلَّا بُشْرٰی لَکُمْ (آل عمران ۱۲۶)	اللہ نے اس وعدے کو تمہارے لیے خوشخبری بنایا

ظاہر ہُوا کہ یہ وعدہ اللہ کی طرف سے تھا۔

جنگِ اُحد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے غزوۂ بدرِ ثانیہ کے لیے لوگوں کو نکلنے کا حکم دیا۔ یہ حکم قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ مگر اللہ نے بعد میں تصدیق کی کہ یہ بھی اُسی کی جانب سے تھا۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (آل عمران - ۱۷۲)

جن لوگوں نے لڑائی میں زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسُول کی پکار پر لبّیک کہا۔

جنگِ بدر کے موقع پر حضورؐ کے مدینے سے نکلنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے:

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ (انفال - ۵)

جس طرح تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے نکالا۔

گھر سے نکلنے کا حکم قرآن میں نہیں آیا، مگر بعد میں اللہ نے تصدیق فرمائی کہ یہ نکلنا اُسی کے حکم سے تھا نہ کہ اپنی رائے سے۔

پھر عین جنگ کے موقع پر اللہ نے اپنے نبی کو خواب دکھایا:

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِىْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا۔ (انفال: ۴۳)

جب کہ اللہ ان کو قلیل بنا کر تیرے خواب میں تجھے دکھا رہا تھا۔

منافقین نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تقسیمِ صدقات پر ناک بھوں چڑھائی تو اللہ نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا کہ یہ تقسیم خود حضرتِ حق کے ارشاد سے عمل میں آئی تھی:

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ (توبہ: ۵۹)

اگر وہ راضی ہو جاتے اُس حصّہ پر جو اس نے اور اس کے رسُول نے ان کو دیا۔

صلح حُدیبیہ کے موقع پر تمام صحابہ صلح کے مخالف تھے، اور صُلح کی شرائط ہر شخص کو ناقابلِ قبول نظر آتی تھیں۔ مگر اللہ کے نبیؐ نے ان کو قبول کیا اور اللہ نے بعد میں تصدیق کی کہ یہ صلح اسی کی جانب سے تھی۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (الفتح - ۱)

ہم نے تجھ کو فتحِ مُبین عطا کی۔

متذکرہ آیات کا ماحصل

آیات کے تتبّع سے اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مگر یہاں استقصاء مقصود نہیں ہے، صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اللہ کا تعلق اپنے انبیاء کے ساتھ کوئی عارضی اور موقتی تعلق نہیں ہے کہ جب کبھی اس کو اپنے بندوں تک کوئی پیغام پہنچانا ہو بس اسی وقت یہ تعلق بھی قائم ہو اور اس کے بعد منقطع ہو جائے۔ بلکہ در اصل حق تعالیٰ جس شخص کو پیغمبری کے لیے منتخب فرماتے ہیں اُس کی طرف وہ ہمیشہ ایک توجہ خاص کے ساتھ متوجہ رہتے ہیں اور دائماً اپنی وحی سے اس کی ہدایت و رہنمائی فرماتے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی میں ٹھیک ٹھیک راہِ راست پر گامزن رہے، اور اس سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر نہ ہونے پائے جو مرضاتِ الٰہی کے خلاف ہو۔ سُورۂ نجم

کی ابتدائی آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ دراصل اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ اور جیسا کہ میں اس مضمون کے پہلے حصہ میں عرض کر چکا ہوں، یہ بات بھی قرآن نے کھول کر بیان کر دی ہے کہ انبیاء پر ہمیشہ اللہ کی نگرانی رہتی ہے، ان کو غلط روی سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور اگر باقتضائے بشریت ان سے کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے، یا وحی خفی کے لطیف اشارے کو سمجھنے میں وہ کبھی غلطی کر جاتے ہیں، یا اپنے اجتہاد سے کوئی ایسی روش اختیار کر جاتے ہیں جو مرضاتِ الٰہی سے یک سرِ مو بھی ہٹی ہوتی ہو تو اللہ تعالیٰ فوراً اُس کی اصلاح کرتا ہے اور تنبیہ کر کے سیدھے راستے پر لے آتا ہے۔ قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیائے کرام کی لغزشوں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی تنبیہوں کا جو ذکر آیا ہے اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں سے انبیاء علیہم السّلام کا اعتماد اُٹھ جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ جب انبیاء بھی ہماری ہی طرح نعوذ باللہ غلط کار ہیں تو ان کے احکام کی اطاعت اور ان کی رَوش کی پیروی کامل اطمینان کے ساتھ کیسے کی جاسکتی ہے بلکہ اس ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ہوائے نفس کا اِتّباع کرنے یا اپنی رائے اور بشری اجتہاد پر چلنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے۔ وہ چونکہ اُس کی طرف سے اُس کے بندوں کی رہنمائی کے لیے مامور کیے گئے ہیں، اس لیے ان پر یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ دائماً اُس کی ہدایت پر کاربند رہیں اور اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی اس کی رضا کے خلاف عمل نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بعض ایسی باتوں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کی گئی ہے جو عام انسانی زندگی میں قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مثلاً کسی انسان کا شہد کھانا یا نہ کھانا، اور کسی اندھے کی طرف توجّہ نہ کرنا اور اس کے دخل در معقولات پر چیں بہ جبیں ہو جانا، یا کسی کے لیے دعائے مغفرت کرنا، کونسا ایسا اہم واقعہ تھا؟ مگر اللہ نے نبی کو ایسے چھوٹے معاملات میں بھی اپنی رائے یا دوسروں کی مرضی پر چلنے نہ دیا۔ اِسی طرح جنگ کی شرکت سے کسی کو معاف کر دینا اور بعض قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا ایک امیر کی زندگی میں محض ایک معمولی واقعہ ہے۔ مگر نبی کی زندگی میں یہی واقعہ اتنا اہم بن جاتا ہے کہ اس پر وحی جلی کے ذریعے سے تنبیہ کی جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کے نبی کی حیثیت عام اُمراء کی سی نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں آزاد ہو، بلکہ منصبِ نبوّت پر مامُور ہونے کی وجہ سے نبی کے لیے لازم ہے کہ اس کا اجتہاد بھی ٹھیک ٹھیک منشاء الٰہی کے مطابق ہو۔ اگر وہ اپنے اجتہاد میں وحی خفی کے اشارے کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ کر مرضی الٰہی کے خلاف بال برابر بھی جنبش کرتا ہے تو اللہ وحی جلی سے اس کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

نبی کی راست روی مکمل طور پر قابلِ اعتماد ہے

اللہ نے اپنے نبی کی اِس خصوصیّت کو ہمارے سامنے اِسی لیے بیان فرمایا ہے کہ ہم کو اُس کے نبی کی راست روی پر کامل اعتماد ہو اور ہم پُورے وثوق کے ساتھ یقین رکھیں کہ نبی کا قول اور عمل گمراہی اور کج راہی اور اتباعِ ہوٰی اور بشری

فکر و رائے کی غلطیوں سے قطعاً محفوظ ہے۔ زندگی میں اس کا قدم مضبوطی کے ساتھ اِس صراطِ مستقیم پر جما ہُوا ہے جو ٹھیک ٹھیک خدا کی بتائی ہوئی ہے۔ اس کی سیرت پاک اسلامی سیرت کا ایک ایسا معیاری نمونہ ہے جس میں کسی نقص کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور اللہ نے خاص طور پر اس کامل و اکمل نمونہ کو اسی لیے بنایا ہے کہ اس کے بندوں میں سے جو کوئی اس کا مقبول و محبوب بندہ بننا چاہے وہ بے خطر اُس کی پیروی کرے۔ اس مقصد کو چھٹی اور ساتویں آیت میں کھول دیا گیا ہے چھٹی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ میں ایک "اُسوۂ حسنہ" ہے، اور ساتویں آیت میں رسُول اللہ کے اتباع کو محبوبِ الٰہی بننے کا واحد ذریعہ بتایا گیا ہے۔

نبیؐ کی پُوری زندگی اُسوۂ حسنہ ہے

یہاں پھر ہم کو کسی قسم کی تخصیص و تحدید نظر نہیں آتی۔ صریح تعمیم و اطلاق ہے۔ رسُول اللہ کی ذات کو مطلقاً اُسوۂ حسنہ بتایا گیا اور مطلقاً ہی آپ کے اتباع کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس قدر زیادہ آپ کا اتباع کرو گے، اور اپنی زندگی میں سیرتِ پاک کا رنگ جتنا زیادہ پیدا کرو گے اُتنا ہی تقرّب تم کو بارگاہِ الٰہی میں حاصل ہوگا اور حق تعالیٰ اُتنا ہی تم کو پیار کرے گا۔

دائرۂ اِستثناء

مگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپؐ کے اِتباع کا حکم دینے سے یہ مراد نہیں ہے کہ تمام معاملاتِ زندگی میں آپؐ نے جو کچھ کیا ہے، اور جس طرح کیا ہے، سب انسان بعینہٖ وہی فعل اسی طرح کریں اور اپنی زندگی میں آپ کی حیاتِ طیّبہ کی ایسی نقل اُتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے۔ یہ مقصد نہ قرآن کا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اِجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صحیح صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں، مجملاً مَیں عرض کرتا ہوں کہ جو امُور فرائض و واجبات اور ارکانِ اسلام کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے ارشادات کی اطاعت اور آپؐ کے عمل کی پیروی طابق النّعل بالنّعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپؐ نے حکم دیا اور جس طرح خود عمل کر کے بتایا ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امُور جو اسلامی زندگی کی عام ہدایات سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً تمدّنی، معاشی، اور سیاسی معاملات، اور معاشرت کے جزئیات، تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں آپؐ نے اخلاق اور حکمت اور شائستگی کی تعلیم دی ہے، اور بعض ایسی ہیں جن کو پیشِ نظر رکھ کر ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ رُوحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپؐ کی سُنّت کا مطالعہ کرے تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امُور میں آپؐ کا

اِتباع طابق النّعل بالنّعل ہونا چاہیے اور کِن اُمور میں آپؐ کی سُنّت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اُصول مستنبط کرنے چاہییں۔ مگر جن لوگوں کی طبیعت نزاع پسند واقع ہوتی ہے وہ اس میں طرح طرح کی حُجّتیں نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم عربی بولتے تھے تو کیا ہم بھی عربی بولیں؟ آپ نے عرب عورتوں سے شادیاں کیں تو کیا ہم بھی عربوں ہی میں شادیاں کریں؟ آپ ایک خاص وضع کا لباس پہنتے تھے تو کیا ہم بھی ویسا ہی لباس پہنیں؟ آپؐ ایک خاص قسم کی غذا کھاتے تھے تو کیا ہم بھی وہی غذا کھائیں؟ آپ کی معاشرت کا ایک خاص طریقہ تھا تو کیا ہم بھی بعینہٖ ویسی ہی معاشرت اختیار کریں؟ کاش یہ لوگ غور کرتے کہ اصل چیز وہ زبان نہیں ہے جو آپ بولتے تھے بلکہ وہ اخلاقی حدُود ہیں جن کی پابندی کو حضورؐ نے ہمیشہ کلام میں ملحوظ رکھا۔ اصل چیز یہ نہیں ہے کہ شادی عرب عورتوں سے کی جائے یا غیر عرب سے، بلکہ یہ ہے کہ جس عورت سے بھی کی جائے اس کے ساتھ ہمارا معاملہ کیسا ہو، اس کے حقوق ہم کس طرح ادا کریں، اور اپنے جائز شرعی اختیارات کو اُس پر کس طرح استعمال کریں۔ اِس معاملہ میں رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا جو برتاؤ اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ تھا اُس سے بہتر نمونہ ایک مُسلمان کی خانگی زندگی کے لیے اور کونسا ہو سکتا ہے؟ پھر یہ کس نے کہا کہ آپؐ جس وضع کا لباس پہنتے تھے وہ ایک مشروع لباس ہے؟ اور جو کھانا آپ کھاتے تھے بعینہٖ وہی کھانا ہر مسلمان کو کھانا چاہیے؟ اس میں اتباع کے قابل جو چیز ہے وہ تو تقوٰی اور پاکیزگی کے وہ حدُود ہیں جو آپ اپنے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں ملحوظ رکھتے تھے۔ اِن ہی حدُود سے ہم کو معلوم ہو سکتا ہے کہ رہبانیت اور نفس پرستی کے درمیان جس معتدل روش کا ہم کو قرآن میں ایک مجمل سبق دیا گیا ہے اس پر ہم کس طرح عمل کریں کہ نہ تو طیّبات سے ناروا اجتناب ہو اور نہ اِسراف۔ یہی حال حضورؐ کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کے دوسرے تمام معاملات کا بھی ہے۔ وہ پاک زندگی پوری کی پوری ایک سچّے اور خدا ترس مسلمان کی زندگی کا معیاری نمونہ تھی۔ حضرت عائشہؓ نے سچ فرمایا کہ کَانَ خُلُقُہٗ الْقُرْاٰن۔ اگر تم کو معلوم کرنا ہو کہ قرآن کی تعلیم اور اسپرٹ کے مطابق ایک مومن انسان کو دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے، تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کو دیکھ لو۔ جو اسلام خدا کی کتاب میں مُجمل ہے وہی رسُولِ خدا کی ذات میں تم کو مفصّل نظر آئے گا۔

رسُول ہمہ وقت رسُول ہے

الحمدللہ کہ تیسرے گروہ کے لوگ پہلے اور دوسرے گروہوں کے ہم خیال نہیں ہیں۔ مگر بعض احادیث سے اُن کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ ”حضورؐ ہر آن اور ہر حال میں رسُول نہیں ہوتے تھے، اور آپؐ کا ہر قول اور ہر فعل بحیثیتِ رسول نہیں ہوتا تھا۔“ یہ غلط فہمی جن روایات سے پیدا ہوتی ہے وہ دراصل ایک دوسری حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسُول ہی تھے، اور یہ شانِ رسالت

ہی تھی کہ آپ ہمیشہ اُس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے تھے جس کے لیے آپؐ کو بھیجا گیا تھا۔ آپؐ کی بعثت کا مقصد یہ نہ تھا کہ لوگوں سے رائے اور عمل کی آزادی قطعاً سلب کر لیں اور ان کی عقل و فکر کو معطل کر دیں۔ نہ آپؐ دنیا کو زراعت اور صنعت و حرفت سکھانے آئے تھے۔ نہ آپؐ کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ لوگوں کے کاروبار اور ان کے ذاتی معاملات میں اُن کی رہنمائی فرمائیں۔

اصل مقصدِ رسالت پر حضورؐ کی توجہ

آپؐ کی زندگی کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ اسلام کو عقیدے کی حیثیت سے دلوں میں بٹھانا اور عمل کی حیثیت سے افراد کی سیرت اور سوسائٹی کے نظام میں نافذ کر دینا تھا۔ اِس مقصد کے سوا دوسری کسی چیز کی طرف حضورؐ نے کبھی توجہ نہیں فرمائی۔ اور اگر شاذ و نادر کسی موقع پر کچھ فرمایا بھی تو صاف کہہ دیا کہ تم اپنی رائے اور عمل میں آزاد ہو، جس طرح چاہو کرو۔ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ اگرچہ صحابۂ کرامؓ آپؐ کے ہر ارشاد کو رسُول کا ارشاد سمجھ کر بدل و جان اس کی اطاعت پر آمادہ تھے، اور آپؐ کو مطلقاً مُطاع و متبُوع سمجھتے تھے، اور اسی لیے جب کبھی حضورؐ کسی دنیوی مسئلہ میں بھی کچھ ارشاد فرماتے تو صحابہؓ کو شبہ گزرتا تھا کہ شاید یہ حکمِ رسالت ہو۔ لیکن کبھی ایسا نہ ہُوا کہ آپؐ نے کسی ایسے مسئلے میں، جو آپؐ کے مقصدِ بعثت سے متعلق نہ تھا صحابہؓ کو کوئی حکم دیا ہو اور انہیں اطاعت پر مجبُور کیا ہو۔ ۲۳ سال کی مدت میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مشن سے غافل نہ ہونا اور ہر آن اِس باریک فرق کو ملحوظ رکھنا کہ کونسا معاملہ اُس مشن سے تعلق رکھتا ہے، اور کون سا نہیں رکھتا، اور اپنے تبعین پر کامل اقتدار رکھنے کے باوجود کبھی ان کو کسی غیر متعلق امر میں حکم نہ دینا، خود اِس بات پر شاہد ہے کہ شانِ رسالت کسی وقت بھی حضورؐ سے منفک نہیں ہوتی تھی۔ مگر یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیوی معاملات میں جو کچھ حضورؐ نے فرمایا وہ خدا کی وحی سے نہ تھا۔ اگرچہ آپؐ کے ایسے ارشادات آپؐ کے احکام نہیں ہیں، نہ آپ نے اُن کو حکم کے انداز میں فرمایا، اور نہ کسی نے ان کو حکم سمجھا، مگر پھر بھی جو بات آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکلی وہ سراسر حق تھی اور غلطی کا اس میں شائبہ تک نہ تھا۔ مثال کے طور پر طبِ نبوی کے باب میں جو کچھ آپؐ سے ثابت ہے وہ ایسی ایسی حکیمانہ باتوں سے لبریز ہے جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عرب کا اُمّی جو طبیب نہ تھا، جس نے کبھی فنِّ طب کی تحقیق نہ کی تھی، وہ کس طرح اِس فن کی اُن حقیقتوں تک پہنچا جو صدیوں کے تجربات کے بعد اب منکشف ہو رہی ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہم کو حضورؐ کے حکیمانہ ارشادات میں ملتی ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں تبلیغِ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں۔ مگر اللہ اپنے رسُولوں کی جبلّت میں جو غیر معمولی قوتیں ودیعت فرماتا ہے وہ صرف تبلیغِ رسالت ہی کے لیے کام نہیں آتیں، بلکہ ہر معاملہ میں اپنی شانِ امتیاز دکھا کر رہتی ہیں۔ حدّادی اور زرہ سازی کا تبلیغِ رسالت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ مگر حضرت داوٗدؑ اس میں غیر معمولی کمال دکھاتے ہیں، اور حق تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ یہ فن ہم نے اُن کو سکھایا تھا۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (انبیاء: ۸۰)۔ پرندوں کی بولیاں جاننے

سے تبلیغِ رسالت کو کیا واسطہ؟ مگر حضرت سلیمانؑ اس میں کمال ظاہر فرماتے ہیں اور خود کہتے ہیں عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (النمل: ۱۶)۔ نجاری اور کشتی سازی تبلیغ رسالت کا کونسا شعبہ ہے؟ مگر اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ سے یہ نہیں کہتا کہ ایک مضبوط سی کشتی بنوالو، بلکہ فرماتا ہے، وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (ہود: ۳۷)

انبیاء کی زندگی کے دو شعبے

پس انبیاء کے حق میں یہ گمان کرنا صحیح نہیں کہ ان پر صرف وہی اُمور وحی کیے گئے تھے جو براہِ راست تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت ان کی ساری زندگی حق تعالیٰ کی ہدایت کے تابع تھی۔ البتہ اگر فرق ہے تو یہ کہ ان کی زندگی کا ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کے قدم بقدم چلنا مسلمان ہونے کے لیے ناگزیر شرط ہے۔ اور ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کا اتباع ہر مسلمان پر فرض نہیں، مگر جو شخص اللہ کا محبوب و مقبول بندہ بننا چاہتا ہو اور بارگاہِ حق میں تقرب کا طلبگار ہو، اس کے لیے بغیر اس کے چارہ نہیں کہ ٹھیک ٹھیک نبی کی سنت پر چلے، حتیٰ کہ اگر ایک سرِ مُو بھی اس خط سے ہٹے گا تو تقرّب اور محبوبیّت میں اسی انحراف کی حد تک کسر رہ جائے گی۔ اس لیے کہ محبوبیّت کے لیے بجز اتباعِ نبی کے اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں، فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ۔

نبی کی امارت اور غیر نبی کی امارت کا فرق

اس بحث کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کی امارت اور دوسرے امیروں کی امارت میں کیا فرق ہے اور نبی کے فیصلے اور دوسرے قاضیوں کے فیصلوں میں کتنا عظیم الشان تفاوت ہے۔ تاہم مَیں نے تین آیتیں آخر میں ایسی نقل کی ہیں جن سے یہ فرق قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ اِن آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسُول اللہ کے حکم پر سر جُھکا دینا اور آپؐ کے فیصلوں کو تسلیم کرنا ایمان کے لیے ضروری شرط ہے۔ جو اس سے انکار کرے وہ مومن ہی نہیں۔ کیا یہ بات کسی دوسرے امیر یا قاضی کو حاصل ہے؟ اگر نہیں تو یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ "اللہ اور رسُول کے الفاظ ساتھ ساتھ قرآن میں جہاں جہاں آتے ہیں اُن سے مراد امارت ہے۔" مجھے مولانا اسلم جیراجپوری کے اسی قول پر اعتراض ہے اور مَیں اِس کو قرآن مجید کی تعلیمات کے قطعاً خلاف سمجھتا ہوں۔ اولی الامر کی اطاعت کا معاملہ تو مَیں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولی الامر کی اطاعت بواجب ہے۔ اور اولی الامر اسلامی حکومت کے وہ تمام فرائض انجام دیں گے جو رسُولِ اکرم اپنی حیاتِ طیبہ میں انجام دیتے تھے، اور معاملات میں اولی الامر کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوگا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی دانست میں ان کے فیصلہ کو حکمِ خدا اور رسُول کے خلاف بھی سمجھتا ہو تب بھی ایک حد تک اُس کے لیے لازم ہوگا کہ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے اُن کے فیصلوں کو تسلیم کرے۔ لیکن اس کے یہ معنی کبھی نہیں ہو سکتے کہ امارت بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں "اللہ اور رسُول" کہا گیا ہے، اور امارت کے احکام ہُو بہُو وہی ہیں جو اللہ اور رسُول کے احکام ہیں۔ اگر ایسا ہو

تو اُمَراء کے بگڑ جانے اور اربابِ حل و عقد کے کتاب و سُنّت سے منحرف ہو جانے کی صورت میں مُسلمانوں کے لیے کوئی چارہ اُن کی اطاعت کرنے کے سوا، اور ہلاکت کے راستوں میں اُن کی پیروی کرنے کے سوا باقی نہ رہے گا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی بندۂ خدا اُٹھے اور رسُول کی طرف رجُوع کرنے کی تاکید کرے تو مولانا اسلم جیراج پوری کے فتوے کی رُو سے تو ظالم اُمَراء اُس بندۂ خدا کو باغی قرار دے کر قتل کر دینے میں بالکل حق بجانب قرار پائیں گے اور ان کو یہ کہنے کا حق ہو گا کہ "اللہ اور رسُول" تو ہم ہی ہیں، دوسرا کون ہے جس کی طرف تو ہم کو پھیرنا چاہتا ہے۔[۱۰۵]

فصل ۱۴

رسولؐ کی حیثیّت شخصی وحیثیّت نبوی کا جائزہ

میرے دو مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" اور "اتباع واطاعتِ رسُول" کا عربی ترجمہ دمشق کے رسالہ "المسلمون" میں شائع ہُوا تھا۔ اس پر شام کے اہلِ علم حضرات نے مجھ کو توجّہ دلائی کہ ان دونوں مضامین میں کچھ تعارض محسوس ہوتا ہے جسے رفع کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز دمشق کے ایک صاحب نے مقدّم الذکر مضمون پر حسبِ ذیل اعتراض بھی کیا۔

"کیا محمد علیہ الصّلوٰۃ والسلام باعتبار انسان ہمارے اندر ایک عام فرد کی حیثیت رکھتے ہیں؟ اور باعتبار انسان ان کے اندر بھی ایسی ذاتی خواہشات پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر وہ لوگوں پر اپنی ذاتی عظمت کا سکّہ جمائیں، اور اپنے شخصی اقتدار کے پنجے میں جکڑیں؟ اگر یہ صورت ہے تو آپ کا بحیثیتِ نبی معصوم ہونا اور بحیثیت انسان محفوظ ہونا چہ معنی دارد؟ آپؐ کی اس زندگی کی تفصیلات کیا فائدہ رکھتی ہیں جب کہ آپ انسان تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منصبِ رسالت پر سرفراز نہیں فرمایا تھا؟ اور کیا رسُول ہونے کے بعد آپؐ کی یہ حیثیتیں حیثیتِ بشری اور حیثیتِ نبوی یکجا ہو گئی ہیں؟ یا الگ الگ ہیں؟ اور کیا ان دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جُدا کیا جا سکتا ہے؟ تاکہ محمد الرسُول کی اطاعت کی جائے اور محمد الانسان کی مخالفت میں ہم آزاد ہوں؟ کیا اس تفریق کے لیے کوئی قاعدۂ کلیّہ موجود ہے جس کی روشنی میں ہم آپ کے انسانی کلام — جس سے اختلاف کا ہمیں حق ہے — اور نبوی کلام — جو واجب الاطاعت ہے کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ سکیں؟

کیا نبی کی ذاتی رائے سے اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے؟ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم مسلمانوں کے اندر یہ رُوح پھونکتے تھے کہ بحیثیت انسان ان کی اطاعت واجب نہیں ہے؟ بلکہ اپنی ذاتی رائے سے اختلاف کرنے میں ان کی ہمّت افزائی کرتے تھے؟ نیز کیا یہ درست ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی حجت اور دلیل کی بنا پر آپ سے بحیثیت انسان اختلاف کیا تھا ۔ ۔ ۔ ؟"

ذیل کا مضمون انہی اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

"المسلمون" جلد ششم، شمارہ ۶، ۷ اور ۸ میں میرے جو مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" اور "اتباع و

اطاعتِ رسول" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں، ان کے متعلق مجھے توجہ دلائی گئی ہے کہ اُن میں تناقض محسوس ہوتا ہے جسے رفع کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی پہلے مضمون میں تو کہا گیا ہے کہ نبی کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی الگ الگ ہیں اور اسلام کی دعوت صرف حیثیتِ نبوی کی اطاعت کی طرف ہے نہ کہ حیثیتِ شخصی کی اطاعت کی طرف۔ لیکن دوسرے مضمون میں اِس بات سے انکار کیا گیا ہے کہ نبی کی دو حیثیتیں الگ الگ ہیں اور پورے اصرار کے ساتھ کہا گیا ہے کہ نبی کی ایک ہی حیثیت تھی اور وہ تھی صرف نبی ہونے کی حیثیت۔ ان دونوں باتوں میں توفیق و تطبیق کی کیا صورت ہے؟ علاوہ بریں میرے پہلے مضمون "آزادی کا اسلامی تصور" پر دمشق سے ایک صاحب نے کچھ سوالات کیے ہیں، جو "المسلمون" کے شمارہ ۷ میں درج ہوئے ہیں اور جنہیں اوپر نقل کیا گیا ہے۔

یہ دونوں اعتراضات چونکہ ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ایک ہی مختصر مضمون میں ان کا جواب دے رہا ہوں۔

دراصل اِس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری، اِس اعتبار سے کہ حقیقتِ نفس الامری کیا ہے؛ دوسرے عملی، اِس لحاظ سے کہ جہاں تک نبی کی ذات سے ہدایت اخذ کرنے کا تعلق ہے، آیا وہ ہمارے لیے پورا کا پورا نبی اور صرف نبی ہی ہے، یا ہم اس کی شخصیت کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے صرف اس کی حیثیتِ نبوی کا اِتباع اور اسی کی اطاعت کریں گے اور حیثیتِ شخصی کو چھوڑ دیں گے؟

بحث کا نظری پہلو

اب پہلے نظری پہلو کو لیجیے۔ قرآن مجید اس معاملہ میں بالکل واضح ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی میں فرق ہے۔ وہ انسانوں کو اپنا بندہ بنانے کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بنانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ۔ "کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربّانی بنو"۔ (آلِ عمران آیت ۷۹)۔ اُن کے سپرد دو فریضے ایک ساتھ کیے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ لوگوں کو ہر غیر اللہ کی بندگی سے نکالیں، جس میں دوسری سب مخلوقات کے ساتھ اُن کی اپنی ذات بھی شامل تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کو صرف ایک اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۔ (النحل ۳۶)	ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا (یہ پیغام دے کر) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے الگ رہو۔
قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ	اے نبی کہو کہ اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔

بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (آل عمران: ۶۴)

یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب بنائے۔

دین میں ان کی بے چون وچرا اطاعت کا جو حکم دیا گیا ہے وہ ان کے ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس بنا پر تھا کہ رسول ہی وہ شخص ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنی مرضی ظاہر فرماتا اور اپنے احکام بھیجتا ہے۔ اسی وجہ سے رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت قرار دی گئی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء۔۶۴) "ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اُس کی اطاعت کی جائے۔" اور مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی" (النساء۔۸۰)۔

اُس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قرآن اور بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی رائے سے کی یا کہی ہے اس میں بے چون وچرا اطاعت کا وہ مطالبہ آپؐ نے کبھی نہیں کیا جو امرِ الٰہی کے تحت کوئی کام کرنے یا کوئی بات کہنے کی صورت میں کیا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں مَیں نے اپنے مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" میں پیش کی ہیں۔ خصوصاً حضرت زیدؓ کا حضورؐ کے منع فرمانے کے باوجود سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینا اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا اُن پر کوئی نکیر نہ کرنا تو اس کی صریح مثال ہے جس کی کوئی توجیہ اُس کے سوا نہیں کی جا سکتی جو مَیں نے اس مضمون میں کی ہے۔ اور تابیرِ نخل والے معاملے میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے کو بالفاظِ صریح فرما چکے ہیں:۔

انما انا بشر اذا امرتکم بشیءٍ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشی من رائی فانما انا بشر۔۔۔ انما ظننت ظنًّا فلا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم من اللہ شیئًا فخذوا بہ فانی لم اکذب علی اللہ۔۔۔ انتم اعلم باموردنیاکم (صحیح مسلم، باب امتثال ما قالہ شرعًا دون ماذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرای)

مَیں بھی ایک انسان ہی ہوں، جب میں تم کو تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے مانو اور جب مَیں اپنی رائے سے کچھ کہوں، تو بس مَیں بھی ایک انسان ہی ہوں ۔۔۔ مَیں نے اندازہ سے ایک بات کہی تھی۔ تم میری ان باتوں کو نہ لو جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں۔ ہاں جب میں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اس کو لے لو۔ اس لیے کہ مَیں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا۔۔۔ تمہیں اپنے دنیوی معاملات کا زیادہ علم ہے۔

یہ تو ہے نظری اور اصُولی فرق۔ اب اس کے عملی پہلُو کو لیجیے۔

بحث کا عملی پہلو

دراصل یہ ایک نازک اور پیچیدہ معاملہ تھا کہ ایک بشر کو اللہ تعالیٰ اپنا واحد نمائندہ بنا کر انسانوں کے درمیان اِس دوہری خدمت پر مامور فرمائے کہ ایک طرف تو وہ بشر اپنے ابنائے نوع کو اپنی شخصیت سمیت تمام مخلوقات کی بندگی سے آزاد کرے اور خود اِس آزادی کی انہیں تربیت دے، اور دوسری طرف وہی بشر ان سے اللہ کی مکمل، بے چون وچرا اطاعت کرائے، اور اِس اطاعت کا مرجع بھی تمام عملی اغراض کے لیے اس بشر کی اپنی ہی ذات من حیث الرّسول ہو۔ یہ دو متضاد کام ایک ہی شخص کو بیک وقت کرنے تھے اور ان کے حدُود ایک دوسرے کے ساتھ اتنے گُتھے ہوئے تھے کہ خود اللہ اور اس کے رسُول کے سوا کوئی دُوسرا ان کے درمیان خطِ امتیاز نہ کھینچ سکتا تھا۔

اِس معاملہ کی نزاکت اور پیچیدگی اور بڑھ جاتی ہے جب ہم تین باتوں پر غور کرتے ہیں:

اوّل یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم جس وقت احکامِ الٰہی کے تحت اپنی اطاعت کراتے تھے اُس وقت تو ظاہر ہی ہے کہ آپ ایک وظیفۂ رسالت انجام دیتے تھے۔ مگر جس وقت آپ اپنے انتہائی اطاعت گزار متّبعین کو خود اپنی ذات کی ذہنی غلامی سے آزاد کر کے حُرّیتِ فکر و رائے کی تربیت دیتے تھے، جب آپ اپنی شخصی آراء کے مقابلے میں ہمّت دلا کر تمام انسانوں کو خود اپنے سامنے استقلالِ فکر برتنا سکھاتے تھے کہ یہاں تم آزاد ہو اور یہاں تمہارے لیے سمع و اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اُس وقت بھی آپ دراصل وظیفۂ رسالت ہی کا ایک حصّہ ادا فرماتے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے لیے آپ کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی کے فرق کو سمجھنا اور عملاً دونوں حیثیتوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے اس طرح مِلی جُلی نظر آتی ہیں کہ ان کے درمیان صرف نظری فرق رہ جاتا ہے۔ عملاً اپنی شخصی حیثیت میں بھی کام کرتے وقت آپ نبوّت ہی کا ایک کام کرتے پائے جاتے ہیں۔

ثانیاً، جو معاملات بظاہر بالکل شخصی معاملات ہیں، مثلاً ایک انسان کا کھانا پینا، کپڑے پہننا، نکاح کرنا، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، گھر کا کام کاج کرنا، غسل و طہارت اور رفعِ حاجت وغیرہ، وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات میں خالص نجی نوعیت کے معاملات نہیں ہیں، بلکہ انہی میں شرعی حُدود اور طریقوں اور آداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ شامل ہے اور آدمی کے لیے خود یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان میں کہاں حیثیتِ رسالت ختم ہوتی ہے اور کہاں حیثیتِ شخصی شروع ہو جاتی ہے۔

ثالثاً، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ نبی کی ذات بحیثیتِ مجموعی ایک اُسوہ ہے جس کا ہر پہلُو اور ہر رُخ ہمیں ہدایت کی روشنی دیتا ہے، اور اس ذات کا کوئی فعل اور قول بھی ہوائے نفس یا ضلالت و غوایت سے ذرّہ برابر بھی

آلودہ نہیں ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱)

تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین اُسوہ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا۔ (الاحزاب: ۴۵-۴۶)

اے نبی ہم نے تمہیں (لوگوں کے لیے) گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور اس کے اذن سے اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنایا ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ (النجم: ۲، ۳، ۴)

تمہارا صاحب (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بدراہ ہُوا نہ گمراہ ہُوا۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا۔ اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

اِن وجوہ سے نہ تو عملاً ہمارے لیے یہ ممکن ہے اور نہ شرعاً ہم اس کے مجاز ہیں کہ بطورِ خود نبی کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی میں فرق کریں، اور آپ ہی آپ اُس کے حدُود متعیّن کر لیں، اور خود ہی یہ بھی طے کر لیں کہ فلاں اُمور آپ کی حیثیتِ نبوی کے تحت تھے جن میں ہم آپؐ کی اطاعت کریں گے اور فلاں شخصی حیثیت میں تھے جن میں ہم آپؐ کے اتباع اور اطاعت سے آزاد ہیں۔ اِس فرق کے معلوم ہونے کا ذریعہ یا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی کوئی تصریح ہو سکتی ہے، یا پھر وہ اصولِ شریعت جو آپؐ ہی کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوں۔

چند قابلِ غور مثالیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ صحابہ کرام اپنی ذاتی رائے ظاہر کرنے سے پہلے آپؐ سے دریافت کر لیتے تھے کہ آپؐ کا ارشاد یا عمل حکمِ الٰہی کی بنا پر ہے یا اپنی ذاتی رائے پر۔ اور جب معلوم ہو جاتا کہ یہ آپؐ کی ذاتی رائے سے ہے تب وہ اپنی بات عرض کرتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں حضرت خبابؓ بن المُنذر نے اپنی رائے پیش کرنے سے پہلے پوچھ لیا تھا کہ اِس مقام کا انتخاب وحی کے ذریعے سے کیا گیا ہے جس سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے، یا یہ محض ایک تدبیرِ جنگ کے طور پر ہے؟ اِسی طرح غزوۂ خندق میں حضرت سعدؓ بن مُعاذ نے بنی غَطفان سے صلح کی تدبیر پر اظہارِ رائے کرنے سے پہلے دریافت کر لیا "اے اللہ کے رسُول! کیا یہ ارادہ وحی کی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ اس میں ہمارے لیے مجالِ کلام نہیں ہے، یا حضورؐ صرف اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں؟"

اور بعض اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی یہ ظاہر فرما دیتے کہ فلاں بات آپ اللہ کی طرف سے ایک حکم دین کے طور پر نہیں فرما رہے ہیں، بلکہ اپنی شخصی رائے ظاہر فرما رہے ہیں، جیسا کہ اوپر تابیرِ نخل کے معاملہ میں حضورؐ کے ارشادات گزر چکے ہیں۔

اور بعض اوقات معاملہ کی نوعیت ہی ایسی ہوتی تھی جس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حضورؐ کا ارشاد اپنی شخصی حیثیت میں ہے۔ مثلاً حضرت زیدؓ سے آپؐ کا فرمانا کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللهَ "اپنی بیوی کو طلاق نہ دو اور اللہ سے ڈرو"۔ اس ارشاد کے متعلق یہ بات ظاہر تھی کہ یہ ایک مومن کو نبی کا حکم شرعی نہ تھا بلکہ ایک خاندان کے فرد کو بزرگ خاندان کا مشورہ تھا۔ اسی وجہ سے حضرت زیدؓ نے حضورؐ کے ارشاد کے باوجود حضرت زینبؓ کو طلاق دی اور اللہ اور اس کے رسول کے اُس پر کوئی نکیر نہ کرنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت زیدؓ نے آپؐ کے فرمان کی نوعیت ٹھیک مشخص کی تھی۔

دَورِ مابعد میں حیثیتِ نبویہ کے تعیُّن کی صورت

یہ تو وہ مثالیں ہیں جو حضورؐ کی حیاتِ طیّبہ میں پیش آئی تھیں۔ ان کے علاوہ متعدد معاملات ایسے ہیں جن میں اب بھی اصولِ شریعت کی روشنی میں اس فرق کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کے لباس اور آپؐ کے کھانے کے معاملہ کو لیجیے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آپ خاص وضع اور قطع کا لباس پہنتے تھے جو عرب میں اُس وقت پہنا جاتا تھا اور جس کے انتخاب میں آپ کے شخصی ذوق کا دخل بھی تھا۔ اسی طرح آپؐ وہی کھانے کھاتے تھے جیسے آپ کے عہد میں اہلِ عرب کے گھروں میں پکتے تھے اور اُن کے انتخاب میں آپ کے اپنے ذوق کا بھی دخل ہوتا تھا۔ دُوسرا پہلو یہ تھا کہ اس کھانے اور پہننے میں آپ اپنے عمل اور قول سے شریعت کے حُدود اور اسلامی آداب کی تعلیم دیتے تھے۔ اب یہ بات خود حضورؐ ہی کے سکھائے ہوئے اصولِ شریعت سے ہم کو معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے پہلی چیز آپ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری چیز حیثیتِ نبویہ سے۔ اس لیے کہ شریعت نے جس کی تعلیم دینے کے لیے آپ اللہ کی طرف سے مامور کیے گئے تھے، انسانی زندگی کے اِس معاملہ کو اپنے دائرہ میں نہیں لیا ہے کہ لوگ اپنے لباس کس تراش خراش اور وضع قطع پر سلوائیں، اور اپنے کھانے کس طرح پکائیں، البتہ اس نے یہ چیز اپنے دائرۂ عمل میں لی ہے کہ کھانے اور پہننے کے معاملے میں حرام اور حلال، جائز اور ناجائز کے حُدود معیّن کرے اور لوگوں کو ان آداب کی تعلیم دے جو اہلِ ایمان کے اخلاق و تہذیب سے مناسبت رکھتے ہیں۔

یہ فرق ہم کو حضورؐ کی کسی تصریح سے معلوم ہو، یا آپؐ کے سکھائے ہوئے اصُولِ شریعت سے، بہر حال اس کے علم کا ذریعہ نبی کی تعلیم ہی ہے۔ گویا ہم آپؐ کی حیثیتِ شخصیہ کے کام کو متعیّن کرنے کے لیے بھی آپؐ ہی کی حیثیتِ نبویّہ کی طرف رجُوع کریں گے۔ حیثیتِ شخصیہ سے براہِ راست ہمارا کوئی معاملہ نہیں ہے جو آپ کی حیثیتِ نبویّہ کو نظر انداز کر کے

ہم کر سکتے ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس پر میں نے اپنے دوسرے مضمون "اتباع و اطاعتِ رسول" میں منکرینِ سنت کو متنبہ کیا ہے۔ ان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ محمد بن عبداللہ باعتبار رسول اور محمد بن عبداللہ باعتبارِ انسان میں خود تفریق کر کے ان دونوں حیثیتوں کے کاموں میں ایک خطِ امتیاز کھینچ دیتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے جس دائرے کو وہ خود آپ کی حیثیتِ رسالت سے الگ سمجھ بیٹھے ہیں اس کے اتباع و اطاعت سے خود ہی انہوں نے آزادی اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی اور نبوی حیثیتوں میں حقیقت کے اعتبار سے جو فرق بھی ہے وہ عنداللہ اور عندالرسول ہے، اور ہمیں اس سے صرف اس لیے آگاہ کیا گیا ہے کہ ہم کہیں عقیدے کی گمراہی میں مبتلا ہو کر محمد بن عبداللہ کو اللہ کے بجائے مطاعِ حقیقی نہ سمجھ بیٹھیں۔ لیکن اُمت کے لیے تو عملاً آپ کی ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے رسول ہونے کی حیثیت۔ حتیٰ کہ محمد بن عبداللہ کے مقابلے میں اگر ہم کو آزادی حاصل بھی ہوتی ہے تو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کرنے سے ہوتی ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کے حدود متعین کرتے ہیں اور اس آزادی کے استعمال کی تربیت بھی ہم کو رسول اللہ ہی نے دی ہے۔

ان توضیحات کے بعد اگر میرے دونوں مضمونوں کو ملاحظہ کیا جائے تو کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہ سکتی۔ ۱۹۶۱ء

فصل ۵

منصبِ نبوّت اور اس کے فرائض از روئے قرآن[1]

رسول کے چار شعبہائے کار

اِس کتابِ پاک میں چار مقامات پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے:

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ .... رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ۔ (البقرہ: ۱۲۹)

اور یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے (تو انہوں نے دعا کی)، اے ہمارے پروردگار اِن لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَكِّیْكُمْ وَیُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ: ۱۵۱)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (آل عمران-۱۶۴)

اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اُس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

---

[1] یہ مضمون منکرین حدیث کے اعتراضات و شبہات کو رفع کرنے کے لیے لکھا گیا تھا (مرتبین)

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ۔ (الجمعہ-۲)

وہی ہے جس نے اُمّیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسُول مبعوث کیا جوان کو اس کی آیات پڑھ کر سُناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اِن آیات میں بار بار جس بات کو بتاکید دُہرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُول کو صرف آیاتِ قرآن ہی سُنا دینے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین مقصد اور بھی تھے۔

ایک یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں۔

دوسرے یہ کہ اُس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔

اور تیسرے یہ کہ آپ افراد کا بھی اور اُن کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں، یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دُور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہترین نظامِ اجتماعی کو نشوونما دیں۔

ظاہر ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم صرف قرآن کے الفاظ سُنا دینے سے زائد ہی کوئی چیز تھی ورنہ اس کا الگ ذکر بے معنی تھا۔ اسی طرح افراد اور معاشرے کی تربیت کے لیے آپ جو تدابیر بھی اختیار فرماتے تھے وہ بھی قرآن کے الفاظ پڑھ کر سُنا دینے سے زائد ہی کچھ تھیں، ورنہ تربیت کی الگ خدمت کا ذکر کرنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اب فرمایئے کہ قرآن پہنچانے کے علاوہ یہ معلّم اور مُربّی کے مناصب جو حضورؐ کو حاصل تھے اُن پر آپ خود فائز ہو بیٹھے تھے یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر مامُور فرمایا تھا؟ کیا قرآن کی اِن صاف اور مکرّر تصریحات کے بعد اس کتاب پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ دونوں مناصب رسالت کے اجزاء نہ تھے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ان مناصب کے فرائض اور خدمات بحیثیت رسُول نہیں بلکہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں انجام دیتے تھے؟ اگر نہیں کہہ سکتا تو بتائیے کہ قرآن کے الفاظ سُنانے سے زائد جو باتیں حضورؐ نے تعلیمِ کتاب و حکمت کے سلسلے میں فرمائیں اور اپنے قول و عمل سے افراد اور معاشرہ کی جو تربیت حضورؐ نے کی اسے من جانب اللہ ماننے اور سند تسلیم کرنے سے انکار خود رسالت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

رسُول بحیثیتِ شارحِ کتاب اللہ

سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ۔ (آیت ۴۴)

اور (اے نبیؐ) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اُس تعلیم کو جو اُن کی طرف اُتاری گئی ہے۔

اِس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے سپُرد یہ خدمت کی گئی تھی کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جو احکام و ہدایات دے اُن کی آپ توضیح و تشریح فرمائیں۔ ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ کسی بات کی تشریح اور توضیح محض اُس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سُنا دینے سے نہیں ہوتی بلکہ تشریح کرنے والا اُس کے الفاظ سے زائد کچھ کہتا ہے تاکہ سُننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے، اور اگر کتاب کی کوئی بات کسی عملی مسئلے سے متعلق ہو تو شارح عملی مظاہرہ (Practical Demonstration) کر کے بتاتا ہے کہ مُصنّف کا منشا اس طرح عمل کرنا ہے۔ یہ نہ ہو، تو کتاب کے الفاظ کا مطلب و مدعا پوچھنے والے کو پھر کتاب ہی کے الفاظ سُنا دینا کسی طفلِ مکتب کے نزدیک بھی تشریح و توضیح قرار نہیں پا سکتا۔ اب فرمائیے کہ اس آیت کی رُو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم قرآن کے شارح اپنی ذاتی حیثیت میں تھے یا خدا نے آپ کو شارح مقرر کیا تھا؟ یہاں تو اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ہی یہ بیان کر رہا ہے کہ رسُول اپنے قول اور عمل سے اس کا مطلب واضح کرے۔ پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ شارحِ قرآن کی حیثیت سے آپؐ کے منصب کو رسالت کے منصب سے الگ قرار دیا جائے؛ اور آپؐ کے پہنچائے ہوئے قرآن کو لے کر آپ کی شرح و تفسیر قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ انکار خود رسالت کا انکار نہ ہو گا؟

یہ آیت جس طرح اُن منکرینِ نبوّت کی حُجّت کے لیے قاطع تھی جو خدا کا "ذکر" بشر کے ذریعہ سے آنے کو نہیں مانتے تھے اُسی طرح آج یہ اُن منکرینِ حدیث کی حُجّت کے لیے بھی قاطع ہے جو نبیؐ کی تشریح و توضیح کے بغیر صرف "ذکر" کو لے لینا چاہتے ہیں۔ وہ خواہ اِس بات کے قائل ہوں کہ نبی نے تشریح و توضیح کچھ بھی نہیں کی تھی، صرف "ذکر" پیش کر دیا تھا، یا اس کے قائل ہوں کہ ماننے کے لائق صرف "ذکر" ہے نہ کہ نبی کی تشریح، یا اِس کے قائل ہوں کہ اب ہمارے لیے صرف ذِکر کافی ہے، نبی کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں، یا اس بات کے قائل ہوں کہ اب صرف ذکر ہی قابلِ اعتماد حالت میں باقی رہ گیا ہے نبی کی تشریح یا تو باقی ہی نہیں رہی یا باقی ہے بھی تو بھروسے کے لائق نہیں ہے، غرض اِن چاروں باتوں میں سے جس بات کے بھی وہ قائل ہوں اُن کا مسلک بہر حال قرآن کی اِس آیت سے ٹکراتا ہے۔

اگر وہ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی نے اُس منشا ہی کو فوت کر دیا جس کی خاطر ذکر کو فرشتوں کے ہاتھ بھیجنے یا براہِ راست لوگوں تک پہنچا دینے کے بجائے اُسے واسطۂ تبلیغ بنایا گیا تھا۔

اور اگر وہ چوتھی بات کے قائل ہیں تو دراصل یہ قرآن اور نبوّتِ محمدیؐ، دونوں کے نسخ کا اعلان ہے جس کے بعد اگر کوئی مسلکِ معقول باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف اُن لوگوں کا مسلک ہے جو ایک نئی نبوّت اور نئی وحی کے قائل ہیں۔ اِس لیے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ خود قرآن مجید کے مقصدِ نزول کی تکمیل کے لیے نبی کی تشریح کو ناگزیر ٹھیرا رہا ہے اور نبی کی ضرورت ہی اس طرح ثابت کر رہا ہے کہ وہ ذکر کے منشا کی توضیح کرے۔ اب اگر منکرینِ حدیث کا یہ

قول صحیح ہے کہ نبی کی توضیح و تشریح دنیا میں باقی نہیں رہی ہے تو اس کے دو نتیجے کھلے ہوئے ہیں پہلا نتیجہ یہ کہ نمونۂ اتباع کی حیثیت سے نبوّتِ محمدی ختم ہوگئی اور ہمارا تعلق محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ صرف اُسی طرح کا رہ گیا ہے جیسا ہُود اور صالح اور شعیب علیہم السلام کے ساتھ ہے کہ ہم ان کی تصدیق تو کرتے ہیں، اُن پر ایمان بھی لاتے ہیں، مگر اُن کا کوئی اُسوہ ہمارے پاس نہیں ہے جس کا ہم اتباع کریں۔ یہ چیز نئی نبوّت کی ضرورت آپ سے آپ پیدا کر دیتی ہے۔ صرف ایک بے وقوف ہی اس کے بعد ختمِ نبوّت پر اصرار کر سکتا ہے۔

دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اکیلا قرآن چونکہ نبی کی تشریح و تبیین کے بغیر خود اپنے بھیجنے والے کے قول کے مطابق ہدایت کے لیے ناکافی ہے، اِس لیے قرآن کے ماننے والے خواہ کتنے ہی زور سے چیخ چیخ کر اُسے بجائے خود کافی قرار دیں، مدعیِ سُنت کی حمایت میں گراہانِ حُبیت کی بات ہرگز نہیں چل سکتی اور ایک نئی کتاب کے نزول کی ضرورت آپ سے آپ خود قرآن کی رُو سے ثابت ہو جاتی ہے۔ قاتلھم اللہ! اس طرح یہ لوگ حقیقت میں انکارِ حدیث کے ذریعے دین کی جڑ کھود رہے ہیں۔ ؎۱۱

رسُول بحیثیتِ پیشوا اور نمونۂ تقلید

سُورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ... قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۔ (آیات ۳۱-۳۲)

(اے نبیؐ) کہو کہ اگر تم اللہ سے محبّت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبّت کریگا ... کہو کہ اطاعت کرو اللہ اور رسُول کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اور سورۂ احزاب میں فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ۔ (آیت ۲۱)

تمہارے لیے اللہ کے رسُول میں ایک نمونۂ تقلید ہے، ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔

ان دونوں آیتوں میں خود اللہ تعالےٰ اپنے رسُول کو پیشوا مقرر کر رہا ہے، اُن کی پیروی کا حکم دے رہا ہے، ان کی زندگی کو نمونۂ تقلید قرار دے رہا ہے، اور صاف فرما رہا ہے کہ یہ روش اختیار نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی اُمید نہ رکھو۔ میری محبت اِس کے بغیر نہیں حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ اِس سے مُنہ موڑنا کفر ہے۔ اب فرمائیے کہ حضورؐ رہنما اور لیڈر خود بن بیٹھے تھے، یا مسلمانوں نے آپ کو منتخب کیا تھا، یا اللہ نے اس منصب پر آپؐ کو مامور کیا تھا؟ اگر قرآن کے یہ الفاظ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے آنحضورؐ کو مامور من اللہ رہنما و پیشوا قرار دے رہے ہیں تو پھر آپؐ کی پیروی اور آپؐ کے نمونۂ زندگی کی تقلید سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہنا سراسر لغو ہے کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے۔

اگر یہ مُراد ہوتی تو فَاتَّبِعُوا الْقُرْاٰن فرمایا جاتا نہ کہ فَاتَّبِعُوْنِیْ - اور اس صورت میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کو اُسوۂ حسنہ کہنے کے تو کوئی معنی ہی نہیں تھے -

رسُول بحیثیتِ شارع

سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ - (آیت: ۱۵۷)	وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے ان کو روکتا ہے اور اُن کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اُتار دیتا ہے جو اُن پر چڑھے ہوئے تھے -

اس آیت کے الفاظ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو تشریعی اختیارات (Legislative Powers) عطا کیے ہیں - اللہ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے، بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضوؐر نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے، اِس لیے وہ بھی قانونِ خداوندی کا ایک حصّہ ہے - یہی بات سورۂ حشر میں اسی صراحت کے ساتھ ارشاد ہوتی ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ - (آیت: ۷)	جو کچھ رسُول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کر دے اُس سے رُک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے -

اِن دونوں آیتوں میں سے کسی کی یہ تاویل نہیں کی جا سکتی کہ ان میں قرآن کے امر او نہی قرآن کی تحلیل و تحریم کا ذکر ہے - یہ تاویل نہیں بلکہ اللہ کے کلام میں ترمیم ہو گی - اللہ نے تو یہاں امر و نہی اور تحلیل و تحریم کو رسُول کا فعل قرار دیا ہے نہ کہ قرآن کا - پھر کیا کوئی شخص اللہ میاں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ سے بیان میں غلطی ہو گئی، آپ بھولے سے قرآن کے بجائے رسُولؐ کا نام لے گئے؟

رسُولؐ بحیثیتِ قاضی:

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر اللہ تعالیٰ اس امر کی تصریح فرماتا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو قاضی مقرر کیا ہے. مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ - (النساء: ۱۰۵)	(اے نبی) ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی

روشنی میں فیصلہ کرو۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۔ (الشوریٰ:۱۵)

اور (اے نبی) کہو کہ میں ایمان لایا ہوں اُس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۔ (النور۔۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جائیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۔ (النساء:۶۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی طرف اور رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو منافقوں کو کہ وہ تم سے کنّی کتراتے ہیں۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء:۶۵)

پس (اے نبیؐ) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تو کرے اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں۔ بلکہ اسے بسروچشم قبول کرلیں۔

یہ تمام آیتیں اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم خود ساختہ، یا مسلمانوں کے مقرر کیے ہوئے جج نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے جج تھے۔ تیسری آیت بتا رہی ہے کہ آپؐ کی جج ہونے کی حیثیت رسالت کی حیثیت سے الگ نہیں تھی بلکہ رسُول ہی کی حیثیت میں آپؐ جج بھی تھے۔ اور ایک مومن کا ایمان بالرسالت اُس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپؐ کی اِس حیثیت کے آگے بھی سمع و طاعت کا رویّہ نہ اختیار کرے۔ چوتھی آیت میں ما انزل اللہ (قرآن) اور رسُول دونوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ حاصل کرنے کے لیے دو مستقل مرجع ہیں، ایک قرآن قانون کی حیثیت سے، دوسرے رسُول جج کی حیثیت سے، اور ان دونوں سے مُنہ موڑنا منافق کا کام ہے نہ کہ مومن کا۔ آخری آیت میں بالکل بے لاگ طریقے سے کہہ دیا گیا ہے کہ رسُول کو جو شخص جج کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا وہ مومن ہی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر رسُول کے دیئے ہوئے فیصلے پر کوئی شخص اپنے دل میں بھی تنگی محسوس کرے تو اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ کیا قرآن کی اِن تصریحات کے بعد بھی کوئی صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضورؐ رسُول کی حیثیت سے قاضی نہ تھے بلکہ دنیا کے عام ججوں اور میجسٹریٹوں کی طرح

آپؐ بھی ایک جج یا مجسٹریٹ تھے اس لیے اُن کے فیصلوں کی طرح حضورؐ کے فیصلے بھی مأخذِ قانون نہیں بن سکتے؟ کیا دنیا کے کسی جج کی یہ حیثیت ہو سکتی ہے کہ اس کا فیصلہ اگر کوئی نہ مانے یا اس پر تنقید کرے یا اپنے دل میں بھی اُسے غلط سمجھے تو اس کا ایمان سلب ہو جائے؟

رسُول بحیثیت حاکم و فرمانروا

قرآن مجید اسی صراحت اور تکرار کے ساتھ بکثرت مقامات پر یہ بات بھی کہتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حاکم و فرمانروا تھے اور آپؐ کو یہ منصب بھی رسُول ہی کی حیثیت سے عطا ہُوا تھا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن (Sanction) سے۔
مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء-٨٠)	جو رسُول کی اطاعت کرے اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ۔ (الفتح-١٠)	(اے نبی) یقیناً جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ۔ (محمد-٣٣)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کر لو۔
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب-٣٦)	اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو پھر ان کے لیے اپنے اس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کر لینے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (النساء: ٥٩)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسُول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں اولی الامر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اس کو پھیر دو اللہ اور رسُول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روزِ آخر پر۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ رسُول کوئی ایسا حاکم نہیں ہے جو خود اپنی قائم کردہ ریاست کا سربراہ بن بیٹھا ہو، یا جسے لوگوں نے منتخب کر کے سربراہ بنایا ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا ہُوا فرمانروا ہے۔ اس کی فرمانروائی

اس کے منصبِ رسالت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا رسول ہونا ہی اللہ کی طرف سے اُس کا حاکمِ مُطاع ہونا ہے۔ اس کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ اس سے بیعت دراصل اللہ سے بیعت ہے۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی کے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو۔ اُس کے مقابلے میں اہلِ ایمان کو (جن میں ظاہر ہے کہ پوری اُمت اور اُس کے حکمران اور اس کے "مرکزِ ملت" سب شامل ہیں) قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جس معاملہ کا فیصلہ وہ کر چکا ہو اس میں وہ خود کوئی فیصلہ کریں۔

اِن تمام تصریحات سے بڑھ کر صاف اور قطعی تصریح آخری آیت کرتی ہے جس میں یکے بعد دیگرے تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے:

سب سے پہلے اللہ کی اطاعت۔

اس کے بعد رسُول کی اطاعت۔

پھر تیسرے درجے میں اولی الامر (یعنی آپ کے "مرکزِ ملت") کی اطاعت۔

اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسُول اولی الامر میں شامل نہیں ہے بلکہ ان سے الگ اور بالاتر ہے اور اس کا درجہ خدا کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ دوسری بات جو اِس آیت سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ اولی الامر سے نزاع ہو سکتی ہے مگر رسُول سے نزاع نہیں ہو سکتی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نزاعات میں فیصلے کے لیے مرجع دو ہیں، ایک اللہ اور دوسرا اس کے بعد اللہ کا رسولؐ۔ ظاہر ہے کہ اگر مرجع صرف اللہ ہوتا تو صراحت کے ساتھ رسُول کا ذکر محض بے معنی ہوتا۔ پھر جبکہ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، تو رسُول کی طرف رجُوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ عہدِ رسالت میں خود ذاتِ رسُول کی طرف اور اس عہد کے بعد سُنّتِ رسُول کی طرف رجُوع کیا جائے۔

بلکہ اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود عہدِ رسالت میں بھی بہت بڑی حد تک سُنّتِ رسولؐ ہی مرجع تھی۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے آخر زمانے میں اسلامی حکومت پورے جزیرۂ عرب پر پھیلی ہوئی تھی دس بارہ لاکھ مربع میل کے اِس وسیع و عریض ملک میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہر معاملہ کا فیصلہ براہِ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرایا جائے۔ لامحالہ اُس زمانے میں بھی اسلامی حکومت کے گورنروں، قاضیوں اور دوسرے حُکام کو معاملات کے فیصلے کرنے میں قرآن کے بعد جس دوسرے ماخذِ قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا تھا وہ سنتِ رسُول ہی تھی۔[۱۰۸]

عدلیہ کا طریقِ کار حضوؐر کے عہدِ مبارک میں

حضوؐر کی حیاتِ طیبہ میں جو معاملات براہِ راست آپ تک پہنچتے تھے ان میں تو اللہ اور رسُول کا منشا بتانے والے اور اس کے مطابق نزاعات کا فیصلہ کرنے والے آپ خود تھے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ پوری مملکتِ اسلامیہ میں پھیلی ہوئی

آبادی کو جو معاملات پیش آتے تھے وہ سب کے سب براہِ راست حضورؐ ہی تک پہنچائے جاتے تھے، اور نہ آپ ہی سے شخصاً ان کا فیصلہ حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کے بجائے مملکت کے مختلف علاقوں میں آپ کی طرف سے معلمین مامور تھے جو لوگوں کو دین سکھاتے تھے اور عام لوگ اپنے روز مرّہ کے معاملات میں انہی سے معلوم کرتے تھے کہ کتاب اللہ کا حکم کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طریقے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے علاوہ ہر علاقے میں امیر، عامل اور قاضی مقرر تھے جو اپنے اپنے دائرۂ عمل سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر معاملات کے فیصلے خود کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ کا منشا پورا کرنے کا جو طریقہ حضورؐ نے خود پسند فرمایا تھا وہ حضرت مُعاذ بن جبل کی مشہور حدیث میں بیان ہوا ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث مُعاذاً الی الیمن فقال کیف تقضی؟ قال، اقضی بما فی کتاب اللہ۔ قال فان لم یکن فی کتاب اللہ؟ قال فبسُنّۃِ رسول اللہ۔ قال فان لم یکن فی سُنّۃ رسول اللہ؟ قال اجتھد برائی۔ قال الحمد للہ الذی وفّق رسولَ رسولِ اللہ۔

(ترمذی، ابواب الاحکام۔ ابوداؤد، کتاب الاقضیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مُعاذ بن جبل کو یمن کی طرف قاضی بنا کر روانہ کیا تو ان سے پوچھا تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا اس ہدایت کے مطابق جو اللہ کی کتاب میں ہے۔ فرمایا اگر اللہ کی کتاب میں نہ ملے؟ عرض کیا پھر جو سنتِ رسُول اللہ میں ہو۔ فرمایا اگر سنتِ رسول اللہ میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا میں اپنی رائے سے حق و صواب تک پہنچنے کی، پُوری کوشش کروں گا۔ اِس پر حضورؐ نے فرمایا کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے رسُول اللہ کے فرستادہ شخص کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔ ۱۰۹ــ

اسلامی نظام کی دستوری بنیادیں اور ان میں رسُول کی حیثیت

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔

(النساء : ۵۹)

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسُول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسُول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

یہ آیت اسلام کے پُورے مذہبی، تمدّنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اوّلین دفعہ ہے۔ اِس میں حسبِ ذیل اصول مستقل طور پر قائم کر دیئے گئے ہیں:

(۱) اسلامی نظام میں اصل مُطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندۂ خدا ہے، باقی جو کچھ بھی ہے بس کے بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی، اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام، دونوں کا مرکز و محور خدا کی فرمانبرداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اُس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی مدِمقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور اس کی تابع ہوں۔ ورنہ ہر وہ حلقۂ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت کا حریف ہو۔ یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لَا طَاعَۃَ لمخلوق فی معصیۃ الخالق "خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے"۔

(۲) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسُول کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے بلکہ اطاعتِ خدا کی واحد عملی صورت ہے۔ رسُول اِس لیے مُطاع ہے کہ وہی ایک مُستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف اِسی طریقہ سے کر سکتے ہیں کہ رسُول کی اطاعت کریں۔ کوئی اطاعتِ خدا رسُول کی سند کے بغیر معتبر نہیں ہے اور رسُول کی پیروی سے منہ موڑنا خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ اِسی مضمون کو یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ مَن اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ "جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی"۔ اور یہی بات خود قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ آگے آ رہی ہے۔

(۳) مذکورۂ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ اُن "اولی الامر" کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ "اولی الامر" کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں، خواہ وہ ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں، یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، یا ملکی انتظام کرنے والے حکّام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا تمدنی اُمور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلّوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحبِ امر ہے وہ اس حیثیت میں اطاعت کا مستحق ہے، اور اس سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے، بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو اور خدا و رسُول کا مطیع ہو۔ یہ دونوں شرطیں اس اطاعت کے لیے لازمی شرطیں ہیں، اور یہ نہ صرف آیتِ مذکورۂ صدر میں صاف طور پر درج ہیں، بلکہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ مثلاً حسبِ ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:

السمع و الطاعۃ علی المرء المسلم فی ما احب وکرہ مالم یومر بمعصیۃ فاذا اُمر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ۔	مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سُنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند، تاوقتیکہ اُسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اور جب اسے معصیت

(بخاری و مسلم) کا حکم دیا جائے تو پھر اُسے نہ کچھ سُننا چاہیے اور نہ ماننا چاہیے۔

لاطاعة فی معصیة۔ انما الطاعة فی المعروف۔ (بخاری و مُسلم)

خدا اور رسُول کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے "معروف" میں ہے۔

یکون علیکم امراء تعرفون وتنکرون فمن انکر فقد برئ ومن کرہ فقد سلم ولکن من رضی وتابع۔ فقالوا افلا نقاتلهم؟ قال لا ما صلوا۔ (مُسلم)

حضورؐ نے فرمایا تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے مُنکرات پر اظہار ناراضی کیا وہ بَری الذمہ ہُوا۔ اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہُوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا، پھر جب ایسے حکام کا دَور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔

یعنی ترکِ نماز وہ علامت ہوگی جس سے صریح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعت خدا اور رسول سے باہر ہوگئے ہیں اور پھر اُن کے خلاف جدوجہد کرنا دُرست ہوگا۔

شِرَارُ ائمتکم الذین تبغضونھم و یبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم۔ قلنا یارسول اللّٰہ فلا ننابذھم عند ذالک؟ قال لا ما اقاموا فیکم الصلوٰۃ، لا ما اقاموا فیکم الصلوٰۃ۔ (مُسلم)

حضورؐ نے فرمایا تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمہارے لیے مبغوض ہوں اور تم ان کے لیے مبغوض ہو، تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسُول اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم اُن کے مقابلہ پر نہ اُٹھیں؟ فرمایا نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔

اس حدیث میں اوپر والی شرط کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ اوپر کی حدیث سے گمان ہو سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد دراصل مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے۔ یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابندِ نماز ہوں، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظامِ حکومت چل رہا ہو وہ کم از کم اقامتِ صلوٰۃ کا انتظام کرے۔ یہ اِس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اصُولی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے۔ ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہونگے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اُسے اُلٹ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لیے جائز ہو جائیگی۔ اسی بات کو ایک اور روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے من جملہ اور باتوں کے ایک

اس امر کا عہد بھی لیا کہ اَن لا ننازِعَ الامرَ اھلہ الا ان ترَوا کفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ برھان" یعنی یہ کہ ہم اپنے سرداروں اور حکام سے نزاع نہ کریں گے، اِلّا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں اُن کے خلاف ہمارے پاس خُدا کے حضور پیش کرنے کے لیے دلیل موجود ہو۔" (بخاری و مُسلم)

(۴) چوتھی بات جو آیت زیر بحث میں ایک مستقل اور قطعی اصُول کے طور پر طے کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسُول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند (Final Authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان، یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہوگی اس میں فیصلہ کے لیے قرآن اور سُنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کر دیں گے اس طرح تمام مسائلِ زندگی میں کتاب اللہ و سُنّتِ رسول اللہ کو سند اور مرجع اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصُوصیت ہے جو اُسے کافرانہ نظامِ زندگی سے مُمیّز کرتی ہے۔ جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

اِس موقع پر بعض لوگ یہ شُبہ پیش کرتے ہیں کہ تمام مسائلِ زندگی کے فیصلہ کے لیے کتاب اللہ و سُنتِ رسُول اللہ کی طرف کیسے رجُوع کیا جا سکتا ہے جبکہ میونسپلٹی اور ریلوے اور ڈاک خانہ کے قواعد و ضوابط اور ایسے ہی بے شمار معاملات کے احکام سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ شُبہ اصُولِ دین کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیّز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا مدّعی ہے اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اُس دائرے میں آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اس کے رب نے اُسے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اُصُول اور قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خُدائی سند کا اپنے آپ کو حاجتمند سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس مُسلمان اپنے ہر معاملہ میں سب سے پہلے خُدا اور اُس کے رسُول (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی طرف رجُوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے، اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اِسی صُورت میں آزادیٔ عمل برتتا ہے۔ اور اُس کی یہ آزادیٔ عمل اِسی حُجت پر مبنی ہوتی ہے کہ اِس معاملہ میں شارع کا کوئی حکم نہ دینا اس کی طرف سے آزادیٔ عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے۔ ؎۱۱۱

فصل ۶

حضورؐ پر قرآن کے علاوہ وحی کا نزول

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ - اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ - ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ -

(القیامہ: ۱۶ تا ۱۹)

اے نبیؐ، اِس وحی کو جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لٰہذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سُنتے رہو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصُولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اُن گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔

اوّلاً، اس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپؐ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے احکام اور فرامین، اس کے اشارات، اس کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم و مدعا حضورؐ کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مِل جاتا۔ لٰہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالب قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ کی طرف سے کی جاتی تھی، وہ بہر حال الفاظِ قرآن سے ماسوا تھی۔ یہ وحیِ خفی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔

ثانیاً، قرآن کے مفہوم و مدعا اور اس کے احکام کی یہ تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی تھی آخر اسی لیے تو بتائی گئی تھی کہ آپ اپنے قول اور عمل سے اُس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔ اگر یہ اُس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپؐ کو صرف اس لیے بتائی گئی تھی کہ آپ اپنی ذات کی حد تک اس علم کو محدود رکھیں تو یہ ایک بے کار کام تھا، کیونکہ فرائضِ نبوّت کی ادائیگی میں اس سے کوئی مدد نہیں مِل سکتی تھی۔ اس لیے صرف ایک بیوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریحی علم سرے سے کوئی تشریعی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے خود سُورۂ نحل آیت ۴۴ میں فرمایا ہے وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ "اور اے نبی، یہ ذکر ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اُتاری گئی ہے[1]"۔ اور قرآن میں چار جگہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سُنا دینا ہی نہ تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔ (البقرہ، آیات ۱۲۹ و ۱۵۱۔ آل عمران، ۱۶۴۔ الجمعہ، ۲[2])۔ اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی صحیح و مُستند، بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے قول اور عمل سے فرما دی ہے کیونکہ وہ آپ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا اُس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے وہ ایسی جسارت کرتا ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحبِ ایمان آدمی نہیں کر سکتا۔

ثالثاً، قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنہیں ایک عربی دان آدمی محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ اُن کا حقیقی مدّعا کیا ہے اور اُن میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اس پر کیسے عمل کیا جائے۔ مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہی کو لے لیجیے۔ قرآن مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوٰۃ ہے۔ لیکن محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک متعین نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اِس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اور اس سے مُراد غالباً کوئی خاص فعل ہے جسے انجام دینے کا اہلِ ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی دان یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے بھیجنے والے نے اپنی طرف سے ایک مُعلّم کو مقرر کر کے اپنی اس اصطلاح کا مفہوم اُسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا، تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں کوئی دو مسلمان بھی ایسے ہو سکتے تھے جو حکمِ صلوٰۃ پر عمل کرنے کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل ایک ہی طرح جو نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں، اور دُنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر صرف قرآن کے الفاظ ہی

---

[1] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۴۰۔

[2] ان سب آیات کی تشریح ہم "سُنّت کی آئینی حیثیت" میں صفحہ ۴۴ سے ۷۱ تک تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ (مؤلف)

وحی نہیں فرماتے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا، اور اُسی مطلب کی تعلیم آپ اُن سب لوگوں کو دیتے چلے گئے جنہوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب اور آپ کو اللہ کا رسُول مان لیا۔

رابعاً، قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسُول کو بتائی اور رسُول نے اپنے قول اور عمل سے اس کی جو تعلیم اُمّت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سُنّت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مُراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سُنّت سے مُراد وہ طریقہ ہے جو حضورؐ کی قولی و عملی تعلیم سے مُسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہُوا جس کی تفصیلات مُعتبر روایتوں سے بھی بعد کی نسلوں کو اگلی نسلوں سے ملیں، اور بعد کی نسلوں نے اگلی نسلوں میں اس پر عمل درآمد ہوتے بھی دیکھا۔ اِس ذریعۂ علم کو قبول کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھا دینے کی جو ذمّہ داری لی تھی اُسے پُورا کرنے میں معاذ اللہ وہ ناکام ہو گیا، کیونکہ یہ ذمّہ داری محض رسُول کو ذاتی حیثیت سے مطلب سمجھانے کے لیے نہیں لی گئی تھی، بلکہ اِس غرض کے لیے لی گئی تھی کہ رسُولؐ کے ذریعہ سے اُمّت کو کتابِ الٰہی کا مطلب سمجھایا جائے، اور حدیث و سُنّت کے ماخذِ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ سے آپ یہ لازم آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ذمّہ داری کو پُورا نہیں کر سکا ہے، اعاذنا اللہ من ذالک۔ اس کے جواب میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تو لی تھیں، اُس سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پوری اُمّت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھُوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ جعل ساز لوگ وہی سکے تو جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انہیں کون بیوقوف جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس اُمّت نے اوّل روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذاتِ پاکؐ کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے، اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اُس ذات کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا اُتنا ہی زیادہ اِس اُمّت کے خیر خواہ اِس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے ممیّز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بد نصیب ہیں وہ لوگ جو اِس علم کو حاصل کیے بغیر مغربی مستشرقین کے بہکائے میں آکر حدیث و سُنّت کو ناقابلِ اعتبار ٹھیراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اِس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ [۱۱۱]

قبلہ کا تقرُّر

قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ حضورؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے اور آپ

ان دونوں قسم کی وحیوں کا اتباع کرنے پر مامور تھے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۔ (البقرہ : ۱۴۳)

اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم تھے اسی لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔

یہ سب سے زیادہ کھلی ہوئی آیت ہے جو ہر تاویل کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور ساتھ ساتھ اس مفروضے کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کسی صورت میں وحی نہیں آتی تھی۔ مسجدِ حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اسے قبلہ بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا ہے اور یہ واقعہ ناقابلِ انکار ہے کہ وہ قبلہ آغازِ اسلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا اور تقریباً ۱۴ سال تک اسی کی طرف حضورؐ اور صحابہ کرامؓ نماز ادا کرتے رہے۔ ۱۴ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی اِس آیت میں حضورؐ کے اِس فعل کی توثیق فرمائی، اور یہ اعلان فرمایا کہ یہ قبلہ ہمارا مقرر کیا ہوا تھا، اور اسے ہم نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ سے اِس لیے مقرر کیا تھا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے مُنہ موڑتا ہے۔ یہ ایک طرف اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف یہی آیت پوری صراحت کے ساتھ یہ بتاتی ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن احکام کا اِتباع کرنے پر بھی مامور ہیں جو قرآن میں مذکور نہ ہوں، حتّٰی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمانوں کے ایمان بالرسالت کی آزمائش ہی اِس طریقہ سے ہوتی ہے کہ رسولؐ کے ذریعہ سے جو حکم دیا جائے اُسے وہ مانتے ہیں یا نہیں۔ [۱۱۲]

سوال یہ ہے کہ اگر حضورؐ پر قرآن کے علاوہ اور کوئی وحی نہیں آتی تھی تو وہ حکم حضورؐ کو کس ذریعہ سے ملا؟ کیا یہ اِس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ حضورؐ کو ایسے احکام بھی ملتے تھے جو قرآن میں درج نہیں ہیں؟ [۱۱۳]

فتحِ مکّہ کی بشارت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپؐ مکّہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ آپؐ اس کی خبر صحابہ کرامؓ کو دیتے ہیں اور ۱۴ سو صحابیوں کو لیکر عُمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ کفارِ مکّہ آپؐ کو حُدیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صُلح حُدیبیہ واقع ہوتی ہے بعض صحابی اس پر خلجان میں پڑ جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ اُن کی ترجمانی کرتے ہوئے پُوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ کیا آپؐ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکّہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا "کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سفر میں ایسا ہوگا؟" اس پر اللہ قرآن میں فرماتا ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ

اللہ نے اپنے رسولؐ کو یقیناً سچّا خواب دکھایا تھا۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا۔ (الفتح : آیت ۲۷)

تم ضرور مسجد حرام میں انشاء اللہ داخل ہو گے امن کے ساتھ سر مونڈتے ہوئے اور بال تراشتے ہوئے بغیر اس کے کہ تمہیں کسی قسم کا خوف ہو۔ اللہ کو علم تھا اُس بات کا جسے تم نہ جانتے تھے۔ اس لیے اس سے پہلے اُس نے یہ قریب کی فتح (یعنی صلح حدیبیہ) عطا کر دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کو خواب کے ذریعہ سے مکہ میں داخل ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر مکہ کی طرف جائیں، کفار روکیں گے، آخر کار صلح ہو گی جس کے ذریعہ سے دوسرے سال عمرہ کا موقع بھی ملے گا اور آئندہ کی فتوحات کا راستہ بھی کھل جائے گا۔ کیا یہ قرآن کے علاوہ دوسرے طریقوں سے ہدایات ملنے کا کھلا ثبوت نہیں ہے؟

راز کی بات

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک بیوی کو راز میں ایک بات بتاتے ہیں وہ اس کا ذکر دوسروں سے کر دیتی ہیں۔ حضورؐ اس پر باز پرس کرتے ہیں تو وہ پوچھتی ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہہ دی ہے۔ حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ۔ (التحریم۔۳)

اور جبکہ نبیؐ نے اپنی ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی اور اس بیوی نے اس کی دوسروں کو خبر دے دی؛ اور اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا تو نبی نے اس بیوی کو اس کے قصور کا ایک حصّہ تو جتا دیا اور دوسرے حصّہ سے درگزر کیا۔ پس جب نبی نے اس بیوی کو اس کا قصور جتایا تو اُس نے پوچھا آپؐ کو کس نے اس کی خبر کر دی؟ نبیؐ نے کہا مجھے علیم و خبیر خدا نے بتایا۔

فرمائیے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی نے تمہاری راز کی بات دوسروں سے کہہ دی ہے؟ اگر نہیں ہے تو ثابت ہوا یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغامات بھیجتا تھا؟

نکاحِ زینبؓ

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ بولے بیٹے زیدؓ بن حارثہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں اور اس کے بعد حضورؐ اُن کی

مطلّقہ بیوی سے نکاح کر لیتے ہیں۔ اس پر منافقین و مخالفین حضور کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک شدید طوفان کھڑا کرتے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب کے ایک پورے رکوع میں دیتا ہے اور اس سلسلے میں لوگوں کو بتاتا ہے کہ ہمارے نبیؐ نے یہ نکاح خود نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے حکم سے کیا ہے۔

فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَهَا لِکَیْ لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا۔ (آیت ۳۷)

پھر جب زیدؓ کا اُس سے جی بھر گیا تو ہم نے اُس (خاتون) کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہلِ ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ ان سے جی بھر چکے ہیں (یعنی انہیں طلاق دے چکے ہیں)۔

یہ آیت تو گزرے ہوئے واقعہ کا بیان ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو جو حکم دیا گیا تھا کہ تم زیدؓ کی مطلّقہ بیوی سے نکاح کر لو وہ قرآن میں کس جگہ ہے؟

درخت کاٹنے کی اجازت

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلّم بنی نضیر کی مسلسل بدعہدیوں سے تنگ آکر مدینہ سے متّصل ان کی بستیوں پر چڑھائی کر دیتے ہیں۔ اور دورانِ محاصرہ میں اسلامی فوج گرد و پیش کے باغات کے بہت سے درخت کاٹ ڈالتی ہے تاکہ حملہ کرنے کے لیے راستہ صاف ہو۔ اس پر مخالفین شور مچاتے ہیں کہ باغوں کو اُجاڑ کر اور ہرے بھرے ثمردار درختوں کو کاٹ کر مسلمانوں نے فساد فی الارض برپا کیا ہے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَکْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰۤی اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (الحشر ۵)

کھجوروں کے درخت تم نے کاٹے اور جو کھڑے رہنے دیئے۔ یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت قرآن مجید کی کس آیت میں نازل ہوئی تھی؟

جنگِ بدر سے پہلے کا ایک وعدہ

(۶) جنگِ بدر کے خاتمہ پر جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اس وقت سورۂ انفال نازل ہوتی ہے اور پوری جنگ پر تبصرہ کیا جاتا ہے اِس تبصرے کا آغاز اللہ تعالیٰ اُس وقت کرتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم جنگ کے لیے گھر سے نکلے تھے، اور اِس سلسلے میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰهُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَکُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَةِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَیُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ

اور جبکہ اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں (یعنی تجارتی قافلے اور قریش کے لشکر) میں سے ایک تمہارے ہاتھ آئے گا، اور تم چاہتے تھے کہ بے زور

بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ۔ (آیت ۷)	گروہ (یعنی تجارتی قافلہ) تمہیں ملے۔ حالانکہ اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی کمر توڑ دے۔

اب کیا آپ پورے قرآن میں سے کسی آیت کی نشاندہی فرما سکتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ نازل ہُوا ہو کہ اَے لوگو، جو مدینہ سے بدر کی طرف جا رہے ہو، ہم دو گروہوں میں سے ایک پر تمہیں قابو عطا فرما دیں گے؟

مُسلمانوں کی فریاد کا جواب

(۷) اِسی جنگِ بدر پر تبصرے کے سلسلے میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (الانفال آیت ۹)	جبکہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، تو اس نے تمہاری فریاد کے جواب میں فرمایا مَیں تمہاری مدد کے لیے لگاتار ایک ہزار فرشتے بھیجنے والا ہوں۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی فریاد کا یہ جواب قرآن مجید کی کس آیت میں نازل ہُوا تھا؟
آپ صرف ایک مثال چاہتے تھے، مَیں نے آپ کے سامنے قرآنِ مجید سے سات مثالیں پیش کر دی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ کے پاس قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔ اس کے بعد آگے کسی بحث کا سلسلہ چلنے سے پہلے مَیں یہ دیکھنا چاہتا ہُوں کہ آپ حق کے آگے جُھکنے کے لیے تیار بھی ہیں یا نہیں؟ [۱۱۴]

اذان اور نمازِ جمعہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ط (الجمعہ)	اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب پُکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔"

اِس فقرے میں تین باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں نماز کے لیے مُنادی کرنے کا ذکر ہے۔ دُوسرے یہ کہ کسی ایسی نماز کی منادی کا ذکر ہے جو خاص طور پر صرف جمعہ کے دن ہی پڑھی جانی چاہیے۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں چیزوں کا ذکر اس طرح نہیں کیا گیا ہے کہ تم نماز کی منادی کرو، اور جمعہ کے روز ایک خاص نماز پڑھا کرو، بلکہ اندازِ بیان اور سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ لوگ اس نماز کے لیے دوڑنے میں تساہل برتتے تھے اور خرید و فروخت کرنے میں لگے رہتے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت صرف اِس غرض کے لیے نازل فرمائی کہ لوگ اس منادی اور اِس خاص نماز کی اہمیت محسوس کریں اور فرض جان کر اس کی طرف دوڑیں۔ اِن تینوں باتوں پر اگر غور کیا جائے تو ان سے یہ اصُولی حقیقت قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو کچھ ایسے احکام بھی دیتا

تھا جو قرآن میں نازل نہیں ہوئے، اور وہ احکام بھی اُسی طرح واجب الاطاعت تھے جس طرح قرآن میں نازل ہونے والے احکام۔

نماز کی منادی وہی اذان ہے جو آج ساری دُنیا میں ہر روز پانچ وقت ہر مسجد میں دی جا رہی ہے۔ مگر قرآن میں کسی جگہ نہ اُس کے الفاظ بیان کیے گئے ہیں نہ کہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز کے لیے لوگوں کو اِس طرح پکارا کرو۔ یہ چیز رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مقرر کردہ ہے۔ قرآن میں اسی کی دو جگہ توثیق کی گئی ہے۔ ایک اِس آیت میں دوسرے سُورۂ مائدہ کی آیت ۵۸ میں۔

اِسی طرح جمعہ کی یہ خاص نماز جو آج ساری دُنیا کے مسلمان ادا کر رہے ہیں، اِس کا بھی قرآن میں نہ حکم دیا گیا ہے نہ وقت اور طریقِ ادا بتایا گیا ہے۔ یہ طریقہ بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا جاری کردہ ہے، اور قرآن کی یہ آیت صرف اس کا وجوب اور اس کی شدت بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔

اِس صریح دلیل کے باوجود جو شخص یہ کہتا ہے کہ شرعی احکام صرف وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے وہ دراصل سُنّت کا نہیں خود قرآن کا بھی منکر ہے۔[۱۱۵]

نماز پڑھنے کا طریقہ

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ - عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ۔ (العلق: ۹-۱۰)

تم نے دیکھا اُس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جبکہ وہ نماز پڑھتا ہے۔

بندے سے مُراد خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ اِس طریقے سے حضورؐ کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى (بنی اسرائیل۔۱)۔ "پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف"۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَنزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ (الکہف۔۱)۔ "تعریف ہے اُس خُدا کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی"۔ وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا (الجن۔۱۹)۔ "اور یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے"۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص محبّت کا انداز ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اپنے رسُول محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکر فرماتا ہے۔ علاوہ بریں اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوّت کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اس طریقے کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے کہ اے نبی تم اِس طرح نماز پڑھا کرو۔ لہٰذا یہ اِس امر کا ایک اور ثبوت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپ کو ایسی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی جو قرآن میں درج نہیں ہیں۔[۱۱۶]

باب ۵

بشریتِ رسولؐ

فصل ۱

نبوّت و بشریّت

نظریۂ جاہلیت کہ پیغمبر بشر نہیں ہوسکتا

ہر زمانے کے جاہل لوگ اِس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ بشر کبھی پیغمبر نہیں ہوسکتا۔ اِسی لیے جب کوئی رسُول آیا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے، گوشت پوست کا بنا ہُوا ہے، فیصلہ کر دیا کہ یہ پیغمبر نہیں ہے کیونکہ بشر ہے۔ اور جب وہ گزر گیا تو ایک مدّت کے بعد اس کے عقیدت مندوں میں ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہو گئے جو کہنے لگے کہ وہ بشر نہیں تھا کیونکہ پیغمبر تھا۔ چنانچہ کسی نے اسے خدا بنایا، اور کسی نے خدا کا بیٹا، اور کسی نے کہا کہ خدا اس میں حلول کر گیا ہے۔ غرض بشریّت اور پیغمبری کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کے لیے ہمیشہ ایک معمّا ہی بنا رہا۔ [1]

مشرکینِ مکّہ کا نقطۂ نظر

اوّل تو اہلِ مکّہ انسان کا رسُول ہونا ہی عجیب سمجھتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہو۔ تاہم اگر آدمی ہی رسُول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دُنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور باریابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا۔ نہ یہ کہ ایک ایسا عامی آدمی خداوندِ عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں جُوتیاں چٹخاتا پھرتا ہو۔ بھلا اُس آدمی کو کون خاطر میں لائے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اُس کے اندر غیر معمولی پن نہ پاتا ہو۔ بالفاظِ دیگر اُن کی رائے میں رسُول کی ضرورت اگر تھی تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ عجوبہ دکھانے یا ٹھاٹھ باٹھ سے دھونس جمانے کے لیے تھی ——— یا پھر ایک فرشتہ اس کے ساتھ کر دیا جاتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ مانو اس کی بات ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسا دیتا ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کا مالک ایک شخص کو نبوّت کا جلیل القدر منصب عطا کر کے بس یُوں ہی اکیلا چھوڑ دے اور وہ لوگوں سے گالیاں اور پتھر کھاتا پھرے ———

بدرجۂ آخر ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اللہ میاں کم از کم اتنا تو کرتے کہ اپنے رسُول کے لیے معاش کا کوئی اچھا انتظام کر دیتے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا رسُول ہمارے معمولی رئیسوں سے بھی گیا گزرا ہو۔ نہ خرچ کے لیے مال میسّر، نہ پھل کھانے کو کوئی باغ نصیب اور دعویٰ یہ کہ ہم اللہ رب العٰلمین کے پیغمبر ہیں۔ [۱۱۸]

نبوّت اور خدا رسیدگی کے متعلق جاہلانہ تصوّرات

نادان لوگوں کے ذہن میں ہمیشہ سے یہ احمقانہ تصوّر رہا ہے کہ جو شخص خدا رسیدہ ہو اُسے انسانیت سے ماورا ہونا چاہیے۔ اُس سے عجائب و غرائب صادر ہونے چاہییں۔ وہ ایک اشارہ کرے اور پہاڑ سونے کا بن جائے۔ وہ ایک حکم کرے اور زمین خزانے اُگلنے لگے۔ اُس پر لوگوں کے اگلے پچھلے سب حالات روشن ہوں۔ وہ بتا دے کہ گم شدہ چیز کہاں رکھی ہے، مریض بچ جائے گا یا مر جائے گا، حاملہ کے پیٹ میں نر ہے یا مادہ۔ پھر اس کو انسانی کمزوریوں اور محدودیتوں سے بھی بالاتر ہونا چاہیے۔ بھلا وہ بھی کوئی خدا رسیدہ ہے جسے بھوک اور پیاس لگے، جسے نیند آئے، جو بیوی بچے رکھتا ہو، جو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خرید و فروخت کرتا ہو، جسے کبھی قرض لینے کی ضرورت پیش آئے اور کبھی وہ مفلسی و تنگ دستی میں مبتلا ہو کر پریشان حال رہے۔ اس قسم کے تصوّرات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے معاصرین کی ذہنیت پر مُسلّط تھے۔ وہ جب آپؐ سے پیغمبری کا دعویٰ سنتے تھے تو آپؐ کی صداقت جانچنے کے لیے آپؐ سے غیب کی خبریں پوچھتے تھے، خوارقِ عادت کا مطالبہ کرتے تھے، اور آپؐ کو بالکل عام انسانوں جیسا ایک انسان دیکھ کر اعتراض کرتے تھے کہ یہ اچھا پیغمبر ہے جو کھاتا پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ [۱۱۹]

نبی کا بشر ہونا کیوں ضروری ہے؟

ذکرِ الٰہی (الہامی پیغام) کو نبی پر نازل کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سورۂ نحل کی ۴۴ ویں آیت میں فرماتا ہے:

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ۔	"اے نبی ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس چیز کی وضاحت کرو جو اُن کی طرف بھیجی گئی ہے۔"

اِس مقصد کا تقاضا یہ تھا کہ لازماً ایک انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے۔ "ذکر" فرشتوں کے ذریعے بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ بلکہ براہِ راست چھاپ کر ایک ایک انسان تک بھی پہنچایا جا سکتا تھا۔ مگر محض ذکر بھیج دینے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت و ربوبیّت اُس کی تنزیل کی متقاضی تھی۔ اُس مقصد کی تکمیل کے لیے تو ضروری تھا کہ اس "ذکر" کو ایک قابل ترین انسان لے کر آئے۔ وہ اس کو تھوڑا تھوڑا

کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے اُس کا مطلب سمجھائے۔ جنہیں کچھ شک ہو اُن کا شک رفع کرے۔ جنہیں کوئی اعتراض ہو اُن کے اعتراض کا جواب دے۔ جو نہ مانیں اور مخالفت اور مزاحمت کریں اُن کے مقابلہ میں وہ اُس طرح کا رویّہ برت کر دکھائے جو اِس ذِکر کے حاملین کی شان کے شایاں ہے۔ جو مان لیں اُنہیں زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کے متعلق ہدایات دے۔ اُن کے سامنے خود اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرے اور اُن کو انفرادی و اجتماعی تربیت دے کر ساری دُنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بطورِ مثال رکھ دے جس کا پورا اجتماعی نظام "ذکر" کے منشا کی شرح ہو۔ ۱۲۰؎

انسان کی رہنمائی کے لیے انسان ہی نبی ہو سکتا ہے

پیغمبر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ آکر پیغام سنا دے، بلکہ اُس کا کام یہ بھی ہے کہ اس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح کرے۔ اُسے انسانی احوال پر اُس پیغام کے اصُولوں کا انطباق کرنا ہوتا ہے۔ اُسے خود اپنی زندگی میں ان اصُولوں کا عملی مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ اُسے اُن بے شمار مختلف انسانوں کے ذہن کی گتھیاں سلجھانی پڑتی ہیں جو اس کا پیغام سُننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُسے ماننے والوں کی تنظیم اور تربیت کرنی ہوتی ہے تاکہ اس پیغام کی تعلیمات کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آئے۔ اُسے انکار اور مخالفت و مزاحمت کرنے والوں کے مقابلے میں جدوجہد کرنی ہوتی ہے تاکہ بگاڑ کی حمایت کرنے والی طاقتوں کو نیچا دکھایا جائے اور وہ اصلاح عمل میں آسکے جس کے لیے خدا نے اپنا پیغمبر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سارے کام جبکہ انسانوں ہی میں کرنے کے ہیں تو ان کے لیے انسان نہیں تو اور کون بھیجا جاتا؟ فرشتہ تو زیادہ سے زیادہ یہی کرتا کہ آتا اور پیغام پہنچا کر چلا جاتا۔ انسانوں میں انسان کی طرح رہ کر انسان کے سے کام کرنا اور پھر انسانی زندگی میں منشائے الٰہی کے مطابق اصلاح کر کے دکھا دینا کسی فرشتے کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے تو ایک انسان ہی موزوں ہو سکتا تھا۔ ۱۲۱؎

فصل ۲

بشریّتِ انبیاء[1]

آدمؑ بشر تھے

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (الاعراف: ۱۱)

"ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا آدمؑ کو سجدہ کرو۔"

یہ جو فرمایا کہ "ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہیں صورت بخشی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو" تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا، اور تمہارا مادۂ آفرنیش تیار کیا، پھر اس مادّے کو انسانی صورت عطا کی، پھر جب ایک زندہ انسان کی حیثیت سے آدمؑ وجود میں آگیا تو اُسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ آدم علیہ السّلام کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ آدمؑ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ نوعِ انسانی کا نمائندہ فرد ہونے کی حیثیت سے تھا۔ اِس آیت کی یہ تشریح خود قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ صٓ، رکوع ۵ میں ہے:

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۔ (صٓ۔ رکوع ۵)

"تصور کرو اُس وقت کا جبکہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے اندر اپنی رُوح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔"

اِس آیت میں وہی تین مراتب ایک دوسرے انداز میں بیان کیے گئے ہیں، یعنی پہلے مٹی سے ایک بشر کی تخلیق پھر اس کا تسویہ، یعنی اس کی شکل و صورت بنانا اور اس کے اعضاء اور اس کی قوتوں کا تناسب قائم کرنا، پھر اس کے

---

[1] واضح رہے کہ یہاں صرف ایسے چند انبیاء کا ذکر کیا گیا ہے جن کی بشریّت پر قرآن میں صراحت سے کہا گیا ہے یا مؤلف نے کوئی تفصیلی بحث کی ہے۔ (مرتبین)

اندر اپنی رُوح سے کچھ پُھونک کر آدمؑ کو وجُود میں لے آنا۔ اسی مضمون کو سُورۂ حِجر رکوع ۳ میں بایں الفاظ ادا کیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ۝ (الحجر: ۲۸-۲۹)

اور تصوّر کرو اس وقت کا جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ مَیں خمیر اُٹھی ہوئی مٹی کے گارے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب مَیں اُسے پُوری طرح تیار کر لُوں اور اُس کے اندر اپنی رُوح سے کچھ پُھونک دُوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔"[1] ۱۲۲؎

نُوح علیہ السّلام کی بشریّت

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝ (ہُود - آیت ۳۱)

اور (نُوحؑ نے کہا) مَیں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ مَیں یہ کہتا ہُوں کہ مَیں غیب کا علم رکھتا ہُوں۔ نہ یہ میرا دعوٰی ہے کہ مَیں فرشتہ ہُوں۔ اور یہ بھی مَیں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی۔ ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر مَیں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔

یہ اُس بات کا جواب ہے جو مخالفین نے کہی تھی کہ ہمیں تو تم بس اپنے ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہو۔ اس پر حضرت نوحؑ فرماتے ہیں کہ واقعی میں ایک انسان ہی ہوں۔ مَیں نے انسان کے سوا اور کچھ ہونے کا دعوٰی کب کیا تھا کہ مجھ پر یہ اعتراض کرتے ہو۔ میرا دعوٰی جو کچھ ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ خدا نے مجھے علم و عمل کا سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ اِس کی آزمائش تم جس طرح چاہو کر لو۔ مگر اِس دعوے کی آزمائش کا یہ کونسا طریقہ ہے کہ کبھی تم مجھ سے غیب کی خبریں پُوچھتے ہو، اور کبھی ایسے ایسے عجیب مطالبے کرتے ہو کہ گویا خدا کے خزانوں کی ساری کُنجیاں میرے پاس ہیں، اور کبھی اِس بات پر اعتراض کرتے ہو کہ مَیں انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہُوں، گویا مَیں نے فرشتہ ہونے کا دعوٰی کیا تھا۔ جس آدمی نے عقائد، اخلاق اور تمدّن میں صحیح رہبری کا دعوٰی کیا ہے اُس سے اِن چیزوں کے متعلق جو چاہو پُوچھو، مگر تم عجیب لوگ ہو جو اس سے پوچھتے ہو کہ فلاں شخص کی بھینس کٹڑا جنے گی یا پڑیا۔ گویا انسانی زندگی کے لیے صحیح اصولِ اخلاق و تمدّن بنانے کا کوئی تعلق بھینس کے حمل سے بھی ہے۔ ۱۲۳؎

---

[1] اِس سے ثابت ہُوا کہ پہلا نبی ہی بشر تھا، کیونکہ اسلام کا یہ مُسلّم عقیدہ ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السّلام نبی تھے (مؤلف)

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِھٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ (المؤمنون۔ آیات ۲۴-۲۵)

"اُس کی (یعنی حضرت نوحؑ کی) قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔ یہ بات تو ہم نے اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سُنی ہی نہیں (کہ بشر رسُول بن کر آئے) کچھ نہیں، بس اِس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا ہے، کچھ مدت اور دیکھ لو (شاید افاقہ ہو جائے)۔

یہ خیال تمام گمراہ لوگوں کی مشترک گمراہیوں میں سے ایک ہے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرآن نے بار بار اس جاہلانہ تصوّر کا ذکر کے اس کی تردید کی ہے اور اس بات کو پورے زور کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تمام انبیاء انسان تھے اور انسانوں کے لیے انسان ہی نبی ہونا چاہیے۔ [۱۲۴]

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ (ھود۔ ۲۷)

جواب میں اس کی (یعنی حضرت نوحؑ کی) قوم کے سردار جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے۔"

یہ وہی (قدیم) جاہلانہ اعتراض ہے جو مکّہ کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے مقابلہ میں پیش کرتے تھے کہ جو شخص ہماری ہی طرح کا ایک معمولی انسان ہے، کھاتا پیتا ہے، چلتا پھرتا ہے، سوتا اور جاگتا ہے، بال بچے رکھتا ہے، آخر ہم کیسے مان لیں کہ وہ خدا کی طرف سے پیغمبر مقرر ہو کر آیا ہے۔ [۱۲۵]

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَاۗءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ (الاعراف۔ آیت ۶۳)

حضرت نوحؑ نے کہا "کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟"

حضرت ہودؑ کی بشرّیت

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ

"اس کی (یعنی حضرت ہودؑ کی) قوم کے جن سرداروں

الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یَاْکُلُ مِمَّا تَاْکُلُوْنَ مِنْهُ وَیَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَکُمْ اِنَّکُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ (المؤمنون ۳۳ - ۳۴)

نے کفر کیا تھا اور آخرت کو جھٹلایا تھا اور جنہیں ہم نے دنیا کی زندگی میں خوشحالی دے رکھی تھی، کہا کہ یہ شخص کچھ بھی نہیں ہے، بس ایک بشر ہے تم ہی جیسا۔ جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو گھاٹے ہی میں رہے۔"

بعض لوگوں نے یہ غلط سمجھا ہے کہ یہ باتیں وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ نہیں، یہ خطاب دراصل عوام الناس سے تھا۔ سردارانِ قوم کو جب خطرہ ہوا کہ عوام پیغمبر کی پاکیزہ شخصیت اور دل لگتی باتوں سے متاثر ہو جائیں گے اور ان کے متاثر ہو جانے کے بعد ہماری سرداری پھر کس پر چلے گی، تو انہوں نے یہ تقریریں کر کے عام لوگوں کو بہکانا شروع کیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے پیغمبری ویغمبری کچھ نہیں ہے محض اقتدار کی بھوک ہے جو اس شخص سے یہ باتیں کروا رہی ہے۔ بھائیو ذرا غور تو کرو کہ آخر یہ شخص تم سے کس چیز میں مختلف ہے۔ ویسا ہی گوشت پوست کا آدمی ہے جیسے تم ہو۔ کوئی فرق اس میں اور تم میں نہیں ہے۔ پھر کیوں یہ بڑا بنے اور تم اس کے فرمان کی اطاعت کرو۔ ان تقریروں میں یہ بات گویا بلا نزاع تسلیم شدہ تھی کہ ہم جو تمہارے سردار ہیں تو ہمیں تو ہونا ہی چاہیے۔ ہمارے گوشت پوست اور کھانے پینے کی نوعیت کی طرف دیکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تو آپ سے آپ قائم اور مسلّم ہے البتہ زیرِ بحث یہ نئی سرداری ہے جو اب قائم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی بات اُن سردارانِ قوم کی بات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی جن کے نزدیک قابلِ الزام اگر کوئی چیز تھی تو وہ "اقتدار کی بھوک" جو کسی نئے آنے والے کے اندر انہیں محسوس ہو، یا جس کے ہونے کا شبہہ کیا جا سکے۔ رہا اُن کا اپنا پیٹ تو وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار بہرحال اس کی فطری خوراک ہے جس سے اگر وہ بدہضمی کی حد تک بھی بھر جائے تو قابلِ اعتراض نہیں۔ ۱۲۶

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰکِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَکُمْ ذِکْرٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْکُمْ لِیُنْذِرَکُمْ ط۔

(الاعراف: ۶۷ تا ۶۹)

اُس نے (یعنی حضرت ہودؑ نے) کہا "اے برادرانِ قوم! مَیں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ مَیں رب العٰلمین کا رسول ہوں، تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے؟

قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِکَةً فَاِنَّا

انہوں نے کہا اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، (۱) ہم

بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ (حٰمٓ السجدہ : ۱۴) — "اُس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔"

حضرت صالحؑ و شعیبؑ کی بشریت

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ○ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ (الشعرآء ۱۵۳-۱۵۴) — (ثمود کی قوم کے لوگوں نے) جواب دیا کہ تُو محض ایک سحرزدہ آدمی ہے تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے۔ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے۔"

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ○ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ (الشعرآء : ۱۸۵-۱۸۶) — "اُنہوں نے کہا تو محض سحرزدہ آدمی ہے اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے جھوٹا آدمی سمجھتے ہیں"

حضرت موسیٰ و ہارون کی بشریت

فرعون اور اُس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ اور ہارون کے متعلق کہا:

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ○ (المؤمنون - ۴۷) — "کہنے لگے، کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندی ہے"۔

تمام انبیاء کی بشریت

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ - (ابراہیم : ۱۱) — "اُن کے رسولوں نے اُن سے کہا" واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے۔"

یعنی بلاشبہ ہم ہیں تو انسان ہی مگر اللہ نے تمہارے درمیان ہم کو علمِ حق اور بصیرتِ کاملہ عطا کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس میں ہمارے بس کی کوئی بات نہیں یہ تو اللہ کے اختیارات کا معاملہ ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو جو چاہے دے۔ ہم نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس آیا ہے وہ تمہارے پاس بھجوا دیں، نہ یہی کر سکتے ہیں کہ جو حقیقتیں ہم پر منکشف ہوتی ہیں اُن سے آنکھیں بند کرلیں۔[۱۲۷]

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ - (ابراہیم - آیت ۱۰) — "انہوں نے (رسولوں کو) جواب دیا" تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں۔ تم ہمیں اُن ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو جنکی بندگی باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ تم ہر حیثیت سے بالکل ہم جیسے انسان ہی نظر آتے ہو۔ کھاتے ہو۔ پیتے ہو۔ سوتے ہو۔ بیوی بچے رکھتے ہو۔ بھوک، پیاس، بیماری، دُکھی، سردی، گرمی، ہر چیز کے احساس میں اور ہر بشری کمزوری میں ہمارے مشابہ ہو۔ تمہارے اندر کوئی غیر معمولی پن ہمیں نظر نہیں آتا جس کی بنا پر ہم یہ مان لیں کہ تم کوئی پہنچے ہوئے لوگ ہو اور خدا تم سے ہم کلام ہوتا ہے اور فرشتے تمہارے پاس آتے ہیں۔[۱۲۸]

فصل ۳

نبیؐ اکرمؐ بھی انسان تھے

کفارِ مکہ کہتے تھے کہ محمدؐ رسول نہیں ہیں کیونکہ وہ انسان ہیں۔

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ (الفرقان: ۷)

کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسُول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ۔

وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ۔ (الانبیاء - ۳)

اور یہ ظالم لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم جیسے ایک بشر کے سوا آخر اور کیا ہے۔ پھر تم آنکھوں دیکھتے اِس جادو کے شکار ہو جاؤ گے ؟

قدیم جاہلانہ خیال

قرآن مجید کفارِ مکہ کے اِس جاہلانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ کوئی نئی جہالت نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ ان لوگوں سے ظاہر ہو رہی ہو۔ بلکہ قدیم ترین زمانے سے تمام جُہلاء اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ جو بشر ہے وہ رسُول نہیں ہو سکتا اور جو رسُول ہے وہ بشر نہیں ہو سکتا۔ قومِ نوحؑ کے سرداروں نے جب حضرت نوحؑ کی رسالت کا انکار کیا تھا تو یہی کہا تھا۔

مَا هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً ۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۔ (المؤمنون: ۲۴)

یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا۔ اور چاہتا ہے کہ تم پر اپنی فضیلت جمائے حالانکہ اللہ چاہتا تو فرشتے نازل کرتا۔ ہم نے تو بات کبھی اپنے باپ دادا سے نہیں سُنی (کہ انسان رسُول بن کر آئے)۔

قومِ عاد نے یہی بات حضرت ہودؑ کے متعلق بھی کہی تھی کہ:

مَا هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ

یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ کھاتا ہے

مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ٥ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخٰسِرُوْنَ٥ (المؤمنون: ۳۳-۳۴)

وہی کچھ جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے وہی کچھ جو تم پیتے ہو۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت کر لی تو تم بڑے گھاٹے میں رہے۔

قومِ ثمود نے حضرت صالحؑ کے متعلق بھی یہی کہا تھا کہ:

أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ (القمر: ۲۴)

کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی اختیار کر لیں؟

اور یہی معاملہ قریب قریب تمام انبیاء کے ساتھ پیش آیا کہ کفار نے کہا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا "تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر"۔ اور انبیاء نے ان کو جواب دیا کہ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَاۤءُ مِنْ عِبَادِهٖ "واقعی ہم تمہاری طرح بشر کے سوا کچھ نہیں ہیں، مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے عنایت فرماتا ہے" (ابراہیم: ۱۰-۱۱)

ہدایت پانے میں رکاوٹ

اِس کے بعد قرآن مجید کہتا ہے کہ یہی جاہلانہ خیال ہر زمانے میں لوگوں کو ہدایت قبول کرنے سے باز رکھتا رہا ہے اور اسی بنا پر قوموں کی شامت آئی ہے۔

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ٥ ذٰلِكَ بِأَنَّهٗ كَانَتْ تَّأْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا أَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا۔ (التغابن: ۶)

کیا انہیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا تھا اور پھر اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور آگے ان کے لیے دردناک عذاب ہے؟ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اُن کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں لے کر آتے رہے مگر انہوں نے کہا، "کیا اب انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟ اسی بنا پر انہوں نے کفر کیا اور منہ پھیر گئے"۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُّؤْمِنُوْٓا إِذْ جَاۤءَهُمُ الْهُدٰىٓ إِلَّآ أَنْ قَالُوْٓا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۹۴)

لوگوں کے پاس جب ہدایت آئی تو کوئی چیز انہیں ایمان لانے سے روکنے والی اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے کہا "کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا؟"

یعنی ہر زمانے کے جاہل لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ بشر کبھی پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ اِسی لیے جب کوئی رسول آیا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے، گوشت پوست کا بنا ہوا ہے، فیصلہ کر دیا کہ یہ پیغمبر نہیں ہے کیونکہ بشر ہے۔ اور جب وہ گزر گیا تو ایک مدت کے بعد اس کے عقیدت مندوں

میں ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہو گئے جو کہنے لگے کہ وہ بشر نہیں تھا، کیونکہ پیغمبر تھا۔ چنانچہ کسی نے اس کو خدا کا بیٹا کہا، اور کسی نے کہا کہ خدا اُس میں حلول کر گیا تھا۔ غرض بشریّت اور پیغمبری کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کے لیے ہمیشہ ایک معمّا ہی بنا رہا۔ ۱۲۹ے

ہمیشہ انسانوں ہی کو رسُول بنایا گیا

پھر قرآن مجید پُوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ اللہ نے ہمیشہ انسان ہی کو رسُول بنا کر بھیجا ہے اور انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی رسُول ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی فرشتہ یا بشریّت سے بالاتر کوئی ہستی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝

(الانبیاء: ۷-۸)

اے نبیؐ ہم نے تم سے پہلے انسانوں ہی کو رسُول بنا کر بھیجا ہے جن پر ہم وحی کرتے تھے۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پُوچھ لو۔ اور ہم نے ان کو ایسے جسم نہیں بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ جینے والے تھے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝

(بنی اسرائیل: ۹۵)

اے نبی، (صلی اللہ علیہ وسلّم) اِن سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ان پر فرشتے ہی کو رسُول بنا کر نازل کرتے۔ ۱۳۰ے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(یوسف: ۱۰۹)

"اے محمّدؐ! تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجے تھے، وہ سب انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔ اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انہیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں؟ یقیناً آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر ہے جنہوں نے پیغمبروں کی بات مان کر تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے؟"

یہاں ایک بہت بڑے مضمون کو دو تین جُملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کو اگر کسی تفصیلی عبارت میں بیان کیا جائے تو یُوں کہا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ تمہاری بات کی طرف اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ جو شخص کل اِن کے شہر میں پیدا ہُوا اور انہی کے درمیان بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہُوا ہو اس کے متعلق یہ کیسے مان لیں کہ یکایک ایک روز خدا نے اسے اپنا سفیر مقرر کر دیا ہے۔ لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے جس سے آج دنیا میں پہلی مرتبہ انہی کو سابقہ پیش آیا ہو۔ اس سے

پہلے بھی خدا اپنے نبی بھیج چکا ہے اور وہ سب بھی انسان ہی تھے۔ پھر یہ بھی کبھی نہیں ہؤا کہ اچانک ایک اجنبی شخص کسی شہر میں نمودار ہو گیا ہو اور اس نے کہا ہو کہ مَیں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہُوں۔ بلکہ جو لوگ بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے اُٹھائے گئے وہ سب ان کی اپنی ہی بستیوں کے رہنے والے تھے۔ مسیحؑ، موسیٰؑ، ابراہیمؑ، نوح (علیہم السّلام) آخر کون تھے؟ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ جن قوموں نے ان لوگوں کی دعوتِ اصلاح کو قبول نہ کیا اور اپنے بے بنیاد تخیلات اور بے لگام خواہشات کے پیچھے چلتی رہیں، ان کا انجام کیا ہؤا؟ تم خود اپنے تجارتی سفروں میں عاد، ثمود، مَدین اور قومِ لُوط وغیرہ کے تباہ شدہ علاقوں سے گزرتے رہے ہو۔ کیا وہاں کوئی سبق تمہیں نہیں ملا؟ یہ انجام جو انھوں نے دنیا میں دیکھا، یہی تو خبر دے رہا ہے کہ عاقبت میں وہ اس سے بدتر انجام دیکھیں گے۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے دُنیا میں اپنی اصلاح کر لی وہ صرف دنیا ہی میں اچھے نہ رہے، آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ بہتر ہو گا۔ ۱۳۱ے

بینا اور نابینا کا فرق

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ۔

(الانعام: ۵۰)

اے محمدؐ! ان سے کہو، "مَیں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ مَیں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ مَیں فرشتہ ہُوں۔ مَیں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہُوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔" پھر ان سے پُوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟

مَیں جن حقیقتوں کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہُوں ان کا مَیں نے مشاہدہ کیا ہے، وہ براہِ راست میرے تجربہ میں آئی ہیں۔ مجھے وحی کے ذریعہ سے ان کا ٹھیک ٹھیک علم دیا گیا ہے، ان کے بارے میں میری شہادت آنکھوں دیکھی شہادت ہے بخلاف اس کے تم ان حقیقتوں کی طرف سے اندھے ہو کہ ان کے بارے میں جو خیالات رکھتے ہو۔ وہ یا تو قیاس و گمان پر مبنی ہیں۔ یا محض اندھی تقلید پر۔ لہٰذا میرے اور تمہارے درمیان بینا اور نابینا کا سا فرق ہے۔ اور اسی بنا پر مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے۔ نہ اِس اعتبار سے کہ میرے پاس خدائی کے خزانے ہیں یا مَیں عالم الغیب ہُوں یا انسانی کمزوریوں سے مُبرّا ہوں۔ ۱۳۲ے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ (الرعد۔ ۳۸)

"اور اے نبیؐ تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسُول بھیج چکے ہیں اور اُن کو ہم نے بیوی بچّوں والا ہی بنایا تھا۔"

یہ ایک اعتراض کا جواب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر کیا جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ اچھا نبی ہے جو بیوی اور بچے رکھتا ہے۔ بھلا پیغمبروں کو بھی خواہشاتِ نفسانی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ ۱۳۳ے

نبی کو فرشتہ ہونا چاہیے تھا

اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۔ (حٰمٓ السجدہ ۱۴)

جب خدا کے رسول اُن کے پاس آگے اور پیچھے ہر طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انہوں نے کہا، ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہٰذا ہم اُس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔

یعنی اگر اللہ کو ہمارا یہ مذہب پسند نہ ہوتا اور وہ اس سے باز رکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ تم چونکہ فرشتے نہیں ہو بلکہ ہم جیسے انسان ہی ہو اس لیے ہم یہ نہیں مانتے کہ تم کو خدا نے بھیجا ہے۔ اور اس غرض کے لیے بھیجا ہے کہ ہم اپنا مذہب چھوڑ کر وہ دین اختیار کر لیں جسے تم پیش کر رہے ہو۔ کفار کا یہ کہنا کہ جس چیز کے لیے تم بھیجے گئے ہو" اُسے ہم نہیں مانتے محض طنز کے طور پر تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا مانتے تھے اور پھر ان کی بات ماننے سے انکار کرتے تھے، بلکہ یہ اُسی قسم کا طنزیہ اندازِ بیان ہے جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ کے متعلق اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (الشعراء: آیت ۲۷) "یہ رسول صاحب جو تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔"[۱۳۴]

نبی ہوتا تو کوئی بڑا آدمی ہوتا

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (الزخرف: ۳۱)

"کہتے ہیں، یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟"

دونوں شہروں سے مراد مکہ اور طائف ہیں۔ کفار کا یہ کہنا تھا کہ اگر واقعی خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا اور وہ اس پر اپنی کتاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا تو ہمارے اِن مرکزی شہروں میں سے کسی بڑے آدمی کو اِس غرض کے لیے منتخب کرتا، رسول بنانے کے لیے اللہ میاں کو ملا بھی تو وہ شخص جو یتیم پیدا ہوا، جس کے حصے میں کوئی میراث نہ آئی، جس نے بکریاں چرا کر جوانی گزار دی، جو اَب گزر اوقات بھی کرتا ہے تو بیوی کے مال سے تجارت کر کے، جو کسی قبیلے کا شیخ یا کسی خانوادے کا سربراہ نہیں ہے۔ کیا مکہ میں ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے؟ کیا طائف میں عُروہ بن مسعود، حبیب بن عَمرو، کنانہ بن عبدِ عَمرو اور ابن عبد یا لیل جیسے رئیس موجود نہ تھے؟ یہ تھا اُن لوگوں کا استدلال پہلے تو وہ یہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کوئی بشر بھی رسول ہو سکتا ہے۔ مگر جب قرآن مجید میں پے در پے دلائل دے کر ان کے اِس خیال کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اس سے پہلے ہمیشہ بشر ہی رسول ہو کر آتے رہے ہیں، اور انسانوں کی ہدایت کے لیے بشر ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ غیر بشر، اور جو رسول بھی دنیا میں آئے ہیں وہ یکایک

آسمان سے نہیں اُتر آئے تھے بلکہ انہی انسانی بستیوں میں پیدا ہوئے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بال بچوں والے تھے، اور کھانے پینے سے مبرّا نہ تھے، تو انہوں نے یہ دوسرا پینترا بدلا کہ اچھا، بشر ہی رسُول سہی مگر وہ کوئی بڑا آدمی ہونا چاہیے۔ مالدار ہو۔ بااثر ہو۔ بڑا جتھے والا ہو۔ لوگوں میں اس کی شخصیت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہو۔ محمدؐ بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس مرتبے کے لیے کیسے موزوں ہو سکتے ہیں؟[۱۳۵]

حضوؐر پر سعیٔ معاش کا اعتراض

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ (الفرقان:۷)

"کہتے ہیں یہ کیسا رسُول ہے، جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور نہ ماننے والوں کو دھمکاتا؟"

یعنی اوّل تو انسان کا رسُول ہونا ہی عجیب بات ہے۔ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہو۔ تاہم اگر آدمی ہی رسُول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دُنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضوُر بار یابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا، نہ یہ کہ ایک ایسا عام آدمی خداوندِ عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں جُوتیاں چٹخاتا پھرتا ہو۔ بھلا اس آدمی کو کون خاطر میں لائے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اس کے اندر کوئی غیر معمولی پن نہ پایا جاتا ہو۔ بالفاظِ دیگر، اُن کی رائے میں رسُول کی ضرورت اگر تھی تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ عجوبہ دکھانے یا ٹھاٹھ باٹ سے دھونس جمانے کے لیے تھی۔[۱۳۶]

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝ (الفرقان-۲۰)

"اے محمدؐ، تم سے پہلے جو رسُول ہم نے بھیجے تھے۔ وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے۔ دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ کیا تم صبر کرتے ہو؟ تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے۔"

یہ جواب ہے کفارِ مکّہ کی اُس بات کا جو وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسُول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہے کہ کفارِ مکّہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت موسیٰؑ اور بہت سے دُوسرے انبیاء سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان کی رسالت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے یہ فرمایا گیا ہے

کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نرالا اعتراض کیوں اٹھا رہے ہو؟ پہلے کونسا نبی ایسا آیا ہے جو کھانا نہ کھاتا ہو اور بازاروں میں نہ چلتا پھرتا ہو؟ اور نہ تو اور خود عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام جن کو عیسائیوں نے خدا کا بیٹا بنا رکھا ہے (اور جن کا مجسمہ کفارِ مکہ نے بھی کعبہ میں رکھ چھوڑا تھا) انجیلوں کے اپنے بیان کے مطابق کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔[۱۳۷]

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ (الانبیاء۔ ۷-۸)

اور اے محمدؐ، تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لو، اُن رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔"

یہ جواب ہے کفار کے اس قول کا کہ "یہ شخص تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے"۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کو اس بات کی دلیل قرار دیتے تھے کہ آپؐ نبی نہیں ہو سکتے، جواب دیا ہے کہ پہلے زمانے کے جن بزرگوں کو تم مانتے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے وہ سب بھی بشر تھے اور بشر ہوتے ہوئے ہی خدا کی وحی سے سرفراز ہوئے تھے۔[۱۳۸]

باب ۸

دینِ حق

فصل ۱

مذہب کا جاہلی تصوّر اور اسلامی تصوّر

محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے دُنیا میں مذہب کا عام تصوّر یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے، یا دوسرے الفاظ میں انسان کی دُنیوی زندگی کے ساتھ یہ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے۔ اُس کا تعلق کلیتہً صرف اُس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دُنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلّق ہو کر صرف اِسی ایک شعبہ کا ہو جائے، مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں، بلکہ محض نجات مطلوب ہو، اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود اُن پر نظرِ عنایت رکھے اور ان کو دُنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے، اُس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دُنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگاتے رکھے۔ دُنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے، اپنے گرد و پیش کی ساری دُنیا سے ایک الگ چیز ہے۔ اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دُوسری چیز۔ اِن دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں۔

یہ جاہلیت کا تصوّر تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدّن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدّن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں، اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو اُس پر پوری زندگی کی عمارت ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدّن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ اِن دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا، مگر یہ اثر اُسی قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتّب ہوتا ہے۔ اِس لیے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔

مذہب نے تہذیب و تمدّن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادّی علائق سے نفرت، لذّاتِ دُنیوی سے کراہت، عالمِ اسباب سے بے تعلقی، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تنافر اور تعصّب کے عناصر داخل کر دیئے۔

یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا۔ بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لیے ایک سنگِ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدّن نے، جس کی بنیاد سراسر مادیّت اور خواہشاتِ نفس کے اِتّباع پر قائم تھی، مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا اُس کو گندا کر دیا۔ اُس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں اور اس سے ہمیشہ یہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اُس گندی اور بد سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے، مذہبی تقدّس کا جامہ پہنا دیا جائے تاکہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے نہ کوئی دوسرا اُس کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اِسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں تک میں ہم کو لذّت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود اُن مذاہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اِس تعامُل سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ دُنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدّن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی دیواروں پر قائم ہوتی ہے۔

سچّے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دُنیا سے الگ رہے اور دُنیا کے معاملات کو دُنیا والوں نے اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر —— جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور جو ہر زمانہ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے —— جس طرح چاہا چلایا۔ اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبُود کو خوش کرنے کے لیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کر لیں۔ مذہب چونکہ ان کے لیے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا اِس لیے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم، ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں اور ہر قسم کی تمدّنی کج رویوں کے ساتھ یہ ضمیمہ منسلک ہو سکتا تھا۔ اُس نے ٹھگی اور قزّاقی کا بھی ساتھ دیا، جہاں سوزی اور غارت گری کا بھی، سُود خوری اور قارُونیت کا بھی، فحش کاری اور قحبہ گری کا بھی۔

ہمہ گیر اور جامع تصوّرِ دین

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لیے بھیجے گئے تھے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے جاہلی تصوّر کو مٹا کر ایک عقلی و فکری تصوّر پیش کریں، اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدّن کا ایک مکمّل نظام قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپؐ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا بھی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو، زندگی کی روح اور اس کی قوّتِ مُحرّکہ ہو، فہم و شعُور اور فکر و نظر ہو، صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو، زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہِ راست اور راہِ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے، راہِ کج سے بچائے، راہِ راست پر استقامت اور

پیش قدمی کی طاقت بخشے، اور زندگی کے اِس لامتناہی سفر میں، جو دُنیا سے لے کر آخرت تک مُسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کے ساتھ گزار دے۔

اِسی مذہب کا نام اِسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پُرانے جاہلی تصوّر کے ماتحت ایک ضمیمۂ زندگی قرار دے دیا جائے۔ یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے، اُسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اور اُسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اِس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اِس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں، بلکہ ایک مجموعہ کے مربُوط اور مرتّب اجزا ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا دار و مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور خُدا کا تعلق دُرست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دُوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں، دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں، اور مذہب کا اصل کام اِسی کامیاب زندگی کے لیے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے۔ جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔

ایک خاص طریقِ فکر اور نقطۂ نظر

اسلام ایک خاص طریقِ فکر (Attitude of Mind) ہے، اور پُوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر (Outlook on Life) ہے۔ اور پھر وہ ایک خاص طرزِ عمل ہے جس کا راستہ اِسی طریقِ فکر اور اِسی نظریۂ زندگی سے متعیّن ہوتا ہے۔ اِس طریقِ فکر اور طرزِ عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہ مذہبِ اسلام ہے، وہ تہذیبِ اسلامی ہے، اور وہی تمدنِ اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریقِ فکر اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔ انسان پر خُدا کے کیا حقوق ہیں؟ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں؟ ماں باپ کے، بیوی بچّوں کے، اور عزیزوں اور قرابت داروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دُشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوعِ انسانی کے، حتیٰ کہ کائنات کی ہر چیز اور ہر قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ اِن حقوق کا تعیُّن بھی کرتا ہے اور ان کے درمیان کامل توازُن اور عدل بھی قائم کرتا ہے۔ ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پُورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا، بغیر اس کے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو دوسرے حق پر قربان کرے۔ پھر یہی طریقِ فکر اور نظریۂ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ رُوحانی منتہائے نظر معیّن کرتا ہے۔ اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو، خواہ وہ

کسی میدان میں ہو، ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجع ہوں۔

فیصلہ کن معیارِ اقدار

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اِسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (Value) متعیّن کی جاتی ہے۔ اِسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے۔ جو شے اِس مرکزی مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہے اُسے اختیار کر لیا جاتا ہے۔ اور جو شے سدِّ راہ ہوتی ہے اسے ردّ کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کو چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کارفرما ہے۔ وہ اِس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، صنفی تعلّقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدُود کو ملحوظ رکھنا چاہیے، تاکہ وہ مرکزِ مقصود کی طرف جانے والی سیدھی راہ پر قائم رہے اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا فیصلہ بھی کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مُرتّب کیے جائیں جن سے معاشرت، معیشت، سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزلِ مقصود کی طرف جانے والے ہوں اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دُور ہٹانے والی ہوں۔ اِس کا فیصلہ بھی کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لیے مسخّر کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے، تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا فیصلہ بھی کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراکِ اغراض میں اور اختلافِ مقاصد میں، غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کے دَور میں، عُلوم و فنُون کے اکتساب میں اور تہذیب و تمدّن کے لین دین میں، کن اصُولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ خارجی تعلقات کے اِن مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو بنی نوعِ انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً یا کرہاً، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اُس مقصد کی خدمت لے لیں جو اصل فطرت کے اعتبار سے اُن کا بھی ایسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروانِ اسلام کا ہے۔

مسجد سے میدانِ کارزار تک

غرض وہ ایک ہی نقطۂ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدانِ کارزار تک، طرقِ عبادت سے لے کر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طرقِ استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجا کے جُزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثارِ فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانینِ طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک، زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی

ربط پایا جاتا ہے اور ان سب کو ایک مشین کے پُرزوں کی طرح اِس طرح جوڑتا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔

انقلابی تصوّر

مذہب کی دُنیا میں یہ ایک انقلابی تصوّر تھا اور جاہلیّت کے خمیر سے بنے ہوتے دماغوں کی گرفت میں یہ تصوّر کبھی پُوری طرح نہ آسکا۔ آج دُنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے۔ مگر آج بھی اتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرۂ آفاق یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اِس انقلاب انگیز تصوّر کے اِدراک سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے اَن پڑھ اور کوَدن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصوّر وراثت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اُس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط جمی ہوئی ہے۔ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اُس کے بند نہیں کُھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے تاریک حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں اور دین داری کو عبادات کے دائرے میں محدُود خیال کریں تو جائے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی "تاریک خیال"۔ جاہل عوام اگر مذہب کو باجے، تعزیے اور گانے کے سوالات میں محدُود سمجھیں تو یہ بھی مقامِ حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگانِ نُورِ علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دُور نہیں ہوئی؟ وہ بھی مذہبِ اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مُسلم قدیم جاہلی تصوّر کے تحت سمجھتا ہے۔ ۱۳۹ے

فصل ۲

دینِ حق کیا ہے؟

قرآن جس دعوے کے ساتھ نوعِ انسان کو اپنے پیش کردہ مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے وہ خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔ (آلِ عمران-۱۹) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

عموماً اس فقرے کا جو سیدھا سادھا مفہوم بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "سچا مذہب تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے۔" اور "اسلام" کا جو تصوّر عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک مذہب کا نام ہے جو اب سے تیرہ سو برس پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا اور جس کی بنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی تھی۔ "بنا ڈالی تھی" کا لفظ میں قصداً اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ بکثرت مسلمان اور اچھے خاصے ذی علم مسلمان بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "بانیٔ اسلام" کہتے اور لکھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اسلام کی ابتدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوئی اور آپؐ ہی اس کے بانی (Founder) ہیں۔ لہٰذا جب ایک غیر مسلم قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس فقرے پر پہنچتا ہے تو وہ یہ گمان کر کے سرسری طور پر اس سے گزر جاتا ہے کہ جس طرح ہر مذہب صرف اپنے ہی برحق ہونے اور دوسرے مذہبوں کے باطل ہونے کا مدّعی ہے اسی طرح قرآن نے بھی اپنے پیش کردہ مذہب کے برحق ہونے کا دعوٰی کر دیا ہے۔ اور جب ایک مسلمان اسے پڑھتا ہے تو وہ اس وجہ سے اس پر غور کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس مذہب کو اس فقرہ میں برحق کہا گیا ہے اُسے وہ خود بھی برحق مانتا ہے۔ یا اگر غور و فکر کے لیے اس کے ذہن میں کوئی تحریک پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ بالعموم یہ رُخ اختیار کر لیتی ہے کہ عیسائیت، ہندومت، بودھ مت اور ایسے ہی دوسرے مذاہب سے اسلام کا مقابلہ کر کے اِس کی حقانیت ثابت کی جائے۔ لیکن درحقیقت قرآن میں یہ مقام ایسا ہے جس پر ایک سنجیدہ طالب علم کو ٹھیر کر بہت غور کرنا چاہیے، اُس سے زیادہ غور کرنا چاہیے جتنا

---

[۱] یہ ایک تقریر ہے جو ایک مارچ ۱۹۴۳ء کو جامعہ ملّیہ دہلی میں کی گئی تھی۔

اب تک اس پر کیا گیا ہے۔

قرآن کے اس دعوے کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں "اَلدِّین" اور "الاسلام" کا مفہوم متعیّن کر لینا چاہیے۔

اَلدِّین کا مفہوم

عربی زبان میں لفظ "دین" کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنی غلبہ اور استیلاء کے ہیں۔ دوسرے معنی اطاعت اور غلامی کے۔ تیسرے معنی جزاء اور بدلہ کے۔ چوتھے معنی طریقہ اور مسلک کے۔ یہاں یہ لفظ اسی چوتھے معنی میں استعمال ہُوا ہے، یعنی دین سے مُراد وہ طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے جس کی پیروی کی جائے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ قرآن محض دین نہیں کہہ رہا ہے بلکہ "اَلدِّین" کہہ رہا ہے۔ اس سے معنی میں وہی فرق واقع ہو جاتا ہے جو انگریزی زبان میں This is a way of life کہنے کے بجائے This is the way of Life کہنے سے واقع ہوتا ہے۔ یعنی قرآن کا دعوٰی یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام ایک طریقِ زندگی ہے۔ بلکہ اس کا دعوٰی یہ ہے کہ اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے۔

پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن اِس لفظ کو کسی محدُود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وسیع ترین معنی میں استعمال کرتا ہے۔ طریقِ زندگی سے اس کی مُراد زندگی کے کسی خاص پہلُو یا کسی خاص شُعبہ کا طریق نہیں بلکہ پُوری زندگی کا طریق ہے۔ الگ الگ ایک شخص کی انفرادی زندگی ہی کا طریق نہیں بلکہ بحیثیتِ مجموعی سوسائٹی کا طریق بھی ہے۔ ایک خاص ملک یا ایک خاص قوم یا ایک خاص زمانہ کی زندگی کا طریق نہیں بلکہ تمام زمانوں میں تمام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طریق ہے۔ لہٰذا قرآن کے دعوے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک پُوجا پاٹ اور عالمِ بالا کے اعتقاد اور حیاتِ بعد الممات کے تصور کا ایک صحیح مجموعہ وہی ہے جس کا نام اسلام ہے۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ افرادِ انسانی کے مذہبی طرزِ خیال و عمل (جیسا کہ لفظ "مذہبی" کا مفہوم آج کل کی مغربی اصطلاح میں لیا جاتا ہے) کی ایک صحیح صورت وہی ہے جسے اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کے لوگوں، یا فلاں صدی تک کے انسانوں، یا فلاں دور مثلاً صنعتی انقلاب سے پہلے تک کے آدمیوں کے لیے ایک صحیح نظامِ زندگی وہی ہے جس کو اسلام سے موسوم کیا گیا ہے۔ بلکہ صریح طور پر اس کا دعوٰی یہ ہے کہ "ہر زمانے اور ہر دَور میں پُوری نوعِ انسانی کے لیے زمین پر زندگی بسر کرنے کا ایک ہی ڈھنگ اللہ کے نزدیک صحیح ہے، اور وہ ڈھنگ وہی ہے جس کا نام الاسلام ہے[1]۔

---

[1] مجھے یہ سُن کر بڑا تعجب ہُوا کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان کسی مقام پر قرآن کی کوئی نئی تفسیر کی گئی ہے جس کی رُو سے "دین" کا مفہوم صرف بندے اور خدا کے انفرادی تعلق تک محدُود ہے اور تمدّن و ریاست کے نظام سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ تفسیر اگر خود قرآن سے اخذ کی گئی ہے تو یقیناً بڑی دلچسپ چیز ہو گی لیکن میں نے اٹھارہ سال تک قرآن کا جو تحقیقی مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر

اَلْاِسْلام کا مفہوم

اب لفظ "اسلام" کو لیجیے۔ عربی زبان میں اس کے معنی ہیں سپر ڈال دینا، جھک جانا، اطاعت قبول کر لینا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ مگر قرآن محض اِسلام نہیں بولتا بلکہ اَلْاِسلام بولتا ہے جو اس کی خاص اصطلاح ہے۔ اس مخصوص اصطلاحی لفظ سے اس کی مراد خدا کے آگے جھک جانا، اس کی اطاعت قبول کر لینا، اس کے مقابلے میں اپنی آزادی سے دستبردار ہو جانا، اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا ہے۔ اس تسلیم و اطاعت اور سپردگی و حوالگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانونِ طبیعت (Law of Nature) کے آگے سپر ڈال دی جائے جیسا کہ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے تخیل یا اپنے مشاہدات و تجربات سے خدا کی مرضی اور اس کے منشاء کا جو تصور بطورِ خود اخذ کرے اسی کی اطاعت کرنے لگے، جیسا کہ کچھ اور لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے خود اپنے رسولوں کے ذریعہ سے انسان کے لیے جس طریقِ فکر و عمل کی طرف رہنمائی کی ہے اس کو وہ قبول کرے اور اپنی آزادیٔ فکر و عمل —— یا بالفاظِ صحیح تر آوارگیٔ فکر و عمل —— چھوڑ کر اس کی پیروی و اطاعت اختیار کرلے۔ اسی چیز کو قرآن "الاسلام" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ درحقیقت کوئی جدید العہد مذہب نہیں ہے جس کی بنا اب سے ۱۳۶۳ برس پہلے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی ہو۔ بلکہ جس روز پہلی مرتبہ اس کرۂ زمین پر انسان کا ظہور ہوا اسی روز خدا نے انسان کو بتا دیا تھا کہ تیرے لیے صرف یہ "الاسلام" ہی ایک صحیح طرزِ عمل ہے۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف گوشوں میں وقتاً فوقتاً جو پیغمبر بھی خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے مامور ہوتے ہیں ان سب کی دعوت بھی بلا استثناء اسی الاسلام کی طرف رہی ہے جس کی طرف بالآخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دعوت دی۔ یہ اور بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے بعد میں بہت سی مختلف چیزوں کی آمیزش کر کے ایک نظام یہودیت کے نام سے اور مسیح علیہ السلام کے پیروؤں نے ایک دوسرا نظام مسیحیت کے نام سے، اور اسی طرح ہندوستان، ایران، چین اور دوسرے ممالک کے پیغمبروں کی اُمتوں نے مختلف مخلوط و مرکب نظامات دوسرے ناموں سے بنا لیے ہوں لیکن موسیٰؑ اور مسیحؑ اور دوسرے تمام معروف و غیر معروف انبیاء علیہم السلام جس دین کی دعوت دینے آتے تھے وہ خالص اسلام تھا نہ کہ کچھ اور۔

میں بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ قرآن اپنے تمام جدید مفسرین کی خواہشات کے علی الرغم، الدین کے لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ اس سے تمام زمانوں کے تمام انسانوں کے لیے ان کی پوری زندگی کا نظامِ فکر و عمل مراد لیتا ہے۔ (اشارہ ہے ترکی اخبار نویسوں کے اُس وفد کی طرف جو ۱۹۴۳ء میں ہندوستان آیا تھا اور جس کے صدرِ وفد نے یہاں ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

قرآن کا دعوٰی کیا ہے

اِس تشریح کے بعد قرآن کا دعوٰی بالکل صاف اور واضح صورت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے، اور وہ یہ ہے:

"نوعِ انسان کے لیے خدا کے نزدیک صرف یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے کہ وہ خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کردے اور فکر و عمل کی اُس راہ پر چلے جس کی طرف خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے رہنمائی کی ہے۔"

یہ ہے قرآن کا دعوٰی۔ اب ہمیں تحقیق کرنا ہے کہ آیا یہ دعوٰی قبول کیا جانا چاہیے؟ خود قرآن نے اپنے اس دعوے کی تائید میں جو دلائل قائم کیے ہیں، ان پر تو ہم غور کریں گے ہی۔ مگر کیوں نہ اس سے پہلے خود اپنی نگہ تلاش و تجسس کرکے یہ دریافت کرلیں کہ آیا ہمارے لیے اس دعوے کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی ہے؟

طریقِ زندگی کی ضرورت

یہ ظاہر ہے کہ دُنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے بہر حال ایک طریقِ زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ انسان دریا نہیں ہے جس کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے خود مُتعیّن ہو جاتا ہے۔ انسان درخت نہیں ہے جس کے لیے قوانینِ فطرت ایک راہ طے کردیتے ہیں۔ انسان نرا جانور نہیں ہے جس کی رہنمائی کے لیے تنہا جبلّت ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے میں قوانینِ طبیعت کا محکوم ہونے کے باوجود انسان زندگی کے بہت سے ایسے پہلو رکھتا ہے جن میں اسے کوئی لگا بندھا راستہ نہیں ملتا کہ حیوانات کی طرح بے اختیار اس پر چلتا رہے، بلکہ اس کو اپنے انتخاب سے خود ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس کو فکر کی ایک راہ چاہیے جس پر وہ اپنے اور کائنات کے اُن بہت سے مسائل کو حل کرے جنہیں فطرت اس کے سوچنے والے دماغ کے سامنے پیش تو کرتی ہے مگر ان کا کوئی حل غیر مشتبہ زبان میں نہیں بتاتی۔ اس کو علم کی ایک راہ چاہیے جس پر وہ اُن معلومات کو منظّم کرے جنہیں فطرت اس کے حواس کے ذریعے سے اس کے ذہن تک پہنچاتی تو ہے مگر انہیں بطورِ خود منظّم کرکے اس کے حوالے نہیں کردیتی۔ اس کو شخصی برتاؤ کے لیے ایک راہ چاہیے جس پر وہ اپنی ذات کے بہت سے اُن مطالبات کو پُورا کرے جن کے لیے فطرت تقاضا تو کرتی ہے مگر انہیں پُورا کرنے کا کوئی مہذب طریقہ معیّن کرکے نہیں دے دیتی۔ اس کو گھریلو زندگی کے لیے، خاندانی تعلقات کے لیے، معاشی معاملات کے لیے، ملکی انتظام کے لیے، بین الاقوامی ربط و تعلق کے لیے اور زندگی کے بہت سے دُوسرے پہلوؤں کے لیے بھی ایک راہ درکار ہے جس پر وہ محض ایک شخص کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک جماعت، ایک قوم، ایک نوع کی حیثیت سے بھی چلے اور ان مقاصد تک پہنچ سکے جو اگرچہ فطرۃً اس کے مقصود و مطلوب ہیں مگر فطرت نے نہ تو ان مقاصد کو صریح طور پر اس کے سامنے نمایاں کیا ہے اور نہ ان تک پہنچنے کا ایک راستہ معیّن کردیا ہے۔

زندگی کا انقسام پذیر نہ ہونا

زندگی کے یہ مختلف پہلو جن میں کوئی ایک طریق اختیار کرنا انسان کے لیے ناگزیر ہے، بجائے خود مستقل شعبے اور ایک دوسرے سے بے نیاز محکمے نہیں ہیں۔ اِس بنا پر یہ ممکن نہیں ہے کہ ان مختلف شعبوں کے لیے انسان ایسی مختلف راہیں اختیار کر سکتا ہو جن کی سمتیں الگ ہوں، جن کے زادِ راہ الگ ہوں، جن پر چلنے کے ڈھنگ اور انداز الگ ہوں، جن کی راہ نوردی کے مقتضیات الگ ہوں، اور جن کی منازلِ مقصود الگ ہوں۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی ایک ذرا سی دانشمندانہ کوشش ہی آدمی کو اس پر مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے کہ زندگی بحیثیتِ مجموعی ایک کُل ہے جس کا ہر جزء دوسرے جزء سے اور ہر پہلو دوسرے پہلو سے گہرا ربط رکھتا ہے، ایسا ربط جو توڑا نہیں جا سکتا۔ اِس کا ہر جزء دوسرے جُزء پر اثر ڈالتا ہے اور اس سے اثر قبول کرتا ہے۔ ایک ہی رُوح تمام اجزاء میں سرایت کیے ہوتے ہوتی ہے اور وہ سب مل کر وہ چیز بناتے ہیں جسے انسانی زندگی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فی الواقع جو چیز انسان کو درکار ہے وہ زندگی کے مقاصد نہیں بلکہ مقصد ہے جس کے ضمن میں سارے چھوٹے بڑے مقاصد پُوری موافقت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ لے سکیں اور جس کے حصُول کی کوشش میں وہ سب حاصل ہو جائیں۔ اس کو راستے نہیں بلکہ راستہ درکار ہے جس پر وہ اپنی پُوری زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنے مقصودِ حیات کی طرف لے چلے۔ اس کو فکر، علم، ادب، آرٹ، تعلیم، مذہب، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون وغیرہ کے لیے الگ الگ نظامات نہیں بلکہ ایک جامع نظام درکار ہے جس میں یہ سب ہمواری کے ساتھ سموئے جا سکیں، جس میں ان سب کے لیے ایک ہی مزاج اور ایک ہی طبیعت رکھنے والے مناسب اصول موجود ہوں، اور جس کی پیروی کر کے آدمی اور آدمیوں کا مجموعہ اور من حیث الکل پُوری آدمیّت اپنے بلند ترین مقصود تک پہنچ سکے۔ وہ جاہلیّت کا تاریک دَور تھا جب زندگی کو مستقل جُداگانہ شعبوں میں تقسیم کرنا ممکن خیال کیا جاتا تھا۔ اب اگر کچھ لوگ اس طرزِ خیال کی مہمل گفتگو کرنے والے موجود ہیں تو وہ بیچارے یا تو اخلاص کے ساتھ پُرانے خیالات کی فضا میں اب تک سانس لے رہے ہیں اس لیے قابلِ رحم ہیں، یا پھر وہ ظالم حقیقت کو خوب جانتے ہیں مگر جان بوجھ کر یہ گفتگو صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ جس "دین" کو وہ کسی انسانی آبادی میں رائج کرنا چاہتے ہیں[1] اس کے اصولوں سے اختلاف رکھنے والوں کو انہیں یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اِس دین کے تحت تمہیں زندگی کے فلاں فلاں شعبوں میں، جو بدقسمتی سے تم کو عزیز تر ہیں، پُورا تحفظ حاصل رہے گا۔ حالانکہ یہ تحفظ عقلاً محال، فطرۃً ممتنع، عملاً ناممکن ہے، اور اِس طرح کی گفتگو کرنے

---

[1] یعنی دینِ قومیت جس میں خدا اور کتاب اور رسالت سے بے تعلق ہو کر خالص دنیوی فائدوں پر ایک مملکت کے باشندوں کے لیے ایک نظامِ زندگی بنایا جائے۔ (مؤلف)

والے غالباً خود بھی جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے[1]۔ ہر دینِ غالب زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی رُوح اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر ہی رہتا ہے۔ جس طرح ہر کانِ نمک ان تمام چیزوں کو مبدّل بہ نمک کر کے ہی رہتی ہے جو اس کے حدود میں داخل ہو جائیں۔

زندگی کی جغرافی و نسلی تقسیم

پھر جس طرح یہ بات مہمل ہے کہ انسانی زندگی کو جُدا گانہ شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مُہمل بات یہ ہے کہ اسے جغرافی حلقوں یا نسلی دائروں میں تقسیم کیا جائے۔ انسان بلاشبہ زمین کے بہت سے حصّوں میں پایا جاتا ہے جن کو دریاؤں نے، پہاڑوں نے، جنگلوں اور سمندروں نے یا مصنوعی سرحدوں نے تقسیم کر رکھا ہے۔ اور انسان کی بہت سی مختلف نسلیں اور قومیں بھی ضرور پائی جاتی ہیں جن کے درمیان تاریخی، نفسیاتی اور دوسرے اسباب سے انسانیت کے نشو و ارتقاء نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ لیکن اِس اختلاف کو حُجّت قرار دے کر جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہر نسل، ہر قوم، اور ہر جغرافی آبادی کے لیے "دین" یعنی نظامِ زندگی الگ ہونا چاہیے وہ سراسر ایک مُہمل بات کہتا ہے۔ اُس کی محدُود نگاہ مَظاہر اور عَوارض کے اختلافات میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ اس ظاہری کثرت کے اندر جوہرِ انسانیت کی وحدت کو وہ نہیں پا سکا۔ اگر فی الواقع یہ اختلافات اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی بنا پر دین الگ الگ ہونے چاہییں تو مَیں کہوں گا کہ زیادہ سے زیادہ جو اختلافات ایک ملک اور دوسرے ملک، ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان آپ پاتے ہیں، اُن سب کو جس قدر مبالغہ کے ساتھ چاہیں قلمبند کر لیں، اور پھر اُن اختلافات کا خالص علمی جائزہ لیں جو عورت اور مرد میں پائے جاتے ہیں، جو ہر انسان اور دوسرے انسان میں پائے جاتے ہیں، جو ایک ہی ماں اور باپ کے دو بچّوں میں پائے جاتے ہیں۔ شاید میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ دعوٰی کروں کہ علمی تحلیل و تجزیہ میں پہلی قسم کے اختلافات سے یہ دوسری قسم کے اختلافات بہرحال شدید تر ہی نکلیں گے۔ پھر کیوں نہ کہہ دیجیے کہ ہر فرد کا نظامِ زندگی الگ ہونا چاہیے؟ مگر جب آپ انفرادی، جنسی، خاندانی کثرتوں کے اندر وحدت کا ایک عنصر اور پائیدار عنصر ایسا پاتے ہیں جس کی بنیاد پر قوم، وطن یا نسل کا تصوّر قائم ہو سکتا ہے اور اس تصوُّر کی بنا پر ایک قوم یا ایک ملک کی کثیر آبادی کے لیے ایک نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جاتا ہے، تو آخر کس چیز نے آپ کو روک دیا ہے کہ قومی، نسلی، وطنی کثرتوں کے درمیان ایک بڑی اور بنیادی وحدت کا عنصر آپ نہیں پا سکتے جس پر انسانیت کا تصوّر قائم ہو اور جس کی بنا پر تمام عالمِ انسانی کا ایک دین یا نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جائے؟ کیا یہ

---

[1] اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے مُصنّف کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصّہ اوّل و دوم کا مطالعہ مفید ہوگا خصوصاً حصّہ دوم میں بنیادی حقوق کی بحث۔ (مرتبین)

واقعہ نہیں ہے کہ تمام جغرافی، نسلی اور قومی اختلافات کے باوجود اصل بنیادی امُور میں سب انسان بالکل یکساں ہیں؟ کیا وہ قوانینِ طبعی یکساں نہیں ہیں جن کے تحت انسان دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے؟ کیا وہ نظامِ جسمانی یکساں نہیں ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، کیا وہ خصوصیات یکساں نہیں ہیں جن کی بنا پر انسان دوسری موجودات سے الگ ایک مستقل نوع قرار پاتا ہے؟ کیا وہ فطری داعیات اور مطالبات یکساں نہیں ہیں جو اُن کے اندر ودیعت کیے گئے ہیں؟ کیا وہ قوّتیں یکساں نہیں ہیں جن کے مجموعے کو ہم نفسِ انسانی کہتے ہیں؟ اور کیا بنیادی طور پر وہ تمام طبعی، نفسیاتی، تاریخی، تمدّنی اور معاشی عوامل بھی یکساں نہیں ہیں جو انسانی زندگی میں کارفرما ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے کہ ان تمام امُور میں سب انسانوں کے درمیان یکسانی پائی جاتی ہے تو پھر یقیناً اُن اصُولوں کو بھی، جو انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے صحیح ہوں، عالمگیر ہونا چاہیے۔ اُن کے قومی یا نسلی یا وطنی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قومیں اور نسلیں ان اصُولوں کے تحت اپنی خصوصیّات کا اظہار اور جزوی طور پر اپنے معاملاتِ زندگی کا بندوبست مختلف طریقوں سے کر سکتی ہیں اور ان کو ایسا کرنا چاہیے۔ مگر انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے جس صحیح دین یا نظامِ زندگی کی ضرورت ہے وہ بہر حال ایک ہی ہونا چاہیے۔ عقل یہ باور کرنے سے انکار کرتی ہے کہ جو چیز ایک قوم کے لیے حق ہو وہ دوسری قوم کے لیے باطل ہو جائے اور جو ایک قوم کے لیے باطل ہو وہ دوسری قوم کے لیے حق ہو جائے۔

زندگی کی زمانی تقسیم

ان مہملات اور جدید زمانہ کے عالمانہ مہملات میں سے ایک اور بات، جو حقیقت کے اعتبار سے مہمل ترین ہے، مگر حیرت ہے کہ یقینیّت کے پُورے وثوق کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، انسانی زندگی کی زمانی تقسیم ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ جو نظامِ زندگی ایک دَور میں حق ہوتا ہے وہ دوسرے دَور میں باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ زندگی کے مسائل و معاملات ہر دَور میں بدل جاتے ہیں، اور نظامِ زندگی کا حق یا باطل ہونا سراسر اُن مسائل و معاملات ہی کی نوعیّت پر منحصر ہے۔ یہ بات اُسی انسانی زندگی کے متعلق کہی جاتی ہے جس کے متعلق ساتھ ہی ساتھ ارتقا کی گفتگو بھی کی جاتی ہے، جس کی تاریخ میں کارفرما قوانین بھی تلاش کیے جاتے ہیں، جس کے گزشتہ تجربات سے حال کے لیے سبق اور مستقبل کے لیے احکام بھی مستنبط کیے جاتے ہیں، اور جس کے لیے "انسانی فطرت" نامی ایک چیز بھی ثابت کی جاتی ہے۔ مَیں پُوچھتا ہوں کیا آپ کے پاس کوئی ایسا آلۂ پیمائش ہے جس سے آپ نوعِ انسانی کی اس مسلسل تاریخی حرکت کے درمیان دور، یا زمانے یا عہد کی واقعی حدبندیاں کر سکتے ہوں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ان حدبندیوں میں سے کسی ایک خط پر اُنگلی رکھ کر آپ کہہ سکتے ہوں کہ اس خط کے اُس پار جو مسائلِ زندگی تھے وہ اِس پار آ کر تبدیل ہو گئے، اور جو حالات اُس پار تھے وہ اِس پار باقی نہیں رہے؟ اگر فی الواقع انسانی سرگزشت ایسے ہی الگ الگ زمانی ٹکڑوں میں منقسم ہے تب تو یُوں سمجھنا چاہیے کہ ایک ٹکڑا جو گزر چکا ہے وہ بعد والے ٹکڑے کے لیے

محض ایک فضول و لایعنی چیز ہوگیا۔ اُس کے گزرتے ہی وہ سب کچھ ضائع ہوگیا جو انسان نے اُس حصّۂ دہر میں کیا تھا۔ اُس زمانے میں جو تجربات انسان کو ہوتے وہ بعد والے زمانے کے لیے کوئی سبق اپنے اندر نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ حالات و مسائل ہی فنا ہوگئے جن میں انسان نے بعض طریقوں کا، بعض اصُولوں کا، بعض قدروں کے لیے سعی و جہد کا تجربہ کیا تھا۔ پھر یہ ارتقاء کی گفتگو کیوں؟ یہ قوانینِ حیات کی تلاش کس لیے؟ یہ تاریخی استنباط کس بنا پر؟ جب آپ ارتقاء کا نام لیتے ہیں تو لامحالہ یہ اِس بات کو متضمن ہے کہ وہاں کوئی چیز ضرور ہے جو تمام تغیّرات کا موضوع بنتی ہے اور ان تغیّرات کے اندر اپنے آپ کو باقی رکھتے ہوئے پیہم حرکت کرتی ہے۔ جب آپ قوانینِ حیات پر بحث کرتے ہیں تو یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ ان ناپائیدار حالات میں، اِن رواں دواں مظاہر میں، اِن بننے اور بگڑنے والی صُورتوں میں کوئی پائیدار اور زندہ حقیقت بھی ہے جو اپنی ایک ذاتی فطرت اور اپنے کچھ مستقل قوانین بھی رکھتی ہے۔ جب آپ تاریخی استنباط کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ کے اِس طول طویل رستے پر جو مسافر مختلف مرحلوں سے گزرتا ہُوا آرہا ہے، اور منزلوں پر منزلیں طے کرتا چلا جارہا ہے، وہ خود اپنی کوئی شخصیت اور اپنا کوئی مستقل مزاج رکھتا ہے جس کے متعلق یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مخصوص حالات میں مخصوص طور پر کام کرتا ہے، ایک وقت میں بعض چیزوں کو قبول کرتا ہے اور دوسرے وقت میں انہیں رد کردیتا ہے اور بعض دوسری چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت، یہ پائیدار موضوعِ تغیّرات، یہ شاہراہِ تاریخ کا مستقل مسافر وہی تو ہے جسے آپ غالباً "انسانیت" کہتے ہیں۔ مگر کیا بات ہے کہ جب آپ راستے کی منزلوں اور اُن میں پیش آنے والے حالات اور اُن سے پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو شروع کرتے ہیں تو اس گفتگو میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ خود مسافر آپ کو یاد نہیں رہتا؟ کیا یہ سچ ہے کہ منزلیں اور اُن کے حالات اور اُن کے مسائل بدل جانے سے مُسافر اور اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی ساخت بالکل نہیں بدلی۔ اس کے عناصرِ ترکیبی وہی ہیں جو اَب سے ہزاروں برس پہلے تھے۔ اس کا مزاج وہی ہے، اس کی فطرت کے تقاضے وہی ہیں، اس کی صفات و خصوصیات وہی ہیں، اس کے رجحانات و میلانات وہی ہیں، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں وہی ہیں، اس کی کمزوریاں اور قابلیتیں وہی ہیں، اس کے فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کے قاعدے وہی ہیں، اس پر کار فرمائی کرنے والی قوتیں وہی ہیں، اور اس کا کائناتی ماحول بھی وہی ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی ابتدائے آفرنیش سے آج تک ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ کوئی شخص یہ دعوٰی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ تاریخ کے دوران میں حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائلِ زندگی کے تغیّر سے خود انسانیت بھی بدلتی چلی آئی ہے۔ یا وہ بنیادی چیزیں بھی متغیّر ہوتی رہی ہیں جو انسانیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو اس دعوے میں کیا وزن ہوسکتا ہے کہ انسان کے لیے جو چیز کل تریاق تھی وہ آج زہر ہے، جو چیز کل حق تھی وہ آج باطل ہے، جو چیز کل قدر رکھتی تھی وہ آج

بے قدر ہے۔

انسان کیسے طریقِ زندگی کا حاجت مند ہے؟

اصل یہ ہے کہ انسانی افراد اور جماعتوں نے تاریخ کے دوران میں نفسِ انسانیت کو اور اس سے تعلق رکھنے والی بنیادی چیزوں کو سمجھنے میں دھوکہ کھا کر اور بعض حقیقتوں کے اعتراف میں مبالغہ اور بعض کے ادراک میں قصور کر کے جو غلط نظامِ زندگی وقتاً فوقتاً اختیار کیے اور جنہیں انسانیتِ کبریٰ (Humanity at Large) نے تجربے کے بعد غلط پا کر دوسرے ایسے ہی نظامات کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور کر دیا، ان کی سرگزشت کے مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا ہے کہ انسانیت کے لیے لازماً ہر دَور میں ایک الگ نظامِ زندگی درکار ہے جو صرف اُسی دَور کے حالات و مسائل سے پیدا ہو اور انہی کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ حالانکہ زیادہ صحت کے ساتھ اس سرگزشت سے اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کے زمانی اور دَوری نظاماتِ زندگی، یا بالفاظِ دیگر موسمی حشرات الارض کو بار بار آزمانے اور ہر ایک کی ناکامی کے بعد اس کے دوسرے جانشین کا تجربہ کرنے میں انسانیتِ کبریٰ کا وقت ضائع ہوتا ہے، اس کی راہ ماری جاتی ہے، اس کے نشوو ارتقاء اور اپنے کمالِ مطلوب کی طرف اس کے سفر میں سخت رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ وہ درحقیقت محتاج اور سخت محتاج ہے ایسے نظامِ زندگی کی جو خود اُس کو اور اُس سے تعلق رکھنے والی تمام حقیقتوں کو جان کر عالمگیر، دائمی اور پائیدار اصولوں پر قائم کیا جائے جسے لے کر وہ حال و مستقبل کے تمام متغیر حالات سے بخیریت گزر سکے، ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کر سکے اور زندگی کے راستے پر اُفتاں وخیزاں نہیں بلکہ رواں اور دواں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ سکے۔

کیا انسان ایسا نظام خود بنا سکتا ہے؟

یہ ہے اس "دین" یا طریقِ زندگی یا نظامِ زندگی کی نوعیت جس کا انسان حاجت مند ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اگر انسان خدا کی مدد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لیے اِس نوعیت کا ایک دین بنانا چاہے تو کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ میں آپ کے سامنے یہ سوال پیش نہ کروں گا کہ آیا انسان اب تک ایسا دین خود بنانے میں کامیاب ہُوا ہے؟ کیونکہ اس کا جواب تو قطعاً نفی میں ہے۔ خود وہ لوگ بھی جو آج بڑے بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اپنے اپنے دین پیش کر رہے ہیں اور ان کے لیے ایک دوسرے سے لڑے مر رہے ہیں، یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کا پیش کردہ دین ان ضرورتوں کو پُورا کرتا ہے جن کے لیے انسان من حیث الانسان ایک "الدین" کا محتاج ہے۔ کسی کا دین نسلی و قومی ہے، کسی کا جغرافی، کسی کا طبقاتی، اور کسی کا دین پیدا ہی اُس دَور کے تقاضوں سے ہُوا ہے جو ابھی کل ہی گزر چکا ہے، رہا وہ دَور جو کل آنے والا ہے اُس کے حالات و مسائل کے متعلق کچھ پیشگی نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں بھی وہ کام دے سکے گا یا نہیں، کیونکہ جو دَور اب گزر رہا ہے ابھی تو اُسی کے

تاریخی تقاضوں کا جائزہ لینا باقی ہے۔ اسی لیے مَیں سوال یہ نہیں کر رہا ہوں کہ انسان ایسا دین بنانے میں کامیاب ہُوا ہے یا نہیں، بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ کامیاب ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس سے سرسری طور پر بحث کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ انسانی زندگی کے فیصلہ کُن سوالات میں سے ایک ہے۔ اس لیے پہلے خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ وہ چیز کیا ہے جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے، اور اس شخص کی قابلیتیں کیا ہیں جس کے متعلق یہ پوچھا جا رہا ہے کہ وہ اس کو وضع کر سکتا ہے یا نہیں۔

الدّین کی نوعیّت

انسان کے لیے جس "الدّین" کی ضرورت مَیں نے ابھی ثابت کی ہے اس سے مُراد کوئی ایسا تفصیلی ضابطہ نہیں ہے جس میں ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لیے تمام چھوٹے بڑے جزئیات تک مُرتّب ہوں اور جس کی موجودگی میں انسان کا کام صرف اس کے مطابق عمل کرنا ہو۔ بلکہ دراصل اس سے مُراد ایسے ہمہ گیر ازلی و ابدی اصُول ہیں جو تمام حالات میں انسان کی رہنمائی کر سکیں، اس کی فکر و نظر، سعی و جہد اور پیش قدمی کے لیے صحیح رُخ متعیّن کر سکیں، اور اسے غلط تجربات میں وقت اور محنت اور قوت ضائع کرنے سے بچا سکیں۔

اِس غرض کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ انسان کو اِس بات کا علم —— قیاس و گمان نہیں بلکہ علم —— ہو کہ اس کی اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔

پھر وہ اس بات کے جاننے کا —— سمجھ بیٹھنے کا نہیں بلکہ جاننے کا —— حاجت مند ہے کہ آیا زندگی بس یہی دُنیا کی زندگی ہے یا یہ پُوری زندگی کا ایک ابتدائی حصّہ ہے۔ آیا سفر بس پیدائش سے لے کر موت تک کی مسافت کا ہے یا یہ پُورے سفر میں سے محض ایک مرحلہ ہے۔

پھر اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا مقصدِ زندگی اس کے لیے متعیّن ہو جو حقیقت کے اعتبار سے —— نہ کہ محض خواہش کی بنا پر —— واقعی حیاتِ انسانی کا مقصُود ہو، جس کے لیے دراصل انسان پیدا کیا گیا ہو، اور جس کے ساتھ ہر فرد، ہر مجموعۂ افراد، اور بحیثیتِ کُلّی تمام انسانیّت کے مقاصد تمام زمانوں میں بلا کسی تصادم و مزاحمت کے ہم آہنگ ہو سکیں۔

پھر اس کو اخلاق کے ایسے پختہ اور ہمہ گیر اصُولوں کی ضرورت ہے جو اس کی فطرت کی تمام خصوصیات کے ساتھ مناسبت بھی رکھتے ہوں، اور تمام ممکن حالات پر نظری و عملی حیثیت سے منطبق بھی ہو سکتے ہوں، تاکہ وہ انہی اصولوں کی بنیاد پر اپنی سیرت کی تعمیر کر سکے، انہی کی رہنمائی میں سفرِ زندگی کی ہر منزل پر پیش آنے والے مسائل کو حل کر سکے اور کبھی اس خطرے میں مبتلا نہ ہو کہ تغیُّر پذیر حالات و مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاقی

اصُول ٹوٹتے اور بنتے چلے جائیں اور وہ محض ایک بے اصُولا، نرا ابن الوقت بن کر رہ جائے۔

پھر اس کو تمدُّن کے ایسے جامع اور وسیع اُصُولوں کی ضرورت ہے جو انسانی اجتماع کی حقیقت وغایت اور اس کے فطری تقاضوں کو سمجھ کر بنائے جائیں۔ جن میں افراط وتفریط اور بے اعتدالی نہ ہو۔ جن میں تمام انسانوں کی مجموعی مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہو۔ جن کی پیروی کر کے ہر زمانے میں انسانی زندگی کے ہر پہلوُ کی تشکیل، تعمیر اور ترقی کے لیے سعی کی جاسکے۔

پھر اسے شخصی کردار اور اجتماعی رویّے اور انفرادی و اجتماعی سعی وعمل کو صحیح سمتِ سفر کا پابند اور بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے جامع حُدُود کی ضرورت ہے جو شاہراہِ زندگی پر نشاناتِ راہ کا کام دیں اور ہر موڑ، ہر دوراہے، ہر خطرناک مرحلے پر اُسے آگاہ کر دیں کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں ہے بلکہ اِدھر ہے۔

پھر اس کو چند ایسے عملی ضابطوں کی ضرورت ہے جو اپنی نوعیّت کے اعتبار سے دائمی اور عالمگیر پیروی کے قابل ہوں اور انسانی زندگی کو اُس حقیقتِ نفس الامری، اُس مآلِ زندگی، اُس مقصدِ حیات، اُن اصولِ اخلاق اُن اصُولِ تمدُّن اور اُن حدُودِ عمل سے ہمیشہ وابستہ رکھیں جن کی تعیین اُس الدّین میں کی گئی ہو۔

یہ ہے وہ چیز جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اب غور کیجیے۔ کیا انسان ایسے ذرائع رکھتا ہے جن سے وہ خود اپنے لیے ایک ایسا الدّین وضع کر سکے ؟

انسانی ذرائع کا جائزہ

انسان کے پاس اپنا "دین" یا طریقِ زندگی اخذ کرنے کے ذرائع چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ پہلا ذریعہ خواہش ہے۔ دوسرا ذریعہ عقل ہے۔ تیسرا ذریعہ مشاہدہ وتجربہ ہے۔ چوتھا ذریعہ پچھلے تجربات کا تاریخی ریکارڈ ہے۔ غالباً ان کے سوا کسی پانچویں ذریعہ کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی۔ اِن چاروں ذرائع کا جتنا مکمّل جائزہ لے کر آپ دیکھ سکتے ہوں، دیکھیے۔ کیا یہ "الدّین" کے ایجاد کرنے میں انسان کی مدد کر سکتے ہیں؟ مَیں نے اپنی عمر کا معتدبہ حصّہ اس کی تحقیق میں صرف کیا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ذرائع "الدّین" کی ایجاد میں تو مدد نہیں دے سکتے، البتّہ اگر کوئی غیر انسانی رہنما "الدین" کو پیش کر دے تو اسے سمجھنے، پرکھنے، پہچاننے اور اس کے مطابق زندگی کے تفصیلی نظام کو وقتاً فوقتاً مرتّب کرتے رہنے میں ضرور مددگار بن سکتے ہیں۔

خواہش

پہلے خواہش کو لیجیے۔ کیا یہ انسان کی رہنما بن سکتی ہے؟ اگرچہ یہ انسان کے اندر اصلی مُحرّک عمل ہے، مگر اس کی عین فطرت میں جو کمزوریاں موجود ہیں ان کی بنا پر یہ رہنمائی کے قابل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تنہا رہنمائی کرنا تو درکنار عقل اور علم کو بھی اکثر اس نے گمراہ کیا ہے۔ اس کو تربیت سے خواہ کتنا ہی روشن خیال بنا دیا جائے، بہرحال آخری

فیصلہ جب کبھی اس پر چھوڑا جائے گا یہ بلا مبالغہ ۹۹ فی صدی حالات میں غیر مستقیم ہی فیصلہ کرے گی۔ کیونکہ اس کے اندر جو تقاضے پائے جاتے ہیں وہ اس کو صحیح فیصلہ کرنے کے بجائے ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس سے مطلوب کسی نہ کسی طرح جلدی اور بآسانی حاصل ہو جائے۔ یہ بجائے خود "خواہشِ انسانی" کی طبعی کمزوری ہے۔ لہٰذا خواہ ایک فرد کی خواہش ہو یا ایک طبقہ کی، یا وہ خواہشِ عام (General will) ہو جس کا روسو نے ذکر کیا ہے، بہر حال کسی قسم کی انسانی خواہش میں بھی فطرۃً یہ صلاحیت نہیں ہے کہ ایک الدین کے وضع کرنے میں مددگار بن سکے۔ بلکہ جہاں تک مسائلِ عالیہ (Ultimate Problems) مثلاً حیاتِ انسانی کی حقیقت، اس کے مآل اور اس کی غایت کا تعلق ہے، ان کو حل کرنے میں تو وہ کسی طرح مددگار بن ہی نہیں سکتی۔

عقل

پھر عقل کو لیجیے۔ اس کی تمام بہترین صلاحیتیں مسلّم۔ انسانی زندگی میں اس کی اہمیت بھی ناقابلِ انکار۔ اور یہ بھی تسلیم کہ انسان کے اندر یہ بہت بڑی رہنما طاقت ہے۔ لیکن قطع نظر اس سوال کے کہ انسان کے لیے "الدین" کس کی عقل وضع کرے گی، زید کی؟ بکر کی؟ تمام انسانوں کی؟ یا انسانوں کے کسی خاص گروہ کی؟ اس زمانہ کے لوگوں کی؟ یا کسی پچھلے زمانہ والوں کی؟ یا آئندہ آنے والوں کی؟ سوال صرف یہ ہے کہ بجائے خود "عقلِ انسانی" کے حدود کا جائزہ لینے کے بعد کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ "الدین" کے وضع کرنے میں اُس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس کے تمام فیصلے منحصر ہیں اُس مواد پر جو حواس اُس کو فراہم کر کے دیں۔ وہ غلط مواد فراہم کر کے دیں گے تو یہ غلط فیصلہ کر دے گی، وہ ناقص مواد فراہم کر کے دیں گے تو یہ ناقص فیصلہ کر دے گی، اور جن اُمور میں وہ کوئی مواد فراہم کر کے نہ دیں گے ان میں اگر یہ خود شناس ہے تو کوئی فیصلہ نہ کرے گی اور اگر بر خود غلط ہے تو اندھیرے میں چوبائی تیر چلاتی رہے گی۔ یہ محدودیتیں جس بے چاری عقل کے ساتھ لگی ہوتی ہیں وہ آخر کس طرح اِس کی اہل ہو سکتی ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے الدین بنانے کی تکلیف اسے دی جائے۔ "الدین" بنانے کا انحصار جن مسائلِ عالیہ کے حل پر ہے اُن میں حواس سرے سے کوئی مواد فراہم ہی نہیں کرتے۔ پھر کیا اُن مسائل کا فیصلہ تخیّلات، لاطائل قیاسات اور مجرّد اَوہام سے کیا جائے گا؟ "الدین" بنانے کے لیے جن مستقل اخلاقی قدروں کا تعیّن ناگزیر ہے اُن کے لیے حواس بہت ہی ناقص مواد فراہم کرتے ہیں۔ پھر کیا عقل سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ ناقص مواد پر صحیح و کامل قدریں متعیّن کرے گی؟ اسی طرح "الدین" کے جو دوسرے اجزائے ترکیبی مَیں نے بیان کیے ہیں ان میں سے کسی ایک جزء کے لیے بھی حواس سے بالکل صحیح اور مکمل مواد حاصل نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر عقل ایک جامع اور مکمل نظام بنا سکے۔ اور اس پر مزید یہ ہے کہ عقل کے ساتھ خواہش کا عنصر مستقل طور پر لگا ہوا ہے جو اُسے ٹھیٹھ عقلی فیصلے دینے سے روکتا ہے اور اس کی راست

روی کو کچھ نہ کچھ ٹیڑھ کی طرف مائل کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ عقلِ انسانی حواس کے فراہم کردہ مواد کی ترتیب اور اس سے استدلال کرنے میں کوئی غلطی نہ کرے گی، تب بھی اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ اتنا بل بوتا نہیں رکھتی کہ اتنے بڑے کام کا بوجھ اس پر ڈالا جا سکے۔ یہ بوجھ اس پر ڈالنا اس پر بھی ظلم کرنا ہے اور خود اپنے اوپر بھی۔

سائنس

اب تیسرے ذریعہ کو لیجیے، یعنی وہ علم جو مشاہدات و تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ مَیں اس علم کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے میں کسی طالب علم سے پیچھے نہیں ہوں اور نہ ذرہ برابر اس کی تحقیر کرنا پسند کرتا ہوں۔ لیکن اس کی محدودیتوں کو نظر انداز کر کے اسے وہ وسعت دینا جو فی الواقع اسے حاصل نہیں ہے، میرے نزدیک بے علمی ہے۔ "علم انسانی" کی حقیقت پر جس شخص کی بھی نظر ہو گی وہ اس بات کو ماننے سے انکار نہ کرے گا کہ جہاں تک مسائلِ عالیہ کا تعلق ہے، ان کی کُنہ تک اس کی رسائی محال ہے۔ کیونکہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہی نہیں ہیں جن سے وہ اس تک پہنچ سکے۔ نہ وہ اس کا براہِ راست مشاہدہ کر سکتا ہے اور نہ مشاہدہ و تجربہ کے تحت آنے والی اشیاء سے استدلال کر کے اس کے متعلق ایسی رائے قائم کر سکتا ہے جس پر "علم" کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ لہٰذا "الدین" وضع کرنے کے لیے جن مسائل کا حل معلوم کرنا سب سے پہلی ناگزیر ضرورت ہے وہ تو علم کی دسترس سے باہر ہی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اخلاقی قدریں، تمدّن کے اصول، اور بے راہ روی سے بچانے والے حدُود معیّن کرنے کا کام آیا علم کے حوالے کیا جا سکتا ہے یا نہیں، تو اس بحث سے قطعِ نظر کرتے ہوئے کہ یہ کام کس شخص یا گروہ یا کس زمانہ کا علم انجام دے گا، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ علمی طور پر یہ کام انجام دینے کے لیے ناگزیر شرائط کیا ہیں۔ اس کے لیے اوّلین شرط یہ ہے کہ اُن تمام قوانینِ فطرت کا علم ہو جن کے تحت انسان اس دُنیا میں جی رہا ہے۔ اس کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ خود انسان کی اپنی زندگی سے جو علوم تعلق رکھتے ہیں وہ مکمّل ہوں۔ اس کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے علوم، یعنی کائناتی اور انسانیاتی علوم کی معلومات یکجا ہوں اور کوئی ذہنِ کامل ان کو صحیح ترتیب دے کر، اُن سے صحیح استدلال کر کے، انسان کے لیے اخلاقی قدروں کا، تمدّن کے اصُولوں کا، اور بے راہ روی سے بچانے والی حدوں کا تعیّن کرے۔ یہ شرائط نہ اِس وقت تک پُوری ہوئی ہیں، نہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ پانچ ہزار برس بعد پُوری ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ انسانیّت کی وفات سے ایک دن پہلے یہ پُوری ہو جائیں، مگر اُس وقت اس کا فائدہ ہی کیا ہو گا۔

تاریخ

آخر میں اُس ذریعۂ علم کو لیجیے جسے ہم پچھلے انسانی تجربات کا تاریخی ریکارڈ یا انسانیت کا نامۂ اعمال کہتے ہیں۔ اس کی اہمیّت اور اس کے فائدوں سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر مَیں کہتا ہوں، اور غور کریں گے تو آپ بھی مان لیں گے کہ "الدین" وضع کرنے کا عظیم الشّان کام انجام دینے کے لیے یہ بھی ناکافی ہے۔ مَیں یہ سوال نہیں کرتا کہ یہ ریکارڈ جتنی

سے حال کے لوگوں تک صحت اور جامعیت کے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں؟ مَیں یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اس ریکارڈ کی مدد سے "الدّین" وضع کرنے کے لیے انسانیت کا نمائندہ کس ذہن کو بنایا جائے گا؟ ہیگل کے ذہن کو؟ مارکس کے ذہن کو؟ ارنسٹ ہیکل کے ذہن کو؟ یا کسی اور ذہن کو؟ مَیں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ماضی، حال، یا مستقبل میں کس تاریخ تک کا ریکارڈ ایک "الدّین" وضع کرنے کے لیے کافی مواد فراہم کر سکے گا؟ اُس تاریخ کے بعد پیدا ہونے والے خوش قسمت ہیں۔ باقی رہے اس سے پہلے گزر جانے والے تو ان کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

مایوس کُن نتیجہ

یہ مختصر اشارات جو مَیں نے کیے ہیں، مجھے توقع ہے کہ مَیں نے ان میں کوئی علمی یا استدلالی غلطی نہیں کی ہے اور اگر انسان کے ذرائع کا یہ جائزہ جو مَیں نے لیا ہے، صحیح ہے تو پھر ہمیں کوئی چیز اس یقین تک پہنچنے سے باز نہیں رکھ سکتی کہ انسان اپنے لیے کوئی کچا پکا، غلط سلط، وقتی اور مقامی "دین" تو وضع کر سکتا ہے، لیکن وہ چاہے کہ "الدّین" وضع کرے، تو یہ قطعی محال ہے۔ پہلے بھی محال تھا، آج بھی محال ہے، اور آئندہ کے لیے بھی اس کے امکان سے پوری مایوسی ہے۔

اب اگر کوئی خدا رہنمائی کے لیے موجود نہیں ہے جیسا کہ منکرینِ خدا کا خیال ہے، تو انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ خودکشی کرلے۔ جس مسافر کے لیے نہ کوئی رہنما موجود ہو اور نہ جس کے اپنے پاس راستہ معلوم کرنے کے ذرائع موجود ہوں، اس کے لیے یاس اور کامل یاس کے سوا کچھ مقدّر نہیں۔ اس کا کوئی ہمدرد اس کے سوا اُسے اور کیا مشورہ دے سکتا ہے کہ سرِ راہ ایک پتھر سے اپنی مشکل آسان کرلے۔ اور اگر خدا ہے لیکن رہنمائی کرنے والا خدا نہیں ہے، جیسا کہ بعض فلسفیانہ اور سائنٹیفک طرز کے مُثبتینِ خُدا کا گمان ہے، تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک صورتِ حال ہے۔ جس خدا نے موجوداتِ عالم کے بقاء و نشوونما کے لیے ہر اُس چیز کی فراہمی کا انتظام کیا ہے جس کی ضرورت کا تصوّر کیا جا سکتا ہو، لیکن ایک نہیں کیا تو صرف انسان کی اُس سب سے بڑی ضرورت کا انتظام جس کے بغیر پُوری نوع کی زندگی غلط ہوئی جاتی ہے، اس کی بنائی ہوئی دُنیا میں رہنا ایک مصیبت ہے، ایسی سخت مصیبت جس سے بڑھ کر کسی دوسری مُصیبت کا تصوّر ممکن نہیں۔ آپ غریبوں اور مُفلسوں، بیماروں اور زخمیوں، مظلوموں اور دُکھی جنتاؤں کی مُصیبت پر کیا روتے ہیں! روئیے اس پُوری نوع کی مصیبت پر جو اس بیچارگی کے عالم میں چھوڑ دی گئی ہے کہ بار بار غلط تجربے کر کے ناکام ہوتی ہے، ٹھوکریں کھا کر گرتی ہے اور پھر اُٹھ کر چلتی ہے تاکہ پھر ٹھوکر کھائے، ہر ٹھوکر پر ملک کے ملک اور قومیں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اُس غریب کو اپنے مقصدِ زندگی تک کی خبر نہیں ہے، کچھ نہیں جانتی کہ کاہے کے لیے سعی و عمل کرے اور کس ڈھنگ پر کرے۔ یہ سب کچھ وہ خدا دیکھ رہا ہے جو اسے زمین پر وجود میں لایا ہے، مگر وہ بس پیدا کرنے سے مطلب رکھتا ہے، رہنمائی کی پروا نہیں کرتا۔

اُمّید کی ایک ہی کرن

اِس تصویر کے بالکل برعکس قرآن ہمارے سامنے صورتِ حال کا ایک دوسرا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا محض پیدا ہی کر دینے والا نہیں ہے بلکہ رہنمائی کرنے والا بھی ہے۔ اس نے موجوداتِ عالم میں سے ہر چیز کو وہ ہدایت بخشی ہے جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اس کے لیے ضروری ہے۔ اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی[1]۔ اگر اس کا ثبوت چاہو تو جس چیونٹی، جس مکھی، جس مکڑی کو چاہو پکڑ کر دیکھ لو۔ جو خدا اِن مخلوقات کی رہنمائی کر رہا ہے وہی خدا انسان کی بھی رہنمائی کرنے والا ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے کہ خود سری چھوڑ کر اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور جس جامع اور مکمّل نظامِ زندگی یا "الدّین" کی ہدایت اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجی ہے، اس کی پیروی اختیار کر لے۔

دیکھیے! ایک طرف تو وہ نتیجہ ہے جو انسان کی قوتوں اور اس کے ذرائع کا بے لاگ جائزہ لینے سے ہم کو حاصل ہوتا ہے، اور دوسری طرف قرآن کا یہ دعوٰی ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ یا تو اس دعوے کو قبول کریں، یا پھر اپنے آپ کو مایوسی کے حوالے کر دیں اور اُس مایوسی کے اندھیرے میں کہیں برائے نام بھی اُمّید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ دراصل صورتِ حال یہ ہے ہی نہیں کہ "الدّین" حاصل ہونے کے دو وسیلے موجود ہوں، اور سوال یہ ہو کہ ہم ان میں سے کس وسیلے سے مدد لیں۔ اصلی صورتِ حال یہ ہے کہ "الدّین" جس وسیلے سے ہم کو مل سکتا ہے وہ صرف ایک ہے اور انتخاب کا سوال صرف اِس امر میں ہے کہ آیا ہم اِس تنہا وسیلے سے مدد لیں یا اس کی دستگیری کا فائدہ اٹھانے کے بجائے تاریکی میں بھٹکتے پھرنے کو ترجیح دیں۔

قرآن کے دلائل

یہاں تک جو استدلال میں نے کیا ہے وہ تو ہم کو محض اس حد تک پہنچاتا ہے کہ ہماری فلاح کے لیے قرآن کے اس دعوے کو قبول کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یعنی بالفاظِ دیگر کافر نتوانی شُد، ناچار مسلماں شو۔ لیکن قرآن اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل پیش کرتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ اعلیٰ و اشرف ہیں، کیونکہ وہ ہمیں بادلِ ناخواستہ مسلمان ہونے کے بجائے برضا و رغبت مسلمان ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کی بہت سی دلیلوں میں سے چار سب سے زیادہ پُرزور ہیں اور انہی کو اُس نے بار بار بتکرار پیش کیا ہے۔

(۱) انسان کے لیے اسلام ہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے، اِس لیے کہ یہی حقیقتِ نفس الامری کے مطابق ہے اور اُس کے سوا ہر دوسرا رویّہ خلافِ حقیقت ہے:

---

[1] "جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر رہنمائی کی۔"

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ۔ (آل عمران: آیت ۸۳)

"کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں چار و ناچار اُسی کے آگے سرِ تسلیم خم کیے ہوتے ہیں اور اسی کی طرف انہیں پلٹ کر جانا ہے۔"

(۲) انسان کے لیے یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے، کیونکہ یہی حق ہے اور از روئے انصاف اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (الاعراف: آیت ۵۴)

"حقیقت میں تمہارا رب (مالک و فرمانروا) تو اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (یا دوروں) میں پیدا کیا، پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہوا۔ جو دن کو رات کا لباس اُڑھاتا ہے اور پھر رات کے تعاقب میں دن تیزی کے ساتھ دوڑا آتا ہے۔ سُورج اور چاند اور تارے سب کے سب جس کے تابع فرمان ہیں۔ سنو! خلق بھی اسی کی ہے اور امر بھی اُسی کا۔ بڑا برکت والا ہے وہ کائنات کا رب۔"

(۳) انسان کے لیے یہی رویّہ صحیح ہے، کیونکہ تمام حقیقتوں کا صحیح علم صرف خدا ہی کو ہے اور بے خطا ہدایت وہی کر سکتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ۔ (آل عمران: آیت ۵)

"درحقیقت اللہ سے نہ زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی ہے اور نہ آسمان کی۔"

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔ (البقرہ: آیت ۲۵۵)

"جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے اور لوگ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر حاوی نہیں ہو سکتے، بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے۔"

قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی (الانعام۔۷۱) "اے پیغمبر کہہ دو کہ اصلی ہدایت صرف خدا ہی کی ہدایت ہے۔"

(۴) انسان کے لیے یہی ایک راہِ راست ہے، کیونکہ اس کے بغیر عدل ممکن نہیں۔ اس کے سوا جس راہ پر بھی انسان چلے گا وہ بالآخر ظلم ہی کی طرف جائے گی۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ - (الطلاق - ۱)

"جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرے اس نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا"۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ - (المائدہ - ۴۵)

"جو اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظالم ہیں"۔

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر معقول انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور ہدایت کے لیے اسی کی طرف رجوع کرے۔

خدائی ہدایت کے پرکھنے کا معیار

اب آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لازماً اس مرحلہ پر پہنچ کر ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اپنی تحقیق کے دوران خود میرے دل میں بھی پیدا ہو چکا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہر اُس شخص کی بات مان لیں جو ایک دین ہمارے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کر دے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو آخر ہمارے پاس وہ کیا معیار ہے جس سے ہم انسانی ساخت کے دین اور خدائی ہدایت کے دین میں فرق کر سکیں؟ اس کا جواب اگرچہ بڑی مفصّل تحقیقی بحث چاہتا ہے، مگر میں یہاں مختصر اشاروں میں وہ چار بڑے معیار بیان کروں گا جو انسانی فکر اور خدائی فکر کو ممیّز کرتے ہیں۔

انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہوتی ہے۔ جو چیز خدا کی طرف سے ہو گی اُس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانے میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو، یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے مُصنّف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اوجھل رہ گیا۔ مگر اس معیارِ تحقیق کو استعمال کرتے ہوئے یہ بات نہ بھول جائیے کہ علم، اور علمی قیاس، اور نظریۂ علمی میں بڑا فرق ہے۔ ایک وقت میں جو علمی قیاسات اور علمی نظریات دماغوں پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں، اکثر غلطی سے ان کو "علم" سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے غلط ہونے کا بھی اتنا ہی اِمکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا۔ تاریخِ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو بالآخر "علم" ثابت ہوئے ہیں۔

انسانی فکر کی دوسری بڑی کمزوری نقطۂ نظر کی تنگی ہے۔ اس کے برخلاف خدائی فکر میں وسیع ترین نقطۂ نظر پایا جاتا ہے۔ جب آپ خدائی فکر سے نکلی ہوئی کسی چیز کو دیکھیں گے تو آپ کو ایسا محسوس ہو گا جیسے اس کا مُصنّف ازل سے ابد تک دیکھ رہا ہے، پوری کائنات کو دیکھ رہا ہے، تمام حقیقتوں کو بیک نگاہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں بڑے سے بڑے فلسفی اور مُفکّر کی فکر بھی ایک بچّے کی فکر محسوس ہو گی۔

انسانی فکر کا تیسرا اہم خاصہ یہ ہے کہ اس میں حکمت و دانش، جذبات و خواہشات کے ساتھ کہیں نہ کہیں ساز باز اور مصلحت کرتی نظر آ ہی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے خدائی فکر میں بے لاگ حکمت اور خالص دانش مندی کی شان اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ اس کے احکام میں کہیں آپ جذباتی جھکاؤ کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔

انسانی فکر کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ جو نظامِ زندگی وہ خود تصنیف کرے گا اس میں جانبداری، انسان اور انسان کے درمیان غیر عقلی امتیاز، اور غیر عقلی بنیادوں ہی پر ترجیح بعض علی البعض کا عنصر لازماً پایا جاتے گا۔ کیونکہ ہر انسان کی کچھ ذاتی دلچسپیاں ہوتی ہیں جو بعض انسانوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور بعض کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتیں۔ بخلاف اس کے خدائی فکر سے نکلا ہوا نظامِ زندگی ایسے ہر عنصر سے بالکل پاک ہو گا۔

اِس معیار پر آپ ہر اُس نظامِ زندگی کو جانچ کر دیکھیے جو اپنے آپ کو خدا کی طرف سے "الدّین" کہتا ہو۔ اگر وہ انسانی فکر کی اِن تمام خصوصیّات سے خالی ہو اور پھر جامعیّت اور ہمہ گیری کی وہ شان بھی رکھتا ہو جو اس سے پہلے مَیں نے "الدّین" کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے بیان کی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر ایمان لانے میں تامّل کریں۔

ایمان کے تقاضے

اب مجھے بنیادی سوالات میں سے آخری سوال پر کچھ گفتگو کرنی ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

آدمی جب قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کرلے اور اُس "الدّین" پر ایمان لے آئے جس کے منجانب اللہ ہونے کا اطمینان اُسے حاصل ہو گیا ہو، تو اِس تسلیم کرنے اور ایمان لانے کے مقتضیات کیا ہیں۔

مَیں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے معنی جھک جانے، سپر ڈال دینے، اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ اس جھکاؤ، سپردگی اور سپر اندازی کے ساتھ خود رائی، خود مختاری اور فکر و عمل کی آزادی ہرگز نہیں نبھ سکتی۔ جس دین پر بھی آپ ایمان لائیں، آپ کو اپنی پوری شخصیّت اس کے حوالے کر دینی ہو گی۔ اپنی کسی چیز کو بھی آپ اس کی پیروی سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپ کے دل اور دماغ کا دین ہو۔ آپ کی آنکھ اور کان کا دین ہو۔ آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا دین ہو۔ آپ کے پیٹ اور دھڑ کا دین ہو، آپ کے قلم اور زبان کا دین ہو، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتوں کا دین ہو، آپ کی سعی اور عمل کا دین ہو، آپ کی محبت اور نفرت کا دین ہو، آپ کی دوستی اور دشمنی کا دین ہو، غرض آپ کی شخصیّت کا کوئی جُز اور کوئی پہلو بھی اُس دین سے خارج نہ ہو۔ اپنی کسی چیز کو جتنا اور جس حیثیت سے بھی آپ اُس دین کے احاطہ سے باہر اور اُس کی پیروی سے مستثنیٰ رکھیں گے، سمجھ لیجیے کہ اُسی قدر آپ کے دعوائے ایمان میں جھوٹ شامل ہے، اور ہر راستی پسند انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کو جھوٹ سے پاک رکھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

پھر یہ بھی میں ابتداء میں عرض کر چکا ہوں کہ انسانی زندگی ایک کُل ہے جسے الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا انسان کی پوری زندگی کا ایک ہی دین ہونا چاہیے۔ دو دو اور تین تین دینوں کی بیک وقت پیروی بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایمان کے ڈانواں ڈول اور عقلی فیصلے کے مضطرب ہونے کا ثبوت ہے۔ جب فی الواقع کسی دین کے "الدّین" ہونے کا اطمینان آپ حاصل کر لیں اور اس پر ایمان لے آئیں تو لازماً اس کو آپ کی زندگی کے تمام شعبوں کا دین ہونا چاہیے اگر وہ شخصی حیثیت سے آپ کا دین ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہی آپ کے گھر کا دین بھی نہ ہو اور وہی آپ کی تربیتِ اولاد کا، آپ کی تعلیم اور آپ کے مدرسے کا، آپ کے کاروبار اور کسبِ معاش کا، آپ مجلسی زندگی اور قومی طرزِ عمل کا، آپ کے تمدّن اور سیاست کا اور آپ کے ادب اور آرٹ کا دین بھی نہ ہو۔ جس طرح یہ بات محال ہے کہ ایک ایک موتی اپنی جگہ تو موتی ہو، مگر جب تسبیح کے رشتے میں بہت سے موتی منظّم ہوں تو سب مل کر دانۂ نخود بن جائیں، اُسی طرح یہ بات بھی میرے دماغ کو اپیل نہیں کرتی کہ انفرادی حیثیت سے تو ہم ایک دین کے پیرو ہوں، مگر جب اپنی زندگی کو منظّم کریں تو اس منظّم زندگی کا کوئی پہلو اس دین کی پیروی سے مستثنیٰ رہ جائے۔

ان سب سے بڑھ کر ایمان کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ جس دین کے "الدّین" ہونے پر آپ ایمان لائیں، اس کی برکتوں سے اپنے ابنائے نوع کو بہرہ مند کرنے کی کوشش کریں اور آپ کی تمام سعی وجہد کا مرکز و محور یہ ہو کہ یہی "الدّین" تمام دُنیا کا دین بن جائے۔ جس طرح حق کی فطرت یہ ہے کہ وہ غالب ہو کر رہنا چاہتا ہے، اسی طرح حق پرستی کی بھی یہ عین فطرت ہے کہ وہ حق کو جان لینے کے بعد باطل پر اسے غالب کرنے کی سعی کیے بغیر چین نہیں لے سکتی۔ جو شخص دیکھ رہا ہو کہ باطل ہر طرف زمین اور اس کے باشندوں پر چھایا ہوا ہے اور پھر یہ منظر اس کے اندر کوئی بے کلی، کوئی چبھن، کوئی تڑپ پیدا نہیں کرتا، اس کے دل میں اگر حق پرستی ہے بھی تو سوتی ہوئی ہے۔ اسے فکر کرنی چاہیے کہ یہ نیند کا سکوت کہیں موت کے سکوت میں تبدیل نہ ہو جائے۔[۱]

فصل ۳

اِسلام اور جاہلیّت کی کشمکش[1]

دُنیا میں انسان کی زندگی کے لیے جو نظام نامہ بھی بنایا جائے گا اس کی ابتداء لامحالہ مابعد الطبیعی (Metaphysical) یا الٰہیاتی مسائل سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق، جس میں انسان رہتا ہے، ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کرلیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا برتاؤ یہاں کیا ہونا چاہیے اور کس طرح اُسے دُنیا میں کام کرنا چاہیے، دراصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے، اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے، اور اِس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈھنگ کو ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائے گا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا۔ پھر اسی نظریۂ اخلاق کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی۔ پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلقات و معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورتیں اختیار کریں گے، اور آخر کار تمدن کی پُوری عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔ دنیا میں اس وقت تک نوعِ انسانی کے لیے جتنے مذہب و مسلک بھی بنے ہیں، ان سب کو بہر حال اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریۂ اخلاق مُرتّب کرنا پڑا ہے، اور اصُول سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک میں ایک مسلک کو دوسرے مسلک سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہی فلسفہ اور یہی اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ کیونکہ ہر دستورِ زندگی کا مزاج اِسی چیز کی طبیعت کے مطابق بنتا ہے، اور یہ اس کے قالب میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

[1] "دینِ حق"، اسلام کے بالمقابل جتنے بھی نظام کارفرما رہے ہیں، یا اب ہیں، ان سب کے لیے جاہلیّت کی اصطلاح بطورِ موازنہ استعمال ہوتی ہے۔ دین کی اساس "العلم" (وحیِ الٰہی) پر ہے اور جاہلی نظاموں کی اساس ایسے مابعد الطبیعی نظریات پر ہوتی ہے جو قیاس و گمان سے گھڑ لیے جاتے ہیں یا سوچے سمجھے بغیر اختیار کر لیے جاتے ہیں۔ (مؤلف)

زندگی کے چار نظریّے

جزئیات و فروع سے قطع نظر، اصُولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسان اور کائنات کے متعلق چار ہی مابعد الطبیعی نظریّے قائم ہو سکتے ہیں اور دُنیا میں جتنے دستورِ زندگی پائے جاتے ہیں انہوں نے اِنہی چار میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔

ان میں سے پہلے نظریّے کو ہم جاہلیّتِ خالصہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ جاہلیّتِ خالصہ

کائنات کا یہ سارا انتظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ یُونہی بن گیا ہے، یُونہی چل رہا ہے اور یُونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی خدا نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو دوسری چیزوں کی طرح شاید اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس کو کس نے پیدا کیا اور کس لیے پیدا کیا۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اِس زمین پر پایا جاتا ہے۔ کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پُورا کرنے کے لیے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے۔ کچھ قُوای اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور اپنے گردوپیش کے دامن پر بہت سا سامان پھیلا ہوا دیکھتا ہے جن پر یہ اپنے اِن قوٰی اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشوں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اُس کی زندگی کا مقصد اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبیعتِ حیوانی کے مطالبات پُورے کرے، اور اس کی انسانی استعدادوں کا مصرف اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان مطالبات کو پُورا کرنے کے لیے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرے۔

انسان سے مافوق کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اس کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو۔ لہٰذا اس کو اپنے گردوپیش کے آثار و احوال سے اور اپنی تاریخ کے تجربات سے خود ہی ایک قانونِ عمل اخذ کرنا چاہیے۔

بظاہر کوئی ایسی حکومت نظر نہیں آتی جس کے سامنے انسان جوابدہ ہو۔ اس لیے انسان بجائے خود ایک غیر ذمّہ دار ہستی ہے۔ اور اگر یہ جوابدہ ہے بھی تو آپ اپنے ہی سامنے ہے۔ یا پھر اُس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مُستولی ہو جائے۔

اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اِسی دنیوی زندگی کی حد تک ہیں۔ اِس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے۔ لہٰذا صحیح اور غلط، مُفید اور مُضر، قابلِ اَخذ اور قابلِ تَرک ہونے کا فیصلہ صرف اُنہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا

جو دُنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

انسان جب جاہلیتِ محضہ کی حالت میں ہوتا ہے، یعنی جب اپنے محسوسات سے ماوراء کسی حقیقت تک وہ نہیں پہنچا، یا بندگیٔ نفس کی وجہ سے نہیں پہنچنا چاہتا، تو اس کے ذہن پر یہی نظریہ حاوی ہوتا ہے۔ دُنیا پرستوں نے ہر زمانے میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر بادشاہوں نے، امیروں نے، درباریوں اور اربابِ حکومت نے، خوش حال لوگوں اور خوشحالی کے پیچھے جان دینے والوں نے عموماً اِسی نظریہ کو ترجیح دی ہے۔ اور جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گاتے جاتے ہیں بالعموم ان سب کے تمدن کی جڑ میں یہی نظریہ کام کرتا رہا ہے۔ موجودہ مغربی تمدن کی بنیاد میں بھی یہی نظریہ کارفرما ہے۔ اگرچہ اہلِ مغرب سب کے سب خدا اور آخرت کے منکر نہیں ہیں۔ نہ علمی حیثیت سے سب مادہ پرستانہ اخلاق کے قائل ہیں، لیکن جو رُوح ان کے پورے نظامِ تہذیب و تمدن میں کام کر رہی ہے وہ اِسی انکارِ خدا و آخرت اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق ہی کی رُوح ہے اور وہ کچھ اس طرح ان کی زندگی میں پیوست ہو گئی ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے خدا اور آخرت کے قائل ہیں اور اخلاق میں ایک غیر مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں وہ بھی غیر شعوری طور پر اپنی واقعی زندگی میں دہریے اور مادہ پرست ہی ہیں۔ کیونکہ ان کے علمی نظریہ کا ان کی عملی زندگی سے بالفعل کوئی ربط قائم نہیں ہے۔ ایسی ہی کیفیت ان سے پہلے کے مُترفین اور خدا فراموش لوگوں کی بھی تھی۔ بغداد، دمشق، دہلی اور غرناطہ کے مُترفین مسلمان ہونے کی وجہ سے خدا اور آخرت کے منکر نہ تھے، مگر ان کی زندگی کا سارا پروگرام اِس طرح بنتا تھا کہ گویا نہ خدا ہے نہ آخرت، نہ کسی کو جواب دینا ہے، نہ کہیں سے ہدایت لینی ہے، جو کچھ ہیں ہماری خواہشات ہیں، ان خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر قسم کے ذرائع اور ہر قسم کے طریقے اختیار کرنے میں ہم آزاد ہیں اور دنیا میں جینے کی جتنی مُہلت ملتی ہے اُس کا بہترین مصرف بس یہ ہے کہ

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جیسا کہ اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اِس نظریہ کی عین فطرت یہی ہے کہ اس کی بُنیاد پر ایک خالص مادہ پرستانہ نظامِ اخلاق بنتا ہے۔ خواہ وہ کتابوں میں مدوّن ہو یا صرف ذہنیتوں ہی میں مرتّب ہو کر رہ جائے۔ پھر اسی ذہنیت سے علوم و فنون اور افکار و آداب کی آبیاری ہوتی ہے اور پُورے نظامِ تعلیم و تربیت میں اِلحاد و مادیت کی رُوح سرایت کر جاتی ہے۔ پھر انفرادی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان تعلقات و معاملات کی تمام صورتیں اسی نقشہ پر بنتی ہیں۔ اور قوانین کا نشو و نما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے۔ پھر اس طرز کی سوسائٹی میں سطح پر وہ لوگ اُبھر آتے ہیں جو سب سے زیادہ مکّار، بددیانت، جھوٹے، دغاباز، سنگدل اور خبیث النفس ہوتے ہیں۔ تمام سوسائٹی کی سیادت و قیادت اور مملکت کی زمامِ کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ شترِ بے مُہار کی طرح ہر حساب سے بے خوف اور ہر مواخذہ سے بے پرواہ ہو کر خلقِ خدا پر ٹوٹ پڑتے ہیں میکیاولی (Macniavelli

کے اصولِ سیاست پر ان کی ساری حکمتِ عملی مبنی ہوتی ہے۔ ان کی کتابِ آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے۔ جہاں کوئی مادّی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی۔ یہ ظلم مملکت کے دائرے میں یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقت ور طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں اور مملکت کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی، امپیریلزم اور ملک گیری اور اقوام کُشی کی صورت میں ہوتا ہے۔

۲۔ جاہلیتِ مُشرکانہ

دوسرا مابعد الطبیعی نظریہ شرک کے اصول پر مبنی ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اتفاقی تو نہیں ہے اور نہ بے خداوند ہے۔ مگر اس کا ایک خداوند (Master) نہیں بلکہ بہت سے خداوند ہیں۔ یہ خیال چونکہ کسی علمی

لہ فاضل مؤلف نے نظریۂ جاہلیت کے ایک اور پہلو کو یوں واضح کیا ہے (مرتبین)

حضرت شعیبؑ نے جب اپنی قوم کے لوگوں کو اللہ واحد کی بندگی کی دعوت دی اور تجارتی کاروبار میں بددیانتی سے روکا تو انہوں نے جواب دیا:

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود۔ آیت ۸۷)

"اے شعیبؑ کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟"

یہ اسلام کے مقابلہ میں جاہلیت کے نظریہ کی پوری ترجمانی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا جو طریقہ بھی ہے غلط ہے اور اس کی پیروی نہ کرنی چاہیے، کیونکہ دوسرے کسی طریقے کے لیے عقل و علم اور کتبِ آسمانی میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی بندگی صرف ایک محدود مذہبی دائرے ہی میں نہ ہونی چاہیے بلکہ تمدّن، معاشرت، معیشت، سیاست، غرض زندگی کے ہر شعبے میں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ دُنیا میں انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کا ہے اور انسان کسی چیز پر بھی اللہ کی مرضی سے آزاد ہو کر خود مختارانہ تصرّف کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے مقابلہ میں جاہلیت کا نظریہ یہ ہے کہ باپ دادا سے جو طریقہ بھی چلا آرہا ہو انسان کو اسی کی پیروی کرنی چاہیے اور اس کی پیروی کے لیے اس دلیل کے سوا کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ نیز یہ کہ دین و مذہب کا تعلق صرف پُوجا پاٹ سے ہے، رہے ہماری زندگی کے عام دنیوی معاملات، تو ان میں ہم کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ جس طرح چاہیں کام کریں۔ اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دائروں میں الگ الگ تقسیم کرنے کا تخیل آج کوئی نیا تخیل نہیں ہے بلکہ آج سے تین ساڑھے تین ہزار برس پہلے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو بھی اس تقسیم پر ویسا ہی اصرار تھا جیسا آج اہلِ مغرب اور ان کے مشرقی شاگردوں کو ہے۔ یہ فی الحقیقت کوئی "نئی روشنی" نہیں ہے جو انسان کو آج "ذہنی ارتقاء" کی بدولت نصیب ہو گئی ہو بلکہ یہ وہی پُرانی تاریک خیالی ہے جو ہزارہا برس پہلے کی جاہلیت میں بھی اسی شان سے پائی جاتی تھی اور اس کے خلاف اسلام کی کشمکش بھی آج کی نہیں بہت قدیم ہے۔ (مؤلف)

ثبوت (Scientific Proof) پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیال آرائی پر اس کی بنا ہے، اس لیے موہوم محسوس اور معقول اشیاء کی طرف خداوندی و الہٰیت کو منسوب کرنے میں مشرکین کے درمیان نہ کبھی اتفاق ہو سکتا ہے، نہ کبھی ہوا ہے۔ اندھیرے میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر بھی پڑ گیا وہ خدا بنا لی گئی۔ اور خداؤں کی فہرست ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ فرشتے، جن، ارواح، تیارے، زندہ اور مُردہ انسان، درخت، پہاڑ، جانور، دریا، زمین، آگ، سب دیوتا بنا ڈالے گئے۔ بہت سے معانی مجردہ (Abstract Ideas) مثلاً محبت، حُسن، شہوت، قوتِ تخلیق، بیماری، جنگ، لچھمی، شکتی وغیرہ کو بھی خدائی کا مقام دیا گیا۔ طرح طرح کے خیالی مُرکبات، مثلاً شیر انسان، ماہی انسان، پرند انسان، چہار سرا، ہزار دستہ، خرطوم بینی وغیرہ بھی مُشرکین کے معبُودوں میں جگہ پاتے رہے۔

پھر اس دیومالا کے گرد اوہام و خرافات (Mythology) کا ایک عجیب طلسم ہوش رُبا تیار ہوا ہے جس میں ہر جاہل قوم کی قوتِ واہمہ نے اپنی نشادابی و نادرہ کاری کے وہ وہ دلچسپ نمونے فراہم کیے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن قوموں میں خداوندِ اعلیٰ یعنی اللہ کا تصوّر نمایاں پایا گیا ہے، وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس طرز کا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے خدا اُس کے وزیر، درباری، مصاحب، عہدہ دار اور اہلکار ہیں۔ مگر انسان بادشاہ سلامت تک راہ نہیں پا سکتا، اِس لیے سارے معاملات ماتحت خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور جن قوموں میں خداوندِ اعلیٰ کا تصور بہت دُھندلا یا تقریباً مفقود ہے وہاں ساری خدائی اربابِ مُتفرقین میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

جاہلیّتِ خالصہ کے بعد یہ دوسری قسم کی جاہلیّت ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے، اور ہمیشہ گھٹیا درجہ کی دماغی حالت ہی میں یہ کیفیت رونما ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ واحدِ قہار کی خدائی کے قائل ہو گئے وہاں سے خداؤں کی دوسری اقسام تو رخصت ہو گئیں، مگر انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین، مجاذیب، اَقطاب، اَبدال، عُلماء، مشائخ اور ظلُّ اللّٰہوں کی خدائی پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں اپنی جگہ نکالتی ہی رہی۔ جاہل دماغوں نے مُشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر اُن نیک بندوں کو خدا بنا لیا جن کی ساری زندگیاں بندوں کی خدائی ختم کرنے اور صرف اللہ کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہوئی تھیں۔ ایک طرف مُشرکانہ پُوجا پاٹ کی جگہ فاتحہ، زیارت، نیاز نذر، عُرس، صندل، چڑھاوے، نشان، عَلَم، تعزیے اور اسی قسم کے دُوسرے مذہبی اعمال کی ایک نئی شریعت تصنیف کر لی گئی۔ دوسری طرف کسی علمی ثبوت کے بغیر ان بزرگوں کی ولادت و وفات، ظُہور و غیاب، کرامات و خوارق، اختیارات و تصرّفات اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اُن کے تقرب کی کیفیات کے متعلق ایک پوری میتھالوجی تیار ہو گئی جو بُت پرست مُشرکین کی میتھالوجی سے ہر طرح لگا کھا سکتی ہے۔ تیسری طرف توسُّل اور اِستمدادِ روحانی اور اکتسابِ فیض وغیرہ ناموں کے خوشنما پردوں میں وہ سب

معاملات جو اللہ اور بندوں کے درمیان ہوتے ہیں، اِن بزرگوں سے متعلق ہو گئے۔ اور عملاً وہی حالت قائم ہو گئی جو اللہ کے ماننے والے اُن مشرکین کے ہاں ہے جن کے نزدیک پادشاہِ عالم انسان کی رسائی سے بہت دُور ہے اور انسان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام اُمور بیچ کے اہلکاروں ہی سے وابستہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کے ہاں اہلکار علانیہ اِلٰہ، دیوتا، اَوتار، یا ابنُ اللہ کہلاتے ہیں اور یہ انہیں غوث، قطب، اَبدال اولیاءُ اور اہلُ اللہ وغیرہ الفاظ کے پردوں میں چھپاتے ہیں۔

یہ دوسری قسم کی جاہلیّت تاریخ کے دَوران میں عموماً پہلی قسم کی جاہلیّت یعنی جاہلیّتِ خالصہ کے ساتھ تعاوُن کرتی رہی ہے۔ قدیم زمانے میں بابل، مصر، ہندوستان، ایران، یونان، رُوم وغیرہ ممالک کے تمدُّن میں یہ دونوں جاہلیّتیں ہم آغوش تھیں۔ اور موجُودہ زمانہ میں جاپان کا بھی یہی حال ہے۔ اِس موافقت کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند کی طرف مَیں اشارہ کروں گا۔

اوّلاً، مُشرکانہ جاہلیّت میں آدمی کا کوئی تعلق اپنے معبودُوں کے ساتھ اِس کے سوا نہیں ہوتا کہ یہ اپنے خیال میں اُن کو صاحبِ اِختیار اور نافع و ضارّ سمجھ لیتا ہے اور مختلف مراسمِ عبُودیّت کے ذریعہ سے اپنے دُنیوی مقاصد میں ان کی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے[1]۔

---

[1] حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا:

فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ۔ (ہُود۔ آیت ۶۱)	"لہٰذا تم اللہ سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے۔"

یہ مُشرکین کی ایک بہت بڑی غلط فہمی کا رد ہے جو بالعموم ان سب میں پائی جاتی ہے اور اُن اہم اسباب میں سے ایک ہے جنہوں نے ہر زمانہ میں انسان کو شرک میں مبتلا کیا ہے۔ یہ لوگ اللہ کو اپنے راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں پر قیاس کرتے ہیں جو رعیّت سے دُور اپنے محلّوں میں دادِ عیش دیا کرتے ہیں، جن کے دربار تک عام رعایا میں سے کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی، جن کے حضور میں کوئی درخواست پہنچانی ہو تو مُقرّبینِ بارگاہ میں سے کسی کا دامن تھامنا پڑتا ہے اور پھر اگر خوش قسمتی سے کسی کی درخواست ان کے آستانۂ بلند پر پہنچ بھی جاتی ہے تو ان کا پندارِ خدائی یہ گوارا نہیں کرتا کہ خود اس کو جواب دیں، بلکہ جواب دینے کا کام مُقرّبین ہی میں سے کسی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اِس غلط گمان کی وجہ سے یہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں اور ہوشیار لوگوں نے ان کو ایسا سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے کہ خداوندِ عالم کا آستانۂ اقدس عام انسانوں کی دست رس سے بہت ہی دُور ہے۔ اس کے دربار تک بھلا کسی عامی کی پہنچ کیسے ہو سکتی ہے۔ وہاں تک دعاؤں کا پہنچنا اور پھر ان کا جواب ملنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ پاک رُوحوں کا وسیلہ نہ ڈھونڈا جائے اور اُن مذہبی منصب داروں کی خدمات نہ حاصل کی جائیں جو اُوپر تک نذریں، نیازیں اور عرضیاں پہنچانے کے ڈھب جانتے ہیں۔ یہی

باقی رہا یہ امر کہ وہاں سے اس کو کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا ضابطہ و قانون ملے تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں کیونکہ وہاں کوئی واقع میں خدا ہو تو ہدایت اور قانون بھیجے۔ پس جب ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو مشرک انسان لامحالہ خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کر لیتا ہے۔ اس طرح وہی جاہلیتِ محضہ بر سرِ کار آ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالص جاہلیت کے تمدن اور مشرکانہ تمدن میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہوتا کہ ایک جگہ جاہلیت کے ساتھ مندروں، پجاریوں اور عبادات کا سلسلہ ہوتا ہے اور دوسری جگہ نہیں ہوتا۔ اخلاق اور اعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں۔ یونانِ قدیم اور بت پرست روم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کا یہی سبب ہے۔

ثانیاً، علوم و فنون، فلسفہ و ادب اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے لیے مشرکانہ نظریہ کوئی الگ مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ اس باب میں بھی مشرک انسان جاہلیتِ محضہ ہی کا رخ اختیار کرتا ہے اور مشرک سوسائٹی کا سارا دماغی نشو و نما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے جس پر خالص جاہلی سوسائٹی میں ہوا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مشرکین کی قوتِ واہمہ حد سے بڑھی ہوتی ہے اس لیے ان کے افکار میں خیال آرائی (Speculation) کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے، اور ملاحدہ ذرا عملی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے نرے خیالی فلسفوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ البتہ جب یہ ملاحدہ خدا کے بغیر کائنات کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی استدلالی کھینچ تان بھی اتنی ہی غیر معقول ہوتی ہے جتنی مشرکین کی ملیتھالوجی۔ بہر حال علمی حیثیت سے شرک اور جاہلیتِ خالصہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہوتا اور اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ موجودہ یورپ اپنے موجودہ نظریات میں قدیم یونان و روم سے اس طرح سلسلہ جوڑتا ہے کہ گویا یہ بیٹا ہے اور وہ باپ۔

ثالثاً، مشرک سوسائٹی ان تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح مستعد رہتی ہے جن کو خالص جاہلی سوسائٹی اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ سوسائٹی کی ترتیب و تعمیر میں شرک اور جاہلیتِ خالصہ کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے، روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص امتیازات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ شاہی خاندان اور مذہبی طبقے مل کر ایک ملی بھگت قائم کرتے ہیں، خاندانوں پر خاندانوں کے اور طبقوں پر طبقوں کے تفوق کا ایک مستقل نظریہ وضع کیا جاتا ہے، اور اس طرح

وہ غلط فہمی ہے جس نے بندے اور خدا کے درمیان بہت سے چھوٹے بڑے معبودوں اور سفارشیوں کا ایک جمِ غفیر کھڑا کر دیا اور اس کے ساتھ مہنت گری (Priesthood) کا وہ نظام پیدا کیا جس کے توسط سے کے بغیر جاہلی مذاہب کے پیرو پیدائش سے لے کر موت تک اپنی کوئی مذہبی رسم بھی انجام نہیں دے سکتے۔ (مؤلف ۱۴۲ھ)

جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلّط قائم کر لیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے خالص جاہلی سوسائٹی میں یہ خرابیاں نسل پرستی، قوم پرستی، قومی امپیریلزم، ڈکٹیٹرشپ، سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں لیکن جہاں تک رُوح اور جوہر کا تعلق ہے، انسان پر انسان کی خدائی مُسلّط کرنے، انسان کو انسان سے پھاڑنے اور انسانیت کو تقسیم کر کے ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لیے صیّاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

۳۔ جاہلیّتِ راہبانہ

تیسرا مابعد الطبیعی نظریہ رہبانیّت پرستی پر مبنی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

یہ دُنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دارُ العذاب ہے۔ انسان کی رُوح اِس قفسِ عنصری میں دراصل ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس جسمانی تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں، اصل میں اس قید خانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ انسان اس دنیا اور اس کی چیزوں سے جتنا تعلق رکھے گا اُتنا ہی گندگی سے آلودہ ہوگا اور اسی قدر مزید عذاب کا مستحق بن جائے گا۔ نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ اس زندگی کے بکھیڑوں سے قطعِ تعلق کیا جائے، خواہشات کو مٹایا جائے، لذات سے کنارہ کشی کی جائے، جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبات کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے، ان تمام محبّتوں کو جو دنیوی اشیاء اور گوشت و خون کی رشتہ داریوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں دل سے نکال دیا جائے، اور اپنے اس دشمن یعنی نفس و جسم کو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ رُوح پر اس کا تسلّط قائم نہ رہ سکے۔ اِس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہو جائے گی اور نجات کے بلند مقامات پر اُڑنے کی طاقت حاصل کرے گی۔

یہ نظریہ بجائے خود غیر تمدّنی (Anti Social) نظریہ ہے، مگر تمدّن پر یہ متعدّد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اِس کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظامِ فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں ویدانتزم، مانویّت، اشراقیت (New-Platonism)، یوگ، تصوّف، مسیحی رہبانیّت اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اِس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی (Positive) اور بہت زیادہ بلکہ تمام تر سلبی (Negative) نوعیت کا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مل جُل کر لٹریچر، عقائد، اخلاقیات، اور عملی زندگی میں نفوذ کرتی ہیں اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچتے ہیں وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں۔

پہلی دونوں قسم کی جاہلیتوں کے ساتھ اِس تیسری قسم کی جاہلیّت کا تعاون عموماً تین صورتوں سے ہوتا ہے:

ا۔ یہ راہبانہ جاہلیّت انسانی جماعت کے نیک اور پاک باز افراد کو دُنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لے جاتی ہے اور بدترین قسم کے شریر افراد کے لیے میدان صاف کر دیتی ہے۔ بدکار لوگ خدا کی زمین کے متولّی بن کر آزادی کے ساتھ فساد پھیلاتے ہیں اور نیک لوگ اپنی نجات کی فکر میں تپسیا کیے چلے جاتے ہیں۔

۲- اِس جاہلیت کے اثرات جہاں تک عوام میں پہنچتے ہیں، وہ ان کے اندر غلط قسم کا صبر و تحمّل اور مایوسانہ نقطۂ نظر پیدا کر کے انہیں ظالموں کے لیے نرم نوالہ بنا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ اُمَراء اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اور یہ خوب آرام سے اُن کی سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔ تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ امپیریلزم، سرمایہ داری اور پاپائیت سے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی کبھی لڑائی ہوئی ہو۔

۳- جب یہ راہبانہ فلسفہ و اخلاق انسانی فطرت سے شکست کھا جاتا ہے تو کتابُ الحِیَل کی تصنیف شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں کَفّارے کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے تاکہ دل کھول کر گناہ کیا جا سکے، اور جنّت بھی ہاتھ سے نہ جائے کہیں ہوس رانی کے لیے عشقِ مجازی کا حیلہ نکالا جاتا ہے تاکہ دل کی لگی بُجھا بھی لی جائے اور تقدّس بھی جُوں کا تُوں قائم رہے۔ اور کہیں ترکِ دُنیا کے پردے میں بادشاہوں اور رئیسوں سے سانٹھ گانٹھ کی جاتی ہے اور رُوحانی امارت کا وہ جال پھیلایا جاتا ہے جس کی بدترین مثالیں رُوم کے پاپاؤں اور مشرقی دُنیا کے گدّی نشینوں نے پیش کی ہیں۔

یہ تو اس جاہلیت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ ہے۔ مگر انبیاء علیہم السّلام کی اُمتوں میں جب یہ گُھس جاتی ہے تو کچھ اور ہی گُل کھلاتی ہے۔ خُدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ یہ دُنیا کو دارالعمل، دارالامتحان اور مَزرَعَۃُ الآخِرۃ کے بجائے دارُالعذاب اور "مایا کے جال" کی حیثیت سے آدمی کے سامنے پیش کرتی ہے۔ نقطۂ نظر کے اس بنیادی تغیّر کی وجہ سے آدمی یہ حقیقت بھُول جاتا ہے کہ وُہ اِس دُنیا میں، خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ مَیں یہاں کام کرنے اور دُنیا کے معاملات کو چلانے نہیں آیا ہُوں، بلکہ گندگی و نجاست میں پھینکا گیا ہُوں جس سے مجھے بچنا اور دُور بھاگنا چاہیے۔ میرے لیے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ مَیں یہاں نان کوآپریٹر (Non-Co-operator) کی طرح رہوں اور ذمّہ داریوں کو قبُول کرنے کے بجائے ان سے کنارہ کروں۔ اِس تصویر کے ساتھ آدمی دُنیا اور اس کے معاملات پر سہمی ہوئی نگاہ ڈالنے لگتا ہے اور بارِ خلافت کو سنبھالنا تو درکنار، بارِ تمدّن کو اپنے سر لیتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اس کے لیے پُورا نظامِ شریعت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبادات اور اوامر و نواہی کا یہ مفہوم بالکل ساقط ہو جاتا ہے کہ یہ حیاتِ دُنیا کی اِصلاح اور فرائضِ خلافت کی انجام دہی کے لیے تیار کرنے والی چیزیں ہیں۔ برعکس اس کے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ عبادات اور چند خاص مذہبی اعمال اِس گناہِ زندگی کا کفارہ ہیں۔ انہی کو پُورے انہماک سے ٹھیک ناپ تول کے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیے تاکہ آخرت میں نجات حاصل ہو۔

اِس ذہنیت نے انبیاء کی اُمتوں میں سے ایک گروہ کو مُراقبہ و مُکاشفہ، چِلّہ کشی و ریاضت، اَوراد و وظائف، اَحزاب و اعمال، سَیرِ مقامات اور حقیقت کی فلسفیانہ تعبیروں[1] کے چکّر میں ڈال دیا اور مُستحبّات و نوافل کے اِلتزام

[1] مثلاً وحدۃ الوجود

میں فرائض سے بھی زیادہ منہمک کر کے خلافتِ الٰہیّہ کے اِس کام سے غافل کر دیا جس کو جاری کرنے کے لیے انبیاء علیہم السّلام آئے تھے۔ اور دوسرے گروہ میں تقشّف، تعمّق فی الدّین، غلوّ، مُو شگافی، چھوٹی چھوٹی چیزوں کی ناپ تول اور جزئیات کے ساتھ غیر معمولی اہتمام کی بیماری پیدا کر دی، حتّٰی کہ ان کے لیے خدا کا دین ایک ایسا نازک آبگینہ ہو گیا جو ذرا ذرا سی باتوں سے ٹھیس کھا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ان بے چاروں کا سارا وقت بس اسی دیکھ بھال کی نذر ہونے لگا کہ کہیں کچھ اُونچ نیچ نہ ہو جائے اور یہ شیشے کا برتن جو سر پر رکھا ہے کھیل کھیل ہو کر نہ رہ جائے۔ دین میں اتنی باریکیاں نکل آنے کے بعد ناگزیر ہے کہ جمود، تنگ خیالی اور کم حوصلگی پیدا ہو۔ ایسے لوگوں میں کہاں یہ قابلیت باقی رہ سکتی ہے کہ نگاہِ جہاں بیں سے انسانی زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر نظر ڈالیں، دین کے عالمگیر اُصول و کلّیات پر گرفت حاصل کریں اور زمانہ کی ہر نئی گردش میں دُنیا کی امامت و رہ نُمائی کے لیے مستعد ہوں۔

۴۔ اِسلام

چوتھا مابعد الطبیعی نظریّہ وہ ہے جسے انبیاء علیہم السّلام نے پیش کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

یہ سارا عالمِ ہست و بُود جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہُوا ہے اور جس کا ایک جزء ہم خود ہیں، دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے، اُسی نے اس کو بنایا، پھر وہی اس کا مالک ہے اور وہی اس کا واحد حاکم ہے۔ اس سلطنت میں کسی کا حکم نہیں چلتا، سب کے سب تابع فرمان ہیں اور اختیارات بالکلّیہ اسی ایک مالک و فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں۔

انسان اِس مملکت میں پیدائشی رعیّت ہے، یعنی رعیّت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ یہ رعیّت ہی پیدا ہُوا ہے اور رعیّت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان میں نہیں ہے۔

اِس نظامِ حکومت کے اندر انسان کی خود مختاری و غیر ذمّہ داری کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرۃً ہو سکتی ہے۔ پیدائشی رعیّت اور ایک جُزوِ مملکت ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ جس طرح مملکت کے تمام اجزاء بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ خود اپنے لیے طریقِ زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کر لینے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اس کی پیروی کرے۔ اُس ہدایت کے آنے کا ذریعہ وحی ہے، اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں۔

مگر انسان کی آزمائش کے لیے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھُپ گیا اور اپنی سلطنت کا وہ پُورا اندرونی انتظام بھی چھُپا دیا، جس سے وہ تدبیرِ امر کرتا ہے۔ ظاہر میں سلطنت اِس طرح چل رہی ہے کہ نہ اس کا کوئی حاکم نظر آتا ہے نہ کار پرداز دکھائی دیتے ہیں۔ انسان صرف ایک کارخانہ چلتا ہُوا دیکھتا ہے، اُس کے درمیان اپنے آپ کو موجود پاتا ہے، اور ظاہری حواس سے کبھی یہ محسوس نہیں کرتا کہ مَیں کسی کا محکوم ہوں اور کسی کو مجھے

حساب دینا ہے۔ اعیان و شہود میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ اس پر فرمانروائے عالم کی حاکمیت اور اپنی محکومیت و مسئولیت (Responsibility) کا حال غیر مشتبہ طور پر کھل جائے، یہاں تک کہ اُسے ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ نبی بھی آتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ ان کے اوپر عیاناً وحی اُترتی دکھائی دے یا کوئی ایسی صریح علامت ان کے ساتھ اُترے جس کو دیکھ کر اُن کی نبوت ماننے کے سوا چارہ نہ رہے۔ پھر آدمی ایک حد کے اندر اپنے آپ کو بالکل مختار پاتا ہے۔ بغاوت کرنا چاہے تو اس کی قدرت دے دی جاتی ہے۔ ذرائع بہم پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ اور بڑی لمبی ڈھیل دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ شرارت و عصیان کی آخری حُدود کو پہنچنے تک کوئی رکاوٹ اسے پیش نہیں آتی۔ مالک کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو نہیں روکا جاتا۔ پُوری آزادی دے دی جاتی ہے کہ جس جس کی بندگی، عبادت، اطاعت کرنا چاہے کرے۔ دونوں صورتوں، یعنی بغاوت اور بندگیٔ غیر کی صورتوں میں رزق برابر ملے جاتا ہے، سامانِ زندگی، وسائلِ کار، اسبابِ عیش حسبِ حیثیت خوب دیتے جاتے ہیں، اور مرتے دم تک دیتے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی باغی یا کسی بندۂ غیر سے محض اِس جُرم کی پاداش میں اسبابِ دُنیا روک لیے جائیں۔ یہ سارا طرزِ کارروائی صرف اس لیے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل، تمیز، استدلال، ارادہ و اختیار کی جو قوتیں دی ہیں، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو ایک طرح کے حاکمانہ تصرُّف کی جو قدرت بخشی ہے، اس میں وہ اس کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ اسی آزمائش کی تکمیل کے لیے حقیقت پر غیب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے تاکہ انسان کی عقل کا امتحان ہو۔ انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہے تاکہ اس امر کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے اس کی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کر کے اِس سے مُنہ موڑ جاتا ہے۔ اسبابِ زندگی کا سرمایہ، وسائل اور کام کا موقع نہ دیا جائے تو اس کی لیاقت و عدمِ لیاقت کا امتحان نہیں ہو سکتا۔

یہ دُنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مُہلت ہے اس لیے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عملِ نیک کا انعام نہیں بلکہ امتحان کا سامان ہے، اور جو تکالیف، مصائب، شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی عملِ بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اُسی قانونِ طبعی کے تحت، جس پر اِس دُنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے، آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں۔ اعمال کے اصلی حساب، جانچ پڑتال اور فیصلے کا وقت مُہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد ہے، اور اُسی کا نام آخرت ہے۔ لہٰذا دُنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد

؎ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اِس دُنیا میں قانونِ مکافات سرے سے کارفرما ہی نہیں بلکہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہاں کی مکافات دوٹوک اور حتمی اور صریح نہیں ہے اور آزمائش کا عنصر ہر دُنیوی جزا اور سزا پر غالب ہے۔ اس لیے یہاں اعمال کے جو نتائج ظاہر ہوتے ہیں ان کو اخلاقی حسن و قبح کا معیار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ (مؤلف)

اور قابلِ اخذ یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقہ اور کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا بُرا ہو گا، صرف اُس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوتی ہے۔ جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر، فیصلہ کُن بات جس پر آخرت کی فلاح یا خُسران کا مدار ہے یہ ہے کہ اوّلاً انسان اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکمِ حقیقی ہونے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے مِن جانبِ اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں۔ ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد وہ آزادیٔ انتخاب رکھنے کے باوجود اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے امرِ شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتدا سے انبیاء علیہم السّلام پیش کرتے آئے ہیں۔ اِس نظریہ کی بنیاد پر تمام واقعاتِ عالم کی مکمّل توجیہہ (Explanation) ہوتی ہے۔ کائنات کے تمام آثار (Phenomena) کی پُوری تعبیر ملتی ہے۔ اور کسی مشاہدے یا تجربے سے یہ نظریہ ٹوٹتا نہیں۔ یہ ایک مستقل نظامِ فلسفہ پیدا کرتا ہے جو جاہلیّت کے فلسفوں سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ کائنات اور خود وجودِ انسانی کے متعلق معلومات کے پُورے ذخیرہ کو ایک دوسرے ڈھنگ پر مرتب کرتا ہے جس کی ترتیب جاہلی عُلوم کی ترتیب سے سراسر متباین ہوتی ہے۔ ادب اور ہُنر (Art and Literature) کے نشو و نما کا ایک الگ راستہ بناتا ہے جو جاہلی ادب و ہنر کے تمام راستوں سے متغائر ہوتا ہے۔ زندگی کے جُملہ معاملات میں ایک خاص زاویۂ نظر اور ایک خاص مقصد پیدا کرتا ہے جو جاہلی مقاصد و نقطہائے نظر سے اپنی رُوح اور اپنے جوہر میں کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ اخلاق کا ایک علیٰحدہ نظام بناتا ہے جس کو جاہلی اخلاقیات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ پھر ان علمی و اخلاقی بنیادوں پر جس تہذیب کی عمارت اُٹھتی ہے اُس کی نوعیت تمام جاہلی تہذیبوں کی نوعیّت سے قطعاً مختلف ہوتی ہے، اور اس کو سنبھالنے کے لیے ایک اور ہی طرز کے نظامِ تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے اصول جاہلیّت کے ہر نظامِ تعلیم و تربیت سے کامل تضاد کی نسبت رکھتے ہیں۔ فی الجملہ اس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو رُوح کام کرتی ہے وہ اللہ واحدِ قہّار کی حاکمیت، آخرت کے اعتقاد اور انسان کے محکُوم و ذمّہ دار ہونے کی رُوح ہے۔ بخلاف اس کے ہر جاہلی تہذیب کے پُورے نظام میں انسان کی خود مختاری، بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمّہ داری کی رُوح سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے۔ اِسی لیے انسانیّت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السّلام کی قائم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے، اس کے خد و خال اور رنگ و روغن جاہلی تہذیب کے بناتے ہوئے نمونہ سے ہر جزء اور ہر پہلو میں جُدا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد تمدّن کی تفصیلی صورت جو اس بُنیاد پر مبنی ہے اس کا سارا نقشہ دُنیا کے دوسرے نقشوں سے

بدلا ہُوا ہوتا ہے ۔طہارت، لباس، خوراک، طرزِ زندگی، آداب و اطوار، شخصی کردار، کسبِ معاش، صرفِ دولت، ازدواجی زندگی، خاندانی زندگی، معاشرتی رسُوم، مجلسی طریقے، انسان اور انسان کے تعلق کی مختلف شکلیں، لین دین کے معاملات، دولت کی تقسیم، مملکت کا انتظام، حکومت کی تشکیل، امیر کی حیثیت، شورٰی کا طریقہ، سول سروس کی تنظیم، قانون کے اصُول، تفصیلی ضوابط کا اصُول سے استنباط، عدالت، پولیس، احتساب، مالگذاری، فینانس، اُمورِ نافعہ (Public Works)، صنعت و تجارت، خبر رسانی، تعلیمات اور دوسرے تمام محکموں کی پالیسی، فوج کی تربیت و تنظیم، جنگ و صلح کے معاملات، بین الاقوامی تعلقات اور خارجی سیاست، غرض انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدّن کا طور وطریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے اور ہر ہر جُز میں ایک واضح خطِ امتیاز اس کو دوسرے تمدّنوں سے الگ کرتا ہے ۔اِس کی ہر چیز میں اوّل سے آخر تک ایک خاص نقطۂ نظر، ایک خاص مقصد اور ایک خاص اخلاقی رویّہ کارفرما ہوتا ہے جس کا براہِ راست تعلق خدائے واحد کی حاکمیتِ مُطلقہ اور انسان کی محکومیّت و مسئولیّت اور دُنیا کے بجائے آخرت کی مقصودیّت سے جُڑا ہُوا ہوتا ہے۔

انبیار کا مشن

اِسی تہذیب و تمدّن کو دُنیا میں قائم کرنے کے لیے انبیاء علیہم السّلام پے درپے بھیجے گئے تھے ۔

رُہبانی تہذیب کو مُستثنیٰ کر کے ہر وہ تہذیب جو دُنیا کی زندگی کے متعلق ایک جامع نظریہ اور کاروبارِ دُنیا کو چلانے کے لیے ایک ہمہ گیر طریقہ رکھتی ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ جاہلیّت کی تہذیب ہو یا اسلام کی، طبعاً اِس بات کی طالب ہوتی ہے کہ حاکمانہ اختیارات پر قبضہ کرے، زِمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے، اور زندگی کا نقشہ اپنے طرز پر بنائے ۔حکومت کے بغیر کسی ضابطہ و نظریہ کو پیش کرنا یا اس کا معتقد ہونا محض بے معنیٰ ہے ۔راہب تو دُنیا کے معاملات کو چلانا ہی نہیں چاہتا، بلکہ ایک خاص قسم کے "سلوک" سے اپنی خیالی نجات کی منزل تک دُنیا کے باہر ہی باہر پہنچ جانے کی فکر میں لگا رہتا ہے اس لیے نہ اس کو حکومت کی حاجت نہ طلب ۔مگر جو دُنیا کے معاملات ہی کو چلانے کا ایک خاص ڈھنگ لے کر اُٹھے اور اسی ڈھنگ کی پیروی میں انسان کی فلاح و نجات کا معتقد ہو، اس کے لیے تو بجُز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ اقتدار کی کُنجیوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے ۔کیونکہ جب تک وہ اپنے نقشے پر عملدرآمد کرنے کی طاقت حاصل نہ کرلے، اس کا نقشہ واقعات کی دُنیا میں قائم نہیں ہوسکتا، بلکہ کاغذ پر اور ذہنوں میں بھی زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔جس تہذیب کے ہاتھ میں زِمامِ کار ہوتی ہے دُنیا کا سارا کاروبار اسی کے نقشہ پر چلتا ہے ۔وہی علوم و افکار اور تہذیب و آداب کی رہ نمائی کرتی ہے ۔وہی اَخلاق کے سانچے بناتی ہے ۔وہی تعلیم و تربیتِ عامّہ کا انتظام کرتی ہے ۔اُسی کے قوانین پر سارا انتظامِ تمدّن مبنی ہوتا ہے ۔اور اُسی کی پالیسی ہر شعبۂ زندگی میں کارفرما ہوتی ہے ۔اِس طرح زندگی میں کہیں بھی اُس تہذیب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی جو اپنی حکومت نہ رکھتی ہو۔یہاں تک کہ جب ایک طویل مدّت تک حکمران تہذیب

کا دَور دَورہ رہتا ہے تو غیر حکمران تہذیب عمل کی دُنیا میں خارج از بحث ہو جاتی ہے۔ اُس کی طرف ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھنے والوں کو بھی اس امر میں شُبہ ہو جاتا ہے کہ یہ طریقہ دُنیا کی زندگی میں چل سکتا ہے یا نہیں۔ اُس کے نام نہاد عَلَم بردار اور اس کی لیڈر شپ کے بزعمِ خود وارثین تک تہذیبِ مخالف سے مدارات (Compromise) اور آدھے پونے کا مشترک معاملہ کرنے پر اُتر آتے ہیں۔ حالانکہ حکمرانی میں دو بالکل مختلف الاصول تہذیبوں کے درمیان مُقاسمت ومُصالحت قطعی غیر ممکن العمل چیز ہے۔ اور انسانی تمدّن اِس شرک کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بٹائی کو ممکن العمل خیال کرنا عقل کی کمی پر دلالت کرتا ہے، اور اُس کے لیے راضی ہو جانا ایمان اور ہمّت کی کمی پر۔

پس دُنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ قائم کر کے اُس پُورے نظامِ زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے[1]۔ وہ اہلِ جاہلیت کو یہ حق تو دینے کے لیے تیار تھے کہ اگر چاہیں تو اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں اور جس حد کے اندر اُن کے عمل کا اثر اُنہی کی ذات تک محدُود رہتا ہے اس میں اپنے جاہلی طریقوں پر چلتے رہیں۔ مگر وہ اُنہیں یہ حق دینے کے لیے تیار نہ تھے، اور فطرۃً نہ دے سکتے تھے، کہ اقتدار کی کُنجیاں اُن کے ہاتھ میں رہیں اور وُہ انسانی زندگی کے معاملات کو طاقت کے زور سے جاہلیّت کے قوانین پر چلائیں۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ بعض کی مساعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں، جیسے حضرت ابراہیمؑ۔ بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کر دی مگر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی ان کا کام ختم ہو گیا، جیسے حضرت مسیحؑ۔ اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا، جیسے حضرت یُوسفؑ، حضرت مُوسیٰؑ، اور سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم[1][2]۔

---

[1] موجودہ زمانے میں بعض دیندار بزرگوں کی زبان سے یہ فقرہ اکثر سُننے میں آتا ہے کہ حکومت مقصود نہیں بلکہ موعود ہے۔ یہ بات جو حضرات فرماتے ہیں ان کے ذہن میں دراصل حکومت کے محض ایک انعام ہونے کا تصور ہے، اُس کے ڈیوٹی اور حکومت ہونے کا تصور نہیں ہے۔ اور نہیں جانتے کہ دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے جس حکومت کی ضرورت ہے اس کا قیام خدا کی شریعت میں مطلوب ومقصود ہے اور اس کے لیے جہاد کرنا فرض ہے۔

فصل ۴

دین کا قرآنی تصوّر

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (الشوریٰ - آیت ۱۳)

"اُس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا۔ اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اِس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔"

اِس آیت میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی نئے مذہب کے بانی نہیں ہیں۔ نہ انبیاء میں سے کوئی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی گزرا ہے۔ بلکہ اللہ کی طرف سے ایک ہی دین ہے جسے شروع سے تمام انبیاء پیش کرتے چلے آ رہے ہیں اور اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کر رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کا نام لیا گیا ہے جو طوفان کے بعد موجودہ نسلِ انسانی کے اوّلین پیغمبر تھے۔ اُس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے جو آخری نبی ہیں۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کا نام دیا گیا ہے جنہیں اہلِ عرب اپنا پیشوا مانتے تھے۔ اور آخر میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کیا گیا ہے، جن کی طرف یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کو منسوب کرتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ اِنہی پانچ انبیاء کو اس دین کی ہدایت کی گئی تھی۔ بلکہ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ دُنیا میں جتنے انبیاء بھی آئے ہیں، سب ایک ہی دین لے کر آئے ہیں اور نمونے کے طور پر اُن پانچ جلیل القدر انبیاء کا نام لے دیا گیا ہے جن سے دُنیا کو معرُوف ترین آسمانی شریعتیں ملی ہیں۔

یہ آیت چونکہ دین اور اس کے مقصود پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اِس پر پُوری طرح غور کر کے اِسے سمجھا جائے۔

لُغوی تحقیق

کلامِ عرب میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

(۱) غلبہ و اقتدار، حکمرانی و فرمانروائی، دوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اُس پر اپنی قوتِ قاہرہ استعمال کرنا، اُس کو اپنا غلام اور تابعِ اَمر بنانا، (Sovereignty) مثلاً کہتے ہیں دَانَ النَّاسَ : ای قھّرھم علی الطاعۃ (یعنی لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا)۔

دِنْتُھم فدانوا، ای قھرتھم فاطاعوا (یعنی مَیں نے ان کو مغلوب کیا اور وہ مُطیع ہوگئے)۔ دِنْتُ القومَ ای اَذْلَلْتُھم وَاسْتَعْبَدْتُہم (مَیں نے اُس قوم کو مُسخّر کرلیا اور غلام بنالیا)۔ دان الرجلُ اذا عزّ (فلاں شخص عزّت اور طاقت والا ہوگیا)۔ دِنْتُ الرجلَ، حملتُہٗ علی ما یکرہ (مَیں نے اس کو ایسے کام پر مجبور کیا جس کے لیے وہ راضی نہ تھا)۔ دُیِنَ فلان، اذا حمل علی مکروہ (فلاں شخص اس کام کے لیے بزور مجبور کیا گیا)۔ دنتہٗ سُسْتُہٗ وملکتہٗ (یعنی مَیں نے اس پر حکم چلایا اور فرمانروائی کی)۔ دَیَّنْتُہُ القومَ، وَلَّیْتُہٗ سیاستھم (یعنی مَیں نے قوم کی سیاست و حکمرانی فلاں شخص کو دی۔ اسی معنی میں حُطیئہ اپنی ماں کو خطاب کرکے کہتا ہے:

لَقَدْ دُیِّنْتِ اَمْرَ بَنِیْكِ حَتّٰی ... تَرَكْتِھِمْ اَدَقَّ مِنَ الطَّحِیْنِ

(تو اپنے بچوں کے حالات کی نگراں بنائی گئی تھی ... آخرکار تو نے انہیں آٹے سے بھی زیادہ باریک کرکے چھوڑا)

حدیث میں آتا ہے الکیّس من دَانَ نفسہٗ وعمل لما بعد الموت (یعنی عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مغلوب کرلیا اور وہ کام کیا جو اس کی آخرت کے لیے نافع ہو)۔ اسی معنی کے لحاظ سے دَیّان اس کو کہتے ہیں جو کسی مُلک یا قوم یا قبیلہ پر غالب و قاہر ہو اور اس پر فرمانروائی کرے۔ چنانچہ اعشیٰ الحرمازی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو خطاب کرکے کہتا ہے یا سیّد الناس و دیّان العرب ۔ اور اسی لحاظ سے مَدِین کے معنی غلام اور مَدِینۃ کے معنی لونڈی، اور ابنِ مَدِینہ کے معنی لونڈی زادہ کے آتے ہیں، جیسے اخطل کہتا ہے ربت وربانی حجرھا ابن مدینۃ ۔ اور قرآن میں ہے فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ یعنی "اگر تم کسی کے مملوک، تابع، ماتحت نہیں ہو تو مرنے والے کو موت سے بچا کیوں نہیں لیتے؟ جان کو واپس کیوں نہیں پلٹا لاتے؟"

(۲) اطاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لیے مسخّر ہو جانا، کسی کے تحتِ اَمر ہونا، کسی کے غلبہ و قہر سے دب کر اس کے مقابلہ میں ذلت قبول کرلینا۔ چنانچہ کہتے ہیں دنتھم فدانوا ای قھرتھم فاطاعوا (یعنی مَیں نے ان کو مغلوب کرلیا اور وہ لوگ مطیع ہوگئے)۔ دنتُ الرَّجُلَ ای خدمتہ (یعنی مَیں نے فلاں شخص کی خدمت کی)۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اُرید من قُریش کلمۃ تَدِین بھم بھا العربُ، ای تطیعھم وتخضع لھم یعنی "مَیں قریش کو ایک ایسے کلمہ کا پیرو بنانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اسے مان لیں تو تمام عرب ان کا تابع فرمان بن جائے اور اُن کے آگے جُھک جائے۔" اسی معنی کے لحاظ سے اطاعت شعار قوم کو قومِ دِین کہتے ہیں۔ اور اسی معنی میں دِین کا لفظ حدیثِ خوارج میں استعمال کیا گیا ہے، یمرقون من الدّین مروق السھم

من الوصیۃ[1]۔

(۳) شریعت، قانون، طریقہ، کیش و ملّت، رسم و عادت۔ مثلاً کہتے ہیں ما زال ذالک دینی و دَیدَنِی، یعنی "یہ ہمیشہ سے میرا طریقہ رہا ہے۔" یقال دان اذا اعتاد خیراً او شرًّا۔ یعنی "آدمی خواہ بُرے طریقہ کا پابند ہو یا بھلے طریقہ کا، دونوں صورتوں میں اُس طریقہ کو جس کا وہ پابند ہے دین کہیں گے۔" حدیث میں ہے کانت قریش ومن دان بدینہم "قریش اور وہ لوگ جو ان کے مسلک کے پیرو تھے" اور حدیث میں ہے انہ علیہ السلام کان علیٰ دین قومہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے اپنی قوم کے دین پر تھے۔" یعنی نکاح، طلاق، میراث، اور دوسرے تمدنی و معاشرتی امور میں انہی قاعدوں اور ضابطوں کے پابند تھے جو آپ کی قوم میں رائج تھے۔

(۴) جزاء عمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ۔ چنانچہ عربی میں مثل ہے کما تَدِینُ تُدَانُ۔ یعنی "جیسا تو کرے گا ویسا بھرے گا۔" قرآن میں کفار کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہے اَءِنَّا لَمَدِینُونَ؟ "کیا مرنے کے بعد ہم سے حساب لیا جانے والا ہے؟ اور ہمیں بدلہ ملنے والا ہے؟ عبد اللہ بن عمرؓ کی حدیث میں آتا ہے لا تسبّوا السلطان فان کان لابُدَّ فقولوا اللّٰھم دِنْھم کما یَدِینُون "اپنے حکمرانوں کو بُرا نہ کہو اور کہنا ناگزیر ہو تو یوں کہو خدایا جیسا یہ ہمارے ساتھ کر رہے ہیں ایسا ہی تو اُن کے ساتھ کر۔" اسی معنی میں دیّان بمعنی قاضی و حاکمِ عدالت آتا ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ سے جب حضرت علیؓ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کان دیّان ھٰذہ الامۃ بعد نبیّہا۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اِس اُمت کے سب سے بڑے قاضی تھے۔"

جامع اصطلاح

انہی تصوّرات میں سے کبھی ایک کے لیے اور کبھی دوسرے کے لیے اہلِ عرب مختلف طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔ مگر چونکہ اِن چاروں اُمور کے متعلق عرب کے تصوّرات پوری طرح صاف نہ تھے اور کچھ بہت

---

[1] اِس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خوارج دین بمعنی ملّت سے نکل جائیں گے۔ کیونکہ حضرت علیؓ سے جب ان کے متعلق پوچھا گیا اکفار ھم؟ "کیا یہ لوگ کافر ہیں؟" تو آپؓ نے فرمایا، من الکفر فرّوا۔ "کفر ہی سے تو وہ بھاگے ہیں۔" پھر پوچھا گیا افمنافقون ھم؟ "کیا یہ منافق ہیں؟" آپؓ نے فرمایا "منافق تو خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں اور ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ شب و روز اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اِسی بنا پر یہ متعیّن ہوتا ہے کہ اِس حدیث میں دین سے مُراد اطاعتِ امیر ہے۔ چنانچہ ابنِ اثیر نے نہایہ میں اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ اراد بالدین الطاعۃ ای انہم یخرجون من طاعۃ الامام المفترض الطاعۃ وینسلخون منہا۔ یعنی حضرت علیؓ کا مطلب یہ تھا کہ وہ دین، یعنی اس امام کی اطاعت سے نکل جائیں گے جس کی اطاعت فرض ہے۔ (جلد ۲۔ ص ۱۴۱-۱۴۲)

زیادہ بلند بھی نہ تھے، اِس لیے اِس لفظ کے استعمال میں ابہام پایا جاتا تھا اور یہ کسی باقاعدہ نظامِ فکر کا اصطلاحی لفظ نہ بن سکا۔ قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے لیے مناسب پاکر بالکل واضح اور متعین مفہومات کے لیے استعمال کیا اور اس کو اپنی مخصوص اصطلاح بنا لیا۔ قرآنی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے۔

قرآنی مفہومات کے لحاظ سے دین کے معنی اُس طرزِ عمل اور اُس رویے کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے۔ اور دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اُسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے۔ اُسی کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی، اور انعام کا اُمیدوار ہو۔ اور اُس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اِس پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن ابھی اس کو "دین" کے پورے معنوی حدُود پر حاوی ہونے کے لیے مزید وسعت درکار ہے۔

ایک مُغالطہ

بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیاء علیہم السّلام کے درمیان مشترک ہے اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے، لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔ اس لیے انہوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ لامحالہ اس دین سے مُراد شرعی احکام و ضوابط نہیں ہیں۔ بلکہ صرف توحید و آخرت اور کتاب و نبوّت کا ماننا اور اللہ کی عبادت بجا لانا ہے، یا حد سے حد اُس میں وہ موٹے موٹے اخلاقی اصُول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں مشترک رہے ہیں۔ لیکن یہ ایک بڑی سطحی رائے ہے جو سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کر لی گئی ہے۔ اور یہ ایسی خطرناک رائے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کر دی جائے تو آگے بڑھ کر بات دین و شریعت کی اُس تفریق تک جا پہنچے گی جس میں مبتلا ہو کر سینٹ پال نے دین بلا شریعت کا نظریہ پیش کیا اور سیدنا مسیح علیہ السّلام کی اُمت کو خراب کر دیا۔ اِس لیے کہ جب شریعت دین سے الگ ایک چیز ہے، اور حکم صرف دین کو قائم کرنے کا ہے نہ کہ شریعت کو، تو لامحالہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح شریعت کو غیر اہم اور اس کی اقامت کو غیر مقصود بالذات سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے اور صرف ایمانیات اور موٹے موٹے اخلاقی اصُولوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے۔ اس طرح کے قیاسات سے دین کا مفہوم متعین کرنے کے بجائے آخر کیوں نہ ہم خود اللہ کی کتاب سے پوچھ لیں کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم یہاں دیا گیا ہے آیا اس سے مراد صرف ایمانیات اور چند بڑے بڑے اخلاقی اصول ہی ہیں، یا شرعی احکام بھی؟ قرآن مجید کا جب ہم تتبع کرتے ہیں تو اس میں جن چیزوں کو دین میں شمار کیا گیا ہے ان میں حسبِ ذیل چیزیں بھی ہمیں ملتی ہیں:

(۱) وَمَآ اُمِرُوۡٓا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ حُنَفَآءَ وَیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ۔
(البیّنہ: آیت ۵)

"اور اُن کو حکم نہیں دیا گیا مگر اس بات کا کہ یکسو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی راست رو ملت کا دین ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ اس دین میں شامل ہیں۔ حالانکہ اِن دونوں کے احکام مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام پچھلی شریعتوں میں نماز کی یہی شکل و ہیئت، یہی اس کے اجزاء، یہی اُس کی رکعتیں، یہی اس کا قبلہ، یہی اس کے اوقات اور یہی اُس کے دوسرے احکام رہے ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ تمام شریعتوں میں یہی اس کا نصاب، یہی اس کی شرحیں، اور یہی اس کی تحصیل اور تقسیم کے احکام رہے ہیں۔ لیکن اختلافِ شرائع کے باوجود اللہ تعالیٰ ان دونوں چیزوں کو دین میں شمار کر رہا ہے۔

(۲) حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِیۡرِ وَمَآ اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ وَالۡمُنۡخَنِقَۃُ وَالۡمَوۡقُوۡذَۃُ وَالۡمُتَرَدِّیَۃُ وَالنَّطِیۡحَۃُ وَمَآ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیۡتُمۡ ۟ وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ ؕ ذٰلِکُمۡ فِسۡقٌ ؕ اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِکُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡہُمۡ وَاخۡشَوۡنِ ؕ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا۔
(المائدہ ـ ۳)

"تمہارے لیے حرام کیا گیا مُردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ اور وہ جو گلا گھُٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو۔ یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اُس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔ اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو نیز یہ بھی تمہارے لیے حرام کیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب کام فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے۔ لہٰذا تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کیا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکامِ شریعت بھی دین ہی ہیں۔

(۳) قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ وَلَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ
(التوبہ، ۲۹)

"جنگ کرو اُن لوگوں سے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اُس کے رسول نے حرام کیا ہے اُسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔"

معلوم ہوا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ حلال و حرام کے اُن احکام کو ماننا اور اُن کی پابندی کرنا بھی دین ہے جو اللہ اور اُس کے رسُولؐ نے دیتے ہیں۔

(۴) اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (النُّور: ۲)	"زانیہ عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔"

معلوم ہوا کہ فوجداری قانون بھی دین ہی ہے۔

یہ تو وہ چار نمونے ہیں جن میں شریعت کے احکام کو بالفاظِ صریح دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے جہنّم کی دھمکی ہے (مثلاً زنا، سُود خواری، قتلِ مؤمن، یتیم کا مال کھانا، باطل طریقوں سے لوگوں کے مال لینا، وغیرہ)، اور جن جرائم کو خدا کے عذاب کا مُوجب قرار دیا گیا ہے، (مثلاً عملِ قومِ لُوطؑ اور لین دین میں قومِ شعیبؑ کا سا رویہ)، ان کا شمار بھی لازماً دین میں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر دین جہنّم اور عذابِ الٰہی سے بچانے کے لیے نہیں آیا ہے تو اور کس چیز کے لیے آیا ہے؟ اسی طرح وہ احکامِ شریعت بھی دین ہی کا حصّہ ہونے چاہییں جن کی خلاف ورزی کو خلُود فی النّار کا موجب قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً میراث کے احکام، جن کو بیان کرنے کے بعد آخر میں ارشاد ہوا ہے:-

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا وَلَہٗ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ۔ (النساء: ۱۴)	"جو اللہ اور اس کے رسُول کی نافرمانی اور اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا اللہ اس کو دوزخ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اُس کے لیے رُسوا کُن عذاب ہے۔"

اسی طرح جن چیزوں کی حُرمت کا فیصلہ کیا گیا ہے، مثلاً جُوئے کی حُرمت، جھوٹی شہادت کی حُرمت، ان کی تحریم کو اگر اقامتِ دین میں شامل نہ کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر ضروری احکام بھی دے دیئے ہیں جن کا اِجراء مقصود نہیں ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً روزہ اور حج، اُن کی اقامت کو بھی محض اِس بہانے اقامتِ دین سے خارج نہیں کیا جا سکتا کہ رمضان کے ۳۰ روزے تو پچھلی شریعتوں میں نہ تھے، اور کعبے کا حج تو اُس شریعت میں تھا جو اولادِ ابراہیمؑ کی اسماعیلی شاخ کو ملی تھی۔

قانونِ مُلکی اور دین

Law of the Land سورۂ یُوسفؑ کی آیت مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ میں قانونِ ملکی (

کے لیے لفظ "دین" استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے معنیٔ دین کی وسعت پوری طرح واضح کر دی ہے۔ اس سے ان لوگوں کے تصوّرِ دین کی جڑ کٹ جاتی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو صرف عام مذہبی معنوں میں خدائے واحد کی پُوجا کرانے اور محض چند مذہبی مراسم و عقائد کی پابندی کرا لینے تک محدود سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ انسانی تمدّن، سیاست، معیشت، عدالت، قانون اور ایسے ہی دوسرے دُنیوی امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں ہے، یا اگر ہے بھی تو ان اُمور کے بارے میں دین کی ہدایات محض اختیاری سفارشات ہیں جن پر اگر عمل ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے اصُول و ضوابط قبُول کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سراسر گمراہانہ تصوّرِ دین، جس کا ایک مدّت سے مُسلمانوں میں چرچا ہے، جو بہت بڑی حد تک مسلمانوں کو اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی سعی سے غافل کرنے کا ذمہ دار رہا ہے، جس کی بدولت مسلمان کفر و جاہلیت کے نظامِ زندگی پر نہ صرف راضی ہو جائے بلکہ ایک نبی کی سُنّت سمجھ کر اس نظام کے پُرزے بننے اور اس کو خود چلانے کے لیے بھی آمادہ ہو گئے، اس آیت کی رُو سے قطعاً غلط ثابت ہوتا ہے جس میں فوجداری قانون کو دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ صاف بتا رہا ہے کہ جس طرح نماز، روزہ اور حج دین ہے اسی طرح وہ قانون بھی دین ہے جس پر سوسائٹی کا نظام اور ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ لہٰذا اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ اور وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وغیرہ آیات میں جس دین کی اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے اس سے مُراد صرف نماز، روزہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کا اجتماعی نظام بھی ہے جس سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کی پیروی خدا کے ہاں ہرگز مقبُول نہیں ہو سکتی۔

دراصل ساری غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ سُورۂ مائدہ کی آیت لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْھَاجًا "ہم نے تم میں سے ہر اُمّت کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کر دی" کا اُلٹا مطلب لے کر اسے یہ معنی پہنا دیئے گئے ہیں کہ شریعت چُونکہ ہر اُمّت کے لیے الگ تھی اور حکم صرف اُس دین کے قائم کرنے کا دیا گیا ہے جو تمام انبیاء کے درمیان مشترک تھا، اِس لیے اقامتِ دین کے حکم میں اقامتِ شریعت شامل نہیں ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ سُورۂ مائدہ میں جس مقام پر یہ آیت آئی ہے اس کے پُورے سیاق و سباق کو آیت ۴۱ سے آیت ۵۰ تک اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی اُمّت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اِس اُمّت کے لیے دین تھی، اور اُس کے دَورِ نبوّت میں اسی کی اقامت مطلوب تھی۔ اور اب چونکہ سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کا دَورِ نبوّت ہے اس لیے اُمّتِ محمّدیہ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ اِس دَور کے لیے دین ہے اور اُس کا قائم کرنا ہی دین کا قائم کرنا ہے۔ رہا اِن شریعتوں کا اختلاف تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر

نماز اور روزے کو دیکھیے۔ نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے۔ مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزاء میں بھی فرق تھا۔ اسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا مگر ماہ رمضان کے ۳۰ روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ مطلقاً نماز اور روزہ تو اقامتِ دین میں شامل ہے، مگر ایک خاص طریقے سے نماز پڑھنا اور خاص زمانے میں روزے رکھنا اقامتِ دین سے خارج ہے۔ بلکہ اس سے صحیح طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کی اُمت کے لیے اُس وقت کی شریعت میں نماز اور روزے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے گئے تھے اُنہی کے مطابق اُس زمانے میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا دین قائم کرنا تھا۔ اور اب اقامتِ دین یہ ہے کہ ان عبادتوں کے لیے شریعتِ محمدیہ میں جو طریقہ رکھا گیا ہے ان کے مطابق اِنہیں ادا کیا جائے۔ اِنہی دو مثالوں پر دوسرے تمام احکامِ شریعت کو بھی قیاس کر لیجیے۔

دین اپنا اقتدار چاہتا ہے

قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ اپنے پیرؤوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دینِ حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیے جان لڑا دیں، اور یہ اُن کو انسانی زندگی کی اصلاح کا ایسا پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصے پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کیے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے کہ

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۔ (النساء: ۱۰۵)	(اے نبی) "ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اُس روشنی میں جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔"

اس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے جو احکام دیئے گئے ہیں وہ صریحًا اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت کا تصوّر رکھتے ہیں جو ایک مقرر قاعدے کے مطابق زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمہ لے (التوبہ ۶۰-۱۰۳)۔ اس کتاب میں سُود کو بند کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سُود خواری جاری رکھنے والوں کے خلاف جو اعلانِ جنگ کیا گیا ہے (البقرہ ۲۷۵-۲۷۹) وہ اُسی صورت میں رُوبعمل آسکتا ہے جب ملک کا سیاسی اور معاشی نظام پُوری طرح اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ اِس کتاب میں قاتل سے قصاص لینے کا حکم (البقرہ: ۱۷۸)، چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (المائدہ: ۳۸)، زنا اور قذف پر حد جاری کرنے کا حکم (النور ۲-۴)، اِس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ ان احکام کے ماننے والے لوگوں کو کُفّار کی پولیس اور عدالتوں کے ماتحت رہنا ہو گا۔ اِس کتاب میں کُفار سے قتال کا حکم (البقرہ ۱۹۰-۲۱۶) یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے

کہ اس دین کے پیرو کفر کی حکومت میں فوج بھرتی کر کے اس حکم کی تعمیل کریں گے۔ اِس کتاب میں اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا حکم (التوبہ - ۲۹) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے ان سے جزیہ وصول کریں گے اور ان کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔ اور یہ معاملہ صرف مدنی سُورتوں ہی تک محدُود نہیں ہے۔ مکّی سُورتوں میں بھی دیدۂ بینا کو علانیہ یہ نظر آسکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیش نظر تھا وہ دین کے غلبہ و اقتدار کا تھا نہ کہ کفر کی حکومت کے تحت دین اور اہلِ دین کے ذِمّی بن کر رہنے کا۔

حضورؐ کے کارنامے سے اِستشہاد

سب سے بڑھ کر جس چیز سے تعبیر کی یہ غلطی متصادم ہوتی ہے وہ خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا وہ عظیم الشّان کام ہے جو حضورؐ نے ۲۳ سال کے زمانۂ رسالت میں انجام دیا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ آپؐ نے تبلیغ اور تلوار دونوں سے پُورے عرب کو مُسخّر کیا اور اس میں ایک مکمّل حکومت کا نظام ایک مفصّل شریعت کے ساتھ قائم کر دیا جو اِعتقادات اور عبادات سے لے کر شخصی کردار، اجتماعی اَخلاق، تہذیب و تمدّن، مَعیشت و معاشرت، سیاست و عدالت اور صلح و جنگ تک زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھی؟ اگر حُضورؐ کے اس پُورے کام کو اقامتِ دین کے اُس حکم کی تفسیر نہ مانا جائے جو اِس آیت کے مطابق تمام انبیاء سمیت آپ کو دیا گیا تھا، تو پھر اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو معاذ اللہ حضورؐ پر یہ الزام عاید کیا جائے کہ آپ مامور تو صرف ایمانیات اور اخلاق کے موٹے موٹے اصُولوں کی محض تبلیغ و دعوت پر ہوتے تھے، مگر آپؐ نے اس سے تجاوُز کر کے بطورِ خود ایک حکومت قائم کر دی اور ایک مفصّل قانون بنا ڈالا جو شرائع انبیاء کی قدرِ مشترک سے مختلف بھی تھا اور زائد بھی۔ یا پھر اللہ تعالیٰ پر یہ الزام رکھا جائے کہ وہ سُورۂ شُوریٰ میں مذکورۂ بالا اعلان کر چکنے کے بعد خود اپنی بات سے منحرف ہو گیا اور اُس نے اپنے آخری نبیؐ سے نہ صرف وہ کام لیا جو اس سُورۃ کی اعلان کردہ اقامتِ دین سے بہت کچھ زائد اور مختلف تھا، بلکہ اس کام کی تکمیل پر اپنے پہلے اعلان کے خلاف یہ دوسرا اعلان بھی کر دیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (آج مَیں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمّل کر دیا)۔ اعاذنا اللہ من ذالك۔

دین ایک جامع اصطلاح

قرآن لفظ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اُس سے مُراد ایک ایسا نظامِ زندگی لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کرے، اس کے حُدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرماں برداری پر عزّت، ترقّی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلّت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پُورے مفہوم پر حاوی ہو۔ حسبِ ذیل آیات میں "دین" اِسی اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہُوا ہے:-

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (توبہ۔آیت ۲۹)

"اہل کتاب میں جو لوگ نہ اللہ کو مانتے ہیں (یعنی اس کو واحد مقتدر اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے) ، نہ یوم آخرت (یعنی یوم الحساب اور یوم الجزاء) کو مانتے ہیں اور نہ اُن چیزوں کو حرام مانتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسُول نے حرام قرار دیا ہے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اِس آیت میں "دین حق" اصطلاحی لفظ ہے جس کے مفہوم کی تشریح واضع اصطلاح جل شانہٗ نے پہلے تین فقروں میں خود ہی کر دی ہے۔ ان کے مجموعے ہی کو دین حق سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَ لْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ۔ (المومن۔آیت ۲۶)

"فرعون نے کہا چھوڑو مجھے، مَیں اس مُوسیٰ کو قتل ہی کیے دیتا ہُوں اور اب پکارے یہ اپنے رب کو۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں یہ تمہارا دین نہ بدل دے یا ملک میں فساد نہ کھڑا کر دے۔"

قرآن میں قصّۂ فرعون و مُوسیٰؑ کی جتنی تفصیلات آئی ہیں ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شُبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین مُجرّد "مذہب" کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ ریاست اور نظامِ تمدّن کے معنی میں آیا ہے۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر مُوسیٰؑ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گی۔ جو نظامِ زندگی اس وقت فراعنہ کی حاکمیت اور رائج الوقت قوانین و رسوم کی بنیادوں پر چل رہا ہے وہ جڑ سے اُکھڑ جائے گا، اور اس کی جگہ یا تو دوسرا نظام بالکل دوسری ہی بنیادوں پر قائم ہوگا، یا نہیں تو سرے سے کوئی نظام قائم ہی نہ ہو سکے گا، بلکہ تمام ملک میں بدنظمی پھیل جائے گی۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران۔۱۹)

"اللہ کے نزدیک دین تو دراصل "اسلام" ہے۔"

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران۔۸۵)

"اور جو "اسلام" کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔"

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (التوبہ۔۳۳)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسُول کو صحیح رہنمائی اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو پُوری جنس دین پر غالب کر دے اگرچہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۔ (الانفال - ۳۹)	اور تم اُن سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے"۔
اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (النصر)	"جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہو چکی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اب اپنے رب کی حمد و ثنا اور اس کی تسبیح کرو اور اس سے درگزر کی درخواست کرو وہ بڑا معاف کرنے والا ہے"۔

ان سب آیات میں دین سے پُورا نظامِ زندگی اپنے تمام اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مُراد ہے۔

پہلی دو آیتوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صحیح نظامِ زندگی صرف وہ ہے جو خود اللہ ہی کی اطاعت و بندگی (اسلام) پر مبنی ہو۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نظام جس کی بنیاد کسی دوسرے مفروضہ اقتدار کی اطاعت پر ہو، مالکِ کائنات کے ہاں ہرگز مقبول نہیں اور فطرۃً نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ انسان جس کا مخلوق، مملوک اور پروردہ ہے اور جس کے ملک میں رعیت کی حیثیت سے رہتا ہے، وہ تو کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ انسان خود اس کے سوا کسی دوسرے اقتدار کی بندگی و اطاعت میں زندگی گذارنے اور کسی دوسرے کی ہدایات پر چلنے کا حق رکھتا ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسُول کو اسی صحیح و برحق نظامِ زندگی، یعنی اسلام کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کے مشن کی غایت یہ ہے کہ اس نظام کو تمام دوسرے نظاموں پر غالب کر کے رہے۔

چوتھی آیت میں دین اسلام کے پیروؤں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو اور اُس وقت تک دم نہ لو جب تک فتنہ یعنی اُن نظامات کا وجود دُنیا سے مٹ نہ جائے جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے اور پُورا نظامِ اطاعت و بندگی اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے۔

پانچویں آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس موقع پر خطاب کیا گیا ہے جب کہ ۲۳ سال کی مُسلسل جدوجہد سے عرب میں انقلاب کی تکمیل ہو چکی تھی، اسلام اپنی پُوری تفصیلی صورت میں ایک اعتقادی و فکری، اخلاقی و تعلیمی، تمدّنی و معاشرتی اور معاشی و سیاسی نظام کی حیثیت سے عملاً قائم ہو گیا تھا، اور عرب کے مختلف گوشوں سے وفد پر وفد آکر اِس نظام کے دائرے میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس طرح جب وہ کام تکمیل کو پہنچ گیا جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مامُور کیا گیا تھا، تو آپؐ سے ارشاد ہوتا ہے کہ اس کارنامے کو اپنا کارنامہ سمجھ کر کہیں فخر نہ کرنے لگنا۔ نقص سے پاک بے عیب ذات اور کامل ذات صرف تمہارے رب ہی کی ہے۔ لہٰذا اِس کارِ عظیم کی انجام دہی پر اُس کی تسبیح اور

حمد و ثنا کرو اور اُس ذات سے درخواست کرو کہ مالک، اس ۲۳ سال کے زمانۂ خدمت میں اپنے فرائض ادا کرنے میں جو خامیاں اور کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہو گئی ہوں انہیں معاف فرما دے[۱۴۴]

باب ۹

مُعجزات

فصل ۱

مسئلۂ مُعجزات

پیغمبروں نے جب کبھی اپنے آپ کو فرستادۂ ربُّ العٰلمین کی حیثیت سے پیش کیا تو لوگوں نے اُن سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی ربُّ العٰلمین کے نمائندے ہو تو تمہارے ہاتھوں سے کوئی ایسا واقعہ ظہور میں آنا چاہیے جو قوانینِ فطرت کی عام روش سے ہٹا ہوا ہو اور جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہو کہ ربُّ العٰلمین نے تمہاری صداقت ثابت کرنے کے لیے اپنی براہِ راست مداخلت سے یہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے۔ اِس مطالبہ کے جواب میں انبیاء علیہم السّلام نے وہ نشانیاں دکھائی ہیں جن کو قرآن کی اصطلاح میں "آیات" اور متکلّمین کی اصطلاح میں "مُعجزات" کہا جاتا ہے۔

مُنکرینِ مُعجزات کی اُلجھن

ایسے نشانات یا مُعجزات کو جو لوگ قوانینِ فطرت کے تحت صادر ہونے والے عام واقعات قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ درحقیقت کتاب کو ماننے اور نہ ماننے کے درمیان ایک ایسا موقف اختیار کرتے ہیں جو کسی طرح معقول نہیں سمجھا سکتا۔ اس لیے کہ قرآن جس جگہ صریح طور پر خارقِ عادت واقعہ کا ذکر کر رہا ہو وہاں اسے سیاق و سباق کے بالکل خلاف ایک عادی واقعہ بنانے کی کوشش محض ایک بھونڈی سخن سازی ہے جس کی ضرورت صرف اُن لوگوں کو پیش آتی ہے جو ایک طرف تو کسی ایسی کتاب پر ایمان نہیں لانا چاہتے جو خارقِ عادت واقعات کا ذکر کرتی ہو، اور دوسری طرف آبائی مذہب کے پیدائشی معتقد ہونے کی وجہ سے اس کتاب کا انکار بھی نہیں کرنا چاہتے جو فی الواقع خارقِ عادت واقعات کا ذکر کرتی ہے۔

اصل سوال

مُعجزات کے باب میں اصل فیصلہ کُن سوال صرف یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ نظامِ کائنات کو ایک قانون پر چلا دینے کے بعد معطّل ہو چکا ہے اور اِس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کسی موقع پر مُداخلت نہیں کر سکتا؛ یا وہ بالفعل اپنی سلطنت کی زمامِ تدبیر و انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور ہر آن اُس کے احکام اِس سلطنت میں نافذ ہوتے

ہیں اور اس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ اشیاء کی شکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جزئی طور پر یا کلّی طور پر جیسا چاہے اور جب چاہے تغیر کر دے۔

دو نقطہ ہائے نظر

جو لوگ اِس سوال کے جواب میں پہلی بات کے قائل ہیں اُن کے لیے معجزات کو تسلیم کرنا غیر ممکن ہے۔ کیونکہ معجزہ نہ ان کے تصوّرِ خدا سے میل کھاتا ہے اور نہ تصوّرِ کائنات سے۔ لیکن ایسے لوگوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر و تشریح کرنے کے بجائے اس کا صاف صاف انکار کر دیں۔ کیونکہ قرآن نے تو سارا زورِ بیان ہی خدا کے مقدم الذکر تصوّر کا ابطال اور مؤخر الذکر تصوّر کا اثبات کرنے پر صرف کیا ہے بخلاف اس کے جو شخص قرآن کے دلائل سے مطمئن ہو کر دوسرے تصوّر کو قبول کرے اس کے لیے معجزے کو سمجھنا اور تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ جب آپؐ کا عقیدہ ہی یہ ہو گا کہ مثلاً اژدہے جس طرح پیدا ہوا کرتے ہیں اُسی طرح وہ پیدا ہو سکتے ہیں، اُس کے سوا کسی دوسرے ڈھنگ پر کوئی اژدہا پیدا کر دینا خدا کی قدرت سے بھی باہر ہے، تو آپ مجبور ہیں کہ ایسے شخص کے بیان کو قطعی طور پر جھٹلا دیں جو آپ کو خبر دے رہا ہو کہ ایک لاٹھی اژدہے میں تبدیل ہوئی، اور پھر اژدہے سے لاٹھی بن گئی۔ لیکن اس کے برعکس اگر آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ بے جان مادّے میں خدا کے حکم سے زندگی پیدا ہوتی ہے، اور خدا جس مادّے کو جیسی چاہے زندگی عطا کر سکتا ہے تو اُس کے حکم سے لاٹھی کا اژدہا بننا اُتنا ہی غیر عجیب واقعہ ہے جتنا اُسی خدا کے حکم سے انڈے کے اندر بھرے ہوئے چند بے جان مادّوں کا اژدہا بن جانا غیر عجیب ہے۔ مجرد یہ فرق کہ ایک واقعہ ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے، اور دوسرا واقعہ صرف تین مرتبہ پیش آیا، ایک کو غیر عجیب اور دوسرے کو عجیب بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔[۱۴۵]

معجزات کے برحق ہونے کے دلائل

قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا یَعْلَمُهُمْ	کہو میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ یعنی کتنے تھے کم ہی
اِلَّا قَلِیْلٌ ۵ فَلَا تُمَارِ فِیْهِمْ اِلَّا مِرَآءً	لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں پس تم سرسری بات سے
ظَاهِرًا ص وَّلَا تَسْتَفْتِ فِیْهِمْ اَحَدًا ۔	بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث
(الکہف۔ آیت ۲۲)	نہ کرو، اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔"

مطلب یہ ہے کہ اصل چیز ان کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اصل چیز وہ سبق ہیں جو اس قصّے سے ملتے ہیں۔ اس سے سبق یہ ملتا ہے کہ ایک سچے مومن کو کسی حال میں حق سے مُنہ موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہونا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کا اعتماد اسبابِ دُنیا پر نہیں بلکہ اللہ پر ہونا چاہیے اور حق پرستی کے

لیے بظاہر ماحول میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہِ حق میں قدم اٹھا دینا چاہیے۔

قانونِ فطرت اور خدا کا بالاتر اختیار

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس "عادتِ جاریہ" کو لوگ "قانونِ فطرت" سمجھتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دُنیا میں کچھ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ درحقیقت اُس کا پابند نہیں ہے۔ وہ جب اور جہاں چاہے اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اُس کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو دو سو برس تک سُلا کر اِس طرح اُٹھا بٹھائے جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہے، اور اس کی عُمر، شکل، صورت، لباس، تندرستی، غرض کسی چیز پر بھی اِس طویل زمانے کا کچھ اثر نہ ہو۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو بیک وقت زندہ کر کے اُٹھا دینا جس کی خبر انبیاء اور کُتُبِ آسمانی نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اِس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جاہل انسان کس طرح ہر زمانے میں اللہ کی نشانیوں کو اپنے لیے سرمۂ چشمِ بصیرت بنانے کے بجائے اُلٹا مزید گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔[۱] ۱۴۶

کائنات میں غیر معمولی عجائبات

خدائی اس خدائی میں عجائبات کی کمی نہیں ہے۔ جس طرف بھی آدمی نگاہ ڈالے اس کی قدرت کے کرشمے غیر معمولی واقعات کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ کچھ واقعات و حالات کا معمولاً ایک خاص صورت میں رُونما ہوتے رہنا اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس معمول سے ہٹ کر کسی دوسری غیر معمولی صورت میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے مفروضات کو توڑنے کے لیے کائنات کے ہر گوشے میں اور مخلوقات کی ہر صنف میں خلافِ معمول حالات و واقعات کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جو شخص خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا واضح تصور رکھتا ہو وہ تو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ کسی انسان کو ایک ہزار برس یا اس سے کم و بیش عمر عطا کر دینا اُس خدا کے لیے بھی ممکن نہیں ہے جو موت و حیات کا خالق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر خود چاہے تو ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر خدا چاہے تو جب تک وہ چاہے اُسے زندہ رکھ سکتا ہے۔ ۱۴۷

---

[۱] اصحابِ کہف کا جو معجزہ اللہ تعالیٰ نے اِس لیے دکھایا تھا کہ لوگ اِس سے آخرت کا یقین حاصل کریں، ٹھیک اسی نشان کو انہوں نے یہ سمجھا کہ اللہ نے انہیں اپنے کچھ اور ولی پوجنے کے لیے عطا کر دیے۔ (از مولف)

فصل ۲

انبیائے ماسبق کے معجزات پر ایک نظر

حضرت صالحؑ کی اُونٹنی کا معجزہ

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ (اعراف: ۷۳)

"اور ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خُدا نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے۔ اس کو کسی بُرے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آ لے گا۔"

ظاہر عبارت سے صاف محسُوس ہوتا ہے کہ پہلے فقرے میں اللہ کی جس کھُلی دلیل کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس سے مُراد یہی اونٹنی ہے جسے اس دوسرے فقرے میں "نشانی" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سُورہ شُعراء رکوع ع۸ میں تصریح ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالحؑ سے مطالبہ کیا تھا، جو ان کے مامُور من اللہ ہونے پر کھُلی دلیل ہو، اور اُسی کے جواب میں حضرت صالحؑ نے اونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہوا تھا اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاؑ نے اپنی نبوّت کے ثبوت میں مُنکرین کے مُطالبہ پر پیش کیے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس اونٹنی کی معجزانہ پیدائش پر دلیل ہے کہ حضرت صالحؑ نے اسے پیش کر کے مُنکرین کو دھمکی دی کہ بس اس اُونٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی مُعلق ہے۔ یہ آزادانہ تمہاری زمینوں میں چرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ اکیلی پانی پیے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پئیں گے اور اگر تم نے اس کو ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ظاہر ہے اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جاسکتی تھی جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ پھر یہ بات

کہ ایک کافی مدّت تک یہ لوگ اس کے چرتے پھرنے کو اور اِس بات کو کہ ایک دن تنہا وہ پانی پیے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پییں، بادلِ ناخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر بڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا، دراں حالے کہ حضرت صالحؑ کے پاس کوئی طاقت نہ تھی جس کا انہیں کوئی خوف ہوتا۔ اِس حقیقت پر مزید دلیل یہ ہے کہ وہ اِس اونٹنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی زور ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دندناتی پھرتی ہے۔ قرآن اِس امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ اونٹنی کیسی تھی، اور کس طرح وجود میں آئی۔ کسی صحیح حدیث میں بھی اس کی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ اِس لیے اُن روایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو مفسّرین نے اِس کی کیفیتِ پیدائش کے متعلق نقل کی ہیں۔ لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور پر معجزے کی حیثیت رکھتی تھی، قرآن سے ثابت ہے۔[۱۸۸]

اِحیائے مَوتیٰ کا معجزہ

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (البقرہ - ۲۵۹)

"یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو، جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اس نے کہا یہ آبادی، جو ہلاک ہو چکی ہے، اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟ اس پر اللہ نے اس کی رُوح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مُردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پُوچھا: بتاؤ کتنی مدّت پڑے رہے ہو؟ اس نے کہا: ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ فرمایا: "تم پر سو برس اِسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیّر نہیں آیا ہے دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اِس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی، تو اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

یہ ایک غیر ضروری بحث ہے کہ وہ شخص کون تھا اور وہ بستی کون سی تھی۔ اصل مدعا جس کے لیے یہاں یہ ذکر لایا گیا ہے، صرف یہ بتانا ہے کہ جس نے اللہ کو اپنا ولی بنایا تھا اُسے اللہ نے کس طرح روشنی عطا کی۔ شخص اور مقام،

دونوں کی تعیین کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ اس کا کوئی فائدہ ۔ البتہ بعد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن صاحب کا یہ ذکر ہے، وہ ضرور کوئی نبی ہوں گے۔

اس سوال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بزرگ حیات بعد الموت کے منکر تھے ۔ یا انہیں اس میں شک تھا، بلکہ دراصل وہ حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے، جیسا کہ انبیاء کو کرایا جاتا رہا ہے ۔ ایک ایسے شخص کا زندہ پلٹ کر آنا جسے دنیا سو برس پہلے مُردہ سمجھ چکی تھی خود اس کو اپنے ہم عصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بنا دینے کے لیے کافی تھا ۔ ۱۴۹

حضرت ایوبؑ کے لیے چشمۂ شفا

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۝ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۝ (صٓ ۔ ۴۱ ۔ ۴۲)

"اور ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر کرو ۔ جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے ۔ (ہم نے اسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مار، یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین میں پاؤں مارتے ہی ایک چشمہ نکل آیا جس کا پانی پینا اور اس میں غسل کرنا حضرت ایوبؑ کے مرض کا علاج تھا ۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ کسی سخت جلدی مرض میں مبتلا تھے ۔ بائیبل کا بیان بھی یہی ہے کہ سر سے پاؤں تک ان کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا ۔ ۱۵۰

معجزاتِ حضرت ابراہیمؑ

چار پرندوں کو زندہ کرنے کا واقعہ

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِىْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (البقرہ ۔ ۲۶۰)

"اور وہ واقعہ بھی پیشِ نظر رہے، جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ "میرے مالک! مجھے دکھا دے، تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔" فرمایا کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے ۔ فرمایا اچھا تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے ۔ پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے ۔ پھر ان کو پکار وہ تیرے پاس دوڑے

چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔"

حضرت ابراہیمؑ کے ہاں بڑھاپے میں اولاد کی پیدائش

فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝ (ہود - آیات ۷۱-۷۳)

"پھر ہم نے اس کو اسحٰقؑ کی اور اسحٰقؑ کے بعد یعقوبؑ کی خوشخبری دی۔ وہ بولی "ہائے میری کم بختی! کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جبکہ میں بڑھیا پھونس ہو گئی اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے؛ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" فرشتوں نے کہا "اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیمؑ کے گھر والو تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔ اور یقیناً اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے۔"

حضرت ابراہیمؑ کا آگ سے بچایا جانا

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ۝ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ۔ (الصّٰفّٰت ۔ ۹۷-۹۸)

"انہوں نے آپس میں کہا "اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔" انہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی۔ مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا۔"

معجزاتِ حضرت موسیٰؑ

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۠ئِهٖ ۔ (المومنون: آیت ۴۶)

"پھر ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنی نشانیوں اور کھلی سند کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا۔"

"نشانیوں" کے بعد "کھلی سند" سے مراد یا تو یہ ہے کہ ان نشانیوں کا ان کے ساتھ ہونا ہی اس بات کی کھلی سند تھا کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔ یا پھر نشانیوں سے مراد عصا کے سوا دوسرے وہ تمام معجزات ہیں جو مصر میں دکھائے گئے تھے۔ اور کھلی سند سے مراد عصا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے جو معجزے رونما ہوئے ان کے بعد تو یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ یہ دونوں بھائی ماموُر من اللہ ہیں۔[151]

فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝

"انہوں نے جو اپنے انچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوفزدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ

(سورۂ اعراف: ۱۱۶-۱۱۷)

بنا لائے۔ ہم نے موسیٰؑ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے اس جھوٹے طلسم کو نگلتا چلا گیا۔"

عصائے موسوی

یہ گمان کرنا صحیح نہیں ہے کہ عصا اُن لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا جو جادوگروں نے پھینکی تھیں اور سانپ اور اژدہے بنی نظر آرہی تھیں۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ عصا نے سانپ بن کر ان کے اُس طلسمِ فریب کو نگلنا شروع کر دیا جو انہوں نے تیار کیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانپ جدھر جدھر گیا وہاں سے جادو کا وہ اثر کافور ہوتا چلا گیا جس کی بدولت لاٹھیاں اور رسیاں سانپوں کی طرح لہراتی نظر آتی تھیں اور اس کی ایک ہی گردش میں جادوگروں کی ہر لاٹھی، لاٹھی اور ہر رسّی، رسّی بن کر رہ گئی۔ ۱۵۲

آلِ فرعون پر متعدد تنبیہی عذاب

وَلَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰۤئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ (اعراف: آیات ۱۳۰-۱۳۳)

"ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں، اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لیے فالِ بد ٹھیراتے، حالانکہ درحقیقت ان کی فالِ بد تو اللہ کے پاس تھی۔ مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔ انہوں نے موسیٰؑ سے کہا کہ "تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے، ہم تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔" آخر کار ہم نے اُن پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سُرسُریاں پھیلائیں، مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کرکے دکھائیں مگر وہ سرکشی کیے چلے گئے اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔"

یہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخن پروری تھی کہ فرعون کے اہلِ دربار اُس چیز کو بھی جادو قرار دے رہے تھے جس کے متعلق وہ خود بھی بالیقین جانتے تھے کہ وہ جادو کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ شاید ایک بے وقوف آدمی بھی یہ باور نہ کریگا کہ ایک پورے ملک میں قحط پڑ جانا اور زمین کی پیداوار میں مسلسل کمی واقع ہونا، کسی جادوگر کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ اسی

بنا پر قرآن پاک کہتا ہے کہ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَّجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل - آیات ۱۳-۱۴) یعنی "جب ہماری نشانیاں ان کی نگاہوں کے سامنے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے، حالانکہ ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے۔ مگر انہوں نے محض ظلم اور سرکشی کی راہ سے اُن کا انکار کیا"[۱۵۳]

طُوفان سے مُراد غالباً بارش کا طوفان ہے جس میں اولے بھی برسے تھے۔ اگرچہ طوفان دوسری چیزوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر بائیبل میں ژالہ باری کے طوفان کا ہی ذکر ہے اس لیے ہم اسی معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔[۱۵۴]

اصل میں لفظ قُمَّل استعمال ہُوا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ جوئیں، چھوٹی مکھی، چھوٹی ٹڈی، مچھر، سُرسُری وغیرہ۔ غالباً یہ جامع لفظ اِس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ بیک وقت جوؤں اور مچھروں نے آدمیوں پر اور سُرسُریوں (گھن کے کیڑوں) نے غلّہ کے ذخیروں پر حملہ کیا ہو گا۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو بائیبل کی کتاب خروج، باب ۷ تا ۱۲)[۱۵۵]

۹ نشانیاں

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا۔ (بنی اسرائیل - آیات ۱۰۱-۱۰۲)

"ہم نے موسیٰؑ کو نو نشانیاں عطا کی تھیں جو صریح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اب یہ تم خود بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب وہ سامنے آئیں تو فرعون نے یہی کہا تھا کہ "اے موسیٰؑ، مَیں سمجھتا ہوں کہ تو ضرور ایک سحرزدہ آدمی ہے"۔ موسیٰؑ نے اس کے جواب میں کہا "تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں ربّ السمٰوات والارض کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں، اور میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون تو ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہے۔"

وہ نُو نشانیاں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے پہلے سورۂ اعراف میں گزر چکی ہیں۔ یعنی عصا جو اژدہا بن جاتا تھا۔[۱] یدِ بیضا، جو بغل سے نکالتے ہی سورج کی طرح چمکنے لگتا تھا۔[۲] جادوگروں کے جادو کو بر سرِ عام شکست دینا۔[۳] ایک اعلان[۴] کے مطابق سارے ملک میں قحط برپا ہو جانا۔ اور پھر یکے بعد دیگرے طوفان[۵]۔ ٹڈی دَل[۶]، سُرسُریوں[۷]، مینڈکوں[۸] اور خون[۹] کی بلاؤں کا نازل ہونا۔[۱۵۶]

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی بات کا جو جواب دیا اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی ملک میں قحط آ جانا، یا لاکھوں مُربع میل زمین پر پھیلے ہوئے علاقوں میں مینڈکوں کا ایک بلا کی طرح نکلنا، یا تمام ملک کے غلّے کے گوداموں میں گھُن لگ جانا، اور ایسے ہی دوسرے عام مصائب کسی جادوگر کے جادو، یا کسی انسانی طاقت کے کرتب سے رُونما نہیں ہو سکتے۔ پھر جبکہ ہر بلا کے نزول سے پہلے حضرت موسیٰؑ فرعون کو نوٹس دے دیتے تھے کہ اگر تو اپنی ہٹ سے باز نہ آیا تو یہ بلا تیری سلطنت پر مُسلّط کی جائے گی اور ٹھیک ان کے بیان کے مطابق وہی بلا پوری سلطنت پر نازل ہو جاتی تھی، تو اس صورت میں صرف

ایک دیوانہ یا ایک سخت ہٹ دھرم آدمی ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ اِن بلاؤں کا نزول ربُّ السّموات والارض کے سوا کسی اور کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔ ۱۵۷

عصا سے بحر کا پھٹنا

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰىٓ ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ○ (طٰہٰ۔ آیت ۷۷)	ہم نے موسیٰؑ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ اور اُن کے لیے سمندر میں سے سُوکھی سڑک بنالے، تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے) ڈر لگے۔"

اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر کار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام بنی اسرائیل اور غیر اسرائیلی مسلمانوں کو (جن کے لیے "میرے بندوں" کا جامع لفظ استعمال کیا گیا ہے) مصر کے ہر حصّے سے ہجرت کے لیے نکل پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔ اُس زمانے میں نہر سویز موجود نہ تھی۔ بحرِ احمر سے بحرِ رُوم (میڈیٹرینین) تک کا پُورا علاقہ کھلا ہوا تھا۔ مگر اس علاقے کے تمام راستوں پر فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے بخیریت نہیں گزرا جا سکتا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ نے بحرِ احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ سمندر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف نکل جائیں۔ لیکن اُدھر سے فرعون ایک لشکرِ عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اُس موقع پر آ پہنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سُورۂ شُعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کا قافلہ لشکرِ فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گھر چکا تھا۔ عین اُس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ "اپنا عصا سمندر پر مار"۔ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ، "فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا۔" اور بیچ میں صرف یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا، بلکہ بیچ کا یہ حصّہ اُوپر کی آیت کے مطابق خشک ہو کر سُوکھی سڑک کی طرح بن گیا۔ یہ صاف اور صریح معجزے کا بیان ہے، اور اس سے ان لوگوں کے بیان کی غلطی واضح ہو جاتی ہے، جو کہتے ہیں کہ ہوا کے طوفان یا جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر ہٹ گیا تھا۔ اس طرح جو پانی ہٹتا ہے وہ دونوں طرف ٹیلوں کی صُورت میں کھڑا نہیں ہو جاتا، اور نہ بیچ کا حصّہ سُوکھ کر سڑک کی طرح بن جاتا ہے۔ ۱۵۸

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۚ (الشُّعراء: آیت ۶۳)	ہم نے مُوسیٰؑ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ "مار اپنا عصا سمندر پر"۔ یکایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔"

اصل الفاظ ہیں کَالطَّوْدِ الْعَظِيْم ۔ طود عربی زبان میں کہتے ہی بڑے پہاڑ کو ہیں۔ لسان العرب میں ہے الطَّوْدُ

الجبل العظیم۔ اس کے لیے پھر عظیم کی صفت لانے کے معنی یہ ہُوئے کہ پانی دونوں طرف بہت اُونچے پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ یہ کام ایک طرف بنی اسرائیل کے پُورے قافلے کو گزارنے کے لیے کیا گیا تھا اور دوسری طرف اس سے مقصد فرعون کے لشکر کو غرق کرنا تھا تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پانی ان نہایت بلند پہاڑوں کی شکل میں اتنی دیر تک کھڑا رہا کہ ہزاروں لاکھوں بنی اسرائیل کا مہاجر قافلہ اس بیچ میں سے گزر بھی گیا اور پھر فرعون کا پُورا لشکر اس کے درمیان پہنچ بھی گیا۔ ظاہر ہے کہ عام قانونِ فطرت کے تحت جو طوفانی ہوائیں چلتی ہیں۔ وہ خواہ کیسی ہی تند و تیز ہوں ان کے اثر سے کبھی سمندر کا پانی اس طرح عالی شان پہاڑوں کی طرح اتنی دیر کھڑا نہیں رہا کرتا۔ اس پر مزید سورۂ طٰہٰ کا یہ بیان ہے کہ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا "ان کے لیے سمندر میں سُوکھا راستہ بنا دے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سمندر پر عصا مارنے سے صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ سمندر کا پانی ہٹ کر دونوں طرف پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا، بلکہ بیچ میں جو راستہ نکلا وہ خشک بھی ہو گیا، کوئی کیچڑ ایسی نہ رہی جو چلنے میں مانع ہوتی۔ یہ صریحًا ایک معجزے کا بیان ہے اور اس سے ان لوگوں کے خیال کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو اس واقعے کی تعبیر عام قوانینِ فطرت کے تحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۵۹

مَن و سلوٰی کا نزُول

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى (طٰہٰ۔ ۸۰) "اور تم پر من و سلوٰی اُتارا"۔

بائیبل کا بیان ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشتِ سین میں ایلیم اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خوراک کے ذخیرے ختم ہو کر فاقوں کی نوبت آگئی تھی، اس وقت من و سلوٰی کا نزول شروع ہوا اور فلسطین کے آباد علاقے میں پہنچنے تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا (خروج، باب ۱۶، گنتی باب ۱۱، آیت ۷-۹۔ یشوع، باب ۵ آیت ۱۲)۔ کتاب خروج میں من و سلوٰی کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:

"اور یُوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا۔ اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب وہ اوس سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اس کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے مَن؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے وہ کیا ہے"۔ (باب ۱۶ آیت ۱۳-۱۵)۔

"اور بنی اسرائیل نے اُس کا نام مَن رکھا اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید اور اس کا مزہ شہد کے بنے ہوئے پوئے کی طرح تھا"۔ (آیت ۳۱)۔

گنتی میں اس کی مزید تشریح یہ ملتی ہے:

"لوگ اِدھر اُدھر جا کر اسے جمع کرتے اور اُسے چکّی میں پیستے یا اوکھلی میں کوٹ لیتے تھے۔ پھر اُسے ہانڈیوں

میں اُبال کر روٹیاں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب لشکر گاہ میں اوس پڑتی تو اس کے ساتھ مَن بھی گرتا تھا (باب ۱۱۔ آیت ۸-۹)۔

یہ بھی ایک معجزہ تھا۔ کیونکہ چالیس برس بعد جب بنی اسرائیل کے لیے خوراک کے فطری ذرائع بہم پہنچ گئے تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب نہ اس علاقے میں بٹیروں کی وہ کثرت ہے، نہ مَن ہی کہیں پایا جاتا ہے۔ تلاش و جستجو کرنے والوں نے اُن علاقوں کو چھان مارا ہے۔ جہاں بائیبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل نے چالیس سال تک دشت نوردی کی تھی۔ مَن اُن کو کہیں نہ ملا۔ البتہ کاروباری لوگ خریداروں کو بیوقوف بنانے کے لیے مَن کا حلوہ ضرور بیچتے پھرتے ہیں۔[۱۶۰]

معجزاتِ حضرت سُلیمانؑ

پرندوں کی بولیوں کا علم

وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ۔ (النمل۔ آیت ۱۶)

"اور اُس نے کہا" لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں۔"

بائیبل اِس ذکر سے خالی ہے کہ حضرت سُلیمانؑ کو پرندوں اور جانوروں کی بولیوں کا علم دیا گیا تھا لیکن بنی اسرائیل کی روایات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ۱۱ ص ۴۳۹)[۱۶۱]

ان کے لیے جنوں کا مُسخّر ہونا

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۔ (النمل۔ ۱۷)

"سُلیمانؑ کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے جو، پُورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔"

ملکہ سبا کا تخت آناً فاناً لایا جانا

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ (النمل۔ آیت ۴۰)

"سُلیمانؑ نے کہا" اے اہلِ دربار! تم میں سے کون اُس کا تخت میرے پاس لاتا ہے، قبل اس کے کہ وہ لوگ مُطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا" میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں۔ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں" یہ جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا" میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں" جونہی کہ سُلیمانؑ

نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا وہ پکار اُٹھا" یہ میرے رب کا فضل ہے۔"

دُوسرے انبیاء کے چند اور معجزات

قصہ یونسؑ کے معجزاتی پہلو

وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ ۝ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ ۝ فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ۝ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ ۝ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ ۝ (الصّٰفّٰت۔۱۴۰-۱۴۶)

"اور یقیناً یُونسؑ بھی رسُولوں میں سے تھا۔ یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا۔ پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا اور اُس میں مات کھائی۔ آخر کار مچھلی نے اُسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا۔ اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو روزِ قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔ آخر کار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا اور اس پر ایک بیلدار درخت اُگا دیا۔"

حضرت زکریاؑ کے لیے سن رسیدہ بیوی سے اولاد

فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ۝ یٰزَكَرِیَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۣ اسْمُهٗ یَحْیٰی ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِیًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَیْـًٔا ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۝ (مریم: ۵تا۱۰)

"تو مجھے اپنے فضلِ خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آلِ یعقوبؑ کی میراث بھی پائے۔ اور اَے پروردگار اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا" (جواب دیا گیا) "اَے زکریاؑ، ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰؑ ہوگا ہم نے اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا۔" عرض کیا پروردگار، بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سُوکھ چکا ہوں؟" جواب ملا "ایسا ہی ہوگا تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے۔ آخر اس سے پہلے مَیں تجھے پیدا کر چکا ہوں جبکہ تو کوئی چیز نہ تھا۔" زکریا نے کہا "پروردگار، میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔" فرمایا "تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے۔"

معجزاتِ حضرتِ عیسیٰؑ

حضرت عیسیٰؑ کا بے باپ پیدا کیا جانا

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَّ آوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ۝ (المؤمنون۔آیت ۵۰)

"اور ابنِ مریمؑ اور اور اُس کی ماں کو ہم نے ایک نشان بنایا اور ان کو ایک سطحِ مُرتفع پر رکھا جو اطمینان کی جگہ تھی اور چشمے اس میں جاری تھے۔"

یہ نہیں فرمایا کہ ایک نشانی ابنِ مریمؑ تھے اور ایک نشانی خود مریمؑ۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ ابنِ مریمؑ اور اس کی ماں کو دو نشانیاں بنایا۔ بلکہ فرمایا یہ ہے کہ دونوں مل کر ایک نشانی بنائے گئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ باپ کے بغیر ابنِ مریمؑ کا پیدا ہونا اور مرد کی صحبت کے بغیر مریمؑ کا حاملہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو اِن دونوں کو ایک نشانی بناتی ہے[۶۲]

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۚ فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ إِنَّمَآ أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ قَالَتْ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ فَأَجَآءَهَا الْمَخَاضُ إِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝

(مریم: آیات ۱۶ تا ۲۳)

"اور اے محمدؐ! اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو، جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ اور پردہ ڈال کر اُن سے چھپ بیٹھی تھی۔ اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی رُوح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پُورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ مریم یکایک بول اُٹھی کہ "اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو مَیں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں"۔ اُس نے کہا "مَیں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں"۔ مریم نے کہا "میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھُوا تک نہیں ہے۔ اور مَیں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں"۔ فرشتے نے کہا "ایسا ہی ہو گا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اُس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف

سے ایک رحمت، اور یہ کام ہو کر رہنا ہے۔" مریم کو اس بچّے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دُور کے مقام پر چلی گئی۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اُسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی "کاش مَیں اِس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام نشان نہ رہتا۔"

دُور کے مقام سے مُراد بیتُ اللحم ہے۔ حضرت مریم کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیتُ المقدس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اِس حالت میں اگر وہ جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی اُن کا جینا مُشکل کر دیتے۔ اِس لیے بیچاری اس شدید آزمائش میں مُبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پُوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سُسرال، سب کو چھوڑ کر وہ زچگی کے لیے ایک دُور دراز مقام پر چلی جاتیں۔[۱۶۳]

اِن الفاظ سے اُس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریم اس وقت مُبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے بلکہ یہ فکر ان کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں اُنہیں ڈالا ہے، اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا۔ اب اِس بچّے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے اُن سے کہا "غم نہ کر" اِس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریم نے یہ الفاظ کہے تھے۔ شادی شُدہ لڑکی کے ہاں بچّہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے اسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہوتا۔[۱۶۴]

نوزائیدہ بچّے کا گہوارے میں کلام کرنا

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَـيْـــًٔـا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ (مریم - ۲۸)

"پس جب وہ بچّے کو گود میں لیے قوم کے پاس آئیں تو لوگوں نے پوچھا اَے مریمؑ یہ چیز کہاں سے لے آئی؟ اَے ہارونؑ کی بہن، نہ تو تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔"

جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش کے مُنکر ہیں وہ آخر اِس بات کی کیا معقول توجیہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مریم کے بچہ لیے ہوئے آنے پر قوم کیوں چڑھ آئی اور اُن پر طعن اور ملامت کی بوچھاڑ اُس نے کیوں کی؟[۱۶۵]

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ (مریم - ۲۹)

مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا ہم اس سے کیا بات کریں جو گھوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے۔"

قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ "ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے"۔ یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسیٰؑ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گھوارے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر جو شخص موقع و محل اور سیاق و سباق پر کچھ بھی غور کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ یہ محض ایک مہمل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے وہ لوگ آئے تھے وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔ علاوہ بریں سورۂ آل عمران کی آیت ۴۶ اور سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰ دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گھوارے میں ایک نوزائیدہ بچے کی حیثیت ہی سے کیا تھا۔ پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گھوارے میں بھی بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود حضرت عیسیٰؑ سے فرماتا ہے کہ "تو لوگوں سے گھوارے میں بھی بات کرتا تھا اور جوانی میں بھی۔ ۱۶۶

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۔ (مریم - ۳۰-۳۱-۳۲)

بچہ بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں، اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔"

یہ نہیں فرمایا کہ والدین کا حق ادا کرنے والا۔ صرف والدہ کا حق ادا کرنے والا فرمایا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا باپ کوئی نہ تھا اور اسی کی ایک صریح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ اُن کو عیسیٰؑ بن مریمؑ کہا گیا ہے۔ ۱۶۷

وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۔ (مریم - ۳۳)

"سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں۔"

یہ ہے وہ "نشانی" جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو اُن کی

مُسلسل بدکرداریوں پر عبرتناک سزا دینے سے پہلے ان پر حُجّت تمام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو جو بیتُ المَقدِس میں مُعتکف اور حضرت زکریا کے زیرِ تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا تاکہ جب وہ بچّہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجّہات یک لخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریم پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اُس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نُبوّت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود ہوں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اِس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوّت کا اِنکار کرے اور اُس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔[۱۶۸]

قرآن کے ذکر کردہ دُوسرے مُعجزات

وَرَسُوۡلًا اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اَنِّىۡ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ اَنِّىۡۤ اَخۡلُقُ لَـكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَیْـــٴَــةِ الطَّيۡرِ فَاَنۡفُخُ فِيۡهِ فَيَكُوۡنُ طَيۡرًا ۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ۚ وَاُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡىِ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ۚ وَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ‌ۚ (آل عمران۔ ۴۹)

"اور جب وہ بحیثیتِ رسُول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو (اُس نے کہا) "مَیں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہُوں۔ مَیں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہُوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ مَیں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں۔ مَیں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔"

حضورؐ اور معجزات

قرآن ہی کو دلیلِ نُبوّت بنایا گیا

وَاِذَا لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بِاٰيَةٍ قَالُوۡا لَوۡلَا اجۡتَبَيۡتَهَا‌ ؕ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ مِنۡ رَّبِّىۡ‌ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ‏

"اے نبیؐ، جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لیے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ ان سے کہو، مَیں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے

(الاعراف۔ آیت ۲۰۳) رب نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان کے لیے جو اُسے قبول کریں۔"

کُفّار کے اِس سوال میں ایک صریح طعن کا انداز پایا جاتا تھا یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میاں جس طرح تم نبی بن بیٹھے ہو اُسی طرح کوئی معجزہ بھی چھانٹ کر اپنے لیے بنا لائے ہوتے لیکن آگے ملاحظہ ہو کہ اس طعن کا جواب کس شان سے دیا جاتا ہے۔

اِس جواب کا مطلب یہ ہے کہ میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو یا جس کی مَیں خود ضرورت محسوس کروں اسے خود ایجاد یا تصنیف کر کے پیش کر دُوں۔ مَیں تو ایک رسُول ہوں، اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے اُس کی ہدایت پر عمل کروں۔ معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے وہ یہ قرآن ہے۔ اِس کے اندر بصیرت افروز روشنیاں موجود ہیں، اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مان لیتے ہیں، ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے، اور ان کے اخلاقِ حسنہ میں رحمتِ الٰہی کے آثار صاف ہویدا ہونے لگتے ہیں۔[۱۶۹]

بطورِ خود معجزات دکھانے پر حضورؐ قادر نہیں تھے

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ (الانعام۔ ۳۵)

"تاہم اگر (اے نبیؐ) اِن لوگوں کی بے رُخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سُرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم جب دیکھتے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مُدّتیں گزر گئی ہیں اور کسی طرح یہ راستی پر نہیں آتی تو بسا اوقات آپؐ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جس سے ان لوگوں کا کفر ٹوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کر لیں۔ آپ کی اسی خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ بے صبری سے کام نہ لو۔ جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدریج سے ہم اِس کام کو چلوا رہے ہیں اُسی پر صبر کے ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا ہم خود نہ لے سکتے تھے ؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ جس فکری و اخلاقی انقلاب اور جس مَدنیتِ صالحہ کی تعمیر کے کام پر تم مامور کیے گئے ہو اُسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے تاہم اگر لوگوں کے موجودہ جمُود اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا اور تمہیں گمان ہے کہ اِس جمُود کو توڑنے کے لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرانا ہی ضروری ہے، تو خود زور لگاؤ اور تمہارا کچھ بس چلتا ہو تو زمین میں گھس کر یا آسمان پر چڑھ کر کوئی ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو کہ یہ بے یقینی کو یقین میں تبدیل کر دینے کے لیے کافی ہو گا مگر ہم سے اُمید نہ رکھو کہ ہم تمہاری یہ خواہش پُوری کریں گے، کیونکہ ہماری اسکیم میں اِس تدبیر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔[۱۷۰]

حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (طٰہٰ - ۱۳۳)

"وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا۔ اور کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں کی تمام تعلیمات کا بیان واضح نہیں آگیا؟"

یعنی کیا یہ کوئی کم معجزہ ہے کہ انہی میں سے ایک اُمّی شخص نے وہ کتاب پیش کی ہے جس میں شروع سے اب تک کی تمام کُتبِ آسمانی کے مضامین اور تعلیمات کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اِن کتابوں میں جو کچھ تھا وہ سب نہ صرف یہ کہ اس میں جمع کر دیا گیا ہے، بلکہ اس کو کھول کر ایسا واضح کر دیا گیا ہے کہ صحرا نشین بدّو تک اس کو سمجھ کر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ۱۷۱

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (العنکبوت ۴۸ تا ۵۱)

"(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے، اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اُتاری گئیں اُس شخص پر نشانیاں (یعنی معجزات) اس کے رب کی طرف سے؟" کہو، نشانیاں تو اُس کے پاس ہیں اور مَیں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر۔ اور کیا اِن لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"

اِن آیات میں اِستدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اَن پڑھ تھے۔ آپؐ کے اہلِ وطن اور رشتہ دار اور برادری کے لوگ، جن کے درمیان روزِ پیدائش سے سنِ کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اِس بات سے خوب واقف تھے کہ آپؐ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔ اِس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اِس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کُتبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیاءِ سابقین کے حالات، مذاہب و اَدیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدّن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے

علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اُس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے کبھی اسے کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اَخذ و اِکتساب سے حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی اُمّیت نے تو کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص ہٹ دھرمی کے سوا اِس کی نبوّت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجہ میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔[۱۷۲]

اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا کیا بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمہاری رسالت پر یقین لانے کے لیے یہ کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنہوں نے دیکھے اُن کے لیے وہ معجزے تھے، مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمہارے سامنے ہے، تمہیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے، تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔[۱۷۳]

حضورؐ کو حِسّی معجزہ کے بجائے عقلی معجزہ دینے کی وجہ

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ (الرعد-۳۱)	"اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اُتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شق ہو جاتی، یا مُردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟"

اِس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ اس میں خطاب کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ مسلمان جب کفّار کی طرف سے بار بار نشانی کا مطالبہ سنتے تھے تو ان کے دلوں میں بے چینی پیدا ہوتی تھی کہ کاش ان لوگوں کو ایسی نشانی دکھا دی جاتی جس سے یہ لوگ قائل ہو جاتے۔ پھر جب وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کی کسی نشانی کے نہ آنے کی وجہ سے کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کے متعلّق لوگوں کے دلوں میں شبہات پھیلانے کا موقع مل رہا ہے تو ان کی یہ بے چینی اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ اس پر مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر قرآن کی کسی سورۃ کے ساتھ ایسی اور ایسی نشانیاں یکایک دکھا دی جاتیں تو کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آتے؟ کیا تمہیں ان سے یہ خوش گمانی ہے کہ یہ قبولِ حق کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں، صرف ایک نشانی کے ظہور کی کسر ہے؟ جن لوگوں کو قرآن کی تعلیم میں، کائنات کے آثار میں، نبی کی پاکیزہ زندگی میں، صحابۂ کرام کے انقلابِ حیات میں نورِ حق نظر نہ آیا، کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ پہاڑوں کے چلنے اور زمین کے پھٹنے اور مُردوں کے قبروں سے نکل آنے میں کوئی روشنی پا لیں گے؟[۱]

---

[۱] اس بحث سے مراد یہ نہیں ہے کہ حضورؐ سے معجزات صادر نہیں ہوتے۔ حضورؐ سے بہت سے معجزات وقتاً فوقتاً صادر ہوئے، مگر وہ بطورِ دلیلِ نبوّت مخالفین کو ایمان سے مالا مال کرنے کا ذریعہ نہیں بنے، ان سے صرف اہلِ ایمان کا ایمان نشو و نما پاتا رہا۔ (مرتّبین)

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ۔	"ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اُس کے آگے جھک جائیں۔"

(الشعراء - آیت ۴)

یعنی کوئی ایسی نشانی نازل کر دینا جو تمام کفار کو ایمان و اطاعت کی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دے، اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ کام اُس کی قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح کا جبری ایمان اُس کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل و خرد سے کام لے کر اُن آیات کی مدد سے حق کو پہچانیں جو کتابِ الٰہی میں پیش کی گئی ہیں۔ جو تمام آفاق میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ جو خود ان کی اپنی ہستی میں پائی جاتی ہیں۔ پھر جب ان کا دل گواہی دے کہ واقعی حق وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے اور اُس کے خلاف جو جو عقیدے اور طریقے رائج ہیں وہ باطل ہیں، تو جان بوجھ کر باطل کو چھوڑیں اور حق کو اختیار کریں۔ یہی اختیاری ایمان، اور ترکِ باطل اور اتباعِ حق وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتا ہے۔ اِسی لیے اِس نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی دی ہے۔ اِسی بنا پر اس نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے کہ صحیح اور غلط جس راہ پر بھی وہ جانا چاہے جا سکے۔ اِسی وجہ سے اُس نے انسان کے اندر خیر و شر کے دونوں رجحانات رکھ دیئے ہیں۔ فجور اور تقویٰ کی دونوں راہیں اُس کے آگے کھول دی ہیں۔ شیطان کو بہکانے کی آزادی عطا کی ہے۔ نبوت اور وحی اور دعوتِ خیر کا سلسلہ راہِ راست دکھانے کے لیے قائم کیا ہے۔ اور انسان کو انتخابِ راہ کے لیے ساری مناسب حال صلاحیتیں دے کر اِس امتحان کے مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ کفر و فسق کا راستہ اختیار کرتا ہے یا ایمان و اطاعت کا۔ اس امتحان کا سارا مقصد ہی فوت ہو جائے اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسی تدبیر اختیار فرمائے جو انسان کو ایمان و اطاعت پر مجبور کر دینے والی ہو۔ جبری ایمان ہی مطلوب ہوتا تو نشانیاں نازل کر کے مجبور کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی فطرت اور ساخت پر پیدا فرما سکتا تھا جس میں کفر، نافرمانی، اور بدی کا کوئی امکان ہی نہ ہوتا، بلکہ فرشتوں کی طرح انسان بھی پیدائشی فرمانبردار ہوتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف متعدد مواقع پر قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس - آیت ۹۹) "اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والے سب کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ اب کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرو گے؟" اور وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (ہود - آیت ۱۱۹) "اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی اُمت بنا سکتا تھا۔ اور وہ تو مختلف راہوں پر ہی چلتے رہیں گے۔ (اور بے راہ رویوں سے) صرف وہی بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی لیے تو اُس نے ان کو پیدا کیا تھا۔"

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الۡاَرۡضِ کَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ ۝ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۔

(سورہ الشعراء آیات ۷۔۸)

"اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔"

یعنی جستجوئے حق کے لیے کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں، آنکھیں کھول کر ذرا اِس زمین ہی کی روئیدگی دیکھ لے۔ اُسے معلوم ہو جائے گا کہ نظامِ کائنات کی جو حقیقت (توحیدِ الٰہ) انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ صحیح ہے یا وہ نظریات صحیح ہیں جو مُشرکین یا مُنکرینِ خدا بیان کرتے ہیں۔ زمین سے اُگنے والی انواع و اقسام کی چیزیں جس کثرت سے اُگ رہی ہیں، پھر اُن کے خواص و صفات میں اور بے شمار مخلوقات کی اَن گنت ضرورتوں میں جو صریح مناسبت پائی جاتی ہے، اِن ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک احمق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کی حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت، کسی خالق کے منصوبۂ تخلیق کے بغیر بس یُونہی آپ سے آپ ہو رہا ہے، یا اِس سارے منصُوبے کو بنانے اور چلانے والا کوئی ایک خدا نہیں ہے بلکہ بہت سے خداؤں کی تدبیر نے زمین اور اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی اور اِن وسائل سے پیدا ہونے والی نباتات اور بے حد و حساب مختلف النوع جانداروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل انسان تو اگر کسی ہٹ دھرمی اور پیشگی تعصب میں مبتلا نہیں ہے، اِس منظر کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ یقیناً یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی کھلی علامات ہیں۔ ان نشانیوں کے ہوتے اور کس معجزے کی ضرورت ہے جسے دیکھے بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین نہ آسکتا ہو؟[۱۷۶]

فصل ۳

ایک عظیم حسّی معجزہ

[کتاب کا یہ حصہ ہمارے نقشے کے مطابق معجزات کی اصولی بحث سے متعلق ہے، اس میں واقعاتی حیثیت سے حضورؐ کے مختلف معجزات شامل نہیں کیے گئے، بلکہ وہ کتاب کے واقعاتی مباحث میں اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں۔ یہاں صرف شق القمر کے بہت بڑے معجزے کو بہ طور مثال سلسلۂ بحث میں شامل کیا گیا ہے۔

انبیائے ماسبق کے معجزات اس بحث میں بعض اُمور کے ثبوت کے لیے بیان ہوئے ہیں، یا ان کو پیش کر کے ان سے اصولی نتائج نکالے گئے ہیں ــــ مرتبین]

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ○ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ○ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ○

(القمر۔ آیات ۱ تا ۳)

"قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، مُنہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا ہُوا جادو ہے۔ انہوں نے جھٹلا دیا اور اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔"

شق القمر سے متعلق روایات

حقیقت یہ ہے کہ شق القمر کا واقعہ قرآن کے صریح الفاظ سے ثابت ہے اور حدیث کی روایات پر اس کا انحصار نہیں ہے۔ البتہ روایات سے اس کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ یہ کب اور کیسے پیش آیا تھا۔ یہ روایات بخاری، مُسلم، ترمذی، احمد، ابوعَوانہ، ابوداؤد طَیالِسی، عبدالرزاق، ابن جَریر، بَیہقی، طَبرانی، ابنِ مردُوْیَہ اور ابونُعیم اصفہانی نے بکثرت سندوں کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حُذَیفہؓ، حضرت اَنَس بن مالکؓ، اور حضرت جُبَیر بن مُطعِمؓ سے نقل کی ہیں۔ ان میں سے تین بزرگ، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حُذَیفہؓ اور حضرت جُبَیرؓ بن مُطعِم تصریح کرتے ہیں کہ وہ اِس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔ اور دو بزرگ ایسے ہیں جو اس کے

عینی شاہد نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ ان میں سے ایک (یعنی عبداللہ بن عباسؓ) کی پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے، اور دوسرے (یعنی انسؓ بن مالکؓ) اُس وقت بچے تھے۔ لیکن چونکہ یہ دونوں حضرات صحابی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ انہوں نے ایسے سن رسیدہ صحابیوں سے سُن کر ہی اِسے روایت کیا ہوگا جو اِس واقعہ کا براہِ راست علم رکھتے تھے۔

روایات کا ماحصل

تمام روایات کو جمع کرنے سے اس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً ۵ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہؤا تھا۔ یکایک وہ پھٹا اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جڑ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اُس وقت منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا دیکھو اور گواہ رہو۔ کفار نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے ہم پر جادو کر دیا تھا اِس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکا کھایا۔ دوسرے لوگ بولے کہ محمدؐ ہم پر جادو کر سکتے تھے، تمام لوگوں پر تو نہیں کر سکتے تھے۔ باہر کے لوگوں کو آنے دو۔ ان سے پوچھیں گے کہ یہ واقعہ انہوں نے بھی دیکھا ہے یا نہیں۔ باہر سے جب کچھ لوگ آئے تو انہوں نے شہادت دی کہ وہ بھی یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔

بعض روایات جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں ان کی بنا پر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شق القمر کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ پیش آیا تھا۔ لیکن اوّل تو صحابہؓ میں سے کسی اور نے یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ دوسرے خود حضرت انسؓ کی بھی بعض روایات میں مرّتین (دو مرتبہ) کے الفاظ ہیں اور بعض میں فِرقتین اور شِقّتین (دو ٹکڑے) کے الفاظ۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید صرف ایک ہی اِنشقاق کا ذکر کرتا ہے۔ اس بنا پر صحیح بات یہی ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا تھا۔ رہے وہ قصّے جو عوام میں مشہور ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُنگلی سے چاند کی طرف اشارہ کیا اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا، اور یہ کہ چاند کا ایک ٹکڑا حضورؐ کے گریبان میں داخل ہو کر آپ کی آستین سے نکل گیا، تو یہ بالکل ہی بے اصل ہیں۔

واقعہ کی حقیقی نوعیّت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس واقعہ کی حقیقی نوعیّت کیا تھی؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا جو کفارِ مکّہ کے مطالبہ پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا؟ یا یہ ایک حادثہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا، اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے لوگوں کو اُس کی طرف توجہ صرف اِس غرض کے لیے دلائی کہ یہ اِمکانِ قیامت اور قربِ قیامت کی ایک نشانی ہے؟ عُلماءِ اسلام کا ایک گروہ اِسے حضورؐ کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ کُفّار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا۔ لیکن اِس رائے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ اُن کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ فتح الباری

میں ابنِ حجر کہتے ہیں کہ "یہ قصہ جتنے طریقوں سے منقول ہوا ہے ان میں سے کسی میں بھی حضرت انسؓ کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شق القمر کا واقعہ مشرکین کے مطالبہ پر ہوا تھا" (باب انشقاق القمر)۔ ایک روایت ابونُعیم اصفہانی نے دلائل النبوۃ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اِس مضمون کی نقل کی ہے۔ مگر اس کی سند ضعیف ہے، اور قوی سندوں سے جتنی روایات کتبِ حدیث میں ابن عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں ان میں سے کسی میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ، دونوں اِس واقعہ کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بخلاف اس کے جو جو صحابہ اُس زمانے میں موجود تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حُذَیفہؓ، حضرت جُبَیر بن مُطعِم، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مُشرکینِ مکہ نے حضورؐ کی صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا اور اس پر شق القمر کا معجزہ ان کو دکھایا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن مجید خود بھی اِس واقعہ کو رسالتِ محمدی کی نہیں بلکہ قُربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ البتہ یہ اِس لحاظ سے حضورؐ کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپؐ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں، یہ واقعہ اُن کی تصدیق کر رہا تھا۔

اعتراضات اور جوابات

معترضین اِس پر دو طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اوّل تو ان کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کہ چاند جیسے عظیم کُرے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں اور سینکڑوں میل کے فاصلے تک ایک دوسرے سے دُور جانے کے بعد پھر باہم جُڑ جائیں۔ دوسرے، وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہُوا ہوتا تو یہ واقعہ دُنیا بھر میں مشہور ہو جاتا، تاریخوں میں اس کا ذکر آتا، اور علمِ نجوم کی کتابوں میں اسے بیان کیا جاتا۔ لیکن درحقیقت یہ دونوں اعتراض بے بنیاد ہیں۔ جہاں تک اِس کے اِمکان کی بحث ہے، قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی، لیکن موجودہ زمانے میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کُرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے اور اس زبردست اِنفجار سے اس کے ٹکڑے دُور تک چلے جائیں، اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی طاقت کے سبب وہ ایک دوسرے سے آملیں۔ رہا دوسرا اعتراض تو وہ اس لیے بے وزن ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لحظہ کے لیے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اُس خاص لمحے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوتی ہوں۔ اس سے کوئی دھما کا نہیں ہُوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اِس کی نہ تھی کہ لوگ اس کے منتظر ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوتے۔ پُوری رُوئے زمین پر اُسے دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ صرف عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اُس وقت چاند نکلا ہُوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اُس وقت تک اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مشرقی

ممالک میں جن لوگوں نے اسے دیکھا ہوتا وہ اُسے ثبت کر لیتے اور کسی مؤرخ کے پاس یہ شہادتیں جمع ہوتیں اور وہ تاریخ کی کسی کتاب میں ان کو درج کر لیتا۔ تاہم مالابار کی تاریخوں میں اس کا ذکر آیا ہے کہ اُس رات وہاں ایک راجہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ رہیں علمِ نجوم کی کتابیں اور جنتریاں تو ان میں اس کا ذکر آنا صرف اس حالت میں ضروری تھا جب کہ چاند کی رفتار اور اس کی گردش کے راستے، اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اس سے کوئی فرق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی اس لیے قدیم زمانے کے اہلِ تنجیم کی توجہ اس کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ اُس زمانے میں رصد گاہیں اِس حد تک ترقی یافتہ نہ تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتیں اور اُس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔ [۱۷۷]

باب ۱

مسئلۂ شفاعت

فصل ۱

مسئلۂ شفاعت کے مختلف پہلو

[نبوت کی حقیقت سے مسئلۂ شفاعت کا گہرا تعلق دو وجہوں سے ہے: ایک اس وجہ سے کہ نبی اکرمؐ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے منکرین و مخالفین نے یہ کہہ کر عقیدۂ شفاعت کو اپنی ڈھال بنایا ہے کہ ہم جن بزرگوں کی اولاد ہیں اور جن بڑے بڑے دیوی دیوتاؤں کی عبادت کر کے ان کو خوش رکھتے ہیں، وہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہیں اور ان کی سفارش کی وجہ سے ہم اللہ کے چہیتے اور لاڈلے ہیں۔ سو ہمیں ہمارے اعمال کی وجہ سے خدا کے غضب اور عذاب سے ڈرنا بے معنی ہے۔ قرآن نے اِس تصورِ شفاعت کا سختی سے توڑ کیا ہے۔

دوسرے اس وجہ سے کہ قیامت میں انبیاء (اور تبعاً جزوی طور پر صُلحاء) کا اپنے ایسے پیروکاروں کے لیے شفاعت کرنا ثابت ہے جو مجموعی طور پر مرضیاتِ الٰہی کے مطابق اچھی زندگی گزارتے ہوئے بعض لغزشوں سے دوچار ہو گئے ہوں یا ان سے گناہوں کا صُدور بھی ہوتا رہا ہو اور وہ بار بار نادم ہو ہو کر اصلاح کی کوشش کرتے رہے ہوں۔

اِس لحاظ سے شفاعت کا تعلق منصبِ نبوّت سے ہے۔

اِن دو وجوہ کی بنا پر ہم نے مناسب سمجھا کہ ایک فصل مسئلۂ شفاعت پر بھی بنیادی مباحث میں شامل ہونی چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس سلسلے میں مولانا کے قلم سے نہایت مفید عبارات نکلی ہیں۔ مُرتّبین]

شفاعت کے مسئلے کو قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی شخص کو یہ جاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی کہ شفاعت کون کر سکتا ہے اور کون نہیں کر سکتا، کس حالت میں کی جاسکتی ہے اور کس حالت میں نہیں کی جاسکتی، کس کے لیے کی جاسکتی ہے اور کس کے لیے نہیں کی جاسکتی، اور کس کے حق میں نافع ہے اور کس کے حق میں نافع نہیں ہے۔ دُنیا میں چونکہ لوگوں کی گمراہی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب شفاعت کے بارے میں غلط عقائد بھی ہیں، اس لیے قرآن نے اِس مسئلے کو اتنا کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش

باقی نہیں چھوڑی۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۵ (آیت الکرسی) ملاحظہ ہو:

(۱) لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔

"آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، کون ہے جو اللہ کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔

(۲) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔

جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اُس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفتِ ادراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔"

خُدا کے ہاں کسی کا زور نہیں چلتا

پہلے حصّہ میں اُن مشرکین کے خیالات کا اِبطال کیا گیا ہے جو بزرگ انسانوں یا فرشتوں یا دوسری ہستیوں کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بڑا زور چلتا ہے، جس بات پر وہ اَڑ بیٹھیں وہ منوا کر چھوڑتے ہیں، اور جو کام چاہیں خدا سے لے سکتے ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ زور چلانا تو درکنار کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر اور کوئی مقرب ترین فرشتہ اُس بادشاہِ ارض وسما کے دربار میں بلا اجازت زبان تک کھولنے کی جرأت نہیں رکھتا۔[۱۷۸]

دوسرے حصّہ میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس سے شرک کی بنیادوں پر ایک اور ضرب لگتی ہے۔ پہلے حصّے میں اللہ تعالیٰ کی غیر محدُود حاکمیّت اور اس کے مطلق اختیارات کا تصوّر پیش کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی حکومت میں نہ تو کوئی بالاستقلال شریک ہے اور نہ کسی کا اس کے ہاں ایسا زور چلتا ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثرانداز ہو سکے۔ اب ایک دوسری حیثیت سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی دوسرا اُس کے کام میں دخل دے کیسے سکتا ہے، جبکہ کسی دوسرے کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظامِ کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں، یا جن، یا فرشتے یا دوسری مخلوقات، سب کا علم ناقص اور محدود ہے، کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں ہے۔ پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جُز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جاتے۔ نظامِ عالم تو رہا درکنار، بندے تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوندِ عالم ہی پوری طرح جانتا ہے، اور ان کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اُس خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں جو علم کا اصلی سرچشمہ ہے۔[۱۷۹]

مستحقِ عذاب لوگوں کے لیے کوئی سفارشی نہیں

سورۂ الانعام میں ارشاد ہے:

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ

اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے اُن سفارشیوں کو بھی

زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔
(الانعام: آیت ۹۴)

نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصّہ ہے۔ تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے۔"

دوسرے مقام پر اسی سورہ میں یوں ارشاد ہے:۔

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔
(الانعام: آیت ۵۱)

"(اے محمدؐ! تم اِس علم وحی) کے ذریعہ سے اِن لوگوں کو نصیحت کرو جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اُس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہو گا جو اُن کا حامی و مددگار ہو یا ان کی سفارش کرے، شاید کہ (اس نصیحت سے متنبّہ ہو کر) وہ خدا ترسی کی رَوِش اختیار کریں۔"

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دُنیا کی زندگی میں ایسے مدہوش ہیں کہ انہیں نہ موت کی فکر ہے نہ یہ خیال ہے کہ کبھی ہمیں اپنے خدا کو بھی مُنہ دکھانا ہے، ان پر تو یہ نصیحت ہرگز کارگر نہ ہو گی۔ اسی طرح اُن لوگوں پر بھی اس کا کچھ اثر نہ ہو گا جو اس بےبنیا بھروسے پر جی رہے ہیں کہ دُنیا میں ہم جو چاہیں کر گزریں، آخرت میں ہمارا بال تک بیکا نہ ہو گا کیونکہ ہم فلاں کے دامن گرفتہ ہیں یا فلاں ہماری سفارش کر دے گا، یا فلاں ہمارے لیے کفّارہ بن چکا ہے۔ [۱۸۰]

سُورۂ اعراف میں ارشاد ہے:

فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ۔
(آیت ۵۳)

"(آخرت میں یہ لوگ کہیں گے) پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں۔"

سُورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝
(آیت ۳)

"کوئی شفاعت (سفارش) کرنے والا نہیں ہے اِلّا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے، لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟"

مزید اسی سورہ کی آیت ۱۸ میں ارشاد ہے:

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ - قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ - (آیت ۱۸)

"یہ لوگ اللہ کے سوا اُن کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے محمدؐ ان سے کہو "کیا تم اللہ کو اُس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں۔ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اِس لیے کہ سب کچھ جو موجود ہے اللہ کے علم میں ہے۔ پس سفارشیوں کے معدوم ہونے کے لیے یہ ایک نہایت لطیف اندازِ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا نہیں کہ زمین یا آسمان میں کوئی اُس کے حضور تمہاری سفارش کرنے والا ہے، پھر یہ تم کن سفارشیوں کی اُس کو خبر دے رہے ہو؟ ۱۸۱ھ

سُورۃ المومن میں ارشاد ہے:

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ - (آیت ۱۸)

"ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔"

یہ بات بر سبیل تنزل کفار کے عقیدۂ شفاعت کی تردید کرتے ہوئے فرمائی گئی ہے۔ حقیقت میں تو وہاں ظالموں کا کوئی شفیع سرے سے ہوگا ہی نہیں، کیونکہ شفاعت کی اجازت اگر مل بھی سکتی ہے تو اللہ کے نیک بندوں کو مل سکتی ہے اور اللہ کے نیک بندے کبھی کافروں اور مشرکوں اور فساق و فجار کے دوست نہیں ہو سکتے کہ وہ اُنہیں بچانے کے لیے سفارش کا خیال بھی کریں۔ لیکن چونکہ کفار و مشرکین اور گمراہ لوگوں کا بالعموم یہ عقیدہ رہا ہے، اور آج بھی ہے کہ ہم جن بزرگوں کے دامن گرفتہ ہیں وہ کبھی ہمیں دوزخ میں نہ جانے دیں گے، بلکہ اَڑ کر کھڑے ہو جائیں گے اور بخشوا کر ہی چھوڑیں گے، اِس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ایسا شفیع کوئی بھی نہ ہوگا جس کی بات مانی جائے اور جس کی سفارش اللہ کو لازماً قبول ہی کرنی پڑے۔ ۱۸۲ھ

سفارش کے لیے پروانۂ اِذن ضروری ہے

سُورۂ مریم میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا -

"اُس وقت لوگ کوئی سفارش لانے پر قادر نہ ہوں گے بجز اُس کے جس نے رحمان کے حضور سے پروانہ

(آیت ۸۷)　　　　حاصل کر لیا ہو۔"

ایک مطلب تو اس کا یہ ہے کہ سفارش اُسی کے حق میں ہو گی جس نے پروانہ حاصل کیا ہو، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہی سفارش کر سکے گا جسے پروانہ ملا ہو۔ آیت کے الفاظ ایسے ہیں جو دونوں پہلوؤں پر یکساں روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ بات کہ سفارش صرف اسی کے حق میں ہو سکے گی جس نے رحمٰن سے پروانہ حاصل کر لیا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے دُنیا میں ایمان لا کر اور خدا سے کچھ تعلق جوڑ کر اپنے آپ کو خدا کے عفو و درگزر کا مستحق بنا لیا ہو[1] اسی کے حق میں سفارش کا امکان ہے۔ اور یہ بات کہ سفارش وہی کر سکے گا جس کو پروانہ ملا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے جن جن کو اپنا شفیع اور سفارشی سمجھ لیا ہے وہ سفارشیں کرنے کے مجاز نہ ہوں گے، بلکہ خدا خود جس کو اجازت دے گا وہی شفاعت کے لیے زبان کھول سکے گا۔[۱۸۳]

سُورۂ طٰہٰ میں ہے:

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا۔ (آیات ۱۰۹-۱۱۰)	"اُس روز شفاعت کارگر نہ ہو گی، اِلّا یہ کہ کسی کو رحمان اس کی اجازت دے اور اس کی بات سُننا پسند کرے۔ وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے۔ دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے۔"

---

[1] اس فقرے کا منشا یہ ہے کہ شفاعت خدا کے قانونِ جزا و سزا اور ضابطۂ مغفرت کے تحت آتی ہے۔ اور شفاعت سے بہرہ ور ہونے کے لیے ضروری ہے کہ بندہ خدا کے سامنے عفو و درگزر کا مستحق بن کے پیش ہو۔ مثلاً خدا کے قانونِ مغفرت کا ایک کلیہ اصولِ توبہ میں بیان ہوا ہے کہ توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو اطمینان سے ساری عمر گنہ در گنہ کے چکر میں پڑے پڑے گزار دیں، بلکہ توبہ صرف ایسے لوگوں کے لیے ہے جو گناہ سرزد ہو جانے پر پشیمان ہوں — بلکہ فوری طور پر (مِن قریب) پشیمان ہوں — توبہ کریں، اور ترکِ گنہ کر کے اپنی اصلاح کے لیے کوشاں ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ شفاعت کا استحقاق انہی بندوں کو حاصل ہو سکتا ہے جو کلیۂ توبہ کا صحیح تقاضا پورا کرتے ہوں۔ اِسی طرح دوسرے موقع پر استحقاقِ مغفرت پانے والوں کے لیے یہ تعریف بتائی گئی ہے کہ وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور کُھلی کُھلی بُرائیوں سے پرہیز کرتے ہیں، اور اگر ان سے غلطیاں سرزد ہوتی بھی ہیں تو نادانستگی میں چھوٹی چھوٹی لغزشوں کی حد تک۔ اس سے ایک آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ مغفرت اور شفاعت کا مستحق بن سکے گا یا نہیں۔ علاوہ بریں احادیث میں حضورؐ نے متعدد اعمال کے متعلق خود واضح فرما دیا ہے کہ مَیں ان کے لیے سفارش نہیں کروں گا۔　(مرتبین)

پہلی آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اوپر کیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ "اُس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی اِلاّ یہ کہ کسی کے حق میں رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کے لیے بات سننے پر راضی ہو۔" الفاظ ایسے جامع ہیں جو دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے روز کسی کو دم مارنے تک کی جرأت نہ ہوگی، کُجا کہ کوئی سفارش کے لیے بطورِ خود زبان کھول سکے۔ سفارش وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ بولنے کی اجازت دے اور اسی کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے بارگاہِ الٰہی سے سفارش کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ دونوں باتیں قرآن میں متعدد مقامات پر کھول کر بتا دی گئی ہیں۔ ایک طرف فرمایا مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ "کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کر سکے؟" (البقرہ۔ آیت ۲۵۵)۔ اور یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ (النبا۔ آیت ۳۸) "وہ دن جبکہ رُوح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہوں گے، ذرا بات نہ کریں گے، صرف وہی بول سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے۔"

دوسری طرف ارشاد ہوا وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ "وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اُس شخص کے جس کے حق میں سفارش سُننے پر (رحمٰن) راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں۔" (الانبیاء۔ آیت ۲۸)۔ اور کَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُھُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰہُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی۔ "کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی بجز اس صورت کے کہ اللہ سے اجازت لینے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سُننا چاہے اور پسند کرے" (النجم۔ آیت ۲۶)

شفاعت پر پابندی کی وجہ

طٰہٰ کی آیت میں یہ وجہ بتائی گئی ہے کہ شفاعت پر یہ پابندی کیوں ہے۔ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء، کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا کہ کس کا ریکارڈ کیسا ہے، کون دُنیا میں کیا کرتا رہا ہے، اور اللہ کی عدالت میں کس سیرت و کردار اور کیسی کیسی ذمہ داریوں کے بارے کر آیا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کو ہر ایک کے پچھلے کارناموں اور کرتوتوں کا بھی علم ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اب اُس کا مُوقف کیا ہے، نیک ہے تو کیسا نیک ہے اور مجرم ہے تو کس درجے کا مُجرم ہے، معافی کے قابل ہے یا نہیں، پُوری سزا کا مستحق ہے یا تخفیف اور رعایت بھی اس کے ساتھ کی جا سکتی ہے[1]۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ملائکہ اور انبیاء اور صُلحاء کو سفارش کی کُھلی چھٹی دے دی جائے اور ہر ایک جس کے

---

[1] دوسرے لفظوں میں شفاعت بھی دراصل ایک طرح کی شہادت ہے کہ کوئی شخص جس کا نامۂ اعمال پیش ہو رہا ہے فی الجملہ کس قسم کا آدمی تھا؟۔ قابلِ عذاب یا قابلِ مغفرت۔ (مرتبین)

حق میں جو سفارش چاہے کر دے۔ ایک معمولی افسر اپنے ذرا سے محکمے میں اگر اپنے ہر دوست یا عزیز کی سفارشیں سننے لگے تو چار
دن میں سارے محکمے کا ستیاناس کر کے رکھ دے گا۔ پھر بھلا زمین و آسمان کے فرمانروا سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے
ہاں سفارشوں کا بازار گرم ہو گا اور ہر بزرگ جا جا کر جس کو چاہیں گے بخشوا لیں گے، درآنحالیکہ ان میں سے کسی بزرگ کو بھی یہ
معلوم نہیں ہے کہ جن لوگوں کی سفارش وہ کر رہے ہیں ان کے نامۂ اعمال کیسے ہیں۔ دُنیا میں جو افسر کچھ بھی احساسِ ذمہ داری
رکھتا ہے اس کی روش یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کا کوئی دوست اس کے کسی قصور وار ماتحت کی سفارش لے کر جاتا ہے تو وہ
اس سے کہتا ہے کہ آپ کو خبر نہیں ہے کہ یہ شخص کتنا کام چور، نا فرض شناس، رشوت خور اور خلقِ خدا کو تنگ کرنے والا ہے۔
میں اس کے کرتوتوں سے واقف ہوں، اِس لیے آپ براہِ کرم مجھ سے اس کی سفارش نہ فرمائیں[1]۔ اسی چھوٹی سی مثال پر
قیاس کر کے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اِس آیت میں شفاعت کے متعلق جو قاعدہ بیان کیا گیا ہے وہ کس قدر صحیح، معقول
اور مبنی بر انصاف ہے۔ خدا کے ہاں شفاعت کا دروازہ بند نہ ہو گا۔ نیک بندے جو دُنیا میں خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی
کا برتاؤ کرنے کے عادی تھے، انہیں آخرت میں بھی ہمدردی کا حق ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن وہ سفارش کرنے
سے پہلے اجازت طلب کریں گے، اور جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انہیں بولنے کی اجازت دے گا صرف اُسی کے حق میں
وہ سفارش کر سکیں گے۔ پھر سفارش کے لیے بھی شرط یہ ہو گی کہ وہ مناسب اور مبنی بر حق ہو جیسا کہ وَقَالَ صَوَابًا ("اور
بات ٹھیک کہے") کا ارشادِ ربانی صاف بتا رہا ہے۔ بُونگی سفارشیں کرنے کی وہاں اجازت نہ ہو گی کہ ایک شخص دُنیا
میں سینکڑوں ہزاروں بندگانِ خدا کے حقوق مار آیا ہو اور کوئی بزرگ اٹھ کر سفارش کر دیں کہ حضور اسے انعام سے
سرفراز فرمائیں[2]۔ ۱۸۴ء

سورۃ النبأ میں ارشاد ہے:

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا	"جس روز روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے،
لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ	کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت

---

[1] حضورؐ نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ "میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے، اُن کو اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا اور اس پر انہیں نہ آنے دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا۔ پھر میں بھی ان کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دُور رہو۔" یہ مضمون بھی بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے (مؤلف)۔ حوالہ: بخاری، کتاب الرقاق، کتاب الفتن۔ مسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الفضائل۔ مُسند احمد، مرویات ابن مسعودؓ و ابوہریرہؓ ابن ماجہ، کتاب المناسک۔ ۱۸۵ء

[2] بلکہ اُلٹا انبیاء اپنے مجرم و منحرف پیروکاروں کے خلاف سزا دہی کی سفارش کریں گے جیسا کہ قرآن میں ایک گروہ کے متعلق حضورؐ کا یہ بیان سامنے لایا گیا ہے کہ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (فرقان)

وَقَالَ صَوَابًا (آیت ۳۸) دے اور جو ٹھیک بات کہے۔"

بولنے سے مُراد شفاعت ہے اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہوگی۔ ایک شرط یہ کہ جس شخص کو جس گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی صرف وُہی شخص اُسی کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ دوسری شرط یہ کہ شفاعت کرنے والا بجا اور درست بات کہے، بے جا نوعیت کی سفارش نہ کرے۔ اور جس کے معاملہ میں وہ سفارش کر رہا ہو وہ دنیا میں کم از کم کلمۂ حق کا قائل رہا ہو یعنی محض گناہ گار ہو، کافر نہ ہو۔[۱۸۶]

مُشرکین کے مزعُومہ سفارشی

سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ۔ (آیت ۲۸)

"جو کچھ اُن کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے جس کے حق میں سفارش سُننے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں۔"

مُشرکین فرشتوں کو دو وجوہ سے معبُود بناتے تھے۔ ایک یہ کہ اُن کے نزدیک وہ خدا کی اولاد تھے، دوسرے یہ کہ وہ اُن کی پرستش (خوشامد) کر کے انہیں خُدا کے ہاں اپنا شفیع (سفارشی) بنانا چاہتے تھے۔ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ (یُونس آیت ۱۸) اور مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (الزُّمَر۔ آیت ۳)۔ اِن آیات میں دونوں وجوہ کی تردید کر دی گئی ہے۔

اِس جگہ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن بالعموم شفاعت کے مُشرکانہ عقیدے کی تردید کرتے ہوئے اِس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ جنہیں تم شفیع قرار دیتے ہو وہ علمِ غیب نہیں رکھتے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اُن باتوں کو بھی جانتا ہے جو اُن کے سامنے ہیں اور اُن باتوں کو بھی جو اُن سے اوجھل ہیں۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ آخر ان کو سفارش کرنے کا مطلق اور غیر مشروط اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ ہر شخص کے اگلے پچھلے اور پوشیدہ و ظاہر حالات سے واقف نہیں ہیں۔ اِس لیے خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء و صالحین ہر ایک کا اختیارِ شفاعت لازماً اِس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی کے حق میں شفاعت کی اجازت دے۔ بطورِ خود ہر کس و ناکس کی شفاعت کر دینے کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے۔ اور جب شفاعت سُننا یا نہ سننا اور اُسے قبول کرنا یہ نہ کرنا بالکل اللہ کی مرضی پر موقوف ہے تو ایسے بے اختیار شفیع اس قابل کب ہو سکتے ہیں کہ ان کے آگے سرِ نیاز جھکایا جائے اور دستِ سوال دراز کیا جائے۔[۱۸۷]

سورۃ سبا میں ارشاد ہے:

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ۔ (سبا - ۲۳)	"اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجز اُس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو"۔

یعنی کسی کا خود مالک ہونا یا ملکیت میں شریک ہونا یا مددگارِ خدا ہونا تو درکنار ساری کائنات میں کوئی ایسی ہستی تک نہیں پائی جاتی جو اللہ تعالیٰ کے حضور کسی کے حق میں بطورِ خود سفارش کر سکے۔ تم لوگ اِس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ خدا کے کچھ پیارے ایسے ہیں، یا خدا کی خدائی میں کچھ بندے ایسے زور آور ہیں کہ وہ اَڑ بیٹھیں تو خدا کو ان کی سفارش ماننی ہی پڑے گی۔ حالانکہ وہاں حال یہ ہے کہ اجازت لیے بغیر کوئی زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جس کو اجازت ملے گی صرف وہی کچھ عرض کر سکے گا اور جس کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت ملے گی اسی کے حق میں عرض معروض کی جا سکے گی۔

پھر آگے چل کر اسی آیت میں ارشاد ہوا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (سبا - آیت ۲۳)	"حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی تو وہ (سفارش کرنے والوں سے) پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا جواب دیا۔ وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے۔ اور وہ بزرگ و برتر ہے"۔

یہاں اُس وقت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جب قیامت کے روز کوئی سفارش کرنے والا کسی کے حق میں سفارش کی اجازت طلب کرے گا۔ اس نقشے میں یہ کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے کہ طلبِ اجازت کی درخواست بھیجنے کے بعد شافع اور مشفوع دونوں نہایت بے چینی کے عالم میں ڈرتے اور کانپتے ہوئے جواب کے منتظر کھڑے ہیں۔ آخر کار جب اُوپر سے اجازت آ جاتی ہے اور شافع کے چہرے سے مشفوع بھانپ جاتا ہے کہ معاملہ کچھ اطمینان بخش ہے تو اس کی جان میں جان آتی ہے اور وہ آگے بڑھ کر شافع سے پوچھتا ہے "کیا جواب آیا؟" شافع جواب دیتا ہے کہ ٹھیک ہے اجازت مل گئی ہے[1]۔

اِس بیان سے جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ نادانو! جس بڑے دربار کی شان یہ ہے اُس کے متعلق تم کس خیالِ خام میں پڑے ہوئے ہو کہ وہاں کوئی اپنے زور سے تم کو بخشوائے گا یا کسی کی یہ مجال ہو گی کہ وہاں

---

[1] قیامت میں انبیاء کے عاجزانہ اندازِ شفاعت کا نقشہ سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں کھینچا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنے پیرووں کی کس انداز سے سفارش کریں گے۔ پہلے وہ سوالات کے جواب میں شہادت دیں گے اور پھر کہیں گے کہ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اس لطیف جملے کے پہلے حصے میں بھی سفارش کا لہجہ جھلکتا ہے، مگر اندازِ پُرزور مطالبے اور تقاضے کا نہیں۔ (مرتبین)

مچل کر بیٹھ جائے اور اللہ سے کہے کہ یہ تو میرے متوسّل ہیں انہیں تو بخشنا ہی پڑے گا۔ ۱۸۹

سورۂ الدخان میں ارشاد باری ہے:

يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۔ (الدخان - ۴۱-۴۲)	"وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے کچھ بھی کام نہ آئے گا، اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے، وہ زبردست اور رحیم ہے"۔

ان فقروں میں بتایا گیا ہے کہ فیصلے کے دن جو عدالت قائم ہوگی اس کا کیا رنگ ہوگا۔ کسی کی مدد یا حمایت وہاں کسی مجرم کو نہ چھڑا سکے گی نہ اس کی سزا کم ہی کرا سکے گی۔ کُلّی اختیارات اس حاکمِ حقیقی کے ہاتھ میں ہوں گے جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی اور جس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کا بل بوتا کسی میں نہیں ہے۔ یہ بالکل اس کے اپنے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہوگا کہ کسی پر رحم فرما کر اس کو سزا نہ دے یا کم سزا دے، اور حقیقت میں اس کی شان یہی ہے کہ انصاف کرنے میں بے رحمی سے نہیں بلکہ رحم ہی سے کام لے۔ لیکن جس مقدمے میں جو فیصلہ بھی وہ کرے گا وہ بہرحال بے کم و کاست نافذ ہوگا۔ عدالتِ الٰہی کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد آگے کے چند فقروں میں بتایا گیا ہے کہ اس عدالت میں جو لوگ مُجرم ثابت ہوں گے ان کا انجام کیا ہوگا اور جن لوگوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ دُنیا میں خدا سے ڈر کر نافرمانیوں سے پرہیز کرتے رہے تھے ان کو کن انعامات سے سرفراز کیا جائے گا۔ ۱۹۰

بیٹے کے لیے حضرت نوحؑ کی دُعا کی مثال

سورۂ ہود میں حضرت ابراہیمؑ کے قصّہ (آیات ۶۹ تا ۷۶) کے مخاطب قریش کے لوگ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کی وجہ ہی سے تمام عرب کے پیرزادے، کعبۃ اللہ کے مجاور اور مذہبی و اخلاقی اور سیاسی و تمدّنی پیشوائی کے مالک بنے ہوئے تھے اور اس گھمنڈ میں مبتلا تھے کہ ہم پر خدا کا غضب کیسے نازل ہو سکتا ہے جبکہ ہم خدا کے اُس پیارے بندے کی اولاد ہیں اور وہ خدا کے دربار میں ہماری سفارش کرنے کو موجود ہے۔ اِس پندارِ غلط کو توڑنے کے لیے پہلے تو انہیں یہ منظر دکھایا گیا کہ حضرت نوحؑ جیسا عظیم الشّان پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشے کو ڈوبتے دیکھ رہا ہے اور تڑپ کر خدا سے دُعا کرتا ہے کہ اس کے بیٹے کو بچا لیا جائے۔ مگر صرف یہی نہیں کہ اس کی سفارش بیٹے کے کچھ کام نہیں آتی، بلکہ اس سفارش پر باپ کو اُلٹی ڈانٹ سُننی پڑتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا منظر خود حضرت ابراہیمؑ کا دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ان پر بے پایاں عنایات ہیں اور نہایت پیار کے انداز میں ان کا ذکر ہو رہا ہے، مگر دوسری طرف جب وہی ابراہیم خلیلؑ انصاف کے معاملہ میں دخل دیتے ہیں تو ان کے اصرار و الحاح کے باوجود اللہ تعالیٰ مجرم قوم (قومِ لوط) کے معاملے میں اُن کی سفارش کو رد کر دیتا ہے۔ ۱۹۱

پھر اسی سُورۂ ہود میں آگے چل کر فرمایا:

یَوْمَ یَاْتِ لَا تَکَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (ہُود - آیت ۱۰۵)

جب وہ (قیامت کا دن) آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہو گی اِلّا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے"

یعنی یہ بے وقوف لوگ اپنی جگہ اس بھروسے میں ہیں کہ فلاں حضرت ہماری سفارش کر کے ہمیں بچا لیں گے، فلاں بزرگ اَڑ کر بیٹھ جائیں گے اور اپنے ایک ایک مُتوسّل کو بخشوائے بغیر نہ مانیں گے، فلاں صاحب جو اللہ میاں کے چہیتے ہیں جنت کے راستے میں مچل بیٹھیں گے اور اپنے دامن گرفتوں کی بخشش کا پروانہ لے کر ہی ٹلیں گے۔ حالانکہ اَڑنا اور مچلنا کیسا، اُس پُر جلال عدالت میں تو کسی بڑے سے بڑے انسان اور کسی مُعزز سے معزز فرشتے کو بھی مجالِ دم زدن تک نہ ہو گی اور اگر کوئی کچھ کہہ بھی سکے گا تو اُس وقت جبکہ احکم الحاکمین خود اسے کچھ عرض کرنے کی اجازت دے دے[1]۔ ۱۹۲

دُنیوی زندگی میں خدا کے ہاں سفارش کا مشرکانہ تصوُّر

سُورہ النحل میں ارشاد ہے:

اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَۃِ اللّٰہِ ھُمْ یَکْفُرُوْنَ۔ (آیت ۷۲)

"پھر کیا یہ لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں؟"

اگرچہ مشرکینِ مکّہ اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں، اور اِن نعمتوں پر اللہ کا احسان ماننے سے بھی اُنہیں انکار نہ تھا، لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی کہ اِن نعمتوں پر اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن بہت سی ہستیوں کا شکریہ بھی زبان اور عمل سے ادا کرتے تھے جن کو انہوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی سند کے اِس نعمت بخشی میں دخیل اور حصّہ دار ٹھیرا رکھا تھا۔ اِسی چیز کو قرآن "اللہ کے احسان کا انکار" قرار دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بطور ایک قاعدۂ کلّیہ کے پیش کی گئی ہے کہ مُحسن کے احسان کا شکریہ غیر مُحسن کو ادا کرنا دراصل مُحسن کے احسان کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اُصُول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ مُحسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا کہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ فلاں شخص کے طفیل، یا فلاں کی رعایت سے، یا فلاں کی سفارش سے، یا فلاں کی مداخلت سے کیا ہے، یہ بھی دراصل اس کے احسان کا انکار ہی ہے۔

یہ دونوں اصُولی باتیں سراسر انصاف اور عقلِ عام کے مطابق ہیں۔ ہر شخص خود بادنیٰ تامُّل ان کی معقولیت سمجھ سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک حاجت مند آدمی پر رحم کھا کر اس کی مدد کرتے ہیں اور وُہ اُسی وقت اُٹھ کر آپ کے سامنے ایک دُوسرے

---

[1] پس جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے غیر اللہ کے آستانوں پر نذریں اور نیازیں چڑھا رہے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں بڑا اثر و رسُوخ رکھتے ہیں اور ان کی سفارش کے بھروسے پر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیے جا رہے ہیں، ان کو وہاں سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ۱۹۳

آدمی کا شکریہ ادا کر دیتا ہے جس کا اِس امداد میں کوئی دخل نہ تھا۔ آپ چاہے اپنی فراخ دلی کی بنا پر اُس کی اِس بیہودگی کو نظر انداز کر دیں اور آئندہ بھی اپنی امداد کا سلسلہ جاری رکھیں، مگر اپنے دل میں یہ ضرور سمجھیں گے کہ یہ ایک نہایت بدتمیز اور احسان فراموش آدمی ہے۔ پھر اگر دریافت کرنے پر آپ کو معلوم ہو کہ اس شخص نے یہ حرکت اِس خیال کی بنا پر کی تھی کہ آپ نے اس کی جو کچھ بھی مدد کی ہے وہ اپنی نیک دلی اور فیاضی کی وجہ سے نہیں کی بلکہ اُس دوسرے شخص کی خاطر کی ہے، درآنحالیکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو آپ لامحالہ اُسے اپنی توہین سمجھیں گے۔ اُس کی اِس بیہودہ تاویل کا صریح مطلب آپ کے نزدیک یہ ہوگا کہ وہ آپ سے سخت بدگمان ہے اور آپ کے متعلق یہ رائے رکھتا ہے کہ آپ کوئی رحیم اور شفیق انسان نہیں ہیں بلکہ محض ایک دوست نواز اور یار باش آدمی ہیں، چند لگے بندھے دوستوں کے توسّل سے کوئی آئے تو آپ اس کی مدد اُن دوستوں کی خاطر کر دیتے ہیں ورنہ آپ کے ہاتھ سے کسی کو کچھ فیض حاصل نہیں ہو سکتا۔ [۱۹۴]

سورۂ نحل ہی میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (آیت ۸۳)	"یہ اللہ کے احسان کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو حق ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

انکار سے مُراد وہی طرزِ عمل ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کفّارِ مکہ اِس بات کے منکر نہ تھے کہ یہ سارے احسانات اللہ نے اُن پر کیے ہیں۔ مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ نے یہ احسانات ان کے بزرگوں اور دیوتاؤں کی مداخلت سے کیے ہیں، اور اسی بنا پر وہ ان احسانات کا شکریہ اللہ کے ساتھ بلکہ کچھ اللہ سے بھی بڑھ کر ان متوسّط ہستیوں کو ادا کرتے تھے۔ اسی حرکت کو اللہ تعالیٰ انکارِ نعمت اور احسان فراموشی اور کفران سے تعبیر کرتا ہے۔ [۱۹۵]

سورۃ الحج میں ارشاد گرامی ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ، يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ، وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔ (آیت ۷۵-۷۶)	"حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لیے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ وہ سمیع اور بصیر ہے۔ اور جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ اور سارے معاملات اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ مشرکین نے مخلوقات میں سے جن جن ہستیوں کو معبود بنایا ہے ان میں افضل ترین مخلوق یا ملائکہ ہیں یا انبیاء۔ اور اُن کی حیثیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے احکام پہنچانے کا ذریعہ ہیں جن کو اُس نے

اِس خدمت کے لیے چُن لیا ہے۔ محض یہ فضیلت اُن کو خدا یا خدائی میں اللہ کا شریک تو نہیں بنا دیتی۔ رہا یہ فقرہ کہ "جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اُس سے بھی وہ واقف ہے" تو یہ قرآن مجید میں بالعموم شفاعت کے مُشرکانہ عقیدے کی تردید کے لیے آیا کرتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر پچھلے فقرے کے بعد اسے ارشاد فرمانے کا مطلب یہ ہُوا کہ ملائکہ اور انبیاء و صلحاء کو بذاتِ خود حاجت روا اور مشکل کُشا سمجھ کر نہ سہی اللہ کے ہاں سفارشی سمجھ کر بھی اگر تم پُوجتے ہو تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ سب کچھ دیکھنے اور سُننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، ہر شخص کے ظاہر و مخفی حالات وہی جانتا ہے، دُنیا کے کُھلے اور چُھپے مصالح سے بھی وہی واقف ہے۔ ملائکہ اور انبیاء سمیت کسی مخلوق کو بھی ٹھیک معلوم نہیں ہے کہ کس وقت کیا کہنا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ نے اپنی مقرب ترین مخلوق کو بھی یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس کے اِذن کے بغیر جو سفارش چاہیں کر بیٹھیں اور ان کی سفارش قبول ہو جائے۔ ۱۹۶

سُورۃ الزُّمر میں ارشاد ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ، قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَعْقِلُوْنَ ۔ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ (آیت ۴۳-۴۴)	"کیا اُس خدا کو چھوڑ کر اِن لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو، کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے، پھر اُسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔"

یعنی ایک تو اِن لوگوں نے اپنے طور پر خود ہی یہ فرض کر لیا کہ کچھ ہستیاں اللہ کے ہاں بڑی زور آور ہیں جن کی سفارش کسی طرح ٹل نہیں سکتی حالانکہ کسی کا یہ زور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں خود سفارشی بن کر ہی اُٹھ سکے، کجا کہ اپنی سفارش منوا لینے کی طاقت بھی اس میں ہو۔ پھر ان کے سفارشی ہونے پر نہ کوئی دلیل، نہ اللہ تعالیٰ نے کبھی یہ فرمایا کہ ان کو میرے ہاں یہ مرتبہ حاصل ہے اور نہ خود اُن ہستیوں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ ہم اپنے زور سے تمہارے سارے کام بنوا دیا کریں گے۔ اس پر مزید حماقت ان لوگوں کی یہ ہے کہ اصل مالک کو چھوڑ کر ان فرضی سفارشیوں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور ان کی ساری نیاز مندیاں اُنہی کے لیے وقف ہیں۔ ۱۹۷

سُورۃ النجم میں ارشاد باری ہے:

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ	"آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں، اُن کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آسکتی جب تک کہ

بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡضٰی۔
(آیت ۲۶)

اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دے جس کے لیے وہ کوئی عرضداشت سُننا چاہے اور اس کو پسند کرے۔"

یعنی تمام فرشتے مل کر بھی اگر کسی کی شفاعت کریں تو وہ اس کے حق میں نافع نہیں ہو سکتی کجا کہ تمہارے اِن بناوٹی معبُودوں کی شفاعت کسی کی بگڑی بنا سکے۔ خدائی کے اختیارات سارے کے سارے بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہیں فرشتے بھی اس کے حضور کسی کی سفارش کرنے کی اس وقت تک جسارت نہیں کر سکتے جب تک وہ انہیں اس کی اجازت نہ دے اور کسی کے حق میں ان کی سفارش سُننے پر راضی نہ ہو۔ [۱۹۸]

اللہ کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا

سُورۃ الرَّعۡد میں اس طرح ارشاد ہے:

وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَہٗ ۔ وَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّالٍ ۔
(آیت ۱۱)

"اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔"

یعنی اِس غلط فہمی میں بھی نہ رہو کہ اللہ کے ہاں کوئی پیر یا فقیر یا کوئی اگلا پچھلا بزرگ، یا کوئی جن یا فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ تم خواہ کچھ ہی کرتے رہو وہ تمہاری نذروں اور نیازوں کی رشوت لے کر تمہیں تمہارے بُرے اعمال کی پاداش سے بچا لے گا۔ [۱۹۹]

شفاعت کے دروازے کی بندش

اِسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ سَبۡعِیۡنَ مَرَّۃً فَلَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَہُمۡ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ۔
(سورۃ توبہ۔ آیت ۸۰)

"اے نبی! تم خواہ ایسے لوگوں (یعنی منافقین) کے لیے معافی کی درخواست کرو، یا نہ کرو، اگر تم ستّر مرتبہ بھی انہیں معاف کر دینے کی درخواست کروگے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسُول کے ساتھ کفر کیا ہے۔ اور اللہ فاسق لوگوں کو راہِ نجات نہیں دکھاتا۔"

سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ ؕ لَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ۔

"اے نبی، تم چاہے اِن (منافقین) کے لیے مغفرت کی دُعا کرو یا نہ کرو، ان کے لیے یکساں ہے، اللہ ہرگز انہیں معاف نہ کرے گا، اللہ فاسق لوگوں کو

ہرگز ہدایت نہیں دیتا" (المنافقون۔ آیت ۶)

یہ بات سورۂ توبہ میں (جو سورۂ منافقون کے تین سال بعد نازل ہوئی ہے) اور زیادہ تاکید کے ساتھ فرما دی گئی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے منافقین کے متعلق فرمایا کہ "تم چاہے ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرو گے تو اللہ اُن کو ہرگز معاف نہ کرے گا۔ یہ اس لیے کہ اُنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول سے کفر کیا ہے۔ اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا" (التوبہ آیت ۸۰)

آگے چل کر پھر فرمایا "اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کی نماز جنازہ کبھی نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔ اِن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے اور یہ فاسق ہونے کی حالت میں مرے ہیں"۔ (التوبہ ۸۴ تفہیم)

اِس آیت میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دعائے مغفرت صرف ہدایت یافتہ لوگوں ہی کے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔ جو شخص ہدایت سے پھر گیا ہو اور جس نے اطاعت کے بجائے فسق و نافرمانی کی راہ اختیار کر لی ہو، اس کے لیے کوئی عام آدمی تو درکنار، خود اللہ کا رسول بھی مغفرت کی دعا کرے تو اُسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کو ہدایت بخشنا اللہ کا طریقہ نہیں ہے جو اس کی ہدایت کے طالب نہ ہوں۔ اگر ایک بندہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے منہ موڑ رہا ہو، بلکہ ہدایت کی طرف اسے بلایا جائے تو سر جھٹک کر غرور کے ساتھ اس دعوت کو رد کر دے تو اللہ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے اپنی ہدایت لیے پھرے اور خوشامد کر کے اسے راہ ہدایت پر لائے۔[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت شافع روزِ محشر

اسلامی عقیدۂ شفاعت تو قرآن و حدیث کی رُو سے یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں شفاعت صرف وہ کر سکے گا جس کو اللہ اجازت دے اور صرف اُسی شخص کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے اللہ اجازت دے۔ ملاحظہ ہو: يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا۔ لَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ۔ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ۔

---

[۱] قرآن کی اِن آیات سے اور ایسی ہی بعض دوسری آیات سے ایک اہم حقیقت کی طرف رہنمائی ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی زبان سے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قیامت میں کیسے لوگوں کے لیے اور کیسے اعمال کے مرتکبین کے لیے کوئی سفارش کارگر نہ ہو گی۔ متعدد احادیث اس بارے میں قطعی ہیں۔ اِس حقیقت کی روشنی میں شفاعت کے اُس مروجہ تصور کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی جس سے سرشار ہو کر لوگ دھڑتے سے ترکِ عبادات کرتے ہیں۔ احکامِ دین کی اطاعت سے بے نیاز رہتے ہیں اور ہر من پسند گناہ میں مگن رہتے ہیں۔ (مرتبین)

اِس قاعدے کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں یقیناً شفاعت فرمائیں گے، مگر یہ شفاعت اللہ کے اذن سے ہوگی اور اُن اہلِ ایمان کے حق میں ہوگی جو اپنی حدِ وسع تک نیک عمل کرنے کی کوشش کے باوجود کچھ گناہوں میں آلودہ ہوگئے ہوں۔ جان بُوجھ کر خیانتیں اور بدکاریاں کرنے والے اور کبھی خدا سے نہ ڈرنے والے لوگ حضورؐ کی شفاعت کے مستحق نہیں ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضورؐ کا ایک طویل خطبہ مروی ہے جس میں آپؐ جرمِ خیانت کی شدت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز یہ خائن لوگ اِس حالت میں آئیں گے کہ ان کی گردن پر ان کا خیانت سے حاصل کیا ہوا مال لدا ہوگا اور وہ مجھے پکاریں گے کہ یا رسُول اللہ اغثنی! (یا رسُول اللہ! میری مدد فرمائیے) مگر مَیں جواب دوں گا کہ "لا املك لك شیئًا قد ابلغتك (میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا، مَیں نے تجھ تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا"۔ (ملاحظہ ہو مشکوٰۃ، باب قسمۃ الغنائم، الغلول فیہا) ۔۲۰۲

باب ۱۱

پیشین گوئیاں

حضورؐ کی چند اہم پیشین گوئیاں

انبیاء علیہم السلام کی طرف سے ایسی پیشین گوئیاں صادر ہوتی ہیں جو بالکل سچی ثابت ہوتی ہیں حالانکہ بسا اوقات ان کے پورا ہونے کا وقت خاصی دیر سے آتا ہے اور بظاہر جن حالات میں کوئی پیشین گوئی کی گئی ہوتی ہے ان کو دیکھ کر عقلاً یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کوئی پیشین گوئی پوری ہو کے رہیگی۔

سچی پیشین گوئیاں علاماتِ نبوّت میں سے ہیں اور ایک لحاظ سے ان میں معجزاتی پہلو پایا جاتا ہے۔ نجومیوں اور فال گیروں کی تک بازیوں کا معاملہ یہ رہا ہے کہ ان میں کچھ چیزیں کسی درجے اور کسی شکل میں کسی موقع پر پوری ہو جاتی ہیں، لیکن انبیاء کی پیشین گوئیاں چونکہ علمِ الٰہی پر مبنی ہوتی ہیں اس لیے وہ بالکل قاطع ہوتی ہیں۔

حضورؐ کی پیشین گوئیاں ایک وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے، دوسری وہ ہیں جو احادیثِ صحیحہ میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے جس قدر تعداد کو ہم جنابِ مؤلف کی تحریروں سے برآمد کر سکے ہیں، یہاں یکجا کر دی گئی ہیں۔

(مُرتّبین)

فصل ۱

قرآن کی پیشین گوئیاں

روشن مستقبل

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔ (الضحیٰ۔ آیت ۴)

اور تقیناً تمہارے لیے بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہے۔

یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جبکہ چند مٹھی بھر آدمی آپ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپ کی مخالف تھی، بظاہر کامیابی کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ اسلام کی شمع مکّہ ہی میں ٹمٹما رہی تھی اور اسے بُجھا دینے کے لیے ہر طرف طوفان اُٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا کہ ابتدائی دَور کی مشکلات سے آپ ذرا پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے آپ کے لیے بہتر ثابت ہو گا۔ آپ کی قوت، آپ کی عزّت و شوکت اور آپ کی قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپ کا نفوذ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔ پھر یہ وعدہ صرف دُنیا ہی تک محدُود نہیں ہے، اس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپ کو ملے گا وہ اُس مرتبے سے بھی بدرجہا بڑھ کر ہو گا جو دنیا میں آپ کو حاصل ہو گا۔ طَبَرانی نے اوسط میں اور بَیہقی نے دلائل میں ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میرے سامنے وہ تمام کامیابیاں پیش کی گئیں جو میرے بعد میری اُمّت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اِس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آخرت تمہارے لیے دُنیا سے بھی بہتر ہے"۔[۲۰۳]

غلبۂ دین کی پیشین گوئی

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ (الضحیٰ۔ آیت ۵)

"اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

یعنی اگرچہ دینے میں کچھ دیر تو لگے گی، لیکن وہ وقت دُور نہیں ہے جب تم پر تمہارے رب کی عطا و بخشش کی وہ بارش ہو گی کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ یہ وعدہ حضورؐ کی زندگی ہی میں اس طرح پُورا ہُوا کہ سارا ملکِ عرب جُنوب کے سواحل سے لے کر شمال میں سلطنتِ روم کی شامی اور سلطنتِ فارس کی عراقی سرحدوں تک، اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر

مغرب میں بحرِ احمر تک آپؐ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ضابطہ کی تابع ہو گئی، جو طاقت بھی اس سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو کر رہ گئی، کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ سے وہ پُورا ملک گونج اُٹھا جس میں مشرکین اور اہلِ کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دم تک ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، لوگوں کے صرف سر ہی اطاعت میں نہیں جھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مُسخّر ہو گئے اور عقائد، اخلاق اور اعمال میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ پُوری تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ ایک جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم صرف ۲۳ سال کے اندر اتنی بدل گئی ہو۔ اِس کے بعد حضورؐ کی برپا کی ہوئی تحریک اس طاقت کے ساتھ اُٹھی کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر وہ چھا گئی اور دُنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دُنیا میں دیا اور آخرت میں جو کچھ دے گا اس کی عظمت کا تصوّر بھی کوئی نہیں کر سکتا۔[۲۰۴]

یہ اللہ کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ ایک ناتراشیدہ اُمّی قوم میں اُس نے ایسا عظیم نبی پیدا کیا جس کی تعلیم و ہدایت اِس درجہ انقلاب انگیز ہے، اور پھر ایسے عالمگیر ابدی اصولوں کی حامل ہے جن پر تمام نوعِ انسانی مل کر ایک اُمّت بن سکتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ان اُصولوں سے رہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔ کوئی بناوٹی انسان خواہ کتنی ہی کوشش کر لیتا، یہ مقام و مرتبہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ عرب جیسی پسماندہ قوم تو درکنار، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی قوم کا کوئی ذہین سے ذہین آدمی بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کی اس طرح مکمل طور پر کایا پلٹ دے، اور پھر ایسے جامع اصول دُنیا کو دے دے جن پر ساری نوعِ انسانی ایک اُمّت بن کر ایک دین اور ایک تہذیب کا عالمگیر و ہمہ گیر نظام ابد تک چلانے کے قابل ہو جائے۔ یہ ایک معجزہ ہے جو اللہ کی قدرت سے رُونما ہُوا ہے، اور اللہ ہی نے اپنی حکمت کی بنا پر جس شخص، جس ملک، اور جس قوم کو چاہا ہے اِس کے لیے انتخاب کیا ہے۔ اِس پر اگر کسی بے وقوف کا دِل دُکھتا ہے تو دُکھتا رہے۔[۲۰۵]

بہتر دَور کی یقین دہانی

سُورۃ الضّحیٰ کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دینا ہے اور مقصد اُس پریشانی کو دُور کرنا ہے جو نزولِ وحی کا سلسلہ رُک جانے سے آپ کو لاحق ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے روزِ روشن اور سکونِ شب کی قسم کھا کر آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپؐ کے رب نے آپؐ کو ہرگز نہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ آپؐ سے ناراض ہُوا ہے۔ اس کے بعد آپؐ کو خوشخبری دی گئی ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ابتدائی دَور میں جن شدید مشکلات سے آپؐ کو سابقہ پیش آ رہا ہے یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ آپؐ کے لیے ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہوتا چلا جائے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی عطاء و بخشش کی ایسی بارش کرے گا جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔ یہ قرآن کی اُن صریح پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے جو بعد میں حرف بحرف پُوری ہُوئیں، حالانکہ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اُس

وقت کہیں دُور دُور تک بھی اِس کے آثار نظر نہ آتے تھے کہ مکہ میں جو بے یار و مددگار انسان پُوری قوم کی جاہلیت کے مقابلے میں برسرِ پیکار ہو گیا ہے اُسے اِتنی حیرت انگیز کامیابی نصیب ہو گی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم سے فرمایا ہے کہ تمہیں یہ پریشانی کیسے لاحق ہو گئی کہ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور ہم تم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ ہم تو تمہارے روزِ پیدائش سے مُسلسل تم پر مہربانیاں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تم یتیم پیدا ہوتے تھے، ہم نے تمہاری پرورش اور خبر گیری کا بہترین انتظام کر دیا۔ تم ناواقفِ راہ تھے، ہم نے تمہیں راستہ بتایا۔ تم نادار تھے، ہم نے تمہیں مالدار بنا دیا۔ یہ ساری باتیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم ابتدا سے ہمارے منظورِ نظر ہو اور ہمارا فضل و کرم مستقل طور پر تمہارے شاملِ حال ہے۔ ۲۰۶ء

بوجھ اُتارنے کا مفہوم

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ (الم نشرح: ۱-۲)	"(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا"

مفسرین میں سے بعض نے اِس کا مطلب یہ لیا ہے کہ نبوت سے پہلے ایامِ جاہلیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے کچھ قصور ایسے ہو گئے تھے جن کی فکر آپؐ کو سخت گراں گزر رہی تھی اور یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مطمئن کر دیا کہ آپؐ کے وہ قصور ہم نے معاف کر دیئے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ معنی لینا سخت غلطی ہے۔ اوّل تو لفظِ وِزر کے معنی لازماً گناہ ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ بھاری بوجھ کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو خواہ مخواہ بُرے معنی میں لیا جائے۔ دوسرے حضورؐ کی نبوت سے پہلے کی زندگی بھی اِس قدر پاکیزہ تھی کہ قرآن میں مخالفین کے سامنے اُس کو ایک چیلنج کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے کُفّار کو مخاطب کر کے یہ کہلوایا گیا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ "میں اِس قرآن کو پیش کرنے سے پہلے تمہارے درمیان ایک عُمر گزار چکا ہوں" (یُونس، آیت ۱۶)۔ اور حضورؐ اس کردار کے آدمی بھی نہ تھے کہ لوگوں سے چھپ کر آپؐ نے کوئی گناہ کیا ہو۔ معاذ اللہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تو اس سے ناواقف نہ ہو سکتا تھا کہ جو شخص کوئی چھپا ہوا داغ اپنے دامن پر لیے ہوتے ہوتا اُس سے خلقِ خدا کے سامنے برملا وہ بات کہلواتا جو سُورۂ یُونس کی مذکورۂ بالا آیت میں اُس نے کہلوائی ہے۔ پس درحقیقت اِس آیت میں وِزر کے صحیح معنی بوجھ کے ہیں اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا بوجھ ہے، وہ جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیت کو دیکھ دیکھ کر آپؐ کی حسّاس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپؐ کے سامنے بُت پُوجے جا رہے تھے۔ شرک اور مُشرکانہ اوہام و رسُوم کا بازار گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں فساد عام تھا۔ زور آوروں کی

زیادتیوں سے بے زور پس رہے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اوقات سَو سَو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پُشت پر کوئی مضبوط جتھا نہ ہو۔ یہ حالت دیکھ کر آپؐ کُڑھتے تھے مگر اس بگاڑ کو دُور کرنے کی کوئی صورت آپؐ کو نظر نہ آتی تھی یہی فکر آپ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارِ گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپؐ کے اُوپر سے اُتار دیا اور نبوّت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپؐ کو معلوم ہو گیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا قفل کھولا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس رہنمائی نے آپؐ کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپ پُوری طرح مطمئن ہو گئے کہ اس ذریعہ سے آپؐ نہ صرف عرب بلکہ پُوری نوعِ انسانی کو اُن خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اُس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔ ۲۰۷؎

رفعِ ذکر

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۔ (الم نشرح۔۳) اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔

یہ بات اُس زمانہ میں فرمائی گئی تھی جب کوئی شخص یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جس فردِ فرید کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہیں اور وہ بھی صرف شہرِ مکّہ تک محدُود ہیں اُس کا آوازہ دنیا بھر میں کیسے بلند ہو گا اور کیسی ناموری اس کو حاصل ہو گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اِن حالات میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ خوشخبری سنائی اور پھر عجیب طریقہ سے اس کو پُورا کیا۔ سب سے پہلے آپ کے رفعِ ذکر کا کام اُس نے خود آپؐ کے دشمنوں سے لیا۔ کُفّارِ مکّہ نے آپؐ کو زک دینے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ حج کے موقع پر جب تمام عرب سے لوگ کھِچ کھِچ کر ان کے شہر میں آتے تھے، اُس زمانہ میں کُفّار کے وفود حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک خطرناک شخص مُحمّد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نامی ہے جو لوگوں پر ایسا جادُو کرتا ہے کہ باپ بیٹے، بھائی بھائی اور شوہر اور بیوی میں جُدائی پڑ جاتی ہے، اس لیے ذرا اُس سے بچ کر رہنا۔ یہی باتیں وہ ان سب لوگوں سے بھی کہتے تھے جو حج کے سوا دوسرے دنوں میں زیارت یا کسی کاروبار کے سلسلے میں مکّہ آتے تھے۔ اِس طرح اگرچہ وہ حضورؐ کو بدنام کر رہے تھے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپ کا نام پہنچ گیا اور مکّہ کے گوشۂ گمنامی سے نکال کر خود دشمنوں نے آپؐ کو تمام ملک کے قبائل سے متعارف کرا دیا۔ اِس کے بعد یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ شخص ہے کون؟ کیا کہتا ہے؟ کیسا آدمی ہے؟ اُس کے "جادُو" سے متاثر ہونے والے کون لوگ ہیں اور ان پر اس کے "جادو" کا آخر کیا اثر پڑا ہے؟ کُفّارِ مکّہ کا پراپیگنڈا جتنا جتنا بڑھتا چلا گیا، لوگوں میں یہ جُستجو بھی بڑھتی چلی گئی۔ پھر جب اِس جُستجو کے نتیجے میں لوگوں کو آپ کے اَخلاق اور آپ کی سیرت و کردار کا

حال معلوم ہوا، جب لوگوں نے قرآن سنا اور انہیں پتہ چلا کہ وہ تعلیمات کیا ہیں جو آپ پیش فرما رہے ہیں، اور جب دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ جس چیز کو جادو کہا جا رہا ہے اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگیاں عرب کے عام لوگوں کی زندگیوں سے کس قدر مختلف ہو گئی ہیں، تو وہی بدنامی نیک نامی سے بدلنی شروع ہو گئی، حتیٰ کہ ہجرت کا زمانہ آنے تک نوبت یہ پہنچ گئی کہ دُور و نزدیک کے عرب قبائل میں شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو جس میں کسی نہ کسی شخص یا کنبے نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو، اور جس میں کچھ نہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے اور آپ کی دعوت سے ہمدردی و دلچسپی رکھنے والے پیدا نہ ہو گئے ہوں۔ یہ حضورؐ کے رفعِ ذکر کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد ہجرت سے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا جس میں ایک طرف منافقین، یہود اور تمام عرب کے اکابر مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے، اور دوسری طرف مدینۂ طیبہ کی اسلامی ریاست خدا پرستی و خدا ترسی، زہد و تقویٰ، طہارتِ اخلاق، حسنِ معاشرت، عدل و انصاف، انسانی مساوات، مالداروں کی فیاضی، غریبوں کی خبر گیری، عہد و پیمان کی پاسداری اور معاملات میں راست بازی کا وہ عملی نمونہ پیش کر رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتا چلا جا رہا تھا۔ دشمنوں نے جنگ کے ذریعہ سے حضورؐ کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو مٹانے کی کوشش کی، مگر آپؐ کی قیادت میں اہلِ ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے اپنے نظم و ضبط، اپنی شجاعت، اپنی موت سے بے خوفی، اور حالتِ جنگ تک میں اخلاقی حدود کی پابندی سے اپنی برتری اس طرح ثابت کر دی کہ سارے عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ دس سال کے اندر حضورؐ کا رفعِ ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا، اُس کا گوشہ گوشہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی صدا سے گونج اٹھا۔ پھر تیسرے مرحلے کا افتتاح خلافتِ راشدہ کے دَور سے ہوا جب آپ کا نامِ مبارک تمام رُوئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ دُنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں باوازِ بلند محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں حضورؐ پر درود نہ بھیجا جا رہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپؐ کا ذکرِ خیر نہ کیا جا رہا ہو، اور سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن اور دن کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب رُوئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ حضورؐ کا ذکرِ مبارک نہ ہو رہا ہو۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جس وقت نبوّت کے ابتدائی دَور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ، اُس وقت کوئی شخص بھی یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ رفعِ ذکر اِس شان سے اور اتنے بڑے پیمانہ پر ہو گا۔

حدیث میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "جبریلؑ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ مَیں نے کس طرح تمہارا رفعِ ذکر کیا، مَیں نے عرض کیا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا۔"

(ابنِ جریر، ابن ابی حاتم، مُسند ابویعلیٰ، ابن المُنذِر، ابنِ حِبّان، ابنِ مَردُویَہ، ابونُعیم)۔ بعد کی پُوری تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حرف بحرف پُوری ہوئی۔[۲۰۸]

شرحِ صدر

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ۔ (الم نشرح۔ آیت ۱) "(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟"

اِس سوال سے کلام کا آغاز، اور پھر بعد کا مضمون یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اُس زمانے میں اُن شدید مُشکلات پر سخت پریشان تھے جو دعوتِ اسلامی کے شروع ہوتے ہی پیش آرہی تھیں۔ اس پر تسلّی دیتے ہوئے فرمایا کہ اَے نبی، کیا ہم نے یہ اور یہ عنایات تم پر نہیں کی ہیں؟ پھر ان ابتدائی مشکلات پر تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سینہ کھولنے کا لفظ قرآنِ مجید میں جن مواقع پر آیا ہے اُن پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں (۱) سُورہَ اَنعام آیت ۱۲۵ میں فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّھۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ "پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔" اور سُورہ زُمر آیت ۲۲ میں فرمایا اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ "کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو پھر وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہو . . . ." اِن دونوں مقامات پر شرحِ صدر سے مُراد ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردُّد سے پاک ہو کر اِس بات پر پُوری طرح مطمئن ہو جانا ہے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی عقائد، وہی اصُولِ اخلاق و تہذیب و تمدُّن، اور وہی احکام و ہدایات بالکل صحیح ہیں جو اسلام نے انسان کو دیئے ہیں۔ (۲) سُورہَ شُعراء آیت ۱۲-۱۳ میں ذکر آیا ہے کہ حضرت مُوسیٰؑ کو جب اللہ تعالیٰ نبوّت کے منصبِ عظیم پر مامُور کر کے فرعون اور اس کی عظیم سلطنت سے جا ٹکرانے کا حکم دے رہا تھا تو انھوں نے عرض کیا رَبِّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِ وَ یَضِیۡقُ صَدۡرِیۡ "میرے رب، مَیں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے۔" اور سُورہَ طٰہٰ آیات ۲۵-۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسی موقع پر حضرت مُوسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ وَ یَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ "میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے۔" یہاں سینے کی تنگی سے مُراد یہ ہے کہ نبوّت جیسے کارِ عظیم کا بار سنبھالنے اور تنِ تنہا کفر کی جابر و قاہر طاقت سے ٹکر لینے کی آدمی کو ہمّت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرحِ صدر سے مُراد یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بلند ہو جائے، کسی بڑی سے بڑی مہم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو انجام دینے میں بھی اسے تأمّل نہ ہو، اور نبوّت کی عظیم ذمّہ داریاں سنبھالنے کی اُس میں ہمت پیدا ہو جائے۔

غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس آیت میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا سینہ کھول دینے سے

یہ دونوں معنی مُراد ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت سے پہلے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مُشرکینِ عرب، نصارٰی، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے، اور اُس حنیفیت پر بھی مطمئن نہ تھے جو عرب کے بعض قائلینِ توحید میں پائی جاتی تھی، کیونکہ یہ ایک مُبہم عقیدہ تھا جس میں راہِ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی لیکن آپ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہِ راست کیا ہے، اِس لیے آپ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا تھے۔ نبوّت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اِس خلجان کو دُور کر دیا اور وہ راہِ راست کھول کر آپؐ کے سامنے رکھ دی جس سے آپؐ کو کامل اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے اِس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ حوصلہ، وہ ہمت، وہ اُولُوالعزمی اور وہ وسعتِ قلب عطا فرما دی جو اِس منصبِ عظیم کی ذمّہ داریاں سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ آپؐ اُس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپؐ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سما نہ سکتا تھا۔ آپؐ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دُور کرنے اور سنوارنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ آپؐ اس قابل ہو گئے کہ جاہلیّت میں مستغرق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اکھڑ مُعاشرے میں کسی سروسامان اور ظاہراً کسی پُشت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر کھڑے ہو جائیں، اسلام کے علمبردار بن کر مخالفت اور دشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طُوفان کا مقابلہ کرنے سے نہ ہچکچائیں۔ اس راہ میں جو بھی تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آئیں، ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں۔ اور کوئی طاقت آپ کو آپ کے موقف سے نہ ہٹا سکے۔ یہ شرحِ صدر کی بیش بہا دولت جب اللہ نے آپؐ کو عطا کر دی ہے تو آپؐ اِن مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغازِ کار کے اس مرحلے میں پیش آ رہی ہیں؟

بعض مُفسّرین نے شرحِ صدر کو شقِ صدر کے معنوں میں لیا ہے۔ اور اس آیت کو اُس معجزۂ شقِ صدر کا ثبوت قرار دیا ہے جو احادیث کی روشنی میں بیان ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس معجزہ کے ثبوت کا دارومدار احادیث کی روایات ہی پر ہے۔ قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرحِ صدر کو کسی طرح بھی شقِ صدر کے معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ علامہ آلوسی رُوح المعانی میں فرماتے ہیں: حَمْلُ الشَّرْحِ فِی الْاٰیَةِ عَلٰی شَقِّ الصَّدْرِ ضَعِیْفٌ عِنْدَ الْمُحَقِّقِیْنَ ۔ محققین کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شق پر محمول کرنا ایک کمزور سی بات ہے۔[۲۰۶]

بشارتِ کوثر

نبوّت کے ابتدائی دَور میں جب رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم شدید ترین مشکلات سے گزر رہے تھے، پُوری قوم دُشمنی پر تُلی ہوئی تھی، مزاحمتوں کے پہاڑ راستے میں حائل تھے، مخالفت کا طُوفان ہر طرف برپا تھا، اور حضورؐ اور آپؐ کے چند مُٹھی بھر ساتھیوں کو دُور دُور تک کہیں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، اُس وقت آپؐ کو تسلّی دینے اور آپؐ کی ہمت بندھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات نازل فرمائیں۔ سُورۂ ضحیٰ میں فرمایا: وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ۔ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی: اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دَور (یعنی ہر بعد کا دَور)

پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تمہیں وہ کچھ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے" اور الم نشرح میں فرمایا کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اور "ہم نے تمہارا آوازہ بلند کر دیا" یعنی دشمن تمہیں ملک بھر میں بدنام کرتے پھر رہے ہیں۔ مگر ہم نے اُن کے علی الرغم تمہارا نام روشن کرنے اور تمہیں ناموری عطا کرنے کا سامان کر دیا ہے اور فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ "پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے" یعنی اِس وقت حالات کی سختیوں سے پریشان نہ ہو۔ عنقریب مصائب کا دور ختم ہونے والا ہے اور کامیابیوں کا دور آنے ہی والا ہے۔

ایسے ہی حالات تھے جن میں سُورۃ کوثر نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلّی بھی دی، اور آپؐ کے مخالفین کے تباہ و برباد ہونے کی پیشین گوئی بھی فرمائی۔ قریش کے کفّار کہتے تھے کہ محمّد (صلی اللہ علیہ وسلّم) ساری قوم سے کٹ گئے ہیں۔ اور ان کی حیثیت ایک بے کس اور بے یار و مددگار انسان کی سی ہو گئی ہے۔ عِکرمہ کی روایت ہے کہ جب حضورؐ نبی بنائے گئے اور آپؐ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قریش کے لوگ کہنے لگے "بَتَرَ مُحَمَّدٌ مِنَّا" (ابنِ جریر) یعنی محمدؐ اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت اپنی جڑ سے کٹ گیا ہو۔ اور متوقع یہی ہو کہ کچھ مدت بعد وہ سُوکھ کر پیوندِ خاک ہو جائے گا۔ محمّد بن اسحاق کہتے ہیں کہ مکّہ کے سردار عاص بن وائل سہمی کے سامنے جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکر کیا جاتا، تو وہ کہتا "اجی چھوڑو اُنہیں وہ تو ایک اَبتر (جڑ کٹے) آدمی ہیں، ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں۔ مر جائیں گے تو کوئی اِن کا نام لیوا بھی نہیں ہو گا" شمر بن عطیہ کا بیان ہے کہ عُقبہ بن ابی مُعیط بھی ایسی ہی باتیں حضورؐ کے متعلق کہا کرتا تھا (ابنِ جریر)۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ لوگ ایک دفعہ کعب بن اشرف (مدینہ کا یہودی سردار) مکّہ آیا تو قریش کے سرداروں نے اس سے کہا: اَلَا تَرٰى اِلٰى هٰذَا الصَّبِيِّ الْمُنْبَتِرِ مِنْ قَوْمِهٖ يَزْعَمُ اَنَّهٗ خَيْرٌ مِّنَّا وَنَحْنُ اَهْلُ الْحَجِيْجِ وَاَهْلُ السِّدَانَةِ وَاَهْلُ السِّقَايَةِ "بھلا دیکھو تو سہی اس لڑکے کو جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ ہم سے بہتر ہے حالانکہ ہم حج اور سدانت اور سقایت کے منتظم ہیں (بزّار)۔ اِس واقعہ کے متعلق عکرِمہ کی روایت یہ ہے کہ قریش والوں نے حضورؐ کے لیے الصُّنْبُوْرُ الْمُنْبَتِرُ مِنْ قَوْمِهٖ کے الفاظ استعمال کیے تھے، یعنی "کمزور، بے یار و مددگار اور بے اولاد آدمی جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے" (ابنِ جریر)۔ ابنِ سعد اور ابنِ عساکر کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سب سے بڑے صاحبزادے قاسمؓ تھے، اُن سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہ تھے، پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں امّ کلثومؓ، فاطمہؓ اور رقیّہؓ تھیں۔ اِن میں سے پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا، پھر حضرت عبداللہ نے وفات پائی۔ اِس پر عاص بن وائل نے کہا "ان کی نسل ختم ہو گئی اب وہ ابتر ہیں" (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی)۔ بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ عاص نے کہا اِنَّ مُحَمَّدًا اَبْتَرُ

لَا ابْنَ لَهٗ یَقُوْمُ مَقَامَهٗ بَعْدَهٗ - فَاِذَا مَاتَ انْقَطَعَ ذِکْرُهٗ وَاسْتَرَحْتُمْ مِنْهُ "یعنی محمدؐ ابتر ہیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے، جب وہ مرجائیں گے تو اُن کا نام دُنیا سے مٹ جائے گا اور ان سے تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا" عبد بن حُمَید نے ابن عباسؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے صاحبزادے عبداللہ کی وفات پر ابوجہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ شِمر بن عطیہ سے ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضورؐ کے اس غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی کمینہ پن کا مظاہرہ عُقبہ بن ابی مُعیط نے کیا تھا۔ عطاء کہتے ہیں جب حضورؐ کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضورؐ کا اپنا چچا ابُولہب (جس کا گھر بالکل حضورؐ کے گھر سے متصل تھا) دوڑا ہوا مُشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ "خوشخبری" دی کہ بَتِرَ مُحَمَّدٌ اللَّیْلَةَ "کہ آج رات محمدؐ لاولد ہو گئے یا اُن کی جڑ کٹ گئی"۔

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضورؐ پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپؐ سے بگڑے تھے کہ آپؐ صرف اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرتے تھے، اور ان کے شرک کو آپؐ نے عَلانیہ رد کر دیا تھا۔ اِسی وجہ سے پُوری قوم میں جو مرتبہ و مقام آپؐ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپؐ سے چھین لیا گیا تھا۔ اور آپؐ گویا برادری سے کاٹ پھینکے گئے تھے۔ آپؐ کے چند مٹھی بھر ساتھی بھی سب بے یار و مددگار تھے، اور مارے کھدیڑے جا رہے تھے۔ اس پر مزید آپؐ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی وفات سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اِس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلے اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت کے بجائے وہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں، اور وہ باتیں بنائی جا رہی تھیں جو ایک ایسے شریف انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنوں اور غیروں تک سے ہمیشہ نیک سلوک کیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس مختصر ترین سورۃ کے ایک فقرے میں وہ خوشخبری دی جس سے بڑی خوشخبری دُنیا کے کسی انسان کو کبھی نہیں دی گئی اور ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی سُنا دیا کہ آپؐ کی مخالفت کرنے والوں ہی کی جڑ کٹ جائے گی۔ ؎۲۱۱

لفظ اَبْتَر بَتَر سے ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں، مگر محاورہ میں یہ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں نماز کی اُس رکعت کو جس کے ساتھ کوئی دوسری رکعت نہ پڑھی جائے بُتَیْراء کہا گیا ہے، یعنی اکیلی رکعت۔ ایک اور حدیث میں ہے کل امر ذی بال لا یُبدأ فیه بحمد الله فهو ابتر "ہر وہ کام جو کوئی اہمیت رکھتا ہو، اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ اَبتر ہے" یعنی اس کی جڑ کٹی ہوئی ہے۔ اُسے کوئی استحکام نصیب نہیں ہے، یا اُس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ نامراد آدمی کو بھی اَبتر کہتے ہیں۔ ذرائع و وسائل سے محرُوم ہو جانے والا بھی اَبتر کہلاتا ہے۔ جس شخص کے لیے کسی خیر اور بھلائی کی توقع باقی نہ رہی ہو اور جس کی کامیابی کی سب اُمیدیں منقطع ہو گئی ہوں وہ بھی اَبتر ہے۔ جو آدمی اپنے کنبے برادری اور اعوان و انصار سے کٹ کر اکیلا رہ گیا ہو وہ بھی اَبتر

ہے۔ جس آدمی کی کوئی اولادِ نرینہ نہ ہو یا مر گئی ہو اس کے لیے بھی اَبْتَر کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہتا اور مرنے کے بعد وہ بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔ قریب قریب ان سب معنوں میں کفارِ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَبْتَر کہتے تھے۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبیؐ اَبْتَر تم نہیں ہو بلکہ تمہارے یہ دشمن اَبْتَر ہیں۔ یہ محض کوئی جوابی حملہ نہ تھا بلکہ درحقیقت یہ قرآن کی بڑی اہم پیشین گوئی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اُس وقت تو لوگ حضورؐ ہی کو اَبْتَر سمجھ رہے تھے اور کوئی تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے اَبْتَر ہو جائیں گے جو نہ صرف مکّہ میں بلکہ پُورے ملکِ عرب میں نامور تھے، کامیاب تھے، مال و دولت اور اولاد ہی کی نعمتیں نہیں رکھتے تھے بلکہ سارے ملک میں جگہ جگہ اُن کے اعوان و انصار موجود تھے، تجارت کے اجارہ دار تھے، اور حج کے منتظم ہونے کی وجہ سے تمام قبائلِ عرب سے ان کے وسیع تعلقات تھے۔ لیکن چند سال نہ گزرے تھے کہ حالات بالکل پلٹ گئے۔ یا تو وہ وقت تھا کہ غزوۂ احزاب (۵ھ ہجری) کے موقع پر قریش بہت سے عرب اور یہودی قبائل کو لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے، اور حضورؐ کو محصور ہو کر، شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی، یا تین ہی سال بعد وہ وقت آیا کہ ۸ھ میں جب آپؐ نے مکّہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا۔ اور انہیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر پُورا ملکِ عرب حضورؐ کے ہاتھ میں تھا۔ ملک کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفود آ کر بیعت کر رہے تھے۔ اور آپؐ کے دشمن بالکل بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ ان کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی، تو اُن میں سے کوئی آج یہ نہیں جانتا کہ وہ ابوجہل یا ابولہب یا عاص بن وائل یا عُقبہ بن ابی مُعَیط وغیرہ اعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے، اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے اسلاف یہ لوگ تھے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر آج دنیا بھر میں درود بھیجا جا رہا ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو آپؐ سے نسبت پر فخر ہے۔ لاکھوں انسان آپؐ ہی سے نہیں بلکہ آپؐ کے خاندان اور آپؐ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک سے انتساب کو باعثِ عزّ و شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سیّد ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے، کوئی صدیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زُبیری اور کوئی انصاری، مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اَبْتَر حضورؐ نہیں بلکہ آپؐ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔[1] ۲۱۱ھ

---

[1] آیت میں لفظ شانِئ استعمال ہوا ہے (اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ) شنءٌ سے ہے جس کے معنی ایسے بغض اور عداوت کے ہیں جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا "اور اے مسلمانو! کسی گروہ کی عداوت تمہیں اس زیادتی پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم انصاف نہ کرو۔" پس شَانِئَكَ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور عداوت میں ایسا ہو گیا ہو کہ آپؐ کو عیب لگاتا ہو، آپؐ کے خلاف بدگوئی کرتا ہو، آپؐ کی توہین کرتا ہو، اور آپؐ پر طرح طرح کی باتیں چھانٹ کر اپنے دل کا بخار نکالتا ہو۔ ۲۱۲ھ

بشارتِ کوثر کا اُخروی پہلو

حوضِ کوثر کے متعلق حضورؐ نے جو کچھ فرمایا وہ یہ ہے:

(۱) یہ حوض قیامت کے روز آپؐ کو عطا ہوگا۔ اور اُس سخت وقت میں، جبکہ ہر ایک العطش، العطش کہہ رہا ہوگا، آپؐ کی اُمت آپؐ کے پاس اُس پر حاضر ہوگی اور اس سے سیراب ہوگی۔ آپ اس پر سب سے پہلے پہنچے ہوئے ہونگے اور اُس کے وسط میں تشریف فرما ہونگے۔ آپؐ کا ارشاد ہے هُوَ حَوْضٌ تَرِدُ عَلَيْهِ اُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ" وہ ایک حوض ہے جس پر میری اُمت قیامت کے روز وارد ہوگی" (مسلم کتاب الصلوٰۃ۔ ابو داؤد، کتاب السنۃ) انا فرطکم علی الحوض "مَیں تم سب سے پہلے اس پر پہنچا ہُوا ہُونگا" (بخاری، کتاب الرقاق اور کتاب الفتن، مسلم کتاب الفضائل اور کتاب الطہارۃ۔ ابنِ ماجہ۔ کتاب المناسک اور کتاب الزھد۔ مسند احمد، مرویاتِ عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ و ابوہریرہؓ) انی فرط لکم و انا شھید علیکم۔ و انی واللہ لانظر الی حوضی الان "مَیں تم سے آگے پہنچنے والا ہُوں، اور تم پر گواہی دونگا اور خدا کی قسم مَیں اپنے حوض کو اس وقت دیکھ رہا ہوں" (بخاری کتاب الجنائز، کتاب المغازی، کتاب الرقاق)۔

انصار کو مخاطب کرتے ہُوئے ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا انکم ستلقون بعدی اثرۃ فاصبروا حتّٰی تلقونی علی الحوض "میرے بعد تم کو خود غرضیوں اور اقربا نوازیوں سے پالا پڑے گا۔ اس پر صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے آکر حوض پر ملو" (بخاری کتاب مناقب الانصار و کتاب المغازی، مسلم، کتاب الامارۃ۔ ترمذی کتاب الفتن) انا یوم القیٰمۃ عند عُقر الحوض "مَیں قیامت کے روز حوض کے وسط کے پاس ہونگا" (مُسلم، کتاب الفضائل)۔

حضرت ابوبرزہؓ اسلمی سے پُوچھا گیا کہ کیا آپؐ نے حوض کے متعلق رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کچھ سُنا ہے؟ انہوں نے کہا ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، چار نہیں، پانچ نہیں، بار بار سُنا ہے، جو اس کو جُھٹلائے اللہ اسے اس کا پانی پینا نصیب نہ کرے (ابو داؤد، کتاب السنۃ)۔

عُبیداللہ بن زیاد حوض کے بارے میں روایات کو جُھوٹ سمجھتا تھا حتّٰی کہ اُس نے ابوبرزہؓ اسلمی، براءؓ بن عازب اور عائذؓ بن عمرو کی سب روایات کو جھٹلایا۔ آخر کار ابو سبرہ ایک تحریر نکال کر لائے جو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص سے سُن کر نقل کی تھی اور اس میں حضورؐ کا یہ ارشاد درج تھا کہ "الا انّ موعدکم حوضی "خبردار رہو میری اور تمہاری ملاقات کی جگہ میرا حوض ہے" (مُسند احمد، مرویاتِ عبداللہ بن عمرو بن عاص)۔

(۲) اِس حوض کی وسعت مختلف روایات میں مختلف بیان کی گئی ہے مگر کثیر روایات میں یہ ہے کہ وہ ایلہ (اسرائیل کی موجودہ بندرگاہ ایلات) سے یمن کے صنعاء تک، یا ایلہ سے عدن تک، یا عمّان سے عدن تک طویل ہوگا اور اس کی چوڑائی اتنی ہوگی جتنا ایلہ سے جُحفہ (جدّہ اور رابغ کے درمیان ایک مقام) تک کا فاصلہ ہے۔ (بخاری کتاب الرقاق،

ابوداؤد الطیالسی، حدیث نمبر ۹۹۵۔ مُسند احمد، مرویات ابوبکر صدیقؓ و عبداللہ بن عمرؓ۔ مُسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ۔ ابن ماجہ، کتاب الزُّھد)۔

اس سے گمان ہوتا ہے کہ قیامت کے روز موجودہ بحرِ احمر ہی کو حوضِ کوثر میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۳) اِس حوض کے متعلق حضورؐ نے بتایا ہے کہ اس میں جنّت کی نہر کوثر (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) سے پانی لاکر ڈالا جائے گا۔ یشخب فیہ میزابان من الجنّۃ، اور دوسری روایت میں ہے یغت فیہ میزابان یمُدّانہٖ من الجنّۃ۔ یعنی اس میں جنّت سے دو نالیاں لاکر ڈالی جائیں گی جو اسے پانی بہم پہنچائیں گی۔ (مُسلم، کتاب الفضائل)۔ ایک اور روایت میں ہے یُفتَح نھر من الکوثر الی الحوض "جنت کی نہر کوثر سے ایک نہر اس حوض کی طرف کھول دی جائے گی۔ (مُسند احمد، مَرویات عبداللہ بن مسعودؓ)۔

(۴) اس کی کیفیت حضورؐ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کا پانی دُودھ سے (اور بعض روایات میں ہے چاندی سے اور بعض میں برف سے) زیادہ سفید، برف سے زیادہ ٹھنڈا، شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، اس کی تہ کی مٹی مُشک سے زیادہ خوشبودار ہوگی۔ اس پر اتنے کوزے رکھے ہونگے جتنے آسمان میں تارے ہیں۔ جو اس کا پانی پی لے گا اُسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔ اور جو اس سے محروم رہ گیا وہ پھر کبھی سیراب نہ ہوگا۔ یہ باتیں تھوڑے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ بکثرت احادیث میں منقول ہوئی ہیں (بخاری، کتاب الرِّقاق۔ مُسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔ مُسند احمد، مَرویات ابن مسعودؓ، ابنِ عُمر و عبداللہ بن عَمرو بن عاص۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ۔ ابن ماجہ، کتاب الزُّھد۔ ابوداؤد طیالسی، حدیث ۹۹۵، ۲۱۳۵)۔

(۵) اس کے بارے میں حضورؐ نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے، اُن کو اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا اور اس پر انہیں نہ آنے دیا جائے گا۔ مَیں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپؐ کو نہیں معلوم کہ آپؐ کے بعد انہوں نے کیا کیا ہے۔ پھر میں بھی ان کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دُور رہو۔ یہ مضمون بھی بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے (بخاری، کتاب الرِّقاق، کتاب الفِتَن۔ مُسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الفضائل۔ مُسند احمد، مرویات ابن مسعودؓ و ابوہریرہؓ۔ ابنِ ماجہ، کتاب المناسک)۔

ابن ماجہ نے اِس سلسلے میں جو حدیث نقل کی ہے وہ بڑے ہی دردناک الفاظ میں ہے۔ اس میں حضورؐ فرماتے ہیں الا وانی فرطکم علی الحوض و اُکاثر بکم الامم فلا تسوّدوا وجھی، الا وانی مُستنقِذٌ اُناساً و مستنقذ اناس منی فاقول یارب اُصیحابی، فیقول انک لا تدری ما احدثوا بعدک "خبردار رہو، میں تم سے آگے حوض پر پہنچا ہوا ہونگا اور تمہارے ذریعہ سے دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں اپنی اُمت کی کثرت

پر فخر کروں گا۔ اُس وقت میرا مُنہ کالا نہ کروانا۔ خبردار رہو کچھ لوگوں کو مَیں چُھڑاؤں گا۔ اور کچھ لوگ مجھ سے چھڑائے جائیں گے۔ مَیں کہوں گا کہ اے پروردگار یہ تو میرے صحابی ہیں وہ فرمائے گا تم نہیں جانتے انہوں نے تمہارے بعد کیا نرالے کام کیے ہیں"۔ ابن ماجہ کی روایت ہے کہ یہ الفاظ حضورؐ نے عرفات کے خُطبے میں فرمائے تھے)۔

(۶) اسی طرح حضورؐ نے اپنے دَور کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میرے طریقے سے ہٹ کر چلیں گے اور اس میں ردّ و بدل کریں گے انہیں اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا۔ مَیں کہوں گا اے میرے رب یہ تو میرے ہیں، میری اُمّت کے لوگ ہیں، جواب ملے گا آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا تغیُّرات کیے اور اُلٹے ہی پھرتے چلے گئے۔ پھر مَیں بھی ان کو دفع کروں گا اور حوض پر نہ آنے دُوں گا۔ اس مضمون کی بہت سی روایات احادیث میں ہیں (بخاری کتاب المساقاۃ، کتاب الرّقاق، کتاب الفتن۔ مُسلم، کتاب الطّہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الفضائل۔ ابن ماجہ، کتاب الزُّہد۔ مُسند احمد، مرویّاتِ ابن عباسؓ)۔

اِس حوض کی روایات ۵۰ سے زیادہ صحابہؓ سے مروی ہیں۔ اور سلف نے بالعموم اِس سے مراد حوض کوثر لیا ہے۔ امام بخاری نے کتاب الرّقاق کے آخری باب کا عنوان ہی یہ باندھا ہے: باب فی الحوض وقول اللہ اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ۔ اور حضرت انسؓ کی ایک روایت میں تو تصریح ہے کہ حضورؐ نے کوثر کے متعلق فرمایا ھُوَ حوضٌ تَرِدُ عَلَیۡہِ اُمَّتِیۡ "وہ ایک حوض ہے جس پر میری اُمّت وارد ہوگی"۔

جنّت میں کوثر نامی جو نہر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو عطا کی جائے گی اس کا ذکر بھی بکثرت روایات میں آیا ہے۔ حضرت انسؓ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں وہ فرماتے ہیں (اور بعض روایات میں صراحت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قول کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں) کہ معراج کے موقع پر حضورؐ کو جنّت کی سَیر کرائی گئی۔ اور اس موقع پر آپؐ نے ایک نہر دیکھی جس کے کناروں پر اندر سے ترشے ہوئے موتیوں یا ہیروں کے قُبّے بنے ہوئے تھے، اس کی تہ کی مٹی مُشکِ اَذفر کی تھی۔ حضورؐ نے جبریلؑ سے یا اُس فرشتے سے جس نے آپؐ کو سیر کرائی تھی، پُوچھا، یہ کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا یہ نہر کوثر ہے جو آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے (مُسند احمد، بخاری، مُسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابو داؤد طَیالسی، ابن جریر)۔

حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے کہ حضورؐ سے پُوچھا گیا (یا ایک شخص نے پوچھا) کوثر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے جنّت میں عطا کی ہے۔ اس کی مٹی مُشک ہے۔ اس کا پانی دُودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے (مُسند احمد، ترمذی، ابن جریر۔ مُسند احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے نہر کوثر کی یہ صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا، اس کی تہ میں کنکریوں کے بجائے موتی پڑے ہوتے ہیں)۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ کوثر جنّت میں ایک نہر ہے جس کے کنارے سونے کے ہیں۔ وہ موتیوں اور ہیروں پر بہ رہی ہے (یعنی

کنکریوں کی جگہ اس کی تہ میں یہ جواہر پڑے ہوتے ہیں) - اس کی مٹی مُشک سے زیادہ خوشبُودار ہے، اس کا پانی دُودھ سے (یا برف سے) زیادہ سفید ہے، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے (مُسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابنِ ابی حاتم، دارمی، ابو داؤد طیالسی، ابن المنذر، ابنِ مَردُویَہ، ابن ابی شیبہ) - اُسامہؓ بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ حضرت حمزہؓ کے ہاں تشریف لے گئے - وہ گھر پر نہ تھے - ان کی اہلیہ نے حضورؐ کی تواضع کی، اور دورانِ گفتگو عرض کیا کہ میرے شوہر نے مجھے بتایا ہے کہ آپؐ کو جنّت میں ایک نہر عطا کی گئی ہے جس کا نام کوثر ہے۔ آپؐ نے فرمایا "ہاں، اور اس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد اور موتیوں کی ہے (ابن جَریر - ابن مَردُویَہ - اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے مگر اس مضمون کی کثیر التعداد روایات کا موجود ہونا اس کو تقویت پہنچاتا ہے) - ان مرفوع روایات کے علاوہ صحابہؓ اور تابعین کے بکثرت اقوال احادیث میں نقل ہوئے ہیں جن میں وہ کوثر سے مراد جنّت کی یہ نہر لیتے ہیں اور اس کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو اُوپر گزری ہیں - مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عبّاس، حضرت انَسؓ بن مالکؓ، حضرت عائشہ، مجاہد اور ابو العالیہ کے اقوال، مُسند احمد، بخاری، ترمذی، نسائی، ابنِ مردُویَہ - ابن جَریر - اور ابن ابی شیبہ وغیرہ محدّثین کی کتابوں میں موجود ہیں - [۲۱۳]

ابُولہب کا انجامِ بد

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّ تَبَّ (اللّھب - ۱) "ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامُراد ہو گیا وہ"

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ کے معنی بعض مُفسّرین نے "ٹوٹ جائیں ابُولہب کے ہاتھ" بیان کیے ہیں اور وَتَبَّ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "وہ ہلاک ہو جائے" یا "وہ ہلاک ہو گیا" لیکن درحقیقت یہ کوئی کوسنا نہیں ہے جو اس کو دیا گیا ہو، بلکہ ایک پیشین گوئی ہے جس میں آئندہ پیش آنے والی بات کو ماضی کے صیغوں میں بیان کیا گیا ہے، گویا اس کا ہونا ایسا یقینی ہے جیسے وہ ہو چکی، اور فی الواقع آخر کار وہی کچھ ہوا جو اس سُورہ میں چند سال پہلے بیان کیا جا چکا تھا - ہاتھ ٹوٹنے سے مُراد ظاہر ہے کہ جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں ہے، بلکہ کسی شخص کا اپنے اُس مقصد میں قطعی ناکام ہو جانا ہے جس کے لیے اس نے اپنا پورا زور لگا دیا ہو - اور ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے واقعی اپنا پُورا زور لگا دیا تھا - لیکن اِس سُورہ کے نزول پر سات آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ جنگ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام کی دشمنی میں ابولہب کے ساتھی تھے - مکّہ میں جب اِس شکست کی خبر پہنچی تو اُس کو اتنا رنج ہُوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا - پھر اس کی موت بھی نہایت عبرتناک تھی - اُسے عَدَسَہ (Malignant Pustule) کی بیماری ہو گئی جس کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے اُسے چھوڑ دیا، کیونکہ انہیں چھُوت لگنے کا ڈر تھا - مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اُس کے پاس نہ آیا، یہاں تک کہ اُس کی لاش سڑ گئی اور اُس کی بُو پھیلنے لگی - آخر کار جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے تو ایک روایت

یہ ہے کہ انہوں نے کچھ حبشیوں کو اُجرت دے کر اس کی لاش اُٹھوائی اور انہی مزدوروں نے اس کو دفن کیا۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اسے ڈھانک دیا۔ اُس کی مزید اور مکمل شکست اس طرح ہوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، اُسی دین کو اُس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی دُرّہ ہجرت کر کے مکہ سے مدینے پہنچیں اور اسلام لائیں۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر اس کے دونوں بیٹے عُتبہ اور مُعَتّب، حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضورؐ کے سامنے پیش ہوئے اور ایمان لا کر انہوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔

اہلِ مکہ کے لیے نبیؐ کو نکالنے کی سزا

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (بنی اسرائیل۔ آیت ۷۶)

"اور یہ لوگ اِس بات پر تُلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اِس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھیر سکیں گے۔"

یہ صریح پیشین گوئی اگرچہ اُس وقت ایک دھمکی نظر آتی تھی مگر دس گیارہ سال کے اندر ہی حرف بحرف سچّی ثابت ہو گئی۔ اس سُورہ کے نزول پر ایک سال گزرا تھا کہ کفارِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اور اس پر ۸ سال سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ آپؐ فاتح کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ اور پھر دو سال کے اندر اندر سرزمینِ عرب مُشرکین کے وجود سے پاک کر دی گئی۔ پھر جو بھی اس ملک میں رہا مُسلمان بن کر رہا، مُشرک بن کر وہاں ٹھیر نہ سکا۔

جمعیتِ قریش کی ہزیمت

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔ (القمر۔ آیت ۴۵)

"عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔"

یہ صریح پیشین گوئی ہے جو ہجرت سے پانچ سال پہلے کر دی گئی تھی کہ قریش کی جمعیت، جس کی طاقت کا انہیں بڑا زعم تھا، عنقریب مسلمانوں سے شکست کھا جائے گی۔ اُس وقت کوئی شخص یہ تصوّر تک نہ کر سکتا تھا کہ مستقبلِ قریب میں یہ انقلاب کیسے ہو گا۔ مسلمانوں کی بے بسی کا حال یہ تھا کہ ان میں سے ایک گروہ ملک چھوڑ کر حبش میں پناہ گزیں ہو چکا تھا اور باقی ماندہ اہلِ ایمان شِعبِ ابی طالب میں محصور تھے جنہیں قریش کے مُقاطعہ اور مُحاصرہ نے بھوکوں مار دیا تھا۔ اِس حالت میں کون یہ سمجھ سکتا تھا کہ سات ہی برس کے اندر نقشہ بدل جانے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد عکرمہؒ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے جب سورۂ قمر کی یہ آیت نازل ہوئی تو میں حیران تھا

کہ آخر یہ کونسی جمعیت ہے جو شکست کھائے گی۔ مگر جب جنگ بدر میں کفّار شکست کھا کر بھاگ رہے تھے اُس وقت میں نے دیکھا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم زرہ پہنے ہوئے آگے کی طرف جھپٹ رہے ہیں اور آپ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں کہ سَیُھۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَیُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ تھی وہ ہزیمت جس کی خبر دی گئی تھی۔ (ابنِ جریر۔ ابنِ ابی حاتم)۔

مکّہ مفتوح ہوگا

وَاِنَّ جُنۡدَنَا لَھُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ۔ (الصّٰفّٰت۔ ۱۷۳) "ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا"

یعنی کچھ زیادہ مُدّت نہ گزرے گی کہ اپنی شکست اور تمہاری فتح کو یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہ بات جس طرح فرمائی گئی تھی اُسی طرح پُوری ہوتی۔ اِن آیات کے نُزُول پر بمشکل ۱۴-۱۵ سال گزرے تھے کہ کُفّارِ مکّہ نے اپنی آنکھوں سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا فاتحانہ داخلہ اپنے شہر میں دیکھ لیا اور پھر اس کے چند سال بعد انہی لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اسلام نہ صرف عرب پر، بلکہ روم و ایران کی عظیم سلطنتوں پر بھی غالب آگیا۔

جُنۡدٌ مَّا ھُنَالِکَ مَھۡزُوۡمٌ مِّنَ الۡاَحۡزَابِ
(صٓ۔ آیت ۱۱)

"یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھا ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے"

"اِسی جگہ" کا اشارہ مکّہ مُعظّمہ کی طرف ہے، یعنی جہاں یہ لوگ یہ باتیں بنا رہے ہیں اسی جگہ ایک دن یہ شکست کھانے والے ہیں اور یہیں وہ وقت آنے والا ہے جب یہ مُنہ لٹکائے اُسی شخص کے سامنے کھڑے ہوں گے جسے آج یہ حقیر سمجھ کر نبی تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

قرآنی دعوت چھاکے رہے گی

حٰمٓ السجدہ میں ارشادِ گرامی ہے:

سَنُرِیۡھِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِھِمۡ
حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ۔
(آیت ۵۳)

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کُھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے"

یعنی عنقریب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام گرد و پیش کے ممالک پر چھا گئی ہے اور یہ خود اس کے آگے سرنگوں ہیں۔ اُس وقت اِنہیں پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ آج ان سے کہا جا رہا ہے اور یہ مان کر نہیں دے رہے ہیں وہ سراسر حق تھا۔

بعض لوگوں نے اِس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محض کسی دعوت کا غالب آجانا اور بڑے بڑے علاقے فتح کر لینا تو اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، باطل دعوتیں بھی چھا جاتی ہیں اور ان کے پیرو بھی ملک پر ملک فتح کرتے

چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک سطحی اعتراض ہے جو پُورے معاملے پر غور کیے بغیر کر دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دَور میں جو حیرت انگیز فتوحات اسلام کو نصیب ہوئیں وہ محض اِس معنی میں اللہ کی نشانیاں نہ تھیں کہ اہلِ ایمان ملک پر ملک فتح کرتے چلے گئے، بلکہ اِس معنی میں تھیں کہ یہ فتح ممالک دُنیا کی دوسری فتوحات کی طرح نہیں تھی جو ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کو دوسروں کی جان و مال کا مالک بنا دیتی ہیں اور خدا کی زمین ظلم سے بھر جاتی ہے۔ اس کے برعکس یہ فتح اپنے جلَو میں ایک عظیم الشان، مذہبی، اخلاقی، ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدُّنی و معاشی انقلاب لے کر آئی تھی جس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے، انسان کے بہترین جوہر کھُلتے چلے گئے اور بدترین اوصاف دبتے چلے گئے۔ دنیا جن فضائل کو صرف تارک الدُّنیا درویشوں اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے اندر ہی دیکھنے کی اُمّید رکھتی تھی اور کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کاروبارِ دنیا چلانے والوں میں بھی وہ پائے جا سکتے ہیں، اِس انقلاب نے وہ فضائلِ اخلاق فرمانرواؤں کی سیاست میں، انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کی عدالت میں، فوجوں کی قیادت کرنے والے سپہ سالاروں کی جنگ اور فتوحات میں، ٹیکس وصُول کرنے والوں کی تحصیلداری میں، اور بڑے بڑے کاروبار چلانے والوں کی تجارت میں جلوہ گر کر کے دکھا دیئے۔ اس نے اپنے پیدا کردہ مُعاشرے میں عام انسانوں کو اخلاق اور کردار اور طہارت و نظافت کے اعتبار سے اتنا اُونچا اٹھایا کہ دوسرے معاشروں کے چیدہ لوگ بھی اُن کی سطح سے فروتر نظر آنے لگے۔ اس نے اوہام و خرافات کے چکّر سے نکال کر انسان کو علمی تحقیق اور معقول طرزِ فکر و عمل کی صاف شاہراہ پر ڈال دیا۔ اُس نے اجتماعی زندگی کے اُن امراض کا علاج کیا جن کے علاج کی فکر تک سے دوسرے نظام خالی تھے، یا اگر انہوں نے اس کی فکر کی بھی تو ان امراض کے علاج میں کامیاب نہ ہو سکے، مثلاً رنگ و نسل اور وطن و زبان کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق، ایک ہی معاشرے میں طبقات کی تقسیم اور ان کے درمیان اُونچ نیچ کا امتیاز اور چھُوت چھات، قانونی حقوق اور عملی معاشرت میں مساوات کا فقدان، عورتوں کی پستی اور بنیادی حقوق تک سے محرومی، جرائم کی کثرت، شراب اور نشہ آور چیزوں کا عام رواج، حکومت کا تنقید و محاسبے سے بالاتر رہنا، عوام کا بنیادی حقوق تک سے محروم ہونا، بین الاقوامی تعلقات میں معاہدات کی بے احترامی، جنگ میں وحشیانہ حرکات، اور ایسے ہی دوسرے امراض۔ سب سے بڑھ کر خود عرب کی سرزمین میں اِس انقلاب نے دیکھتے دیکھتے طوائف الملوکی کی جگہ نظم، خونریزی و بدامنی کی جگہ امن، فسق و فجور کی جگہ تقویٰ و طہارت، ظلم و بے انصافی کی جگہ عدل، گندگی اور ناشائستگی کی جگہ پاکیزگی اور تہذیب، جہالت کی جگہ علم اور نسل در نسل چلنے والی عداوتوں کی جگہ اخوت و محبت پیدا کر دی، اور جس قوم کے لوگ اپنے قبیلے کی سرداری سے بڑھ کر کسی چیز کا خواب تک نہ دیکھ سکتے تھے انہیں دُنیا کا امام بنا دیا۔ یہ تھیں وہ نشانیاں جو اُسی نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جسے مخاطب کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ یہ آیت سنائی تھی۔ اور اس کے بعد سے آج تک اللہ تعالیٰ ان نشانیوں کو برابر دکھائے

جارہا ہے مسلمانوں نے اپنے زوال کے دَور میں بھی اخلاق کی جس بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی گرد کو بھی وہ لوگ کبھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب و شائستگی کے علمبردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقہ، امریکہ، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دَور میں بھی اُس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کر دی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پاکر اُتنے ظالم نہ بن سکے جتنے غیر مسلم تاریخ کے ہر دَور میں ظالم پائے گئے ہیں اور آج تک پائے جا رہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو خود دیکھ لے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمران رہے اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانہ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اب ہندو غالب آجانے کے بعد اُن کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ پچھلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ اُن کا کیا رویہ ہے۔ ۲۱۹ ؎

آنحضورؐ کے لیے رُتبہ بلند

اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ۔

"اے نبیؐ، یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین انجام کو پہنچانے والا ہے۔"

(القصص۔ آیت ۸۵)

اصل الفاظ ہیں لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ "تمہیں ایک معاد کی طرف پھیرنے والا ہے"۔ معاد کے لغوی معنی ہیں وہ مقام جس کی طرف آخرکار آدمی کو پلٹنا ہو اور اُسے نکرہ استعمال کرنے سے اُس میں خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مقام بڑی شان اور عظمت کا مقام ہے۔ بعض مُفسّرین نے اس سے مراد جنّت لی ہے۔ لیکن اسے صرف جنّت کے ساتھ مخصوص کر دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ کیوں نہ اسے ویسا ہی عام رکھا جائے جیسا خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، تاکہ یہ وعدہ دنیا اور آخرت دونوں سے متعلق ہو جائے۔ سیاقِ عبارت کا اقتضاء بھی یہ ہے کہ اسے آخرت ہی میں نہیں اس دُنیا میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو آخرکار بڑی شان و عظمت عطا کرنے کا وعدہ سمجھا جائے۔ کفارِ مکّہ کے جس قول پر آیت ۵۷ سے لے کر یہاں تک مسلسل گفتگو چلی آ رہی ہے، اُس میں انہوں نے کہا تھا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم)، تم اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبنا چاہتے ہو۔ اگر ہم تمہارا ساتھ دیں اور اس دین کو اختیار کر لیں تو عرب کی سرزمین میں ہمارا جینا مشکل ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ سے فرماتا ہے کہ اے نبیؐ، جس خدا نے اس قرآن کی علَم برداری کا بار تم پر ڈالا ہے وہ تمہیں برباد کرنے والا نہیں ہے، بلکہ تم کو اُس مرتبے پر پہنچانے والا ہے جس کا تصوّر بھی یہ لوگ آج نہیں کر سکتے۔ اور فی الواقع اللہ تعالیٰ نے چند ہی سال بعد حضورؐ کو اس دنیا میں، اُنہی لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تمام ملک عرب پر ایسا مکمّل اقتدار عطا کر کے دکھا دیا کہ آپؐ کی مزاحمت کرنے والی کوئی طاقت وہاں

نہ ٹھہر سکی اور آپؐ کے دین کے سوا کسی دین کے لیے وہاں گنجائش نہ رہی۔ عرب کی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی نظیر اس کی موجود نہ تھی کہ پورے جزیرۃ العرب پر کسی ایک شخص کی ایسی بے غل و غش بادشاہی قائم ہوگئی ہو کہ ملک بھر میں کوئی اُس کا مدِمقابل باقی نہ رہا ہو، کسی میں اس کے حکم سے سرتابی کا یارا نہ ہو، اور لوگ صرف سیاسی طور پر ہی اس کے حلقہ بگوش نہ ہوتے ہوں بلکہ سارے دینوں کو مٹا کر اسی ایک شخص نے سب کو اپنے دین کا پیرو بھی بنا لیا ہو۔[۲۲]

آنحضورؐ کے لیے مقامِ محمود

عَسٰٓی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ۔ "بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقامِ محمود پر فائز کردے۔" (بنی اسرائیل۔ آیت ۷۹)

یعنی دُنیا اور آخرت میں تم کو ایسے مرتبے پر پہنچا دے جہاں تم محمودِ خلائق ہو کر رہو۔ ہر طرف سے تم پر مدح و ستائش کی بارش ہو۔ اور تمہاری ہستی ایک قابلِ تعریف ہستی بن کر رہے۔ آج تمہارے مخالفین تمہاری تواضع گالیوں اور ملامتوں سے کر رہے ہیں اور ملک بھر میں تم کو بدنام کرنے کے لیے انہوں نے جھوٹے الزامات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے۔ مگر وہ وقت دور نہیں ہے جبکہ دُنیا تمہاری تعریفوں سے گونج اُٹھے گی اور آخرت میں بھی تم ساری خلق کے ممدوح ہو کر رہو گے۔ قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ شفاعت پر کھڑا ہونا بھی اسی مرتبۂ محمودیت کا ایک حصہ ہے۔[۲۳]

شکست خوردہ رُوم کے لیے فتح کی خبر

جو پیشین گوئی سُورۂ رُوم کی ابتدائی آیات میں کی گئی ہے وہ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسُولِ برحق ہونے کی نمایاں ترین شہادتوں میں سے ایک ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن تاریخی واقعات پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی جائے جو اِن آیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصرِ روم ماریس (Maurice) کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس (Phocas) تختِ سلطنت پر قابض ہوگیا۔ اس شخص نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کر دیا، پھر خود قیصر کو قتل کرا کے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں برسرِعام لٹکوا دیئے، اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اِس واقعہ سے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو رُوم پر حملہ آور ہونے کے لیے بہترین اخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر ماریس اس کا محسن تھا۔ اُسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہوا تھا۔ اُسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اس بنا پر اُس نے اعلان کیا کہ میں غاصب فوکاس سے اُس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اُس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اس نے سلطنتِ رُوم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فوجوں کو پے در پے

شکستیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں اڈیسا (موجودہ اُورفا) تک اور دوسری طرف شام میں حلب اور انطاکیہ تک پہنچ گیا۔ رُوم کے اعیان سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقہ کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اس نے اپنے بیٹے ہِرَقل (Heraclius) کو ایک طاقتور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہِرَقل قیصر بنا دیا گیا اور اس نے برسرِ اقتدار آ کر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اس نے ماریس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب رسالت پر سرفراز ہوئے تھے۔

خسرو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اُس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے کے بعد اس کو نئے قیصر کے ساتھ صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اُس نے جنگ کو مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو سرکاری کلیسا نے ملحد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نسطوری اور یعقوبی وغیرہ) ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں، اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا حتیٰ کہ خسرو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہِرَقل آ کر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المَقدِس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا کنیسۃ القیامہ (Holy Sepulchr) برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اُسی پر مسیح نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاٹ پادری زکریاہ کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انہوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بُری طرح خسرو پرویز پر چڑھا تھا اُس کا اندازہ اُس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المَقدِس سے ہِرَقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

> "سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام رُوئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اُس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہِرَقل کے نام
>
> تُو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا۔"

اِس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اُردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پُورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکّہ معظمہ میں ایک اور اس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے

والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی قیادت میں، اور شرک کے پیروکار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو رُوم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اُس وقت سلطنتِ روم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکّے کے مُشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ "دیکھو ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بُت پرست بھی تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔"

اِن حالات میں قرآن مجید کی یہ سُورۃ نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ "قریب کی سرزمین میں رُومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلُوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آجائیں گے اور وہ دن وہ ہو گا جب کہ اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔" اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رُومیوں کو غلبہ نصیب ہو گا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اُسی زمانے میں فتح حاصل ہو گی۔ بظاہر دُور دُور تک اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر اندر پُوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو مکّے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشین گوئی کے بعد بھی آٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف رُوم کی مغلوبیّت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ۶۱۹ء تک پُورا مصر ایران کے قبضہ میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رُومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور ۶۱۷ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون (Chalcedon موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابزنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوندِ آتش کی بندگی نہ اختیار کر لے۔" آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اُس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (Carthage موجودہ ٹیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض انگریز مؤرخ گبن کے بقول، قرآن مجید کی اِس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصوّر تک نہ کر سکتا تھا کہ رُومی سلطنت ایران پر غالب آجائے گی، بلکہ غلبہ تو درکنار اُس وقت تو کسی کو یہ اُمّید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی [1]

---

[1] Gibbon. Decline & Fall of the Roman Empire. Vol. II P. 788 Modern Library. New York

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفارِ مکہ نے ان کا خوب مذاق اُڑایا اور اُبَیّ بن خَلَف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رُومی غالب آگئے تو دس اُونٹ میں دُوں گا ورنہ دس اُونٹ تم کو دینے ہونگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس شرط کا علم ہُوا تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن میں فِی بِضْعِ سِنِیْنَ کے الفاظ آئے ہیں، اور عربی زبان میں بِضْع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اِس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سَو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبَیّ سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہو گی وہ سَو اونٹ دیگا۔

۶۲۲ء میں اِدھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینۂ طیبہ تشریف لے گئے اور اُدھر قیصر ہِرَقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحرِ اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہُوا جہاں اُس نے ایران پر پُشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اِس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اُسقُفِ اعظم سرجیس (Serjius) نے مسیحیت کو مجُوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شُدہ دولت سُود پر قرض دی۔ ہِرقل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں ارمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے آذربیجان میں گھُس کر زرتشت کے مقامِ پیدائش اُرمیاہ کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ یہی سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مُشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کُن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشین گوئیاں جو سُورۂ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پُوری ہو گئیں۔

پھر رُوم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوی کی فیصلہ کُن لڑائی (۶۲۷ء) میں انہوں نے سلطنتِ ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دستگرد (دَسْکَرۃُ المَلِک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر ہِرَقل کے لشکر عین طَیْسَفُون (Ctesiphon) کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رونما ہوئی، وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے اٹھارہ بچے قتل کر دیئے گئے، اور چند روز بعد وہ خود قید کی سختیوں سے ہلاک ہو گیا۔ یہی سال تھا جس میں صلح حُدَیبیہ واقع ہوئی جسے قرآن "فتحِ عظیم" کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہی سال تھا جس میں خسرو پرویز کے بیٹے قباد ثانی نے تمام رُومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے رُوم سے صلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر "مقدس صلیب" اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیتُ المَقْدِس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عُمرۃُ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکّہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش ہی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچی تھی۔ عرب کے بکثرت

مشرکین اس پر ایمان لے آئے۔ اُبَیّ بن خلف کے وارثوں کو شرط ہار کر شرط کے اونٹ حضرت ابوبکرؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ انہیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے حکم دیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے۔ کیونکہ شرط اُس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جُوئے کی حُرمت کا حکم نہیں آیا تھا۔ مگر اَب حُرمت کا حکم آچکا تھا۔ اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی، مگر ہدایت کی گئی کہ اُسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔[۲۲۲]

وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ۔ (الرُّوم۔ آیت ۴)

"اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے۔"

ابنِ عباسؓ، ابوسعید خُدریؓ، سُفیان ثوری، سُدّیؒ وغیرہ حضرات کا بیان ہے کہ ایرانیوں پر رُومیوں کی فتح اور جنگِ بدر میں مُشرکین پر مسلمانوں کی فتح کا زمانہ ایک ہی تھا، اِس لیے مسلمانوں کو دوہری خوشی حاصل ہوئی۔ یہی بات ایران اور رُوم کی تاریخوں سے بھی ثابت ہے۔ ۶۲۴ء ہی وہ سال ہے جس میں جنگِ بدر ہوئی، اور یہی وہ سال ہے جس میں قیصرِ رُوم نے زرتشت کا مولِد تباہ کیا اور ایران کے سب سے بڑے آتش کدے کو مسمار کر دیا۔[۲۲۳]

نعشِ فرعون کا استحفاظ[۱]

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً۔

"اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت رہے۔"

آج تک وہ مقام جزیرہ سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے۔ جہاں فرعون کی لاش تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اِس کو موجودہ زمانے میں جبلِ فرعون کہتے ہیں، اور اسی کے قریب ایک گرم چشمہ ہے جس کو مقامی آبادی نے حمامِ فرعون کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ اِس کی جائے وقوع ابوزنیمہ سے چند میل اوپر شمال کی جانب ہے۔ اور علاقے کے باشندے اسی جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ فرعون کی لاش یہاں پڑی ہوئی ملی تھی۔

اگر یہ ڈوبنے والا وہی فرعون منفتہ ہے جس کو زمانۂ حال کی تحقیق نے فرعونِ مُوسیٰ[۱۴] قرار دیا ہے تو اُس کی لاش آج تک

---

[۱] یہ قرآن کی نہایت ہی عظیم پیشین گوئی ہے جو حضورؐ کی نبوّت اور قرآن کی صداقت کی ایک واضح دلیل ہے۔ جس وقت قرآن میں یہ پیشین گوئی سامنے آئی تھی اس وقت تک فراعنۂ مصر کی قبروں اور نقشوں کا حال منکشف نہیں ہوا تھا۔ اہراموں میں داخل ہونے اور فراعنہ کے مقبروں اور تابوتوں کو کھولنے کا کام زمانۂ حال میں ہوا ہے۔ ۱۹۰۷ء سے پہلے یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ دَورِ موسیٰ کے فرعونِ غرقی کی لاش محفوظ ہے یا نہیں۔ تین ہزار سال سے زیادہ پُرانے واقعہ کے متعلق حالیہ انکشاف نے قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل مُنکرین کے لیے فراہم کر دی ہے۔

قاہرہ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سر گرافٹن الیٹ سمتھ نے اِس کی ممی پر سے جب پٹیاں کھولی تھیں اس کی لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی تھی، جو کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی ایک کھلی علامت تھی۔

وَاِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ۔ یعنی ہم تو سبق آموز اور عبرت انگیز نشانات دکھائے ہی جائیں گے اگرچہ اکثر انسانوں کا حال یہ ہے کہ کسی بڑی سے بڑی عبرت ناک نشانی کو دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں[۲۲۴]

یاجُوج ماجُوج کی عالمگیر یورش

یاجوج سے مُراد رُوس اور شمالی چین کے وہ قبائل ہیں جو تاتاری، منگولی، ہُن اور سیتھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں اور قدیم زمانے سے مُتمدّن ممالک پر حملے کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے حملوں سے بچنے کے لیے قفقاز کے جنوبی علاقے میں دربند اور داریال کے استحکامات تعمیر کیے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے سیلاب وقتاً فوقتاً اٹھ کر ایشیا اور یورپ، دونوں طرف رُخ کرتے رہے ہیں۔ بائیبل کی کتاب پیدائش (باب ۱۰) میں ان کو حضرت نوحؑ کے بیٹے یافث کی نسل میں شمار کیا گیا ہے، اور یہی بیان مُسلمان مؤرخین کا بھی ہے۔ حزقی ایل کے صحیفے (باب ۳۸ و ۳۹) میں ان کا علاقہ رُوس اور توبل (موجودہ توبالسک) اور مسک (موجودہ ماسکو) بتایا گیا ہے۔ اسرائیلی مؤرخ یوسیفوس اُن سے مُراد سیتھین قوم لیتا ہے جس کا علاقہ بحرِ اسود کے شمال اور مشرق میں واقع تھا۔ جیروم کے بیان کے مطابق ماجوج کاکیشیا کے شمال میں بحرِ خزر کے قریب آباد تھے۔[۲۲۵]

ان کے کھول دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دُنیا پر اس طرح ٹُوٹ پڑیں گے کہ جیسے کوئی شکاری درندہ یکایک پنجرے یا بندھن سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ "وعدۂ حق پُورا ہونے کا وقت قریب آ لگے گا" کا اشارہ صاف طور پر اس طرف ہے کہ یاجُوج ماجُوج کی یہ عالمگیر یورش آخری زمانہ میں ہوگی اور اس کے بعد جلدی ہی قیامت آجائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا وہ ارشاد اس معنی کو اور زیادہ کھول دیتا ہے جو مُسلم نے حُذیفہ بن اُسید الغفاری کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو: دُھواں، دجّال، دآبۃ الارض، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ ابنِ مریم کا نزول، یاجُوج و ماجُوج کی یورش اور تین بڑے خسوف (زمین کا دھنسنا یا Land Slide)، ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں، پھر سب سے آخر میں یمن سے ایک سخت آگ اُٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی (یعنی بس اس کے بعد قیامت آجائے گی)۔ ایک اور حدیث میں یاجوج ماجوج کی یورش کا ذکر کر کے حضورؐ نے فرمایا اس وقت قیامت اِس قدر قریب ہوگی جیسے پُورے پیٹوں کی حاملہ کہ نہیں کہہ سکتے کب وہ بچہ جَن دے، رات کو یا دن کو (کالحامل المتم لایدری اھلھا متیٰ تفجؤھم بولدھا لیلا او نھارا)۔ لیکن قرآن مجید اور حدیث میں یاجُوج و ماجُوج کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ یہ دونوں متحد ہوں گے اور مل کر دُنیا پر ٹُوٹ پڑیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے قریب

زمانے میں یہ دونوں آپس ہی میں لڑ جائیں اور پھر ان کی لڑائی ایک عالمگیر فساد کی موجب بن جائے۔ ۲۲۶ھ

یہود کی ذلت و مسکنت

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کے بارے میں میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ تا قیامت ہے۔ اس میں فلسطین کی موجودہ اسرائیلی حکومت بن جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اول تو آیت تمام یہودی ملت کے بارے میں بحیثیتِ مجموعی ایک حکم لگاتی ہے، اس کے ایک ایک فرد پر یا افراد کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ اُس کیفیت کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہونے کے بعد سے قیامت تک ان پر من حیث المجموع دُنیا بھر میں طاری رہے گی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اِس طویل مدت کے دوران میں کبھی کسی مختصر مدت کے لیے بھی زمین کے کسی گوشے میں انہیں قوت و اقتدار نصیب نہ ہو۔ دراصل اِس آیت کو سمجھنے کے لیے یہودی قوم کی اُس تاریخ سے واقف ہونا ضروری ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے آج تک گزری ہے۔ اس تاریخ کو، اور اُن کی موجودہ حالت کو جو بحیثیت مجموعی دنیا میں آج بھی پائی جاتی ہے، بغور دیکھا جائے تو قرآن مجید کے اِن ارشادات کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ۔ (الاعراف ۱۶۷)	"اور جب اعلان کر دیا تیرے رب نے کہ وہ قیامت تک ان پر کسی نہ کسی ایسے شخص کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت عذاب دے گا۔"
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ۔ (آل عمران ۱۱۲)	"ان پر ذلت تھوپ دی گئی جہاں بھی وہ پائے جائیں بجز اس کے کہ کہیں ان کو اللہ کی طرف سے اور انسانوں کی طرف سے تحفظ کی ضمانت مل جائے۔"

پوری تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وقتاً فوقتاً دُنیا کے کسی گوشے میں کوئی نہ کوئی طاقت ایسی اُٹھتی رہی ہے جو یہودیوں کو خوب مارتی کھدیڑتی رہی۔ اور جہاں کہیں بھی وہ بخیریت رہے ہیں اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ اللہ کے دیئے ہوتے مواقع کی بنا پر کسی دوسرے ہی انسانی گروہ کی حمایت میں آجانے کی وجہ سے رہے ہیں۔ موجودہ یہودی ریاست بھی برطانیہ اور امریکہ کی حمایت ہی میں قائم ہوئی ہے اور باقی ہے۔ یہ حمایت جس وقت بھی ہٹے گی اِس ریاست کا حشر دُنیا دیکھ لے گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو فنا نہیں کرنا چاہتا بلکہ نمونۂ عبرت بنا کر باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس پر مسلسل عذاب کا کوڑا برستا رہتا تو یہ کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس کے باقی رہنے کا یہ انتظام کر دیا ہے کہ کہیں وہ پٹتی جاتی ہے تو کہیں اُسے پناہ بھی مل جاتی ہے۔ اِس طرح یہ ڈھائی ہزار برس سے لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى کی مصداق اِس دُنیا میں جیے جا رہی ہے۔ ۲۲۷ھ

فصل ۲

حدیث میں پیشین گوئیاں

کامل امن کا دور

حضرت خبابؓ کہتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ مَیں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپ خدا سے دُعا نہیں فرماتے؟" یہ سُن کر آپؐ کا چہرۂ مبارک تمتما اُٹھا اور آپؐ نے فرمایا، تم سے پہلے جو اہلِ ایمان تھے ان پر اس سے زیادہ مظالم ہو چکے ہیں۔ ان کی ہڈیوں پر لوہے کی کنگھیاں گھسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر رکھ کر آرے چلائے جاتے تھے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اِس کام کو پورا کر کے رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا کہ ایک آدمی صنعاد سے حضر موت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہو گا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو (بخاری)۔ ۲۲۸ھ

عرب و عجم پر غلبہ کی شرط

ابو طالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپؐ سے کہا "بھتیجے، یہ تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک منصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو تاکہ تمہارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جائے"۔ پھر انہوں نے وہ بات حضورؐ کو بتائی جو سردارانِ قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا "چچا جان، مَیں تو ان کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہ مان لیں تو عرب ان کا تابع فرمان اور عجم ان کا باجگزار ہو جائے۔

حضورؐ کے اِس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا اریدھم علیٰ کلمۃ واحدۃٍ یقولونھا تدین لھم بھا العرب وتؤدّی الیھم بھا العجم الجزیۃ۔ دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: ادعوھم الیٰ ان یتکلموا بکلمۃ تدین لھم بھا العرب ویملکون بھا العجم۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے ابو طالب کے بجائے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے

فرمایا" کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب و تدین لکم بھا العجم - اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں
"أرأیتم ان اعطیتکم کلمۃ تکلمتم بھا ملکتم بھا العرب ودانت لکم بھا العجم - ان لفظی اختلافات
کے باوجود مدعا سب کا یکساں ہے، یعنی حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر مَیں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کروں
جسے قبول کرکے تم عرب وعجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر بات ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات
کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمہاری بھلائی اس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اس میں کہ جس حالت میں تم پڑے
ہو اُسی میں تم کو پڑا رہنے دوں اور بس اپنی جگہ آپ ہی اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں؟" ۲۲۹

قُریش کا سیاسی اقتدار

آپ نے پیش گوئی کر دی تھی کہ جب تک قریش اپنے اخلاق بلند رکھیں گے اور فی الجملہ دین کی علمبرداری
کرتے رہیں گے، اور ان میں دو آدمی بھی مردانِ کار پائے جائیں گے ریاست انہی کو حاصل رہے گی۔
حضورؐ کا یہ اندازہ اس قدر صحیح تھا کہ تاریخ آپ کے بعد صدیوں تک اس کی صحت کا ثبوت دیتی رہی ہے قُریش
کے قبیلے کی زبردست مردم خیزی کا حال یہ تھا کہ خلافتِ راشدہ کے دَور میں چاروں خلیفہ اسی نے فراہم کیے اور
معلوم ہے کہ ان چاروں کی ٹکر کا کوئی آدمی فی الواقع اس وقت عرب میں نہ تھا۔ پھر اسی قبیلے نے عظیم الشان اموی
سلطنت قائم کی۔ اُسی نے عباسی سلطنت کو جنم دیا۔ اسی نے اسپین میں ایک زبردست حکومت کھڑی کر دی۔
اور اُسی نے مصر میں دولتِ فاطمیہ کی تاسیس کی۔ ۲۳۰

جہاد جاری رہے گا

"میری اُمت میں جہاد قیامت تک جاری رہے گا اور نہ کسی عادل کا عدل اسے ختم کر سکے گا، نہ کسی ظالم کا ظلم۔
——— یہی اسپرٹ ہمیشہ تجدیدِ اسلام کی تحریکوں کی محرک رہی ہے، اور اسی نے صالحین کو ماحول کی خوفناکیوں کے
آگے جھک جانے سے روکا ہے۔ ۲۳۱

مُسلمانوں کا بگاڑ یہود و نصاریٰ کی طرح کا ہو گا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی جو حدیث میں حضورؐ نے فرمائی ہے، یہ ہے کہ
مسلمان آخر کار یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر چل پڑیں گے اور جہاں جہاں انھوں نے قدم رکھا ہے یہ بھی قدم رکھیں گے
حتیٰ کہ اگر ان میں کسی نے اپنی ماں سے زنا کی تو مسلمانوں میں بھی کوئی شخص اُٹھے گا جو اس فعل کا ارتکاب کرے گا۔ ۲۳۲

لہ فاضل مؤلف نے حضورؐ کے ارشاد کو ایک دوسری روایت سے اخذ کر کے یُوں ذکر کیا ہے:
"آپؐ نے فرمایا ہے کہ تم بھی آخر کار پچھلی اُمتوں ہی کی روش پر چل کر رہو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بِل میں گھسے ہیں تو تم

مِلّت کی تاریخ مابعد کا خاکہ

اگرچہ یہ پیشین گوئیاں مُسلم، ترمذی، ابنِ ماجہ، مُستدرک وغیرہ کتابوں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ مگر یہاں اُس روایت کا نقل کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا جو امام شاطبی نے موافقات میں اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے منصبِ امامت میں نقل کی ہے:

ان اوّل دینکم نبوۃ و رحمۃ و تکون فیکم ماشاء اللہ ان تکون ثم یدفعھا اللہ جلّ جلالہٗ ثم تکون خلافۃ علیٰ منہاج النبوۃ ماشاء اللہ ان تکون ثم یدفعھا اللہ جل جلالہٗ ثمّ تکون ملکاً عاضاً فیکون ماشاء اللہ ان یکون ثم یدفعہ اللہ جلّ جلالہٗ۔

"تمہارے دین کی ابتداء نبوّت اور رحمت سے ہے اور وہ تمہارے درمیان رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ جل جلالہٗ اس کو اُٹھالے گا۔ پھر نبوّت کے طریقہ پر خلافت ہوگی[1] جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ اسے بھی اُٹھالے گا۔ پھر بداطوار بادشاہی ہوگی اور جب تک اللہ چاہے گا رہے گی پھر اللہ اسے بھی اُٹھالے گا۔

ثُمَّ تکون ملکاً جبریۃ فتکون ماشاء اللہ ان تکون ثم یدفعھا اللہ جلّ جلالہٗ۔

پھر جبر کی فرمانروائی ہوگی اور وہ بھی جب تک اللہ چاہے گا رہے گی۔ پھر اللہ اسے بھی اُٹھالے گا۔

ثم تکون خلافۃ علیٰ منہاج النبوۃ تعمل فی الناس بسنّۃ النبیّ ویلقی الاسلام بجرانہٖ فی الارض یرضیٰ عنھا ساکن السّماء وساکن الارض لا تدع السماء من قطر الاصبّتہ مدراراً ولا

پھر وہی خلافت بطریقِ نبوّت ہوگی جو لوگوں کے درمیان نبی کی سُنّت کے مطابق عمل کرے گی اور اسلام زمین میں پاؤں جمائے گا۔ اس حکومت سے آسمان والے بھی خوش ہونگے اور زمین والے بھی۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین

---

[۲۲] بھی اسی میں گھسو گے صحابہؓ نے پُوچھا: یارسُول اللہ، کیا یہُود و نصاریٰ مُراد ہیں؟ آپؐ نے فرمایا اور کون؟

نبیٔ اکرمؐ کا یہ ارشاد محض ایک توبیخ نہ تھا بلکہ اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے آپ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کی اُمّتوں میں بگاڑ کن کن راستوں سے آیا اور کن کن شکلوں میں ظہور کرتا رہا ہے[۲۳۳]

[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ "میرے بعد خلافت ۳۰ سال رہے گی، پھر بادشاہی ہوگی"۔ اور یہ مُدّت ربیع الاوّل ۴۱ھ میں ختم ہوگئی جب کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوئے۔ (مؤلف)[۲۳۴]

تدع الارض من نباتها و برکاتها شیئاً الّا اخرجته۔ اپنے پیٹ کے سارے خزانے اُگل دے گی"۔

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اسناد کے اعتبار سے اس روایت کا کیا مرتبہ ہے مگر معنی یہ اُن تمام روایات سے مطابقت رکھتی ہے جو اس معنی میں وارد ہوئی ہیں۔ اس میں تاریخ کے پانچ مرحلوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے تین گزر چکے ہیں اور چوتھا اب گزر رہا ہے۔ آخر میں جس پانچویں مرحلہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے، تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ انسانی تاریخ تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انسانی ساخت کے سارے "اِزم" آزمائے جا چکے ہیں اور بُری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ آدمی کے لیے اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تھک ہار کر اسلام کی طرف رجوع کرے۔[۲۳۵]

اُمراء و حُکّام کا بگاڑ

اِنہ ستکون بعدی امراء مَن صَدَّقھم بکذبھم و اعانھم علی ظلمھم فلیس منّی ولست منہ۔ (نسائی، کتاب البیعہ، باب ۳۴، ۳۵)

"میرے بعد کچھ لوگ حکمران ہونے والے ہیں، جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے، وہ مجھ سے نہیں اور مَیں اُس سے نہیں"۔

سیکون علیکم ائمۃٌ یملکون ارزاقکم یحدثونکم فیکذبونکم و یعملون فیسیئون العمل لا یرضون منکم حتّٰی تُحَسِّنُوا قبیحھم و تصدّقوا کذبھم فاعطوھم الحقّ ما رضُوا بہ فاذا تجاوزوا فمن قُتِل علی ذالك فھو شھید۔

(کنز العمال، ج ۶، ص ۴۴)

"عنقریب تم پر ایسے لوگ حاکم ہوں گے جن کے ہاتھ میں تمہاری روزی ہوگی۔ وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور کام کریں گے تو بُرے کام کریں گے۔ وہ تم سے اُس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی بُرائیوں کی تعریف اور ان کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرو پس تم ان کے سامنے حق پیش کرو جب تک وہ اسے گوارا کریں۔ پھر اگر وہ اس سے تجاوز کریں تو جو شخص اس پر قتل کیا جائے وہ شہید ہے"۔[۲۳۶]

سلسلۂ تجدیدِ دین

شرح حدیث مَن یُجدّدُ لھا دِینَھا

یہی وہ چیز ہے جس کی خبر مُخبرِ صادق علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اُس حدیث میں دی ہے جو ابو داؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ:

اِنّ اللہَ یبعث لھٰذہِ الاُمّۃ علٰی رأس کلّ مِاۃ سَنَۃٍ مَن یُجدِّدُ لھا دِینَھا۔

"اللہ ہر صدی کے سر پر اس اُمّت کے لیے ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا جو اس کے لیے دین کو تازہ کریں گے"۔

مگر اِس حدیث سے بعض لوگوں نے تجدید اور مُجدّدِ دین کا بالکل ہی ایک غلط تصوّر اخذ کر لیا۔ انہوں نے علیٰ رأسِ کُلِّ مِائَۃٍ سے صدی کا آغاز یا اِختتام مراد لے لیا اور مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا کا مطلب یہ سمجھا کہ اِس سے مُراد لازماً کوئی ایک ہی شخص ہے۔ اِس بنا پر انہوں نے تلاش کرنا شروع کر دیا کہ اسلام کی پچھلی تاریخوں میں کون کون ایسے اشخاص ملتے ہیں جو ایک ایک صدی کے آغاز یا اِختتام پر پیدا ہوئے یا مرے ہوں اور انہوں نے تجدید کا کام بھی کیا ہو۔ حالانکہ نہ رأس سے مراد سرا ہے اور نہ مَن کا مفہوم فردِ واحد تک محدود ہے۔ رأس کے معنی سر کے ہیں۔ اور صدی کے سر پر کسی شخص کے اٹھائے جانے کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وہ اپنے دَور کے عُلوم، افکار اور رفتارِ عمل پر نمایاں اثر ڈالے گا۔ اور مَن کا لفظ عربی زبان میں واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اِس لیے مَن سے مُراد ایک شخص بھی ہو سکتا ہے، بہت سے اشخاص بھی ہو سکتے ہیں، اور پُورے پُورے اِدارے اور گروہ بھی ہو سکتے ہیں۔ حضورؐ نے جو خبر دی ہے اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ انشاء اللہ اسلامی تاریخ کی کوئی صدی ایسے لوگوں سے خالی نہ گزرے گی جو طوفانِ جاہلیت کے مقابلے میں اُٹھیں گے اور اسلام کو اس کی اصلی رُوح اور صُورت میں از سرِ نَو قائم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ ضروری نہیں کہ ایک صدی کا مُجدّد ایک ہی شخص ہو۔ ایک صدی میں متعدد اشخاص اور گروہ یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام دُنیائے اسلام کے لیے ایک ہی مُجدّد ہو۔ ایک وقت میں بہت سے ملکوں میں بہت سے آدمی تجدیدِ دین کے لیے سعی کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ شخص جو اس سلسلے کی کوئی خدمت انجام دے "مُجدّد" کے خطاب سے نوازا جائے۔ یہ خطاب تو صرف ایسے اشخاص ہی کو دیا جا سکتا ہے جنہوں نے تجدیدِ دین کے لیے کوئی بہت بڑا اور نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔[۲۳۷]

مُسلمانوں میں تفرقہ کا ظہُور

ایک حدیث میں ہے کہ "عنقریب میری اُمّت ۷۳ فرقوں میں بَٹ جائے گی جن میں سے صرف ایک ناجی ہو گا، وہ جو میری اور میرے اصحاب کی پیروی کرے گا۔"

احادیث میں مسلمانوں کے اندر بہت سے فتنے پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے جس سے مقصود اہلِ ایمان کو فتنوں پر مُتنبّہ کرنا، اور اُن سے بچنے کے لیے تاکید کرنا تھا۔[۲۳۸]

ظہُورِ مہدی کے متعلق پیشین گوئیاں

ظہُورِ مہدی کے متعلق جو روایات ہیں، ان کے متعلّق ناقدینِ حدیث نے اس قدر سخت تنقید کی ہے کہ ایک گروہ سرے سے اس بات کا قائل ہی نہیں رہا ہے کہ امام مہدی کا ظہور ہو گا۔ اَسماءُ الرِّجال کی تنقید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِن احادیث کے اکثر رُواۃ شیعہ ہیں۔ تاریخ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر گروہ نے سیاسی و مذہبی اغراض کے لیے اِن احادیث کو استعمال کیا ہے، اور اپنے کسی آدمی پر ان مندرجہ علامات کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے

روایات میں صحیح اور وضعی عنصر

اِن وجوہ سے مَیں اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نفسِ ظہورِ مہدی کی خبر کی حد تک تو یہ روایات صحیح ہیں، لیکن تفصیلی علامات کا بیشتر بیان غالباً وضعی ہے، اور اہلِ غرض نے شاید بعد میں اِن چیزوں کا اصل ارشادِ نبوی پر اضافہ کیا ہے۔ مختلف زمانوں میں جن لوگوں نے مہدی[1] موعود ہونے کے جھُوٹے دعوے کیے ہیں ان کے لٹریچر میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری فتنہ پردازی کے لیے مواد انہی روایات نے بہم پہنچایا ہے۔

حضورؐ کی پیشین گوئیوں کا انداز

مَیں نے جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں پر غور کیا ہے۔ ان کا انداز یہ نہیں ہوتا کہ کسی آنے والی چیز کی علامات و تفصیلات اُس طریقے سے کبھی آپؐ نے بیان کی ہوں جس طرح ظہورِ مہدی کی احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ آپ بڑی بڑی اصولی علامات تو ضرور بیان فرما دیا کرتے تھے لیکن جزئی تفصیلات بیان کرنا آپؐ کا طریقہ نہ تھا۔[239]

متعلقہ روایات کی ژولیدگی

لیکن جو لوگ ان روایات کو جمع کرکے ان کا باہمی مقابلہ کرتے ہیں اور ان میں بکثرت تعارضات پاتے ہیں، نیز جن کے سامنے بنی فاطمہ اور بنی عباس اور بنی اُمیّہ کی کشمکش کی پُوری تاریخ ہے، اور وہ صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ اِس کشمکش کے فریقوں میں سے ہر ایک کے حق میں متعدد روایات موجود ہیں، اور راویوں میں سے بھی اکثر و بیشتر وہ لوگ ہیں جن کا ایک نہ ایک فریق سے کھلا ہوا تعلق تھا، ان کے لیے یہ بہت مُشکل ہے کہ ان روایات کی ساری تفصیلات کو صحیح تسلیم کرلیں جو احادیث میں منقول ہیں۔ مثلاً ان میں سے بعض میں "رایات السود"

---

[1] اوّل تو خود لفظ "مہدی" پر غور کرنا چاہیے جو حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے مہدی کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنی ہدایت یافتہ کے ہیں، "ہادی" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ مہدی ہر وہ سردار، لیڈر اور امیر ہو سکتا ہے جو راہِ راست پر ہو۔ "المہدی" زیادہ سے زیادہ خصوصیت کے لیے استعمال ہوگا جس سے آنے والے کی کسی خاص امتیازی شان کا اظہار مقصود ہے۔ اور وہ امتیازی شان حدیث میں اس طرح بیان کردی گئی ہے کہ آنے والا الخلافت علی منہاج النبوۃ کا نظام درہم برہم ہو جانے اور ظلم و جور سے زمین کے بھر جانے کے بعد از سرِ نو خلافت کو منہاجِ نبوت پر قائم کریگا اور زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ بس یہی چیز ہے جس کی وجہ سے اس کو مختص و ممتاز کرنے کے لیے "مہدی" پر "ال" داخل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ مہدی کے نام سے دین میں کوئی خاص منصب قائم کیا گیا ہے جس پر ایمان لانا اور جس کی معرفت حاصل کرنا ویسا ہی ضروری ہو جیسا انبیاء پر ایمان لانا، اور اُس کی اطاعت بھی شرطِ نجات اور شرطِ اسلام و ایمان ہو۔ نیز اس خیال کے لیے بھی حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ مہدی کوئی امام معصوم ہوگا۔ دراصل یہ معصومیتِ غیرِ انبیاء کا تخیّل ایک خالص شیعی تخیّل ہے جس کی کوئی سند کتاب و سُنّت میں موجود نہیں ہے۔[240]

یعنی کالے جھنڈوں کا ذکر ہے، اور تاریخ سے معلوم ہے کہ کالے جھنڈے بنی عباس کا شعار تھے۔ نیز یہ بھی تاریخ سے معلوم ہے کہ اس قسم کی احادیث کو پیش کر کر کے خلیفہ مہدی عباسی کو مہدیٔ موعود ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ [۲۴۱]

مُجدّدِ کامل کا مقام

تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مُجدّدِ کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بعد جتنے مُجدّد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مُجدّدِ کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دُنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو، خواہ اِس دَور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام الامام المہدی ہو گا جس کے بارے میں صاف پیشین گوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔

آج کل لوگ نادانی کی وجہ سے اس نام کو سُن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ کسی آنے والے مردِ کامل کے انتظار نے جاہل مسلمانوں کے قوائے عمل کو سرد کر دیا ہے، اس لیے ان کی رائے یہ ہے کہ جس حقیقت کا غلط مفہوم لے کر جاہل لوگ بے عمل ہو جائیں وہ سرے سے حقیقت ہی نہ ہونی چاہیے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ تمام مذہبی قوموں میں کسی "مردے از غیب" کی آمد کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ محض ایک وہم ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرح پچھلے انبیاء نے بھی اگر اپنی قوموں کو یہ خوش خبری دی ہو کہ نوعِ انسان کی دنیوی زندگی ختم ہونے سے پہلے ایک دفعہ اسلام ساری دنیا کا دین بنے گا اور انسان کے بنائے ہوئے سارے "ازموں" کی ناکامی کے بعد آخر کار تباہیوں کا مارا ہوا انسان اس "ازم" کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو گا جسے خدا نے بنایا ہے، اور یہ نعمت انسان کو ایک ایسے عظیم الشان لیڈر کی بدولت نصیب ہو گی جو انبیاء کے طریقہ پر کام کر کے اسلام کو اس کی صحیح صورت میں پُوری طرح نافذ کر دے گا، تو آخر اس میں وہم کی کون سی بات ہے؟ بہت ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے کلام سے نکل کر یہ چیز دنیا کی دوسری قوموں میں بھی پھیلی ہو اور جہالت نے اس کی روح نکال کر اوہام کے لبادے اس کے گرد لپیٹ دیئے ہوں۔

مہدی کے متعلق مروّجہ تصوّر

مسلمانوں میں جو لوگ الامام المہدی کی آمد کے قائل ہیں وہ بھی ان متجددین سے جو اس کے قائل نہیں ہیں، اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ و صوفیانہ وضع و قطع کے آدمی ہوں گے۔ تسبیح ہاتھ میں لیے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہوں گے۔ آتے ہی انا المہدی کا

اعلان کریں گے۔ علماء اور مشائخ کتابیں لیے ہوئے پہنچ جائیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے ان کے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کر کے انہیں شناخت کر لیں گے، پھر بیعت ہو گی اور اعلانِ جہاد کر دیا جائے گا چلے کھینچے ہوئے درویش اور سب پرانے طرز کے "بقیۃ السلف" ان کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے۔ تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لیے برائے نام چلانی پڑے گی، اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے ہو گا۔ پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے۔ جس کافر پر نظر ماریں گے تڑپ کر بے ہوش ہو جائے گا اور محض بددعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائیں گے۔

مہدی کے متعلق مؤلف کا اندازہ

عقیدۂ ظہورِ مہدی کے متعلق عام لوگوں کے تصورات کچھ اسی قسم کے ہیں۔ مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھ کو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہو گا۔ وقت کے تمام علومِ جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہو گی۔ زندگی کے سارے مسائلِ مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہو گا۔ عقلی و ذہنی ریاست، سیاسی تدبّر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہو گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی "جدتوں" کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شور مچائیں گے، پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہو گا کہ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے، نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرے گا۔ بلکہ شاید اسے خود بھی اپنے مہدیٔ موعود ہونے کی خبر نہ ہو گی اور اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہو گا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا۔

مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں

جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، نبی کے سوا کسی کا یہ منصب نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے۔ مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں، کر کے دکھا جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں، میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

مہدی کے کام کی نوعیت

مہدی کے کام کی نوعیت کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ بھی ان حضرات کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے اس کام میں کرامات و خوارق، کشوف و الہامات، اور چلّوں اور "مجاہدوں" کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انقلابی لیڈر کو دنیا میں جس طرح شدید جدوجہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے انہی مرحلوں سے مہدی کو بھی گزرنا ہو گا۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہبِ فکر (School of Thought)

پیدا کرے گا، ذہنیتوں کو بدلے گا، ایک زبردست تحریک اٹھائے گا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی، جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی، مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دیگا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی، اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوجِ کمال پر پہنچ جائے گی۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے" اس کی حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہونگے اور زمین والے بھی، آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا، اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اُگل دے گی۔"

اگر یہ توقع صحیح ہے کہ ایک وقت میں اسلام تمام دنیا کے افکار، تمدن اور سیاست پر چھا جانے والا ہے تو ایسے عظیم الشان لیڈر کی پیدائش بھی یقینی ہے جس کی ہمہ گیر و پُرزور قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوگا۔ جن لوگوں کو ایسے لیڈر کے ظہور کا خیال سن کر حیرت ہوتی ہے مجھے ان کی عقل پر حیرت ہوتی ہے۔ جب خدا کی اس خدائی میں لینن اور ہٹلر جیسے ائمۂ ضلالت کا ظہور ہو سکتا ہے تو آخر ایک امامِ ہدایت ہی کا ظہور کیوں مستبعد ہو؟ [۲۴۲]

مسیح علیہ السلام کی آمدِ ثانی کے متعلق حضور کی پیشین گوئیاں

متعلقہ احادیث

(۱) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لَیُوشِکَنَّ ان ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلاً فیکسر الصلیب و یقتل الخنزیر و یضع الحرب و یُفیض المال حتی لا یقبلہ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اتریں گے تمہارے درمیان ابنِ مریمؑ حاکمِ عادل بن کر، پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور خنزیر کو ہلاک کر دیں گے[۱] اور

---

[۱] صلیب کو توڑ ڈالنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ دینِ عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسٰیؑ) کو صلیب پر "لعنت" کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفارہ بن گیا۔ اور انبیاء کی اُمتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی تھی کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا جو تمام انبیاء کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسٰی علیہ السلام آکر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دی، نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بنا تو عیسائی عقیدے کی سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے تو نہ اپنے پیروؤں کے لیے سور حلال کیا تھا اور نہ ان کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھیرایا تھا، تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

احدٌ حتیٰ تکون السجدۃ الواحدۃ خیراً من الدنیا و مافیہا (بخاری کتاب احادیث الانبیاء، باب نُزُول عیسیٰ بن مریم ۔ مسلم، باب بیان نزول عیسیٰ ۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی نزول عیسیٰ ۔ مسند احمد، مرویاتِ ابی ہریرۃؓ)۔

جنگ کا خاتمہ کر دیں گے (دوسری روایت میں حرب کے بجائے جزیہ کا لفظ ہے یعنی جزیہ ختم کر دیں گے[1]) اور مال کی وہ کثرت ہو گی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا اور (حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور) ایک سجدہ کر لینا دُنیا و مافیہا سے بہتر ہو گا۔"

(۲) ایک اور روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ان الفاظ میں ہے کہ لاتقوم الساعۃ حتیٰ ینزل عیسیٰ ابن مریم ......"قیامت قائم نہ ہو گی جب تک نازل نہ ہو لیں عیسیٰ ابن مریم" ...... اور اس کے بعد وہی مضمون ہے جو اُوپر کی حدیث میں بیان ہُوا ہے (بخاری، کتاب المظالم، باب کسر الصلیب ۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجال)

(۳) عن ابی ھُریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم و امامکم منکم (بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ ۔ مسلم، بیان نُزُولِ عیسیٰ ۔ مُسند احمد، مرویاتِ ابی ہریرۃؓ)۔

حضرت ابُوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیسے ہو گے تم جبکہ تمہارے درمیان ابنِ مریمؑ اُتریں گے اور تمہارا امام اُس وقت خود تم میں سے ہو گا۔"[2]

(۴) عن ابی ھُریرۃؓ اَنَّ رسُولَ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال ینزل عیسیٰ ابن مریم فیقتل الخنزیر و یمحوا الصلیب و تجمع لہ الصلوٰۃ و یُعطی المال حتیٰ لا یقبل و یضع الخراج و ینزل الروحاء فیحج منہا او یعتمر، او یجمعھما (مُسند احمد، سلسلہ مرویات

"حضرت ابُوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ ابن مریمؑ نازل ہوں گے پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو مٹا دیں گے اور ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہو گا اور وہ خراج ساقط کر دیں گے اور روحاء[3] کے مقام

---

[1] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ملتوں کے اختلافات ختم ہو کر سب لوگ ایک ملتِ اسلام میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح نہ جنگ ہو گی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اسی بات پر آگے احادیث نمبر ۵ و ۱۵ دلالت کرتی ہیں

[2] یعنی نماز میں حضرت عیسیٰؑ امامت نہیں کرائیں گے بلکہ مسلمانوں کا جو امام پہلے سے ہو گا اسی کے پیچھے وہ نماز پڑھیں گے۔

[3] مدینہ سے ۳۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

ابی ہریرہؓ۔ مسلم، کتاب الحج۔ باب جواز التمتع فی الحج والقران)۔

پر منزل کر کے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے۔ یا دونوں کو جمع کریں گے۔ؐ (راوی کو شک ہے کہ حضورؐ نے ان میں سے کونسی بات فرمائی تھی)۔

(۵) عن ابی ھریرۃ (بعد ذکر خروج الدجال) فبینما ھم یعدّون للقتال یسوّون الصفوف اذا اقیمت الصلوٰۃ فینزل عیسیٰ ابن مریم فامّھم فاذا راٰہ عدو اللّٰہ یذوب کما یذوب الملح فی الماء فلو ترکہ لانذاب حتّٰی یھلک ولکن یقتلہ اللّٰہ بیدہٖ فیریھم دمہ فی حربتہٖ (مشکوٰۃ، کتاب الفتن، باب الملاحم، بحوالہ مسلم)۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے (دجال کے خروج کا ذکر کرنے کے بعد حضورؐ نے فرمایا) اس اثناء میں کہ مسلمان اس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے، صفیں باندھ رہے ہوں گے اور نماز کے لیے تکبیرِ اقامت کہی جا چکی ہو گی کہ عیسیٰ ابن مریمؑ نازل ہو جائیں گے اور نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ اور اللہ کا دشمن (یعنی دجال) ان کو دیکھتے ہی اس طرح گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام اس کو اُس کے حال ہی پر چھوڑ دیں تو وہ آپ ہی گُھل کر مر جائے۔ مگر اللہ اس کو اُن کے ہاتھ سے قتل کرائے گا اور وہ اپنے نیزے میں اُس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔"

(۶) عن ابی ھُریرۃؓ انّ النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم قال لیس بینی وبینہ نبی (یعنی عیسیٰ) وانّہ نازل فاذا رأیتموہ فاعرفوہ رجل مربوع الی الحمرۃ والبیاض بین ممصرتین کان رأسہ یقطر وان لم یصبہ بلل فیقاتل الناس علی الاسلام فیدقّ الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیۃ ویھلک اللّٰہ فی زمانہ الملل کلھا الّا الاسلام ویھلک المسیح الدجال فیمکث فی الارض اربعین سنۃ ثمّ یتوفّی فیصلّی علیہ المسلمون۔ (ابوداؤد)

"ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "میرے اور اُن (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اُترنے والے ہیں، پس جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا، وہ ایک میانہ قد آدمی ہیں، رنگ مائل بسُرخی و سپیدی ہے، دو زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر کے بال ایسے ہوں گے گویا اب ان سے پانی ٹپکنے والا ہے، حالانکہ وہ بھیگے ہوئے نہ ہوں گے، وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے، صلیب کو پاش پاش کر دیں گے۔ خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، اور اللہ

ؐ واضح رہے کہ اس زمانے میں جن صاحب کو مثیلِ مسیح قرار دیا گیا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں نہ حج کیا اور نہ عُمرہ۔

کتاب الملاحم، باب خروج الدجال۔ مُسند احمد، مرویاتِ (ابی ہریرہؓ)۔

ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام ملتوں کو مٹا دیگا اور وہ مسیح دجال کو ہلاک کر دیں گے، اور زمین میں وہ چالیس سال ٹھیریں گے پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے۔"

(۷) عن جابر بن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔ ۔۔ ۔۔ فینزل عیسٰی بن مریم علیہ السّلام فیقول امیرھم تعال فصلِّ فیقول لا ان بعضکم علٰی بعضٍ امراء تکرمۃ اللہ ھٰذہ الامۃ۔ (مسلم، بیانِ نزولِ عیسٰی ابن مریم۔ مُسند احمد بسلسلۂ مرویاتِ جابر بن عبد اللہ)۔

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ پھر عیسٰی ابنِ مریمؑ نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ آئیے، آپ نماز پڑھائیے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو[1]۔ یہ وہ اُس عزت کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اس اُمت کو دی ہے۔

(۸) عن جابر بن عبد اللہ (فی قصۃ ابنِ صیّاد) فقال عمر بن الخطاب ائذن لی فاقتلہ یا رسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یکن ھو فلست صاحبہ، انّ صاحبہ عیسٰی ابن مریم علیہ الصلوٰۃ و السّلام، وان لا یکن فلیس لک ان تقتل رجلًا من اھلِ العھد (مشکوٰۃ۔ کتاب الفتن، باب قصۂ ابنِ صیاد، بحوالہ شرح السنہ بغوی)۔

"جابرؓ بن عبد اللہ (قصۂ ابنِ صیاد کے سلسلہ میں) روایت کرتے ہیں کہ پھر عمرؓ بن خطاب نے عرض کیا، یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسے قتل کر دوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ وہی شخص (یعنی دجال) ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو بلکہ اسے تو عیسٰی ابن مریمؑ ہی قتل کریں گے۔ اور اگر یہ وہ شخص نہیں ہے تو تمہیں اہلِ عہد (یعنی ذمیوں) میں سے ایک آدمی کو قتل کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

(۹) عن جابر بن عبد اللہ (فی قصۃ الدجال) فاذا ھم بعیسٰی ابن مریم علیہ السّلام فتقام الصلوٰۃ فیقال لہ تقدّم یا روحَ اللہ فیقول لیتقدّم امامکم فلیصلِّ بکم۔ فاذا صلی صلوٰۃ الصبح خرجوا الیہ قال فحین یری

"جابرؓ بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ (دجال کا قصہ بیان کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اس وقت یکایک عیسٰی ابن مریم علیہ السلام مسلمانوں کے درمیان آجائیں گے۔ پھر نماز کھڑی ہوگی اور ان سے کہا جائے گا کہ اے رُوح اللہ آگے بڑھیے، مگر وہ

---

[1] یعنی تمہارا امیر خود تم ہی میں سے ہونا چاہیے۔

الكذّاب ينماث كما ينماث الملح فى الماء فيمشى اليه فيقتله حتّٰى ان الشجر و الحجر ينادى يا روحَ الله هٰذا اليهُودِىُّ فلا يترك ممن كان يتبعه احدًا اِلّا قتله ۔ (مُسند احمد، بسلسلۂ روایات جابرؓ بن عبد اللہ)۔

کہیں گے کہ نہیں، تمہارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے: وہی نماز پڑھاتے۔ پھر صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمان دجّال کے مقابلے پر نکلیں گے۔ فرمایا جب وہ کذّاب حضرت عیسٰیؑ کو دیکھے گا تو گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھیں گے اور اُسے قتل کر دیں گے اور حالت یہ ہوگی کہ درخت اور پتھر پکار اُٹھیں گے کہ اَے رُوح اللہ یہ یہُودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ دجّال کے پیروؤں میں سے کوئی نہ بچے گا جسے وہ (یعنی عیسٰیؑ) قتل نہ کر دیں۔

(۱۰) عن النواس بن سمعان (فى قصة الدّجّال) فبينما هو كذالك اذ بعث (الله المسيح بن مريم فينزل عند المنارة البيضاء شرقى دمشق بين مهروذتين واضعًا كفيه على اجنحة ملكين اذا طأطأ راسه قطر واذا رفعه تحدر منه جمان كاللؤلؤ فلا يحل لكافر يجد ريح نفسه الامات ونفسه ينتهى الى حيث ينتهى طرفه فيطلبه حتّٰى يدركهٗ بباب لُدٍّ فيقتلهٗ ۔ (مسلم، ذکر الدجّال۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجّال۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی فتنۃ الدجّال۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجّال)۔

حضرت نوّاس بن سَمعان کلابی (قصّۂ دجّال بیان کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں: اِس اثنا میں کہ دجّال یہ کچھ کر رہا ہوگا، اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریمؑ کو بھیج دیگا اور وہ دمشق کے مشرقی حصے میں، سفید مینار کے پاس، زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے، دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اُتریں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں، اور جب سر اُٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی۔ اور وہ ان کی حدِ نظر تک جائیگی۔ وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابنِ مریمؑ دجّال کا پیچھا کریں گے اور لُدؓ[1] کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔

(۱۱) عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله

عبد اللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ

---

[1] واضح رہے کہ لُد (Lydda) فلسطین میں ریاست اسرائیل کے دار السلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہودیوں نے وہاں بہت بڑا ہوائی اڈا بنا رکھا ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلّم یخرج الدّجّالُ فی اُمّتی فیمکث اربعین (لا ادری اربعین یومًا او اربعین شھرًا او اربعین عامًا) فیبعث اللہ عیسیٰ ابن مریم کانہ عروۃ بن مسعود فیطلبہ فیھلکہٗ ثم یمکث الناس سبع سنین لیس بین اثنین عداوۃٌ (مُسلم، ذکر الدجال)

علیہ وسلّم نے فرمایا: دجّال میری اُمّت میں نکلے گا اور چالیس (مَیں نہیں جانتا چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال[1]) رہے گا۔ پھر اللہ عیسیٰ ابن مریمؑ کو بھیجے گا۔ ان کا حلیہ عُروہ بن مسعُود (ایک صحابی) سے مشابہ ہوگا۔ وہ اس کا پیچھا کریں گے اور اسے ہلاک کر دیں گے، پھر سات سال تک لوگ اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان بھی عداوت نہ ہوگی۔"

(۱۲) عن حذیفۃ بن اَسید الغفاری قال اطلع النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم علینا ونحن نتذاکر فقال ما تذکرون قالوا نذکر الساعۃ قال انھا لن تقوم حتّٰی تَرَون قبلھا عشر اٰیات فذکر الدُّخانَ والدَّجّالَ و الدّابۃ وطلوع الشمس من مغربھا و نزول عیسی ابن مریم ویاجوج وماجوج وثلثۃ خسوف، خسف بالمشرق وخسف بالمغرب، وخسف بجزیرۃ العرب واٰخر ذالک نار تخرج من الیمن تطرد الناس الی محشرھم (مُسلم: کتاب الفِتَن واشراط الساعۃ۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب امارات الساعۃ)۔

"حُذَیفہؓ بن اَسید الغفاری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم ہماری مجلس میں تشریف لائے اور ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ آپؐ نے پُوچھا کیا بات ہو رہی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ھم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ فرمایا وہ ہرگز قائم نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے دس نشانیاں ظاہر نہ ہو جائیں۔ پھر آپؐ نے وہ دس نشانیاں یہ بتائیں: (۱) دُھواں، (۲) دجّال، (۳) دابۃ الارض، (۴) سُورج کا مغرب سے طلوع ہونا، (۵) عیسیٰ ابن مریمؑ کا نزول، (۶) یاجوج ماجوج، (۷) تین بڑے خسف[2]، ایک مشرق میں، (۸) دوسرا مغرب میں، (۹) تیسرا جزیرۃ العرب میں، (۱۰) سب سے آخر میں ایک زبردست آگ جو یمن سے اُٹھے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔"

(۱۳) عن ثوبانَ مَولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلّم

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے آزاد کردہ غلام ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "میری اُمّت

---

[1] یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کا اپنا قول ہے۔

[2] زمین میں دھس جانا (Land Slide)

عصابتان من امتی احرزهما اللہ تعالیٰ من النار۔ عصابۃ تغزو الھند، وعصابۃ تکون مع عیسی ابن مریم علیہ السلام (نسائی، کتاب الجہاد۔ مسند احمد بسندہ روایاتِ ثوبان)۔

کے دو لشکر ایسے ہیں جن کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچا لیا۔ ایک وہ لشکر جو ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا وہ جو عیسیٰ ابن مریمؑ کے ساتھ ہوگا۔

(۱۴) عن مُجَمِّع ابن جاریۃ قال سمعتُ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول یقتل ابنُ مَریَمَ الدَّجّال بباب لُدٍّ (مُسند احمد، ترمذی، ابواب الفتن)۔

"مُجَمِّع بن جاریہ انصاری کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ ابنِ مریمؑ دجّال کو لُد کے دروازے پر قتل کریں گے"۔

(۱۵) عن ابی اُمامۃ الباھلی (فی حدیث طویل فی ذکر الدجّال) فبینما امامھم قد تقدم یصلّی بھم الصبح اذ نزل علیھم عیسی ابن مریم فرجع ذالک الامام ینکص یمشی قھقرٰی لیتقدّم عیسٰی فیضع عیسٰی یدہ بین کتفیہ ثم یقول لہ تَقَدَّمْ فصلِّ، فانھا لک اقیمت فیصلّی بھم امامھم فاذا انصرف قال عیسٰی علیہ السلام افتحوا الباب فیفتح و وراءہ الدجّال ومعہ سبعون الف یھودیّ کلھم ذُوسیف محلی وساج فاذا نظر الیہ الدَّجّالُ ذاب کما یذوب الملح فی الماء وینطلق ھاربا و یقول عیسٰی ان لی فیک ضربۃ لن تسبقنی بھا فیدرکہ عند باب اللُّدِّ الشرقی فیھزم اللہ الیھود۔۔۔ وتملأ الارض من المسلم کما یملأ الاناء من الماء وتکون الکلمۃ واحدۃ فلا یعبد الا اللہ تعالیٰ (ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجال)۔

ابو اُمامہ باہلی (ایک طویل حدیث میں دجّال کا ذکر کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں کہ عین اُس وقت جب مسلمانوں کا امام صُبح کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکا ہوگا عیسیٰ ابن مریمؑ اُن پر اُتر آئیں گے۔ امام پیچھے پلٹے گا تاکہ عیسیٰؑ آگے بڑھیں، مگر عیسیٰؑ اس کے شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ تم ہی نماز پڑھاؤ کیونکہ یہ تمہارے لیے ہی کھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہی نماز پڑھائے گا۔ سلام پھیرنے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ دروازہ کھولو، چنانچہ وہ کھولا جائے گا۔ باہر دجّال ۷۰ ہزار مسلح یہودیوں کے ساتھ موجود ہوگا۔ جونہی کہ عیسیٰ علیہ السلام پر اس کی نظر پڑے گی وہ اس طرح گھُلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھُلتا ہے اور وہ بھاگ نکلے گا۔ عیسیٰؑ کہیں گے میرے پاس تیرے لیے ایک ایسی ضرب ہے جس سے تو بچ کر نہ جا سکے گا۔ پھر وہ اسے لُد کے مشرقی دروازے پر جا لیں گے اور اللہ یہودیوں کو ہرا دے گا۔۔۔ اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی جیسے برتن پانی سے بھر جائے۔ سب دُنیا کا کلمہ ایک ہو جائے گا اور

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔"

(۱۶) عن عثمان بن ابی العاص قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ۔ ۔ ۔ و ینزل عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام عند صلوٰۃ الفجر فیقول لہ امیرھم یا روح اللہ تقدم، صلِّ، فیقول ھذہ الامۃ بعضھم امراء علیٰ بعض فتقدم امیرھم فیصلی، فاذا قضیٰ صلوٰتہ اخذ عیسیٰ حربتہ فیذھب نحو الدجال فاذا یراہ الدجال ذاب کما یذوب الرصاص فیضع حربتہ بین ثندوتہ فیقتلہ و ینھزم اصحابہ لیس یومئذٍ شیئٌ یواری منھم احداً حتیٰ ان الشجر لیقول یا مومن ھٰذا کافر ویقول الحجر یا مؤمن ھٰذا کافر (مسند احمد۔ طبرانی۔ حاکم)۔

"عثمان بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے ۔ ۔ ۔ اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام فجر کی نماز کے وقت اُتر آئیں گے۔ مسلمانوں کا امیر اُن سے کہے گا کہ اے رُوح اللہ! آپ نماز پڑھائیے۔ وہ جواب دیں گے کہ اس اُمت کے لوگ خود ہی ایک دوسرے پر امیر ہیں تب مسلمانوں کا امیر آگے بڑھ کر نماز پڑھائے گا پھر نماز سے فارغ ہو کر عیسیٰ اپنا حربہ لے کر دجال کی طرف چلیں گے۔ وہ جب ان کو دیکھے گا تو اس طرح گھلنے لگا جیسے سیسہ گھلتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنے حربے سے اس کو ہلاک کر دیں گے اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگیں گے مگر کہیں انہیں چھپنے کو جگہ نہ ملے گی حتیٰ کہ درخت پکاریں گے اے مومن، یہ کافر یہاں موجود ہے اور پتھر پکاریں گے کہ اے مومن، یہ کافر یہاں موجود ہے۔"

(۱۷) عن سمُرَۃ بن جُندُب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (فی حدیث طویل)، فیصبح فیھم عیسیٰ ابن مریمؑ فیھزمہ اللہ وجنودہ حتیٰ ان اجذم الحائط و اصل الشجر لینادی یا مومن ھٰذا کافر یستتر بی فتعال اقتلہ۔ (مسند احمد، حاکم)۔

"سمُرہ بن جُندُب (ایک طویل حدیث میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: پھر صبح کے وقت مُسلمانوں کے درمیان عیسیٰ ابن مریمؑ آجائیں گے اور اللہ دجال اور اس کے لشکروں کو شکست دے گا یہاں تک کہ دیواریں اور درختوں کی جڑیں پکار اُٹھیں گی کہ اے مومن، یہ کافر میرے پیچھے چھپا ہوا ہے، آ اور اسے قتل کر۔"

(۱۸) عن عِمران بن حصین ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تزال طائفۃ من اُمتی علی الحق ظاھرین علیٰ من ناواٰھم

"عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اُمّت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا موجود رہے گا جو حق پر قائم اور مخالفین پر بھاری

حتّٰی یاتی امر اللہ تبارک وتعالیٰ وینزل عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام (مُسند احمد)۔

ہوگا یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فیصلہ آجائے اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نازل ہو جائیں۔"

(۱۹) عن عائشۃ (فی قصۃ الدجّال) فینزل عیسیٰ علیہ السّلام فیقتلہٗ ثم یمکث عیسیٰ علیہ السلام فی الارض اربعین سنۃ اماماً عادلاً وحکماً مقسطاً (مُسند احمد)

"حضرت عائشہؓ (دجّال کے قصّے میں) روایت کرتی ہیں: پھر عیسیٰ علیہ السّلام اُتریں گے اور دجّال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السّلام چالیس سال تک زمین میں ایک امامِ عادل اور حاکمِ مُنصِف کی حیثیت سے رہیں گے۔"

(۲۰) عن سفینۃ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم (فی قصۃ الدجّال) فینزل عیسیٰ علیہ السّلام فیقتلہ اللہ تعالیٰ عند عَقَبَۃِ اَفِیق۔ (مُسند احمد)۔

"رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے آزاد کردہ غلام سفینہ (دجّال کے قصّے میں) روایت کرتے ہیں: پھر عیسیٰ علیہ السّلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دجّال کو اَفِیق[1] کی گھاٹی کے قریب ہلاک کر دے گا۔"

(۲۱) عن حذیفۃ (فی ذکر الدجّال) فلمّا قاموا یصلّون نزل عیسیٰ ابن مریم اماہم فصلّی بھم فلمّا انصرف قال ھٰکذا افرجوا بینی وبین عدو اللہ ۔۔ ۔۔ ویُسلّط اللہ علیہم المُسلمین فیقتلونھم حتّٰی ان الشجر والحجر لینادی یا عبد اللہ یا عبد الرحمٰن یا مسلم ھٰذا الیھودیّ فاقتُلْہُ فیفنیھم اللہ تعالیٰ ویظھر المسلمُون فیکسرون الصلیب ویقتلون الخنزیر ویضعون الجزیۃ۔ (مُستدرک حاکم۔ مُسلم میں بھی یہ روایت

"حضرت حُذیفہ بن یمان (دجّال کا ذکر کرتے ہوئے) بیان کرتے ہیں: "پھر جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوں گے تو ان کی آنکھوں کے سامنے عیسیٰ ابن مریمؑ اُتر آئیں گے، اور وہ مُسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے پھر سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے کہیں گے کہ میرے اور اس دُشمنِ خدا کے درمیان سے ہٹ جاؤ — اور اللہ دجّال کے ساتھیوں پر مسلمانوں کو مُسلّط کر دیگا اور مُسلمان اُنہیں خوب ماریں گے یہاں تک کہ درخت اور پتھر پکار اُٹھیں گے اَے عبداللہ، اَے عبدالرحمٰن اَے مسلمان، یہ رہا ایک یہودی، مار اِسے اِس طرح

---

[1] اَفِیق، جسے آج کل فِیق کہتے ہیں، شام اور اسرائیل کی سرحد پر موجودہ ریاست شام کا آخری شہر ہے، اس کے آگے مغرب کی جانب چند میل کے فاصلہ پر طَبَریّہ نامی جھیل ہے جس میں سے دریائے اُرْدُن نکلتا ہے، اور اس کے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے درمیان ایک نشیبی راستہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ دو ہزار فیٹ تک گہرائی میں اُتر کر اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے دریائے اُردن طبریّہ میں سے نکلتا ہے۔ اسی پہاڑی راستے کو عَقَبۂ اَفِیق (اَفِیق کی گھاٹی) کہتے ہیں۔

اختصار کے ساتھ آئی ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری جلد ۶ ص ۴۵۰ میں اسے صحیح قرار دیا ہے)۔

اللہ ان کو فنا کر دے گا اور مسلمان غالب ہوں گے اور صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے اور جزیہ ساقط کر دیں گے۔"

یہ جملہ ۲۱ روایات ہیں جو ۱۴ صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے لیکن طولِ کلام سے بچنے کے لیے ہم نے ان سب کو نقل نہیں کیا ہے بلکہ صرف وہ روایتیں لے لی ہیں جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں۔

مثیلِ مسیحؑ کا تصوّر باطل ہے

جو شخص بھی ان احادیث کو پڑھے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی "مسیحِ موعود" یا "مثیلِ مسیح" یا "بروزِ مسیح" کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ ان میں اس امر کی گنجائش ہے کہ کوئی شخص اِس زمانے میں کسی ماں کے پیٹ اور کسی باپ کے نطفے سے پیدا ہو کر یہ دعویٰ کر دے کہ مَیں ہی وہ مسیحؑ ہوں جس کے آنے کی سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں ان عیسیٰ علیہ السّلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں جو اَب سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ۲۴۳

دجّال اور اُس کا ظہور

ظہورِ دجّال کے زمانہ کا عدمِ تعیّن

دجّال کے متعلق جتنی احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہیں، ان کے مضمون پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ حضوؐر کو اللہ کی طرف سے اِس معاملہ میں جو علم مِلا تھا وہ صرف اِس حد تک تھا کہ ایک بڑا دجّال ظاہر ہونے والا ہے، اس کی یہ اور یہ صفات ہوں گی، اور وہ اِن اِن خصوصیات کا حامل ہو گا۔ لیکن یہ آپ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہو گا، کہاں ظاہر ہو گا، اور یہ کہ آیا وہ آپ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپ کے بعد کسی بعید زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے۔

حضوؐر کے مختلف قیاسات

اِن اُمور کے متعلق جو مختلف باتیں حضوؐر سے احادیث میں منقول ہیں ان کا اختلافِ مضمون خود بھی یہ ظاہر کرتا ہے اور حضوؐر کے طرزِ کلام سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ آپؐ نے بربنائے وحی نہیں بلکہ بربنائے ظن و قیاس ارشاد فرمائی ہیں۔ کبھی آپؐ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ دجّال خراسان سے اُٹھے گا، کبھی یہ کہ اصفہان سے اور کبھی یہ کہ شام و عراق کے درمیانی علاقہ سے۔ پھر کبھی آپؐ نے ابنِ صیّاد نامی اُس یہودی بچّے پر جو مدینہ میں (غالباً ۲ یا ۳ ھ میں) پیدا ہوا تھا یہ

شُبہ کیا کہ شاید یہی دجّال ہو اور آخری روایت یہ ہے کہ ۹ھ میں جب فلسطین کے ایک عیسائی راہب (تمیم داری) نے آکر اسلام قبول کیا اور آپؐ کو یہ قصّہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ سمندر میں (غالباً بحیرۂ رُوم یا بحیرۂ عرب) میں سفر کرتے ہوئے ایک غیر آباد جزیرے میں پہنچے اور اُن کی ملاقات ایک عجیب شخص سے ہوئی اور اس نے انہیں بتایا کہ وہ خود ہی دجّال ہے، تو آپؐ نے ان کے بیان کو بھی غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نہ سمجھی، البتّہ اس پر اپنے شک کا اظہار فرمایا کہ اِس بیان کی رُو سے دجّال بحرِ رُوم یا بحرِ عرب میں ہے مگر میں خیال کرتا ہُوں کہ وہ مشرق سے ظاہر ہوگا۔

حضورؐ کے ارشادات کے دو اجزاء

ان مختلف روایات پر جو شخص بھی مجموعی نظر ڈالے گا وہ اگر علمِ حدیث اور اُصُولِ دین سے کچھ بھی واقف ہو تو اُسے یہ سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ اس معاملہ میں حضورؐ کے ارشادات دو اجزاء پر مشتمل ہیں:۔

جزوِ اوّل یہ کہ دجّال آئے گا، اِن صفات کا حامل ہوگا اور یہ فتنے برپا کرے گا۔ یہ بالکل یقینی خبریں ہیں جو آپؐ نے اللہ کی طرف سے دی ہیں۔ ان میں کوئی روایت دوسری روایت سے مختلف نہیں ہے۔

جزوِ دوم کی جُداگانہ حیثیّت

جزوِ دوم یہ کہ دجّال کب اور کہاں ظاہر ہوگا اور وہ کون شخص ہے۔ اِس میں نہ صرف یہ کہ روایات مختلف ہیں بلکہ اکثر روایات میں شک اور شُبہ اور گمان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی مروی ہیں۔ مثلاً ابنِ صیّاد کے متعلق آپؐ کا حضرت عمرؓ سے یہ فرمانا کہ "اگر دجّال یہی ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو۔ اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو تمہیں ایک مُعاہد کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔ یا مثلاً ایک حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد کہ "اگر وہ میری زندگی میں آ گیا تو میں حُجّت سے اس کا مقابلہ کروں گا ورنہ میرے بعد میرا رب تو ہر مومن کا حامی و ناصر ہے ہی"۔

اس دوسرے جُز کی دینی اور اصولی حیثیت ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی جو پہلے جُز کی ہے۔ جو شخص اس کی بھی تمام تفصیلات کو اسلامی عقائد میں شُمار کرتا ہے وہ غلطی کرتا ہے۔ بلکہ اس کے ہر حصّے کی صحت کا دعویٰ کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ابنِ صیّاد پر آپؐ کو شبہ ہوا تھا کہ شاید وہی دجّال ہو۔ اور حضرت عمرؓ نے تو قسم بھی کھائی تھی کہ یہی دجّال ہے، مگر بعد میں وہ مُسلمان ہوا، حرمین میں رہا، حالتِ اسلام میں مرا اور اس کی نمازِ جنازہ مسلمانوں نے پڑھی۔ اب اس کی کیا گنجائش باقی رہ گئی کہ آج تک ابنِ صیّاد پر دجّال ہونے کا شبہ کیا جاتا رہے؟ تمیمؓ داری کے بیان کو اُس وقت تقریباً صحیح سمجھا گیا تھا، مگر کیا ساڑھے تیرہ سو برس تک بھی اس شخص کا ظاہر نہ ہونا جسے حضرت تمیمؓ نے جزیرے میں محبوس دیکھا تھا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اُس نے اپنے دجّال ہونے کی جو خبر حضرت تمیمؓ کو دی تھی وہ صحیح نہ تھی؟ حضورؐ کو اپنے زمانہ میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجّال آپؐ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے یا آپؐ کے بعد کسی قریبی زمانہ میں ظاہر ہو، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں اور ابھی تک دجّال

نہیں آیا ہے؟ اب اِن چیزوں کو اس طرح نقل و روایت کیے جانا کہ گویا یہ بھی اسلامی عقائد ہیں، نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی ہے اور نہ اسے حدیث ہی کا صحیح فہم کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ مَیں عرض کر چکا ہُوں، اس قسم کے معاملات میں اگر کوئی بات نبی کے قیاس یا گُمان یا اندیشے کے مطابق ظاہر نہ ہو تو یہ اس کے منصبِ نبوّت میں ہرگز قادح نہیں ہے۔ نہ اِس سے عصمتِ انبیاء کے عقیدے پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ ایسی چیزوں پر ایمان لانے کے لیے شریعت نے ہم کو مُکلّف کیا ہے۔

اس اُصولی حقیقت کو تابیرِ نخل والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم خود واضح فرما چکے ہیں۔ ۲۴۴

حضورؐ کی اپنی تصریحات سے رہنمائی

یہ امر کہ حضورؐ کی کون سی بات ظن یا ذاتی رائے پر مبنی ہے اور کون سی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم پر، اس کا اظہار بسا اوقات حضورؐ کی اپنی تصریحات سے ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات دوسرے قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً یہی احادیث جو دجّال کے متعلق وارد ہوئی ہیں، ان میں یہ بات حضورؐ کی اپنی ہی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے کہ آپ کو اس کے مقام، زمانے اور شخصیّت کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم نہیں دیا گیا تھا۔ ابنِ صیّاد کے متعلق آپؐ کو اتنا قوی شُبہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے آپؐ کی موجودگی میں قسم کھا کر اسے دجّال قرار دیا اور آپؐ نے اس کی تردید نہ کی، مگر جب انہوں نے اس کے قتل کی اجازت مانگی تو آپؐ نے فرمایا: ان یکنہ فلن تسلط علیہ وان لم یکنہ فلا خیر لك فی قتلہ۔ "اگر یہ وہی ہے تو تم اس پر قابو نہ پا سکو گے اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو اس کے قتل میں تمہارے لیے کوئی بھلائی نہیں۔" (مُسلم۔ ذکرِ ابنِ صیّاد)۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ نے دجّال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اِن یخرج وانا فیکم فانا حجیجہ دونکم وان یخرج ولستُ فیکم فامرؤٌ حجیج نفسہ واللہ خلیفتی علیٰ کل مسلم۔ "اگر وہ میری موجودگی میں نکلے تو تمہاری طرف سے مَیں اس کا مقابلہ کروں گا، اور اگر وہ ایسے زمانے میں نکلے جب میں تمہارے درمیان موجود نہ ہوں تو ہر آدمی اپنی طرف سے خود ہی اس کا مقابلہ کرے اور اللہ میرے پیچھے ہر مُسلم کا نگہبان ہے۔" (مُسلم، ذکر الدجال)۔ تمیم داریؓ نے اپنے ایک بحری سفر میں دجّال سے اپنی ملاقات کا قصہ جب آپؐ کو سُنایا تو اس کی بھی آپؐ نے تصدیق یا تکذیب نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ اعجبنی حدیث تمیم انہ وافق الذی کنت احدثکم عنہ، "مجھے تمیمؓ کا بیان پسند آیا، وہ موافقت رکھتا ہے اس بات سے جو مَیں دجّال کے متعلق تم سے بیان کرتا تھا۔" پھر آپؐ نے اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمایا الا انہ فی بحر الشام او بحر الیمن، لا بل من قبل المشرق، "مگر وہ بحرِ شام یا بحرِ یمن میں ہے نہیں بلکہ مشرق کی جانب ہے۔" (مُسلم، قصۃ الجساسہ)۔ یہ سب روایات اپنا مفہوم خود واضح کر رہی ہیں۔ ۲۴۵

حضرت عمّار بن یاسرؓ کے قتل کی پیش گوئی

حضرت عمّارؓ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد صحابہؓ میں مشہور و معروف تھا، اور بہت سے صحابیوںؓ نے اس کو حضورؐ کی زبانِ مبارک سے سُنا تھا کہ تقتلك الفئۃ الباغیۃ "تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا" (مُسند احمد، بخاری،

مُسلم، تِرمذی، نسائی، طبرانی، بیہقی، مُسند ابُو داؤد طیالسی وغیرہ کتبِ حدیث میں حضرات ابوسعید خدری، ابوقتادہ انصاری، اُمِّ سلمہ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابوہریرہ، عثمان بن عفان، حُذیفہ، ابُوایوب انصاری، ابُورافع، خُزیمہ بن ثابت، عمرو بن العاص، ابوالیسر، عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہم اور متعدد دوسرے صحابہؓ سے اِس مضمون کی روایات منقول ہوئی ہیں۔ ابنِ سعد نے طبقات میں بھی یہ حدیث کئی سندوں سے نقل کی ہے۔

ابنِ عبد البرّ الاستیعاب میں لکھتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے بتواترِ آثار یہ بات منقول ہے کہ عمّارؓ بن یاسر کو باغی گروہ قتل کرے گا اور یہ صحیح ترین احادیث میں سے ہے۔"[۲۴۶]

قُربِ قیامت کی دس نشانیاں

مُسلم میں حُذیفہ بن اَسید الغِفاری کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ دُھواں۔ دجّال۔ دابّۃ الارض۔ مغرب سے سُورج کا طُلوع۔ عیسٰی بن مریم کا نُزول۔ یاجُوج ماجُوج کی یورش اور تین بڑے خسوف (زمین کا دھنسنا یا Land Slide)، ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں۔ پھر سب سے آخر میں یمن سے ایک سخت آگ اُٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی (یعنی بس اس کے بعد قیامت آجائے گی)۔ ایک اور حدیث میں یاجُوج و ماجُوج کی یورش کا ذکر کر کے حضُورؐ نے فرمایا اُس وقت قیامت اِس قدر قریب ہوگی جیسے پُورے پیٹوں کی حاملہ، کہ نہیں کہہ سکتے کب وہ بچہ جَن دے، رات کو یا دن کو، کالحامل المتم لا یدری اھلھا متی تفجؤھم بولدھا لیلاً او نھاراً۔[۲۴۷]

باب ۱۲

قرآن اور حضورؐ کے متعلق

مستشرقین کی علمی خیانتیں

[اسلام، قرآن اور سیرتِ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مستشرقین نے جو کام کیا ہے اُس میں بے شمار فضولیات اور نامعقول باتیں سامنے آتی ہیں جنہیں تحقیق کے خوبصورت نام سے علمی حقائق کی حیثیت دے کر پھیلایا گیا ہے۔ ان نام نہاد حقائق کے دائرے میں —— ولیم میور جیسے متعصب مصنفین سے لے کر منٹگمری واٹ جیسے معتدل مزاج اہلِ قلم تک —— ایسی ایسی مضحکہ انگیز باتیں اسلام اور نبیٔ اکرم کے متعلق پائی جاتی ہیں کہ جن سے آگاہ ہو جانے والے منصف مزاج قارئین کی نگاہ میں مستشرقین کے سارے علمی کارناموں کی وقعت ختم ہو جاتی ہے۔ ان شاندار علمی تحقیقی کارناموں کا ایک مقصد تو حروبِ صلیبیہ کی پیدا کردہ ذہنیت کے تحت عیسائیوں کے جہانِ افکار کو اسلام کی یلغار سے محفوظ کرنے کے لیے تعصبات کی دیواریں اٹھانا ہے۔ ان کا دوسرا مقصد اسلام ناآشنا مسلمانوں کو اسلام کے متعلق مغالطوں اور شبہات میں ڈالنا بھی ہے۔ بایں ہمہ مستشرقین ہمارے جدید طبقوں کے لیے ایک صدی سے معلمینِ اسلام اور اساتذۂ سیرت بنے ہوئے ہیں، اور اسلام ناآشنا مسلمان ان کی تحریروں کو پڑھ کر ایسے ایسے شکوک میں مبتلا ہوتے ہیں اور ایسے ایسے اعتراضات اپنے ہی دین کے خلاف خود اٹھاتے ہیں کہ سر تا سر حقیقت کے لیے حیرت و عبرت کا مقام پیدا ہو جاتا ہے۔

اِس کتاب میں مشمولہ مواد کے فاضل مؤلف نے بحیثیتِ متکلمِ اسلام، علمی دائرے میں اسلامی علوم و معارف کی تجدید کا جو وسیع کام کیا ہے، اس میں جابجا مستشرقین کی نکتہ آفرینیوں سے تعرّض کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ حقائق کو مسخ کرنے والے ان محققین کا طلسم توڑے بغیر مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو اسلام کی حقیقت کے سرچشمے تک پہنچانا ممکن نہیں۔

چنانچہ سیرتِ نبیٔ اکرم کے سلسلے میں اپنی جن تحریروں میں فاضل مؤلف نے مستشرقین کی مغالطہ انگیزیوں سے تعرّض کیا ہے ان میں سے جن تک ہماری نگاہ پہنچ سکی ہے، ان کے ضروری اقتباسات اس باب میں پیش کیے گئے ہیں۔ اِس باب کے مواد کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین یہ ملحوظ رکھیں کہ مستشرقین نے اسلام اور نبیٔ اسلام کو سمجھنے

میں جو غلطیاں کی ہیں اور طرح طرح کے جو مغالطے پیدا کیے ہیں، ان سب کا اِستقصا جناب مؤلّف نے نہیں کیا، کیونکہ خود مستشرقین کے پُورے کام کو موضوع بنا کر کسی مستقل کتاب یا مقالے کی تدوین نہیں کی گئی۔ صرف ضروری نکات پر حسبِ موقع بحث اٹھائی گئی ہے۔ سیرتِ پاکؐ سے متعلق مستشرقین کے دُوسرے بے شمار اعتراضات کے جوابات مختلف ابواب میں شامل ہیں، اگرچہ معترضین کے مقولے درج نہیں کیے گئے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس باب کے مواد کے بارے میں یہ مسئلہ ہمارے لیے اُلجھن کا باعث بنا کہ اسے کتاب کے کس حصّے میں کس مقام پر رکھا جائے۔ غور و بحث کے بعد ہم نے اسے بھی بنیادی مباحث میں جگہ دی ہے، کیونکہ جہاں اس حصے کے دوسرے مضامین کو یہ اہمیّت ہے کہ سیرتِ پاکؐ کو سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے، وہاں مستشرقین کے باب کا مطالعہ بعض ایسی رکاوٹوں کو دُور کرتا ہے جو سیرتِ نبویؐ کے فہم میں حائل ہوتی ہیں۔

اِس باب کی فصلِ اوّل بڑی مختصر ہے، مگر انتہائی جامع بھی۔ ایک چند سطری عبارت کو ہم نے مستقل فصل اس لیے قرار دیا ہے کہ فاضل مؤلّف کا یہ نقطۂ نظر نمایاں ہو کر سامنے آجائے۔ (مُرتّبین) ——]

فصل ۱

مُستشرِقین کا نامعقُول طریقِ کار

یہ بدطینت لوگ علم کے نام سے جو تحقیقات کرتے ہیں، اُس میں پہلے اپنی جگہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کو بہرحال منزل من اللہ تو نہیں ماننا ہے، اب کہیں نہ کہیں سے اِس امر کا ثبوت بہم پہنچانا ضروری ہے کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں پیش کیا ہے، یہ فلاں فلاں مقامات سے چُرائے ہُوئے مضامین اور معلومات ہیں۔ اِس طرزِ تحقیق میں یہ لوگ اِس قدر بے شرمی کے ساتھ کھینچ تان کر زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ بے اختیار گھِن آنے لگتی ہے، اور آدمی کو مجبُوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر اِسی کا نام علمی تحقیق ہے تو لعنت ہے اِس علم پر اور اِس تحقیق پر!

فصل ۲

بَحیرا راہب کا افسانہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۔ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ، اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

(الفرقان، آیت ۴، ۵، ۶)

"جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اُتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پُرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اِسے صبح و شام سُنائی جاتی ہیں۔ اے محمدؐ، ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اُس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔"

یہ وہی اعتراض ہے جو اِس زمانے کے مستشرقینِ مغرب قرآن مجید کے خلاف پیش کرتے ہیں۔

حضورؐ کی قوم نے اعتراض کیوں نہ اُٹھایا؟

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہم عصر دشمنوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تم بچپن میں بحیرا راہب سے جب ملے تھے اس وقت یہ سارے مضامین تم نے سیکھ لیے تھے۔ اور نہ یہ کہا کہ جوانی میں جب تجارتی سفروں کے سلسلے میں تم باہر جایا کرتے تھے اس زمانے میں تم نے عیسائی راہبوں اور یہودی ربیوں سے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔ اِس لیے کہ ان سارے سفروں کا حال اُن کو معلوم تھا۔ یہ سفر اکیلے نہیں ہوتے تھے، اُن کے اپنے قافلوں کے ساتھ ہوئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان میں کسی سے کچھ سیکھ آنے کا الزام ہم لگائیں گے تو ہمارے اپنے ہی شہر میں سینکڑوں زبانیں ہم کو جھٹلا دیں گی۔ اس کے علاوہ مکّے کا ہر عام آدمی پوچھے گا کہ اگر یہ معلومات اس شخص کو بارہ تیرا برس کی عمر ہی میں بحیرا سے حاصل ہو گئی تھیں، تو آخر یہ شخص کہیں باہر تو نہیں رہتا

تھا، ہمارے ہی درمیان رہتا بستا تھا، کیا وجہ ہے کہ چالیس برس کی عمر تک اس کا یہ سارا علم چھپا رہا اور کبھی ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ایسا نہ نکلا جو اس علم کی غمازی کرتا؟ یہی وجہ ہے کہ کُفّارِ مکّہ نے اتنا سفید جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کی اور اسے بعد کے زیادہ بے حیا لوگوں کے لیے چھوڑ دیا۔

کُفّارِ مکّہ کا اعتراض کیا تھا؟

وہ جو بات کہتے تھے وہ نبوّت سے پہلے کے متعلق نہیں بلکہ دعوائے نبوّت کے زمانے کے متعلق تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص اَن پڑھ ہے، خود مطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل کر نہیں سکتا۔ پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا، چالیس برس کی عمر تک ان میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا جو باتیں آج اُسکی زبان سے نکل رہی ہیں، اب آخر یہ معلومات آ کہاں سے رہی ہیں؟ ان کا سرچشمہ لامحالہ کچھ اگلے لوگوں کی کتابیں ہیں جن کے اقتباسات راتوں کو چپکے چپکے ترجمہ اور نقل کرائے جاتے ہیں، اُنہیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سُنتا ہے اور پھر اُنہیں یاد کر کے ہمیں دن کو سُنا دیتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہلِ کتاب تھے، پڑھے لکھے تھے اور مکّہ میں رہتے تھے۔ یعنی عَدّاس (حُوَیطِب بن عبدالعُزّیٰ کا آزاد کردہ غلام)، یَسار (علاء بن الحَضرَمی کا آزاد کردہ غلام) اور جَبر (عامر بن ربیعہ کا آزاد کردہ غلام)۔

بظاہر بڑا وزنی اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ وحی کے دعوے کو رد کر دینے کے لیے نبی کے مآخذِ علم کی نشاندہی کر دینے سے بڑھ کر اور کونسا اعتراض وزنی ہو سکتا ہے۔ مگر آدمی پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ جواب میں سرے سے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی۔ بلکہ صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو، صریح بے انصافی کی بات کہہ رہے ہو، سخت جھوٹ کا طوفان اُٹھا رہے ہو، یہ تو اُس خدا کا کلام ہے جو آسمان و زمین کے بھید جانتا ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ سخت مخالفت کے ماحول میں ایسا زوردار اعتراض پیش کیا جائے، اور اس کو یُوں حقارت سے رد کر دیا جائے؟ کیا واقعی یہ ایسا ہی پوچ اور بے وزن اعتراض تھا کہ اس کے جواب میں بس "جھوٹ اور ظلم" کہہ دینا کافی تھا؟ آخر وجہ کیا ہے کہ اس مختصر سے جواب کے بعد نہ عوام نے کسی تفصیلی اور واضح جواب کا مطالبہ کیا اور نہ نئے نئے ایمان لانے والوں کے دلوں میں کوئی شک پیدا ہوا اور نہ مخالفین ہی میں سے کسی کو یہ کہنے کی ہمت ہوئی کہ دیکھو، ہمارے اِس وزنی اعتراض کا جواب بن نہیں پڑ رہا ہے اور محض جھوٹ اور ظلم کہہ کر بات ٹالی جا رہی ہے؟

اِس گُتھی کا حل ہمیں اُسی ماحول سے مل جاتا ہے جس میں مخالفینِ اسلام نے یہ اعتراض کیا تھا۔ (اِس حل کو پا لینے کے لیے مؤلّف نے ذیل کی تنقیحات قائم کی ہیں[1]) :-

---

[1] اضافہ مُرتّبین۔

پہلی تنقیح

وہ ظالم سردار جو ایک ایک مسلمان کو مارتے کوٹتے اور تنگ کرتے پھر رہے تھے، ان کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن جن لوگوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ پرانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے محمدؐ کو یاد کرایا کرتے ہیں، ان کے گھروں پہ اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر چھاپے مارتے اور وہ سارا ذخیرہ برآمد کر کے پبلک کے سامنے لا رکھتے جو ان کے زعم میں اس کام کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ وہ عین اُس وقت چھاپا مار سکتے تھے جب کہ یہ کام کیا جا رہا ہو اور ایک مجمع کو دکھا سکتے تھے کہ لو دیکھو، یہ نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بلالؓ کو تپتی ریت پر گھسیٹنے والوں کے لیے ایسا کرنے میں کوئی آئین و ضابطہ مانع نہ تھا۔ اور ایسا کر کے وہ ہمیشہ کے لیے نبوت محمدیؐ کے "خطرے" کو مٹا سکتے تھے۔ مگر وہ بس زبانی اعتراض ہی کرتے رہے اور ایک دن بھی یہ فیصلہ کن قدم اٹھا کر انہوں نے نہ دکھایا۔

دوسری تنقیح

جن لوگوں کے نام وہ اِس سلسلے میں لیتے تھے وہ کہیں باہر کے نہ تھے۔ اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ اُن کی قابلیتیں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ ہر شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا تھا، یہ دیکھ سکتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ کس پائے کی ہے، کس شان کی زبان ہے، کس مرتبے کا ادب ہے، کیا زورِ کلام ہے، کیسے بلند خیالات اور مضامین ہیں اور وہ کس درجے کے لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محمدؐ اُن سے یہ سب کچھ حاصل کر کر کے لا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی نے بھی اِس اعتراض کو کوئی وزن نہ دیا۔ ہر شخص سمجھتا تھا کہ اِن باتوں سے بس دل کے جلے پھپھولے پھوڑے جا رہے ہیں ورنہ اس قول میں کسی شبہ کے قابل بھی جان نہیں ہے۔ جو لوگ ان اشخاص سے واقف نہ تھے وہ بھی آخر اتنی ذرا سی بات تو سوچ سکتے تھے کہ اگر یہ لوگ ایسی ہی قابلیت رکھتے تھے تو آخر انہوں نے خود اپنا چراغ کیوں نہ جلایا؟ ایک دوسرے شخص کے چراغ کو تیل مہیا کرنے کی انہیں ضرورت کیا پڑی تھی؟ اور وہ بھی چپکے چپکے کہ اس کام کی شہرت کا ذرا سا حصہ بھی ان کو نہ ملے۔

تیسری تنقیح

وہ سب اشخاص، جن کا نام اس سلسلے میں لیا جا رہا تھا، بیرونی ممالک سے آئے ہوئے غلام تھے، جن کو اُن کے مالکوں نے آزاد کر دیا تھا۔ عرب کی قبائلی زندگی میں کوئی شخص بھی کسی طاقتور قبیلے کی حمایت کے بغیر نہ جی سکتا تھا۔ آزاد ہو جانے پر بھی غلام اپنے سابق مالکوں کے وِلاء (یعنی سرپرستی) میں رہتے تھے اور ان کی حمایت ہی معاشرے میں اُن کے لیے زندگی کا سہارا ہوتی تھی۔ اب یہ ظاہر بات تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی بدولت معاذ اللہ ایک جھوٹی نبوت کی دکان چلا رہے تھے تو یہ لوگ کسی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ تو اس سازش میں آپؐ کے شریک نہ ہو سکتے تھے۔ آخر کار ایسے شخص کے وہ مخلص رفیقِ کار اور سچے عقیدت مند کیسے ہو سکتے تھے جو رات کو انہی سے کچھ باتیں

سیکھتا ہو اور دن کو دنیا بھر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتا ہو کہ یہ خدا کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے؟ اس لیے ان کی شرکت کسی لالچ اور کسی غرض ہی کی بنا پر ہو سکتی تھی۔ مگر کون صاحبِ عقل و ہوش آدمی یہ باور کر سکتا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے سرپرستوں کو ناراض کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سازش میں شریک ہو گئے ہوں گے؟ آخر کیا لالچ ہو سکتا تھا جس کی بنا پر وہ ساری قوم کے مغضوب اور مطعون اور ساری قوم کی دشمنی کے ہدف آدمی کے ساتھ مل جاتے اور اپنے سرپرستوں سے کٹ جانے کے نقصان کو ایسے مصیبت زدہ آدمی سے حاصل ہونے والے کسی فائدے کی امید پر گوارا کر لیتے؟ پھر یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ ان کے سرپرستوں کو یہ موقع تو آخر حاصل ہی تھا کہ مار کوٹ کر ان سے سازش کا اقبال کرا لیں۔ اس موقع سے انہوں نے کیوں نہ فائدہ اٹھایا اور کیوں نہ ساری قوم کے سامنے خود انہی سے یہ اعتراف کروا لیا کہ ہم سے سیکھ سیکھ کر یہ نبوت کی دکان چمکائی جا رہی ہے؟

چوتھی تنقیح

سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور اس ضرب المثل عقیدت میں شامل ہوئے جو صحابہ کرامؓ آنحضورؐ کی ذاتِ اقدس سے رکھتے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بناوٹی اور سازشی نبوت پر خود وہی لوگ ایمان لائیں اور گہری عقیدت کے ساتھ ایمان لائیں جنہوں نے اس کے بنانے کی سازش میں خود حصہ لیا ہو؟ اور بالفرض اگر یہ ممکن بھی تھا تو ان لوگوں کو اہلِ ایمان کی جماعت میں کوئی نمایاں مرتبہ تو ملا ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نبوت کا کاروبار تو چلے عداس اور یسار اور جبر کے بل بوتے پر اور نبی کے دستِ راست بنیں ابوبکرؓ اور عمرؓ اور ابوعبیدہؓ؟

اسی طرح یہ بات بھی بڑی تعجب انگیز تھی کہ اگر چند آدمیوں کی مدد سے راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر نبوت کے اس کاروبار کا مواد تیار کیا جا رہا تھا تو وہ زیدؓ بن حارثہ، علیؓ بن ابی طالب، ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے لوگوں سے کس طرح چھپ سکتا تھا جو شب و روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے تھے؟

اس الزام میں برائے نام بھی کوئی شائبۂ صداقت ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ یہ لوگ اس قدر خلوص کے ساتھ حضورؐ پر ایمان لاتے اور آپؐ کی حمایت میں ہر طرح کے خطرات اور نقصانات برداشت کرتے؟

یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر ہر سننے والے کی نگاہ میں یہ اعتراض آپ ہی بے وزن تھا۔ اس لیے قرآن میں اس کو کسی وزنی اعتراض کی حیثیت سے، جواب دینے کی خاطر نقل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بتانے کی خاطر اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ دیکھو، حق کی دشمنی میں یہ لوگ کیسے اندھے ہو گئے ہیں اور کس قدر صریح جھوٹ اور بے انصافی پر اتر آئے ہیں۔ ۲۴۸ے

فصل ۳

قرآن کے تین قصص کی بحث

مُستشرقین نے قرآن کے تین قصص کو بھی اپنی تحقیق کے خراد پر چڑھایا ہے، اور ان کے متعلق بھی یہ الزام لگایا ہے کہ نبی اکرمؐ نے یہ قصص دوسرے ماٰخذ سے مستعار لے کر اپنی طرف سے پیش کر دیئے۔ مُستشرقین کے الزام و اعتراض کو بیان کرنے سے پہلے لازم ہے کہ خود ان قصص کو سامنے رکھا جائے۔ ورنہ آنے والی بحث کو سمجھنے میں دقت پیش آئے گی۔ (مُرتّبین)

(۱) حضرت مُوسیٰؑ کا سفرِ مجمع البحرین

وَاِذْ قَالَ مُوسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا۔ (الکہف: آیت ۶۰)

"ذرا اِن کو وہ قصہ سناؤ جو مُوسیٰؑ کو پیش آیا تھا جبکہ مُوسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ مَیں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔"

اس مرحلے پر یہ قصہ سُنانے سے مقصود کفّار اور مومنین دونوں کو ایک اہم حقیقت پر مُتنبّہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہر بین نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتے دیکھتی ہے اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے، کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحتیں نہیں ہوتیں جنہیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ ظالموں کا پھلنا پھُولنا اور بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا، نافرمانوں پر انعامات کی بارش اور فرمانبرداروں پر مصائب کا ہجوم، بدکاروں کا عیش اور نیکوکاروں کی بدحالی، یہ وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور محض اس لیے کہ لوگ ان کی کُنہ کو نہیں سمجھتے، ان سے عام طور پر ذہنوں میں اُلجھنیں، بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہو جاتی ہیں۔ کافر اور ظالم ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیا اندھیر نگری ہے، کوئی اس کا راجہ نہیں، اور ہے تو چوپٹ ہے۔ یہاں جس کا جو جی چاہے کرتا رہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات سخت

نقشہ بسلسلہ قصہ خضر و موسیٰ علیہما السلام

بحرِ ابیض متوسط

فلسطین

مصر

شمال

مغرب

مشرق

جنوب

دریائے نیل

مکہ

جدہ

دریائے عطبرہ

موجودہ شہر خرطوم

البحر الازرق

البحر الابیض

حبشہ

آزمائشوں کے مواقع پر ان کے ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانۂ مشیت کا پردہ اٹھا کر ذرا اس کی ایک جھلک دکھائی تھی تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے کیسے اور کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے اور کس طرح واقعات کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

قصّہ کی تفصیلات

حضرت موسیٰ کو یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟ اس کی کوئی تصریح قرآن نے نہیں کی ہے۔ حدیث میں عَوفی کی ایک روایت ہمیں ضرور ملتی ہے جس میں وہ ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا تھا جب فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰؑ نے مصر میں اپنی قوم کو آباد کیا تھا لیکن ابن عباسؓ سے جو قوی تر روایات بخاری اور دوسری کُتبِ حدیث میں منقول ہیں وہ سب اس بیان کی تائید نہیں کرتیں اور نہ کسی دوسرے ذریعے سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰؑ کبھی مصر میں رہے تھے۔ بلکہ قرآن اس کی تصریح کرتا ہے کہ مصر سے خروج کے بعد ان کا سارا زمانہ سینا اور تیہ میں گزرا۔ اِس لیے یہ روایت تو قابلِ قبول نہیں ہے۔ البتہ ہم خود اس قصّے کی تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مشاہدات حضرت موسیٰؑ کو ان کی نبوّت کے ابتدائی دور میں کرائے گئے ہوں گے، کیونکہ آغازِ نبوّت ہی میں انبیاء علیہم السلام کو اس طرح کی تعلیم و تربیت درکار ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو ان مشاہدات کی ضرورت اس زمانے میں پیش آئی ہو گی جبکہ مصر میں بنی اسرائیل کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آ رہا تھا جن سے مسلمان مکّہ معظمہ میں دوچار تھے۔ اِن دو وجوہ سے ہمارا قیاس یہ ہے (والعلم عنداللہ) کہ اِس واقعہ کا تعلق اس دور سے ہے جبکہ مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور سردارانِ قریش کی طرح فرعون اور اس کے درباری بھی عذاب میں تاخیر دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ اوپر کوئی نہیں ہے جو اس سے باز پُرس کرنے والا ہو، اور مکّے کے مظلوم مسلمانوں کی طرح مصر کے مظلوم مسلمان بھی بے چین ہو ہو کر پُوچھ رہے تھے کہ خدایا اِن ظالموں پر انعامات کی اور ہم پر مصائب کی یہ بارش کب تک؟ حتیٰ کہ خود حضرت موسیٰؑ بھی پکار اُٹھے تھے کہ رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ۔ "اَے پروردگار، تُو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دُنیا کی زندگی میں بڑی شان و شوکت اور مال و دولت دے رکھی ہے، اَے پروردگار، کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ دُنیا کو تیرے راستے سے بھٹکا دیں؟"

اگر ہمارا یہ قیاس درست ہو تو پھر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ غالباً حضرت موسیٰؑ کا یہ سفر سوڈان کی جانب تھا اور مجمع البحرین سے مراد وہ مقام ہے جہاں موجودہ شہر خرطوم کے قریب دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحرالابیض اور البحرالازرق آ کر ملتی ہیں۔

تلمود کا بیان

بائیبل اس واقعے کے باب میں بالکل خاموش ہے۔ البتہ تلمود میں اس کا ذکر موجود ہے، مگر وہ اسے حضرت

مُوسیٰؑ کے بجائے رَبّی یُہو حانان بن لاوِی کی طرف منسُوب کرتی ہے اور اس کا بیان ہے کہ ربّی مذکور کو یہ واقعہ حضرت الیاسؑ کے ساتھ پیش آیا تھا جو دنیا سے زندہ اُٹھائے جانے کے بعد فرشتوں میں شامل کر لیے گئے ہیں اور دُنیا کے انتظام پر مامور ہیں۔

(The Talmud Selections, By H. Polano. PP. 313 - 16)

ممکن ہے کہ خرُوج سے پہلے کے بہت سے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کے ہاں اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رہا ہو اور صدیوں بعد انہوں نے قصّے کی کڑیاں کہیں سے کہیں لے جا کر جوڑ دی ہوں تلمود کی اِسی روایت سے متأثر ہو کر مسلمانوں میں بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ قرآن میں اس مقام پر مُوسیٰ سے مراد حضرت مُوسیٰؑ نہیں بلکہ کوئی اور مُوسیٰ ہیں۔ لیکن نہ تو تلمود کی ہر روایت لازماً صحیح تاریخ قرار دی جا سکتی ہے، نہ ہمارے لیے یہ گمان کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ قرآن میں کسی اور مجہول الحال مُوسیٰ کا ذکر اس طریقہ سے کیا گیا ہو گا، اور پھر جبکہ معتبر احادیث میں حضرت اُبَیّ بن کعب کی یہ روایت موجود ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس قصّے کی تشریح فرماتے ہوئے مُوسیٰ سے مراد حضرت مُوسیٰؑ پیغمبر بنی اسرائیل کو بتایا ہے تو کسی مسلمان کے لیے تلمود کا بیان لائقِ التفات نہیں۔

مستشرقینِ مغرب نے اپنے معمول کے مطابق قرآن مجید کے اِس قصّے کے بھی ماٰخذ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور تین قصّوں پر اُنگلی رکھ دی ہے کہ یہ ہیں وہ مقامات جہاں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے نقل کر کے یہ قصّہ بنایا اور پھر دعویٰ کر دیا کہ یہ تو میرے اوپر بذریعہ وحی نازل ہُوا ہے۔ ایک داستانِ گلگامیش، دوسرے سکندر نامہ سُریانی اور تیسرے وہ یہُودی روایات جن کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے۔

مستشرقین پر جرح کے لیے چار سوال

ان کی اس متعصّبانہ افترا پردازی کا پردہ بالکل چاک ہو جائے اگر کوئی طالب علم ان سے صرف چار باتوں کا جواب طلب کرے:

(۱) اوّل یہ کہ آپ کے پاس وہ کیا دلیل ہے جس کی بنا پر آپ دو چار قدیم کتابوں میں قرآن کے کسی بیان سے ملتا جلتا مضمون پا کر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ قرآن کا بیان لازماً اُنہی کتابوں سے ماخوذ ہے؟

(۲) دوسرے یہ کہ مختلف زبانوں کی جتنی کتابوں کو آپ لوگوں نے قرآن مجید کے قصّوں اور دوسرے بیانات کی ماخذ قرار دیا ہے اگر اُن کی فہرست بنائی جائے تو اچھے خاصے ایک کتب خانے کی فہرست بن جائے۔ کیا ایسا کوئی کتب خانہ مکّے میں اُس وقت موجود تھا، اور کیا مختلف زبانوں کے مترجمین بیٹھے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے مواد فراہم کر رہے تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ کا سارا انحصار اُن دو تین سفروں پر ہے

جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے نبوّت سے کئی سال پہلے عرب سے باہر کیے تھے، تو سوال یہ ہے کہ آخر ان تجارتی سفروں میں آنحضرتؐ کتنے کتب خانے نقل یا حفظ کر لائے تھے؟ اور اعلانِ نبوّت سے ایک دن پہلے تک بھی آنحضرتؐ کی ایسی معلومات کا کوئی نشان آپ کی بات چیت میں نہ پائے جانے کی کیا معقول وجہ ہے؟

(۳) تیسرے یہ کہ کفار مکہ اور یہودی اور نصرانی، سب آپ ہی لوگوں کی طرح اس تلاش میں تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم یہ مضامین کہاں سے لاتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے معاصرین کو اس سرچشمے کا پتہ نہ چلنے کی کیا وجہ ہے؟ اُنہیں تو بار بار تحدّی کی جا رہی تھی کہ یہ قرآن مُنزّل من اللہ ہے، وحی کے سوا اس کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اگر تم اسے بشر کا کلام کہتے ہو تو ثابت کرو کہ بشر ایسا کلام کہہ سکتا ہے۔ اس چیلنج نے آنحضرتؐ کے معاصر دشمنانِ اسلام کی کمر توڑ کر رکھ دی، مگر وہ ایک مأخذ کی بھی نشان دہی نہ کر سکے جس سے قرآن کے ماخوذ ہونے کا کوئی معقول آدمی یقین تو درکنار، شک ہی کر سکتا ہو۔ سوال یہ ہے کہ معاصرین اس سُراغ رسانی میں ناکام کیوں ہوئے اور ہزار بارہ سو برس کے بعد آج مُعاندین کو اس میں کیسے کامیابی نصیب ہو رہی ہے؟

(۴) آخری اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس بات کا امکان تو بہرحال ہے نا کہ قرآن مُنزّل من اللہ ہو اور وہ پچھلی تاریخ کے اُنہی واقعات کی صحیح خبریں دے رہا ہو جو دوسرے لوگوں تک صدیوں کے دوران میں زبانی روایات سے مسخ ہوتی ہوئی پہنچی ہوں اور افسانوں میں جگہ پا گئی ہوں۔ اس امکان کو کس معقول دلیل کی بنا پر بالکل ہی خارج از بحث کر دیا گیا؟ اور کیوں صرف اسی ایک امکان کو بنائے بحث و تحقیق بنا لیا گیا کہ قرآن اُن قصوں ہی سے ماخوذ ہو جو لوگوں کے پاس زبانی روایات اور افسانوں کی شکل میں موجود تھے؟ کیا مذہبی تعصب اور عناد کے سوا اس ترجیح کی کوئی دوسری وجہ بیان کی جا سکتی ہے؟

اِن سوالات پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا کہ مستشرقین نے "علم" کے نام سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ درحقیقت کسی سنجیدہ طالبِ علم کے لیے قابلِ التفات نہیں ہے۔[۲۴۹]

(۲) فرعون کا ارادۂ قتلِ موسیٰؑ[۴۱]

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ۔ (المومن۔ آیت ۲۶)

"ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا چھوڑو مجھے مَیں اس موسٰیؑ کو قتل کیے دیتا ہوں اور یہ پکار دیکھے اپنے رب کو۔"

اِس آیت سے آیت ۵۰ تک جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ تاریخِ بنی اسرائیل کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے جسے خود بنی اسرائیل بالکل فراموش کر گئے ہیں۔ بائیبل اور تلمود دونوں اس کے ذکر سے خالی ہیں اور دوسری اسرائیلی روایات

میں بھی اس کا کوئی نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ صرف قرآن مجید ہی کے ذریعہ سے دنیا کو یہ معلوم ہُوا ہے کہ فرعون اور موسٰیؑ کی کشمکش کے دَور میں ایک وقت یہ واقعہ بھی پیش آیا تھا۔

دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے قصّے کی اہمیّت

اس قصّے کو جو شخص بھی پڑھے گا، بشرطیکہ وہ اسلام اور قرآن کے خلاف تعصب میں اندھا نہ ہو چکا ہو، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے گا کہ دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے یہ قصّہ بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور بجائے خود یہ بات بعید از عقل و قیاس بھی نہیں ہے کہ حضرت موسٰیؑ کی شخصیّت، ان کی تبلیغ اور ان کے ہاتھوں ظہور پذیر ہونے والے حیرت انگیز معجزات سے متاثر ہو کر خود فرعون کے اعیانِ سلطنت میں سے کوئی شخص دل ہی دل میں ایمان لے آیا ہو اور فرعون کو اُن کے قتل پر آمادہ دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا ہو۔ لیکن مغربی مستشرقین علم و تحقیق کے لمبے چوڑے دعووں کے باوجود تعصُّب میں اندھے ہو کر جس طرح قرآن کی روشن صداقتوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اُس کا اندازہ اِس بات سے ہو سکتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مضمون "موسٰیؑ" کا مصنّف اِس قصّے کے متعلق لکھتا ہے :۔

> "قرآن کی یہ کہانی کہ فرعون کے دربار میں ایک مومن موسٰیؑ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، پُوری طرح واضح نہیں ہے (سورہ ۴۰۔ آیت ۲۸)۔ کیا ہمیں اس کا تقابل اُس قصّے سے کرنا چاہیے جو ہگّادا میں بیان ہُوا ہے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ یتھرو نے فرعون کے دربار میں عفو سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا؟"

مدّعیانِ تحقیق کی شُبہ انگیزی

گویا اِن مدّعیانِ تحقیق کے ہاں یہ بات تو طے شُدہ ہے کہ قرآن کی ہر بات میں ضرور رکیڑے ہی ڈالنے ہیں۔ اب اگر اُس کے کسی بیان پر حرف زنی کی کوئی بنیاد نہیں ملتی تو کم از کم یہی شوشہ چھوڑ دیا جائے کہ یہ قصّہ پُوری طرح واضح نہیں ہے۔ اور چلتے چلتے یہ شک بھی پڑھنے والوں کے دل میں ڈال دیا جائے کہ ہگّادا میں یتھرو کا جو قصّہ حضرت موسٰیؑ کی پیدائش سے پہلے کا بیان ہوا ہے وہ کہیں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے سُن لیا ہوگا اور اسے لاکر یہاں اِس شکل میں بیان کر دیا ہوگا۔ یہ ہے "علمی تحقیق" کا وہ انداز جو اِن لوگوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے معاملے میں اختیار کر رکھا ہے۔ ۲۵۰

(۳) قصّۂ اَصحابِ کہف

غار میں مدّتِ قیام پر اعتراض

بعض مستشرقین نے اس قصّے کو قصّۂ اصحابِ کہف کا مترادف ماننے سے اِس بنا پر انکار کیا ہے کہ آگے قرآن اُن کے قیامِ غار کی مدّت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے۔ لیکن اس سُورہ کے حاشیہ ۲۵ میں ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ

آیت ۲۵ میں اصحابِ کہف کے غار میں قیام کی مدت ۳ سو اور ۳ سو نو سال کی جو بیان کی گئی ہے یہ ہمارے خیال میں دراصل لوگوں کے قول کی حکایت ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ بعد کے فقرے (آیت ۲۶) میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ تم کہو، اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت رہے۔ اگر ۳۰۹ کی تعداد اللہ نے خود بیان فرمائی ہوتی تو اس کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اسی دلیل کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی یہی تاویل اختیار فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے بلکہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے۔

گبن کی جسارت

سُریانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں جن کو بنیاد بنا کر گبن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر "جہالت" کا الزام لگایا ہے۔ حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر وہ اتنی بڑی جسارت کر رہا ہے اس کے متعلق وہ خود جانتا ہے کہ وہ اِس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے۔ اور اتنی مدت کے اندر زبانی روایات کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اِس طرح کی ایک روایت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس سے کسی جُز میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے، صرف اُن ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔

عیسائی نوشتوں سے شہادت

اِس قصے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے جو سُریانی زبان میں لکھے گئے تھے، یہ شخص اصحابِ کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ مرتب کیے تھے۔ ان مواعظ میں وہ اس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سُریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دَور کے مفسرین کو پہنچی جسے ابنِ جریر طبری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، اور دوسری طرف یورپ پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ گبن نے اپنی کتاب "تاریخ زوال و سقوطِ دولتِ رُوم" کے باب ۳۳ میں "سات سونے والوں" (Seven Sleepers) کے عنوان کے تحت ان مآخذ سے اس قصے کا جو خلاصہ دیا ہے وہ ہمارے مفسرین کی روایات سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں قصے قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحابِ کہف غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے، ہمارے مفسرین اس کا نام دَقیُنوس یا دقیانوس یا دِمیُوس بتاتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈیسیس (Decius) تھا جس نے ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک سلطنتِ روم پر فرمانروائی کی ہے اور مسیح علیہ السّلام کے

پیروؤں پر ظلم وستم کرنے کے معاملہ میں جس کا عہد بہت بدنام ہے۔ جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام ہمارے مفسرین افسُس یا افسوس لکھتے ہیں اور گبن اس کا نام اِفِسس (Ephesus) بتاتا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پہ رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، جس کے کھنڈر آج موجودہ ٹرکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰۔۲۵ میل بجانبِ جنوب پائے جاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقشہ ۱) پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحابِ کہف جاگے اس کا نام ہمارے مفسرین تیندوسیس لکھتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ ان کے بعث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسیس (Theodosius) ثانی کے زمانے میں پیش آیا جو رُومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک رُوم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحابِ کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا تھا اس کا نام ہمارے مفسرین یملیخا بتاتے ہیں اور گبن اسے یَمبلیخَس (Jamblichus) لکھتا ہے۔

دو طرفہ روایات میں یکسانی

قصّے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈیسیس کے زمانے میں جب مسیح علیہ السّلام کے پیروؤں پر سخت ظلم وستم ہو رہے تھے، یہ سات نوجوان ایک غار میں جا بیٹھے تھے پھر قیصر تھیوڈوسیس کی سلطنت کے اڑتیسویں سال (یعنی تقریباً ۴۴۵ء یا ۴۴۶ء میں) یہ لوگ بیدار ہوئے جبکہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السّلام کی پیرو بن چکی تھی۔ اسی حساب سے غار میں ان کے رہنے کی مدّت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔ ۲۵۱ھ

جلد اوّل	ــــــــــــــ	حصّہ ۲

بعثت سے پہلے کا ماحول

ا: اقوامِ ماضیہ

باب ۱۳

سابق اُمّتوں کی تباہی

اور اُن کے آثار

فصل ۱

اِبتدائیہ

نوعِ انسانی کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو کہ دنیا کو محض ایک تماشا گاہ، محض ایک خوانِ یغما، محض ایک عیش کدہ سمجھ کر جینے والی، اور انبیاء کی بتائی ہوئی حقیقت سے منہ موڑ کر باطل نظریات پر کام کرنے والی قومیں پے در پے کس انجام سے دوچار ہوتی رہی ہیں ؟ ۲۵۱

آثارِ قدیمہ کا مشاہدہ انہوں نے (یعنی معذّب و تباہ شدہ اقوام نے) محض ایک تماشائی کی حیثیت سے کیا، ان سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کے قائل کی نگاہ اور اس کے منکر کی نگاہ میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک تماشا دیکھتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ تاریخ مرتّب کرتا ہے۔ دوسرا انہی چیزوں سے اخلاقی سبق لیتا ہے اور زندگی سے ماوراء حقیقتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ ۲۵۲

جو لوگ بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے اُٹھائے گئے وہ سب ان کی اپنی ہی بستیوں کے رہنے والے تھے مسیح، مُوسیٰ، ابراہیم اور نوح علیہم السلام آخر کون تھے۔ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ جن قوموں نے اِن لوگوں کی دعوتِ اصلاح کو قبول نہ کیا اور اپنے بے بنیاد تخیُّلات اور اپنی بے لگام خواہشات کے پیچھے چلتی رہیں ان کا انجام کیا ہوا۔ تم خود اپنے تجارتی سفروں میں عاد، ثمود، مَدیَن اور قومِ لُوط وغیرہ کے تباہ شدہ علاقوں سے گذرتے رہے ہو۔ کیا وہاں تمہیں کوئی سبق نہیں ملا۔ یہ انجام جو انہوں نے دنیا ہی میں دیکھا یہی تو خبر دے رہا ہے کہ عاقبت میں وہ اس سے بدتر انجام دیکھیں گے۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے دنیا میں اپنی اصلاح کر لی وہ صرف دنیا ہی میں اچھے نہ رہے آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ بہتر ہو گا۔ ۲۵۳

جن قوموں نے بھی انبیاء علیہم السّلام کی بات نہ مانی اور اپنی زندگی کا پُورا رویّہ توحید، رسالت، اور آخرت کے انکار پر قائم کیا وہ آخر کار ہلاکت کی مستحق ہو کر رہیں۔ تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا کا قانونِ اخلاق جو انبیاء کے ذریعہ سے دیا گیا، اور اس کے مطابق انسانی اعمال کی باز پُرس جو آخرت میں ہونی ہے، سراسر مبنی بر حقیقت ہے، کیونکہ جس قوم نے بھی اس قانون سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو غیر ذمّہ دار اور غیر جواب دہ سمجھتے ہُوئے دنیا میں اپنا

رویہ متعین کیا ہے وہ آخر کار سیدھی تباہی کی طرف گئی ہے۔ ۲۵۵

پچھلی انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہیں ان سب کو جس چیز نے گرایا وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوشحالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی ضمیر اس درجہ بگڑ گیا کہ یا تو ان کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو برائیوں سے روکتے، یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رُک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت آخر کار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں۔ ۲۵۶

طالبِ حق لوگوں کے لیے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ حقیقت کو پہچان سکتے ہیں، لیکن ہٹ دھرم لوگ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے ہیں۔ نہ آفاق کی نشانیاں دیکھ کر اور نہ انبیاء کے معجزات دیکھ کر۔ وہ تو ہمیشہ اس وقت تک اپنی ضلالت پر جمے رہے ہیں جب تک خدا کے عذاب نے آکر ان کو گرفت میں نہیں لے لیا ہے۔ اسی مناسبت سے سُورۂ شعراء میں تاریخ کی سات قوموں کے حالات پیش کیے گئے ہیں جنہوں نے اسی ہٹ دھرمی سے کام لیا تھا جس سے کفارِ مکہ کام لے رہے تھے۔ اور اس تاریخی بیان کے ضمن میں چند باتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔

اوّل یہ کہ نشانیاں دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو خدا کی زمین پر ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر ہر صاحبِ عقل آدمی تحقیق کر سکتا ہے کہ نبی جس چیز کی طرف بُلا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔ دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو فرعون اور اس کی قوم نے دیکھیں، قومِ نوح نے دیکھیں، عاد اور ثمود نے دیکھیں، قومِ لوط اور اصحابُ الایکہ نے دیکھیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

دوم یہ کہ ہر زمانے میں کفّار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے، ان کی حجتیں ایک ہی طرح کی تھیں۔ ان کے اعتراضات یکساں تھے۔ ایمان نہ لانے کے لیے ان کے حیلے اور بہانے یکساں تھے۔ اور آخر کار انجام بھی یکساں ہی رہا، اس کے برعکس ہر زمانے میں انبیاء کی تعلیم ایک تھی۔ ان کی سیرت و اخلاق کا رنگ ایک تھا۔ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں ان کی دلیل و حجت کا انداز ایک تھا اور ان سب کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک تھا۔ یہ دونوں نمونے تاریخ میں موجود ہیں۔ ۲۵۷

پچھلی قوموں کو اپنے اپنے زمانے میں کام کرنے کا موقع دیا گیا تھا، مگر انہوں نے آخر کار ظلم و بغاوت کی روش اختیار کی اور جو انبیاء ان کو راہِ راست دکھانے کے لیے بھیجے گئے تھے اُن کی بات انہوں نے نہ مانی۔ اس لیے وہ ہمارے امتحان میں ناکام ہوئیں اور میدان سے ہٹا دی گئیں۔ اب اے اہلِ عرب تمہاری باری آئی ہے تمہیں ان کی جگہ کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تم اس امتحان گاہ میں کھڑے ہو جس سے تمہارے پیش رو ناکام ہو کر نکالے

جا چکے ہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارا انجام بھی وہی ہو جو ان کا ہؤا تو اس موقع سے جو تمہیں دیا جا رہا ہے، صحیح فائدہ اٹھاؤ، پچھلی قوموں کی تاریخ سے سبق لو اور اُن غلطیوں کا اعادہ نہ کرو جو ان کی تباہی کی موجب ہوئیں۔[۲۵۸]

فصل ۲

قومِ نوحؑ

قرآن کے اشارات اور بائیبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہوجاتی ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم اُس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔ بابل کے آثارِ قدیمہ میں بائیبل سے قدیم تر جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں بیان ہوا ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔ پھر جو روایات کردستان اور آرمینیا میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی۔ موصل کے شمال میں جزیرۂ ابنِ عمر کے آس پاس، اور آرمینیا کی سرحد پر کوہ اراراط کے نواح میں نوح علیہ السلام کے مختلف آثار کی نشاندہی اب بھی کی جاتی ہے۔ اور نخچیوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اس شہر کی بنا حضرت نوحؑ نے ڈالی تھی۔

ایک بڑے طوفان کا تاریخی ریکارڈ

حضرت نوحؑ کے اس قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں اور اس کے علاوہ برما، ملایا، جزائر شرق الہند، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اُس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسلِ آدم کسی ایک ہی خطۂ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دُنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشان دہی کرتی ہیں، اگرچہ مرورِ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انہوں نے فراموش کردیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔[۲۵۹]

جُودی پہاڑ (جس پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹھہری تھی) کردستان کے علاقہ میں جزیرۂ ابنِ عمر کے شمال مشرقی جانب واقع ہے۔ بائیبل میں اس کشتی کے ٹھہرنے کی جگہ اراراط بتائی گئی ہے جو آرمینیا کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور ایک

قومِ نوحؑ کا علاقہ اور جبلِ جودی
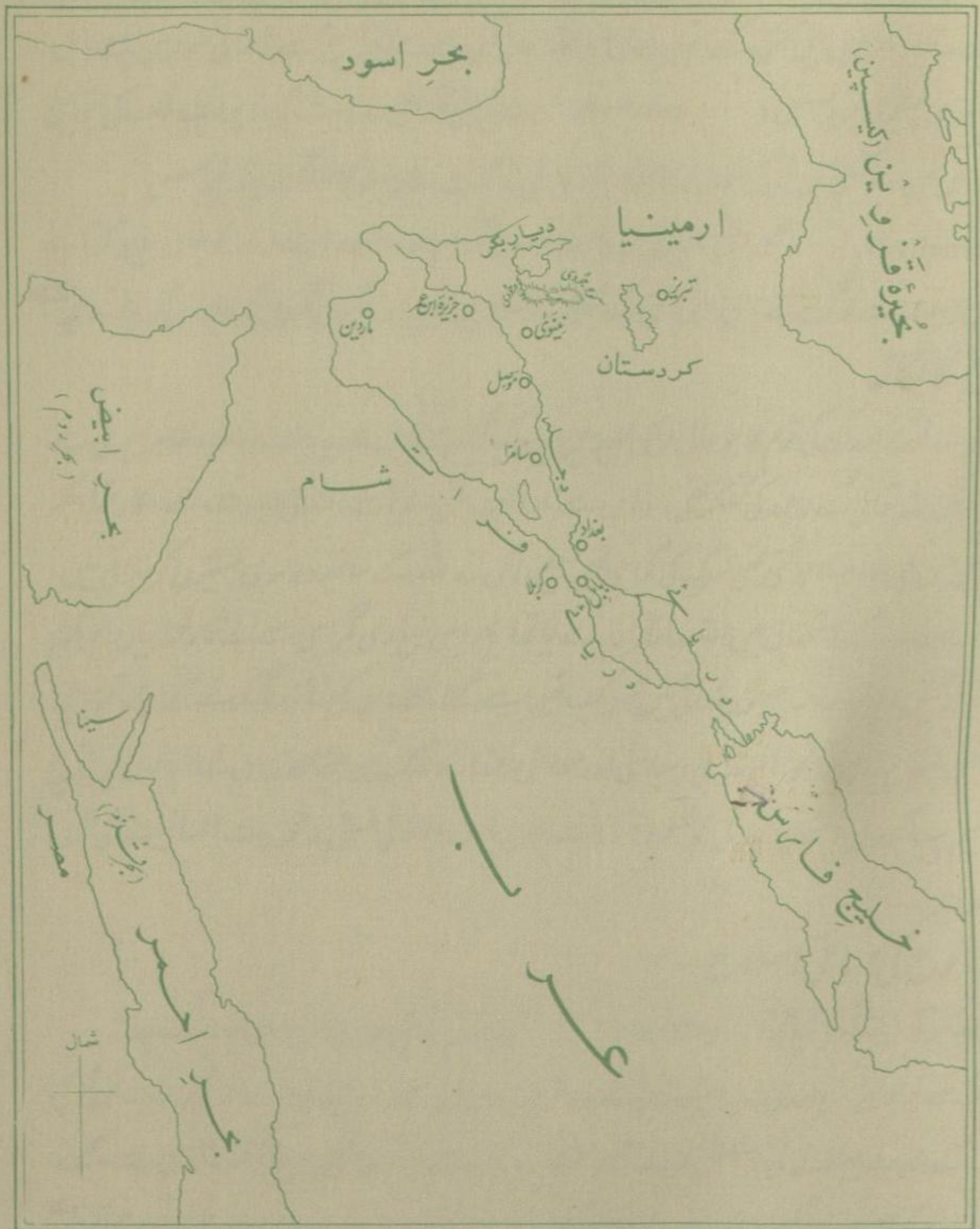
سلسلۂ کوہستان کا نام بھی سلسلۂ کوہستان کے معنی میں، جس کو ارارط کہتے ہیں وہ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلتا ہے اور جبل الجُودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جو آج بھی جودی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم تاریخوں میں کشتی کے ٹھہرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ مسیحؑ سے ڈھائی سو برس پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیروسس (Berasus) نے پرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنے ملک کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں وہ کشتیٔ نوحؑ کے ٹھہرنے کا مقام جُودی ہی بتاتا ہے۔ ارسطو کا شاگرد ابیڈینیوسس (Abydenus) بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے، نیز وہ اپنے زمانہ کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جنہیں وہ گھول گھول کر بیماروں کو پلاتے ہیں۔[۲۶۰]

قومِ نوحؑ کا بگاڑ

حضرت نوحؑ اور اُن کی قوم کا جو حال قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو اللہ تعالیٰ کے وجود کی منکر تھی، نہ اس سے ناواقف تھی، نہ اُسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا، بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئی تھی شرک کی گمراہی تھی۔ یعنی اُس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو خدائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دے لیا تھا۔ پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں رُونما ہو گئیں۔ جو خود ساختہ معبود خدائی میں شریک ٹھیرا لیے گئے تھے، ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا اور اس نے انسانوں میں اُونچ نیچ کی تقسیم پیدا کر دی، اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔

حضرت نوح کی مساعیٔ اصلاح

وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۔ (نوح ۔ ۲۲) "ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے۔"

مکر سے مُراد ان سرداروں اور پیشواؤں کے وہ فریب ہیں جن سے وہ اپنی قوم کے عوام کو حضرت نوحؑ کی تعلیمات کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ نوحؑ تمہی جیسا ایک آدمی ہے، کیسے مان لیا جائے کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی آئی ہے (الاعراف: ۶۳ ۔ ہود: ۲۷)۔ نوحؑ کی پیروی تو ہمارے اراذل نے بے سوچے سمجھے قبول کر لی ہے، اگر اس کی بات میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے اکابر اس پر ایمان لاتے (ہود ۔ ۲۷)۔ خدا کو اگر بھیجنا ہوتا تو کوئی فرشتہ بھیجتا (المومنون ۔ ۲۴)۔ اگر یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو اس کے پاس خزانے ہوتے، اس کو علمِ غیب حاصل ہوتا اور یہ فرشتوں کی طرح تمام انسانی حاجات سے بے نیاز ہوتا (ہود ۔ ۳۱)۔ نوحؑ اور اور اس کے پیروؤں میں آخر کونسی کرامت نظر آتی ہے جس کی بنا پر ان کی فضیلت مان لی جائے (ہود ۔ ۲۷) یہ شخص

دراصل تم پر اپنی سرداری جمانا چاہتا ہے (المومنون ۲۴)۔ اِس شخص پر کسی جن کا سایہ ہے جس نے اِسے دیوانہ بنا دیا ہے (المومنون ۲۵) [261]

حضرت نوح علیہ السلام نے اِس حالت کو بدلنے کے لیے ایک زمانۂ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی مگر عامۃ النّاس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھانس رکھا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار حضرت نوحؑ نے خدا سے دُعا کی کہ ان کافروں میں سے ایک کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ، کیوں کہ اگر تو نے ان میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا بدکار اور نمک حرام ہی پیدا ہو گا۔[1] [262]

عذاب

حضرت نوحؑ کی دُعا دربارِ ایزدی[2] میں مقبول ہوئی اور اس قوم کو عذابِ الٰہی نے آن لیا۔ قرآن کے صریح الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے کہ طوفان کی ابتداء ایک خاص تنوّر سے ہوئی جس کے نیچے سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا، پھر ایک طرف آسمان سے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اور دوسری طرف زمین میں جگہ جگہ سے چشمے پھوٹنے لگے۔ سورۂ ہُودؑ میں صرف تنّور کے اُبل پڑنے کا ذکر ہے اور آگے چل کر بارش کی طرف بھی اشارہ ہے۔ مگر سورۂ قمر میں اس کی تفصیل دی

---

[1] اشارہ ہے حضرت نوحؑ کی اُس دعا کی طرف جو ایک مدّتِ دراز تک اپنی قوم کی اصلاح کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہنے کے بعد آخر کار تنگ آ کر انہوں نے مانگی کہ اِنِّی مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ "پروردگار میں مغلوب ہو گیا ہوں میری مدد کو پہنچ (القمر۔ آیت ۱۰)۔ اور رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا "پروردگار، زمین پر ایک کافر باشندہ بھی نہ چھوڑ۔ (نوح۔ آیت ۱۰)

[2] قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس طویل کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت نوحؑ کی دعوت اور اُن کی قوم کے اصرار علی الکفر کے درمیان صدیوں برپا رہی۔ سورۂ عنکبوت میں بتایا گیا ہے کہ اس کشمکش کا زمانہ ساڑھے نو سو برس تک ممتد رہا ہے۔ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا (آیت ۱۴)۔ حضرت نوحؑ نے اس زمانہ میں پُشت در پُشت اُن کے اجتماعی طرزِ عمل کو دیکھ کر نہ صرف یہ اندازہ فرما لیا کہ اُن کے اندر قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے بلکہ یہ رائے بھی قائم کر لی کہ آئندہ ان کی نسلوں سے بھی نیک اور ایماندار آدمیوں کے اُٹھنے کی توقع نہیں ہے اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (نوح۔ آیت ۲۷) "اے رب اگر تُو نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور اُن کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا فاجر اور سخت منکرِ حق ہو گا۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت نوحؑ کی اس رائے کو درست قرار دیا اور اپنے علمِ کامل و شامل کی بنا پر فرمایا کہ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (ہُود۔ آیت ۳۶) "تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے بس وہ لا چکے، اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے لہٰذا اب ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دے۔" [264]

گئی ہے کہ فَفَتَحْنَا اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ "ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے جن سے لگاتار بارش برسنے لگی اور زمین کو پھاڑ دیا کہ ہر طرف چشمے ہی چشمے پھوٹ نکلے اور یہ دونوں طرح کے پانی اُس کام کو پُورا کرنے کے لیے تُل گئے جو مقدر کر دیا گیا تھا" نیز لفظ تنّور پر الف لام داخل کرنے کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تنّور کو اس کام کی ابتدا کے لیے نامزد فرما دیا تھا جو اشارہ پاتے ہی ٹھیک اپنے وقت پر اُبل پڑا اور بعد میں طوفان والے تنّور کی حیثیت سے معروف ہو گیا۔ ۲۶۴ھ

کیا طُوفان عالمگیر تھا ؟

یہ طُوفان عالمگیر تھا یا اُس خاص علاقے میں آیا تھا جہاں حضرت نُوحؑ کی قوم آباد تھی ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فیصلہ آج تک نہیں ہوا۔ اسرائیلی روایات کی بنا پر عام خیال یہی ہے کہ یہ طُوفان تمام رُوئے زمین پر آیا تھا (پیدائش ۷ : ۱۸-۲۴) ۔ مگر قرآن میں یہ بات کہیں نہیں کہی گئی ہے۔ قرآن کے اشارات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی انسانی نسلیں انہی لوگوں کی اولاد سے ہیں جو طُوفانِ نُوحؑ سے بچا لیے گئے تھے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طُوفان تمام رُوئے زمین پر آیا ہو، کیونکہ یہ بات اس طرح بھی صحیح ہو سکتی ہے کہ اُس وقت تک بنی آدم کی آبادی اسی خطّہ تک محدُود رہی ہو جہاں طوفان آیا تھا اور طوفان کے بعد جو نسلیں پیدا ہوتی ہوں وہ بتدریج تمام دُنیا میں پھیل گئی ہوں۔ اِس نظریہ کی تائید دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ دجلہ و فرات کی سرزمین میں تو ایک زبردست طوفان کا ثبوت تاریخی روایات سے، آثارِ قدیمہ سے اور طبقات الارض سے ملتا ہے، لیکن رُوئے زمین کے تمام خطّوں میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے کسی عالمگیر طوفان کا یقین کیا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ رُوئے زمین کی اکثر و بیشتر قوموں میں ایک طوفانِ عظیم کی روایات قدیم زمانے سے مشہور ہیں، حتیٰ کہ آسٹریلیا، امریکہ اور نیوگنی جیسے دُور دراز علاقوں کی پُرانی روایات میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کسی وقت ان سب قوموں کے آباؤ اجداد ایک ہی خطّہ میں آباد ہوں گے جہاں یہ طُوفان آیا تھا۔ اور پھر جب ان کی نسلیں زمین کے مختلف حصّوں میں پھیلیں تو یہ روایات اُن کے ساتھ گئیں۔ ۲۶۵ھ

کشتی نُوحؑ ایک نشانِ عبرت بن گئی

وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (العنکبوت۔ ۱۵) "اور اسے دُنیا والوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا کر رکھ دیا"

اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہولناک عقوبت کو یا اس عظیم الشان واقعہ کو بعد والوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ لیکن یہاں اور سورۂ قمر آیت ۱۵ میں یہ بات جس طریقہ سے بیان فرمائی گئی ہے اس سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ وہ نشانِ عبرت خود وہ کشتی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر صدیوں موجود رہی اور بعد کی نسلوں کو خبر دیتی رہی

کہ اس سرزمین میں کبھی ایسا طوفان آیا تھا جس کی بدولت یہ کشتی پہاڑ پر جا ٹکی ہے۔ سُورۂ قمر کی آیت کی تفسیر میں ابنِ جَریر نے قتادہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ عہدِ صحابہ میں جب مسلمان الجزیرہ کے علاقے میں گئے ہیں تو انہوں نے کوہِ جودی پر (اور ایک روایت کی رُو سے باقِردیٰ نامی بستی کے قریب) اس کشتی کو دیکھا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بھی وقتاً فوقتاً یہ اطلاعات اخبارات میں آتی رہتی ہیں کہ کشتیٔ نُوحؑ کو تلاش کرنے کے لیے مہمات بھیجی جا رہی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہاز جب کوہستانِ اراراط پر سے گزر رہے ہیں تو ایک چوٹی پر انہوں نے ایسی چیز دیکھی ہے جو کشتی سے مشابہ ہے۔

امام بخاری، ابن ابی حاتم، عبدالرزاق اور ابن جریر نے قَتادہ سے یہ روایات نقل کی ہیں کہ مسلمانوں کو فتح عراق و الجزیرہ کے زمانے میں یہ کشتی جودی پر (اور ایک روایت کے مطابق باقردیٰ کی بستی کے قریب) موجود تھی اور ابتدائی دور کے اہلِ اسلام نے اس کو دیکھا تھا۔[۳۶۶]

قومِ عاد کا علاقہ

فصل ۳
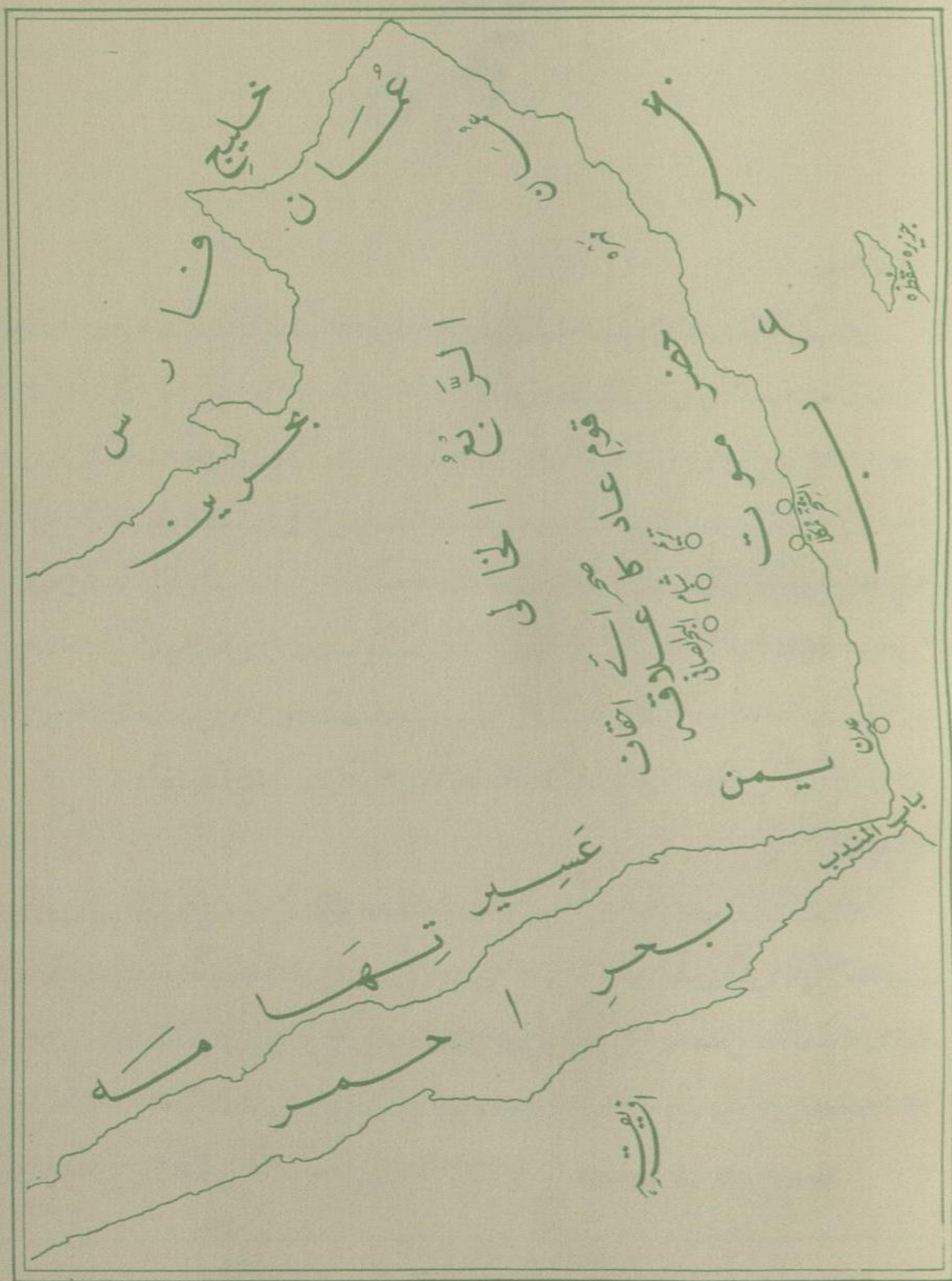
قومِ عاد

وجہ تسمیہ

یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہلِ عرب میں زبان زدِ عام تھے۔ بچّہ بچّہ ان کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شوکت و حشمت ضرب المثل تھی۔ پھر دنیا سے ان کا نام و نشان تک مٹ جانا بھی ضرب المثل ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی شہرت کی وجہ سے عربی زبان میں ہر قدیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کو عادیات کہتے ہیں۔ جس زمین کے مالک باقی نہ رہے ہوں اور جو آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے اُفتادہ پڑی ہوتی ہو اُسے عادیُّ الارض کہا جاتا ہے۔ قدیم عربی شاعری میں ہم کو بڑی کثرت سے اس قوم کا ذکر ملتا ہے۔ عرب کے ماہرینِ انساب بھی اپنے ملک کی معدوم شدہ قوموں میں سب سے پہلے اسی قوم کا نام لیتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں بنی ذُہل بن شیبان کے ایک صاحب آئے جو عاد کے علاقے کے رہنے والے تھے اور انہوں نے وہ قصّے حضورؐ کو سُنائے جو اس قوم کے متعلق قدیم زمانوں سے ان کے علاقہ کے لوگوں میں نقل ہوتے چلے آ رہے تھے۔

قومِ عاد کا مسکن

قرآن کی رُو سے اس قوم کا اصل مسکن اَحقاف[1] کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان واقع ہے۔ یہیں سے پھیل کر ان لوگوں نے یمن کے مغربی سواحل سے عراق تک اپنی طاقت کا سکّہ رواں کر دیا تھا۔ تاریخی حیثیت سے اس قوم کے آثار دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں لیکن جنوبی عرب میں کہیں کہیں کچھ پُرانے کھنڈر موجود ہیں جنہیں عاد کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ ایک مقام پر حضرت ہود علیہ السلام کی قبر بھی مشہور ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ایک انگریز بحری افسر (James R. Wellested) کو حِصنِ غُراب میں ایک پُرانا کتبہ ملا تھا جس میں حضرت ہُود علیہ السلام

---

[1] اَحقاف حِقف کی جمع ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ریت کے لمبے لمبے ٹیلے جو بلندی میں پہاڑوں کی حد کو نہ پہنچے ہوں، لیکن اصطلاحاً یہ صحرائے عرب (الرُّبع الخالی) کے جنوبی مغربی حصّے کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔[۲۶۸] (مؤلّف)

کا ذکر موجود ہے اور عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی تحریر ہے جو شریعتِ ہُودؑ کے پیرو تھے۔ ۲۶۷

ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ عاد کا علاقہ عُمان سے یمن تک پھیلا ہوا تھا اور قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا اصل وطن الاحقاف تھا جہاں سے نکل کر وہ گرد و پیش کے ممالک میں پھیلے اور کمزور قوموں پر چھا گئے۔ آج کے زمانے تک بھی جنوبی عرب کے باشندوں میں یہی بات مشہور ہے کہ عاد اسی علاقے میں آباد تھے۔ موجودہ شہر مُکلّا سے تقریباً ۱۲۵ میل کے فاصلے پر شمال کی جانب حضرموت میں ایک مقام ہے جہاں لوگوں نے حضرت ہُودؑ کا مزار بنا رکھا ہے اور وہ قبرِ ہُودؑ کے نام ہی سے مشہور ہے۔ ہر سال ۱۵ شعبان کو وہاں عُرس ہوتا ہے اور عرب کے مختلف حصّوں سے ہزاروں آدمی وہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہ قبر اگرچہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے لیکن اس کا وہاں بنایا جانا اور جنوبی عرب کے لوگوں کا کثرت سے اس کی طرف رجوع کرنا کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ مقامی روایات اِسی علاقے کو قومِ عاد کا علاقہ قرار دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ حضرموت میں متعدد خرابے (Ruins) ایسے ہیں جن کو مقامی باشندے آج تک دارِ عاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مسکنِ عاد کی موجودہ حالت

الاحقاف کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شاندار تمدّن رکھنے والی طاقتور قوم آباد ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاداب علاقہ ہوگا اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگ زار بنا دیا ہوگا۔ آج اُس کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک لق و دق ریگستان ہے جس کے اندرونی حصّوں میں جانے کی بھی کوئی ہمّت نہیں رکھتا۔ ۱۸۴۳ء میں بویریا کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ حضرموت کی شمالی سطحِ مُرتفع پر سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فیٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید قطعے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بدّو اس علاقے سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدو اُسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اُس کا بیان ہے کہ یہاں کی ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے۔ میں نے دُور سے ایک شاقول اس میں پھینکا تو وہ ۵ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا اور اُسی وقت اس ڈور کا سرا گل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔[1] ۲۶۹

---

[1] مفصّل معلومات کے لیے ملاحظہ ہوں:

1. Arabia and The Isles, Harold Ingrams, London. 1946
2. The unveiling of Arabia, R. H. Kirnan, London. 1937
3. The Empty Quarter, Philby, London. 1933

تباہی سے پہلے کی خوشحالی

یہ بات خود اہلِ عرب کی تاریخی روایات سے بھی ثابت ہے۔ اور موجودہ اثری انکشافات بھی اس پر شہادت دیتے ہیں کہ عادِ اُولیٰ بالکل تباہ ہو گئے اور ان کی یادگاریں تک دُنیا سے مٹ گئیں چنانچہ مؤرخینِ عرب انہیں عرب کی اُمَمِ بائدہ (معدوم اقوام) میں شمار کرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی عرب کے تاریخی مسلّمات میں سے ہے کہ عاد کا صرف وہ حصّہ باقی رہا جو حضرت ہُودؑ کا پیرو تھا۔ انہی بقایائے عاد کا نام تاریخ میں عادِ ثانیہ ہے اور حصنِ غُراب کا وہ کتبہ جس کا ہم ابھی اوپر ذکر کر چکے ہیں انہی کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس کتبہ میں (جسے تقریباً ۱۸ سو برس قبلِ مسیحؑ کی تحریر سمجھا جاتا ہے)، ماہرینِ آثار نے جو عبارت پڑھی ہے اس کے چند جملے یہ ہیں:

"ہم نے ایک طویل زمانہ اس قلعہ میں اِس شان سے گزارا ہے کہ ہماری زندگی تنگی و بدحالی سے دُور تھی، ہماری نہریں دریا کے پانی سے لبریز رہتی تھیں، اور ہمارے حکمران ایسے بادشاہ تھے جو بُرے خیالات سے پاک اور اہلِ شر و فساد پر سخت تھے۔ وہ ہم پر ہُودؑ کی شریعت کے مطابق حکومت کرتے تھے اور عمدہ فیصلے ایک کتاب میں درج کر لیے جاتے تھے۔ اور ہم معجزات اور موت کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے۔"

یہ عبارت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عاد کی قدیم عظمت و شوکت اور خوشحالی کے وارث آخر کار وہی لوگ ہوتے جو حضرت ہُودؑ پر ایمان لاتے تھے۔ ۲۷۰

قرآن میں ان کے عُروج اور اِستکبار کا ذکر

قومِ نوحؑ کی تباہی کے بعد دُنیا میں جس قوم کو عُروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی۔

وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ۔ (الاعراف: آیت ۶۹) "یاد کرو (اللہ کے اس فضل و انعام کو کہ) نوحؑ کی قوم کے بعد اس نے تم کو خلیفہ بنایا۔"

جسمانی حیثیت سے یہ بڑے تنومند اور زور آور لوگ تھے۔

وَزَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَصْۜطَةً (الاعراف ۶۹) "اور تمہیں جسمانی ساخت میں خوب تنومند کیا۔"

اپنے دَور میں یہ بے نظیر قوم تھی، کوئی دوسری قوم اس کی ٹکّر کی نہ تھی۔

الَّتِى لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ (الفجر-۸) "جس کے مانند ملکوں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔"

اس کا تمدن بڑا شاندار تھا۔ اُونچے اُونچے ستونوں کی بلند و بالا عمارتیں بنانا اس کی وہ خصوصیت تھی جس کے لیے وہ اس وقت کی دنیا میں مشہور تھی۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ۔ اِرَمَ ذَاتِ "تُو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے کیا کیا ستونوں والے

الْعِمَادِ۔ (الفجر۔ آیت ۶-۷) عادِ ارم کے ساتھ؟

اِس مادّی اور جسمانی زور آوری نے ان کو سخت متکبّر بنا دیا تھا اور انہیں اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً۔ (حٰم السجدہ۔ آیت ۱۵)

رہے عاد، تو انہوں نے زمین میں حق کی راہ سے ہٹ کر تکبّر کی روش اختیار کی اور کہنے لگے کہ کون ہے ہم سے زیادہ زور آور؟

ان کا سیاسی نظام چند بڑے بڑے جبّاروں کے ہاتھ میں تھا جن کے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا:

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (ہود۔ آیت ۵۹)

اور انہوں نے ہر جبّار دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی۔

مذہبی حیثیت سے یہ اللہ تعالیٰ کے مُنکر نہ تھے بلکہ شرک میں مبتلا تھے۔ ان کو اس بات سے انکار تھا کہ بندگی صرف اللہ کی ہونی چاہیے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا۔ (الاعراف آیت ۷۰)

انہوں نے (ہُود سے) کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی بندگی کریں اور اُن کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے[۲۷۱]

ان پر نزولِ عذاب کی وجہ

قدیم قومِ عاد کی تباہی و بربادی اِس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اللہ کو ان کے ساتھ کوئی دشمنی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ انہیں تباہ کر دے، بلکہ دراصل انہوں نے خود ہی اپنے لیے وہ طرزِ زندگی پسند کیا جو انہیں بربادی کی طرف لے جانے والا تھا۔ اللہ نے تو انہیں سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا پورا موقع دیا، ان کی فہمائش کے لیے رسُول بھیجے، رسُولوں کے ذریعہ سے ان کو غلط روی کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا اور انہیں کھول کھول کر نہایت واضح طریقے سے بتا دیا کہ اُن کے لیے فلاح کا راستہ کونسا ہے اور ہلاکت و بربادی کا کونسا۔ مگر جب انہوں نے اصلاحِ حال کے کسی موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور ہلاکت کی راہ چلنے ہی پر اصرار کیا تو لامحالہ ان کا وہ انجام ہونا ہی تھا جو بالآخر ہو کر رہا۔[۲۷۲]

عذاب کے بارے میں قرآنی تصریحات

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (حٰم السجدہ آیت ۱۶)

آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا اُن پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں۔

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اِس عذاب کی جو تفصیل آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہوا مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک چلتی رہی۔ اس کے زور سے لوگ اس طرح گر گر کر مر گئے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے پڑے ہوں

(الحاقّہ آیت ۷)۔ جس چیز پر سے بھی یہ ہوا گزر گئی اس کو بوسیدہ کر کے رکھ دیا (الذّاریات: ۴۲)۔ جس وقت یہ ہوا آ رہی تھی اس وقت عاد کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے کہ خوب گھٹا گھر کر آئی ہے، بارش ہوگی اور سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے گا۔ مگر وہ آئی تو اس طرح آئی کہ اس نے ان کے پورے علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔[۲۷۳]

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ	ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا
نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ۔ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ	ان پر بھیج دی جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک
نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ۔ (القمر۔ ۱۹-۲۰)	رہی تھی جیسے وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں۔

یعنی ایک ایسے دن جس کی نحوست کئی روز تک مسلسل جاری رہی۔ سورۂ حٰم السجدہ آیت ۱۶ میں فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اور سورۂ الحاقّہ آیت ۷ میں فرمایا گیا ہے کہ ہوا کا یہ طوفان مسلسل سات رات اور آٹھ دن جاری رہا۔[ل][۲۷۴]

ل مشہور یہ ہے کہ جس دن یہ عذاب شروع ہوا وہ بدھ کا دن تھا۔ اسی سے لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ بدھ کا دن منحوس ہے اور کوئی کام اس دن شروع نہ کرنا چاہیے۔ بعض نہایت ضعیف احادیث بھی اس سلسلے میں نقل کی گئی ہیں جن سے اس دن کی نحوست کا عقیدہ عوام کے ذہن میں بیٹھ گیا ہے مثلاً ابن مردویہ اور خطیب بغدادی کی یہ روایت کہ آخر اربعاء فی الشھر یوم نحس مستمر (مہینے کا آخری بدھ منحوس ہے جس کی نحوست مسلسل جاری رہتی ہے)۔ ابن جوزی اسے موضوع کہتے ہیں۔ ابن رجب نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ حافظ سخاوی کہتے ہیں کہ جتنے طریقوں سے یہ منقول ہوئی ہے وہ سب واہی ہیں۔ اسی طرح طبرانی کی اس روایت کو بھی محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے کہ یوم الاربعاء یوم نحس مستمر (بدھ کا دن پیہم نحوست کا دن ہے)۔ بعض اور روایات میں یہ باتیں بھی مروی ہیں کہ بدھ کو سفر نہ کیا جائے، لین دین نہ کیا جائے، ناخن نہ کٹوائے جائیں، مریض کی عیادت نہ کی جائے، اور یہ کہ جذام اور برص اسی روز شروع ہوتے ہیں۔ مگر یہ تمام روایات ضعیف ہیں اور ان پر کسی عقیدے کی بنا نہیں رکھی جا سکتی۔ محقق مناوی کہتے ہیں توقی الاربعاء علی جھۃ الطیرۃ وظن اعتقاد المنجمین حرام شدید التحریم اذ الایام کلھا للہ تعالیٰ لا تنفع ولا تضر بذاتھا "بدفالی کے خیال سے بدھ کے دن کو منحوس سمجھ کر چھوڑنا اور نجومیوں کے سے اعتقاد اس باب میں رکھنا حرام، سخت حرام ہے، کیونکہ سارے دن اللہ کے ہیں، کوئی دن بذاتِ خود نہ نفع پہنچانے والا ہے نہ نقصان"۔ علامہ آلوسی کہتے ہیں "سارے دن یکساں ہیں، بدھ کی کوئی تخصیص نہیں۔ رات دن میں کوئی گھڑی ایسی نہیں ہے جو کسی کے لیے اچھی اور کسی کے لیے بُری نہ ہو۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کسی کے لیے موافق اور کسی کے لیے ناموافق حالات پیدا کرتا رہتا ہے۔ (مؤلف)[۲۷۵]

فصل ۴

قومِ ثمُود

تعارُف

یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معرُوف ہے۔ نزُولِ قرآن سے پہلے اس کے قصّے اہلِ عرب میں زبان زدِ عام تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔ اسیریا کے کتبات اور یونان، اسکندریہ اور روم کے قدیم مؤرّخین اور جغرافیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مسیح علیہ السّلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے۔ چنانچہ رومی مؤرّخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کے خلاف لڑے جن سے ان کی دُشمنی تھی۔

قومِ ثمُود کا مسکن

اِس قوم کا مسکن شمالی مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحِجر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانہ میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جسے مدائنِ صالح کہتے ہیں۔ یہی ثمُود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانہ میں حِجر کہلاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جن کو ثمُود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا اور اِس شہرِ خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اِس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی[1]۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے اِن آثارِ قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب اِدھر سے گزرے تو آپؐ نے مسلمانوں کو یہ آثارِ عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثارِ قدیمہ سے ہر صاحبِ بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک جگہ آپؐ نے ایک کنوئیں کی نشاندہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنوئیں سے

---

[1] حجاز کے شمالی حصّہ میں رابغ سے عقبہ تک اور مدینہ و خیبر سے تیما اور تبوک تک کا سارا علاقہ آج بھی ثمود کے آثار سے بھرا ہوا ہے۔ نزُولِ قرآن کے زمانہ میں یہ آثار موجودہ حالت سے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوں گے۔[276] (مؤلف)

پانی لینا، باقی کنوؤں کا پانی نہ پینا - ایک پہاڑی درّے کو دکھا کر آپ نے بتایا کہ اسی درّے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی - چنانچہ وہ مقام آج بھی فجّ الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔[1] ۲۷۷

آثارِ ثمود

وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا۔ (الاعراف - ۷۴)	یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قومِ عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔

ثمود کی یہ صنعت (کوہ تراشی)، ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان میں ایلورا، ایجنٹا اور بعض دوسرے مقامات پر پائی جاتی ہے - یعنی وہ پہاڑوں کو تراش کر اُن کے اندر بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بناتے تھے - مدائنِ صالح میں اب تک ان کی یہ عمارتیں جُوں کی تُوں موجود ہیں اور ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم نے انجینئری میں کتنی حیرت انگیز ترقی کی تھی - ۲۷۸

حِجر قومِ ثمود کا مرکزی شہر تھا اور اس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العُلاء سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہیں - مدینہ سے تبوک جاتے ہُوئے یہ مقام شاہ راہِ عام پر پڑتا ہے - اور قافلے اِس وادی میں سے ہو کر گزرتے ہیں - مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا -

آٹھویں صدی ہجری میں ابنِ بطوطہ حج کو جاتے ہُوئے یہاں پہنچا تھا - وہ لکھتا ہے کہ "یہاں سُرخ رنگ کے پہاڑوں میں قومِ ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو اُنہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں - ان کے نقش و نگار اِس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہیں - اِن مکانات میں اب بھی سٹری گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں - ۲۷۹

مادّی ترقی اور اخلاقی بگاڑ

اِس قوم کے متعلق قرآن مجید میں مختلف مقامات (مثلاً الاعراف آیات ۷۳ تا ۷۹ - ہود ۶۱ تا ۶۸ - الحجر ۸۰ تا ۸۴ -

---

[1] غزوۂ تبوک کے موقع پر ثمود کے ان کھنڈروں میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے ان کو آپ نے جمع کیا اور ان کے سامنے ایک خُطبہ دیا جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اُس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہُوا تھا لہٰذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ - یہ سیرگاہ نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے - (مؤلف) ۲۸۰

النمل ۵۴ تا ۵۳ - الذّاریات ۴۳ تا ۴۵ - القمر ۲۳ تا ۳۱ - الحاقہ ۴-۵ - الفجر ۹ - الشمس - ۱۱) پر جو تصریحات کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی - جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ (الاعراف ۷۴) مگر اس کی تمدنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کی جو عاد کی ترقی نے کی تھی، یعنی معیارِ زندگی بلند سے بلند تر اور معیارِ آدمیت پست سے پست تر ہوتا چلا گیا - ایک طرف میدانی علاقوں میں عالی شان قصر اور پہاڑوں میں ایلورا اور اجنتہ کے غاروں جیسے مکان بن رہے تھے، دوسری طرف معاشرے میں شرک و بت پرستی کا زور تھا - اور زمین ظلم و ستم سے لبریز ہو رہی تھی - قوم کے بدترین مفسد لوگ اس کے لیڈر بنے ہوئے تھے - اونچے طبقے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مست تھے - حضرت صالحؑ کی دعوتِ حق نے اگر اپیل کیا تو نچلے طبقے کے کمزور لوگوں کو کیا - اونچے طبقوں نے اسے ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ "جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کو ہم نہیں مان سکتے"۔[۲۸۱]

سرکشی کے تین وجوہ

حضرت صالحؑ کی پیروی سے ان کا انکار تین وجوہ سے تھا - ایک یہ کہ وہ بشر ہیں، انسانیت سے بالاتر نہیں ہیں کہ ہم ان کی بڑائی مان لیں - دوسرے یہ کہ وہ ہماری ہی قوم کے ایک فرد ہیں - ہم پر ان کی فضیلت کی کوئی وجہ نہیں - تیسرے یہ کہ اکیلے ہیں ہمارے عام آدمیوں میں سے ایک آدمی ہیں، کوئی بڑے سردار نہیں ہیں جس کے ساتھ کوئی بڑا جتھا ہو، لاؤ لشکر ہو، خدم و حشم ہوں، اور اس بنا پر ہم ان کی بڑائی تسلیم کریں - وہ چاہتے تھے کہ نبی یا تو کوئی فوق البشر ہستی ہو، یا اگر وہ انسان ہی ہو تو ہمارے اپنے ملک اور قوم میں پیدا نہ ہوا ہو، بلکہ کہیں اوپر سے اتر کر آئے یا باہر سے بھیجا جائے، اور اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم اسے کوئی رئیس ہونا چاہیے جس کی غیر معمولی شان و شوکت کی وجہ سے یہ مان لیا جائے کہ رہنمائی کے لیے خدا کی نظرِ انتخاب اس پر پڑی ہے -[۲۸۲]

خیر و شر کی کشمکش

جونہی کہ حضرت صالحؑ کی دعوت کا آغاز ہوا ان کی قوم دو گروہوں میں بٹ گئی -

فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ (النمل آیت ۴۵) "تو یکایک وہ دو متخاصم فریق بن گئے"

ایک گروہ ایمان لانے والوں کا، دوسرا گروہ انکار کرنے والوں کا اور اس تفرقہ کے ساتھ ہی ان کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی - جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ

اُس کی قوم میں سے جو سردار اپنی بڑائی کا گھمنڈ رکھتے تھے اُنہوں نے اُن لوگوں سے جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، جو ان میں سے ایمان لائے تھے، کہا، کیا واقعی

قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلَ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ۔ قَالَ الَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡۤا اِنَّا بِالَّذِىۡۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ۔

(الاعراف ۔ آیات ۷۵-۷۶)

تم یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کو لے کر وہ بھیجے گئے ہیں۔ ان متکبّرین نے کہا جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کے ہم کافر ہیں۔

دوسرے مقام پر قومِ صالحؑ کے سرداروں کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ "اَے صالح، لے آ وہ عذاب ہم پر جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو واقعی رسُولوں میں سے ہے (الاعراف آیت ۷۷)

مُعجزہ کا مُطالبہ

اِنَّا مُرۡسِلُوا النَّاقَةِ فِتۡنَةً لَّهُمۡ فَارۡتَقِبۡهُمۡ وَاصۡطَبِرۡ وَنَبِّئۡهُمۡ اَنَّ الۡمَآءَ قِسۡمَةٌۢ بَيۡنَهُمۡ كُلُّ شِرۡبٍ مُّحۡتَضَرٌ ۔ (القمر: ۲۷-۲۸)

ہم اونٹنی کو ان کے لیے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں، اب صبر کے ساتھ دیکھ کہ ان کا کیا انجام ہوتا ہے ان کو جتا دے کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری کے دن پانی پر آئے گا۔

یہ تشریح ہے اس ارشاد کی کہ "ہم اونٹنی کو ان کے لیے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں"۔ وہ فتنہ یہ تھا کہ یکایک ایک اُونٹنی لاکر ان کے سامنے کھڑی کر دی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ ایک دن یہ اکیلی پانی پیے گی اور دوسرے دن تم سب لوگ اپنے لیے اور اپنے جانوروں کے لیے پانی لے سکو گے۔ اس کی باری کے دن تم میں سے کوئی شخص کسی چشمے اور کنوئیں پر نہ خود پانی لینے کے لیے آئے، اور نہ اپنے جانوروں کو پلانے کے لیے لائے۔ یہ چیلنج اس شخص کی طرف سے دیا گیا تھا جس کے متعلق وہ خود کہتے تھے کہ یہ کوئی لاؤ لشکر نہیں رکھتا، نہ کوئی بڑا جتھا اس کی پُشت پر ہے۔ [۲۸۴]

فیصلہ کُن نشانی

سُورۂ شعراء آیات ۱۵۴ تا ۱۵۶ میں تصریح ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالحؑ سے مطالبہ کیا تھا جو ان کے مامُور من اللہ ہونے پر کھلی دلیل ہو اور اسی کے جواب میں حضرت صالحؑ نے اونٹنی کو پیش کیا تھا[۱]۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہوا تھا اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاء نے اپنی نبوّت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبہ پر پیش کیے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس

---

[۱] یہی بات سُورۂ اعراف میں ارشاد ہوئی ہے۔ آیت ۷۳ (مؤلف)

اُونٹنی کی معجزانہ پیدائش پر دلیل ہے کہ حضرت صالحؑ نے اسے پیش کر کے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اب اس اونٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی مُعلّق ہے۔ یہ آزادانہ تمہاری زمینوں میں چرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ اکیلی پانی پیئے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پئیں گے۔ اور اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑیگا۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جا سکتی تھی جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ پھر یہ بات کہ ایک کافی مدت تک یہ لوگ اس کے آزادانہ چرتے پھرنے کو اور اس بات کو کہ ایک دن وہ تنہا پانی پیے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پیئں، بادلِ ناخواستہ برداشت کرتے رہے۔ اور آخر بڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا۔ درآنحالیکہ حضرت صالحؑ کے پاس کوئی طاقت نہ تھی جس کا انہیں کوئی خوف ہوتا۔ اِس حقیقت پر مزید دلیل یہ ہے کہ وہ لوگ اِس اُونٹنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی زور ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دندناتی پھرتی ہے[1]۔ ۲۸۵

اونٹنی کا قتل

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ۔ (الاعراف-۷۷)

انہوں نے اونٹنی کو قتل کر ڈالا اور اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔

کافی مدت تک یہ اونٹنی ساری قوم کے لیے ایک مسئلہ بنی رہی۔ لوگ اس پر دلوں میں اَونٹتے رہے، مشورے ہوتے رہے، اور آخر کار ایک من چلے سردار نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ وہ قوم کو اس بلا سے نجات دلائے گا۔ سُورۂ شمس میں اُس شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰهَا "جبکہ اُٹھا اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی"۔ اور سُورۂ قمر میں فرمایا گیا ہے فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ "انہوں نے اپنے رفیق سے اپیل کی۔ آخر کار وہ یہ کام اپنے ذمّہ لے کر اٹھا اور اس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں"۔ ۲۸۶

اگرچہ (اونٹنی کو) مارا ایک شخص نے تھا جیسا کہ سُورۂ قمر اور سُورۂ شمس میں ارشاد ہوا ہے، لیکن چونکہ پُوری قوم اُس مُجرم کی پُشت پر تھی اور وہ دراصل اِس جُرم میں پُوری قوم کی مرضی کا آلۂ کار تھا اس لیے الزام پُوری قوم پر عائد کیا گیا ہے[2]۔ ۲۸۷

---

[1] قرآن اِس امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ اونٹنی کیسی تھی اور کس طرح وجود میں آئی کسی صحیح حدیث میں بھی اس کی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے ان روایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو مفسّرین نے اس کی کیفیتِ پیدائش کے متعلق نقل کی ہیں لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور پر معجزے کی حیثیت رکھتی تھی قرآن سے ثابت ہے۔ ۲۸۸

[2] ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش کے مطابق کیا جائے یا جس کے ارتکاب کو قوم کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہو، ایک قومی گناہ ہے۔ خواہ اس کا ارتکاب کرنے والا ایک فردِ واحد ہی ہو۔ صرف یہی نہیں، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ جو گناہ قوم کے درمیان علی الاعلان کیا جائے اور قوم اسے گوارا کرے وہ بھی قومی گناہ ہے۔ (مؤلف) ۲۸۹

حضرت صالحؑ کے خلاف اشرار کی سازش

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ - قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ - وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ -

(النمل - آیات ۴۸ تا ۵۱)

اُس شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ اُنہوں نے آپس میں کہا "خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ ہم صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہدیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے۔ ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔" یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہُوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو۔"

قبل اس کے کہ وہ اپنے طے شدہ وقت پر حضرت صالحؑ کے ہاں شبخون مارتے، اللہ تعالیٰ نے اپنا عذاب بھیج دیا اور نہ صرف وہ بلکہ ان کی پوری قوم تباہ ہو گئی۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سازش ان لوگوں نے اونٹنی کی کوچیں کاٹنے کے بعد کی تھی۔ سورۂ ہود میں ذکر آتا ہے کہ جب اُنہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا تو حضرت صالحؑ نے انہیں نوٹس دیا کہ بس اب تین دن اور مزے کر لو اس کے بعد تم پر عذاب آجائے گا۔ فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذَٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ۔ اس پر شاید انہوں نے سوچا ہوگا کہ صالحؑ کا عذاب موعود تو آئے چاہے نہ آئے، ہم لگے ہاتھوں اونٹنی کے ساتھ اُس کا بھی کیوں نہ کام تمام کر دیں۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ انہوں نے شبخون مارنے کے لیے وہی رات تجویز کی ہو گی جس رات عذاب آنا تھا، اور قبل اس کے کہ ان کا ہاتھ حضرت صالحؑ پر پڑتا خدا کا زبردست ہاتھ اُن پر پڑ گیا۔[۲۹]

عذاب کی تفصیل

فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ (الشعراء آیت ۵۸) "عذاب نے انہیں آلیا"۔

قرآن میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب اونٹنی مار ڈالی گئی تو حضرت صالحؑ نے اعلان کیا تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ "تین دن اپنے گھروں میں مزے کر لو" (ہود۔ آیت ۶۵)۔ اِس نوٹس کی مدّت ختم ہونے پر رات کے پچھلے پہر صُبح کے قریب ایک زبردست دھماکا ہُوا اور اس کے ساتھ ایسا سخت زلزلہ آیا جس نے آن کی آن میں پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ صبح ہوئی تو ہر طرف اس طرح

کچلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جیسے باڑے کی باڑھ میں لگی ہوئی جھاڑیاں جانوروں کی آمد و رفت سے پامال ہو کر رہ گئی ہوں۔ نہ ان کے سنگین قصر انہیں اس آفت سے بچا سکے نہ پہاڑوں میں کھودے ہوئے غار۔[1]

اہلِ ایمان کو بچا لیا گیا

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ۔ (ہود۔ آیت ۶۶)

"آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے ان کو محفوظ رکھا۔"

جزیرہ نمائے سینا میں جو روایات مشہور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ثمود پر عذاب آیا تو حضرت صالح ہجرت کر کے وہاں چلے گئے تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ والے پہاڑ کے قریب ہی ایک پہاڑی کا نام نبی صالح ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہی جگہ آنجناب کی جائے قیام تھی۔ [292]

ثمود کا تمدنی عروج اور اس کے آثار

جس طرح عاد کے تمدن کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ اونچے اونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے، اسی طرح ثمود کے تمدن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت، جس کی بنا پر وہ قدیم زمانے کی قوموں میں مشہور تھے، یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے تھے۔ چنانچہ سورۂ فجر میں جس طرح عاد کو ذاتُ العماد (ستونوں والے) کا لقب دیا گیا ہے اسی طرح ثمود کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ "وہ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں"۔ اس کے علاوہ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے۔ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا۔ الاعراف۔ آیت ۷۴

اور ان کی تعمیرات کی غرض و غایت کیا تھی؟ قرآن اس پر لفظ فٰرِهِيْنَ سے روشنی ڈالتا ہے، یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی، اپنی دولت و قوت اور اپنے کمالاتِ فن کی نمائش کے لیے تھا، کوئی حقیقی ضرورت ان کے لیے داعی نہ تھی۔ ایک بگڑے ہوئے تمدن کی شان یہی ہوتی ہے۔ ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سر چھپانے تک کو ڈھنگ کی جگہ نہیں پاتے۔ دوسری طرف اُمراء اور اہلِ ثروت رہنے کے لیے جب ضرورت سے زیادہ محل بنا چکتے ہیں تو بلا ضرورت نمائشی یادگاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

ثمود کی ان عمارتوں میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں جنہیں دسمبر ۱۹۵۹ء میں میں نے خود دیکھا ہے۔ مقابل کے

---

[1] ملاحظہ ہو القمر، آیت ۳۱۔ الاعراف آیت ۷۸۔ الحجر، آیات ۸۳۔۸۴ (مؤلف)

العلاء کے پہاڑ

مدائنِ صالح کے پہاڑ
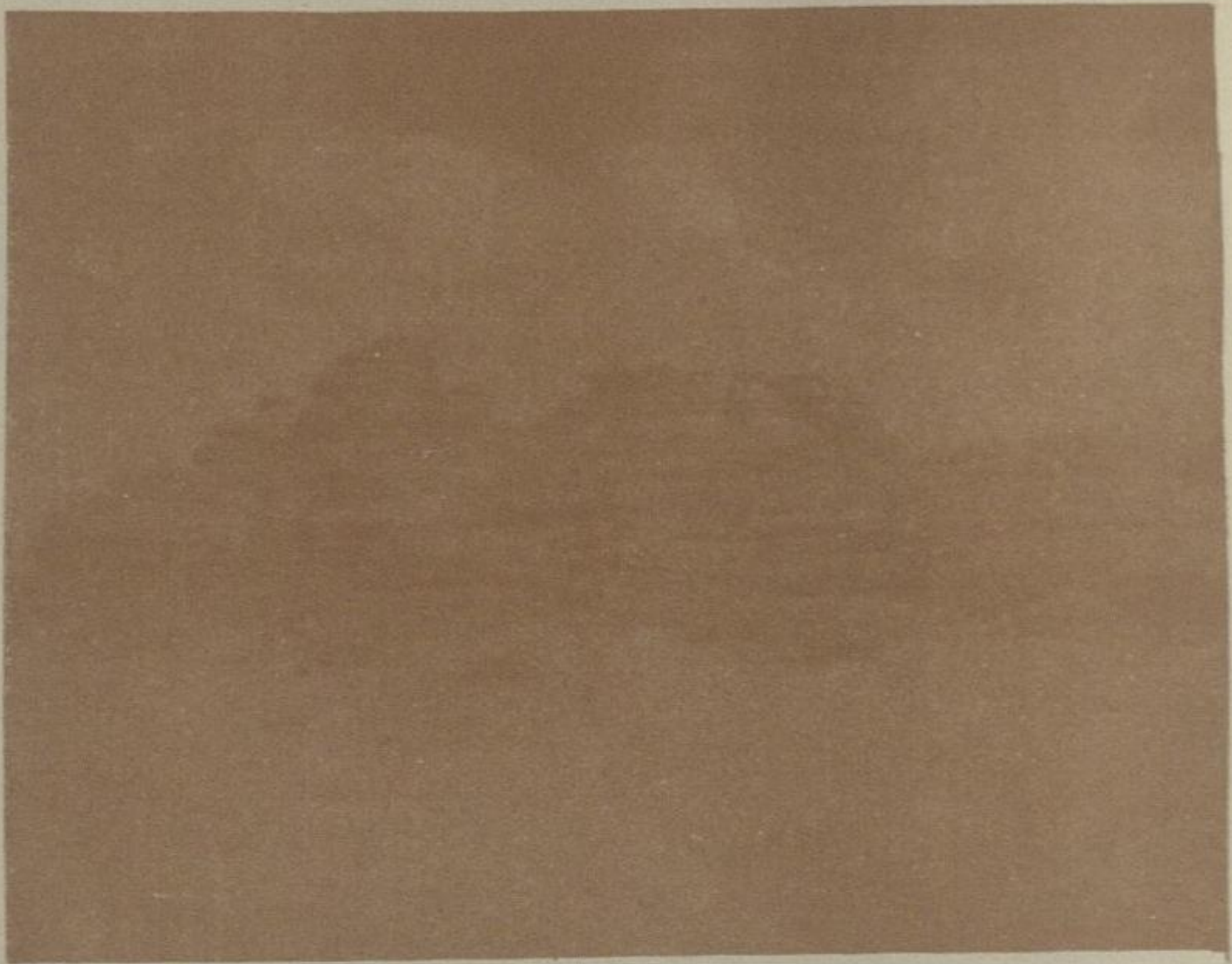
مدائنِ صالح کی ثمودی عمارات
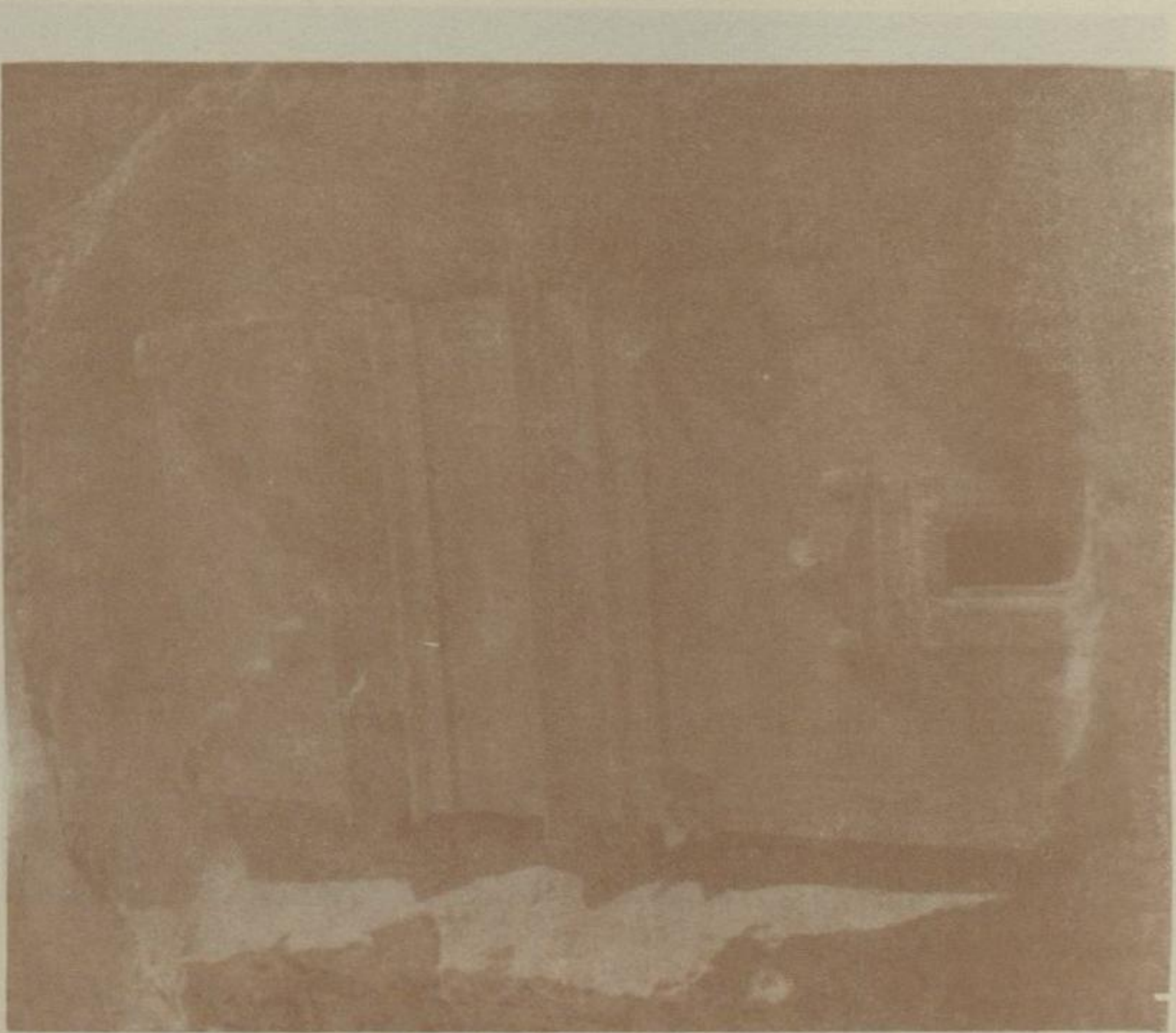
مدائنِ صالح کی ثمودی عمارات

مدائنِ صالح کی ایک ثمودی عمارت

مدائنِ صالح میں وُہ کنواں جس پر حضرت صالح علیہ السّلام کی اُونٹنی پانی پیتی تھی

مدین میں ثمودی طرز کی ایک عمارت

پٹرا میں ثمودی طرز کی ایک عمارت

پٹرا میں ثمودی طرز کی ایک عمارت
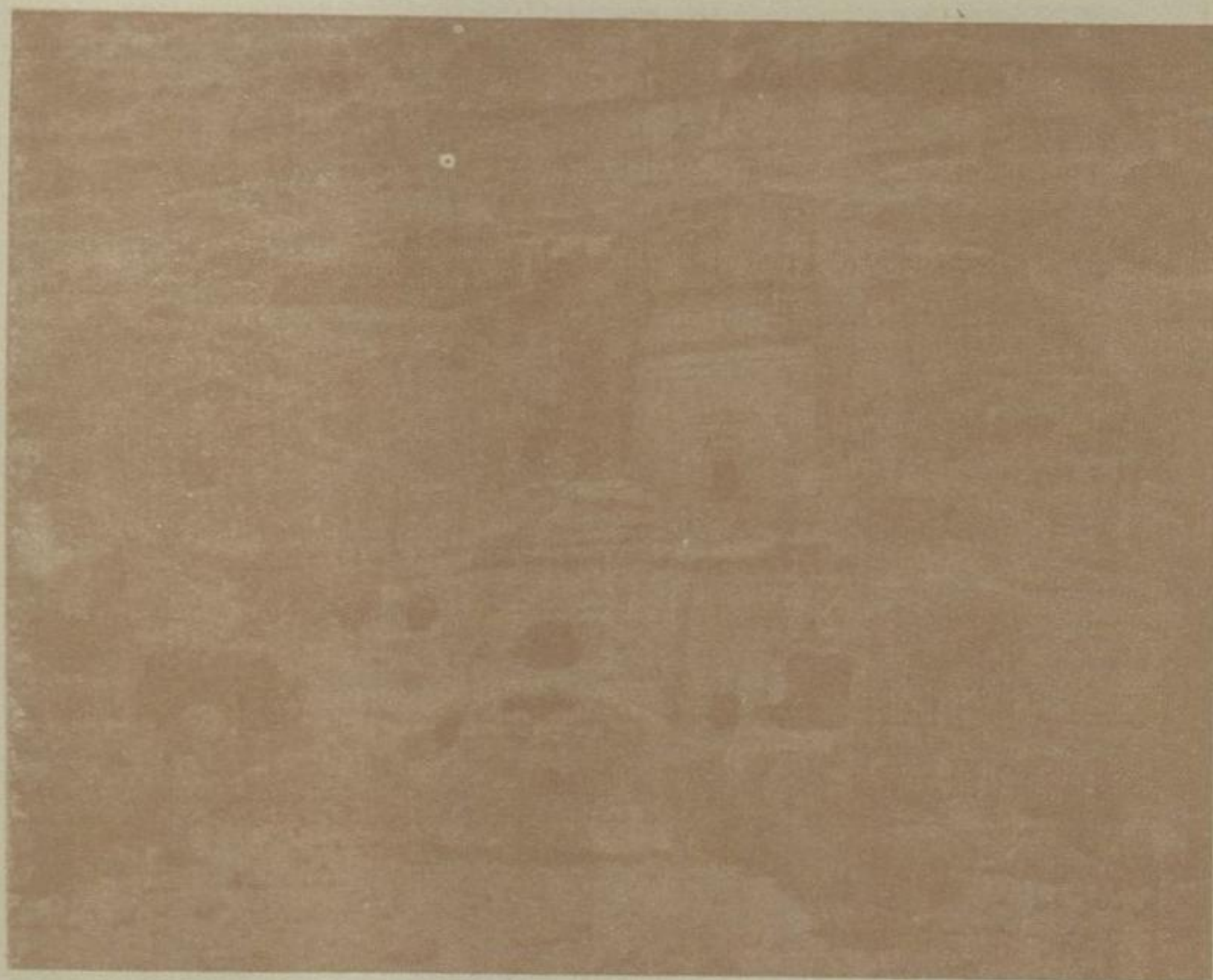
پٹرا میں نبطی طرز کی ایک عمارت
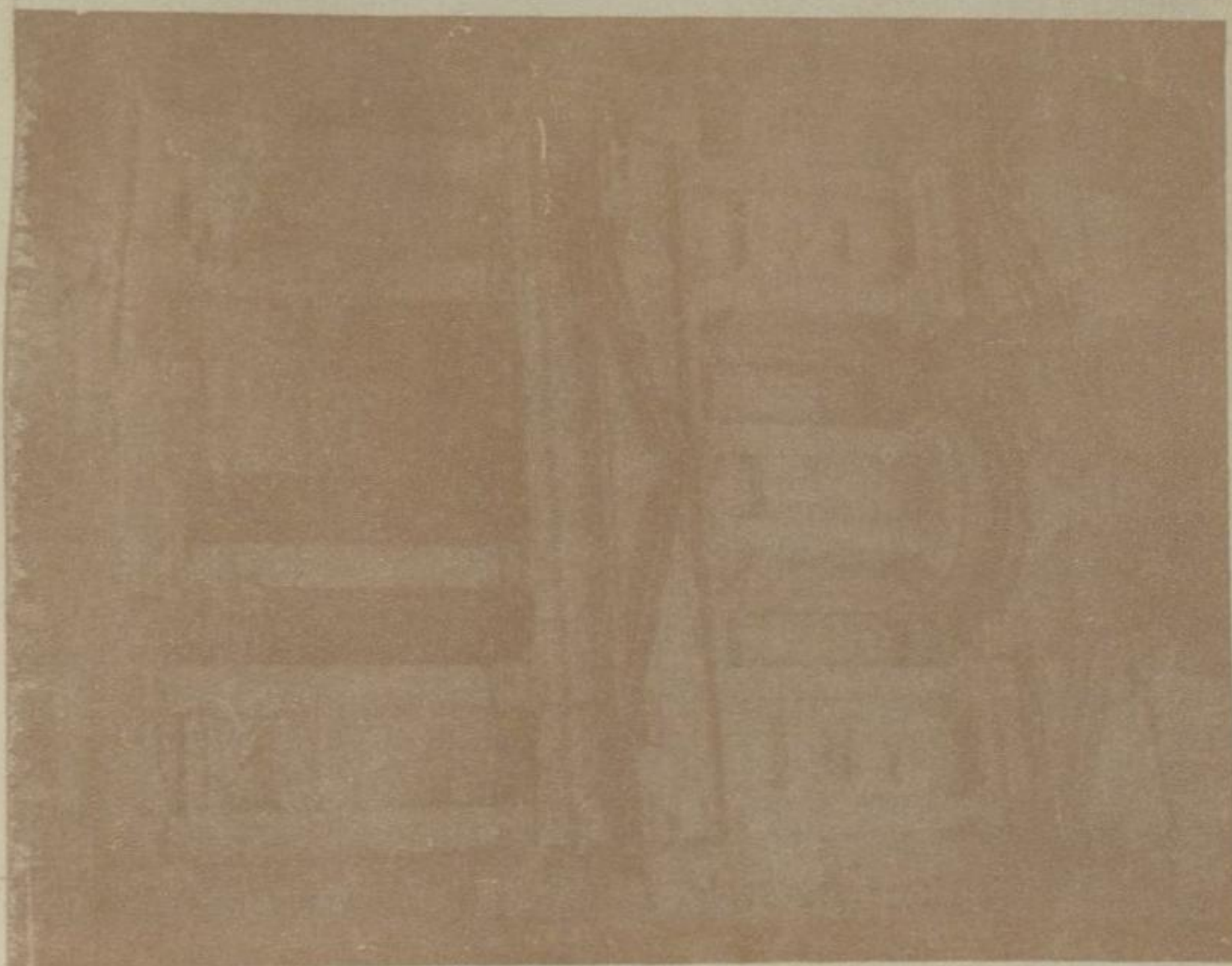
صفحات میں ان کی کچھ تصویریں دی جا رہی ہیں۔ یہ جگہ مدینہ طیبہ اور تبوک کے درمیان حجاز کے مشہور مقام العُلاء سے (جس کو عہدِ نبوی میں وادی القریٰ کہا جاتا تھا)، چند میل کے فاصلے پر بجانبِ شمال واقع ہے۔ آج بھی اس جگہ کو مقامی باشندے اَلحِجر اور مدائنِ صالحؑ کے ناموں ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اس علاقے میں العُلاء تو اب بھی ایک نہایت سرسبز و شاداب وادی ہے جس میں کثرت سے چشمے اور باغات ہیں۔ مگر اَلحِجر کے گرد و پیش بڑی نحوست پائی جاتی ہے۔ آبادی برائے نام ہے۔ روئیدگی بہت کم ہے۔ چند کنوئیں ہیں۔ انہی میں سے ایک کنوئیں کے متعلق مقامی آبادی میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی اُسی سے پانی پیتی تھی۔ اب وہ ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سی فوجی چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے (اس کی تصویر دی جا رہی ہے)۔ اِس علاقے میں جب ہم داخل ہوئے تو العُلاء کے قریب پہنچتے ہی ہر طرف ہمیں ایسے پہاڑ نظر آئے جو بالکل کِھیل کِھیل ہو گئے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انہیں سطحِ زمین سے چوٹی تک جھنجوڑ کر قاش قاش کر رکھا ہے (ان پہاڑوں کی بھی کچھ تصویریں مقابل کے صفحات پر دی جا رہی ہیں)۔ اسی طرح کے پہاڑ ہمیں مشرق کی طرف العُلاء سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً ۵۰ میل تک اور شمال کی طرف ریاست اُردُن کے حدود میں ۳۰-۴۰ میل اندر تک ملتے چلے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور ۱۰۰ میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک زلزلۂ عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ثمود کی جو عمارتیں ہم نے اَلحِجر میں دیکھی تھیں، اسی طرح کی چند عمارتیں ہم کو خلیج عَقَبہ کے کنارے مَدیَن کے مقام پر اور اُردن کی ریاست میں پٹرا (Petra) کے مقام پر بھی ملیں۔ خصوصیت کے ساتھ پٹرا میں ثمودی عمارات اور نَبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور ان کی تراش خراش اور طرزِ تعمیر میں اتنا نمایاں فرق ہے کہ ہر شخص ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ دونوں نہ ایک زمانے کی ہیں اور نہ یہ ایک ہی قوم کا طرزِ تعمیر ہے۔

انگریز مستشرق ڈاٹی (Daughty) قرآن کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے اَلحِجر کی عمارات کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ثمود کی نہیں بلکہ نَبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات ہیں۔ لیکن دونوں کی عمارات کا فرق اس قدر واضح ہے کہ ایک اندھا ہی اُنہیں ایک قوم کی عمارات کہہ سکتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پہاڑ تراش کر ان کے اندر عمارتیں بنانے کا فن ثمود سے شروع ہوا، اس کے ہزاروں سال بعد نَبطیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبل مسیحؑ میں اسے عُروج پر پہنچایا اور پھر الورا میں (جس کے غار پٹرا سے تقریباً سات سو برس بعد کے ہیں) یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔[۲۹۳]

فصل ۵

قومِ ابراہیم علیہ السّلام

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انہوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستانِ عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں اپنے خلیفہ مقرر کیے۔ شرقِ اُردن میں اپنے بھتیجے حضرت لُوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو اور اندرونِ عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکّے میں وہ گھر تعمیر کیا جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اِس مشن کا مرکز قرار پایا۔ ۲۹۴

مولدِ ابراہیم علیہ السّلام

جدید اثری تحقیقات کے سلسلہ میں نہ صرف وہ شہر دریافت ہو گیا ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے، بلکہ دورِ ابراہیمیؑ میں اس علاقے کے لوگوں کی جو حالت تھی اس پر بھی بہت کچھ روشنی پڑی ہے۔ سر لیونارڈ وولی (Sir Leonard Woolley) نے اپنی کتاب ("Abraham," London, 1935) میں اس تحقیقات کے جو نتائج شائع کیے ہیں اُن کا خلاصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

شہرِ اُر کے متعلق تاریخی و تمدّنی معلومات

اندازہ کیا گیا ہے کہ ۲۱۰۰ قبل مسیحؑ کے لگ بھگ زمانہ میں، جسے اب عام طور پر محققین حضرت ابراہیمؑ کے ظہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں، شہرِ اُر کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی اور بعید نہیں کہ پانچ لاکھ ہو۔ بڑا صنعتی و تجارتی مرکز تھا۔ ایک طرف پامیر اور نیلگری تک سے وہاں مال آتا تھا اور دوسری طرف اناطولیہ تک سے اس کے تجارتی تعلقات تھے۔ جس ریاست کا یہ صدر مقام تھا اس کے حُدود موجودہ حکومتِ عراق سے شمال میں کچھ کم اور مغرب میں کچھ زیادہ تھے۔ ملک کی آبادی بیشتر صنعت و تجارت پیشہ تھی۔ اس عہد کی جو تحریرات آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں میں دستیاب ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطۂ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دولت

کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصدِ حیات تھا۔ سُود خواری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ سخت کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور آپس میں بہت مقدمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اپنے خداؤں سے ان کی دعائیں زیادہ تر درازیٔ عمر، خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی۔

(۱) عَمیلو۔ یہ اُونچے طبقے کے لوگ تھے، جن میں پُجاری، حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔

(۲) مِشکینو۔ یہ تُجّار، اہلِ صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔

(۳) اَردو۔ یعنی غلام

ان میں سے پہلے طبقہ، یعنی عَمیلو کو خاص امتیازات حاصل تھے۔ ان کے فوجداری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے اور ان کی جان و مال کی قیمت دوسروں سے بڑھ کر تھی۔

یہ شہر اور یہ معاشرہ تھا جس میں حضرت ابراہیمؑ نے آنکھیں کھولیں۔ ان کا اور ان کے خاندان کا جو حال ہمیں تلمُود میں ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عَمیلو طبقہ کے ایک فرد تھے اور ان کا باپ ریاست کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا (نمرُود کے ہاں سلطنت کے سب سے بڑے عہدے (Chief Officer of the State) کا منصب رکھتا تھا)۔

صنمیات، معابد اور مذہبی مراسم

اُر کے کتبات میں تقریباً ۵ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ خدا ہوتا تھا جو ربُّ البَلَد، مہادیو یا رئیس الآلہہ سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبُودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ اُر کا ربُّ البَلَد "نَنّار" (چاند دیوتا) تھا اور اسی مناسبت سے بعد کے لوگوں نے اِس شہر کا نام "قمرینہ" بھی لکھا ہے۔ دوسرا بڑا شہر لَرسَہ تھا جو بعد میں اُر کے بجائے مرکزِ سلطنت ہوا۔ اس کا ربّ البَلَد "شماش" (سُورج دیوتا) تھا۔ ان بڑے خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کیے گئے تھے اور لوگ اپنی مختلف فروعی ضروریات اُن سے متعلق سمجھتے تھے۔ اِن آسمانی اور زمینی دیوتاؤں کی شبیہیں بُتوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں اور تمام مراسمِ عبادت انہی کے آگے بجا لائے جاتے تھے۔ "نَنّار" کا بُت اُر میں سب سے اُونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اسی کے قریب "نَنّار" کی بیوی "نِن گل" کا معبد تھا۔ نَنّار کے مَعبد کی شان ایک شاہی محل کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ایک پُجارن جا کر اس کی دُلہن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں (Religious Prostitutes) کی سی تھی۔

وہ عورت بڑی معزز خیال کی جاتی تھی جو "خدا" کے نام پر اپنی بکارت قربان کر دے۔ کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو "راہِ خدا" میں کسی اجنبی کے حوالہ کرنا عورت کے لیے ذریعۂ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں کہ اِس مذہبی قحبہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پُجاری حضرات ہی ہوتے تھے۔

"نَنّار" دیوتا کا مقام

نَنّار محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ ملک کا سب سے بڑا زمیندار، سب سے بڑا تاجر، سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغ، مکانات، اور زمینیں اس مندر کے لیے وقف تھیں اِس جائداد کی آمدنی کے علاوہ کسان، زمیندار، تجار سب ہر قسم کے غلّے، دُودھ، سونا، کپڑا اور دوسری چیزیں لا کر مندر میں نذر بھی کرتے تھے۔ تجارتی کاروبار بھی بہت بڑے پیمانے پر مندر کی طرف سے ہوتا تھا۔ یہ سب کام دیوتا کی نیابت میں پُجاری ہی انجام دیتے تھے۔ پھر ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی مندر ہی میں تھی۔ پُجاری اس کے جج تھے اور ان کے فیصلے "خدا" کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ خود شاہی خاندان کی حاکمیت بھی نَنّار ہی سے ماخوذ تھی۔ اصل بادشاہ نَنّار تھا اور فرمانروائے ملک اس کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ اس تعلق سے بادشاہ خود بھی معبودوں میں شامل ہو جاتا تھا اور خداؤں کے مانند اس کی پرستش کی جاتی تھی۔

نمرُودی سلطنت کا آغاز، عُروج اور خاتمہ

اُر کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں حکمران تھا اس کے بانیٔ اوّل کا نام اُرنَمُّو تھا جس نے ۲۳۰۰ برس قبل مسیح ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس کے حُدودِ مملکت مشرق میں سُوسَہ سے لے کر مغرب میں لُبنان تک پھیلے ہُوئے تھے۔ اسی سے اِس خاندان کو "نَمُّو" کا نام ملا جو عربی میں جا کر نمرود ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اس خاندان اور قوم پر مسلسل تباہی نازل ہونی شروع ہوئی پہلے عَیلامیوں نے اُر کو تباہ کیا اور نمرود کو نَنّار کے بُت سمیت پکڑ لے گئے۔ پھر لَرسَہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت اُر کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخر کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابل نے زور پکڑا اور لَرسَہ اور اُر دونوں اس کے زیرِ حکم ہو گئے۔ اِن تباہیوں نے نَنّار کے ساتھ اُر کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا کیونکہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

تعلیمِ ابراہیمی کے اثرات بعد کے اَدوار میں

تعیّن کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کے اَدوار میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کا اثر اِس ملک کے لوگوں نے کہاں تک قبول کیا۔ لیکن ۱۹۱۰ سنہ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ حمورابی (بائیبل کے اَمرافیل) نے جو قوانین مرتب کیے تھے وہ شہادت دیتے ہیں کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اُن کی تدوین میں مشکوٰۃِ نبوّت سے حاصل کی ہُوئی روشنی

کسی حد تک ضرور کارفرما تھی - اِن قوانین کا مفصّل کتبہ ۱۹۰۲ء بعدِ مسیحؑ میں ایک فرانسیسی مُفتّشِ آثارِ قدیمہ کو ملا اور اس کا انگریزی ترجمہ (C. H. W. Joho) نے ۱۹۰۳ء بعدِ مسیح میں (The Oldest Code of law) کے نام سے شائع کیا - اِس ضابطۂ قوانین کے بہت سے اصُول اور فروع موسوی شریعت سے مشابہت رکھتے ہیں -

مکمّل مُشرکانہ نظامِ تمدّن

یہ اب تک کی اثری تحقیقات کے نتائج اگر صحیح ہیں تو ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم میں شرک محض ایک مذہبی عقیدہ اور بُت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس قوم کی پُوری معاشی، تمدّنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام اسی عقیدے پر مبنی تھا - اس کے مقابلہ میں حضرت ابراہیمؑ توحید کی جو دعوت لے کر اُٹھے تھے اس کا اثر صرف بتوں کی پرستش ہی پر نہ پڑتا تھا بلکہ شاہی خاندان کی معبُودیت اور حاکمیت، پجاریوں اور اُونچے طبقوں کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی حیثیت، اور پُورے ملک کی اجتماعی زندگی اُس کی زد میں آئی جاتی تھی - ان کی دعوت کو قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ نیچے سے اُوپر تک ساری سوسائٹی کی عمارت اُدھیڑ ڈالی جائے اور اسے از سرِ نَو توحیدِ الٰہ کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے - اِسی لیے ابراہیم علیہ السّلام کی آواز بلند ہوتے ہی عوام اور خواص، پجاری اور نمرُود سب کے سب بیک وقت اس کو دبانے کے لیے کھڑے ہو گئے ۔[۲۹۵]

نمرُودی نظامِ شرک کا جائزہ

قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام مُشرک سوسائٹیوں کی یہ مُشترک خصوصیّت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ربُّ الارباب اور خدائے خدائیگاں کی حیثیت سے تو مانتے ہیں، مگر صرف اُسی کو رب اور تنہا اُسی کو خدا اور معبُود نہیں مانتے -

خُدائی کو مُشرکین نے ہمیشہ دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے - ایک فوق الفطری (Supernatural) خدائی جو سلسلۂ اسباب پر حکمران ہے اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مشکلات میں دستگیری کے لیے رجُوع کرتا ہے - اِس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اَرواح اور فرشتوں اور جنوں اور سیّاروں اور دوسری بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھیراتے ہیں، اُن سے دُعائیں مانگتے ہیں، ان کے سامنے مراسمِ پرستش بجا لاتے ہیں اور اُن کے آستانوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں - دوسری تمدّنی اور سیاسی معاملات کی خُدائی (یعنی حاکمیّت) جو قوانینِ حیات مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعتِ امر کی مستحق ہو، اور جسے دنیوی معاملات میں فرماں روائی کے مطلق اختیارات حاصل ہوں - اِس دوسری قسم کی خدائی کو دنیا کے تمام مشرکین نے قریب قریب ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب

کر کے، یا اس کے ساتھ شاہی خاندانوں اور مذہبی پروہتوں اور سوسائٹی کے اگلے پچھلے بڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اکثر شاہی خاندان اسی دوسرے معنی میں خدائی کے مدعی ہوتے ہیں۔ اور اسے مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے بالعموم پہلے معنی والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعوٰی کیا ہے اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریک سازش رہے ہیں۔

نمرود کا دعوائے خدائی بھی اسی دوسری قسم کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ اس کا دعوٰی یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبّر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسباب عالم کے پورے سلسلے پر اس کی حکومت چل رہی ہے۔ بلکہ اسے دعوٰی اس امر کا تھا کہ اس ملک عراق کا اور اس کے باشندوں کا حاکم مطلق میں ہوں، میری زبان قانون ہے، میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں، اور عراق کا ہر وہ باشندہ باغی و غدار ہے جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے یا میرے سوا کسی اور کو رب تسلیم کرے۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید کی سیاسی زد

ابراہیم علیہ السّلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین ہی کو خدا اور معبود اور رب مانتا ہوں، اور اس کے سوا سب کی خدائی اور ربوبیت کا قطعی طور پر منکر ہوں، تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہوا کہ قومی مذہب اور مذہبی معبودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابلِ برداشت ہے، بلکہ یہ سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا کہ قومی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس عقیدے کی جو زد پڑتی ہے اُسے کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جرمِ بغاوت کے الزام میں نمرود کے سامنے پیش کیے گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کا اتمامِ حجّت

اس وقت جب نمرود سے ابراہیم علیہ السّلام نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے"۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا "اچھا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا"۔ یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا۔

اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلے فقرے ہی سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، تاہم نمرود اس کا جواب ڈھٹائی سے دے گیا۔ لیکن دوسرے فقرے کے بعد اس کے لیے مزید ڈھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اسی خدا کے زیرِ فرمان ہیں، جس کو ابراہیمؑ نے رب مانا ہے پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا؟ مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی اس کو تسلیم کر لینے کے معنی اپنی مطلق العنان فرمانروائی سے دست بردار ہو جانے

کے تھے، جس کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھا۔ لہٰذا وہ صرف ششدر رہی ہو کر رہ گیا، خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا۔ اگر اس طاغوت کے بجائے اس نے خدا کو اپنا ولی و مددگار بنایا ہوتا، تو اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی اس تبلیغ کے بعد راہِ راست کھل جاتی۔

نارِ نمرود اور گلزارِ خلیلؑ

تلمود کا بیان ہے کہ اس کے بعد بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ قید کر دیئے گئے۔ دس روز تک وہ جیل میں رہے پھر بادشاہ کی کونسل نے ان کو زندہ جلا دینے کا فیصلہ کیا۔ ۲۹۶

قرآن مجید کی رو سے بھی انہوں نے واقعی اپنے اس فیصلے پر عمل کیا اور جب آگ کا الاؤ تیار کر کے انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو اس میں پھینکا[1] تب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی ہو جائے اور بے ضرر بن کر رہ جائے[2] ۲۹۷

قومِ ابراہیمؑ دنیا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا، اس میں سے اگر کسی کو بقا نصیب ہوا تو صرف ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مبارک فرزندوں (اسماعیلؑ و اسحاقؑ) کی اولاد ہی کو نصیب ہوا[3]۔ قرآن میں اگرچہ اُس عذاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے نکل جانے کے بعد ان کی قوم پر آیا، لیکن اس

---

[1] حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں پھینکے جانے کے واقعہ کے متعلق قرآن کے حسبِ ذیل مقامات دیکھنے چاہئیں:- الانبیاء، آیات ۶۸ تا ۷۰۔ العنکبوت ۲۴۔ الصّٰفّٰت: ۹۷-۹۸۔ (مرتبین)

[2] یہ بھی صریح طور پر ان معجزات میں سے ایک ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان معجزات کی اس لیے تاویلیں کرتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کے لیے بھی نظامِ عالم کے معمول (Routine) سے ہٹ کر کوئی غیر معمولی کام کرنا ممکن نہیں ہے تو آخر وہ خدا کو ماننے ہی کی زحمت کیوں اُٹھاتا ہے؟ اور اگر وہ اس طرح کی تاویلیں اس لیے کرتا ہے کہ جدید زمانے کے نام نہاد عقلیت پرست ایسی باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ بندۂ خدا تیرے اوپر یہ فرض کس نے عائد کیا تھا کہ تو کسی نہ کسی طرح انہیں منوا کر ہی چھوڑ؟ جو شخص قرآن کو، جیسا کہ وہ ہے، ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، اُسے اُس کے حال پر چھوڑو۔ اسے منوانے کی خاطر قرآن کو اس کے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا جبکہ قرآن کے الفاظ قدم قدم پر اس ڈھلائی کی مزاحمت کر رہے ہوں، آخر کس قسم کی تبلیغ ہے اور کون معقول آدمی اسے جائز سمجھ سکتا ہے؟ ۲۹۸

[3] بلکہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو مخاطب کر کے یہ اعلان فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرہ آیت ۱۲۴) لیعنی ہم نے تمہیں ساری انسانیت کی امامت کا منصب سونپا۔ چنانچہ آج دنیا کے تمام زندہ الہامی سلسلۂ مذاہب کے پیرو (مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور نصرانی) حضرت ابراہیمؑ سے یکساں وابستگی رکھتے ہیں۔ (مرتبین)

کا شمار مُعذَّب قوموں ہی میں کیا گیا ہے۔[1] ۲۹۹؎

بابل کے وہ حکمران اور پنڈت اور پروہت جنہوں نے ابراہیم علیہ السّلام کی دعوت کو نیچا دکھانا چاہا تھا اور اس کے وہ مُشرک باشندے جنہوں نے آنکھیں بند کرکے ان ظالموں کی پیروی کی تھی، وہ تو دنیا سے مٹ گئے اور ایسے مٹے کہ آج دُنیا میں کہیں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں، مگر وہ شخص جسے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے جُرم میں اُن لوگوں نے جلا کر خاک کر دینا چاہا تھا، اور جسے آخر کار بے سروسامانی کے عالم میں وطن سے نکل جانا پڑا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ سرفرازی عطا فرمائی کہ چار ہزار برس سے دنیا میں اس کا نام روشن ہے اور قیامت تک رہے گا۔ دنیا کے تمام مسلمان، عیسائی اور یہودی اس خلیل ربّ العٰلمین کو بالاتفاق اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ دنیا کو ان چالیس صدیوں میں جو کچھ بھی ہدایت کی روشنی میسّر آئی ہے اسی ایک انسان اور اس کی پاکیزہ اولاد کی بدولت میسّر آئی ہے۔ آخرت میں جو اجرِ عظیم اس کو ملے گا وہ تو ملے گا ہی، مگر اس دنیا میں بھی اس نے وہ عزت پائی جو حصولِ دُنیا کے پیچھے جان کھپانے والوں میں سے کسی کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔ ۳۰۰؎

تلمُود کا بیان

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اِس اہم واقعے کا بائیبل میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کے عراقی دَور کا کوئی واقعہ بھی اس کتاب میں جگہ نہیں پا سکا ہے۔ نمرُود سے ان کی مُڈبھیڑ، باپ اور قوم سے ان کی کش مکش، بُت پرستی کے خلاف ان کی جدّوجہد، آگ میں ڈالے جانے کا قصّہ اور بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا، ان میں سے ہر چیز بائیبل کی کتاب" پیدائش" کے مُصنّف کی نگاہ میں ناقابلِ التفات تھی۔ وہ صرف ان کی ہجرت کا ذکر کرتا ہے مگر وہ بھی اِس انداز سے کہ جیسے ایک خاندان تلاشِ معاش میں ایک ملک چھوڑ کر دُوسرے مُلک میں جا کر آباد ہو رہا ہے۔ قرآن اور بائیبل کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ اختلاف یہ ہے کہ قرآن کے بیان کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ کا مُشرک باپ اُن پر ظلم کرنے میں پیش پیش تھا، اور بائیبل کہتی ہے کہ ان کا باپ خود اپنے بیٹوں، پوتوں اور بہوؤں کو لے کر حاران میں جا بسا (پیدائش، باب ۱۱۔ آیات ۲۷ تا ۳۲)۔ اس کے بعد یکایک خدا حضرت ابراہیمؑ سے کہتا ہے کہ تو حاران کو چھوڑ کر کنعان میں جا کر بس جا اور "میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا، سو تو باعثِ برکت ہو، جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اُس پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے" (پیدائش، باب ۱۲ آیت ۱-۳)۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک حضرت ابراہیمؑ پر یہ نظرِ عنایت کیوں ہو گئی۔

---

[1] اَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ (التوبہ آیت)

تلمود میں البتہ سیرت ابراہیمؑ کے عراقی دور کی وہ بیشتر تفصیلات ملتی ہیں جو قرآن کے مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہیں، مگر دونوں کا تقابل کرنے سے نہ صرف یہ کہ قصے کے اہم اجزاء میں بیّن تفاوت نظر آتا ہے، بلکہ ایک شخص صریح طور پر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تلمود کا بیان بکثرت بے جوڑ اور خلافِ قیاس باتوں سے بھرا پڑا ہے اور اس کے برعکس قرآن بالکل منقح صورت میں حضرت ابراہیمؑ کے اہم واقعاتِ زندگی کو پیش کرتا ہے جن میں کوئی لغویات آنے نہیں پائی ہے۔ توضیحِ مدعا کے لیے ہم یہاں تلمود کی داستان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کی غلطی پوری طرح کھل جائے جو قرآن کو بائیبل اور یہودی لٹریچر کا خوشہ چین قرار دیتے ہیں۔

تلمود کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش کے روز نجومیوں نے آسمان پر ایک علامت دیکھ کر نمرود کو مشورہ دیا تھا کہ تارح کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے اسے قتل کر دے۔ چنانچہ وہ ان کے قتل کے درپے ہوا۔ مگر تارح نے اپنے ایک غلام کا بچہ ان کے بدلے میں دے کر انہیں بچا لیا۔ اس کے بعد تارح نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک غار میں لے جا کر چھپا دیا جہاں ۱۰ سال تک وہ رہے۔ گیارھویں سال حضرت ابراہیمؑ کو تارح نے حضرت نوحؑ کے پاس پہنچا دیا اور ۳۹ سال تک وہ حضرت نوحؑ اور اُن کے بیٹے سام کی تربیت میں رہے۔ اسی زمانے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی سگی بھتیجی سارہ سے نکاح کر لیا جو عمر میں ان سے ۴۲ سال چھوٹی تھیں (بائیبل اس کی تصریح نہیں کرتی کہ سارہ حضرت ابراہیمؑ کی بھتیجی تھیں۔ نیز وہ دونوں کے درمیان عمر کا فرق صرف دس سال بتاتی ہے (پیدائش، باب ۱۱، آیت ۲۹- اور باب ۱۷- آیت ۱۷)

پھر تلمود کہتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پچاس سال کی عمر میں حضرت نوحؑ کا گھر چھوڑ کر اپنے باپ کے ہاں آگئے۔ یہاں انہوں نے دیکھا کہ باپ بُت پرست ہے اور گھر میں سال کے بارہ مہینوں کے حساب سے ۱۲ بُت رکھے ہیں۔ انہوں نے پہلے تو باپ کو سمجھانے کی کوشش کی، اور جب اس کی سمجھ میں بات نہ آئی تو ایک روز موقع پا کر اس گھریلو بُت خانے کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ تارح نے آکر اپنے خداؤں کا یہ حال جو دیکھا تو سیدھا نمرود کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ ۵۰ برس پہلے میرے ہاں جو لڑکا پیدا ہوا تھا آج اس نے میرے گھر میں یہ حرکت کی ہے آپ اس کا فیصلہ کیجیے۔ نمرود نے بُلا کر حضرت ابراہیمؑ سے باز پُرس کی۔ اُنھوں نے سخت جوابات دیئے۔ نمرود نے ان کو تو فوراً جیل بھیج دیا اور پھر معاملہ اپنی کونسل میں پیش کیا تاکہ صلاح مشورے سے اس مقدمے کا فیصلہ کیا جائے۔ کونسل کے ارکان نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ آگ کا ایک بڑا الاؤ تیار کرایا گیا اور حضرت ابراہیمؑ اس میں پھینک دیئے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کے بھائی اور خسر حاران کو بھی پھینکا گیا، کیونکہ نمرود نے تارح سے جب پوچھا کہ تیرے اس بیٹے کو تو میں پیدائش ہی کے روز قتل کرنا چاہتا تھا، تو نے اس وقت اسے بچا کر دوسرا بچہ کیوں اس کے بدلے قتل کرایا، تو اس نے کہا

کہ میں نے حاران کے کہنے سے یہ حرکت کی تھی، اِس لیے خود اس فعل کے مُرتکب کو تو چھوڑ دیا گیا اور مشورہ دینے والے کو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ آگ میں پھینکا گیا۔ آگ میں گرتے ہی حاران فوراً جل بھُن کر کوئلہ ہو گیا مگر حضرت ابراہیمؑ کو لوگوں نے دیکھا کہ اندر اطمینان سے ٹہل رہے ہیں۔ نمرُود کو اس معاملے کی اطلاع دی گئی۔ اس نے آکر جب خود اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھ لیا تو پکار کر کہا "آسمانی خدا کے بندے، آگ سے نکل آ اور میرے سامنے کھڑا ہو جا"۔

حضرت ابراہیمؑ باہر آگئے۔ نمرُود ان کا معتقد ہو گیا اور اس نے بہت سے قیمتی نذرانے ان کو دے کر رُخصت کر دیا۔

اس کے بعد تلمُود کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ دو سال تک وہاں رہے۔ پھر نمرُود نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا اور اس کے نجومیوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ ابراہیمؑ تیری سلطنت کی تباہی کا مُوجب بنے گا، اسے قتل کرا دے۔ اس نے ان کے قتل کے لیے آدمی بھیجے، مگر حضرت ابراہیمؑ کو خود نمرُود ہی کے عطا کیے ہوئے غلام الیعزر نے قبل از وقت اس منصُوبے کی اِطّلاع دے دی اور حضرت ابراہیمؑ نے بھاگ کر حضرت نوحؑ کے ہاں پناہ لی۔ وہاں تارح آکر اُن سے خُفیہ طور پر ملتا رہا اور آخر باپ بیٹوں کی یہ صلاح ہوئی کہ مُلک چھوڑ دیا جائے۔ حضرت نوحؑ اور سام نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ تارح اپنے بیٹے ابراہیمؑ اور پوتے لوطؑ اور پوتی اور بہو سارہ کو لے کر اُر سے حاران چلا گیا۔ (منتخباتِ تلمُود از ایچ پولانو لندن صفحہ ۳۰ تا ۴۲)

کیا اس داستان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ یہ قرآن کا ماخذ ہو سکتی ہے؟[۱۰۳]

فصل ٦

قومِ لوطؑ

بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے دو بھائی تھے۔ نخور اور حاران حضرت لوطؑ حاران کے بیٹے تھے (پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۶)۔ سورۂ عنکبوت آیت ۲۶ میں حضرت ابراہیمؑ کا جو تذکرہ آیا ہے اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم میں سے صرف ایک حضرت لوطؑ ہی ان پر ایمان لائے تھے[۳۰۲]

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام، فلسطین و مصر میں گشت لگا کر دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے۔ پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے جو قومِ لوطؑ کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ اہلِ سدوم کو اُن کی قوم اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ شاید ان کا رشتہ داری کا تعلق اس قوم سے ہوگا۔

قوم لوطؑ کا علاقہ

یہ قوم اُس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج کل شرقِ اُردن (Trans Jordan) کہا جاتا ہے اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اِس قوم کے صدر مقام "سدوم" بتایا گیا ہے جو بحیرۂ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا۔ تلمود میں لکھا ہے کہ سدوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے اور ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہونے لگتی تھی۔ مگر آج اِس قوم کا نام و نشان دُنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرۂ مردار (Dead Sea) ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے جسے آج تک بحرِ لوط کہا جاتا ہے[۱] ۔[۳۰۳]

---

[۱] یہودیوں کی تحریف کردہ بائیبل میں حضرت لوطؑ کی سیرت پر جہاں اور بہت سے سیاہ دھبے لگائے گئے ہیں وہاں ایک دھبہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ سے لڑ کر سدوم کے علاقے میں چلے گئے تھے (پیدائش، باب ۱۳، آیت ۱-۱۲)۔ مگر قرآن اس غلط بیانی کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے اُنہیں رسول بنا کر اُس قوم کی طرف بھیجا تھا۔[۳۰۴]

حجاز سے شام اور عراق سے مصر جاتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستے میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے اُن آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پورے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ بحرِ لوط (بحرِ مُردار) کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے جنوبی حصّے کے متعلق جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ یہاں اس درجہ ویرانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔[305]

قومِ لُوطؑ کا بگاڑ

(۱) اَتَاْتُوْنَ الذُّکْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَکُمْ رَبُّکُمْ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ۔

(الشعراء۔ آیت ۱۶۶)

کیا تم دُنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اُسے چھوڑ دیتے ہو بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے۔

(۲) اِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَکُمْ بِھَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۔ (العنکبوت آیت ۲۸)

کیا تم وہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جو دنیا کی مخلوق میں سے کسی نے تم سے پہلے نہیں کیا۔

(۳) اَئِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ وَ تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ۔

(العنکبوت۔ آیت ۲۹)

کیا تمہارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بُرے کام کرتے ہو۔

یعنی ان سے شہوت رانی کرتے ہو، جیسا کہ سُورۃ اعراف میں ہے اِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَھْوَۃً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ۔ تم خواہشِ نفس پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو (اور اُوپر سے غضب یہ ہے کہ یہ) فحش کام چُھپ کر بھی نہیں کرتے بلکہ علانیہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ یہی بات سُورۃ نمل میں فرمائی ہے اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔ کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے فحش کاری کرتے ہو۔[306]

وہ قابلِ نفرت فعل جس کی بدولت قومِ لُوطؑ نے شہرتِ دوام حاصل کی ہے، اس کے ارتکاب سے تو بدکردار انسان کبھی باز نہیں آتے، لیکن یہ فخر صرف یُونان کو حاصل ہے کہ اس کے فلاسفہ نے اس گھناؤنے جرم کو اخلاقی خوبی کے مرتبے تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی اُسے موجودہ یورپ اور امریکہ نے پورا کیا کہ علانیہ اس کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا گیا یہاں تک کہ ایک ملک (جرمنی) کی پارلیمنٹ نے اسے باقاعدہ جائز ٹھہرا دیا (اور بعض اور مغربی ممالک میں بھی اب اسے قانوناً جائز کر دیا گیا ہے ——— حالانکہ یہ بالکل ایک صریح حقیقت ہے کہ مباشرتِ ہم جنس قطعی طور پر وضعِ فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ذی حیات

انواع میں نر و مادہ کا فرق محض تناسُل اور بقائے نوع کے لیے رکھا ہے اور نوعِ انسانی کے اندر اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل کر ایک خاندان وجود میں لائیں اور اس سے تمدّن کی بنیاد پڑے۔ اِسی مقصد کے لیے مرد اور عورت دو الگ صنفیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پیدا کی گئی ہے۔ ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصدِ زوجیت کے لیے عین مناسب بنائی گئی ہے۔ اور ان کے جذب و انجذاب میں وہ لذّت رکھی گئی ہے جو فطرت کے منشا کو پُورا کرنے کے لیے بیک وقت داعی و محرّک بھی ہے اور اِس خدمت کا صلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس اسکیم کے خلاف عمل کر کے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذّت حاصل کرتا ہے وہ ایک ہی وقت میں متعدد جرائم کا مُرتکب ہوتا ہے۔ اوّلاً وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اس میں خللِ عظیم برپا کر دیتا ہے جس سے دونوں کے جسم، نفس اور اخلاق پر نہایت بُرے اثرات مترتّب ہوتے ہیں۔ ثانیاً وہ فطرت کے ساتھ غدّاری اور خیانت کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ فطرت نے جس لذّت کو نوع اور تمدُّن کی خدمت کا صلہ بنایا تھا، اور جس کے حُصُول کو فرائض اور ذمہ داریوں اور حقوق کے ساتھ وابستہ کیا تھا، وہ اسے کسی خدمت کی بجا آوری اور کسی فرض اور حق کی ادائیگی اور کسی ذمہ داری کے التزام کے بغیر چُرا لیتا ہے۔ ثالثاً، وہ انسانی اجتماع کے ساتھ کھُلی بددیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے قائم کیے ہوئے تمدنی اداروں سے فائدہ تو اُٹھا لیتا ہے، مگر جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے بجائے اپنی قوّتوں کو پُوری خود غرضی کے ساتھ ایسے طریقہ پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدّن و اخلاق کے لیے صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ایجاباً مضرّت رساں ہے۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور خاندان کی خدمت کے لیے نااہل بناتا ہے، اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا کرتا ہے۔ اور کم از کم دو عورتوں کے لیے بھی صنفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کے دروازے کھول دیتا ہے۔[۳۰۷]

(۴) وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۝ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۭ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۭ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ	اور جب ہمارے فرشتے لُوطؑ کے پاس پہنچے تو اُن کی آمد سے وہ بہت گھبرایا اور دل تنگ ہُوا اور کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔ (اِن مہمانوں کا آنا تھا کہ) اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف دَوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خُوگر تھے۔ لُوطؑ نے اُن سے کہا بھائیو، یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر

مَالَنَا فِیْ بَنٰتِکَ مِنْ حَقٍّ وَ اِنَّکَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ۔ (ہُود۔ آیات ۷۷، تا ۷۹) ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟" انہوں نے جواب دیا" تجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔"

اس قصّے کی جو تفصیلات قرآن مجید میں بیان ہوتی ہیں ان کے فحوائے کلام سے یہ بات صاف مترشح ہوتی ہے کہ یہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے ہاں پہنچے تھے اور حضرت لوطؑ اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ فرشتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان مہمانوں کی آمد سے آپ کو سخت پریشانی و دل تنگی لاحق ہوئی۔ اپنی قوم کو جانتے تھے کہ وہ کیسی بدکردار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ حضرت لوطؑ کا اشارہ قوم کی لڑکیوں کی طرف ہو کیونکہ نبی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے اور قوم کی لڑکیاں اس کی نگاہ میں اپنی بیٹیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کا اشارہ خود اپنی صاحبزادیوں کی طرف ہو۔ بہر حال دونوں صورتوں میں یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ حضرت لوطؑ نے اُن سے زنا کرنے کے لیے کہا ہو گا۔ "یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہیں" کا فقرہ ایسا غلط مفہوم لینے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ حضرت لوطؑ کا منشا صاف طور پر یہ تھا کہ اپنی شہوتِ نفس کو اس فطری اور جائز طریقے سے پورا کرو جو اللہ نے مقرر کیا ہے اور اس کے لیے عورتوں کی کمی نہیں ہے۔

یہ فقرہ (وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ) ان لوگوں کے نفس کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے کہ وہ خباثت میں کس قدر ڈوب گئے تھے۔ بات صرف اس حد تک ہی نہیں تھی کہ وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ سے ہٹ کر ایک گندی خلافِ فطرت راہ پر چل پڑے تھے، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اب اسی گندی راہ ہی میں تھی۔ ان کے نفس میں اب طلب اُس گندگی ہی کی رہ گئی تھی اور وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے کہ یہ راستہ تو ہمارے لیے بنا ہی نہیں ہے۔ یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے بگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے جس سے فروتر کسی مرتبے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اِس شخص کا معاملہ تو بہت ہلکا ہے جو محض نفس کی کمزوری کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو جاتا ہو مگر حلال کو چاہنے کے قابل اور حرام کو بچنے کے قابل چیز سمجھتا ہو۔ ایسا شخص کبھی سُدھر بھی سکتا ہے، اور نہ سُدھرے تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بگڑا ہوا انسان ہے۔ مگر جب کسی شخص کی ساری رغبت صرف حرام ہی میں ہو اور وہ سمجھے کہ حلال اس کے لیے ہے ہی نہیں تو اس کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دراصل ایک گندا کیڑا ہے جو غلاظت ہی میں پرورش پاتا ہے اور طیبات سے اس کے مزاج کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ ایسے کیڑے اگر کسی صفائی پسند

انسان کے گھر میں پیدا ہو جائیں تو وہ پہلی فرصت میں فینائل ڈال کر ان کے وجود سے اپنے گھر کو پاک کر دیتا ہے۔ پھر بھلا خدا اپنی زمین پر ان گندے کیڑوں کے اجتماع کو کب تک گوارا کر سکتا تھا۔ ۳۰۹

(۵) وَجَاۗءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۔ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۔ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۔ قَالَ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۔

(الحجر۔ آیات ۶۷ تا ۷۱)

اتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بیتاب ہو کر لوطؑ کے گھر چڑھ آئے۔ لوطؑ نے کہا "بھائیو، یہ میرے مہمان ہیں، میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو، مجھے رسوا نہ کرو۔" وہ بولے "کیا ہم بارہا تمہیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو؟" لوطؑ نے عاجز ہو کر کہا "اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں۔"

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کی بد اخلاقی کس حد کو پہنچ چکی تھی۔ بستی کے ایک شخص کے ہاں چند خوبصورت مہمانوں کا آجانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ اس کے گھر پر اوباشوں کا ایک ہجوم اُمنڈ آئے اور علانیہ وہ اس سے مطالبہ کریں کہ اپنے مہمانوں کو بدکاری کے لیے ہمارے حوالے کر دے۔ ان کی پوری آبادی میں کوئی ایسا عنصر باقی نہ رہا تھا جو ان حرکات کے خلاف آواز اُٹھاتا، اور نہ ان کی قوم میں کوئی اخلاقی حس باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو علی الاعلان یہ زیادتیاں کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس ہوتی۔ حضرت لوطؑ جیسے مقدس انسان اور معلم اخلاق کے گھر پر بھی جب بدمعاشوں کا حملہ اس بے باکی کے ساتھ ہو سکتا تھا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عام انسانوں کے ساتھ ان بستیوں میں کیا کچھ ہو رہا ہوگا۔ ۳۰۹

تلمود کا بیان

تلمود میں اس قوم کے جو حالات لکھے ہیں ان کا خلاصہ ہم یہاں دیتے ہیں جن سے کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگا کہ یہ قوم اخلاقی فساد کی کس انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عیلامی مسافر ان کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ راستہ میں شام ہو گئی اور اسے مجبوراً ان کے شہر سدوم میں ٹھیرنا پڑا۔ اس کے ساتھ اپنا زادِ راہ تھا۔ کسی سے اُس نے میزبانی کی درخواست نہ کی۔ بس ایک درخت کے نیچے اُتر گیا۔ مگر ایک سدومی اصرار کے ساتھ اُٹھا کر اسے اپنے گھر لے گیا۔ رات اسے اپنے ہاں رکھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کا گدھا اُس کے زین اور مالِ تجارت سمیت اُڑا دیا۔ اُس نے شور مچایا، مگر کسی نے اس کی فریاد نہ سُنی، بلکہ بستی کے لوگوں نے اس کا رہا سہا مال بھی لوٹ کر اُسے نکال باہر کیا۔

ایک مرتبہ حضرت سارہ (حضرت ابراہیمؑ کی بیوی) نے حضرت لوطؑ کے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے

کے لیے اپنے غلام اِلیعزر کو سدُوم بھیجا۔ اِلیعزر جب شہر میں داخل ہُوا تو اُس نے دیکھا کہ ایک سدومی ایک اجنبی کو مار رہا ہے۔ اِلیعزر نے اسے شرم دلائی کہ تم بیکس مسافروں سے یہ سلوک کرتے ہو۔ مگر جواب میں سرِ بازار الیعزر کا سر پھاڑ دیا گیا۔

ایک مرتبہ ایک غریب آدمی کہیں سے ان کے شہر میں آیا اور کسی نے اسے کھانے کو کچھ نہ دیا۔ وہ فاقے سے بدحال ہو کر ایک جگہ گرا پڑا تھا کہ حضرت لُوطؑ کی بیٹی نے اسے دیکھ لیا اور اس کے لیے کھانا پہنچایا۔ اس پر حضرت لُوطؑ اور ان کی بیٹی کو سخت ملامت کی گئی اور اُنہیں دھمکیاں دی گئیں کہ ان حرکتوں کے ساتھ تم لوگ ہماری بستی میں نہیں رہ سکتے۔

اس طرح کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد تلمود کا مُصنّف لکھتا ہے کہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں یہ لوگ سخت ظالم، دھوکہ باز اور بدمعاملہ تھے۔ کوئی مسافر ان کے علاقے سے بخیریت نہ گزر سکتا تھا۔ کوئی غریب ان کی بستیوں سے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ پا سکتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مر جاتا اور یہ اس کے کپڑے اُتار کر اس کی لاش کو برہنہ دفن کر دیتے۔ بیرونی تاجر اگر شامت کے مارے وہاں چلے جاتے تو برسرِ عام لُوٹ لیے جاتے اور ان کی فریاد کو ٹھٹھوں میں اُڑا دیا جاتا۔ اپنی وادی کو انہوں نے ایک باغ بنا رکھا تھا جس کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہُوا تھا۔ اِس باغ میں وہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ علانیہ بدکاریاں کرتے تھے اور ایک لُوطؑ کی زبان کے سوا کوئی زبان ان کو ٹوکنے والی نہ تھی۔

قرآن کا ایجازِ بیان

قرآن مجید میں اِس ساری داستان کو صرف دو فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے کہ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ (وہ پہلے سے بہت بُرے بُرے کام کر رہے تھے)۔ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ۔ (تم مردوں سے خواہشِ نفس پُوری کرتے ہو، مسافروں کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں کُھلّم کُھلّا بدکاریاں کرتے ہو)۔ ۳۱۰

نبی کی دعوت پر ردِّ عمل

حضرت لُوطؑ نے جب آیاتِ ماسبق کے مطابق دعوتِ اصلاح دی تو ان کی قوم نے بپھر کر ان سے کہا کہ:-

لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا لُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ۔ (الشعراء - ۱۶۷)

"اے لُوطؑ، اگر تو اِن باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں ان میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا۔"

یعنی تجھے معلوم ہے کہ اس سے پہلے جس نے بھی ہمارے خلاف زبان کھولی ہے یا ہماری حرکتوں پر احتجاج کیا ہے

یا ہماری مرضی کے خلاف کام کیا ہے۔ وہ ہماری بستیوں سے نکالا گیا ہے۔ اب اگر تو یہ باتیں کرے گا تو تیرا حشر بھی ایسا ہی ہو گا۔

سُورۂ اعراف اور سُورۂ نمل میں بیان ہُوا ہے کہ حضرت لُوطؑ کو یہ نوٹس دینے سے پہلے اس شریر قوم کے لوگ آپس میں یہ طے کر چکے تھے کہ اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ۔ یعنی لُوطؑ اور اس کے خاندان والوں اور ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں، اِن صالحین کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔"[۳۱۱]

فرشتوں کی آمد

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ۔ (العنکبوت - ۳۱)	"اور جب ہمارے فرستادے ابراہیمؑ کے پاس بشارت لے کر پہنچے تو انہوں نے اس سے کہا ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں اس کے لوگ سخت ظالم ہو چکے ہیں۔"

جو فرشتے قومِ لُوطؑ پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے وہ پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس حاضر ہُوئے اور انہوں نے آنجناب کو حضرت اسحٰقؑ کی اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ کی پیدائش کی بشارت دی، پھر یہ بتایا کہ ہمیں قومِ لُوطؑ کو تباہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔[۳۱۲]

قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا - (العنکبوت ۳۲)	ابراہیمؑ نے کہا "وہاں تو لُوطؑ موجود ہے۔"

سب سے پہلے تو حضرت ابراہیمؑ فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھ کر ہی گھبرا گئے، کیونکہ اِس شکل میں فرشتوں کا آنا کسی خطرناک مہم کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ پھر جب انہوں نے آپ کو بشارت دی اور آپ کی گھبراہٹ دُور ہو گئی اور آپ کو معلوم ہوا کہ مہم قومِ لُوطؑ کی طرف جا رہی ہے تو آپؑ اس قوم کے لیے بڑے اصرار کے ساتھ رحم کی درخواست کرنے لگے (فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ) مگر یہ درخواست قبول نہ ہُوئی اور فرمایا گیا کہ اس معاملہ میں اب کچھ نہ کہو، تمہارے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ عذاب اب ٹلنے والا نہیں ہے (يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ)۔ اِس جواب سے جب حضرت ابراہیمؑ کو یہ امید باقی نہ رہی کہ قومِ لُوطؑ کی مُہلت میں کوئی اضافہ ہو سکے گا تب انہیں حضرت لُوطؑ کی فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے وہ بات عرض کی جو یہاں نقل کی گئی ہے کہ "وہاں تو لُوطؑ موجود ہے" یعنی یہ عذاب اگر لُوطؑ کی موجودگی میں نازل ہُوا تو وہ اور ان کے اہل و عیال اس سے

---

[۱] کسی قوم کے بگاڑ کی یہ آخری حد ہوتی ہے کہ وہ داعیانِ اصلاح کی بات قبول نہ کرنے سے آگے بڑھ کر ان کی معاند بن جاتی ہے۔ (مُرتبین)

کیسے محفوظ رہیں گے۔ ۳۱۳

قَالُوا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِیْهَا لَنُنَجِّیَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ کَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ۔ (العنکبوت۔ ۳۲)

اُنہوں نے کہا "ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے ہم اسے اور اس کی بیوی کے سوا اس کے باقی سب گھروالوں کو بچالیں گے" اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔

اس عورت کے متعلق سُورۂ تحریم (آیت ۱۰) میں بتایا گیا ہے کہ یہ حضرت لُوطؑ کی وفادار نہ تھی۔ اسی وجہ سے اس کے حق میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ بھی ایک نبی کی بیوی ہونے کے باوجود عذاب میں مبتلا کر دی جائے۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت لُوطؑ ہجرت کے بعد جب اُردن کے علاقے میں آکر آباد ہوئے ہوں گے تو انہوں نے اسی قوم میں شادی کر لی ہوگی۔ لیکن ان کی صحبت میں ایک عُمر گزار دینے کے بعد بھی یہ عورت ایمان نہ لائی اور اس کی ہمدردیاں اور دلچسپیاں اپنی قوم ہی کے ساتھ وابستہ رہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رشتہ داریاں اور برادریاں کوئی چیز نہیں ہیں، ہر شخص کے ساتھ معاملہ اس کے اپنے ایمان و اخلاق کی بنیاد پر ہوتا ہے، اس لیے پیغمبر کی بیوی ہونا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکا اور اس کا انجام اپنے شوہر کے ساتھ ہونے کے بجائے اپنی اُس قوم کے ساتھ ہُوا جس کے ساتھ اس نے اپنا دین و اخلاق وابستہ کر رکھا تھا۔ ۳۱۴

حضرت لُوطؑ کی پریشانی

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا۔ (العنکبوت ۳۳)

پھر جب ہمارے فرستادے لُوطؑ کے پاس پہنچے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور دل تنگ ہُوا۔

اس پریشانی اور دل تنگی کی وجہ یہ تھی کہ فرشتے بہت خوبصورت نوخیز لڑکوں کی شکل میں آتے تھے۔ حضرت لُوطؑ اپنی قوم کے اخلاق سے واقف تھے، اس لیے ان کے آتے ہی وہ پریشان ہو گئے کہ مَیں اپنے ان مہمانوں کو ٹھیراؤں تو اس بدکردار قوم سے ان کو بچانا مشکل ہے، اور نہ ٹھیراؤں تو یہ بڑی بے مروّتی ہے جسے شرافت گوارا نہیں کرتی۔ مزید برآں یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر مَیں ان مسافروں کو اپنی پناہ میں نہ لُوں گا تو رات انہیں کہیں اور گزارنی پڑے گی اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ گویا مَیں نے خود انہیں بھیڑیوں کے حوالہ کیا ہے ۳۱۵

سُورۂ ہُودؑ میں بیان ہُوا ہے کہ جب لوگ حضرت لُوطؑ کے گھر میں گھُسے چلے آرہے تھے اور آپ نے محسوس کیا کہ اب آپ کسی طرح بھی اپنے مہمانوں کو ان سے نہیں بچا سکتے تو آپ پریشان ہو کر چیخ اُٹھے کہ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ "کاش میرے پاس تمہارے ٹھیک کر دینے کی طاقت ہوتی یا کسی زور آور کی حمایت میں پا سکتا" اس وقت فرشتوں نے کہا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْکَ

"اے لوط، ہم تمہارے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں یہ تم تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔"

وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ (آیت ۳۳) "وہ انہوں نے کہا" نہ ڈرو اور نہ رنج کرو۔"

یعنی ہمارے معاملہ میں نہ اس بات سے ڈرو کہ یہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ اس بات کے لیے فکر مند ہو کہ ہمیں ان سے کیسے بچایا جائے۔ یہی موقع تھا جب فرشتوں نے حضرت لوطؑ پر یہ راز فاش کیا کہ وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں جنہیں اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ۳۱۷

لوط علیہ السلام کے قصّے کی جو تفصیلات قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں ان کے فحوائے کلام سے یہ بات صاف مترشح ہوتی ہے کہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے ہاں پہنچے تھے اور حضرت لوطؑ اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ فرشتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان مہمانوں کی آمد سے آپ کو سخت پریشانی و دل تنگی لاحق ہوئی۔ اپنی قوم کو جانتے تھے کہ وہ کیسی بدکردار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔

اِن مہمانوں کا آنا تھا کہ اِس قوم کے لوگ بے اختیار اُس کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خُوگر تھے۔ لُوطؑ نے اُن سے کہا، بھائیو! یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا تجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔" (ہُود۔ آیت ۸، ۷۔ ۹) ۳۱۸

وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِىْ وَنُذُرِ۔ (القمر: ۳۷)	پھر انہوں نے اسے اپنے مہمانوں کی حفاظت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ آخر کار ہم نے ان کی آنکھیں مُوند دیں کہ چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزا۔

حضرت لُوطؑ نے ان کی بے انتہا منّت سماجت کی کہ وہ اس ذلیل حرکت سے باز رہیں مگر وہ نہ مانے اور گھر میں گھس کر زبردستی مہمانوں کو نکال لینے کی کوشش کی۔ اِس آخری مرحلے پر یکایک ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ پھر فرشتوں نے حضرت لُوطؑ سے کہا کہ وہ اور ان کے گھر والے صُبح ہونے سے پہلے اِس بستی سے نکل جائیں اور ان کے نکلتے ہی اس قوم پر ایک ہولناک عذاب نازل ہو گیا۔ بائبل میں یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے الفاظ یہ ہیں" تب وہ اُس مرد یعنی لُوطؑ پر پل پڑے اور نزدیک آئے تاکہ کواڑ توڑ ڈالیں۔ لیکن اِن مردوں یعنی فرشتوں نے اپنے ہاتھ بڑھا کر لُوطؑ کو اپنے پاس گھر میں کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا اور اُن مردوں کو جو گھر کے دروازے پر تھے، کیا چھوٹے کیا بڑے اندھا کر دیا، سو وہ دروازہ

ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے"۔ پیدائش، ۱۹: ۹ - ۱۱)[۳۱۹]

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمٍ مُّجْرِمِیْنَ۔ لِنُرْسِلَ عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِیْنٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِیْنَ۔ (الذاریات ۳۲-۳۴)

اُنہوں نے کہا ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسادیں جو آپکے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لیے نشان زدہ ہیں۔

یعنی ایک ایک پتھر پر آپ کے رب کی طرف سے نشان لگا دیا گیا ہے کہ اُسے کس مجرم کی سرکوبی کرنی ہے[۳۲۰]۔

نُزولِ عذاب

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ۔ وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ۔ (ہود ۸۲-۸۳)

پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آپہنچا تو ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑتوڑ برسائے جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دُور نہیں ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ۔ (الشعراء - آیت: ۱۷۳)

اور ہم نے ان پر برسائی ایک برسات۔ بڑی ہی بری بارش تھی جو ان ڈرائے جانے والوں پر نازل ہوئی۔

غالباً یہ عذاب ایک سخت زلزلے اور آتش فشانی انفجار کی شکل میں آیا تھا۔ زلزلے نے ان کی بستیوں کو تل پٹ کیا اور آتش فشاں مادّے کے پھٹنے سے ان کے اوپر زور کا پتھراؤ ہوا۔ پکی ہوئی مٹی کے پتھروں سے مُراد شاید وہ متحجّر مٹی ہے جو آتش فشاں علاقے میں زیرِ زمین حرارت اور لاوے کے اثر سے پتھر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آج تک بحرِ لُوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں اس اِنفجار کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔[۳۲۱]

فَمَا وَجَدْنَا فِیْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (الذاریات ۳۶)

اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

پُوری قوم میں اور اس کے پُورے علاقے میں صرف ایک گھر تھا جس میں ایمان و اسلام کی روشنی پائی جاتی تھی، اور وہ تنہا حضرت لوطؑ کا گھر تھا۔ باقی پوری قوم فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کا سارا ملک گندگی سے لبریز ہو چکا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس ایک گھر کے لوگوں کو بچا کر نکال لیا اور اس کے بعد اس ملک پر وہ تباہی نازل کی جس سے اس بدکار قوم کا کوئی فرد بچ کر نہ جا سکا[۱]۔[۳۲۲]

---

[۱] اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات اس وقت تک کسی قوم کی کامل تباہی کا فیصلہ نہیں کرتا جب تک اس میں کچھ قابلِ لحاظ

بائیبل میں اس عذاب کی تفصیلات

بائیبل کے بیانات، قدیم یونانی اور لاطینی تحریروں، جدید زمانے کی طبقات الارضی تحقیقات اور آثارِ قدیمہ کے مشاہدات سے اس عذاب کی تفصیلات پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بحیرۂ مُردار (Dead Sea) کے جنوب اور مشرق میں جو علاقہ آج انتہائی ویران اور سنسان حالت میں پڑا ہوا ہے۔ اس میں بکثرت پُرانی بستیوں کے کھنڈروں کی موجودگی پتہ دیتی ہے کہ یہ کسی زمانہ میں نہایت آباد علاقہ رہا تھا۔ آج وہاں سینکڑوں برباد شدہ قریوں کے آثار ملتے ہیں، حالانکہ اب یہ علاقہ اتنا شاداب نہیں ہے کہ اتنی آبادی کا بوجھ سہار سکے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اِس علاقے کی آبادی و خوشحالی کا دور ۲۳۰۰ سنہ قبل مسیح سے ۱۹۰۰ سنہ قبل مسیح تک رہا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مؤرخین کا اندازہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں گزرے ہیں۔ اِس لحاظ سے آثار کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے کہ یہ علاقہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ کے عہد ہی میں برباد ہوا ہے۔

اِس علاقے کا سب سے زیادہ آباد اور سرسبز و شاداب حصّہ وہ تھا جسے بائیبل میں سدّیم کی وادی کہا گیا ہے۔ جس کے متعلق بائیبل کا بیان ہے کہ "وہ اس سے پیشتر کہ خداوند نے سَدوم اور عمورَہ کو تباہ کیا، خداوند کے باغ (عدن)، اور مصر کے مانند خوب سیراب تھی" (پیدائش باب ۱۳، آیت ۱۰)۔ موجودہ زمانے کے محققین کی عام رائے یہ ہے کہ وہ وادی اب بحیرۂ مُردار کے اندر غرق ہے اور یہ رائے مختلف آثار کی شہادتوں سے قائم کی گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں بحیرۂ مُردار جنوب کی طرف اتنا وسیع نہ تھا جتنا اب ہے۔ شرقِ اُردن کے موجودہ شہر الکرک کے سامنے مغرب کی جانب اِس بُحیرے میں جو ایک چھوٹا سا جزیرہ نما "اللسان" پایا جاتا ہے، قدیم زمانے میں بس یہی پانی کی آخری سرحد تھی۔ اس کے نیچے کا حصّہ جہاں اب پانی پھیل گیا ہے (جسے ملحقہ نقشے میں ہم نے

بھلاتی موجود رہے۔ بُرے لوگوں کی اکثریت کے مقابلے میں اگر ایک قلیل عنصر بھی ایسا پایا جاتا ہو جو بدی کو روکنے اور نیکی کے راستے کی طرف بلانے کے لیے کوشاں ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ مگر جب حالت یہ ہو جاتی ہے کہ کسی قوم کے اندر آٹے میں نمک کے برابر بھی خیر باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو دو چار نیک انسان اس کی بستیوں میں بُرائی کے خلاف لڑتے لڑتے تھک کر عاجز آ چکے ہوں انہیں وہ اپنی قدرت سے کسی نہ کسی طرح بچا کر نکال دیتا ہے اور باقی لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو ہر ہوشمند مالک اپنے سڑے ہوئے پھلوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ ۳۲۳ے

آڑی لکیروں سے نمایاں کیا ہے) پہلے ایک سرسبز وادی کی شکل میں آباد تھا اور یہی وہ وادی سدیم تھی جس میں قوم لوط کے بڑے بڑے شہر سدوم، عمورہ، اَدمہ، ضبوئیم اور ضُغر واقع تھے۔ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے یہ وادی پھٹ کر دب گئی اور بحیرۂ مُردار کا پانی اس کے اوپر چھا گیا۔ آج بھی یہ بُحیرے کا سب سے زیادہ اُتھلا حصّہ ہے۔ مگر رُومی عہد میں یہ اتنا اُتھلا تھا کہ لوگ اللسان سے چل کر مغربی ساحل تک پانی میں سے گزر جاتے تھے۔ اس وقت تک جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبے ہوئے جنگلات صاف نظر آتے ہیں، بلکہ یہ شبہ بھی کیا جاتا ہے کہ پانی میں کچھ عمارات بھی ڈوبی ہوئی ہیں۔

بائبل اور قدیم یُونانی و لاطینی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں جگہ جگہ نفط (پٹرول) اور اسفالٹ کے گڑھے تھے اور بعض بعض جگہ زمین سے آتش گیر گیس بھی نکلتی تھی۔ اب بھی وہاں زیرِ زمین پٹرول اور گیسوں کا پتہ چلتا ہے۔ طبقات الارضی مشاہدات سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے ساتھ پٹرول، گیس اور اسفالٹ زمین سے نکل کر بھڑک اُٹھے اور سارا علاقہ بھک سے اڑ گیا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ اس تباہی کی اطلاع پا کر حضرت ابراہیمؑ جب حبرُون سے اس وادی کا حال دیکھنے آئے تو زمین سے دُھواں اس طرح اُٹھ رہا تھا جیسے بھٹّی کا دُھواں ہوتا ہے۔ (پیدائش باب ۱۹- آیت ۲۸)[۳۲۴]

وَلَقَد تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً۔ اور ہم نے اس بستی کی ایک کھُلی نشانی چھوڑ دی ہے

اِس کھُلی نشانی سے مُراد ہے بُحَیرہ مُردار جسے بحرِ لُوط بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کفّارِ مکّہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اِس ظالم قوم پر اس کے کرتوتوں کی بدولت جو عذاب آیا تھا اس کی ایک نشانی آج بھی شاہراہِ عام پر موجود ہے جسے تم شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں جاتے ہوئے شب و روز دیکھتے ہو وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ (الحجر) اور وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ وَ بِالَّيْلِ (الصّٰفّٰت)

حالیہ انکشافات

موجودہ زمانے میں یہ بات قریب قریب یقین کے ساتھ تسلیم کی جا رہی ہے کہ بُحیرۂ مُردار کا جنوبی حصّہ ایک ہولناک زلزلے کی وجہ سے زمین میں دھنس جانے کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اسی دھنسے ہوئے حصّے میں قومِ لُوطؑ کا مرکزی شہر سَدُوم (Sodom) واقع تھا۔ اِس حصے میں پانی کے نیچے کچھ ڈوبی ہوئی بستیوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ حال میں جدید آلاتِ غوطہ زنی کی مدد سے یہ کوشش شروع ہوئی ہے کہ کچھ لوگ نیچے جا کر ان آثار کی جستجو کریں۔ لیکن ابھی تک ان کوششوں کے نتائج سامنے نہیں آتے ہیں۔[۳۲۵]

وَ تَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ۔ (الذاریات: ۳۷)

اس کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی ان لوگوں کے لیے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں۔

قومِ لُوط کا علاقہ

دریائے اُردن
اَریحا
بیت المقدس
خربتِ قُمران
بحیرۂ مُردار (بحرِ لُوط)
شرقِ اُردن
حبرون
بنی نُعیم
فلسطین
اللسان
الکرک
قومِ لُوط کا علاقہ
مؤتہ
الصافی
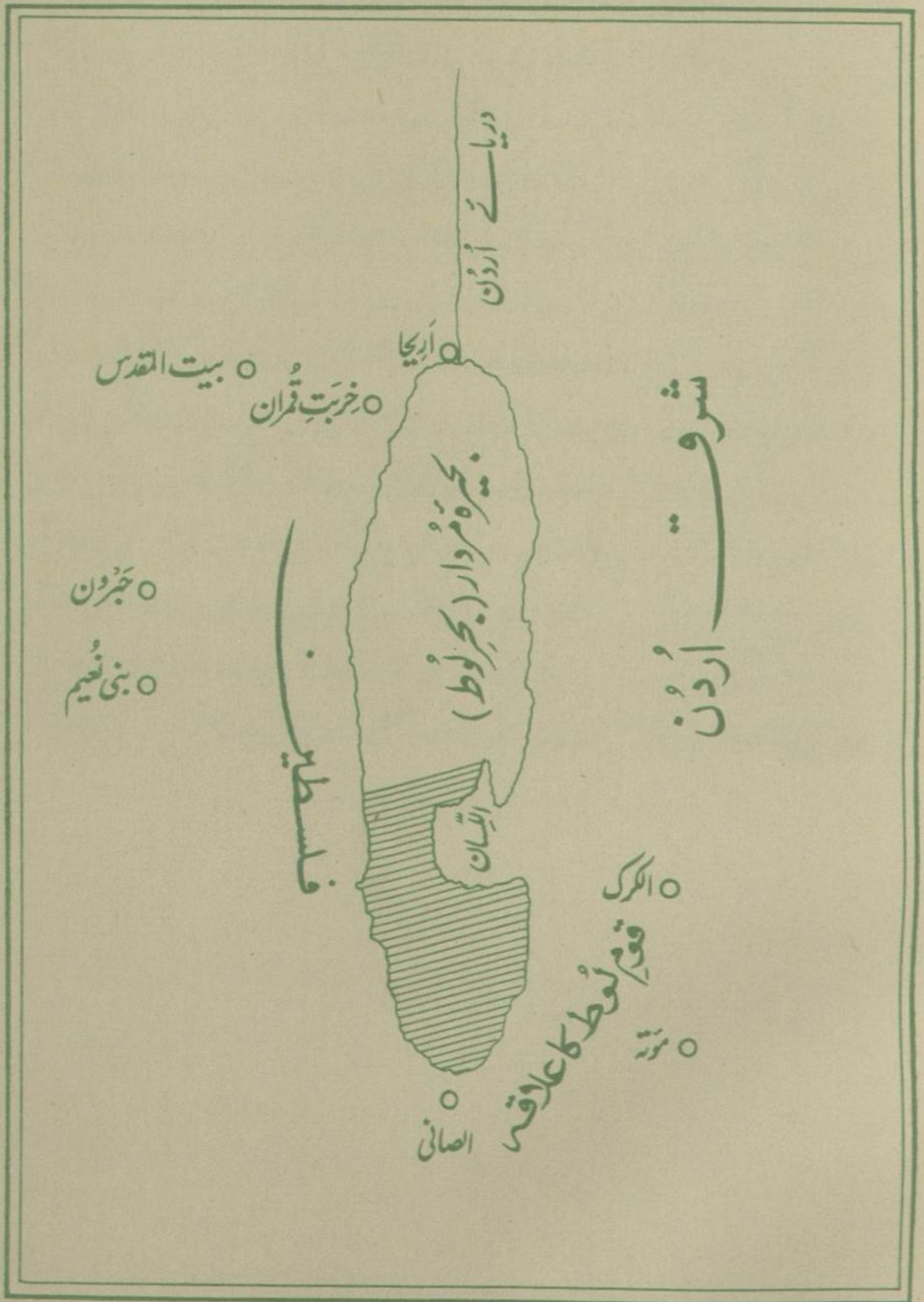
اِس نشانی سے مُراد بحیرۂ مُردار (Dead Sea) ہے جس کا جنوبی علاقہ آج بھی ایک عظیم الشّان تباہی کے آثار پیش کر رہا ہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا اندازہ ہے کہ قومِ لُوطؑ کے بڑے شہر غالباً شدید زلزلے سے زمین کے اندر دھنس گئے تھے اور ان کے اُوپر بحیرۂ مُردار کا پانی پھیل گیا تھا، کیونکہ اس بُحیرے کا وہ حصّہ جو "اللّسان" نامی چھوٹے سے جزیرہ نما کے جنوب میں واقع ہے، صاف طور پر بعد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے اور قدیم بحیرۂ مُردار کے جو آثار اس جزیرہ نما کے شمال تک نظر آتے ہیں وہ جنوب میں پائے جانے والے آثار سے بہت مختلف ہیں۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جنوب کا حصّہ پہلے اس بُحیرے کی سطح سے بلند تھا، بعد میں کسی وقت دھنس کر اس کے نیچے چلا گیا۔ اس کے دھنسنے کا زمانہ بھی دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ معلوم ہوتا ہے اور یہی تاریخی طور پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کا زمانہ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں آثارِ قدیمہ کی تلاش کرنے والی ایک امریکی جماعت کو اللّسان پر ایک بہت بڑا قبرستان ملا ہے جس میں بیس ہزار سے زیادہ قبریں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریب میں کوئی بڑا شہر ضرور آباد ہو گا۔ مگر کسی ایسے شہر کے آثار آس پاس کہیں موجود نہیں ہیں جس سے متصل اتنا بڑا قبرستان بن سکتا ہو۔ اس سے بھی یہ شُبہ تقویّت پاتا ہے کہ جس شہر کا یہ قبرستان تھا وہ بُحیرے میں غرق ہو چکا ہے۔ بُحیرے کے جنوب میں جو علاقہ ہے اس میں اب بھی ہر طرف تباہی کے آثار موجود ہیں اور زمین میں گندھک، رال، تارکول اور قدرتی گیس کے اتنے ذخائر پائے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کسی وقت بجلیوں کے گرنے سے یا زلزلے کا لاوا نکلنے سے یہاں ایک جہنّم پھٹ پڑی ہو گی۔[۳۲۶]

فصل ۷

قومِ سبا

قومِ سبا کا علاقہ

سبا جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی، جس کا دارالحکومت مارب، موجودہ یمن کے دارالسلطنت صنعاء سے ۵۵ میل بجانب شمالِ مشرق واقع تھا۔ اس کا زمانۂ عروج مَعین کی سلطنت کے زوال کے بعد تقریباً ۱۱۰۰ق م سے شروع ہوا اور ایک ہزار سال تک یہ عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔ پھر ۱۱۵ ق م میں جنوبی عرب کی دوسری مشہور قوم حمیر نے اس کی جگہ لے لی۔ عرب میں یمن اور حضر موت اور افریقہ میں حبش کے علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔

مشہور عظیم قوم

مشرقی افریقہ، ہندوستان، مشرق بعید اور خود عرب کی جتنی تجارت مصر و شام اور یونان و روم کے ساتھ ہوتی تھی وہ زیادہ تر انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسی وجہ سے یہ قوم قدیم زمانہ میں اپنی دولت کے لیے نہایت مشہور تھی۔ بلکہ یونانی مؤرخین تو اسے دُنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم کہتے ہیں۔ تجارت کے علاوہ ان کی خوشحالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر ایک بہترین نظامِ آبپاشی قائم کر رکھا تھا جس سے ان کا پورا علاقہ جنّت بنا ہوا تھا۔ ان کے ملک کی اس غیر معمولی سر سبزی و شادابی کا ذکر یونانی مؤرخین نے بھی کیا ہے اور سورۃ سبا کے دوسرے رکوع میں قرآن مجید بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ [۳۲۷]

"تاریخ کی رُو سے "سبا" جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عبد البرّ اور ترمذی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حسبِ ذیل قبیلے پیدا ہوئے: کِندہ، حِمیر، اَزد، اَشعَرییّن، مَذحِج، اَنمار (جس کی دو شاخیں ہیں، خَثعَم اور بَجیلہ)، عاملہ، جُذام، لَخم اور غسّان۔

بہت قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شہرہ تھا۔ ۲۵۰۰ قبل مسیح میں اُر کے کتبات اس کا

ذکر سابوم کے نام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابل اور آشور (اسیریا) کے کتبات میں اور اسی طرح بائیبل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے (مثال کے طور پہ ملاحظہ ہو زبور، ۷۲: ۱۵، یرمیاہ ۶: ۲۰، حزقی ایل ۲۷: ۲۲-۳۸: ۱۳- ایوب ۶: ۱۹)۔ یونان و روم کے مؤرخین و جغرافیہ نویس تھیوفراسٹس ۲۸۸ء قبل مسیح) کے وقت سے مسیح کے بعد کی کئی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔ اس کا وطن عرب کا جنوبی مغربی کونہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السّلام کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔

سبا کی مذہبی تاریخ

آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی[1] پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمانؑ (۹۶۵ء سے ۹۲۶ء ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت مسلمان ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور اس نے اَلْمقہ (چاند دیوتا)، عَثتر (زہرہ)، ذاتِ حَمِیم اور ذات بعدان (سورج دیوی)، ہوبس، حرمتم یا حریمت اور ایسے ہی دوسرے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ اَلْمقہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حق دار قرار دیتے تھے۔ یمن میں بکثرت کتبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں اور خصوصاً اَلْمقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا اور ہر اہم واقعہ پر ان کے شکریے ادا کیے جاتے تھے۔[2]

---

[1] قرآن مجید (النمل آیت ۲۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو جب ہُدہُد نے اس قوم کا حال سنایا اُس وقت یہ آفتاب کی عبادت کرتی تھی۔ عرب کی قدیم روایات سے بھی اس کا یہی مذہب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ابن اسحاق علمائے اَنساب کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ سبا کی قوم دراصل ایک مورثِ اعلیٰ کی طرف منسوب ہے جس کا نام عبدِ شمس (بندۂ آفتاب یا سورج کا پرستار) اور لقب سبا تھا۔ بنی اسرائیل کی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔ ان میں بیان کیا گیا ہے کہ ہُدہُد جب حضرت سلیمانؑ کا خط لے کر پہنچا تو ملکۂ سبا سورج دیوتا کی پرستش کے لیے جا رہی تھی۔ ہُدہُد نے راستے ہی میں وہ خط ملکہ کے سامنے پھینک دیا۔[28]

[2] تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانے سے قوم سبا میں ایک عنصر ایسا موجود تھا جو دوسرے معبودوں کو ماننے کے بجائے خدائے واحد کو مانتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اثری تحقیقات کے سلسلے میں یمن کے کھنڈروں سے جو کتبات ملے ہیں ان میں سے بعض اس قلیل عنصر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ۶۵۰ء ق م کے لگ بھگ

آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں یمن سے تقریباً ۳ ہزار کتبات فراہم ہوتے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ عربی روایات اور رُومی و یونانی تواریخ کی فراہم کردہ معلومات کو اگر جمع کر لیا جائے تو اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اس کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ ان معلومات کی رُو سے اس کی تاریخ کے اہم اَدوار حسبِ ذیل ہیں۔

۶۵۰ سنہ ق م سے پہلے کا دَور

اس زمانے میں ملوکِ سبا کا لقب مُکَرِّب سبا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لفظ مُقَرِّب کا ہم معنی تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بادشاہ انسانوں اور خداؤں کے درمیان اپنے آپ کو واسطہ قرار دیتے تھے، یا دوسرے الفاظ میں یہ کاہن بادشاہ (Priest Kings) تھے۔ اس زمانے میں ان کا پایۂ تخت صِرواح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مارب سے مغرب کی جانب ایک دن کی راہ پر پائے جاتے ہیں اور خَریبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اِس دَور میں مارب کے مشہور بند کی بِنا رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔

۶۵۰ سنہ ق م سے ۱۱۵ سنہ ق م تک کا دَور

اِس دَور میں سبا کے بادشاہوں نے مُکَرِّب کا لقب چھوڑ کر مَلِک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت میں مذہبیت کی جگہ سیاست اور سیکولرزم کا رنگ غالب ہو گیا۔ اس زمانے میں ملوکِ سبا نے صِرواح کو چھوڑ کر مارِب کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔ یہ مقام سمندر سے ۳۹۰۰ فیٹ کی بلندی پر صنعاء سے ۶۰ میل جانبِ مشرق واقع ہے اور آج تک اس کے کھنڈر شہادت

زمانے کے بعض کتبات بتاتے ہیں کہ مملکتِ سبا کے متعدد مقامات پر ایسی عبادت گاہیں بنی ہوتی تھیں جو ذُسَمَوی یا ذُوسماوی (یعنی ربُّ السّماء) کی عبادت کے لیے مخصوص تھیں بعض مقامات پر اس معبود کا نام مَلکن ذُسَموی (وہ بادشاہ جو آسمانوں کا مالک ہے) لکھا ہے۔ یہ عنصر مُسلسل صدیوں تک یمن میں موجود رہا۔ چنانچہ ۳۷۸ سنہ ء کے ایک کتبے میں بھی الٰہ ذُوسَمَوی کے نام سے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ پھر ۴۶۵ سنہ ء کے ایک کتبے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں بنصر و ردا الٰھن بعل سمین وارضن (یعنی اس خدا کی مدد اور تائید سے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے)۔ اسی زمانے کے ایک اور کتبے میں جس کی تاریخ ۴۵۸ سنہ ء ہے، اسی خدا کے لیے رحمان کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ ہیں بردا رحمنن (یعنی رحمان کی مدد سے) ۳۲۹

دے رہے ہیں کہ یہ کبھی ایک بڑی متمدن قوم کا مرکز تھا۔

۱۱۵ ق م سے ۳۰۰ء تک کا دَور

اس زمانے میں سبا کی مملکت پر حِمیَر کا قبیلہ غالب ہوگیا جو قومِ سبا ہی کا ایک قبیلہ تھا اور تعداد میں دوسرے تمام قبائل سے بڑھا ہوا تھا۔ اِس دَور میں مارِب کو اُجاڑ کر رَیدان پایۂ تخت بنایا گیا جو قبیلہ حِمیَر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظَفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل موجودہ شہر یریم کے قریب ایک مدوّر پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں اور اسی کے قریب علاقہ میں ایک چھوٹا سا قبیلہ حِمیَر کے نام سے آباد ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص تصوّر تک نہیں کر سکتا کہ یہ اُسی قوم کی یادگار ہے جس کے ڈنکے کبھی دنیا بھر میں بجتے تھے۔ اسی زمانے میں سلطنت کے ایک حصّہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ یمنت اور یمنات کا استعمال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یمن اس پورے علاقے کا نام ہوگیا جو عرب کے جنوبی مغربی کونے پر عَسیر سے عدن تک اور باب المندب سے حضرموت تک واقع ہے۔ یہی دَور ہے جس میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا۔

۳۰۰ء کے بعد سے آغازِ اسلام تک کا دَور

یہ قومِ سبا کی تباہی کا دَور ہے۔ اِس دَور میں ان کے ہاں مسلسل خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوئی۔ تجارت برباد ہوئی۔ زراعت نے دم توڑا اور آخر کار آزادی تک ختم ہوگئی۔ پہلے ہَمدانیوں، حِمیَریوں اور ہَمدانیوں کی باہمی نزاعات سے فائدہ اُٹھا کر ۳۴۰ء سے ۳۷۸ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی تو بحال ہوگئی مگر مارِب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہوگئے یہاں تک کہ آخر کار ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر سُورۂ سَبا میں آیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد اَبرَہہ کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مرمتیں ہوتی رہیں، لیکن جو آبادی منتشر ہوچکی تھی وہ پھر جمع نہ ہوسکی اور نہ آب پاشی اور زراعت کا وہ نظام جو درہم برہم ہوچکا تھا، دوبارہ بحال ہوسکا۔[ل]

ل سبا کی قوم ایسی منتشر ہوئی کہ اس کی پراگندگی ضرب المَثَل ہوگئی۔ آج بھی اہلِ عرب اگر کسی گروہ کے انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں "تفرقوا ایدی سبا" "وہ تو ایسے پراگندہ ہوگئے جیسے سبا کی قوم پراگندہ ہوئی تھی"۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب زوالِ نعمت کا دَور شروع ہوا تو سبا کے مختلف قبیلے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر عرب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ غسّانیوں نے اُردن اور شام کا رُخ کیا۔ اَوس وخزرج کے قبیلے یثرب میں جا بسے۔ خُزاعہ نے جدّے کے قریب تہامہ کے علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ اَزْد کا قبیلہ عُمان میں جا کر آباد ہوا۔ لَخم اور جُذام اور کِندہ بھی نکلنے پر مجبور ہوئے۔ حتیٰ کہ "سبا" نام کی کوئی قوم ہی دُنیا میں باقی نہ رہی۔ صرف اس کا ذکر افسانوں میں رہ گیا۔ ۳۳۰

۵۲۳ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم وستم برپا کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں اصحاب الاخدود کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہوگئی اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی وائسرائے ابرہہ نے کعبہ کی مرکزیت کو ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو رومی، حبشی اثر میں لانے کے لیے ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چند روز قبل) مکہ معظمہ پر حملہ کیا اور اس کی پوری فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآن مجید میں اصحاب الفیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر کار ۵۷۵ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا اور اس کا خاتمہ اُس وقت ہوا جب ۶۲۸ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کر لیا۔

قومِ سبا کا مادّی عروج

قومِ سبا کا عروج دراصل دو بنیادوں پر قائم تھا۔ ایک زراعت، دوسرے تجارت۔ زراعت کو انہوں نے آب پاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعہ سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا نظام آب پاشی بابل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ اُن کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہ نکلتے تھے۔ انہی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انہوں نے تالاب بنا لیے تھے اور ان سے نہریں نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق ہر طرف ایک باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ اِس نظامِ آب پاشی کا سب سے بڑا مخزنِ آب وہ تالاب تھا جو شہر مارِب کے قریب کوہ بلق کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ مگر جب اللہ کی نظرِ عنایت ان سے پھر گئی تو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ ملک کا پورا نظامِ آب پاشی تباہ ہو کر رہ گیا۔ پھر کوئی اسے بحال نہ کر سکا۔[1]

تجارت کے لیے اس قوم کو خدا نے بہترین جغرافی مقام عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہی قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کے بندرگاہوں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالابار کے گرم مسالے، ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں، مشرقی افریقہ کے زنگی غلام، بندر، شتر مرغ کے پر اور ہاتھی دانت پہنچتے تھے اور دوسری طرف یہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچاتے تھے جہاں سے رُوم و یُونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان، عُود، عَنبر، مُشک، مُر، قرفہ، قصب الذریرہ، سلیخہ اور دوسری ان خوشبودار

---

[1] قرآن میں اِس تباہ کُن عذاب کا واضح طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔

چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنہیں مصر و شام اور رُوم و یُونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اِس عظیم الشّان تجارت کے دو بڑے راستے تھے۔ ایک بحری دوسرا برّی۔ بحری تجارت کا اجارہ ہزار سال تک انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھا کیونکہ بحرِ احمر کی موسمی ہواؤں، زیرِ آب چٹانوں اور لنگر اندازی کے مقامات کا راز یہی لوگ جانتے تھے اور دوسری کوئی قوم اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمّت نہ رکھتی تھی۔ اِس بحری راستے سے یہ لوگ اُردن اور مصر کی بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔ برّی راستے عدن اور حضرموت سے مارب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکّہ، جدہ، یثرب، العُلاء، تبوک اور اَیلہ سے گزرتی ہوئی پِٹرا تک پہنچتی تھی۔ اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرف اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا تھا۔ اِس برّی راستے پر جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہُوا ہے، یمن سے حدُودِ شام تک سبائیوں کی نو آبادیاں مُسلسل قائم تھیں اور شب و روز ان کے تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ آج تک ان میں سے بہت سی نو آبادیوں کے آثار اِس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی و حِمیَری زبان کے کتبات مل رہے ہیں۔

تجارتی زوال کا آغاز

پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں اس تجارت پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ شرقِ اوسط میں جب یونانیوں اور پھر رُومیوں کی طاقتور سلطنتیں قائم ہوئیں تو شور مچنا شروع ہُوا کہ عرب تاجر اپنی اجارہ داری کے باعث مشرق کے اموالِ تجارت کی من مانی قیمتیں وصُول کر رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہم خود اس میدان میں آگے بڑھ کر اِس تجارت پر قبضہ کر لیں۔ اِس غرض کے لیے سب سے پہلے مصر کے یونانی الاصل فرماں روا بطلیموس ثانی (۲۸۵ – ۲۴۶ ق م) نے اُس قدیم نہر کو پھر سے کھولا جو ۱۳۰۰ برس پہلے فرعون سیسوسٹریس نے دریائے نیل کو بحرِ احمر سے ملانے کے لیے کھُدوائی تھی۔ اس نہر کے ذریعہ سے مصر کا بحری بیڑا پہلی مرتبہ بحرِ احمر میں داخل ہُوا۔ لیکن سبائیوں کے مقابلے میں یہ کوشش زیادہ کارگر نہ ہو سکی۔ پھر جب مصر پر رُوم کا قبضہ ہُوا تو رُومی زیادہ طاقتور تجارتی بیڑا بحرِ احمر میں لے آئے، اور اُس کی پُشت پر اُنہوں نے ایک جنگی بیڑا لا کر ڈال دیا۔ اِس طاقت کا مقابلہ سبائیوں کے بس میں نہ تھا۔ رُومیوں نے جگہ جگہ بندرگاہوں پر اپنی تجارتی نو آبادیاں قائم کیں، ان میں جہازوں کی ہر ضرورت فراہم کرنے کا انتظام کیا، اور جہاں ممکن ہُوا وہاں اپنے فوجی دستے بھی رکھ دیے، حتیٰ کہ ایک وقت وہ آگیا کہ عدن پر رُومیوں کا فوجی تسلّط قائم ہو گیا۔ اِس سلسلے میں رُومی اور حبشی سلطنتوں نے سبائیوں کے مقابلے میں باہم سازباز بھی کر لیا جس کی بدولت بالآخر اِس قوم کی آزادی تک ختم ہو گئی۔

بحری تجارت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد صرف برّی تجارت سبائیوں کے پاس رہ گئی تھی۔ مگر بہت سے اسباب

نے رفتہ رفتہ اس کی کمر بھی توڑ دی۔ پہلے نبطیوں نے پیٹرا سے العُلا تک بالائی حجاز اور اُردن کی تمام نو آبادیوں سے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر ۱۰۶ء میں رُومیوں نے نبطی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور حجاز کی سرحد تک شام و اُردن کے تمام علاقے اُن کے مضبوط ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد حبش اور روم کی متحدہ کوشش یہ رہی کہ سبائیوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر ان کی تجارت کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر حبشی بار بار یمن میں مداخلت کرتے رہے، یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے پُورے ملک پر قبضہ کر لیا۔

عذاب سے پہلے کا مُسرفانہ تمدّن

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اِس قوم کو انتہائی عرُوج سے گرا کر اُس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی۔ ایک وقت تھا کہ اس کی دولت کے افسانے سُن سُن کر یُونان و روم والوں کے مُنہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اسٹرابو لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں اور ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت، سونے چاندی اور جواہر کا کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ پلینی کہتا ہے کہ رُوم اور فارس کی دولت ان کی طرف بہی چلی جا رہی ہے۔ یہ اِس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم ہیں اور ان کا سر سبز و شاداب ملک باغات، کھیتوں اور مواشی سے بھرا ہُوا ہے۔ آرٹی میڈورس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی لکڑی کے بجائے دارچینی، صندل اور دوسری خوشبُودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اِسی طرح دوسرے یونانی مؤرخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب سواحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبُو کی لپٹیں پہنچتی ہیں۔ انہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صنعاء کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت Skyscraper تعمیر کی جو قصرِ غُمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی ۲۰ منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فٹ بلند تھی۔

یہ سب کچھ بس اسی وقت تک رہا جب تک اللہ کا فضل ان کے شاملِ حال رہا۔ آخر کار جب انہوں نے کُفرانِ نعمت کی حد کر دی تو ربِّ قدیر کی نظرِ عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ ۳۱ھ

قومِ ثمود کا علاقہ

بحرِ ابیض متوسط
فلسطین
قومِ لوط کا علاقہ
پٹرا (رقیم)
جزیرہ نمائے سینا
عقبہ
خلیج سویز
خلیج عقبہ
مدین
مصر
تبوک
اَصحابُ الاَیکَہ
تیماء
الحجر
قومِ ثمود کا علاقہ
العلا
خیبر
مدینہ

فصل ۸
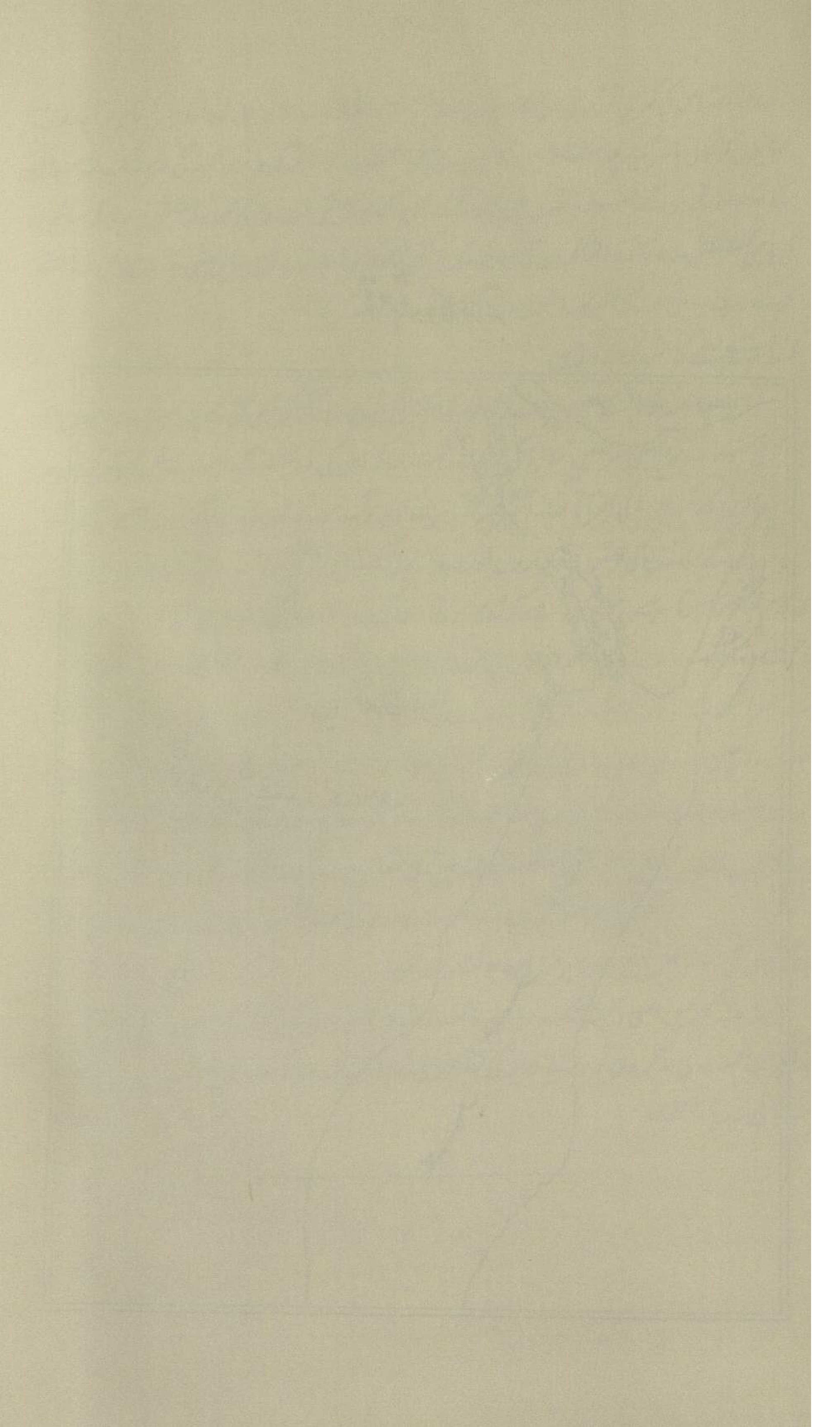
اہلِ مَدیَن و اَصحابُ الاَیکَہ

مُفسرین کے درمیان اِس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مَدیَن اور اَصحابُ الاَیکَہ الگ الگ قومیں ہیں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں اور اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سُورۂ اَعراف میں حضرت شُعَیبؑ کو اہلِ مَدیَن کا بھائی فرمایا گیا ہے (وَاِلیٰ مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیبًا) اور یہاں اَصحابُ الاَیکَہ کے ذکر میں صرف یہ ارشاد ہُوا ہے کہ اِذْ قَالَ لَھُمْ شُعَیبٌ (جبکہ ان سے شُعَیبؑ نے کہا)، "اُن کے بھائی" (اَخُوھُمْ) کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس بعض مُفسّرین دونوں کو ایک ہی قوم قرار دیتے ہیں کیونکہ سُورۂ اعراف اور ہُود میں جو امراض اور اوصاف اصحابِ مَدین کے بیان ہُوئے ہیں وہی یہاں اصحابُ الاَیکَہ کے بیان ہو رہے ہیں۔ حضرت شُعیبؑ کی دعوت و نصیحت بھی یکساں ہے اور آخر کار ان کے انجام میں بھی فرق نہیں ہے۔

تاریخی تحقیق

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اقوال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحابِ مَدیَن اور اصحاب الاَیکہ بلاشُبہ دو الگ قبیلے ہیں، مگر ہیں ایک ہی نسل کی دو شاخیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی جو اولاد اُن کی بیوی یا کنیز قَطُورا کے بطن سے تھی وہ عرب اور اسرائیل کی تاریخ میں بنی قطورا کے نام سے معرُوف ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہُور ہُوا مدیان بن ابراہیمؑ کی نسبت سے مِدیانی یا اصحابِ مَدیَن کہلایا اور اس کی آبادی شمالی حجاز سے فلسطین کے جنوب تک اور وہاں سے جزیرہ نمائے سینا کے آخری گوشے تک بحرِ قلزم اور خلیج عقبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔ اُس کا صدر مقام شہر مَدیَن تھا جس کی جائے وقوع ابوالفداء نے خلیج عَقبہ کے مغربی کنارے پر اَیلَہ (موجودہ عقبہ) سے پانچ دن کی راہ پر بتائی ہے۔ باقی بنی قطورا جن میں بنی دِدان (Dedanites) نسبتاً زیادہ مشہُور ہیں، شمالی عرب میں تیماء اور تبوک اور العُلاء کے درمیان آباد ہُوئے اور اُن کا صدر مقام تبوک تھا جسے قدیم زمانے میں اَیکہ کہتے تھے۔

(یاقوت نے مُعجم البلدان میں لفظ اَیکہ کے تحت بتایا ہے کہ یہ تبوک کا پرانا نام ہے اور اہل تبوک میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ یہی جگہ کسی زمانے میں اَیکہ تھی)۔

دونوں قبیلوں کے لیے مشترک نبی کیوں؟

اصحاب مَدیَن اور اصحاب الایکہ کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے اور ان کے علاقے بھی بالکل ایک دوسرے سے متصل تھے، بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قطورا کی اِن شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ بائیبل کی ابتدائی کتابوں میں جگہ جگہ یہ ذکر ملتا ہے کہ یہ لوگ بَعلِ فغور کی پرستش کرتے تھے اور بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر ان کے علاقے میں آئے تو اُن کے اندر بھی انہوں نے شرک اور زناکاری کی وبا پھیلادی (گنتی باب ۲۵ آیت ۱-۵)۔ باب ۳۱ آیت ۱۶-۱۷)۔ پھر یہ لوگ بین الاقوامی تجارت کی اِن دو بڑی شاہراہوں پر آباد تھے جو یمن سے شام اور خلیج فارس سے مصر کی طرف جاتی تھیں۔ اِن شاہراہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے انہوں نے بڑے پیمانے پر رہزنی کا سلسلہ چلا رکھا تھا۔ دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خراج لیے بغیر نہ گزرنے دیتے تھے اور بین الاقوامی تجارت پر خود قابض رہنے کی خاطر انہوں نے راستوں کا امن خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ قرآن مجید میں ان کی اس پوزیشن کو یوں بیان کیا گیا ہے: وَاِنَّھُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیۡنٍ "یہ (دونوں یعنی قومِ لُوط اور اصحابُ الایکہ) کھلی شاہراہ پر آباد تھے" اور ان کی راہزنی کا ذکر سورۂ اَعراف میں اِس طرح کیا گیا ہے وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ "اور ہر راستے پر لوگوں کو ڈرانے نہ بیٹھو"۔ یہی اسباب تھے جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اِن دونوں قبیلوں کے لیے ایک ہی پیغمبر بھیجا اور ان کو ایک ہی طرح کی تعلیم دی۔ ۲۲۲

اہلِ مَدیَن کے متعلق مزید تفاصیل[1]

مَدیَن کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحرِ احمر اور خلیج عَقبہ کے کنارے پر واقع تھا، اگرچہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانہ میں جو تجارتی شاہراہ بحرِ احمر کے کنارے کنارے یمن سے مکّہ اور ینبوع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی، اور ایک

---

[1] چونکہ یہ نسبتہً بڑا قبیلہ تھا اور حضرت شعیب علیہ السلام کو قرآن نے ان کے ساتھ زیادہ قریبی نسبت دی (اخاھم)، اس لیے اس کے متعلق کچھ زیادہ تفاصیل دی گئی ہیں (مرتّبین)

دوسری تجارتی شاہ راہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی، اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں تھیں اسی بنا پر عرب کا بچہ بچہ مدین سے واقف تھا اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی، کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات دن اس کے آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔

اہل مدین کے متعلق ایک اور ضروری بات جس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے، یہ ہے کہ یہ لوگ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مدیان کی طرف منسوب ہیں جو ان کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ قدیم زمانہ کے قاعدے کے مطابق جو لوگ کسی بڑے آدمی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے وہ رفتہ رفتہ اسی کی آل اولاد میں شمار ہو کر بنی فلاں کہلانے لگتے تھے۔ اسی قاعدے پر عرب کی آبادی کا بڑا حصہ بنی اسماعیل کہلایا۔ اور اولاد یعقوب کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہونے والے لوگ سب کے سب بنی اسرائیل کے جامع نام کے تحت کھپ گئے۔ اسی طرح مدین کے علاقے کی ساری آبادی بھی جو مدیان بن ابراہیم علیہ السلام کے زیر اثر آئی، بنی مدیان کہلائی اور اُن کے ملک کا نام ہی مدین یا مدیان ہو گیا۔ اس تاریخی حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ اس قوم کو دین حق کی آواز پہلی مرتبہ حضرت شعیبؑ ہی کے ذریعہ سے پہنچی تھی۔ درحقیقت بنی اسرائیل کی طرح ابتداءً وہ بھی مسلمان ہی تھے اور شعیب علیہ السلام کے ظہور کے وقت ان کی حالت ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم کی سی تھی، جیسی ظہور موسیٰ علیہ السلام کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی حضرت ابراہیمؑ کے بعد چھ سات سو برس تک مشرک اور بد اخلاق قوموں کے درمیان رہتے رہتے یہ لوگ شرک بھی سیکھ گئے تھے اور بداخلاقیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود ایمان کا دعویٰ اور اس پر فخر برقرار تھا۔ ۳۳۳

دعوتِ اصلاح کا ردِ عمل

وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ۔

(الاعراف۔ آیت ۹۰)

اس قوم کے سرداروں نے جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے، آپس میں کہا اگر تم نے شعیبؑ کی پیروی کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔

حضرت شعیبؑ کی دعوتِ اصلاح کے جواب میں مدین کے سردار اور لیڈر کہتے تھے اور اسی بات کا اپنی قوم کو بھی یقین دلاتے تھے کہ شعیبؑ جس ایمانداری اور راستبازی کی دعوت دے رہا ہے اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اصولوں کی پابندی کرانا چاہتا ہے، اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے اگر ہم بالکل ہی سچائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں۔ اور ہم جو دنیا کی سب سے بڑی تجارتی شاہ راہوں کے چوراہے

پر بستے ہیں اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدن سلطنتوں کی سرحد پر آباد ہیں اگر ہم قافلوں کو چھیڑنا بند کر دیں اور بے ضرر اور پُر امن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو معاشی اور سیاسی فوائد ہمیں اپنی موجودہ جغرافی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور آس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے گی۔ یہ بات صرف قوم شعیب کے سرداروں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں بگڑے ہوئے لوگوں نے حق اور راستی اور دیانت کی روش میں ایسے ہی خطرات محسوس کیے ہیں۔ ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات جھوٹ اور بے ایمانی اور بد اخلاقی کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ہر جگہ دعوتِ حق کے مقابلہ میں جو زبردست عذرات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر دنیا کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے گی تو قوم تباہ ہو جائے گی۔ [۳۳۴]

اہلِ مَدْیَن پر عذاب

اہلِ مَدْیَن پر عذاب رَجفہ دہولناک دھماکے اور زلزلے کی صورت میں آیا۔ اُن کی یہ تباہی مدتِ دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضرب المثل رہی ہے۔ چنانچہ زبورِ داؤدؑ میں ایک جگہ آتا ہے کہ "اے خدا فلاں فلاں قوموں نے تیرے خلاف عہد باندھ لیا ہے، لہٰذا تو ان کے ساتھ وہی کر جو تُو نے مِدیان کے ساتھ کیا" (۸۳-۵ تا ۹)۔ اور یسعیاہ نبی ایک جگہ بنی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آشور والوں سے نہ ڈرو، اگرچہ وہ تمہارے لیے مصریوں کی طرح ظالم بنے جا رہے ہیں لیکن کچھ دیر نہ گزرے گی کہ رب الافواج ان پر اپنا کوڑا برسائے گا اور ان کا وہی حشر ہوگا جو مِدیان کا ہوا" (یسعیاہ: ۱۰-۲۱ تا ۲۶) [۳۳۵]

اصحابُ الایکہ پر عذاب

فَكَذَّبُوهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ الظُّلَّةِ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (آیت ۱۸۹۔ الشعراء)

انہوں نے اسے جھٹلایا، آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آ گیا۔ اور وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا۔

ان پر نازل ہونے والے عذاب کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ آسمانی عذاب مانگا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک بادل بھیج دیا اور وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھایا رہا جب تک بارانِ عذاب نے ان کو بالکل تباہ نہ کر دیا۔ قرآن سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب مَدْیَن کے عذاب کی کیفیت اصحابُ الایکہ کے

عذاب سے مختلف تھی۔ یہ جیسا کہ یہاں بتایا گیا ہے چھتری والے عذاب سے ہلاک ہوئے۔ اور اُن پر عذاب ایک دھماکے اور زلزلے کی شکل میں آیا (فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ، اور وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ)۔ اس لیے ان دونوں کو ملا کر ایک داستان بنانے کی کوشش درست نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے عذاب یوم الظلہ کی کچھ تشریحات بیان کی ہیں۔ مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کی معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ ابن جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ من حدثك من العلماء ما عذاب يوم الظلة فكذبه (علماء میں سے جو کوئی تم سے بیان کرے کہ یوم الظلہ کا عذاب کیا تھا اس کو درست نہ سمجھو۔")[۳۳۶]

فصل ۹

قومِ یونسؑ

حضرت یونسؑ کے حالاتِ زندگی

یونس علیہ السلام[1] (جن کا نام بائبل میں یوناہ ہے اور جن کا زمانہ ۸۶۰ء-۷۸۴ء قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے) اگرچہ اسرائیلی نبی تھے، مگر ان کو اشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق بھیجا گیا تھا، اور اسی بنا پر اشوریوں کو یہاں قومِ یونس کہا گیا ہے۔ اس قوم کا مرکز اُس زمانہ میں نینوٰی کا مشہور شہر تھا جس کے وسیع کھنڈرات آج تک دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ شہر موصل کے عین مقابل پائے جاتے ہیں۔ اور اسی علاقے میں "یونس نبی" کے نام سے ایک مقام بھی موجود ہے۔ اِس قوم کے عُروج کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا دار السلطنت نینوٰی تقریبًا ۶۰ میل کے دَور میں پھیلا ہوا تھا۔

قرآن اور بائبل میں تذکرۂ یونسؑ

قرآن میں اس قصہ کی طرف چار جگہ صرف اشارات کیے گئے ہیں، کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔[2] اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قوم کن خاص وجوہ کی بنا پر خدا کے اِس قانون سے مستثنیٰ کی گئی کہ عذاب کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کسی کا ایمان اُس کے لیے نافع نہیں ہوتا۔ بائبل میں "یوناہ" کے نام سے جو مختصر سا صحیفہ ہے اس میں کچھ تفصیل تو ملتی ہے مگر وہ چنداں قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ کیونکہ اوّل تو نہ وہ آسمانی صحیفہ ہے نہ خود یونس علیہ السلام کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ بلکہ ان کے چار پانچ سو برس بعد کسی نامعلوم شخص نے اسے تاریخِ یونسؑ کے طور پر لکھ کر مجموعۂ

---

[1] قرآن میں کہیں ان کا نام لیا گیا ہے اور کہیں "ذوالنون" اور "صاحب الحوت" یعنی مچھلی والے کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مچھلی والا انہیں اس لیے نہیں کہا گیا کہ وہ مچھلیاں پکڑتے یا بیچتے تھے، بلکہ اِس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ کے اِذن سے ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا تھا جیسا کہ سورۂ صافات آیت ۱۴۲ میں بیان ہوا ہے (تفہیم القرآن جلد سوم۔ الانبیاء، حاشیہ ۸۲)

[2] ملاحظہ ہو سورۂ یونس آیت ۹۸۔ سورۂ انبیاء۔ آیات ۸۷-۸۸۔ الصافات ۱۳۹-۱۴۸۔ القلم ۴۸-۵۰۔

کتبِ مقدسہ میں شامل کر دیا ہے۔ دوسرے اس میں بعض صریح مُہملات بھی پائے جاتے ہیں جو ماننے کے قابل نہیں ہیں۔ تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونسؑ کی تفصیلات پر غور کرنے سے وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو مفسّرینِ قرآن نے بیان کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السّلام چونکہ عذاب کی اطّلاع دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اپنا مستقر چھوڑ گئے تھے[1]، اس لیے جب آثارِ عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ و استغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا[2]۔

قرآن مجید میں خدائی دستور کے جو اُصول و کلّیات بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اُس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجّت پُوری نہیں کر دیتا۔ پس جب نبیؑ نے اس قوم کی مُہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطورِ خود ہی ہجرت کر گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا، کیونکہ اس پر اتمامِ حُجّت کی قانونی شرائط پُوری نہیں ہوئی تھیں۔

قومِ یُونسؑ کی آخری تباہی

جب یہ قوم ایمان لے آئی تو اس کی مُہلتِ عمر میں اضافہ کر دیا گیا۔ بعد میں اس نے پھر خیال و عمل کی گمراہیاں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ ناحوم نبی (۷۲۰ء-۶۹۸ء قبل مسیح) نے اسے متنبّہ کیا، مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر صَفنیاہ نبی (۶۴۰ء-۶۰۹ء قبل مسیح) نے اس کو آخری تنبیہ کی۔ وہ بھی کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار ۶۱۲ء ق م کے لگ بھگ زمانے میں اللہ تعالیٰ نے میڈیا والوں کو اس پر مُسلّط کر دیا۔ میڈیا کا بادشاہ بابل والوں کی مدد سے آشور کے علاقے پر چڑھ آیا۔ اشوری فوج شکست کھا کر نینویٰ میں محصور ہو گئی۔ کچھ مدّت تک اس نے سخت مقابلہ کیا۔ پھر دجلہ کی طغیانی نے فصیلِ شہر توڑ دی اور حملہ آور اندر گھُس گئے۔ پُورا شہر جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ گرد و پیش کے علاقے کا بھی یہی حشر ہُوا۔ اشور کا بادشاہ خود اپنے محل میں آگ لگا کر جل مرا اور اس کے ساتھ ہی اشوری سلطنت اور تہذیب بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ زمانۂ حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں، ان میں آتش زدگی کے نشانات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔[۳۳۸]

---

[1] یعنی وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے قبل اس کے کہ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم آتا اور ان کے لیے اپنی ڈیوٹی چھوڑنا جائز ہوتا۔[۳۳۷]

[2] اس مسئلے پر مفصل بحث تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سُورۂ صافّات، حاشیہ ۸۵ میں کی گئی ہے جس میں معترضین کے تمام اعتراضات کا جواب دے دیا گیا ہے۔

فصل ۱۰

بنی اِسرائیل

نسلِ ابراھیمی کی دو شاخیں

حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں : ایک حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ ان کے پھیلاتے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے، اس لیے وہ اپنا سلسلہ اُنہی سے جوڑتے تھے۔ دوسرے حضرت اسحاقؑ کی اولاد جن میں حضرت یعقوب، یوسف، مُوسیٰ، داؤد، سُلیمان، یحییٰ، عیسیٰ اور بہت سے انبیاء علیہم السّلام پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی اُن کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے اُن کا دین قبول کیا، انہوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی اُن کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو اُن سے الگ رہے۔ مگر مذہباً ان کے متبع رہے۔ اِس شاخ میں جب پستی و تنزل کا دَور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا[۳۳۹]۔

سُورۃ المائدہ کی آیت ۲۰ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اُس عظمتِ گذشتہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام سے بہت پہلے کسی زمانہ میں ان کو حاصل تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبران کی قوم میں پیدا ہوئے اور دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السّلام کے زمانہ میں اور ان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ مدّت دراز تک یہی اس زمانہ کی مہذب دُنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے۔ اور انہی کا سکّہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔ عموماً لوگ بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت مُوسیٰؑ سے شروع کرتے ہیں۔ لیکن قرآن اِس مقام پر تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانۂ عروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا تھا جسے خود حضرت مُوسیٰؑ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے[۳۴۰]۔

فلسطین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے فلسطین کے پورے علاقے کو فتح کر لیا۔ مگر انھوں نے متحد ہو کر اپنی کوئی ایک منظم سلطنت قائم نہ کی۔ بلکہ اس علاقے کو مختلف اسرائیلی قبیلوں نے آپس میں بانٹ کر اپنی چھوٹی چھوٹی قبائلی ریاستیں قائم کر لیں۔ اس نقشے میں دکھایا گیا ہے کہ فلسطین کا مختصر سا علاقہ کس طرح بنی اسرائیل کے قبائل (بنی یہوداہ، بنی شمعون، بنی دان، بنی بن یمین، بنی افرائیم، بنی روبن، بنی جد، بنی منسّی، بنی اشکار، بنی زبولون، بنی نفتالی اور بنی آشر) میں تقسیم ہو گیا تھا۔

اس طرح ہر قبیلے کی ریاست اپنی اپنی جگہ کمزور رہی اور یہ لوگ توراۃ کے اس منشا کو پورا نہ کر سکے کہ اس علاقے کی مشرک قوموں کا استیصال کر دیا جائے۔

اسرائیلی قبائل کے ان علاقوں میں جگہ جگہ مشرک کنعانی قوموں کی شہری ریاستیں بدستور قائم رہیں۔ بائبل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ طالوت کے عہد تک صیدا، صُور، دُور، مجِدّو، بیت شان، جزر، یروشلم وغیرہ شہر مشرکوں کے قبضے میں ہے اور ان شہروں کی مشرکانہ تہذیب کا بنی اسرائیل پر گہرا اثر پڑتا رہا۔

مزید برآں اسرائیلی قبائل کی سرحدوں پر فلستیوں، اَدومیوں، موآبیوں اور عمونیوں کی طاقتور ریاستیں بھی بدستور قائم رہیں اور انھوں نے بعد میں پے در پے حملے کر کے بہت سا علاقہ اسرائیلیوں سے چھین لیا۔ حتیٰ کہ نوبت یہ آگئی کہ فلسطین سے بنی اسرائیل بیک بینی و دو گوش نکال دیے جاتے اگر عین وقت پر اللہ تعالیٰ طالوت کی قیادت میں اسرائیلیوں کو جمع نہ کر دیتا۔
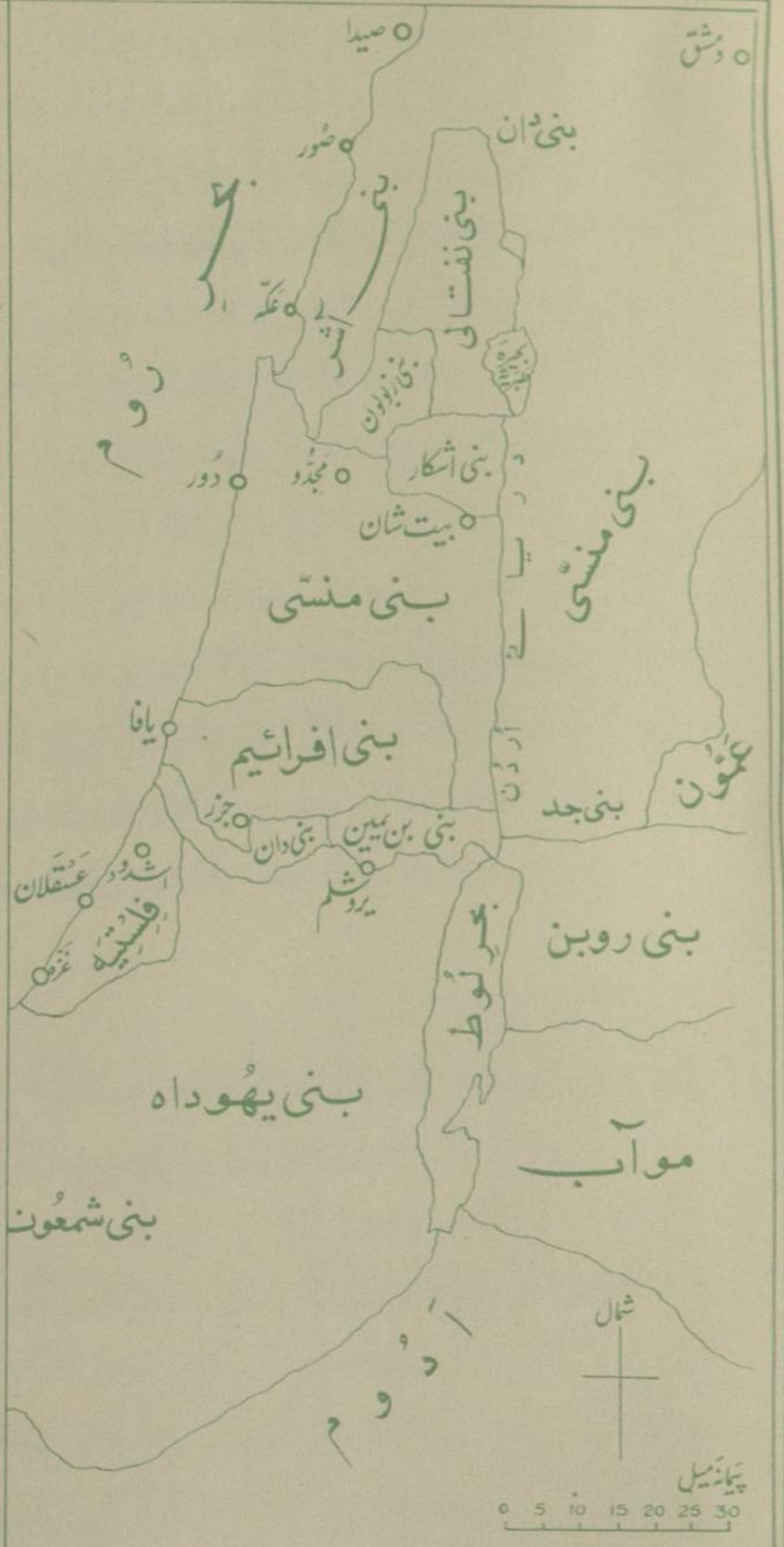
فلسطین میں بدترین شرک کا دور

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف قومیں آباد تھیں، حِتّی، اموری، کنعانی، فرزّی، حِرّی، یبوسی، فلستی وغیرہ۔ ان قوموں میں بدترین قسم کا شرک پایا جاتا تھا۔ ان کے سب سے بڑے معبود کا نام ایل تھا جسے دیوتاؤں کا باپ کہتے تھے اور اسے عموماً سانڈ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اس کی بیوی کا نام عشیرہ تھا اور اس سے خداؤں اور خدائیوں کی ایک پوری نسل چلی تھی جن کی تعداد ستر تک پہنچتی تھی۔ ان کی اولاد میں سب سے زیادہ زبردست بَعل تھا جس کو بارش اور روئیدگی کا خدا اور زمین و آسمان کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ شمالی علاقوں میں اس کی بیوی اُناث کہلاتی تھی، اور فلسطین میں عِستارات۔ یہ دونوں خواتین عشق اور افزائشِ نسل کی دیویاں تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی دیوتا موت کا مالک تھا۔ کسی دیوی کے قبضے میں صحت تھی۔ کسی دیوتا کو وبا اور قحط لانے کے اختیارات تفویض کیے گئے تھے۔ اور یُوں ساری خدائی بہت سے معبُودوں میں بٹ گئی تھی۔ ان دیوتاؤں اور دیویوں کی طرف ایسے ایسے ذلیل اوصاف و اعمال منسوب تھے کہ اخلاقی حیثیت سے انتہائی بدکردار انسان بھی ان کے ساتھ مشتہر ہونا پسند نہ کریں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسی کمینہ ہستیوں کو خدا بنائیں اور ان کی پرستش کریں وہ اخلاق کی ذلیل ترین پستیوں میں گرنے سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو حالات آثارِ قدیمہ کی کھُدائیوں سے دریافت ہوئے ہیں وہ شدید اخلاقی گراوٹ کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کے ہاں بچوں کی قربانی کا عام رواج تھا۔ ان کے معابد زناکاری کے اڈّے بنے ہوتے تھے۔ عورتوں کو دیوداسیاں بنا کر عبادت گاہوں میں رکھنا اور ان سے بدکاریاں کرنا عبادت کے اجزا میں داخل تھا۔ اور اسی طرح کی اور بہت سی بد اخلاقیاں ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔

بنی اسرائیل میں بگاڑ کا سبب

تورات میں حضرت مُوسیٰؑ کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو جو ہدایات دی گئی تھیں ان میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تم ان قوموں کو ہلاک کر کے ان کے قبضے سے فلسطین کی سرزمین چھین لینا اور ان کے ساتھ رہنے بسنے اور ان کی اخلاقی و اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔

لیکن بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو وہ اس ہدایت کو بھُول گئے۔ انہوں نے اپنی کوئی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقے کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔ اس تفرقے کی وجہ سے ان کا کوئی قبیلہ بھی اتنا طاقتور نہ ہو سکا کہ اپنے علاقے کو مشرکین سے پوری طرح پاک کر دیتا۔ آخر کار انہیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں بسیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے مفتوح علاقوں میں جگہ جگہ ان مشرک قوموں کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں بھی موجود رہیں جن کو بنی اسرائیل

مسخر نہ کرسکے۔ اسی بات کی شکایت زبور میں کی گئی ہے[1]

نتائجِ بد

اس کا پہلا خمیازہ تو بنی اسرائیل کو یہ بھگتنا پڑا کہ ان قوموں کے ذریعے سے ان کے اندر شرک گھس آیا اور اس کے ساتھ بتدریج دوسری اخلاقی گندگیاں بھی راہ پانے لگیں۔ چنانچہ اس کی شکایت بائیبل کی کتاب قضاۃ میں یوں کی گئی ہے:-

"اور بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے اور انہوں نے خداوند اپنے باپ دادا کے خدا کو جو انہیں ملک مصر سے نکال لایا تھا چھوڑ دیا اور دوسرے معبودوں کی جو ان کے گرداگرد کی قوموں کے دیوتاؤں میں سے تھے پیروی کرنے لگے اور ان کو سجدہ کرنے لگے اور خداوند کو غصہ دلایا۔ وہ خداوند کو چھوڑ کر بَعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے اور خداوند کا قہر اسرائیل پر بھڑکا۔" (باب ۲۔ آیت ۱۱-۱۳)

اس کے بعد دوسرا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انہوں نے چھوڑ دی تھیں، انہوں نے اور فلستیوں نے، جن کا پورا علاقہ غیر مغلوب رہ گیا تھا، بنی اسرائیل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور پے درپے حملے کرکے فلسطین کے بڑے حصے سے ان کو بے دخل کر دیا۔ حتیٰ کہ ان سے خداوند کے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) تک چھین لیا۔ آخر کار بنی اسرائیل کو ایک فرمانروا کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی درخواست پر حضرت سموئیل نبی نے سنہ ۱۰۲۰ قبل مسیح میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا (اس کی تفصیل سورہ بقرہ رکوع ۳۲ میں بیان ہوئی ہے)۔

دورِ خیر و فلاح

اس متحدہ سلطنت کے تین فرمانروا ہوئے۔ طالوت (سنہ ۱۰۲۰ تا سنہ ۱۰۰۴ ق م)، حضرت داؤد علیہ السلام (سنہ ۱۰۰۴ تا سنہ ۹۶۵ ق م)، اور حضرت سلیمان علیہ السلام (سنہ ۹۶۵ تا سنہ ۹۲۶ ق م)۔ ان فرمانرواؤں نے اس کام

---

[1] یہ شکایت حضرت داؤد کی زبان سے یوں ادا ہوئی ہے:

"انہوں نے ان قوموں کو ہلاک نہ کیا جیسا خداوند نے ان کو حکم دیا تھا بلکہ ان قوموں کے ساتھ مل گئے اور ان کے سے کام سیکھ گئے اور ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگے جو ان کے لیے پھندا بن گئے بلکہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا، یعنی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا خون بہایا ـــــ اس لیے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث سے نفرت ہو گئی۔ اور اس نے ان کو قوموں کے قبضے میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمران بن گئے۔"

(زبور، باب ۱۰۶۔ آیات ۳۴-۴۱)
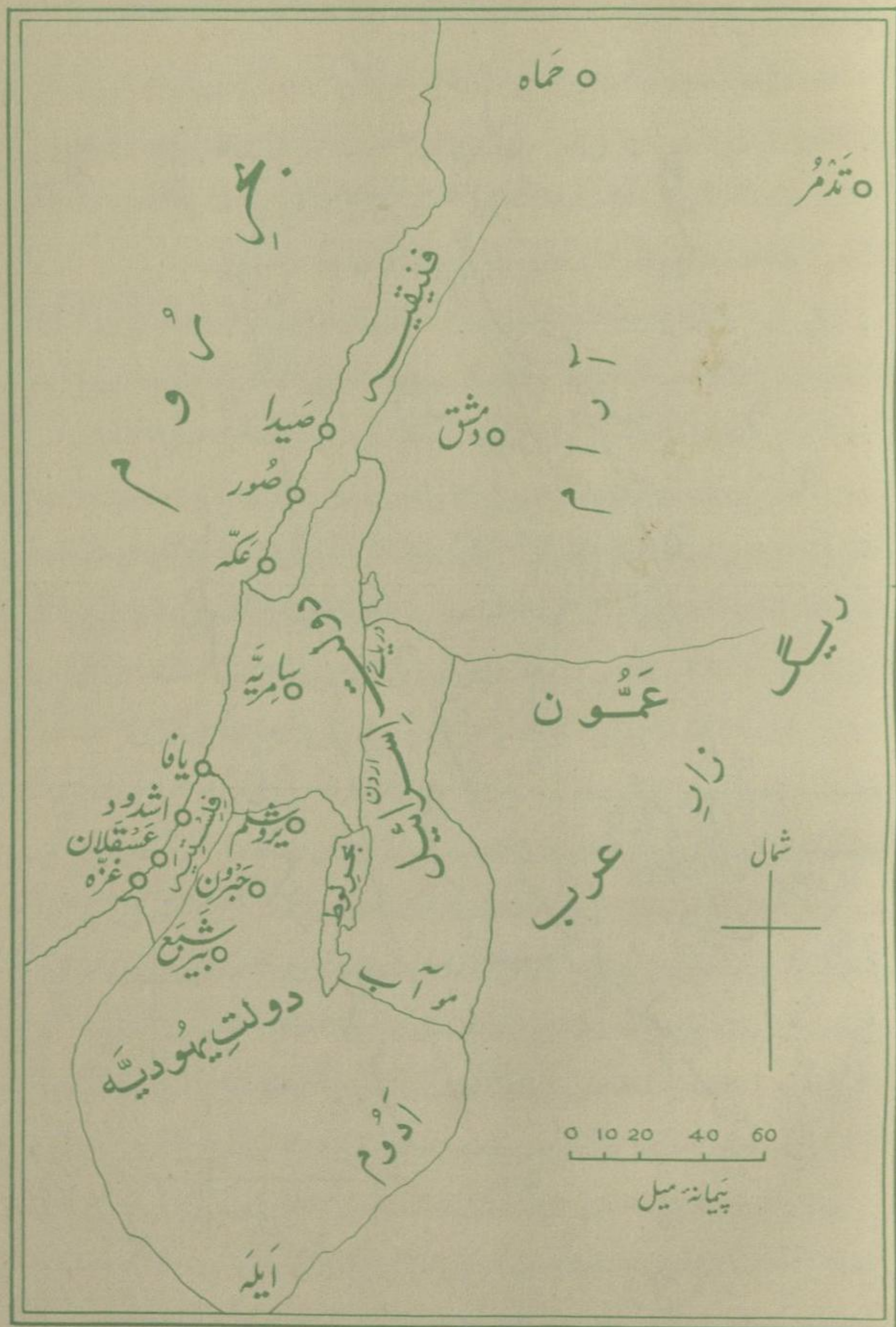
حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی سلطنت

سنہ ۱۰۰۰ - سنہ ۹۳۰ قبل مسیح

حماہ
تدمر
بحرِ روم
فینیقیہ
صیدا
صور
عکہ
دمشق
بحیرہ طبریہ
دریائے اردن
بنی عمون
ریگزار عرب
یافا
اشدود
عسقلان
غزہ
فلسطین
یروشلم
حبرون
بیر شبع
بحر لوط
بنی اسرائیل
موآب
ادوم
ایلہ
شمال
پیمانۂ میل

کو مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ صرف شمالی ساحل پر فنیقیوں کی اور جنوبی مغربی ساحل پر فلستیوں کی ریاستیں باقی رہ گئیں جنہیں مسخر نہ کیا جا سکا اور محض باجگزار بنانے پر اکتفا کیا گیا۔

دورِ فساد و بحران

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انہوں نے آپس میں لڑ کر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شمالی فلسطین اور شرقِ اُردن میں سلطنتِ اسرائیل جس کا پایۂ تخت آخر کار سامریہ قرار پایا۔ اور جنوبی فلسطین اور ادُوم کے علاقے میں سلطنتِ یہودیہ جس کا پایہ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش اوّل روز سے شروع ہو گئی اور آخر تک رہی

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور یہ حالت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب اس ریاست کے فرمانروا اخی اَب نے صیدا کی مشرک شہزادی ایزبل سے شادی کر لی۔ اس وقت حکومت کی طاقت اور ذرائع سے شرک اور بداخلاقیاں سیلاب کی طرح اسرائیلیوں میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ حضرت الیاس، اور حضرت الیسع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی مگر یہ قوم جس تنزل کی طرف جا رہی تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخر کار اللہ کا غضب اشوریوں کی شکل میں دولت اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر اشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہو گئے۔ اِس دَور میں عاموس نبی (۷۸۷ تا ۷۴۷ قبل مسیح)، اور پھر ہوسیع نبی (۷۴۷ تا ۷۳۵ قبل مسیح) نے اُٹھ کر اسرائیلیوں کو پے در پے تنبیہات کیں۔ مگر جس غفلت کے نشے میں وہ سرشار تھے وہ تنبیہ کی ترشی سے اور زیادہ تیز ہو گیا۔ یہاں تک کہ عاموس نبی کو شاہِ اسرائیل نے ملک سے نکل جانے اور دولت سامریہ کے حدود میں نبوت بند کر دینے کا نوٹس دے دیا۔ اس کے بعد کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ خدا کا عذاب اسرائیلی سلطنت اور اس کے باشندوں پر ٹوٹ پڑا۔ ۷۲۱ قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرماں روا سارگون نے سامِریہ کو فتح کر کے دولتِ اسرائیل کا خاتمہ کر دیا، ہزارہا اسرائیلی تہ تیغ کیے گئے، ۲۷ ہزار سے زیادہ با اثر اسرائیلیوں کو ملک سے نکال کر اشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بتر کر دیا گیا۔ اور دوسرے علاقوں سے لا کر غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسایا گیا جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عنصر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز زیادہ بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی، وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلدی شرک اور بداخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔ مگر نسبتہً اس کا اعتقادی اور اخلاقی زوال دولتِ اسرائیل کی بہ نسبت سست رفتار تھا اس لیے اس کو مہلت بھی کچھ زیادہ دی گئی۔ اگرچہ

دولتِ اسرائیل کی طرح اس پر بھی اشوریوں نے پے در پے حملے کیے، اس کے شہروں کو تباہ کیا، اس کے پایۂ تخت کا محاصرہ کیا، لیکن یہ ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم نہ ہو سکی۔ بلکہ صرف باج گزار بن کر رہ گئی۔ پھر جب حضرت یسعیاہؑ اور حضرت یرمیاہؑ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بُت پرستی اور بداخلاقیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۸ ق م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولتِ یہودیہ کو مسخر کر لیا اور یہودیہ کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یروشلم اور ہیکلِ سلیمانی کو اس طرح پیوندِ خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی، یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کر دیا اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بُری طرح ذلیل اور پامال ہو کر رہے۔[۲۴۱]

بابل کی اسیری کے زمانے میں بنی اسرائیل کا کردار

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڵ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

(البقرہ ۱۰۲)

"اور لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے، جو شیاطین، سلیمانؑ کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے، حالانکہ سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ (فرشتے) جب کبھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ دیکھو، ہم محض ایک آزمائش ہیں، تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔" پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے، جس سے شوہر اور بیوی میں جُدائی ڈال دیں۔ ظاہر تھا کہ اذنِ الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے، جو خود ان کے لیے نفع بخش

نہیں بلکہ نقصان دہ تھی اور انہیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ کتنی بُری متاع تھی جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، کاش انہیں معلوم ہوتا:

شیاطین سے مُراد شیاطینِ جن اور شیاطینِ اِنس دونوں ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں مُراد ہیں۔ جب بنی اسرائیل میں اخلاقی و مادّی انحطاط کا دَور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت و افلاس اور ذلّت و پستی نے ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی تو ان کی توجہات جادو ٹونے اور طلسمات و عملیات اور تعویذ گنڈوں کی طرف مبذول ہونے لگیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مشقت اور جدوجہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں کے زور پر سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیاطین نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمان علیہ السلام کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں تو سب کچھ چند نقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں، اور وہ ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعیٔ حق کی آواز انہوں نے سُن کر دی۔

اِس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں، مگر جو کچھ مَیں نے سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پُوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے بھیجا ہوگا جس طرح قومِ لوطؑ کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دوکان لگائی گئی ہوگی۔ اور دوسری طرف وہ اِتمامِ حُجّت کے لیے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہونگے کہ دیکھو ہم تمہارے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہونگے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں، ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہونگے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بُری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خور حاکم کو نشان زدہ سکّے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اُسے عین حالتِ ارتکابِ جُرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عُذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

اس منڈی میں سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس سے ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو اس سے توڑ کر اپنے اُوپر عاشق کر لے۔ یہ اخلاقی زوال کا وہ انتہائی درجہ تھا

جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔

ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدّن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدّن کی درستی کا اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدّن کی خرابی کا مدار ہے۔ لہٰذا وہ شخص بدترین مفسد ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہو جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ابلیس اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ ایجنٹ واپس آکر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں فتنہ برپا کیا۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شر کھڑا کیا۔ مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تُو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں جُدائی ڈال آیا ہُوں۔ یہ سُن کر ابلیس اس کو گلے سے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو کام کر کے آیا ہے۔ اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے انہیں کیوں حکم دیا گیا کہ عورت اور مرد کے درمیان جُدائی ڈالنے کا "عمل" ان کے سامنے پیش کریں۔ دراصل یہی ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔ ۳۴۲ھ

دورِ تجدید و اِحیاء

جہاں تک سامریہ اور اسرائیل کے لوگوں کا تعلق ہے وہ تو اخلاقی و اعتقادی زوال کی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اُٹھے۔ مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت دینے والا تھا۔ اُس نے اُن لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے کھچے رہ گئے تھے۔ اور اُن لوگوں کو بھی توبہ و انابت کی ترغیب دی جو بابل اور دوسرے علاقوں میں جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ آخر کار رحمتِ الٰہی اُن کی مددگار ہوئی۔ بابل کی سلطنت کو زوال ہُوا ۵۳۹ھ قبل مسیح میں ایرانی فاتح سائرس (خورس یا خسرو) نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے فرمان جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہودیوں کے قافلے پر قافلے یہودیہ کی طرف جانے شروع ہو گئے جن کا سلسلہ مدّتوں جاری رہا۔ سائرس نے یہودیوں کو ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی اجازت بھی دی۔ مگر ایک عرصے تک ہمسایہ قومیں جو اس علاقہ میں آباد ہو گئی تھیں، مزاحمت کرتی رہیں۔ آخر داریوس (دارا) اوّل نے ۵۲۲ھ ق م میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے

پوتے زرُو بابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے حجّی نبی، زکریاہ نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکلِ مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔ پھر ۴۵۰ء ق م میں ایک جلاوطن گروہ کے ساتھ حضرت عُزَیر (عزرا) یہوُدیہ پہنچے اور شاہ ایران ارتخششتا (اٹاکسرسز یا اردشیر) نے ایک فرمان کی رُو سے ان کو مجاز کیا کہ:

"تو اپنے خدا کی اُس دانش کے مطابق جو تجھ کو عنایت ہوئی، حاکموں اور قاضیوں کو مقرر کر تاکہ دریا پار کے سب لوگوں کا جو تیرے خدا کی شریعت کو جانتے ہیں انصاف کریں، اور تم اُس کو جو نہ جانتا ہو سکھاؤ، اور جو کوئی تیرے خدا کی شریعت پر اور بادشاہ کے فرمان پر عمل نہ کرے اس کو بلا توقف قانونی سزا دی جائے، خواہ موت ہو، یا جلاوطنی، یا مال کی ضبطی، یا قید۔"

(عزرا۔ باب ۷۔ آیت ۲۵-۲۶)

اس فرمان سے فائدہ اُٹھا کر حضرت عُزیر نے دینِ موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ انہوں نے یہوُدی قوم کے تمام اہلِ خیر و صلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائبل کی کتب خمسہ کو جن میں توراۃ تھی، مُرتّب کر کے شائع کیا۔ یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا۔ قوانینِ شریعت کو نافذ کر کے اُن اعتقادی اور اخلاقی بُرائیوں کو دُور کرنا شروع کیا جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گھُس آئی تھیں۔ اُن تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جن سے یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے۔ اور بنی اسرائیل سے از سرِ نَو خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا میثاق لیا۔

۴۴۵ء قبل مسیح میں نحمیاہ کے زیرِ قیادت ایک اور جلاوطن گروہ یہودیہ واپس آیا اور شاہِ ایران نے نحمیاہ کو یروشلم کا حاکم مقرر کر کے اس امر کی اجازت دی کہ وہ اس کی شہر پناہ تعمیر کرے۔ اِس طرح ڈیڑھ سو سال بعد بیتُ المقدس پھر سے آباد ہُوا اور یہوُدی مذہب و تہذیب کا مرکز بن گیا۔ مگر شمالی فلسطین اور سامریہ کے اسرائیلیوں نے حضرت عُزیر کی اصلاح و تجدید سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا۔ بلکہ بیت المقدس کے مقابلہ میں اپنا ایک مذہبی مرکز کوہِ جرزیم پر تعمیر کر کے اس کو قبلۂ اہلِ کتاب بنانے کی کوشش کی۔ اس طرح یہوُدیوں اور سامریوں کے درمیان بُعد اور زیادہ بڑھ گیا۔

یُونانی تسلُّط اور اس کے خلاف کشمکش

ایرانی سلطنت کے زوال اور سکندرِ اعظم کی فتوحات اور پھر ایرانیوں کے عروج سے یہوُدیوں کو کچھ مدت کے لیے ایک سخت دھکا لگا۔ سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت جن تین سلطنتوں میں تقسیم ہوئی تھی ان میں سے شام کا علاقہ اِس سُلُوقی سلطنت کے حصے میں آیا جس کا پایۂ تخت انطاکیہ تھا۔ اور اس کے فرمانروا انٹیوکس ثالث نے ۱۹۸ء ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یہ یونانی فاتح، جو مذہباً مشرک اور اخلاقاً اباحیت پسند تھے، یہوُدی مذہب و

تہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی دباؤ سے یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کر دیا اور خود یہودیوں میں سے ایک اچھا خاصا عنصر ان کا آلۂ کار بن گیا۔ اِس خارجی مداخلت نے یہودی قوم میں تفرقہ ڈال دیا۔ ایک گروہ نے یونانی لباس، یونانی زبان، یونانی طرزِ معاشرت اور یونانی کھیلوں کو اپنا لیا اور دوسرا گروہ اپنی تہذیب پر سختی کے ساتھ قائم رہا۔ ۱۷۵ء ق م میں انٹیوکس چہارم (جس کا لقب ایپی فانیس یعنی مظہرِ خدا، تھا) جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری جابرانہ طاقت سے کام لے کر یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔ اس نے بیت المقدس کے ہیکل میں زبردستی بُت رکھوائے اور یہودیوں کو مجبور کیا کہ ان کو سجدہ کریں۔ اس نے قربان گاہ پر قربانی بند کرائی۔ اس نے یہودیوں کو مُشرکانہ قربان گاہوں پر قربانیاں کرنے کا حکم دیا، اس نے ان سب لوگوں کے لیے سزائے موت تجویز کی جو اپنے گھروں میں تورات کا نسخہ رکھیں۔ یا سَبت کے احکام پر عمل کریں یا اپنے بچوں کے ختنے کرائیں۔ مگر یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکابی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس کشمکش میں یونانیت زدہ یہودیوں کی ساری ہمدردیاں یونانیوں کے ساتھ تھیں۔ اور انہوں نے عملاً مکابی بغاوت کو کچلنے میں انطاکیہ کے ظالموں کا پورا ساتھ دیا۔ لیکن عام یہودیوں میں حضرت عُزَیر کی پھونکی ہوئی رُوحِ دینداری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مکابیوں کے ساتھ ہو گئے اور آخرکار انہوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کر لی جو ۶۷ء ق م تک قائم رہی۔ اِس ریاست کے حدود پھیل کر رفتہ رفتہ اِس پورے رقبے پر حاوی ہو گئے جو کبھی یہودیہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے زیرِ نگین تھے بلکہ فلستیہ کا بھی ایک بڑا حصّہ اس کے قبضے میں آ گیا جو حضرت داؤد و سُلیمان علیہما السّلام کے زمانے میں بھی مسخر نہ ہوا تھا۔ [۳۴۳]

دوسرا دَورِ فساد

مکابیوں کی تحریک جس اخلاقی و دینی رُوح کے ساتھ اُٹھی تھی، وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ خالص دُنیا پرستی اور بے رُوح ظاہر داری نے لے لی۔ آخرکار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپی ۶۳ء ق م میں اِس ملک کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن رومی فاتحین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ وہ مفتوح علاقوں پر براہِ راست اپنا نظم و نسق قائم کرنے کی بہ نسبت مقامی حکمرانوں کے ذریعے سے بالواسطہ اپنا کام نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اِس لیے انہوں نے فلسطین میں اپنے زیرِ سایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی جو بالآخر ۴۰ء ق م میں ایک ہوشیار یہودی ہیرود نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرودِ اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی فرمانروائی پورے فلسطین اور شرقِ اُردن پر ۴۰ء سے ۴ء قبل مسیح تک رہی۔ اس نے ایک طرف
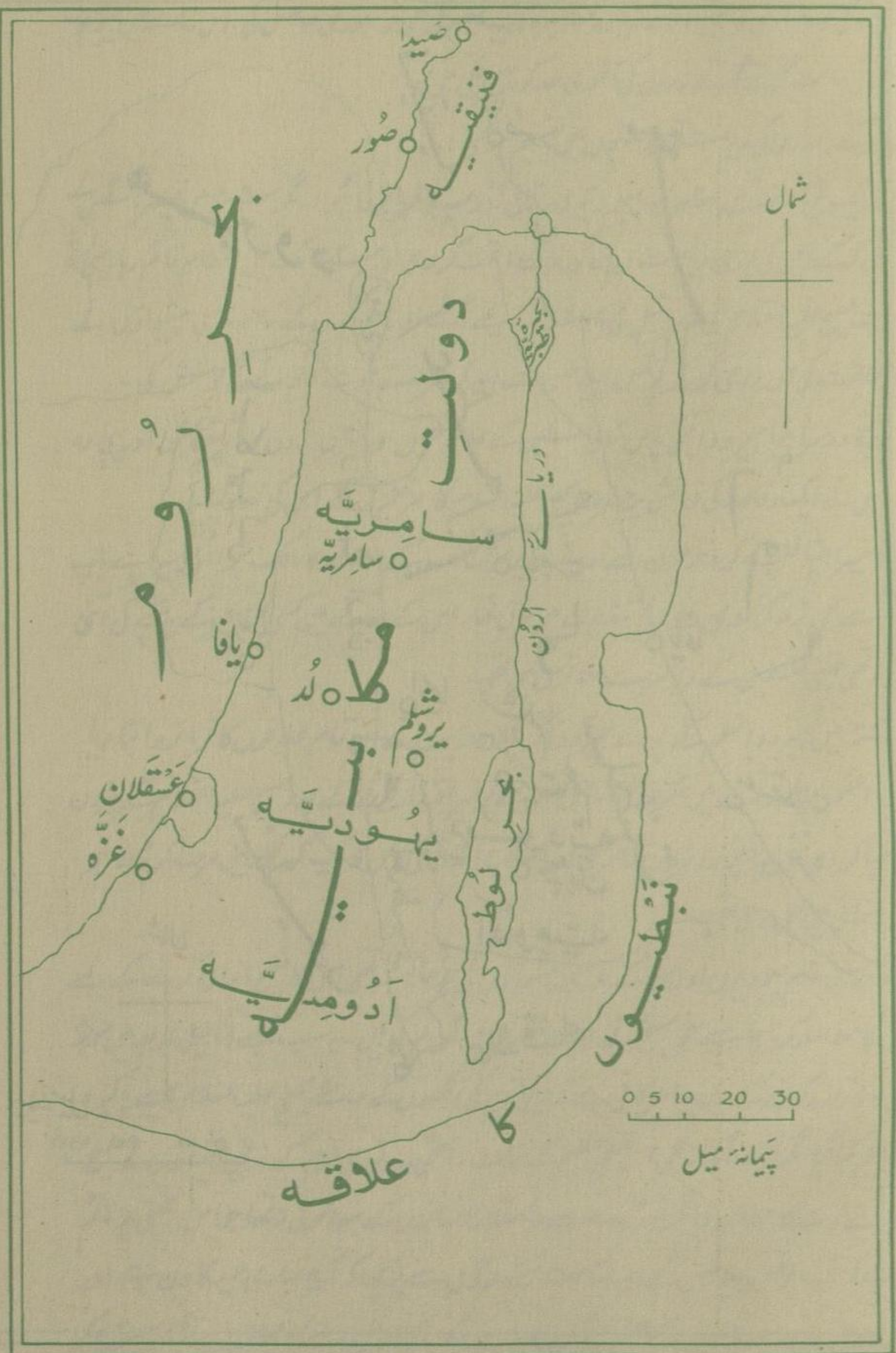
ہیرودِ اعظم کی سلطنت

سنہ ۴۰ – سنہ ۴ قبل مسیح

صیدا

فینیقیہ

صور

بحرِ روم

ہیرودِ اعظم کی سلطنت

دیکاپولس

(شاہی گورنر کے ماتحت)

سامریہ

سامریہ

دریائے اردن

یافا

فلیڈلفیا

اریحا

یروشلم

بیت لحم

یہودیہ

عسقلان

غزہ

حبرون

ادومیہ

بحرِ لوط

نبطیوں کا علاقہ

شمال

پیمانہ میل

0 5 10 20 30
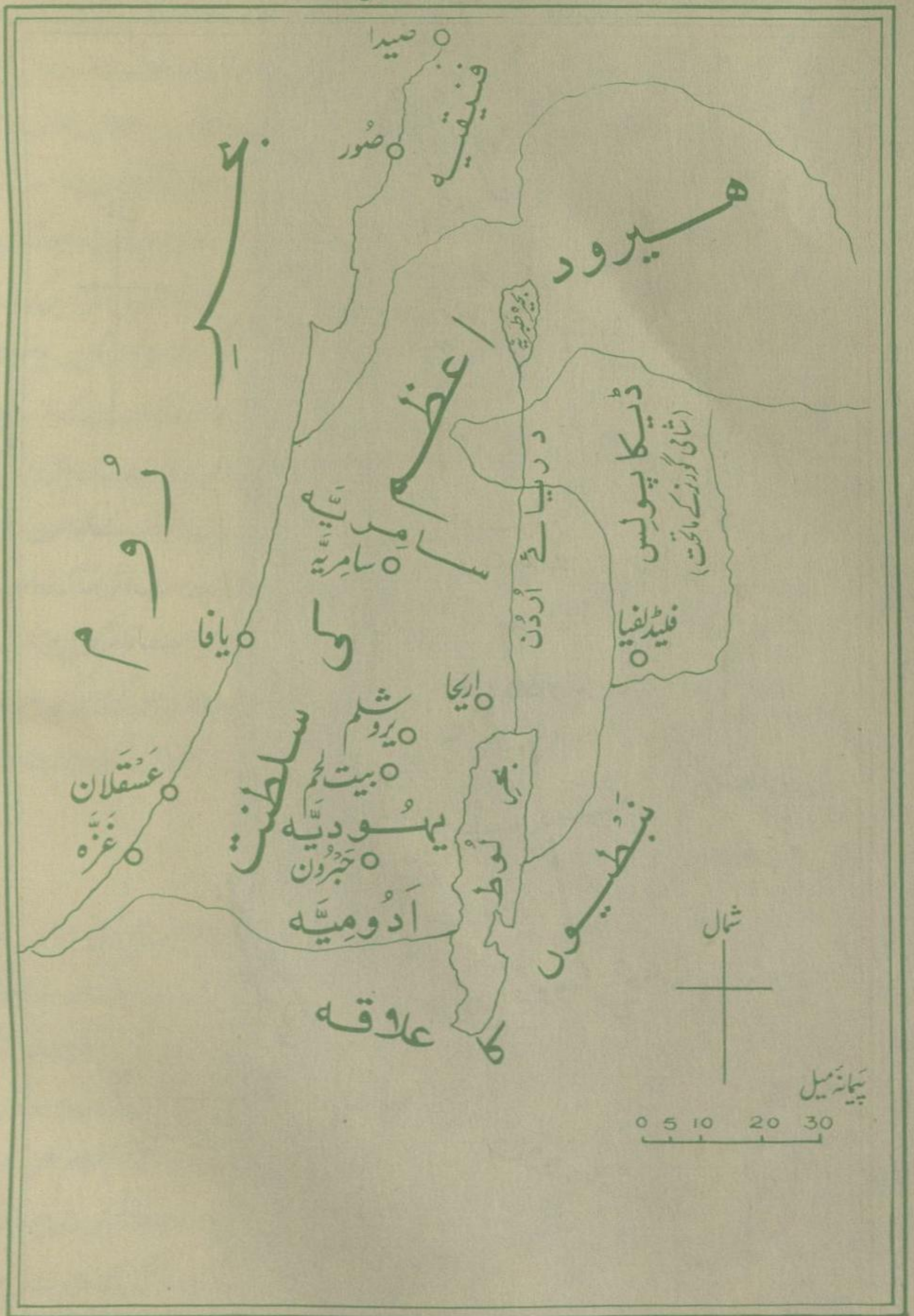
مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کرکے یہودیوں کو خوش رکھا اور دوسری طرف رومی تہذیب کو فروغ دے کر اور رُومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرکے قیصر کی بھی خوشنودی حاصل کی۔ اس زمانے میں یہودیوں کی دینی و اخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

ہیرود کے بعد اس کی ریاست تین حصّوں میں تقسیم ہوگئی :۔

اس کا ایک بیٹا ارخلاؤس سامریہ، یہودیہ اور شمالی اَدُومیہ کا فرمانروا ہُوا، مگر ۶ء میں قیصر آگسٹس نے اس کو معزول کرکے اس کی پوری ریاست اپنے گورنر کے ماتحت کردی اور ۴۱ء تک یہی انتظام قائم رہا۔ یہی زمانہ تھا جب حضرت مسیح علیہ السّلام بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے اُٹھے اور یہُودیوں کے تمام مذہبی پیشواؤں نے مل کر اُن کی مخالفت کی اور رومی گورنر پونتس پیلاطس سے ان کو سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔

ہیرود کا دوسرا بیٹا ہیرود انیٹی پاس شمالی فلسطین کے علاقہ گلیل اور شرقِ اُردن کا مالک ہُوا اور یہی وہ شخص ہے جس نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰ علیہ السّلام کا سر قلم کرکے اس کی نذر کیا۔

اس کا تیسرا بیٹا فلپ، کوہ حرمون سے دریائے یرموک تک کے علاقے کا مالک ہُوا اور یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بھی بڑھ کر رومی و یونانی تہذیب میں غرق تھا۔ اس کے علاقے میں کسی کلمۂ خیر کے پنپنے کی اتنی گنجائش بھی نہ تھی جتنی فلسطین کے دوسرے علاقوں میں تھی۔

۴۱ء میں ہیرود اعظم کے پوتے ہیرود اَگرِپا کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرمانروا بنا دیا جن پر ہیرود اعظم اپنے زمانے میں حکمران تھا۔ اس شخص نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السّلام کے پیرؤوں پر مظالم کی انتہا کردی اور اپنا پُورا زور خدا ترسی اور اصلاحِ اخلاق کی اس تحریک کو کچلنے میں صرف کر ڈالا جو حواریوں کی رہنمائی میں چل رہی تھی۔

اِس دَور میں عام یہودیوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی جو حالت تھی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اُن تنقیدوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مسیحؑ نے اپنے خطبوں میں اُن پر کی ہیں۔ یہ سب خطبے اناجیل اربعہ میں موجود ہیں۔ پھر اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اِس قوم کی آنکھوں کے سامنے یحییٰ علیہ السلام جیسے پاکیزہ انسان کا سر قلم کیا گیا، مگر ایک آواز بھی اس ظلمِ عظیم کے خلاف نہ اُٹھی اور پُوری قوم کے مذہبی پیشواؤں نے مسیحؑ کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا مگر تھوڑے سے راستباز انسانوں کے سوا کوئی نہ تھا جو اِس بدبختی پر ماتم کرتا۔ حد یہ ہے کہ جب پونتس پیلاطس نے ان شامت زدہ لوگوں سے پُوچھا کہ آج تمہاری عید کا دن ہے اور قاعدے کے مطابق میں سزائے موت کے مستحق مجرموں میں سے ایک کو چھوڑ دینے کا مجاز ہوں، بتاؤ یسوعؑ کو چھوڑوں یا براباڈاکو کو؟ تو اُن کے پُورے مجمع نے بیک آواز کہا کہ برابا ڈاکو کو چھوڑ دے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ

کی طرف سے آخری حجت تھی جو اس قوم پر قائم کی گئی۔

تازیانۂ مشیّت

اس پر تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی اور ۶۴ء اور ۶۶ء کے درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کر دی۔ ہیرودِ اگرپا ثانی اور رومی پروکیوریٹر فلورس دونوں اس بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام ہوئے۔ آخر کار رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی سے اس بغاوت کو کچل دیا اور ۷۰ء میں ٹیٹس نے بزورِ شمشیر یروشلم کو فتح کر لیا۔ اس موقع پر قتلِ عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار آدمی مارے گئے۔ ۶۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنائے گئے، ہزارہا آدمی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیئے گئے، ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لیے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لیے چن لی گئیں، اور یروشلم کے شہر اور ہیکل کو مسمار کر کے پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد فلسطین سے یہودی اثر و اقتدار ایسا مٹا کہ دو ہزار برس تک اس کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا اور یروشلم کا ہیکلِ مقدس پھر کبھی تعمیر نہ ہو سکا۔ بعد میں قیصر ہیڈریان نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا، مگر اب اس کا نام ایلیا تھا اور اس میں مدتہائے دراز تک یہودیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔[۳۴۴]

آخری اتمامِ حُجّت

چونکہ بنی اسرائیل صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمائشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، پے در پے کئی انبیاء کو قتل کر چکے تھے اور ہر اُس بندۂ صالح کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انہیں دعوت دیتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کرنے اور انہیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بیک وقت مبعوث کیا جن کے ساتھ مامور من اللہ ہونے کی ایسی کھلی کھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو حق و صداقت سے انتہا درجہ کا عناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلہ میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ ان دونوں پیغمبروں کی دعوت رد کر دی، بلکہ ان کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش پر قلم کرا دیا، اور ان کے علماء و فقہاء نے سازش کر کے حضرت عیسیٰ کو رومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمائش پر مزید وقت

فلسطین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں

صیدا
دمشق
رومی صوبۂ شام
صور
قیساریہ فلپ
فلپس بن ہیرودِ اعظم کی ریاست
بحرِ روم
بیت صیدا
کفرناحوم
گنیسرت کی جھیل
طبریہ
گلیل کا علاقہ
ناصرہ
قیساریہ
دریائے اردن
دیکاپولس (رومی صوبۂ شام کے ماتحت)
پونتس پیلاطس کے زیرِ انتظام علاقہ
سامریہ
سامِریہ
یافا
لُد
یریحو
عمواص
یروشلم
بیت لحم
یہودیہ
حبرون
ہیرود انتی پاس کی ریاست
بحرِ لوط
عسقلان
غزہ
رومی صوبۂ شام کا ایک حصہ
ادومیہ
نبطیوں کا علاقہ
شمال
0 5 10 15 20 25 30

اور قوت صرف کرنا بالکل فضول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بلا لیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔[۳۴۵]

حضرت یحییٰؑ اور اُن سے بنی اسرائیل کا سلوک

حضرت یحییٰؑ کے جو حالات مختلف انجیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں انہیں جمع کر کے ہم یہاں ان کی سیرتِ پاک کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔

لُوقا کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ سے ۶ مہینے بڑے تھے۔ ان کی والدہ اور حضرت عیسیٰؑ کی والدہ آپس میں قریبی رشتہ دار تھیں۔ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ نبوت کے منصب پر عملاً مامور ہوئے اور یُوحنّا کی روایت کے مطابق انہوں نے شرقِ اُردن کے علاقے میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا۔ وہ کہتے تھے:

"میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔"

(یُوحنّا ۱: ۲۳)

مرقس کا بیان ہے کہ وہ لوگوں سے گناہوں کی توبہ کراتے تھے اور توبہ کرنے والوں کو بپتسمہ دیتے تھے یعنی توبہ کے بعد غسل کراتے تھے تاکہ رُوح اور جسم دونوں پاک ہو جائیں۔ یہودیہ اور یروشلم کے بکثرت لوگ ان کے معتقد ہو گئے تھے اور ان کے پاس جا کر بپتسمہ لیتے تھے (مرقس ۱: ۴-۵)۔ اسی بنا پر ان کا نام یُوحنّا بپتسمہ دینے والا (John The Baptist) مشہور ہو گیا تھا۔ عام طور پر بنی اسرائیل ان کی نبوت تسلیم کر چکے تھے (متی ۲۱: ۲۶) مسیح علیہ السلام کا قول تھا کہ "جو عورتوں سے پیدا ہوتے ہیں ان میں یُوحنّا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہُوا" (متی ۱۱: ۱۱)

وہ اُونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھے رہتے تھے اور ان کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا (متی ۳: ۴)۔ اس فقیرانہ زندگی کے ساتھ وہ منادی کرتے پھرتے تھے کہ "توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی قریب آگئی ہے۔" (متی ۳: ۲) یعنی مسیح علیہ السلام کی دعوتِ نبوت کا آغاز ہونے والا ہے۔ اسی بنا پر ان کو عموماً حضرت مسیح کا "ارہاص" کہا جاتا ہے، اور یہی بات ان کے متعلق قرآن میں کہی گئی ہے کہ "مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران ۴)۔

وہ لوگوں کو روزے اور نماز کی تلقین کرتے تھے (متی ۹: ۱۴۔ لُوقا ۵: ۳۳۔ لُوقا ۱۱: ۱)

وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ "جس کے پاس دو کرتے ہوں وہ اس کو جس کے پاس نہ ہو بانٹ دے اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا ہی کرے۔" محصُول لینے والوں نے پوچھا کہ اُستاد، ہم کیا کریں تو انہوں نے فرمایا "جو تمہارے لیے مقرر ہے اس سے زیادہ نہ لینا۔" سپاہیوں نے پوچھا ہمارے لیے کیا ہدایت ہے؟ فرمایا

"نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ناحق کسی سے کچھ لو اور اپنی تنخواہ پر کفایت کرو" (لُوقا ۳: ۱۰-۱۴)

بنی اسرائیل کے بگڑے ہوئے علماء، فریسی اور صدوقی ان کے پاس بپتسمہ لینے آئے تو ڈانٹ کر فرمایا "اَے سانپ کے بچو! تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو؟ — اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابرہام ہمارا باپ ہے .. ..اب درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہُوا ہے۔ پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے" (متی ۳: ۷-۱۰)

ان کے عہد کا یہودی فرمانروا، ہیرودِ اینٹی پاس، جس کی ریاست میں وہ دعوتِ حق کی خدمت انجام دیتے تھے، سرتاپا رومی تہذیب میں غرق تھا اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فسق و فجور پھیل رہا تھا اس نے خود اپنے بھائی فِلپ کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ حضرت یحییٰؑ نے اس پر ہیرود کو ملامت کی اور اس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اٹھائی۔ اِس جُرم میں ہیرود نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ تاہم وہ ان کو ایک مقدس اور راستباز آدمی جان کر ان کا احترام بھی کرتا تھا اور پبلک میں ان کے غیر معمولی اثر سے ڈرتا بھی تھا۔ لیکن ہیرودیاس یہ سمجھتی تھی کہ یحییٰ علیہ السلام جو اخلاقی رُوح قوم میں پھُونک رہے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں اُس جیسی عورتوں کو ذلیل کیے دے رہی ہے۔ اِس لیے وہ ان کی جان کے درپے ہو گئی۔ آخر کار ہیرود کی سالگرہ کے جشن میں اس نے وہ موقع پا لیا جس کی وہ تاک میں تھی۔ جشن کے دربار میں اس کی بیٹی نے خوب رقص کیا جس پر خوش ہو کر ہیرود نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے۔ بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا کیا مانگوں؟ ماں نے کہا کہ یحییٰؑ کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اس نے ہیرود کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کیا مجھے یُوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی منگوا دیجیے۔ ہیرود یہ سُن کر بہت غمگین ہوا۔ مگر محبوبہ کی بیٹی کا تقاضا کیسے رد کر سکتا تھا۔ اُس نے فوراً قید خانے سے یحییٰ علیہ السلام کا سر کٹوا کر منگوایا اور ایک تھال میں رکھوا کر رقاصہ کی نذر کر دیا۔ (متی ۱۴: ۳-۱۲۔ مرقس ۶: ۱۷-۲۹۔ لُوقا ۳: ۱۹-۲۰) ؁۳۲۶

حضرت عیسیٰؑ اور ان سے بنی اسرائیل کا سلوک

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا۔

اور اَے محمدؐ، اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو، جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ بیٹھی تھی۔

سُورۂ آلِ عمران میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے اپنی مانی ہوئی نذر کے مطابق ان کو بَیتُ المَقدِس میں عبادت کے لیے بٹھا دیا تھا اور حضرت زکریاؑ نے ان کی حفاظت و کفالت اپنے ذمے

لے لی تھی۔ وہاں یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت مریمؑ بیت المقدس کی ایک محراب میں معتکف ہوگئی تھیں اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ محراب جس میں حضرت مریمؑ معتکف تھیں بیت المقدس کے شرقی حصے میں واقع تھی اور انہوں نے معتکفین کے عام طریقے کے مطابق ایک پردہ لٹکا کر اپنے آپ کو دیکھنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے محض بائبل کی موافقت کی خاطر مکاناً شرقیاً سے مراد ناصرہ لیا ہے انہوں نے غلطی کی ہے، کیونکہ ناصرہ یروشلم کے شمال میں ہے نہ کہ مشرق میں۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا ۔ قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا ۔ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ۔ قَالَتْ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِیًّا ۔ قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا ۔ (مریم ۔ ۱۷ تا ۲۱)

اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہوگیا۔ مریمؑ یکایک بول اٹھی کہ "اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں"۔ اس نے کہا "میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں"۔ مریمؑ نے کہا "میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں"۔ فرشتے نے کہا "ایسا ہی ہوگا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔ اور یہ کام ہو کر رہنا ہے"۔

حضرت مریمؑ کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ "ایسا ہی ہوگا" ہرگز اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔ انہی الفاظ میں حضرت زکریاؑ کا استعجاب نقل ہو چکا ہے اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مطلب اس کا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ ذاریات، آیات ۲۸ ۔ ۳۰ میں جب فرشتہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور حضرت سارہؑ کہتی ہیں کہ مجھ بوڑھی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہوگا تو فرشتہ ان کو جواب دیتا ہے کہ کَذٰلِكِ "ایسا ہی ہوگا"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود ان کے ہاں اولاد ہونا ہے۔ علاوہ بریں اگر کَذٰلِكِ کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھے چھوئے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہوگا جیسے دنیا بھر

کی عورتوں کے ہاں ہُوا کرتا ہے، تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اِس صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے، اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی کا لفظ یہاں صریح معجزے کے معنی میں استعمال ہُوا ہے اور اسی معنی پر یہ فقرہ بھی دلالت کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے"۔ لہٰذا اِس ارشاد کا مطلب بجز اِس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کی تفصیلات اس بات کی خود تصریح کر رہی ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ذات کو کس طرح معجزہ بنا کر پیش کیا گیا ہے:

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا وَهُزِّىْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۔ فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِىْۤ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۔ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ۔ يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۔ (مریم: ۲۲ تا ۲۸)

"مریم کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دُور کے مقام پر چلی گئی۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وُہ کہنے لگی "کاش میں اِس سے پہلے ہی مرجاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا"۔ فرشتے نے پائنتی سے اس کو پکار کر کہا "غم نہ کر، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے، اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہدے کہ مَیں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی۔ پھر وہ اس بچے کو لیے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے "مریم! یہ تو تُو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اَے ہارُون کی بہن، نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی"۔

دُور کے مقام سے مُراد بیتِ لحم ہے۔ حضرت مریم کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المَقدِس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہوگئی۔ اِس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں اور

ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام باپ کے بغیر پیدا ہوتے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچّہ پیدا ہو رہا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال سب کو چھوڑ چھاڑ کر وہ زچگی کے لیے تنِ تنہا ایک دُور دراز مقام پر چلی جاتیں۔

ان الفاظ سے اس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریمؑ اُس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر ان کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں اُنہیں ڈالا ہے اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چُھپا لیا۔ اب اس بچّے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے ان سے کہا "غم نہ کر" اِس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریمؑ نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچّہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے اسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہُوا کرتا۔

مطلب یہ ہے کہ بچّے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدائش پر جو کوئی بھی معترض ہو اس کا جواب اب ہمارے ذمّے ہے۔ (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ بھی رائج تھا)۔ یہ الفاظ بھی صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت مریمؑ کو اصل پریشانی کیا تھی۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلوٹی کا بچّہ اگر دُنیا کے معروف طریقہ پر پیدا ہو تو آخر اُسے چُپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟

اِن الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں ظاہری معنی میں لیا جائے۔ اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مریمؑ کا کوئی بھائی، ہارون نامی ہو۔ دوسرے یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اُختِ ہارون کے معنی "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے مثلاً قبیلہ مضر کے آدمی کو یا اخا مضر (اے مُضر کے بھائی)، اور قبیلۂ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ھمدان (اے ہمدان کے بھائی) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنی کے حق میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے یہ معنی منقول ہوتے ہیں۔ اور دوسرے معنی کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اس معنی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اس واقعہ سے قوم میں جو ہیجان برپا ہُوا تھا اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک

گمنام شخص کی کنواری بہن گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریمؑ کے گرد جمع کر دیا تھا وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادۂ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیثِ مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل اصولاً قابلِ لحاظ نہیں ہو سکتی، لیکن مسلم، نسائی، ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنی "ہارون کی بہن" ہی ہیں۔ مغیرہؓ بن شعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے حضرت مغیرہؓ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریمؑ کو ہارونؑ کی بہن کہا گیا ہے حالانکہ حضرت ہارونؑ ان سے سینکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہؓ ان کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہ دے سکے اور انہوں نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ "تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیاء اور صلحاء کے نام پر رکھتے تھے"۔ حضورؐ کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا - قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا - وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَتِىْ وَلَمْ يَجْعَلْنِىْ جَبَّارًا شَقِيًّا وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِىْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ -

(مریم - آیات ۲۹ تا ۳۴)

"مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا "ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے"؟ بچہ بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا جہاں بھی رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں، اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں"۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریمؑ اور یہ ہے اس کے بارے میں وہ سچی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔

یہ ہے وہ "نشانی"، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرتناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا

چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک زاہدہ و عابدہ لڑکی کو جو بیتُ المَقدِس میں معتکف اور حضرت زکریاؑ کے زیرِ تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجہات یک لخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریمؑ پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچّے سے کلام کرایا تاکہ جب یہی بچّہ بڑا ہو کر نبوّت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود رہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اُسے مُجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے جو دنیا کی کسی قوم کو نہیں دی گئی۔[۱] ۳۴۷

---

[۱] مزید تشریح (تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران: حاشیہ ۴۴، ۵۳۔ النساء، حاشیہ ۲۱۲-۲۱۳۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۸، ۸۹-۹۰۔ المومنون، حاشیہ ۴۳)

فصل ۱۱

اَصحابُ الرَّس

ان کا ذکر پہلے سورۂ فرقان آیت ۳۸ میں کیا گیا ہے اور اس کے بعد سورۂ قٓ آیت ۱۲ میں دوبارہ ان کا ذکر آیا ہے۔ مگر دونوں جگہ انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کے سلسلے میں صرف ان کا نام ہی لیا گیا ہے کوئی تفصیل ان کے قصّے کی بیان نہیں کی گئی ہے[1]

عرب کی روایات میں الرّس کے نام سے دو مقام معروف ہیں۔ ایک نجد میں، دوسرا شمالی حجاز میں۔ ان میں نجد کا الرّس زیادہ مشہور ہے اور اشعارِ جاہلیت میں زیادہ تر اُسی کا ذکر ملتا ہے۔ اب یہ تعیّن کرنا مشکل ہے کہ اصحاب الرّس ان دونوں میں سے کس جگہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے قصے کی بھی کوئی قابلِ اعتماد تفصیل کسی روایت میں نہیں ملتی۔ زیادہ سے زیادہ بس اتنی بات صحت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ کوئی ایسی قوم تھی جس نے اپنے نبی کو کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ لیکن قرآن مجید میں جس طرح ان کی طرف محض ایک اشارہ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں اہلِ عرب بالعموم اس قوم اور اس کے قصے سے واقف تھے اور بعد میں یہ روایات تاریخ میں محفوظ نہ رہ سکیں۔ ۳۴۸

---

[1] اصحابُ الرَّس کے متعلق تحقیق نہ ہو سکا کہ کون لوگ تھے۔ مفسّرین نے مختلف روایات بیان کی ہیں مگر ان میں سے کوئی چیز قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ ایک ایسی قوم تھی جس نے اپنے پیغمبر کو کنوئیں میں پھینک یا لٹکا کر مار اتھا۔ رس عربی زبان میں پُرانے کنوئیں یا اندھے کنوئیں کو کہتے ہیں (تفہیم القرآن جلد سوم، الفرقان حاشیہ ۵۲)

جلد اوّل ________ حصّہ ۳

بعثت سے پہلے کا ماحول

ب : مُرَوَّجہ مذاہب

باب ۱۴

مُشرِکین

فصل ۱

پُوری انسانی دُنیا پر ایک اجمالی نظر

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جب اسلام کی دعوت پر مامُور ہوئے تو دُنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدّنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رُومی اور ایرانی امپریلزم بھی موجُود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی ہورہا تھا اور اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپؐ کے اپنے ملک میں بہت سے پیچیدہ مسائل موجود تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک مشرقی اور جنوبی عرب کے تمام ساحلی علاقے، عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلّط میں تھے۔ شمال میں حجاز کی سرحد تک رُومی تسلّط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سُود خواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مغربی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکّے پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہب اور اس سے یک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ ۳۴۹

رُوم، یُونان اور ہند

رُوم کے کولوسیم (Colosseum) کے افسانے اب تک تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں جس میں ہزارہا انسان شمشیر زنی (Gladiatory) کے کمالات اور رُومی اُمراء کے شوقِ تماشا کی نذر ہو گئے۔ مہمانوں کی تفریح کے لیے یا دوستوں کی تواضع کے لیے غلاموں کو درندوں سے پھڑوا دینا، یا جانوروں کی طرح ذبح کرا دینا، یا ان کے جلنے کا تماشا دیکھنا، یورپ اور ایشیا کے اکثر ممالک میں کوئی معیوب کام نہ تھا۔ قیدیوں اور غلاموں کو مختلف طریقوں سے عذاب دے دے کر مار ڈالنا اس عہد کا عام دستور تھا۔ جاہل و خونخوار اُمراء سے گزر کر یونان و روما کے بڑے بڑے حکماء و فلاسفر کے اجتہادات میں بھی انسانی جانوں کو بے قصور ہلاک کرنے کی بہت سی وحشیانہ صُورتیں جائز تھیں۔

ارسطو و افلاطون جیسے اساتذۂ اخلاق ماں کو یہ اختیار دینے میں کوئی خرابی نہ پاتے تھے کہ وہ اپنے جسم کے ایک حصّہ (یعنی جنین) کو الگ کر دے۔ چنانچہ یونان و روما میں اسقاطِ حمل کوئی ناجائز فعل نہ تھا۔ باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پُورا حق تھا اور رُومی مقنّنوں کو اپنے قانون کی اِس خصوصیت پر فخر تھا کہ اس میں اولاد پر باپ کے اختیارات اس قدر غیر محدُود ہیں۔ حکماء رواقیین (Stoics) کے نزدیک خودکشی کوئی بُری چیز نہ تھی، بلکہ ایک ایسی عزت کی بات تھی کہ لوگ جلسے کر کے ان میں خودکُشیاں کیا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ افلاطون جیسا حکیم بھی اسے کوئی بڑی معصیت نہ سمجھتا تھا۔ شوہر کے لیے اپنی بیوی کا قتل بالکل ایسا تھا جیسے وہ اپنے کسی پالتو جانور کو ذبح کر دے، اِس لیے قانونِ یُونان میں اس کی کوئی سزا نہ تھی۔ جیو رکھشا کا گہوارہ ہندوستان ان سب سے بڑھا ہوا تھا۔ یہاں مُردہ شوہر کی لاش پر زندہ بیوہ کو جلا دینا ایک جائز فعل تھا (کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عورتیں شوہر کی چِتا میں جلائی نہ جاتی تھیں بلکہ خود جلتی تھیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مختلف طریقوں سے سوسائٹی کا دباؤ ہی ان کو یہ ہولناک خودکشی کرنے پر مجبُور کرتا تھا) اور مذہبًا اس کی تاکید تھی۔ شُودر کی جان کی کوئی قیمت نہ تھی اور صرف اِس بنا پر کہ وہ غریب برہما کے پاؤں سے پیدا ہُوا ہے، اُس کا خون برہمن کے لیے حلال تھا۔ وید کی آواز سُن لینا شُودر کے لیے اتنا بڑا گناہ تھا کہ اس کے کان میں پگھلا ہُوا سیسہ ڈال کر اسے مار ڈالنا نہ صرف جائز تھا بلکہ ضروری تھا۔ ”جل پروا“ کی رسم عام تھی جس کے مطابق ماں باپ اپنے پہلے بچہ کو دریائے گنگا کی نذر کر دیتے تھے اور اس قساوت کو اپنے لیے مُوجبِ سعادت سمجھتے تھے۔ ۳۵۰؎

شِرک کا عالمگیر روگ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم توحید کی دعوت لے کر اُٹھے اُس وقت دُنیا کے مذہبی تصوُّرات کیا تھے۔ بت پرست مشرکین اُن خداؤں کو پُوج رہے تھے جو لکڑی، پتھر، سونے، چاندی وغیرہ مختلف چیزوں کے بنے ہوئے ہونے تھے۔ شکل، صورت اور جسم رکھتے تھے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی باقاعدہ نسل چلتی تھی۔ کوئی دیوی بے شوہر نہ تھی اور کوئی دیوتا بے زوجہ نہ تھا۔ ان کو کھانے پینے کی ضرورت بھی لاحق ہوتی تھی اور اُن کے پرستار اُن کے لیے اس کا انتظام کرتے تھے۔ مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور کرتا ہے اور کچھ لوگ اس کے اَوتار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ ایک خدا کو ماننے کے مدعی تھے، مگر اُن کا خدا بھی کم از کم ایک بیٹا تو رکھتا ہی تھا۔ اور باپ بیٹے کے ساتھ خدائی میں رُوح القدس کو بھی حصّہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا حتیٰ کہ خدا کی ماں بھی ہوتی تھی اور اُس کی ساس بھی۔ یہُودی بھی ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، مگر اُن کا خدا بھی مادّیت اور جسمانیت اور دوسری انسانی صفات سے خالی نہ تھا۔ وہ ٹہلتا تھا۔ انسانی شکل

میں نمودار ہوتا تھا۔ اپنے کسی بندے سے کُشتی بھی لڑ لیتا تھا اور ایک عدد بیٹے (عُزَیر) کا باپ بھی تھا۔ ان مذہبی گروہوں کے علاوہ مجوس آتش پرست تھے اور صابئی ستارہ پرست۔ ۳۵۱

انسانیت کی باطل تقسیموں کا فتنہ

قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دَور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اس نے اپنا اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور اخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی پیدائش کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں۔ کہیں ان کی بنا ایک خاندان، قبیلے یا نسل میں پیدا ہونا ہے، اور کہیں ایک جغرافی خطّے میں یا ایک خاص رنگ والی یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہو جانا۔ پھر ان بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم ہوگئی ہے وہ صرف اِس حد تک محدُود نہیں رہی ہے کہ جنہیں اِس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو ان کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اس تمیز نے غیروں کے ساتھ نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں۔ مذہب ایجاد کیے گئے ہیں۔ قوانین بنائے گئے ہیں۔ اخلاقی اصول وضع کئے گئے ہیں۔ قوموں اور سلطنتوں نے اس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے اسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق ٹھیرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں وَرن آشرم کو اِسی تمیز نے جنم دیا جس کی رُو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اُونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھیرائے گئے، اور شُودروں کو انتہائی ذلّت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، آج اس بیسویں صدی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے برّاعظم امریکہ میں گھُس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا اور ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلّط قائم کر کے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا اس کی تہ میں بھی یہی تصوّر کارفرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے حدُود سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال اور آبرو اُن پر مباح ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ ان کو لوٹیں، غلام بنائیں اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں کے لیے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے اس کی بدترین مثالیں زمانۂ قریب کی لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہیں اور آج دیکھی جا رہی ہیں۔ خصوصیّت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیت اور نارڈک نسل کی برتری کا تصوّر پچھلی جنگِ عظیم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی ہے۔[1]

---

[1] الحجرات آیت ۱۳۔

فصل ۲

مُشرکینِ عرب کا مذہب اور معاشرتی رُسوم و اَطوار

مُشرکینِ عرب کا معاشرہ ایک نظر میں

اُس تاریک دَور میں زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تاریکی کا تصرُّف اور بھی زیادہ بڑھا ہُوا تھا۔ جو ممالک اُس زمانے کے معیارِ تمدُّن کے لحاظ سے متمدّن تھے ان کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہُوا تھا۔ اس کے اردگرد ایران، روم اور مصر کے ملکوں میں علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی کچھ روشنی پائی جاتی تھی۔ مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جُدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی راہ طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے اور صرف اموال کا تبادلہ کر کے واپس آجاتے تھے۔ علم و تہذیب کی کوئی روشنی ان کے ساتھ نہ آتی تھی۔ ان کے ملک میں نہ کوئی مدرسہ تھا، نہ کتب خانہ تھا، نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا، نہ علوم و فنون سے کوئی دلچسپی تھی۔ تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنہیں کچھ لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ مگر وہ بھی اتنا نہیں کہ اس زمانہ کے علوم و فنون سے آشنا ہوتے۔ اُن کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی باقاعدہ زبان ضرور تھی جس میں بلند خیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان میں بہترین ادبی مذاق بھی موجود تھا۔ مگر ان کے لٹریچر کے جو کچھ باقیات ہم تک پہنچے ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کس قدر محدود تھیں، تہذیب و تمدّن میں ان کا درجہ کس قدر پست تھا، اُن پر اَوہام کا کس قدر غلبہ تھا، ان کے خیالات اور ان کی عادات میں کتنی جہالت اور وحشت تھی، اُن کے اخلاقی تصوّرات کتنے بھدّے تھے۔

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ کوئی ضابطہ اور قانون نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا، اور صرف "جنگل کے قانون" کی پیروی کی جاتی تھی۔ جس کا جس پر بس چلتا اُسے مار ڈالتا اور اس کے مال پر قابض ہو جاتا۔ یہ بات ایک عرب بدوی کے فہم سے بالاتر تھی کہ جو شخص اس کے قبیلہ کا نہیں ہے اُسے آخر وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اس کے مال پر کیوں نہ متصرّف ہو جائے؟

اَخلاق و تہذیب و شائستگی کے جو کچھ بھی تصورات ان لوگوں میں تھے وہ نہایت ادنیٰ اور سخت ناتراشیدہ

تھے۔ پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً نا آشنا تھے۔ اُن کی زندگی نہایت گندی تھی۔ ان کے طریقے وحشیانہ تھے۔ زنا، جُوا، شراب، چوری، رہزنی اور قتل و خونریزی ان کی زندگی کے معمولات تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلّف برہنہ ہو جاتے تھے۔ ان کی عورتیں تک ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ وہ اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کر دیتے تھے محض اس جاہلانہ خیال کی بنا پر کہ کوئی اُن کا داماد نہ بنے۔ وہ اپنے باپوں کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ انہیں کھانے اور لباس اور طہارت کے معمولی آداب تک معلوم نہ تھے۔

مذہب کے باب میں وہ ان تمام جہالتوں اور ضلالتوں کے حصہ دار تھے جن میں اُس زمانہ کی دُنیا مبتلا تھی۔[1] بُت پرستی، ارواح پرستی، کواکب پرستی، غرض ایک خدا کی پرستش کے سوا اس وقت دُنیا میں جتنی "پرستیاں" پائی جاتی تھیں وہ سب ان میں رائج تھیں۔ انبیائے قدیم اور ان کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم ان کے پاس نہ تھا۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ ان کے باپ ہیں۔ مگر یہ نہ جانتے تھے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عاد اور ثمود کے قصّے بھی ان میں مشہور تھے مگر ان کی جو روایتیں عرب کے مؤرخین نے نقل کی ہیں ان کو پڑھ جائیے۔ کہیں آپ کو صالحؑ اور ہودؑ کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ ان کو یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے انبیائے بنی اسرائیل کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں، مگر وہ جیسی کچھ تھیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک نظر اُن اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے جو مفسرین اسلام نے نقل کی ہیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہل عرب اور خود بنی اسرائیل جن انبیاء سے واقف تھے وہ کیسے انسان تھے اور نبوت کے متعلق ان لوگوں کا تصور کس قدر گھٹیا درجہ کا تھا۔[۳۵۳]

حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی پیروی کا زعم

زمانۂ جاہلیت کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا پیرو کہتے اور سمجھتے تھے اور اسی بنا پر اُن کا خیال یہ تھا کہ جس مذہب کا وہ اتباع کر رہے ہیں وہ خدا کا پسندیدہ مذہب ہی ہے۔ لیکن جو دین ان لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے سیکھا تھا اس کے اندر بعد کی صدیوں میں مذہبی پیشوا، قبائل کے سردار، خاندانوں کے بڑے بوڑھے اور مختلف لوگ طرح طرح کے عقائد اور اعمال اور رسوم کا اضافہ کرتے چلے گئے جنہیں آنے والی نسلوں نے اصل مذہب کا جُز سمجھا اور عقیدت مندی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ چونکہ روایات میں یا تاریخ میں یا کسی کتاب میں ایسا کوئی ریکارڈ محفوظ نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ اصل مذہب کیا تھا اور بعد میں

---

[1] عربوں کے مذہبی حالات پر ایک مستقل فصل آگے آ رہی ہے۔ (مرتّبین)

کیا چیزیں کس زمانہ میں کس نے کس طرح اضافہ کیں، اِس وجہ سے اہلِ عرب کے لیے ان کا پورا دین مشتبہ ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ کسی چیز کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ اس اصل دین کا جزء ہے جو خدا کی طرف سے آیا تھا اور نہ یہی جانتے تھے کہ یہ بدعات اور غلط رسوم ہیں جو بعد میں لوگوں نے بڑھا دیں۔[1] ۳۵۔ھ

مُشرِکینِ عرب کے چند مشہور ترین بُت

لات

اس کا استھان طائف میں تھا اور بنی ثَقیف اس کے اس حد تک معتقد تھے کہ جب اَبرَہہ ہاتھیوں کی فوج لے کر خانۂ کعبہ کو توڑنے کے لیے مکّہ پر چڑھائی کرنے جا رہا تھا اس وقت ان لوگوں نے محض اپنے اِس معبُود کے آستانے کو بچانے کی خاطر اُس ظالم کو مکّے کا راستہ بتانے کے لیے بَدرَقے فراہم کیے تاکہ وہ لات کو ہاتھ نہ لگائے، حالانکہ تمام اہلِ عرب کی طرح ثقیف کے لوگ بھی یہ مانتے تھے کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے۔ لات کے معنی میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن جریر طَبَری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اللہ کی تانیث ہے، یعنی اصل میں یہ لفظ اَللّٰہَۃُ تھا جسے اللّات کر دیا گیا۔ زَمَخشَری کے نزدیک یہ لَوٰی یَلْوِی سے مشتق ہے جس کے معنی مڑنے اور کسی کی طرف جھکنے کے ہیں۔ چونکہ مشرکین عبادت کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے اور اس کے آگے جھکتے اور اس کا طواف کرتے تھے اس لیے اس کو لات کہا جانے لگا۔ ابن عباسؓ اس کو لاتّ بتشدید تاء پڑھتے ہیں اور اسے لَتَّ یَلِتُّ سے مشتق قرار دیتے ہیں جس کے معنی مَتھنے اور لتھیڑنے کے ہیں۔ اُن کا اور مجاہد کا بیان ہے کہ یہ دراصل ایک شخص تھا جو طائف کے قریب ایک چٹان پر رہتا تھا اور حج کے لیے جانے والوں کو سَتُّو پلاتا اور کھانا کھلاتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اُسی چٹان پر اُس کا استھان بنا لیا اور اُس کی عبادت کرنے لگے۔ مگر لات کی یہ تشریح ابنِ عباسؓ اور مُجاہد جیسے بزرگوں سے مروی ہونے کے باوجود دو وجوہ سے قابلِ قبول نہیں ہے۔ ایک یہ کہ قرآن میں اسے لات کہا گیا ہے نہ کہ لاتّ۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید ان تینوں کو دیویاں بتا رہا ہے، اور اس روایت کی رُو سے لات مرد تھا نہ کہ عورت۔

عُزّیٰ

عِزّت سے ہے اور اس کے معنی عزّت والی کے ہیں۔ یہ قریش کی خاص دیوی تھی اور اس کا استھان مکّہ اور

---

[1] عربوں کے عقائد اور مذہبی مراسم میں سے جن چند باتوں کو قرآن نے صحیح یا غلط قرار دیا ہے، ہم صرف ان کے متعلق ضمنی طور پر جانتے ہیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ (مُرتّبین)

طائف کے درمیان وادیٔ نخلہ میں حُراض کے مقام پر واقع تھا۔ بنی ہاشم کے حلیف بنی شَیبان کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ قریش اور دوسرے قبائل کے لوگ اس کی زیارت کرتے اور اس پر نذریں چڑھاتے اور اس کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ کعبہ کی طرح اس کی طرف بھی ہَدِی کے جانور لے جائے جاتے اور تمام بُتوں سے بڑھ کر اُس کی عزت کی جاتی تھی۔ ابنِ ہشام کی روایت ہے کہ ابو اُحَیحَہ جب مرنے لگا تو ابُولَہَب اس کی عیادت کے لیے گیا۔ دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔ ابُولہب نے کہا کیوں روتے ہو ابُو اُحَیحہ؟ کیا موت سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ وہ سب ہی کو آنی ہے۔ اس نے کہا خدا کی قسم مَیں موت سے ڈر کر نہیں روتا، بلکہ مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے بعد عُزّیٰ کی پُوجا کیسے ہو گی؟ ابُولہب بولا، اُس کی پُوجا نہ تمہاری زندگی میں تمہاری خاطر ہوتی تھی اور نہ تمہارے بعد اُسے چھوڑا جائے گا۔ ابُو اُحَیحَہ نے کہا اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے بعد کوئی میری جگہ سنبھالنے والا ہے۔

مَناۃ

اس کا استھان مکّہ اور مدینہ کے درمیان بحرِ احمر کے کنارے قُدَید کے مقام پر تھا اور خاص طور پر بنی خُزاعہ اور اَوس اور خَزرَج کے لوگ اس کے بہت معتقد تھے۔ اس کا حج اور طواف کیا جاتا اور اس پر نذر کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ زمانۂ حج میں جب حُجّاج طوافِ بیتُ اللہ اور عرفات اور مِنیٰ سے فارغ ہو جاتے تو وہیں سے مَناۃ کی زیارۃ کے لیے لبّیک لبّیک کی صدائیں بلند کر دی جاتیں اور جو لوگ اِس دوسرے "حج" کی نیت کر لیتے وہ صفا اور مَروَہ کے درمیان سعی نہ کرتے تھے۔ ۳۵۵

قومِ نُوح کے اَصنام

قومِ نُوحؑ کے معبُودوں میں سے سُورۂ نوحؑ میں صرف اُن معبُودوں کے نام لیے گئے ہیں جنہیں بعد میں اہلِ عرب نے بھی پُوجنا شروع کر دیا تھا اور آغازِ اسلام کے وقت عرب میں جگہ جگہ ان کے مندر بنے ہوئے تھے۔ بعید نہیں کہ طوفان میں جو لوگ بچ گئے تھے ان کی زبان سے بعد کی نسلوں نے قومِ نوحؑ کے قدیم معبُودوں کا ذکر سُنا ہو اور جب از سرِ نَو ان کی اولاد میں جاہلیت پھیلی تو انہی معبُودوں کے بُت بنا کر انہوں نے پھر انہیں پُوجنا شروع کر دیا ہو۔

(۱) وَدّ

قبیلۂ قُضاعہ کی شاخ بنی کَلب بن وَبرَہ کا معبُود تھا جس کا استھان انہوں نے دُومَۃُ الجَندَل میں بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات میں اس کا نام وَدَّم اَبَم (ودّ بابا) لکھا ہُوا ملتا ہے۔ کلبی کا بیان ہے کہ اس کا

بُت ایک نہایت عظیم الجثہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور اس کا نام ان کے ہاں وُدّ تھا۔ اسی کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام عبدِ وُدّ ملتا ہے۔

(۲) سُواع

قبیلۂ ہُذَیل کی دیوی تھی اور اس کا بُت عورت کی شکل کا بنایا گیا تھا۔ ینبوع کے قریب رُہاط کے مقام پر اس کا مندر واقع تھا۔

(۳) یَغُوث

قبیلۂ طے کی شاخ اَنعُم اور قبیلہ مذحج کی بعض شاخوں کا معبود تھا۔ مذحج والوں نے یمن اور حجاز کے درمیان جُرش کے مقام پر اس کا بُت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی بعض کا نام عبد یغوث ملتا ہے۔

(۴) یَعُوق

یمن کے علاقہ ہَمدان میں قبیلۂ ہَمدان کی شاخ خَیوان کا معبود تھا اور اس کا بُت گھوڑے کی شکل کا تھا۔

(۵) نَسر

حِمیَر کے علاقے میں قبیلۂ حِمیَر کی شاخ آلِ ذوالکلاع کا معبود تھا اور بَلخع کے مقام پر اس کا بُت نصب تھا جس کی شکل گدِھ کی تھی۔ سبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام نَسور لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مندر کو وہ لوگ بیتِ نسور، اور اس کے پجاریوں کے اہلِ نَسور کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے جو آثار عرب اور اس کے متصل علاقوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گدھ کی تصویر بنی ہوئی ہے[۳۵۶]

مشہور بُت بَعل

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ۔ (الصّٰفّٰت۔۱۲۵)

(حضرت الیاسؑ نے کہا) کیا تم بَعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے تھے۔

بعل کے لغوی معنی آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوہر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا اور متعدد مقامات پر خود قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸، سورۂ نساء آیت[۱۲۷]۔ سورۂ ہود آیت ۷۲، اور سورۂ نور آیت ۳۱ میں۔ لیکن قدیم زمانے کی سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنی میں استعمال کرتی تھیں اور انہوں نے ایک خاص دیوتا کو بعل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا خصوصیت کے ساتھ لُبنان کی فنیقی قوم (Phoenicians) کا سب سے بڑا دیوتا بَعل تھا اور اس کی بیوی عستارات (Ashtoreth) ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اِس امر

میں اختلاف ہے کہ آیا بعل سے مراد سورج ہے یا مشتری، اور عستارات سے مراد چاند ہے یا زہرہ۔ بہرحال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابل سے لے کر مصر تک پورے مشرقِ اوسط میں بعل پرستی پھیلی ہوئی تھی، اور خصوصاً لبنان اور شام و فلسطین کی مشرک اقوام بُری طرح اس میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد فلسطین اور شرقِ اُردن میں آکر آباد ہوئے اور توراۃ کے سخت امتناعی احکام کی خلاف ورزی کرکے انہوں نے ان مشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کر دیئے تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشَع بن نون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں یہ اخلاقی و دینی زوال رُونما ہونا شروع ہو گیا تھا:

"اور بنی اسرائیل نے خدا کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے ... ... اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے۔" (قُضاۃ، ۲: ۱۱-۱۳)

"سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور حِتّیوں اور اَموریوں اور فرزّیوں اور حَوّیوں اور یبوسیوں کے درمیان بس گئے اور ان کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو دینے اور ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے۔" (قُضاۃ ۲: ۵-۶)

اُس زمانہ میں بعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گھس چکی تھی کہ بائیبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں عَلانیہ بعل کا مذبح بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مذبح توڑ دیا۔ دوسرے دن ایک مجمعِ کثیر اکٹھا ہو گیا اور وہ اس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اڈّے کو توڑا تھا۔ اِس صورتِ حال کو آخرکار حضرت سموایل، طالوت، داؤد علیہ السّلام اور سُلیمان علیہ السّلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی بلکہ اپنی مملکت میں بالعموم شرک و بت پرستی کو دبا دیا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر اُبھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بعل پرستی کے سیلاب میں بہ گئی۔ ۳۵۷

بُت پرستی کے ساتھ خدا کا برتر تصوّر

مشرکینِ عرب اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے۔ وہی دن نکالتا اور رات لاتا ہے اور اُسی نے آفتاب و ماہتاب کو وجود بخشا ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ عقیدہ نہ تھا کہ یہ کام لات یا ہُبل یا عُزّیٰ یا کسی اور دیوتا کے ہیں۔ ۳۵۸

قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے بارے میں مُشرکینِ عرب کا عقیدہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر سُورۂ زُخرُف میں ہے: "اگر تم اِن سے پُوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے"

(آیت ۸۷)۔ سورۂ عنکبوت میں ہے: "اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخّر کر رکھا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ ... ... اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مردہ پڑی ہوئی زمین کو جلا اٹھایا تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔" (آیات ۶۱ تا ۶۳)

سورۂ مومنون میں ہے: "ان سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ کی ... ... ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ ... ... ان سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے؟ اور کون ہے جو پناہ دیتا ہے اور اُس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور جواب دیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے" (آیات ۸۴ تا ۸۹)۔

سورۂ یونس میں ہے: "ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں (جو تمہیں حاصل ہیں) کس کے اختیار میں ہیں؟ اور کون زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون اِس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ" (آیت ۳۱)۔ اسی سورۂ یونس میں ایک اور جگہ ہے: "جب تم لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُس سے دُعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اِس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں (آیات ۲۲-۲۳)۔ یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں یوں دہرائی گئی ہے: "جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اُس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ (آیت ۶۷)۔ ۳۵۹

اموال میں خدا کے ساتھ بتوں کا حصّہ

وہ اِس بات کے خود قائل تھے کہ زمین اللہ کی ہے اور کھیتیاں وُہی اُگاتا ہے، اُن جانوروں کا خالق بھی اللہ ہی ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خدمت لیتے ہیں لیکن اُن کا تصوّر یہ تھا کہ اُن پر اللہ کا یہ فضل اُن دیویوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں اور جنّات اور آسمانی ستاروں اور بزرگانِ سلف کی ارواح کے طفیل و برکت سے ہے جو ان پر نظرِ کرم رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو حصّے نکالتے تھے۔ ایک حصّہ اللہ کے نام کا، اِس شکریہ میں کہ اُس نے یہ کھیت اور یہ جانور انہیں بخشے، اور دوسرا حصّہ اپنے قبیلہ یا خاندان کے سرپرست معبودوں کی نذر و نیاز کا، تاکہ اُن کی مہربانیاں ان کے شاملِ حال رہیں۔ ۳۶۰

خدا پر بتوں کو ترجیح

لیکن، وہ خدا کے نام سے جو حصّہ نکالتے تھے اس میں بھی طرح طرح کی چالبازیاں کر کے کمی کرتے رہتے تھے اور ہر صورت سے اپنے خود ساختہ شریکوں کا حصّہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جو دلچسپی انہیں اپنے ان شریکوں سے ہے وہ خدا سے نہیں ہے۔ مثلاً جو غلّے یا پھل وغیرہ خدا کے نام پر نکالے جاتے ان میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شریکوں کے حصّہ میں شامل کر دیا جاتا تھا اور اگر شریکوں کے حصّے میں سے گرتا یا خدا کے حصّے میں مل جاتا تو اُسے اُنہی کے حصّہ میں واپس کیا جاتا۔ کھیت کا جو حصّہ شریکوں کی نذر کے لیے مخصوص کیا جاتا تھا اگر اُس میں سے پانی اُس حصّہ کی طرف چھوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تھا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصّہ میں داخل کر دی جاتی تھی۔ لیکن اگر اس کے برعکس صورت پیش آتی تو خدا کے حصّہ میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا غلّہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو خدا کا حصہ کھا لیتے تھے مگر شریکوں کے حصّہ کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصّہ میں کچھ کمی آجاتی تو وہ خدا کے حصّہ سے پوری کی جاتی تھی لیکن خدا کے حصہ میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصّہ میں سے ایک حبّہ بھی اس میں نہ ڈالا جاتا۔ اِس طرزِ عمل پر کوئی نکتہ چینی کرتا تو جواب میں طرح طرح کی دلفریب توجیہیں کی جاتی تھیں۔ مثلاً کہتے تھے کہ خدا تو غنی ہے اس کے حصّہ میں کچھ کم بھی ہو جائے تو اُسے کیا پروا ہو سکتی ہے۔ رہے ہمارے یہ شریک، تو یہ بندے ہیں۔ خدا کی طرح غنی نہیں ہیں اس لیے ذرا سی کمی بیشی پر بھی ان کے ہاں گرفت ہو جاتی ہے۔

ان توہّمات کی اصل جڑ کیا تھی اس کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ جہلائے عرب اپنے مال میں سے جو حصّہ خدا کے لیے نکالتے تھے وہ فقیروں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مدد میں صرف کیا جاتا تھا۔ اور جو حصّہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لیے نکالتے تھے وہ یا تو براہِ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر چڑھاوے کی صورت میں پیش کیا جاتا اور اُس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پُجاریوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی لیے ان کے خود غرض مذہبی پیشواؤں سے صدیوں کی مُسلسل تلقین سے ان جاہلوں کے دل میں یہ بات بٹھائی تھی کہ خدا کے حصّہ میں کمی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں مگر "خدا کے پیاروں" کے حصّہ میں کمی نہ ہونی چاہیے بلکہ حتی الامکان کچھ بیشی ہی ہوتی رہے تو بہتر ہے۔ [۳۶۱]

مُشرکین کی اصل گمراہی کیا تھی؟

اگرچہ مُشرکین مکہ اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں اور اِن نعمتوں پر اللہ کا احسان ماننے سے بھی انہیں انکار نہ تھا۔ لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی۔

کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن بہت سی ہستیوں کا شکریہ بھی زبان اور عمل سے ادا کرتے تھے جن کو انہوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی سند کے اس نعمت بخشی میں دخیل اور حصّہ دار ٹھیرا رکھا ہے۔

اسی چیز کو قرآن "اللہ کے احسان کا انکار" قرار دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بطور ایک قاعدۂ کلیہ کے پیش کی گئی ہے کہ محسن کے احسان کا شکریہ غیر محسن کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ محسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا کہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ فلاں شخص کے طفیل، یا فلاں کی رعایت سے، یا فلاں کی سفارش سے، یا فلاں کی مداخلت سے کیا ہے۔ یہ بھی دراصل اس کے احسان کا انکار ہی ہے[۱۲]

اپنے معبودوں کے متعلق اہلِ عرب کے تصوّرات

اہلِ عرب اگرچہ شرک میں مبتلا تھے اور سخت تعصب کی حد تک مبتلا تھے، مگر درحقیقت اس کی جڑیں اوپری سطح ہی تک محدود تھیں، کچھ گہری اُتری ہوئی نہ تھیں، اور دنیا میں کبھی کہیں بھی شرک کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری اُتری ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس خالص خدا پرستی کی عظمت ان کے ذہن کی گہرائیوں میں رچی ہوئی موجود تھی جس کو اُبھارنے کے لیے اُوپر کی سطح کو بس ذرا زور سے کھرچ دینے کی ضرورت تھی۔

جاہلیت کی تاریخ کے متعدد واقعات ان دونوں باتوں کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً ابرہہ کے حملے کے موقع پر قریش کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ اس بلا کو وہ بُت نہیں ٹال سکتے جو خانۂ کعبہ میں رکھے ہوئے ہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ٹال سکتا ہے جس کا یہ گھر ہے۔ آج تک وہ اشعار اور قصائد محفوظ ہیں جو اصحاب الفیل کی تباہی پر ہم عصر شعراء نے کہے تھے۔ اُن کا لفظ لفظ گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ اس واقعہ کو محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ سمجھتے تھے اور اس امر کا ادنیٰ سا گمان بھی نہ رکھتے تھے کہ اس میں اُن کے معبودوں کا کوئی دخل ہے۔ اسی موقع پر شرک کا یہ بدترین کرشمہ بھی قریش اور تمام مشرکینِ عرب کے سامنے آیا تھا کہ ابرہہ جب مکے کی طرف جاتے ہوئے طائف کے قریب پہنچا تو اہلِ طائف نے اس اندیشے سے کہ یہ کہیں اُن کے معبود "لات" کے مندر کو بھی نہ گرا دے، اپنی خدمات کعبے کو منہدم کرنے کے لیے اُس کے آگے پیش کر دیں اور اپنے بدرقے اس کے ساتھ کر دیے تاکہ وہ پہاڑی راستوں سے اس کے لشکر کو بخیریت مکہ تک پہنچا دیں۔ اس واقعہ کی تلخ یاد مدتوں تک قریش کو ستاتی رہی اور سالہا سال تک وہ اس شخص کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے جو طائف کے بدرقے کا سردار تھا۔

علاوہ بریں قریش اور دوسرے اہلِ عرب اپنے دین کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے تھے، اپنے بہت سے مذہبی اور معاشرتی مراسم اور خصوصاً مناسکِ حج کو دینِ ابراہیمی ہی کے اجزاء قرار دیتے تھے،

اور یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ خالص خدا پرست تھے، بتوں کی پرستش انہوں نے کبھی نہیں کی۔ ان کے ہاں کی روایات میں یہ تفصیلات بھی محفوظ تھیں کہ بت پرستی اُن کے ہاں کب سے رائج ہوئی اور کون سا بت کب کہاں سے، کون لایا؟

اپنے معبودوں کی جیسی کچھ عزت ایک عام عرب کے دل میں تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب کبھی اس کی دعاؤں اور تمناؤں کے خلاف کوئی واقعہ ظہور میں آجاتا تو بسا اوقات وہ معبود صاحب کی توہین بھی کر ڈالتا تھا اور اس کی نذر و نیاز سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ ایک عرب اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ذوالخلصہ نامی بت کے آستانے پر جا کر اس نے فال کھلوائی۔ جواب نکلا یہ کام نہ کیا جائے۔ اس پر عرب طیش میں آگیا۔ کہنے لگا:

لَوْ كُنْتَ يَا ذَا الْخَلَصِ الْمَوْتُورَا ۔۔۔ مِثْلِي وَكَانَ شَيْخُكَ الْمَقْبُورَا

لَمْ تَنْهَ عَنْ قَتْلِ الْعُدَاةِ زُورًا

"یعنی اے ذوالخلصہ! اگر میری جگہ تو ہوتا اور تیرا باپ مارا گیا ہوتا تو ہرگز تو یہ جھوٹی بات نہ کہتا کہ ظالموں سے بدلہ نہ لیا جائے۔"

ایک اور عرب صاحب اپنے اونٹوں کا گلہ اپنے معبود سعد نامی کے آستانے پر لے گئے تاکہ ان کے لیے برکت حاصل کریں۔ یہ ایک لمبا تڑنگا بت تھا جس پر قربانیوں کا خون لتھڑا ہوا تھا۔ اونٹ اسے دیکھ کر بھڑک گئے اور ہر طرف بھاگ نکلے۔ عرب اپنے اونٹوں کو اس طرح تتر بتر ہوتے دیکھ کر غصے میں آگیا۔ بت پر پتھر مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ "خدا تیرا ستیاناس کرے۔ میں آیا تھا برکت لینے کے لیے اور تو نے میرے رہے سہے اونٹ بھی بھگا دیئے۔"

متعدد بت ایسے تھے جن کی اصلیت کے متعلق نہایت گندے قصے مشہور تھے مثلاً اِساف اور نائلہ جن کے مجسمے صفا اور مروہ پر رکھے ہوئے تھے، ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دونوں دراصل ایک عورت اور ایک مرد تھے جنہوں نے خانہ کعبہ میں زنا کا ارتکاب کیا تھا اور خدا نے ان کو پتھر بنا دیا۔ یہ حقیقت جن معبودوں کی ہو ظاہر ہے کہ ان کی کوئی حقیقی عزت تو عابدوں کے دلوں میں نہیں ہو سکتی۔[۳۶۳]

---

[۱] اِن مختلف پہلوؤں کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ خالص خدا پرستی کی ایک گہری قدر و منزلت تو دلوں میں موجود تھی مگر ایک طرف جاہلانہ قدامت پرستی نے اس کو دبا رکھا تھا اور دوسری طرف قریش کے پروہت اس کے خلاف تعصبات بھڑکاتے رہتے تھے کیونکہ بتوں کی عقیدت ختم ہو جانے سے ان کو اندیشہ تھا کہ

صالحینِ سلف کے بُت

عرب کے متعدد قبائل، ربیعہ، غسّان، کلب، تغلب، قُضاعہ، کنانہ، حرث، کعب، کندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے۔ اور یہ دونوں مذاہب بُری طرح انبیاء، اولیاء اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے۔ پھر مشرکینِ عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے معبود وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے جنہیں بعد کی نسلوں نے خدا بنا لیا تھا۔ بخاری میں ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق، نَسر یہ سب صالحین کے نام ہیں جنہیں بعد کے لوگ بُت بنا بیٹھے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اِساف اور نائلہ دونوں انسان تھے۔ اسی طرح کی روایات لات اور مَناة اور عُزّیٰ کے بارے میں بھی موجود ہیں اور مشرکین کا یہ عقیدہ بھی روایات میں آیا ہے کہ لات اور عُزّیٰ اللہ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ میاں جاڑا لات کے ہاں اور گرمی عُزّیٰ کے ہاں بسر کرتے تھے۔ (سُبحانہٗ وتعالیٰ عمّا یصِفُون)۔ ۳۶۵ھ

اصحابِ قبور کی پرستش

سُورۂ نحل آیت ۲۱ میں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی گئی ہے وہ فرشتے یا جن یا شیاطین، یا لکڑی پتھر کی مُورتیاں نہیں ہیں، بلکہ اصحابِ قبور ہیں۔ اِس لیے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں ان پر اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور لکڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملہ میں بعث بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اِس لیے مَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ کے الفاظ انہیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اِس آیت میں اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ سے مُراد وہ انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین داتا، مشکل کُشا، فریاد رس، غریب نواز، گنج بخش، اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لیے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اِس نوعیت کے معبود نہیں پائے جاتے تھے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ جاہلیّتِ عرب کی تاریخ سے اس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ ۳۶۶ھ

۴۔ عرب میں ان کو جو مرکزیت حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی اور ان کی آمدنی میں بھی فرق آجائے گا۔ ان سہاروں پر جو مذہبِ شرک قائم تھا وہ توحید کی دعوت کے مقابلے میں کسی وقار کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے خود مشرکین کو خطاب کر کے بے تکلّف کہا کہ تمہارے معاشرے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیروؤں کو جن وجوہ سے برتری حاصل ہے ان میں سے ایک اہم ترین وجہ ان کا شرک سے پاک ہونا اور خالص خدا پرستی پر قائم ہو جانا ہے۔ اس پہلو سے مسلمانوں کی برتری کو زبان سے ماننے کے لیے چاہے مشرکین تیار نہ ہوں مگر دلوں میں اس کا وزن محسوس کرتے تھے۔ ۳۶۴ھ

فرشتوں کے زنانہ مجسّموں کی پرستش

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں قُریش، جُہَینیہ، بنی سَلَمہ، خزاعہ، بنی مُلَیح اور بعض دوسرے قبائل کا عقیدہ یہ تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں[1] فرشتوں کو انہوں نے دیویاں قرار دے رکھا تھا۔ ان کے بُت عورتوں کی شکل کے بنا رکھے تھے۔ اُنہیں زنانہ کپڑے اور زیور پہناتے اور کہتے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اُن کی عبادت کرتے، اور انہی سے مَنّتیں اور مُرادیں مانگتے۔

تقدیر کا بہانہ

ان جہالتوں پر ٹوکا جاتا تو تقدیر کا بہانہ پیش کرتے اور کہتے کہ اگر اللہ ہمارے اس کام کو پسند نہ کرتا تو ہم کیسے اِن بتوں کی پرستش کر سکتے تھے۔ حالانکہ اللہ کی پسند اور ناپسند معلوم ہونے کا ذریعہ اُس کی کتابیں ہیں نہ کہ وہ کام جو دُنیا میں اُس کی مشیّت کے تحت ہو رہے ہیں۔ مشیّت کے تحت تو ایک بُت پرستی ہی نہیں، چوری، زنا، ڈاکہ، قتل سب ہی کچھ ہو رہا ہے کیا اِس دلیل سے ہر اُس بُرائی کو جائز و برحق قرار دیا جاتے گا جو دنیا میں ہو رہی ہے۔ دُنیا کے کسی کام کا مشیّت کے تحت ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس کام کو اللہ کی رضا بھی حاصل ہے

باپ دادا کی اندھی تقلید

پوچھا جاتا کہ اپنے اِس شرک کے لیے تمہارے پاس اِس غلط دلیل کے سوا کوئی اور سند بھی ہے تو جواب دیتے کہ باپ دادا سے یہ کام یونہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ گویا ان کے نزدیک کسی مذہب کے حق ہونے کے لیے یہ کافی دلیل تھی۔ حالانکہ ابراہیم علیہ السّلام جن کی اولاد ہونے پر ہی ان کے سارے فخر و امتیاز کا مدار تھا، باپ دادا کے مذہب کو لات مار کر گھر سے نکل گئے تھے اور انہوں نے اسلاف کی ایسی اندھی تقلید کو رد کر دیا تھا جس کا ساتھ کوئی دلیلِ معقول نہ دیتی ہو۔ پھر اگر ان لوگوں کو اسلاف کی تقلید ہی کرنی تھی تو اس کے لیے بھی اپنے بزرگ ترین اسلاف ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے جاہل ترین اسلاف کا انتخاب کیا!

عیسائیوں کی گمراہی سے بُت پرست اہلِ عرب کا استدلال

ان سے کہا جاتا کہ کیا کبھی کسی نبی نے اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی کتاب نے بھی یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے ساتھ دوسرے بھی عبادت کے مستحق ہیں، تو وہ عیسائیوں کے اِس فعل کو دلیل میں پیش کرتے کہ انہوں نے عیسٰی ابنِ مریمؑ کو ابن اللہ مانا اور اُن کی پرستش کی۔ حالانکہ سوال یہ نہ تھا کہ کسی نبی کی اُمّت نے شرک کیا ہے

---

[1] قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ان کے اس جاہلانہ عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: النساء: آیت ۱۱۷۔ النحل آیات ۵۷۔۵۸۔ بنی اسرائیل آیت ۴۰۔ الزخرف آیات ۱۶ تا ۱۹۔ النجم، آیات ۲۱ تا ۲۷۔

یا نہیں ؟ بلکہ یہ تھا کہ کیا خود کسی نبی نے بھی شرک کی تعلیم دی ہے ؟ عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے کب کہا تھا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو ؟ ان کی اپنی تعلیم تو وہی تھی جو دنیا کے ہر نبی نے دی ہے کہ میرا رب بھی اللہ ہے اور تمہارا رب بھی، اُسی کی تم عبادت کرو۔ ۳۶۷

مُشرکین کے خداؤں کی اقسام

دُنیا بھر کے مشرکین خدا کے سوا جن ہستیوں سے دُعائیں مانگتے رہے ہیں اور اہلِ عرب بھی جن سے دُعائیں مانگتے تھے، وہ تین اقسام پر منقسم ہیں لہ ایک بے رُوح اور بے عقل مخلوقات۔ دوسرے وہ بزرگ انسان جو گزر چکے ہیں۔ تیسرے وہ گمراہ انسان جو خود بگڑے ہوتے تھے اور دوسروں کو بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے عابدوں کی دعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر ہی ہے۔ رہے دوسری قسم کے معبود جو اللہ کے مقرب انسان تھے، تو ان کے بے خبر رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں جہاں انسانی آوازیں براہِ راست اُن تک نہیں پہنچتیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی ان تک یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو آپ ساری عمر اللہ سے دعا مانگنا سکھاتے رہے تھے وہ اب اُلٹی آپ سے دُعائیں مانگ رہے ہیں۔ اِس لیے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو صدمہ پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور اللہ اپنے اُن نیک بندوں کی ارواح کو اذیّت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معبودوں کے معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے بے خبر رہنے کے بھی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ملزموں کی حیثیت سے اللہ کے ہاں حوالات میں بند ہیں جہاں دُنیا کی کوئی آواز انہیں نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے بھی انہیں یہ اطّلاع نہیں پہنچاتے کہ تمہارا مشن دنیا میں خوب کامیاب ہو رہا ہے اور لوگ تمہارے پیچھے تمہیں معبود بنائے بیٹھے ہیں، اِس لیے کہ یہ خبریں اُن کے لیے مسرت کی مُوجب ہوں گی۔ اور خدا اِن ظالموں کو ہرگز خوش نہیں کرنا چاہتا۔ ۳۶۹

وہ تمام فرشتے جن کو دنیا میں دیوی اور دیوتا قرار دے کر پُوجا گیا، اور وہ تمام جن، ارواح، اسلاف، اجداد، انبیاء، اولیاء، شہداء وغیرہ جن کو خدائی صفات میں شریک ٹھیرا کر وہ حقوق انہیں ادا کیے گئے جو

لہ مولانا نے اسی بات کو دوسری جگہ ایک اور انداز سے لکھا ہے کہ: مشرکانہ مذاہب میں تین چیزیں الگ الگ پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ اصنام، تصاویر یا علامات جو مرجع پرستش (Objects of worship) ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ اشخاص یا ارواح یا معانی جو دراصل معبود قرار دیئے جاتے ہیں اور جن کی نمائندگی اصنام اور تصاویر وغیرہ کی شکل میں کی جاتی ہے۔ تیسرے وہ اعتقادات جو ان مشرکانہ عبادات و اعمال کی تہ میں کارفرما ہوتے ہیں ۳۶۸

دراصل خدا کے حقوق تھے، وہاں اپنے پرستاروں سے صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہماری عبادت بجا لا رہے ہو۔ تمہاری کوئی دعا، کوئی التجا، کوئی پکار اور فریاد، کوئی نذر و نیاز، کوئی چڑھاوے کی چیز، کوئی تعریف و مدح اور ہمارے نام کی جاپ، اور کوئی سجدہ ریزی و آستانہ بوسی و درگاہ گردی ہم تک نہیں پہنچی۔ ۳۷۰

عرب میں قحبہ گری کی صورتیں

عرب میں قحبہ گری کی دو صورتیں رائج تھیں۔ ایک خانگی کا پیشہ۔ دوسرے باقاعدہ چکلہ۔ "خانگی" کا پیشہ کرنے والی زیادہ تر آزاد شدہ لونڈیاں ہوتی تھیں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا، یا ایسی آزاد عورتیں ہوتی تھیں جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی خاندان یا قبیلہ نہ ہوتا۔ یہ کسی گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مردوں سے بیک وقت ان کا معاہدہ ہو جاتا کہ وہ ان کو مدد خرچ دیں گے اور اپنی حاجت پوری کرتے رہیں گے۔ جب بچہ پیدا ہوتا تو عورت اُن مردوں میں سے جس کے متعلق کہہ دیتی کہ یہ بچہ اس کا ہے اُسی کا بچہ وہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ یہ گویا معاشرے میں ایک مسلّم ادارہ تھا جسے اہلِ جاہلیت ایک قسم کا "نکاح" سمجھتے تھے (ابوداؤد)۔ دوسری صورت، یعنی کھلی قحبہ گری تمام تر لونڈیوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس کے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ لوگ اپنی جوان لونڈیوں پر ایک بھاری رقم عائد کر دیتے تھے کہ ہر مہینے اتنا کما کر ہمیں دیا کرو، اور وہ بے چاریاں بدکاری کرا کرا کر یہ مطالبہ پورا کرتی تھیں۔ اس کے سوا نہ کسی دوسرے ذریعہ سے وہ اتنا کما سکتی تھیں، نہ مالک ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی پاکیزہ کسب کے ذریعہ سے یہ رقم لایا کرتی ہیں، اور نہ جوان لونڈیوں پر عام مزدوری کی شرح سے کئی کئی گنی رقم عائد کرنے کی کوئی دوسری معقول وجہ ہی ہو سکتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان اور خوبصورت لونڈیوں کو کوٹھوں پر بٹھا دیتے تھے اور ان کے دروازوں پر جھنڈے لگا دیتے تھے جنہیں دیکھ کر دُور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ "حاجتمند" آدمی کہاں اپنی حاجت رفع کر سکتا ہے۔ یہ عورتیں "قلیقیات" کہلاتی تھیں اور ان کے گھر "مواخیر" کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں نے اس طرح کے چکلے کھول رکھے تھے۔ خود عبداللہ بن اُبَیّ رئیس المنافقین، وہی صاحب جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ بنانا طے کر چکے تھے، اور وہی صاحب جو حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں سب سے پیش پیش تھے، مدینے میں ان کا ایک باقاعدہ چکلہ موجود تھا جس میں چھ خوبصورت لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے ذریعہ سے وہ صرف دولت ہی نہیں کماتے تھے بلکہ عرب کے مختلف حصّوں سے آنے والے معزز مہمانوں کی تواضع بھی انہی سے فرمایا کرتے تھے اور ان کی ناجائز اولاد سے اپنے خدم و حشم کی فوج بھی بڑھاتے تھے۔ ۳۷۱

بتوں کے استھانوں پر فال گیری

مشرکینِ مکہ نے فال گیری (جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا تھا یا غیب کی

خبر دریافت کی جاتی تھی یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا تھا) کی غرض سے کعبہ کے اندر ہُبَل دیوتا کے بُت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے آستھان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو، یا کھوئی ہوئی چیز کا پتہ پوچھنا ہو، یا خون کے مقدمہ کا فیصلہ مطلوب ہو، غرض کوئی کام بھی ہو، اُس کے لیے ہُبَل کے پانسہ دار (صاحب القداح) کے پاس پہنچ جاتے، اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہُبَل سے دُعا مانگتے کہ ہمارے اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسہ دار اُن تیروں کے ذریعے سے فال نکالتا اور جو تیر بھی فال میں نکل آتا اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہُبَل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔ ۳۷۲

نذر نیاز کے طریقے

اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ بعض جانوروں کے متعلق یا بعض کھیتوں کی پیداوار کے متعلق مَنّت مان لیتے تھے کہ یہ فلاں آستانے یا فلاں حضرت کی نیاز کے لیے مخصوص ہیں۔ اُس نیاز کو ہر ایک نہ کھا سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے ان کے ہاں ایک مفصّل ضابطہ تھا جس کی رُو سے مختلف نیازوں کو مختلف قسم کے مخصوص لوگ ہی کھا سکتے تھے۔ ۳۷۳

اہلِ عرب کے ہاں بعض مخصوص مَنّتوں اور نذروں کے جانور ایسے ہوتے تھے جن پر خُدا کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا، کیونکہ حج کے لیے لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دُودھ دوہتے وقت یا اُن پر سوار ہونے کی حالت میں یا اُن کو ذبح کرتے ہوئے یا ان کو کھانے کے وقت اہتمام کیا جاتا تھا کہ خدا کا نام زبان پر نہ آئے۔ ۳۷۴

اہلِ عرب کے ہاں نذروں اور مَنّتوں کے جانوروں کے متعلق جو خود ساختہ شریعت بنی ہوئی تھی اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو بچّہ پیدا ہو اس کا گوشت صرف مرد کھا سکتے ہیں، عورتوں کے لیے ان کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن اگر وہ بچّہ مُردہ ہو یا مر جائے تو اس کا گوشت کھانے میں مرد عورت سب شریک ہو سکتے ہیں۔ ۳۷۵

جانوروں کو پُن کر کے چھوڑنا

زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب مختلف طریقوں سے جانوروں کو پُن کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان طریقوں سے چھوڑے ہوئے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔

بَحِیرہ ۔ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جو پانچ دفعہ بچّے جن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچّہ ہُوا ہو۔ اُس کا کان چیر کر اُسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا، نہ اُس کا دُودھ پیا جاتا، نہ اُسے ذبح کیا جاتا، نہ اُس کا اُون اُتارا جاتا۔ اُسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے چرے اور جس گھاٹ سے چاہے

پانی پیے۔

سَائبہ، اُس اونٹ یا اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی مَنّت کے پُورا ہونے یا کسی بیماری سے شفا پانے یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطورِ شکرانہ پُن کر دیا گیا ہے۔ نیز جس اونٹنی نے دس مرتبہ بچے دیئے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو اُسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وَصِیلہ، اگر بکری کا پہلا بچہ نر ہوتا تو وہ خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا۔ اور اگر وہ پہلی بار مادہ جنتی تو اسے اپنے لیے رکھ لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کے بجائے یُونہی خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کا نام وَصِیلہ تھا۔

حام، اگر کسی اونٹ کا پوتا سواری کے قابل ہو جاتا تو اُس بُوڑھے اُونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا، نیز اگر کسی اُونٹ کے نُطفہ سے دس بچّے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل جاتی [۳۷۶]

زمانۂ جاہلیّت میں عربوں کا حج

منجملہ ان توہم پرستانہ رسموں کے جو عرب میں رائج تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ جب حج کے لیے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے بلکہ پیچھے سے دیوار کُود کر یا دیوار میں کھڑکی سی بنا کر داخل ہوتے تھے، نیز سفر سے واپس آ کر بھی گھروں میں پیچھے سے داخل ہوا کرتے تھے۔[۳۷۷]

یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصوّر تھا کہ سفرِ حج کے دوران میں کسبِ معاش کے لیے کام کرنے کو وہ بُرا سمجھتے تھے، کیونکہ اُن کے نزدیک کسبِ معاش ایک دُنیا دارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔[۳۷۸]

اہلِ عرب حج سے فارغ ہو کر جلسے کرتے تھے جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ داداکے کارنامے فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔[۳۷۹]

مظاہرِ قدرت سے شگون لینا

چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے جس نے ہر زمانے میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے اوہام و تخیّلات اور رسوم دُنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہلِ عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے۔ چاند سے اچھے یا بُرے شگون لینا، بعض تاریخوں کو سعد اور بعض کو نحس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کار کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسعُود خیال کرنا، اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلُوع و غروب اور اس کی کمی و بیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے، یہ سب باتیں دوسری جاہل قوموں کی طرح اہلِ عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس

سلسلے میں مختلف توہم پرستانہ رسمیں اُن میں رائج تھیں ۔ ۳۸۱

جنّات کے بارے میں توہّم پرستی

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں جب عرب کسی سنسان وادی میں رات گزارتے تھے تو پکار کر کہتے "ہم اِس وادی کے مالک (یعنی جن) کی پناہ مانگتے ہیں"۔ عہدِ جاہلیت کی دوسری روایات میں بھی بکثرت اس بات کا ذکر ملتا ہے ۔ مثلاً اگر کسی جگہ پانی اور چارہ ختم ہو جاتا تو خانہ بدوش بدو اپنا ایک آدمی کوئی دوسری جگہ تلاش کرنے کے لیے بھیجتے جہاں پانی اور چارہ مل سکتا ہو، پھر اُس کی نشان دہی پر جب یہ لوگ نئی جگہ پہنچتے تو وہاں اترنے سے پہلے پکار پکار کر کہتے "کہ ہم اس وادی کے رب کی پناہ مانگتے ہیں تاکہ یہاں ہم ہر آفت سے محفوظ رہیں"۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر غیر آباد جگہ کسی نہ کسی جن کے قبضے میں ہے اور اس کی پناہ مانگے بغیر وہاں کوئی ٹھیر جائے تو وہ جن یا تو خود ستاتا ہے یا دوسرے جنوں کو ستانے دیتا ہے ۔ ۳۸۲

کثرتِ اِزدواج

جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی ۔ ایک ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا تھا ۔ اور جب اس کثرتِ ازدواج سے مصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا تھا ۔ ۳۸۳

سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے ۔ ۳۸۴

حائضہ سے سلوک

اہلِ مدینہ چونکہ یہودیوں سے بہت متاثر تھے اس لیے ان کے ہاں یہودیوں کی طرح ایامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا ۔ نہ اس کا پکایا ہوا کھانا کھاتے نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے ، نہ اس کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھتے ۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے ۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی تھی ۔ ۳۸۵

طلاق در طلاق کا رواج

ایک بہت بڑی معاشرتی خرابی عرب جاہلیت میں یہ رائج تھی کہ ایک شخص اپنی بیوی کو بے حد و حساب طلاق دینے کا مجاز تھا ۔ جس عورت سے اس کا شوہر بگڑ جاتا اس کو وہ بار بار طلاق دے کر رجوع کرتا رہتا تھا ۔ تاکہ نہ تو وہ غریب اس کے ساتھ ہی بس سکے اور نہ اس سے آزاد ہو کر کسی اور ہی سے نکاح کر سکے ۔ ۳۸۶

یتامیٰ پر زیادتیاں

زمانۂ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں ان کے مال اور ان کے حُسن و جمال کی وجہ

سے یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرا تو ہے نہیں جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے۔ ۳۸۷

حضرت عائشہؓ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے۔ اگر لڑکی مالدار ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے تھے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح ہونے دیتے تھے تاکہ اس کا کوئی ایسا سر دھرا پیدا نہ ہو جائے جو کل اُس کے حق کا مطالبہ کرنے والا ہو۔ ۳۸۸

یتامیٰ کے ساتھ عرب میں کیا سلوک ہوتا تھا؟

اِس سلسلے میں ایک بڑا عجیب واقعہ قاضی ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب اَعلام النبوۃ میں لکھا ہے۔ ابوجہل ایک یتیم بچّے کا وصی تھا۔ وہ بچہ ایک روز اِس حالت میں اُس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہُوئے مال میں سے وہ اسے کچھ دے دے۔ مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے از راہِ شرارت اس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے پاس جا کر شکایت کر، وہ ابوجہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دینگے۔ بچّہ بےچارا ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے کیا تعلق ہے اور یہ بدبخت اسے کس غرض کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضورؐ کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپ سے بیان کیا۔ آپ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہُوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپ کو دیکھ کر اس نے آپ کا استقبال کیا اور جب آپؐ نے فرمایا کہ اس بچّے کا حق اسے دے دو تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں، ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزے دار جھڑپ کی امید کر رہے تھے۔ مگر جب انہوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے اور اسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے۔ اس نے کہا خدا کی قسم، مَیں نے اپنا دین نہیں چھوڑا، مگر مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے دائیں بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا اگر مَیں نے ذرا بھی ان کی مرضی کے خلاف حرکت کی۔[1] ۳۸۹

---

[1] اس واقعہ سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور معزز قبیلے تک کے

قتلِ اولاد کی صورتیں

قتلِ اولاد کی تین صورتیں اہلِ عرب میں رائج تھیں:

۱۔ لڑکیوں کا قتل، اِس خیال سے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے یا قبائلی لڑائیوں میں وہ دشمن کے ہاتھ نہ پڑیں یا کسی دوسرے سبب سے وہ ان کے لیے سببِ عار نہ بنیں۔

۲۔ بچّوں کا قتل، اِس خیال سے کہ ان کی پرورش کا بار نہ اُٹھایا جا سکے گا اور ذرائع معاش کی کمی کے سبب سے وہ ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائیں گے۔

۳۔ بچّوں کو اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لیے بھینٹ چڑھانا۔[۳۹۱]

عورتوں اور بچّوں کی میراث سے محرومی

عرب میں عورتوں اور بچّوں کو میراث سے محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظریہ اس باب میں یہ تھا کہ میراث کا حق صرف ان مردوں کو پہنچتا ہے جو لڑنے اور کنبے کی حفاظت کرنے کے قابل ہوں۔ اس کے علاوہ مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور با اثر ہوتا تھا وہ بلا تامّل ساری میراث سمیٹ لیتا تھا اور ان سب لوگوں کا حصّہ مار رکھتا تھا جو اپنا حصّہ حاصل کرنے کا بل بوتا نہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی اہمیّت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دیں خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔[۳۹۲]

وراثت کا ایک رواج

اہلِ عرب میں قاعدہ تھا کہ جن لوگوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارہ کے عہد و پیمان ہو جاتے تھے وہ ایک دوسرے کی میراث کے حقدار بن جاتے تھے اسی طرح جسے بیٹا بنا لیا جاتا وہ بھی مُنہ بولے باپ کا وارث قرار پاتا تھا۔[۳۹۳]

لڑکیوں کو زندہ در گور کرنا

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا یہ بے رحمانہ طریقہ قدیم زمانے میں مختلف وجوہ سے رائج ہو گیا تھا ایک معاشی خستہ حالی جس کی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے کم ہوں اور اولاد کو پالنے پوسنے کا بار اُن پر نہ پڑے۔

؎ بڑے بڑے سرداروں کا یتیموں اور دوسرے بے یار و مددگار لوگوں کے ساتھ کیا سلوک تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کس بلند اخلاق کے مالک تھے اور آپ کے اس اخلاق کا آپ کے بدترین دشمنوں تک پر کیسا رُعب تھا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ہم اس سے پہلے تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۱۳۶ پر نقل کر چکے ہیں جو حضورؐ کے اُس زبردست اخلاقی رُعب پر دلالت کرتا ہے جس کی وجہ سے کُفارِ قریش آپ کو جادوگر کہتے تھے۔[۳۹۰]

بیٹوں کو تو اس اُمید پر پال لیا جاتا تھا کہ بعد میں وُہ حصُولِ معیشت میں ہاتھ بٹائیں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ انہیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر انہیں بیاہ دینا ہو گا۔ دوسرے عام بدامنی جس کی وجہ سے بیٹوں کو اس لیے پالا جاتا تھا کہ جس کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں گے اس کے اتنے ہی حامی و مددگار ہوں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ قبائلی لڑائیوں میں اُلٹی ان کی حفاظت کرنی پڑتی تھی اور دفاع میں وہ کسی کام نہ آ سکتی تھیں۔ تیسرے عام بدامنی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ دشمن قبیلے جب ایک دوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تھے تو جو لڑکیاں بھی ان کے ہاتھ لگتی تھیں انہیں لے کر وہ یا تو لونڈیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے۔ ان وجوہ سے عرب میں یہ طریقہ چل پڑا تھا کہ کبھی تو زچگی کے وقت ہی عورت کے آگے ایک گڑھا کھود رکھا جاتا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسی وقت اسے گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جائے، اور کبھی اگر ماں اِس پر راضی نہ ہوتی یا اُس کے خاندان والے اس میں مانع ہوتے تو باپ بادلِ ناخواستہ اسے کچھ مدت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لے جا کر زندہ دفن کر دیتا۔ اس معاملہ میں جو شقاوت برتی جاتی تھی اس کا قصّہ ایک شخص نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے ایک مرتبہ بیان کیا۔ سُنَنِ دارمی کے پہلے ہی باب میں یہ حدیث منقول ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے اپنے عہدِ جاہلیت کا یہ واقعہ بیان کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت مانوس تھی۔ جب میں اس کو پکارتا تو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی تھی۔ ایک روز مَیں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستہ میں ایک کنواں آیا۔ مَیں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنوئیں میں دھکا دے دیا۔ آخری آواز جو اس کی میرے کانوں میں آئی وہ تھی ہائے ابّا، ہائے ابّا۔ یہ سُن کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم رو دیئے اور آپؐ کے آنسوُ بہنے لگے۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا اَے شخص تُو نے حضوُرؐ کو غمگین کر دیا۔ حضوُرؐ نے فرمایا اسے مت روکو، جس چیز کا اسے سخت احساس ہے، اس کے بارے میں اسے سوال کرنے دو۔ پھر آپؐ نے اس سے فرمایا کہ اپنا قصّہ پھر بیان کرو۔ اس نے دوبارہ اسے بیان کیا اور آپؐ سُن کر اس قدر روئے کہ آپ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ جاہلیت میں جو کچھ ہو گیا اسے اللہ نے معاف کر دیا۔ اب نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر۔

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اہلِ عرب اِس انتہائی غیر انسانی فعل کی قباحت کا سرے سے کوئی احساس ہی نہ رکھتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی معاشرہ خواہ کتنا ہی بگڑ چکا ہو، وہ ایسے ظالمانہ افعال کی بُرائی کے احساس سے بالکل خالی نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے قرآن پاک میں اس فعل کی قباحت پر کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے الفاظ میں صرف اتنی بات کہہ کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قصوُر میں ماری

گئی[1]۔

عرب کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو زمانۂ جاہلیت میں اس رسم کی قباحت کا احساس تھا۔ طبرانی کی روایت ہے کہ فرزدق شاعر کے دادا صَعصَعہ بن ناجیۃ المُجاشعی نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسُول اللہ، مَیں نے جاہلیت کے زمانے میں کچھ اچھے اعمال بھی کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ مَیں نے ۳۶۰ لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے بچایا اور ہر ایک کی جان بچانے کے لیے دو دو اُونٹ فدیے میں دیئے۔ کیا مجھے اس پر اجر ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا ہاں تیرے لیے اجر ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تجھے اسلام کی نعمت عطا فرمائی۔

---

[1] وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (التکویر: ۸-۹) "اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔

اِس آیت کے اندازِ بیان میں ایسی شدید غضبناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضبناکی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابلِ نفرت ہوں گے کہ اُن کو مخاطب کر کے یہ نہ پُوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصُوم کو کیوں قتل کیا، بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچّی سے پُوچھا جائے گا کہ تو بے چاری آخر کس قصُور میں ماری گئی اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظُلم کیا اور کس طرح اُسے زندہ دفن کر دیا۔ اس کے علاوہ اس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیئے گئے ہیں جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اس کے فحویٰ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اہلِ عرب کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جاہلیت نے ان کو اخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرتے ہیں، پھر بھی انہیں اصرار ہے کہ اپنی اس جاہلیت پر قائم رہیں گے اور اُس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں آخرت کے ضروری ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کی گئی ہے۔ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا اس کی آخر کہیں تو دادرسی ہونی چاہیے اور جن ظالموں نے یہ ظلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب ان سے اس بے دردانہ ظلم کی باز پُرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دنیا میں تو کوئی سُننے والا نہیں تھا۔ جاہلیت کے معاشرے میں اِسے بالکل جائز رکھا گیا تھا۔ نہ ماں باپ کو اس پر کوئی شرم آتی تھی، نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا، نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلمِ عظیم بالکل ہی بے داد رہ جانا چاہیے؟ ۳۹۵ھ

قتل کا انتقام

جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے اُتنی ہی قیمت کا خون اُس خاندان یا قبیلے یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اُسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لے لینے سے اُن کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سینکڑوں سے لینا چاہتے تھے۔ ان کا کوئی معزز آدمی اگر دوسرے گروہ کے کسی چھوٹے آدمی کے ہاتھوں مارا گیا ہوتا تو وہ اصل قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ قاتل کے قبیلے کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے، یا اس کے کئی آدمی اُن کے مقتول پر سے صدقہ کیے جائیں۔ برعکس اس کے اگر مقتول ان کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجے کا شخص اور قاتل کوئی زیادہ قدر و عزت رکھنے والا شخص ہوتا تو وہ اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لی جائے۔ [۳۹۶]

تصوّرِ لباس و برہنگی

یہ لوگ (اہلِ عرب) لباس کو صرف زینت اور موسمی اثرات سے جسم کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس کی سب سے پہلی بنیادی غرض یعنی جسم کے قابلِ شرم حصّوں کی پردہ پوشی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ انہیں اپنے ستر دوسروں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظرِ عام پر نہا لینا، راہ چلتے قضائے حاجت کے لیے بیٹھ جانا، اِزار کھُل جائے تو ستر کے بے پردہ ہو جانے کی پرواہ نہ کرنا ان کے شب و روز کے معمولات تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے بکثرت لوگ حج کے موقع پر کعبہ کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کی عورتیں ان کے مردوں سے بھی کچھ زیادہ بے حیا تھیں۔ اُن کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور نیک کام سمجھ کر وہ اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ [۳۹۷]

عرب میں پھیلی ہوئی عام بدامنی وطوائف الملوکی

عرب میں بدامنی عام پھیلی ہوئی تھی جس سے سارا ملک تنگ آیا ہوا تھا۔ ہر طرف کُشت و خون برپا تھا۔ لُوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور کوئی شخص بھی رات چین سے نہیں گزار سکتا تھا کیونکہ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کب کوئی دشمن صبح سویرے اس کی بستی پر لوٹ پڑے۔ یہ ایسی حالت تھی جسے عرب کے سارے ہی لوگ جانتے تھے اور اس کی قباحت کو محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ لُٹنے والا اس پر ماتم کرتا تھا اور لُوٹنے والا اس پر خوش ہوتا تھا، لیکن جب کسی وقت لُوٹنے والے کی اپنی شامت آجاتی تھی تو وہ بھی یہ محسوس کر لیتا تھا کہ یہ کیسی بُری حالت ہے جس میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ [۳۹۸]

اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی بستی پر انہیں چھاپہ مارنا ہوتا تو رات کے اندھیرے میں چل کر جاتے تاکہ

دشمن خبردار نہ ہو سکے، اور صبح سویرے اچانک اُس پر ٹوٹ پڑتے تھے تاکہ صُبح کی روشنی میں ہر چیز نظر آسکے، اور دن اتنا زیادہ روشن بھی نہ ہو کہ دشمن دُور سے ان کو آتا دیکھ لے اور مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے۔[۳۹۹]

عرب کا حال اُس دَور میں یہ تھا کہ پُورے ملک میں کوئی بستی ایسی نہ تھی جس کے لوگ راتوں کو چین سے سو سکتے ہوں، کیونکہ ہر وقت ان کو یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کب کوئی غارت گر گروہ اچانک اُس پر چھاپا مار دے۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنے قبیلے کے حدُود سے باہر قدم رکھنے کی ہمت کر سکے، کیونکہ اِکّا دُکّا آدمی کا زندہ بچ کر واپس آجانا، یا گرفتار ہو کر غلام بن جانے سے محفوظ رہنا گویا امرِ محال تھا۔ کوئی قافلہ ایسا نہ تھا جو اطمینان سے سفر کر سکے، کیونکہ راستے میں جگہ جگہ اُس پر ڈاکہ پڑنے کا خطرہ تھا، اور راستے بھر کے بااثر قبائلی سرداروں کو رشوتیں دے کر تجارتی قافلے بخیریت گزر سکتے تھے۔[۴۰۰]

باب ۱۵

عربوں کے چند دیگر مذاہب

فصل ۱

حُنَفَاء

دین کا تفصیلی علم چاہے اُس جاہلیّت کے زمانہ میں لوگوں کے پاس نہ رہا ہو، مگر یہ بات اُس زمانے میں بھی لوگوں سے پوشیدہ نہ تھی کہ اصل دین توحید ہے اور انبیاء علیہم السلام نے کبھی بت پرستی نہیں سکھائی ہے۔ یہ حقیقت اُن روایات میں بھی محفوظ تھی جو عرب کے لوگوں کو اپنی سرزمین کے انبیاءؑ سے پہنچی تھیں اور اسے قریب کی سرزمین میں آئے ہوئے انبیاء حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سُلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السّلام کی تعلیمات کے واسطے سے بھی وہ جانتے تھے۔

عرب کی روایات میں یہ بات مشہور و معروف تھی کہ قدیم زمانہ میں عرب کا اصل دین، دینِ ابراہیمی تھا اور بُت پرستی اُن کے ہاں عَمْرو بن لُحَیّ نامی ایک شخص نے شروع کی تھی۔ شرک و بُت پرستی کے رواجِ عام کے باوجود عرب کے مختلف حصّوں میں جگہ جگہ ایسے لوگ موجود تھے جو شرک سے انکار کرتے تھے، توحید کا اعلان کرتے تھے اور بُتوں پر قربانیاں کرنے کی عَلانیہ مذمّت کرتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد سے بالکل قریب زمانے میں قُسّ بن ساعِدۃ الاِیادی، اُمیّہ بن ابی الصَّلت، سُوَید بن عَمْرو المُصْطَلِقی، وَکیع بن سَلَمہ بن زُہیر الاِیادی، عَمْرو بن جُندُب الجُہَنی، ابو قَیس صِرْمہ بن ابی اَنَس، زَید بن عَمْرو بن نُفَیل، وَرَقہ بن نَوفَل، عُثمان بن الحُوَیرِث، عبید اللہ بن جَحْش، عامر بن الظَّرِب العَدوانی، عَلّاف بن شہاب التّمیمی، المُتَلَمِّس بن اُمیّۃ الکِنانی، زُہَیر بن ابی سُلمیٰ، خالد بن سِنان بن غیث العَبْسی، عبد اللہ القُضاعی اور ایسے ہی بہت سے لوگوں کے حالات ہمیں تاریخوں میں ملتے ہیں جنہیں حُنَفاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سب لوگ علی الاعلان توحید کو اصل دین کہتے تھے اور مشرکین کے مذہب سے اپنی بے تعلقی کا صاف صاف اظہار کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں یہ تخیّل انبیاء علیہم السّلام کی سابقہ تعلیمات کے باقی ماندہ اثرات ہی سے آیا تھا۔ اس کے علاوہ یمن میں چوتھی پانچویں صدی عیسوی کے جو کتبات آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں برآمد ہوتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دَور میں وہاں ایک توحیدی مذہب موجود تھا جس کے پیرو الرَّحمٰن اور ربُّ السَّماءِ والارض ہی کو الٰہِ واحد تسلیم

کرتے تھے۔ ۳۷۸ء کا ایک کتبہ ایک عبادت گاہ کے کھنڈر سے ملا ہے جس میں لکھا ہے کہ یہ مَعبدُ الٰہ ذُو سَمَوِیٰ" یعنی اِلٰہ السماء یا ربُّ السماء کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے۔ ۴۶۵ء کے ایک کتبے میں بنصر ورداالٰھن بعل سمین وارضین (بنصرو بعون الالٰہ ربّ السّماء والارض) کے الفاظ لکھے ہیں جو عقیدۂ توحید پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ اِسی دَور کا ایک اور کتبہ ایک قبر پر ملا ہے جس میں بِحَیل رحمنن (یعنی اَستعین بحول الرحمٰن) کے الفاظ لکھے ہیں۔ اسی طرح شمالِ عرب میں دریائے فُرات اور قِنَّسْرِین کے درمیان زَبَد کے مقام پر ۵۱۲ء کا ایک کتبہ ملا ہے جس میں بِسْمِ الْاِلٰہِ، لَا عِزَّ اِلَّا لَہٗ، لَاشُکْرَ اِلَّا لَہٗ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے انبیاءِ سابقین کی تعلیمات کے آثار عرب سے بالکل مٹ نہیں گئے تھے، اور کم از کم اتنی بات یاد دلانے کے لیے بہت سے ذرائع موجود تھے کہ "تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے"۔ [۴۰۱]

اہلِ عرب میں جو موحّدین پائے جاتے تھے وہ اِن تین گناہوں سے پرہیز کرتے تھے جن میں اہلِ عرب کثرت سے مبتلا تھے۔ ایک شرک باللہ۔ دوسرے قتلِ ناحق، تیسرے زنا[1]۔

---

[1] اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے بکثرت احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ سے پوچھا گیا، سب سے بڑا گناہ کیا ہے۔ فرمایا ان تجعل لِلّٰہ نِدًّا وھو خلقك، "یہ کہ تو کسی کو اللہ کا نِدِّ مقابل اور ہمسر ٹھیرائے، حالانکہ تجھے پیدا اللہ نے کیا ہے"۔ پوچھا گیا اس کے بعد؟ فرمایا ان تقتل ولدك خشیۃ ان یطعمَ مَعك، "یہ کہ تو اپنے بچّے کو اِس خوف سے قتل کر ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گا"۔ پوچھا گیا پھر۔ فرمایا ان تُزانی حلیلۃ جارك، "یہ کہ تو اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے"۔ (بخاری، مُسلم، تِرمذی، نَسائی، احمد)۔ اگرچہ کبیرہ گناہ اور بھی بہت سے ہیں لیکن عرب سوسائٹی پر اُس وقت سب سے زیادہ تسلّط انہی تین گناہوں کا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی اِس خصُوصیّت کو نمایاں کیا گیا کہ پُورے معاشرے میں چند لوگ ہیں جو ان بُرائیوں سے بچ گئے ہیں۔ [۴۰۲]

فصل ۲

صابئین

صابئی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے۔ ایک حضرت یحییٰ علیہ السّلام کے پیرو، جو بالائی عراق (یعنی الجزیرہ) کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے اور حضرت یحییٰؑ کی پیروی میں اِصطباغ (بپتسمہ) کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السّلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پر سیّاروں کی اور سیّاروں پر فرشتوں کی فرماں روائی کے قائل تھے۔ ان کا مرکز حَرّان تھا اور عراق کے مختلف حصّوں میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفہ و سائنس اور فنِّ طب کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہُوا ہے لیکن اغلب یہ ہے کہ سُورۂ الحج میں جن صابئین کا ذکر کیا گیا ہے ان سے پہلا گروہ مُراد ہے۔ کیونکہ دوسرا گروہ غالباً نزولِ قرآن کے زمانے میں اِس نام سے موسُوم نہ تھا۔[1]

---

[1] حاشیہ مِن جانب مرتبین :۔

اس سلسلے میں محمود شکری آلوسی نے یہ معلومات جمع کی ہیں :

"صابئہ بڑی اُمّتوں میں سے ایک اُمّت ہے۔ لوگوں کو ان کے دین کے متعلق جس قدر معرفت حاصل ہُوئی ہے اسی قدر ان کے متعلق اختلافِ رائے پایا گیا ہے۔ ان کی دو قسمیں ہیں: مومن اور کافر۔ (اس سلسلے میں آیت ۲ : ۴۲ کا حوالہ دیا گیا ہے)

یہ لوگ حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السّلام کی قوم تھے۔ حضرت ابراہیم انہی کی طرف مبعُوث ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا مسکن حَرّان تھا اور یہی صابئیوں کا گھر ہے۔ ان کی دو قسمیں تھیں : ایک قسم دینِ حنیف پر قائم تھی اور دوسری مُشرک تھی۔ ان میں سے جو مُشرک تھے وہ سات ستاروں اور بارہ برجوں کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اپنے مندروں میں ان کی تصویریں بنا کر رکھتے تھے۔ ان ستاروں کے لیے ان کے ہاں مخصوص مَندر پائے جاتے تھے۔ یہی ان کے بڑے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۹)

عبادت خانے تھے، ایسے ہی جیسے عیسائیوں کے گرجے اور یہودیوں کے بیعے۔ چنانچہ انہوں نے ایک بڑا مندر سُورج کے لیے بنا رکھا تھا، ایک چاند کے لیے، ایک زُہرہ کے لیے، ایک مشتری کے لیے، ایک عطارد کے لیے، ایک مریخ کے لیے، ایک زحل کے لیے اور ایک مندر علّتِ اُولیٰ کے لیے۔ ان کے نزدیک ہر ستارے کے لیے مخصوص عبادت اور مخصوص دُعا ہے۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ مسلمانوں کی طرح ان کے ہاں بھی پانچ نمازیں ہیں۔

ان میں سے کچھ لوگ رمضان کے مہینے میں روزے بھی رکھتے ہیں، اور کعبے کی طرف رُخ کر کے نماز بھی پڑھتے ہیں مکّے کی بھی تعظیم کرتے ہیں اور حج کے لیے مکّے جانے کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ مُردار، خون اور سُور کے گوشت کو حرام قرار دیتے ہیں۔ شادی کے معاملے میں اُنہی رشتہ داروں کو حرام قرار دیتے ہیں جنہیں مسلمان حرام قرار دیتے ہیں۔ بغداد کے ارکانِ سلطنت کی ایک جماعت اسی مذہب پر کاربند تھی۔ انہی میں سے بلال بن المحسن الصابی تھے جو دیوان الانشا کے افسر اور مشہور رسائل کے مُصنّف ہیں۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھا کرتے، ان کے ساتھ عبادت کیا کرتے، ان کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے اور حرام چیزوں کو حرام قرار دیتے ۔۔ ۔۔ ۔۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس دین کی اصل یہ تھی کہ یہ لوگ دنیا کے مذاہب کی خوبیاں لے لیا کرتے تھے اور ان کی بُرائیوں سے قولاً اور عملاً علیحدگی اختیار کرتے تھے۔ اسی لیے انہیں صابئہ کہا گیا یعنی خارج (۲:۲۲۵)۔ چنانچہ یہ لوگ ہر مذہب کی جملہ اور تفصیلی باتوں سے نکل گئے اور صرف اُن امور پر کاربند رہے جنہیں انہوں نے حق سمجھا۔

کفارِ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو صابی کہا کرتے تھے اور آپ کے اصحاب کو صُبَاۃ۔ محاورے میں کہتے ہیں صَبَأَ الرجل، جب آدمی ایک چیز سے نکل کر دوسری چیز میں چلا جاتے۔ اور صَبَا یَصْبُوُ اُس وقت بولتے ہیں جب وہ مائل ہو جاتے۔

(اقتباسات از اردو ترجمہ بلوغ الارب، ج ۳ ص ۱۱۷، ۱۲۰)

فصل ۳

مجُوس

ان دو گروہوں (یعنی یہوُد و نصاریٰ) کے علاوہ جن دوسری قوموں کے پاس کتابیں بھیجی گئی تھیں، انہوں نے چونکہ اپنی کتابوں کو بالکل گمُ یا مسخ کر دیا اور ان کے اعتقاد و عمل میں کوئی چیز بھی تعلیماتِ انبیاءؑ پر باقی نہیں رہی، اس لیے ان پر لفظ اہلِ کتاب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کو اہلِ کتاب قرار نہیں دیا، حالانکہ وہ زردشت کو مانتے ہیں جس پر نبی ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ ہَجَر کے مجوسیوں سے جب معاملہ پیش آیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ سنوا بھم سنۃ اھل الکتاب " ان کے ساتھ اہلِ کتاب کا سا معاملہ کرو"۔ یہ نہیں فرمایا کہ وہ اہلِ کتاب ہیں۔ پھر جو نامۂ مبارک آپؐ نے مجوسِ ہَجَر کو لکھا تھا اس میں صراحت کے ساتھ یہ تحریر فرما دیا تھا کہ :

" فان اسلمتم فلکم مالنا و علیکم ما علینا و من ابیٰ فعلیہ الجزیۃ غیر اکل ذبائحھم ولا نکاح نساءھم "۔ اگر تم اسلام قبول کر و گے تو تمہارے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور تم پر وہی واجبات ہوں گے جو ہم پر ہیں اور جو لوگ تم میں سے انکار کریں گے ان پر جزیہ عائد کر دیا جائے گا۔ مگر نہ اُن کا ذبیحہ کھایا جائے گا اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے گا۔

ایران کے آتش پرستؒ[1] جو روشنی اور تاریکی کے "دو" خدا مانتے تھے اور اپنے آپ کو زردشت کا پیرو کہتے تھے، اُن کے مذہب و اخلاق کو مَزدک کی گمراہیوں نے بُری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ حتیٰ کہ سگی بہن سے نکاح تک ان میں رواج پا گیا تھا۔

---

[1] حاشیہ من جانب مرتبین :

عرب آتش پرستوں کے متعلق محمود شکری آلوسی نے لکھا ہے کہ :

" ایسے لوگ عربوں میں متفرق تھے۔ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب ایرانیوں اور مجوسیوں کے ذریعے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

ان میں سرایت کر گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ آگ کی پرستش دنیا میں قابیل کے عہد سے چلی آرہی ہے ...
... قابیل پہلا شخص ہے جس نے آتشکدہ بنایا اور اس کی عبادت کی پھر یہ مذہب مجوسیوں میں سرایت کر گیا۔ اور انہوں نے آگ کے بہت سے گھر بنائے اور اس کے لیے وقف، محافظ اور دربان مقرر کیے۔ وہ اسے ایک لحظہ کے لیے بھی بجھنے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ فریدوں نے ایک آتشکدہ طوس میں تعمیر کرایا اور ایک بخارا میں۔ بہمن نے سجستان میں ایک آتشکدہ تعمیر کیا۔ ابوقباذ نے ایک آتشکدہ بخارا کی جانب تعمیر کیا۔

آتش پرستوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ وہ ہے جو آگ میں کسی نفس کے ڈالنے اور آگ سے بدن کے جلنے کو حرام قرار دیتا ہے .. .. آتش پرستوں کا ایک اور فرقہ ہے جو اس کی پوجا کرنے میں اس حد تک چلے گئے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو آگ پر قربان کر دیتے ہیں۔

آتش پرستوں میں سے بعض لوگ زاہد اور عابد ہیں جو آگ کے گرد روزہ رکھکر بیٹھتے اور چلے کاٹتے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ اچھے اخلاق مثلاً صدق، وفا، امانت داری، پارسائی، عفت اور عدل کی ترغیب دیتے ہیں۔

ابن قتیبہ کتاب المعارف میں کہتا ہے: "مجوسیت کا رواج بنی تمیم میں تھا۔ زرارہ بن عدس التمیمی اور اس کا بیٹا حاجب بن زرارہ انہی میں سے تھا۔ اُس نے اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی، مگر بعد میں نادم ہوا۔ انہی میں سے اقرع بن حابس تھا (یہ بعد میں اسلام لائے اور صحابہ میں شمار ہیں)۔ وکیع بن حسّان کا دادا ابوالاسود بھی مجوسی تھا۔"
(اقتباسات از اردو ترجمہ بلوغ الادب، ج ۳ ص ۱۳۸ تا ۱۴۱)

حاشیہ از مرتبین:

ہمارا خیال ہے کہ مجوسیت کے مختلف اجزاء اور مختلف شکلیں عربوں کے ہاں پہنچیں۔ عربوں میں زردشتی گروہ کے دو خداؤں اور عقیدۂ نور و ظلمت کے پائے جانے کے متعلق محمود شکری آلوسی نے ایک فصل لکھی ہے جس کا عنوان ہے: "ثنویہ کے عقائد کا بیان"۔ اس کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

"یہ وہ لوگ ہیں جن کا کہنا ہے کہ بنانے والے دو ہیں: خیر کا بنانے والا نور ہے اور شر کا ظلمت۔ اور یہ دونوں قدیم، ازلی اور ابدی ہیں، قوی ہیں، حسّاس ہیں، ادراک کے مالک ہیں، سمیع ہیں اور بصیر ہیں۔
کچھ لوگ کہتے ہیں: حق سبحانہ مدت تک تنہا رہنے سے اُداس ہو گیا، لہٰذا اس کے دل میں بُرا خیال آیا (العیاذ باللہ) اور یہ خیال جسمیت اختیار کر کے تاریکی بن گیا۔ پھر اس سے ابلیس پیدا ہوا۔"
(اقتباسات از اردو ترجمہ بلوغ الادب، ج ۳ صفحہ ۱۳۰-۱۳۱) (باقی صفحہ ۶۰۳ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

صاحب بلوغ الارب نے زندقی کے نام سے ایک اور مذہبی گروہ کا ذکر الگ کیا ہے، مگر فی الحقیقت وہ بھی مجوسیت سے الگ کوئی چیز نہیں، اور اس کا سرچشمہ بھی ایران ہی تھا۔ جیسا کہ خود ذیل کے اقتباس سے واضح ہے:

"ابنِ قُتَیبہ کتاب المعارف میں عہدِ جاہلیت کے مذاہبِ اہلِ عرب سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے:
زندیقی مذہب قریش میں پایا جاتا تھا۔ انہوں نے اسے حِیرہ سے لیا تھا۔ القاموس میں ہے: الزِندِیق (کسرہ کے ساتھ) یہ دو خداؤں کو ماننے والوں میں سے ہیں، یا وہ لوگ جو نُور اور ظلمت کے قائل ہیں، یا وہ جو آخرت اور رُبُوبیت پر ایمان نہیں رکھتے، یا وہ جو در پردہ کافر ہوں اور بظاہر مومن۔ یا یہ لفظ "زن دین" یعنی "عورت کا دین" سے معرّب ہے۔ (غالباً یہ قیاس عورت کے متعلق مشہور مزدکی فلسفہ کی بنا پر کیا گیا ہو)۔ اس کے صحیح ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔ زند اس کتاب کا نام ہے جسے مزدک نے پیش کیا تھا، اور وہ ثَنَوِیّہ فرقوں میں سے مَزدَکیہ فرقے کا رئیس تھا۔"

(اردو ترجمہ بلوغ الارب۔ ج ۳۔ ص ۲۹)

فصل ۴

دہریّت

دہریّت کی حقیقت

دُنیا کی زندگی سطح بین انسانوں کو مختلف قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ جینا اور مرنا جو کچھ ہے بس اسی دنیا میں ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں، لہٰذا جتنا کچھ بھی تمہیں کرنا ہے بس یہیں کر لو۔ ۴۰۶

بعض لوگ سرے سے یہی نہیں مانتے کہ اِن ساری چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ محض مادّے کے ہیجان کا نتیجہ ہے، یا ایک حادثہ ہے جس میں کسی حکمت اور صنّاعی کا کوئی دخل نہیں[لـه] ۴۰۷

اپنے معبُودوں کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی قوم سمیت تمام مُشرکین کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ بجز دہریوں کے اور کسی کو بھی دنیا میں اللہ کے خالقِ کائنات ہونے سے انکار نہیں رہا ہے۔ ۴۰۸

درحقیقت شرک اور دہریّت اور انکارِ آخرت کے عقائد کوئی شخص بھی یقین کی بنا پر اختیار نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یقین صرف علم سے حاصل ہوتا ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ علم حاصل نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے، یا بہت سے خدا ہیں، یا خدائی کے اختیارات میں بہت سی ہستیوں کو دخل حاصل ہے، یا آخرت نہیں ہونی چاہیے۔ پس جس نے بھی دنیا میں یہ عقائد اختیار کیے ہیں اُس نے محض قیاس و گمان پر ایک عمارت کھڑی کر لی ہے جس کی اصل بنیاد شک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ شک اُنہیں سخت گمراہی کی طرف لے گیا ہے۔ انہیں خدا کے وجود میں شک ہوا۔ انہیں توحید کی صداقت میں شک ہوا۔ انہیں آخرت کے آنے میں شک ہوا۔ حتّٰی کہ اس شک کو انہوں نے یقین کی طرح دلوں میں بٹھا کر انبیاءؑ کی کوئی بات نہ مانی۔ ۴۰۹

لـه واضح رہے کہ قرآن میں مُلحد دہریوں کا اجمالی تذکرہ بھی موجود ہے اور ان کے نظریات کا ابطال بھی کیا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ گروہ بھی عرب میں موجود تھا لیکن تھا قلیل التعداد۔ اسی بنا پر مولانا مودودی صاحب نے بھی اس گروہ کا مختصر تذکرہ

مَیں نے جہاں تک قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہے اور جس حد تک تاریخی معلومات میرے پاس ہیں، ان دونوں سے یہ بات مجھے قریب بہ یقین معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں کبھی کسی قوم یا کوئی ہیئتِ اجتماعی (Community

---

۳- کیا ہے۔ عرب کے دہریوں کے متعلق علامہ محمود شکری آلوسی نے جو معلوماتی نوٹ لکھے ہیں ان کے اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:-

"عربوں میں ایک قسم دہریوں کی تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مصنوعات کو صانع سے بالکل الگ تھلگ قرار دے رکھا ہے۔ ان لوگوں کا قول جیسا کہ خدا تعالیٰ نے بیان کیا ہے یہ ہے (آیت اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا ـــ وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ) کہ زندگی تو صرف دنیا کی زندگی ہے۔ ہم مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔ اور ہمیں زمانے کے سوا کوئی چیز ہلاک نہیں کرتی۔"

ان کے دو فرقوں کا ذکر کرتے ہوتے، زیادہ مقبول تصور والے فرقے کے خیالات یُوں بیان کیے گئے ہیں:

"۔۔۔۔ اشیا کی قطعاً کوئی ابتدا نہیں۔ اشیاء تو صرف قوت سے فعل کی طرف نکل کر آتی ہیں۔ لہٰذا جو چیز پہلے بالقُوّہ ہو جب وہ فعل کی طرف نکل کر آجائے تو اشیاء کے مرکّبات اور بسائط خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ کسی اور چیز سے نہیں پیدا ہوتے۔ نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جہان ازل سے ہے اور اسی طرح ابد تک چلتا رہے گا۔ نہ ہی اس میں تغیر پیدا ہوگا اور نہ ہی اس کے فعل کے باوجود اسے زوال ہوگا۔ اور یہ جہان خود ہی ان اجزاء کو جو اس کے اندر ہیں مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے۔"

"شہرستانی کی کتاب الملل والنحل میں دہریہ سے بحث کی گئی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خلق کے دوبارہ زندہ کیے جانے کا اور لوٹائے جانے کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: طبیعت (فطرت)، زندہ کرنے والی ہے۔ اور زمانہ فنا کرنے والا ہے۔" ۔۔۔۔ آمدی نے اپنی کتاب ابکار الافکار میں طبیعت کے ماننے والوں کے ساتھ بہت لطیف بحث کی ہے۔"

"جو لوگ دہر کے معتقد ہیں، انہوں نے اس کے لیے صفاتِ کمال بھی ثابت کی ہیں: مثلاً علم، قدرت وغیرہ۔" (عربی شعراء کے کلام میں ایسی باتیں مذکور ہیں جن کا علامہ نے حوالہ دیا ہے)۔

"دہر کو ماننے والوں اور طبیعت پر اعتقاد رکھنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے ان میں فرق روا رکھا ہے۔"

(اقتباسات از اُردو ترجمہ بلوغ الارب - ج ۳،
ص ۱۰۹ تا ۱۱۶)

(مرتبین)

ایسی نہیں گزری ہے جو بحیثیتِ مجموعی خدا کی منکر اور دہریہ رہی ہو۔ افراد اور چھوٹے چھوٹے فلسفیانہ گروہ ایسے ضرور رہے ہیں لیکن وہ اتنے قابلِ لحاظ نہ تھے کہ براہِ راست ان کو خطاب کرنے کے لیے کوئی نبی بھیجا جاتا یا کتاب نازل کی جاتی۔ اسی لیے قرآن مجید میں ایسے گروہوں کے متعلق کہیں کہیں مختصر اشارات تو ضرور کیے گئے ہیں، لیکن دعوت کا براہِ راست خطاب مشرکین ہی کی طرف رہا ہے، اور عموماً توحید پر جو دلائل دیے گئے ہیں وہ اِس انداز سے دیے گئے ہیں کہ شرک کے ابطال کے ساتھ دہریت کا ابطال بھی انہی سے ہو جاتا ہے۔ اُس کے خلاف الگ سے دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ الخ

شرک کے ساتھ دہریت کا اِبطال

اِس سلسلے میں ملاحظہ ہو سورۃ النمل کی آیت ۶۰:

"بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے وہ خوشنما باغ اگاتے جن کے درختوں کا اُگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ — کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ (نہیں!) بلکہ یہی لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔ (ترجمہ از تفہیم القرآن)

اِس سوال اور اس کے بعد کے سوالات میں صرف مشرکین ہی کے شرک کا اِبطال نہیں ہے بلکہ دہریوں کی دہریت کا اِبطال بھی ہے۔[1] مثلاً اِس پہلے سوال میں پوچھا گیا ہے کہ یہ بارش برسانے والا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی نباتات اُگانے والا کون ہے؟ اب غور کیجیے، زمین میں اُس مواد کا ٹھیک سطح پر یا سطح سے متصل موجود ہونا جو بے شمار مختلف اقسام کی نباتی زندگی کے لیے درکار ہے، اور پانی کے اندر وہ اوصاف موجود ہونا جو حیوانی اور نباتی زندگی کی ضروریات کے مطابق ہیں، اور اس پانی کا پے در پے سمندروں سے اُٹھایا جانا اور زمین کے مختلف حصّوں میں وقتاً فوقتاً ایک باقاعدگی کے ساتھ برسایا جانا، اور زمین، ہوا، پانی اور درجۂ حرارت وغیرہ مختلف قوتوں کے درمیان ایسا متناسب تعاون قائم کرنا کہ اس سے نباتی زندگی کو نشوونما

---

[1] اِس سلسلے میں مولانا مودودی کی بعض اہم تحریروں کو یہاں اس خیال سے بھی جمع کرنا ضروری سمجھا گیا ہے کہ دورِ حاضر میں دہریت نے فلسفے میں بھی اپنا راستہ بنا لیا ہے اور سیاست و اقتصادیات کے روپ میں وہ ذہنوں پر حملہ آور ہے۔ مولانا مودودی نے کائنات و حیات کے نظم و توافق پر اپنی جامع اور مختصر بحثیں ایسے انداز میں کی ہیں کہ ایک ذی تشخص، صاحبِ ارادہ اور حکیم و قدیر خدا کا وجود تسلیم کیے بغیر عالمِ موجودات کی کوئی تعبیر ممکن نہیں۔ دوسرے لفظوں میں مولانا نے سائنس کی دریافتوں کو وجودِ باری کی ناقابلِ تردید شہادتوں کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ (مرتبین)

نصیب ہو اور وہ ہر طرح کی حیوانی زندگی کے لیے اس کی بے شمار ضروریات پوری کرے، کیا یہ سب کچھ ایک حکیم کی منصوبہ بندی اور دانشمندانہ تدبیر اور غالب قوت و ارادہ کے بغیر خود بخود اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ہر اتفاقی حادثہ مسلسل ہزارہا برس بلکہ لاکھوں کروڑوں برس تک اسی باقاعدگی سے رونما ہوتا چلا جائے؟ صرف ایک ہٹ دھرم آدمی ہی جو تعصب میں اندھا ہو چکا ہو اسے ایک امر اتفاقی کہہ سکتا ہے۔ کسی راستی پسند، عاقل انسان کے لیے ایسا لغو دعویٰ کرنا اور ماننا ممکن نہیں ہے۔[۱۱۹]

نظم و توافق اتفاقی حادثہ نہیں

"زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لیے جائے قرار ہونا (اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا ...) بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ ..... یہ کرہ فضائے بسیط میں معلق ہے، کسی چیز پر ٹکا ہوا نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب و اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا جس کے خطرناک نتائج کا ہم کبھی زلزلہ آجانے سے بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی۔ یہ کرہ باقاعدگی سے سورج کے سامنے آتا اور چھپتا ہے ... . اگر اس کا ایک ہی رخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا رخ ہر وقت چھپا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی۔ ... اس کرہ پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کا ایک کثیف ردا چڑھا دیا گیا ہے جو شہابوں کی خوفناک بمباری سے اسے بچائے ہوئے ہے (ورنہ روزانہ دو کروڑ شہاب ۳۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں)۔ ... یہی ہوا درجۂ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے، یہی سمندروں سے بادل اٹھاتی اور زمین کے مختلف حصوں تک آب رسانی کی خدمت انجام دیتی ہے، اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گیسیں فراہم کرتی ہے۔[۱] یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لیے جائے قرار نہ بن سکتی۔ اس کرے کی سطح سے بالکل متصل وہ معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزا بڑے پیمانے پر فراہم کر دیے گئے ہیں جو نباتی، حیوانی اور انسانی زندگی کے لیے مطلوب ہیں۔ ..... اس کرے پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیر زمین سوتوں کی شکل میں پانی کا بڑا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے، اور پہاڑوں پر بھی اس کے بڑے بڑے ذخائر کو منجمد کرنے اور پھر پگھلا کر بہانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ... پھر اس پانی، ہوا اور تمام ان اشیاء کو جو زمین پر پائی جاتی ہیں سمیٹے رکھنے کے لیے اس کرے میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے۔ .....

علاوہ بریں اس کرے کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے جو آبادی کے لیے مناسب ترین ہے۔ ...

یہ صرف چند وہ مناسبتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لیے جائے قرار بنی ہے۔ کوئی شخص

---

[۱] یہی آواز ہمارے لیے آوازوں کا وسیلۂ ترسیل و قبولیت ہے جس کے بغیر تکلم کا سلسلہ ممکن نہ ہوتا (مرتبین)

جو عقل رکھتا ہو اور ان اُمور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ کسی خالقِ حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں ایک حادثے کے نتیجے میں خود بخود قائم ہو گئی ہیں، اور نہ یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے کو بنانے اور رُو بعمل لانے میں کسی دیوی، دیوتا یا جن یا نبی و ولی یا فرشتے کا کوئی دخل ہے۔[۱۱۲]

حیات اور اس کا اعادہ

حیات کی پیدائش کے لیے جتنے عوامل درکار ہیں اُن سب کا ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آجانا دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانونِ بخت و اتفاق (Law of Chance) کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا۔

زندگی محض ایک مجرّد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار متنوّع صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک رُوئے زمین پر حیوانات کی تقریباً ۱۰ لاکھ اور نباتات کی تقریباً دو لاکھ انواع کا پتہ چلا ہے۔ یہ لکھوکھا انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں۔ اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورتِ نوعیہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آرہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (Design) کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوّع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے۔

اب ذرا اعادۂ خلق پر غور کیجیے۔ خالق نے ہر نوعِ حیوانی اور نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظام العمل (Mechanism) رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد و حساب نسل ٹھیک اسی کی صورتِ نوعیہ اور مزاج و خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے، اور کبھی جھوٹوں بھی اِن کروڑہا کروڑ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانۂ تناسُل کسی دوسری نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ جدید علمِ تناسُل کے مشاہدات اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں۔ ہر پودے میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کا ایسا مکمل انتظام کرے جس سے آنے والی نسل اس کی نوع کی تمام امتیازی خصوصیات کی حامل ہو، اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورتِ نوعیہ میں ممیّز ہو۔ یہ بقائے نوع اور تناسُل کا سامان ہر پودے کے ایک خُلیے (Cell) کے ایک حصّے میں ہوتا ہے جسے بمشکل انتہائی طاقت ور خورد بین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینیئر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نشو و نما کو حتماً اُسی راستے پر ڈالتا ہے جو اس کی

اپنی صورتِ نوعیہ کا راستہ ہے۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ناقابلِ تصور وسیع پیمانے پر ہر طرف اعادۂ تخلیق کا ایک عظیم کارخانہ چل رہا ہے جو ہر نوع کے افراد سے پیہم اُسی نوع کے بے شمار افراد وجود میں لاتا چلا جا رہا ہے۔ ۔۔ ۔۔

۔۔ ۔۔ یہ چیز نہ صرف اپنی ابتدا کے لیے ایک صانع حکیم چاہتی ہے بلکہ ہر آن اپنے درست طریقہ پر چلتے رہنے کے لیے بھی ایک ناظم و مُدبّر اور ایک حیّ و قیوم کی طالب ہے جو ایک لحظہ کے لیے بھی اِن کارخانوں کی نگرانی اور رہنمائی سے غافل نہ ہو۔

یہ حقائق ایک دہریے کے انکارِ خدا کی بھی اُسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مُشرک کے شرک کی۔ [۴۱۳]

حقیقتِ کائنات کے دو پہلو

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۔ (الرّوم۔ آیت ۸)	کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں برحق اور ایک مقرر مدت ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔

اس فقرے میں آخرت کی دو مزید دلیلیں دی گئی ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے وجود سے باہر کے نظامِ کائنات کو بنظرِ غور دیکھے تو اسے دو حقیقتیں نمایاں نظر آئیں گی:

ایک یہ کہ یہ کائنات برحق بنائی گئی ہے۔ یہ کسی بچے کا کھیل نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے اُس نے ایک بے ڈھنگا سا گھروندا بنا لیا ہو جس کی تعمیر اور تخریب دونوں ہی بے معنی ہوں، بلکہ یہ ایک سنجیدہ نظام ہے جس کا ایک ایک ذرّہ اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ اسے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے جس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے، جس کی ہر شے بامقصد ہے۔ انسان کا سارا تمدّن اور اس کی پوری معیشت اور اس کے تمام علوم و فنون خود اس بات پر گواہ ہیں کہ دنیا کی ہر چیز کے پیچھے کام کرنے والے قوانین کو دریافت کر کے اور ہر شے جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اسے تلاش کر کے ہی انسان یہاں یہ سب کچھ تعمیر کر سکا ہے، ورنہ ایک بے ضابطہ اور بے مقصد کھلونے میں اگر ایک پُتلے کی حیثیت سے اُس کو رکھ دیا گیا ہوتا تو کسی سائنس اور کسی تہذیب و تمدّن کا تصوّر تک نہ کیا جا سکتا تھا۔ اب آخر یہ بات تمہاری عقل میں کیسے سماتی ہے کہ جس حکیم نے اِس حکمت اور مقصدیت کے ساتھ یہ دُنیا بنائی ہے اور اس کے اندر تم جیسی ایک مخلوق کو اعلیٰ درجہ کی ذہنی و جسمانی طاقتیں دے کر، اختیارات دے کر، آزادیِ انتخاب

دے کر، اخلاق کی حس دے کر اپنی دنیا کا بے شمار سرو سامان تمہارے حوالہ کیا ہے، اس نے تمہیں بے مقصد ہی پیدا کر دیا ہوگا؟ تم دنیا میں تعمیر و تخریب، اور نیکی و بدی، ظلم و عدل، اور راستی و ناراستی کے سارے ہنگامے برپا کرنے کے بعد بس یونہی مر کر مٹی میں مل جاؤ گے اور تمہارے کسی اچھے یا برے کام کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا؟ تم اپنے ایک ایک عمل سے اپنی اور اپنے جیسے ہزاروں انسانوں کی زندگی پر اور دنیا کی بے شمار اشیاء پر بہت سے مفید یا مضر اثرات ڈال کر چلے جاؤ گے اور تمہارے مرتے ہی یہ سارا دفترِ عمل بس یونہی لپیٹ کر دریا بُرد کر دیا جائے گا۔

دوسری حقیقت جو اس کائنات کے نظام کا مطالعہ کرنے سے صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کسی چیز کے لیے ہمیشگی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک عمر مقرر ہے جسے پہنچنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے اور یہی معاملہ بحیثیتِ مجموعی پوری کائنات کا بھی ہے۔ یہاں جتنی طاقتیں کام کر رہی ہیں وہ سب محدود ہیں۔ ایک وقت تک ہی وہ کام کر رہی ہیں، اور کسی وقت پر انہیں لامحالہ خرچ ہو جانا اور اِس انتظام کو ختم ہو جانا ہے۔ قدیم زمانے میں تو علم کی کمی کے باعث اُن فلسفیوں اور سائنسدانوں کی بات کچھ چل بھی جاتی تھی جو دنیا کو اَزلی و اَبدی قرار دیتے تھے۔ مگر موجودہ سائنس نے عالَم کے حُدوث و قِدَم کی اِس بحث میں، جو ایک مدّتِ دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی، قریب قریب حتمی طور پر اپنا ووٹ خدا پرستوں کے حق میں ڈال دیا ہے۔ اب دہریوں کے لیے عقل اور حکمت کا نام لے کر یہ دعوٰی کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی۔ پرانی مادّہ پرستی کا سارا انحصار اِس تخیّل پر تھا کہ مادّہ فنا نہیں ہو سکتا، صرف صورت بدلی جا سکتی ہے، مگر ہر تغیّر کے بعد مادّہ مادّہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ اِس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ اِس عالَمِ مادّی کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ انتہا۔ لیکن اب جوہری توانائی (Atomic Energy) کے انکشاف نے اس پورے تخیّل کی بساط اُلٹ کر رکھ دی ہے۔ اب یہ بات کھل گئی ہے کہ قوّت مادّے میں تبدیل ہوتی ہے اور مادّہ پھر قوّت میں تبدیل ہو جاتا ہے حتّٰی کہ نہ صورت باقی رہتی ہے نہ ہیُولیٰ۔ اب حرکیاتِ حرارت کے دوسرے قانون (Second Law of Thermo Dynamics) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ عالَمِ مادّی نہ ازلی ہو سکتا ہے نہ ابدی۔ اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا چاہیے۔ اس لیے سائنس کی بنیاد پر اب قیامت کا انکار ممکن نہیں رہا ہے اور ظاہر بات ہے کہ جب سائنس ہتھیار ڈال دے تو فلسفہ کن ٹانگوں پر اُٹھ کر قیامت کا انکار کریگا؟[۱۲۴]

باب ۱۶

یہود اور یہودیت

فصل ۱

حضرتِ موسیٰؑ سے قبل کا دور

حضرت اسحٰقؑ کی اولاد، جس میں حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤد، سلیمان، عیسیٰ اور بہت سے دوسرے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے حضرت یعقوبؑ کی نسل سے تھے اُن کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا انہوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی ان کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو ان سے الگ رہیں مگر مذہباً ان کی متبع رہیں۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔ ھ۱۴۱

اِس قوم کی روایات یہ ہیں کہ ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت یعقوبؑ سے اللہ تعالیٰ نے کشتی لڑی۔ رات بھر کشتی ہوتی رہی، اور صبح تک لڑ کر بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہ پچھاڑ سکا۔ پھر جب صبح ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا: "اب مجھے جانے دے" تو انہوں نے کہا: "مَیں تجھے نہ جانے دونگا جب تک تو مجھے برکت نہ دے۔" اللہ تعالیٰ نے پوچھا: "تمہارا نام کیا ہے؟" انہوں نے کہا: "یعقوب"۔ اللہ نے فرمایا کہ "آئندہ تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔"[1] ھ۱۴۶

بنی اسرائیل کا وسیع و عظیم ماضی

ایک طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر

---

[1] ملاحظہ ہو: یہودیوں کا جدید ترین ترجمہ کتبِ مقدسہ (The Holy Sepulchre) شائع کردہ جیوش پبلیکیشنز سوسائٹی آف امریکہ ۱۹۵۴ء، کتاب پیدائش، باب ۳۲، آیات ۲۵ تا ۲۹۔ عیسائیوں کے ترجمۂ بائبل میں بھی یہ مضمون اسی طرح بیان ہوا ہے۔ یہودی ترجمہ کے حاشیہ میں اسرائیل کے معنی لکھے گئے ہیں He who striveth with God یعنی "جو خدا سے زور آزمائی کرے۔" اور انسائیکلوپیڈیا آف بیبلیکل لٹریچر میں عیسائی علماء نے اسرائیل کے معنی کی تشریح یہ کی ہے کہ Wrestler with God یعنی خدا سے کشتی لڑنے والا۔ پھر بائبل کی کتاب ہوسیع باب ۱۲۔ آیت ۴ میں حضرت یعقوبؑ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی توانائی کے ایام میں خدا سے کشتی لڑا، پھر فرشتے سے کشتی لڑا اور غالب آیا۔"

ان کی قوم میں پیدا ہوئے اور دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اور ان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ مدتِ دراز تک یہی اس زمانے کی مہذب دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے، اور ان ہی کا سکہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔

عموماً لوگ بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰؑ سے شروع کرتے ہیں لیکن قرآن اس مقام پر (المائدہ-۲۰) تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانۂ عروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا تھا جسے خود حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔[۴۱۸]

یہودیت کی ابتدا اور وجہ تسمیہ

اصل دین جو حضرت موسیٰؑ اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاءؑ لاتے تھے وہ تو اسلام ہی تھا ان انبیاءؑ میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا، اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مذہب اس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اُس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جب سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تو یہ خاندان اُس ریاست کا مالک ہوا جو یہودیہ کے نام سے موسوم ہوئی، اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کر لی جو سامریہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر اسیریا نے نہ صرف یہ کہ سامریہ کو برباد کر دیا بلکہ اُن اسرائیلی قبیلوں کا بھی نام و نشان مٹا دیا جو اس ریاست کے بانی تھے۔ اس کے بعد صرف یہوداہ اور اس کے ساتھ بن یامین کی نسل باقی رہ گئی جس پر یہوداہ کی نسل کے غلبے کی وجہ سے یہودی کے لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ اس نسل کے اندر کاہنوں اور ربیوں اور احبار نے اپنے اپنے خیالات اور رجحانات کے مطابق عقائد اور رسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچہ صدہا برس میں تیار کیا اس کا نام یہودیت ہے۔ یہ ڈھانچہ چوتھی صدی قبل مسیح سے بننا شروع ہوا اور پانچویں صدی عیسوی تک بنتا رہا۔ اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی ربانی ہدایت کا بہت تھوڑا ہی عنصر اس میں شامل ہے اور اس کا حلیہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔ اِس بنا پر قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ان کو "اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے — یعنی اے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے ہو۔ ان میں سب کے سب اسرائیلی ہی نہ تھے بلکہ وہ غیر اسرائیلی لوگ بھی تھے جنہوں نے یہودیت قبول کر لی تھی۔ قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے، وہاں بنی اسرائیل کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اور جہاں مذہب یہود کے پیرووں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں "اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔[۴۱۹]

یہود حضرت یوسفؑ کے دور میں

موجودہ زمانے کے محققین جنہوں نے بائیبل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے، عام طور پر یہ رائے رکھتے ہیں کہ

حروا ہے بادشاہوں Hyksos Kings میں سے جس فرماں روا کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس Apophis) ملتا ہے وہی حضرت یوسفؑ کا ہم عصر تھا

مصر کا دارالسلطنت ممفس (منف) تھا جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۱۴ میل کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسف ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں وہاں پہنچے۔ دو تین سال عزیز مصر کے گھر رہے۔ آٹھ سال جیل میں گذارے ۳۰ سال کی عمر میں ملک کے فرماں روا ہوئے اور ۸۰ سال تک بلا شرکت غیرے تمام مملکتِ مصر پر حکومت کرتے رہے۔ اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال انہوں نے حضرت یعقوبؑ کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلا لیا اور اُس علاقے میں آباد کیا جو دمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس علاقے کا نام جُشَن یا گوشن بتایا گیا ہے۔[1] حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور انتقال کے وقت بنی اسرائیل کو وصیت کی کہ جب تم مصر سے نکلو تو میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے کر جانا۔ ۴۲۰ھ

حضرت یوسفؑ جن کی بدولت مصر میں اُن کے قدم جمے، خود پیغمبر تھے۔ ان کے بعد چار پانچ صدی ملک کا اقتدار انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ اِس دوران میں یقیناً انہوں نے مصر میں اسلام کی خوب تبلیغ کی ہوگی۔ اہلِ مصر میں سے جو لوگ اسلام لاتے ہونگے ان کا مذہب ہی نہیں، ان کا تمدن اور پورا طریقِ زندگی غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے ہم رنگ ہو گیا ہوگا۔ مصریوں نے ان سب کو اسی طرح اجنبی ٹھہرایا ہوگا جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ٹھیرایا۔ ان کے اوپر بنی اسرائیل کا لفظ اُسی طرح چسپاں کر دیا ہوگا جس طرح غیر عرب مسلمانوں پر "محمڈن" کا لفظ آج چسپاں کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی دینی و تہذیبی روابط اور شادی بیاہ کے تعلقات کی وجہ سے غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مصر پرستی کا طوفان اُٹھا تو مظالم صرف بنی اسرائیل پر ہی نہیں ہوتے بلکہ مصری مسلمان بھی ان کے ساتھ یکساں لپیٹ لیے گئے۔ اور جب بنی اسرائیل نے ملک چھوڑا تو مصری مسلمان بھی ان کے ساتھ نکلے اور ان سب کا شمار اسرائیلیوں ہی میں ہونے لگا۔[2] ۴۲۲ھ

---

[1] تلمود میں لکھا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ کی آمد کی خبر دارالسلطنت میں پہنچی تو حضرت یوسفؑ سلطنت کے بڑے بڑے اُمراء واہلِ مناصب اور فوج فرا کو لے کر ان کے استقبال کے لیے نکلے اور پورے تزک و احتشام کے ساتھ ان کو شہر میں لائے۔ وہ دن وہاں جشن کا دن تھا۔ عورت، مرد، بچے، سب اس جلوس کو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے اور سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

[2] ہمارے اِس قیاس کی تائید بائبل کے متعدد اشارات سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "خروج" میں جہاں بنی اسرائیل کے

مصر میں قوم پرستانہ انقلاب

حضرت یوسف علیہ السلام کا دور گزر جانے کے بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب ہوا۔ اور قبطیوں کے ہاتھ جب دوبارہ اقتدار آیا تو نئی قوم پرست حکومت نے بنی اسرائیل کا زور توڑنے کی پوری کوشش کی۔ اس سلسلے میں صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا گیا کہ اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کیا جاتا اور انہیں ادنیٰ درجے کی خدمات کے لیے مخصوص کر لیا جاتا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹائی جائے اور ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے، تاکہ رفتہ رفتہ ان کی عورتیں قبطیوں کے تصرّف میں آتی جائیں اور ان سے اسرائیلی کے بجائے قبطی نسل پیدا ہو۔ تلمود اس کی مزید تفصیل یہ دیتی ہے کہ حضرت یوسفؑ کی وفات پر ایک صدی سے کچھ زیادہ مدّت گزر جانے کے بعد یہ انقلاب ہوا تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ نئی قوم پرست حکومت نے پہلے تو بنی اسرائیل کو ان کی زرخیز زمینوں اور ان کے مکانات اور جائیدادوں سے محروم کیا۔ پھر ان کو حکومت کے تمام مناصب سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد بھی جب قبطی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل اور ان کے ہم مذہب مصری کافی طاقت ور ہیں تو انہوں نے اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کرنا شروع کیا، اور ان سے سخت محنت کے کام قلیل معاوضوں پر یا بلا معاوضہ لینے لگے۔ یہ تفسیر ہے قرآن کے اس بیان کی کہ فرعون مصر کی آبادی کے ایک گروہ کو ذلیل کرتا تھا (یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً) اور سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ آلِ فرعون بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیتے تھے۔[۴۲۴]

مصر سے نکلنے کا حال بیان ہوا ہے، بائبل کا مصنّف کہتا ہے کہ ان کے ساتھ ایک ملی جلی بھیڑ بھی تھی" (۱۲: ۳۸) پھر بتدریج ان غیر اسرائیلی مسلمانوں کے لیے اجنبی اور پردیسی کی اصطلاحیں استعمال ہونے لگیں۔ چنانچہ توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کو جو احکام دیتے گئے ان میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے "تمہارے لیے اور اس پردیسی کے لیے جو تم میں رہتا ہے نسل در نسل سدا ایک ہی آئین رہے گا۔ خداوند کے آگے پردیسی بھی ویسے ہی ہوں گے جیسے تم ہو۔" (۱۵: ۱۴-۱۵) (مؤلف)[۴۲۳]

فصل ۲

بعثتِ موسیٰ علیہ السّلام

بنی اسرائیل کئی صدیوں تک مصر میں انتہائی ذلّت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان موسیٰ علیہ السّلام کو پیدا کیا، ان کے ذریعہ سے اِس قوم کو غلامی کی حالت سے نکالا، پھر ان پر کتاب نازل کی، اور اس کے فیض سے وہی دبی اور پسی ہوئی قوم ہدایت پاکر دنیا میں ایک نامور قوم بن گئی۔

حضرت موسیٰؑ کی دعوت

حضرت موسیٰ دو چیزوں کی دعوت لے کر فرعون کے پاس گئے تھے: ایک یہ کہ وہ اللہ کی بندگی (اسلام) قبول کرے، دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل کی قوم کو جو پہلے سے مسلمان تھی، اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر دے۔ ۴۲۶

دوسری طرف انہوں نے بنی اسرائیل کو یہ تعلیم و تربیت دی کہ:

"اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ آخری کامیابی اُنہی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔"

بنی اسرائیل کی دوں ہمتی

اُس پُرخطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علمبردارِ حق (حضرت موسیٰؑ) کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ اُن پر مصلحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اِس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوتے جس کا راستہ ان کو خطرات سے پُر نظر آرہا تھا۔ بلکہ وہ اُلٹے ان نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰؑ کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہو گے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔ ۴۲۷

اُن کے اس طرزِ عمل کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں حضرت موسیٰؑ کے صادق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اور خصوصاً ان کے اکابر و اشراف حضرت موسیٰؑ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیری کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نسلی اور مذہبی دونوں

حیثیتوں سے ابراہیم، اسحٰق، یعقوب اور یوسف علیہم السّلام کے اُمتی تھے، اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے، لیکن ایک مدّتِ دراز کے اخلاقی انحطاط نے اور اُس پست ہمّتی نے جو زیردستی سے پیدا ہوئی تھی، ان میں اِتنا بل بوتا باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر و ضلالت کی فرماں روائی کے مقابلے میں ایمان و ہدایت کا علَم لے کر خود اُٹھتے یا جو اُٹھا تھا اس کا ساتھ دیتے ۔[۴۲۸]

واضح رہے کہ ایک دَورِ ستم وہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے رَعمسیس ثانی کے زمانے میں جاری ہُوا تھا، اور دوسرا دَورِ ستم یہ تھا جو (فرعون منفتاح کے دَور میں) موسیٰ علیہ السّلام کی بعثت کے بعد شروع ہوا۔ دونوں اَدوار میں یہ بات مشترک تھی کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کیا جاتا اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جاتا تھا۔[۴۲۹]

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی اِس کشمکش میں عام اسرائیلیوں کا طرزِ عمل کیا تھا اس کا اندازہ بائبل کی اِس عبارت سے ہو سکتا ہے :۔

"جب وہ فرعون کے پاس سے نکلے آ رہے تھے تو ان کو موسیٰؑ اور ہارونؑ ملاقات کے لیے راستے پر کھڑے ملے۔ تب انہوں نے ان سے کہا کہ خداوند ہی دیکھے اور تمہارا انصاف کرے، تم نے ہم کو فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ میں ایسا گھنأونا کیا ہے کہ ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے ۔ (خروج ۶: ۲۰-۲۱)

تلمود میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰؑ اور ہارونؑ علیہما السّلام سے کہتے تھے :۔

"ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیے نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے آ کر اس کو بچانے کی کوشش کی، اور دونوں کی کشمکش میں بکری کے ٹکڑے اُڑ گئے بس اسی طرح تمہاری اور فرعون کی کھینچ تان میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا۔"[۴۳۰]

مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت[۱]

اللہ تعالیٰ نے آخرکار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام اسرائیلی اور غیر اسرائیلی مسلمانوں کو مصر کے ہر حصّے سے ہجرت کے لیے نکل پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔

---

[۱] حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے سامنے کس کس طرح دعوت دی، ان پر کیا کیا الزامات لگائے جاتے رہے، ان کے دَور میں فرعونیوں پر کیا کیا انتباہی عذاب آئے، نیز خود بنی اسرائیل کے احوال کیا تھے، ان ساری تفاصیل کو چھوڑ کر ہم تاریخی اہمیت کا یہ واقعہ لے رہے ہیں کہ چونکہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا جواب فرعون نے مسلسل انکار اور سرکشی سے دیا، اس لیے اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو نجات دلانے کے لیے ہجرت کی راہ پر نکل کھڑے ہوئے ۔ (مُرتّبین)

. . . حضرت موسیٰؑ نے بحرِ احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا . . . . لیکن ادھر سے فرعون ایک لشکرِ عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اس موقع پر آپہنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سورۂ الشعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کا قافلہ لشکرِ فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گھر چکا تھا عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اپنا عصا سمندر پر مار۔ چنانچہ فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑہ ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں صرف یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا بلکہ بیچ کا یہ حصّہ خشک ہو کر سوکھی سڑک کی طرح بن گیا۔ اس سڑک سے مہاجرین کے گزرتے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اس درمیانی راستے میں اُتر آیا، اور سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دبوچ لیا۔ ۴۳۱ھ

قومِ موسیٰ کا دَورِ صحرا نوردی

حضرت موسیٰ علیہ السّلام بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر جزیرہ نمائے سینا میں مارہ، ایلیم، اور رفیدیم کے راستے کوہِ سینا کی طرف آئے، اور ایک سال سے کچھ زائد مدّت تک اس مقام پر ٹھہرے رہے[1]۔ یہیں تورات کے بیشتر احکام آپ پر نازل ہوئے۔

فلسطین پر چڑھائی کا حکم

پھر آپ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین کی طرف جاؤ اور اسے فتح کر لو کہ وہ تمہاری میراث میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام بنی اسرائیل کو لیے ہوئے تبعیرا اور حصیرات کے راستے دشتِ فاران میں تشریف لائے۔ یہاں سے آپ نے ایک وفد فلسطین کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے بھیجا۔ قادس کے مقام پر اس وفد نے آکر اپنی رپورٹ پیش کی۔ حضرت یوشع اور کالب کے سوا پورے وفد کی رپورٹ حوصلہ شکن تھی جسے سُن کر بنی اسرائیل چیخ اُٹھے اور انہوں نے فلسطین کی مہم پر جانے سے انکار کر دیا۔

دوسرا دَورِ صحرا نوردی بطورِ سزا

تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب یہ چالیس برس تک اس علاقے میں بھٹکتے رہیں گے، اور ان کی موجودہ نسل یوشع اور کالب کے سوا فلسطین کی شکل نہ دیکھنے پائے گی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل دشتِ فاران، بیابانِ شور، اور دشتِ صین کے درمیان مارے مارے پھرتے رہے اور عمالقہ، اموریوں، اَدومیوں، مدیانیوں اور موآب کے لوگوں سے لڑتے بھڑتے رہے۔

---

[1] بنی اسرائیل کے دَورِ صحرا نوردی کی داستان کے بہت سے پہلو بڑے اہم ہیں۔ اس دَور میں ان پر معجزانہ صورت میں خاص انعامات ہوئے، اِس دَور میں ان کے اندر غلامانہ ماضی کے اثرات طرح طرح کی غلط حرکات کی صورت میں ظاہر ہوئے جس کی اصلاح کے لیے حضرت موسیٰؑ نے شدید محنت کی۔ اس لحاظ سے یہ زمانہ تربیت تھا۔ (مرتبین)

فصل ۳

فلسطین کی فتح اور دَورِ مابعد

فلسطین کی فتح

جب چالیس سال گزرنے کے قریب آئے تو اَدُوم کی سرحد کے قریب کوہِ ہور پر حضرت ہارون علیہ السلام نے وفات پائی۔ پھر حضرت مُوسیٰؑ بنی اسرائیل کو لیے ہُوئے موآب کے علاقے میں داخل ہُوئے اور اس پُورے علاقے کو فتح کرتے ہُوئے حسبون اور شطیم تک پہنچ گئے۔ یہاں کوہِ عباریم پر حضرت مُوسیٰ کا انتقال ہوا۔ اور اُن کے بعد اُن کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشع نے مشرق کی جانب سے دریائے اُردن کو پار کر کے شہر یریحو (اریحا) کو فتح کیا۔ یہ فلسطین کا پہلا شہر تھا جو بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا۔ پھر ایک قلیل مدت ہی میں پُورا فلسطین فتح ہو گیا۔[۱]

بنی اسرائیل کو بگاڑ سے بچانے کے لیے حضرت مُوسیٰؑ کا انتباہ

سُورۂ ابراہیم آیت نمبر ۷ میں حضرت مُوسیٰؑ کی وصیت یُوں مذکور ہے:

"اور یاد رکھو، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو مَیں تم کو اور زیادہ نوازوں گا، اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔"[۲]

۱؎ فلسطین کی فتح سے پہلے بنی اسرائیل طرح طرح کے فتنوں میں مبتلا ہوئے اور فتح پانے کے بعد پھر ان میں شر و فساد نے مختلف شکلوں میں سر اٹھایا۔ پھر انہوں نے اس کا خمیازہ بھگتا۔ (مُرتبین)

۲؎ اس طرح کی وصیتوں کی ضرورت یہ تھی کہ بنی اسرائیل انعاماتِ الٰہی سے متمتع ہونے کے بعد بار بار نافرمانیاں اور ناشکریاں کرتے تھے۔ حضرت مُوسیٰؑ بار بار ان کی اصلاح کی سعی کرتے اور ان میں توبہ و انابت کا جذبہ اُبھارتے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں یہ اندیشہ بے جا نہ تھا کہ جب یہ فتحِ فلسطین کے نقطۂ عروج تک پہنچیں گے تو ان میں شیطان بڑی آسانی سے سرکشی پیدا کر دے گا۔ اس لیے انہیں پہلے سے اس قانونِ الٰہی کی طرف توجہ دلانا ضروری تھا جو انعام یافتہ اقوام کی سرکشی کی صورت میں کام کرتا ہے۔ (مُرتبین)

اس مضمون کی تقریر بائبل کی کتاب اِستثناء میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ اِس تقریر میں حضرت موسیٰؑ اپنی وفات سے چند روز پہلے بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے سارے اہم واقعات یاد دلاتے ہیں، پھر تورات کے اُن تمام احکام کو دوہراتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بھیجے تھے۔ پھر ایک طویل خطبہ دیتے ہیں۔ ... ... اس کے بعض بعض مقامات کمال درجہ موثر و عبرت انگیز ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

"اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جاں فشانی سے مان کر اُس کے اِن سب حکموں پر جو میں آج کے دن تجھے دیتا ہوں، احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا ... ... لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل نہ کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر ہونگی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی۔ ... ... وبا تجھ سے لپٹی رہے گی ... آسمان جو تیرے سر پر ہے، پیتل کا، اور زمین جو تیرے نیچے ہے، لوہے کی ہو جائے گی۔ ... خداوند تجھے تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا۔ ... ... عورت سے منگنی تو تو کریگا مگر دوسرا اس سے مباشرت کرے گا۔ تو گھر بساتے گا مگر اس میں بسنے نہ پائے گا۔ تو تاکستان لگائے گا پر اُس کا پھل نہ کھا سکے گا۔ تیرا بیل تیری آنکھوں کے سامنے ذبح کیا جائے گا۔ ... ... بھوکا اور پیاسا اور ننگا اور سب چیزوں کا محتاج ہو کر تو اپنے اُن دشمنوں کی خدمت کرے گا جن کو خداوند تیرے برخلاف بھیجے گا۔ اور غنیم تیری گردن پر لوہے کا جوا رکھے گا، جب تک وہ تیرا ناس نہ کر دے۔ ... ... خداوند تجھ کو زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کر دے گا۔[1] ۳۳ھ

حضرت یُوشع کی دعوتِ اصلاح

بنی اسرائیل کی ذہنیت کو اہلِ مصر کی غلامی نے جیسا کچھ بگاڑ دیا تھا اس کا اندازہ اِس بات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ مصر سے نکل آنے کے ۰، برس بعد (جبکہ بنی اسرائیل بُت پرستی پر اُتر آئے تھے۔ مُرتّب)، حضرت موسیٰؑ کے خلیفۂ اول حضرت یُوشع بن نون اپنی آخری تقریر میں بنی اسرائیل کے مجمعِ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"تم خداوند کا خوف رکھو اور نیک نیتی اور صداقت کے ساتھ اس کی پرستش کرو، اور ان دیوتاؤں کو دُور کر دو جن کی پرستش تمہارے باپ دادا بڑے دریا کے پار اور مصر میں کرتے تھے، اور خداوند کی پرستش

---

[1] باب ۲۹- آیت ۱۵ تا ۶۴ (اقتباس و تلخیص)

کرو۔ اور اگر خداوند کی پرستش تم کو بُری معلوم ہوتی ہو تو آج ہی تم اُسے، جس کی پرستش کرو گے، چُن لو۔ ... ... اب رہی میری اور میرے گھرانے کی بات سو ہم تو خداوند ہی کی پرستش کریں گے۔"[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴۰ سال تک حضرت موسیٰؑ کی اور ۲۸ سال تک حضرت یوشع کی تربیت و رہنمائی میں زندگی بسر کر لینے کے بعد بھی یہ قوم اپنے اندر سے اُن اثرات کو نہ نکال سکی جو فراعنۂ مصر کی بندگی کے دَور میں اس کی رگ رگ کے اندر اُتر گئے تھے۔[2]

فتحِ فلسطین کے بعد

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف قومیں آباد تھیں۔ حِتّی، اَموری، کنعانی، فِرزّی، حِوّی، یَبُوسی، فِلستی وغیرہ۔ اِن قوموں میں بدترین قسم کا شرک پایا جاتا تھا۔ ... ساری خدائی بہت سے معبُودوں میں بٹ کر رہ گئی تھی ... اِن دیوتاؤں اور دیویوں کی طرف ایسے ایسے ذلیل اوصاف اور اعمال منسُوب تھے کہ اخلاقی حیثیت سے انتہائی بدکردار انسان بھی ان کے ساتھ مشتہر ہونا پسند نہ کرے ...... ان کے ہاں بچّوں کی قربانی کا عام رواج تھا۔ ان کے معابد زناکاری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ عورتوں کو دیوداسیاں بنا کر عبادت گاہوں میں رکھنا اور اُن سے بدکاریاں کرنا عبادت کے اجزاء میں داخل تھا۔

توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو جو ہدایات دی گئی تھیں ان میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تم ان قوموں کو ہلاک کر کے ان کے قبضے سے فلسطین کی زمین چھین لینا اور ان کے ساتھ رہنے بسنے اور ان کی اخلاقی و اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔

لیکن بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو وہ اس ہدایت کو بھول گئے۔ انہوں نے اپنی کوئی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقوں کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔[3] اس تفرقے سے ان کا کوئی قبیلہ بھی اتنا طاقتور نہ ہو سکا کہ اپنے علاقے کو

---

[1] یشوع ۲۴ (۱۴-۱۵)، [2] اس قوم کی کج فطرتی اور دوں ہمتی کے مظاہر کو قرآن نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مصر میں حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر لبیک کہنے سے گریز، آزادی پاتے ہی سامری کے زیرِ اثر آکر گوسالہ پرستی، گائے ذبح کرنے کے حکم کی مخلصانہ تعمیل کے بجائے حضرت موسیٰؑ سے سوال در سوال کا سلسلہ، صحرا میں من و سلویٰ کے بطورِ انعامِ الٰہی منت حاصل ہونے پر شکر ادا کرنے کے بجائے پرانی شہری غذاؤں کا مطالبہ، جہاد کے موقع پر تعمیلِ حکم سے انکار، یومِ سَبت کے احکام میں نقب زنی، تحریفِ کتاب، قتلِ انبیاء اور اُن پر بہتان بازی، علم فروشی، کتمانِ حق، غرضیکہ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ اس قسم کے سیاہ اوراق سے بھری پڑی ہے (مرتبین)، [3] فلسطین کا مختصر سا علاقہ بنی اسرائیل کے جن قبائل میں تقسیم ہو گیا وہ یہ تھے: بنی یہوداہ۔ بنی شمعون۔ بنی دانی۔ بنی بمین۔ بنی افرائیم۔ بنی روبن۔ بنی جدّ۔ بنی منسی۔ بنی اشکار۔ بنی زبولون۔ بنی نفتالی۔ بنی آشر (مطابق تحقیق مو...)

مشرکین سے پوری طرح پاک کر دیتا۔ آخر کار انہیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں بسیں۔

اس کا پہلا خمیازہ تو بنی اسرائیل کو یہ بھگتنا پڑا کہ ان قوموں کے ذریعہ سے ان کے اندر شرک گھس آیا، اور اس کے ساتھ بتدریج دوسری اخلاقی گندگیاں بھی راہ پانے لگیں لہ[۴۳۵]

بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت کے عہد تک صیدا، صور، دُور، مجدّہ، بیت شان، جزر، یروشلم وغیرہ شہر مشرکوں کے قبضے میں رہے اور ان شہروں کی مشرکانہ تہذیب کا بنی اسرائیل پر گہرا اثر پڑتا رہا۔ مزید برآں اسرائیلی قبائل کی سرحدوں پر فلسطینیوں، اَدومیوں، موآبیوں اور عمونیوں کی طاقت ور ریاستیں بھی بدستور قائم رہیں اور انہوں نے بعد میں پے در پے حملے کر کے بہت سا علاقہ اسرائیلیوں سے چھین لیا حتیٰ کہ نوبت یہ آگئی کہ فلسطین سے بنی اسرائیل بہ یک بینی دو گوش نکال دیے جاتے اگر عین وقت پر اللہ تعالیٰ طالوت کی قیادت میں اسرائیلیوں کو جمع نہ کر دیتا۔[۴۳۶]

بنی اسرائیل کا پہلا بڑا دورِ فساد

حضرت سُلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انہوں نے آپس میں لڑ کر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شمالی فلسطین اور شرقِ اُردن میں سلطنتِ اسرائیل، جس کا پایۂ تخت آخر کار سامریّہ قرار پایا، اور جنوبی فلسطین اور اَدُوم کے علاقے میں سلطنتِ یہودیہ جس کا پایۂ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش اوّل روز سے شروع ہو گئی اور آخر تک رہی۔

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متأثر ہوئے۔ ... حضرت الیاس اور حضرت الیسع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر یہ قوم جس تنزّل کی طرف جا رہی تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخر کار اللہ کا غضب آشوریوں کی شکل میں دولتِ اسرائیلی کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر آشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہو گئے۔ .....

لہ دوسرا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انہوں نے چھوڑ دی تھیں، انہوں نے اور فلسطیوں نے جن کا پورا علاقہ غیر مغلوب رہ گیا تھا، بنی اسرائیل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور پے در پے حملے کر کے فلسطین کے بڑے حصے سے ان کو بے دخل کر دیا، حتیٰ کہ ان سے خداوند کے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) تک چھین لیا۔ آخر کار بنی اسرائیل کو ایک فرماں روا کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ... اس متحدہ سلطنت کے تین فرماں روا ہوئے۔ حضرت طالوت، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام۔ ان فرمانرواؤں نے اُس کام کو مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ (مؤلف)[۴۳۷]

۷۲۰ء قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرماں روا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے دولتِ اسرائیل کا خاتمہ کر دیا۔

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلدی شرک اور بداخلاقی میں مبتلا ہوگئی۔

اگرچہ دولتِ اسرائیل کی طرح اس پر بھی اشوریوں نے پے در پے حملے کیے، اس کے شہروں کو تباہ کیا، اس کے پایۂ تخت کا محاصرہ کیا، لیکن یہ ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم نہ ہو سکی۔ بلکہ صرف باجگزار بن کر رہ گئی . . .

. . . آخر ۵۸۷ء قبل مسیح میں (بابل کے بادشاہ) بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یروشلم اور ہیکلِ سلیمانی کو اِس طرح پیوندِ خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کر دیا۔[۲۸]

خدا کی طرف سے ایک اور موقع دیا گیا

جہاں تک سامریہ اور اسرائیل کے لوگوں کا تعلق ہے وہ تو (اشوریوں کی فتح کے بعد) اخلاقی اور اعتقادی زوال کی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اُٹھے۔ مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیّہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت دینے والا تھا۔ اس نے اُن لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے کھچے رہ گئے تھے، اور اُن لوگوں کو بھی توبہ و انابت کی ترغیب دی جو بابل اور دوسرے علاقوں میں جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ آخر کار رحمتِ الٰہی ان کی مددگار ہوئی۔ بابل کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ۵۳۹ء قبل مسیح میں ایرانی فاتح سائرس (خورس یا خسرو) نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے فرمان جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت ہے۔

سائرس نے یہودیوں کو ہیکلِ سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی اجازت بھی دی۔ مگر ایک عرصے تک ہمسایہ قومیں جو اس علاقے میں آباد ہو گئی تھیں، مزاحمت کرتی رہیں۔ آخر داریوس (دارا) اوّل نے ۵۲۲ء قبل مسیح میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے پوتے زرُوبابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے حجّی نبی، زکریاہ نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکلِ مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔

اِس زمانے میں حضرت عُزَیر نے دینِ مُوسَوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ اُنہوں نے یہُودی قوم کے تمام اہلِ خیر و صلاح لوگوں کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائبل کی کتبِ مقدسہ کو جن میں توراۃ تھی، مرتّب کر کے شائع کیا، یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا، قوانینِ شریعت کو نافذ کر کے اُن اعتقادی اور اخلاقی برائیوں کو دُور کرنا شروع کیا۔ جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گھس آئی تھیں۔ اُن تمام مُشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جن سے یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے۔ اور بنی اسرائیل سے ازسرِ نو

خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا میثاق لیا۔

ڈیڑھ سو سال بعد بیتُ المقدس پھر سے آباد ہوا اور یہودی مذہب و تہذیب کا مرکز بن گیا۔

یونانی تسلّط اور مکّابی تحریک

انٹیوکس ثالث (سلوقی سلطنت کا فرمانروا جس کا پایۂ تخت انطاکیہ تھا) نے ۱۹۸ء قبل مسیح میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یہ یونانی فاتح جو مذہباً مشرک اور اخلاقاً اباحیت پسند تھے، یہودی مذہب و تہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی دباؤ سے یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کیا اور خود یہودیوں میں سے ایک اچھا خاصا عنصر ان کا آلۂ کار بن گیا۔ اس خارجی مداخلت نے یہودی قوم میں تفرقہ ڈال دیا۔ ایک گروہ نے یونانی لباس، یونانی زبان، یونانی طرزِ معاشرت اور یونانی کھیلوں کو اپنا لیا اور دوسرا گروہ اپنی تہذیب پر سختی سے قائم رہا۔

۱۷۵ء قبل مسیح میں انٹیوکس چہارم (جس کا لقب ایپی فانیس یعنی مظہرِ خدا تھا) جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری جابرانہ قوت سے یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی...... لیکن یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکّابی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس کشمکش میں یونانیت زدہ یہودیوں کی ساری ہمدردیاں یونانیوں کے ساتھ تھیں اور انہوں نے عملاً مکّابی بغاوت کو کچلنے میں انطاکیہ کے ظالموں کا پورا ساتھ دیا، لیکن عام یہودیوں میں حضرت عُزیرؑ کی پھونکی ہوئی رُوحِ دینداری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مکّابیوں کے ساتھ ہو گئے اور آخر کار انہوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کر لی جو ۶۷ء قبل مسیح تک قائم رہی۔ اس ریاست کے حدود پھیل کر رفتہ رفتہ اس پورے رقبے پر حاوی ہو گئے جو کبھی یہودیہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے زیرِ نگیں تھا۔ بلکہ فلستیہ کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں آ گیا جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بھی مسخر نہ ہوا تھا۔[۴۴]

دوسرا دَورِ فساد اور اس کا خمیازہ

مکّابیوں کی تحریک جس اخلاقی و دینی رُوح کے ساتھ اُٹھی تھی وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ خالص دنیا پرستی اور بے روح ظاہر داری نے لے لی۔ آخر کار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپی ۶۳ء قبل مسیح میں اس ملک کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے

لہ اس سلسلے میں ان تفصیلی احکام کا تذکرہ چھوڑ دیا گیا ہے جن کے ذریعے یہودیوں کے عام عقائد، عبادات، شعائر اور اصولِ معاشرت کو نشانہ بنایا گیا تھا (مرتبین)

بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن رومی فاتحین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ وہ مفتوح علاقوں پر براہِ راست اپنا نظم و نسق قائم کرنے کی بہ نسبت مقامی حکمرانوں کے ذریعہ سے بالواسطہ اپنا کام نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے فلسطین میں اپنے زیرِ سایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی جو بالآخر سنہ ۴۰ ق م میں ایک ہوشیار یہودی ہیرود نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرودِ اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ ...... اس نے ایک طرف مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کر کے یہودیوں کو خوش رکھا، اور دوسری طرف رومی تہذیب کو فروغ دے کر اور رومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے قیصر کی بھی خوشنودی حاصل کی۔ اس زمانے میں یہودیوں کی دینی و اخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

سنہ ۴۱ء میں ہیرودِ اعظم کے پوتے ہیرود اگرپا کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرماں روا بنا دیا جن پر ہیرودِ اعظم اپنے زمانے میں حکمراں تھا۔ اس شخص نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کر دی۔

اِس دَور میں عام یہودیوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی جو حالت تھی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان تنقیدوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مسیح علیہ السلام نے اپنے خطبوں میں اُن پر کی ہیں۔

اِس قوم کی آنکھوں کے سامنے یحییٰ علیہ السلام جیسے پاکیزہ انسان کا سر قلم کیا گیا، مگر ایک آواز بھی اس ظلمِ عظیم کے خلاف نہ اُٹھی۔ اور پوری قوم کے مذہبی پیشواؤں نے مسیح علیہ السلام کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا۔ .... حد یہ ہے کہ جب پونتس پیلاطُس نے ان شامت زدہ لوگوں سے پوچھا کہ .... بتاؤ یسوع کو چھوڑوں یا برابّا ڈاکو کو، تو ان کے پورے مجمع نے بیک آواز ہو کر کہا کہ برابّا کو چھوڑ دے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت تھی جو اس قوم پر قائم کی گئی۔

اس پر تھوڑا زمانہ ہی گزرا تھا کہ یہودیوں اور رُومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی اور ۶۴ء اور ۶۶ء کے درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کر دی۔ .... آخر کار رُومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی سے اِس بغاوت کو کچل ڈالا اور سنہ ۷۰ء میں ٹیٹس نے بزورِ شمشیر یروشلم کو فتح کر لیا۔ اس موقع پر قتلِ عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار آدمی مارے گئے، ۶۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنائے گئے، ہزارہا آدمی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیئے گئے۔ ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لیے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لیے چُن لی گئیں۔ اور یروشلم کے شہر اور ہیکل کو پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد فلسطین

سے یہودی اثر ایسا مٹا کہ دو ہزار برس تک اس کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔[۱۴۱]

توراۃ میں تحریف[۱]

کتابِ استثنا میں حضرت موسیٰ کی جو آخری تقریر نقل کی گئی ہے اس میں وہ بار بار بنی اسرائیل سے عہد لیتے ہیں کہ جو احکام مَیں نے تم کو پہنچائے ہیں انہیں اپنے دل پر نقش کرنا، اپنی آئندہ نسلوں کو سکھانا، گھر بیٹھے اور راہ چلتے، اور اٹھتے اور لیٹتے ہر وقت ان کا چرچا کرنا، اپنے گھر کی چوکھٹوں پر ان کو لکھ دینا[۲]۔ پھر اپنی آخری وصیت میں انہوں نے تاکید کی کہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ کوہ عیبال پہ بڑے بڑے پتھر نصب کر کے توراۃ کے احکام اُن پر کندہ کر دینا[۳]۔ نیز بنی لاوی کو توراۃ کا ایک نسخہ دے کر ہدایت فرمائی کہ ہر ساتویں برس عیدِ خیام کے موقع پر قوم کے مردوں، عورتوں، بچّوں سب کو جگہ جگہ جمع کر کے یہ پُوری کتاب لفظ بہ لفظ ان کو سناتے رہنا[۴]۔ لیکن اس پر بھی کتاب اللہ سے بنی اسرائیل کی غفلت رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ حضرت موسیٰ کے سات سو برس بعد ہیکلِ سلیمانی کے سجادہ نشین اور یروشلم کے یہودی فرمانروا تک کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں توراۃ نامی کوئی کتاب موجود ہے[۵]۔

علمائے یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انہوں نے کتاب اللہ کے علم کی اشاعت کرنے کے بجائے اس کو ربّیوں اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود طبقے میں مقیّد کر رکھا تھا، اور عامّۂ خلائق تو درکنار، خود یہودی عوام تک کو اس کی ہوا نہ لگنے دیتے تھے۔ پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گمراہیاں پھیلیں تو علماء نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوشش نہ کی بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیّت برقرار رکھنے کے لیے ہر اُس ضلالت اور بدعت کو جس کا رواج عام ہو جاتا، اپنے قول و عمل سے، یا اپنے سکوت سے اُلٹی سندِ جواز عطا کرنے لگے[۶][۱۴۳]۔

ان لوگوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلامِ الٰہی کے معنی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ بائیبل میں اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو، اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے حقیقی قوانین کو کلامِ الٰہی کے ساتھ خَلَط مَلَط کر دیا[۷]۔ اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے

---

[۱] توریت میں کلامِ الٰہی کے تھوڑے بہت اجزا کے ساتھ یہودی مبلّغوں، مفسّروں، واعظوں اور فقیہوں نے جو ردّے اپنی طرف سے چڑھائے ہیں، انہی سے یہودیت کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ (مرتّبین) [۲] ۶:۴-۹ [۳] ۲۷:۲-۴۔

[۴] اس وصیت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس دین کو قائم رکھنا ہو اس کی تعلیمات کو پھیلانا ہی اُس کی حفاظت کا ذریعہ ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے نظامِ تعلیم و تربیت میں کتابِ الٰہی کو اولیت اور مرکزیت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ (مرتّبین) [۵] سلاطین ۲۲: ۸-۱۳۔

[۶] قرآن کے الفاظ میں علمائے یہود کا حال یہ تھا کہ: "اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل ط

سامنے اِس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی فلسفہ، ہر مفسّر کی تاویل ہر متکلم کا الٰہیاتی عقیدہ اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد، جس نے مجموعۂ کتبِ مقدسہ (بائیبل) میں جگہ پائی۔ اللہ کا قول (Word of God) بن کر رہ گیا۔ اس پر ایمان لانا فرض ہو گا۔ اور اس سے پھرنے کے معنی دین سے پھرنے کے ہو گئے۔

ہماری تحقیق یہ ہے کہ عہدِ عتیق (Old Testament) کی کتبِ خمسہ (Pentateuch) اصل توراۃ نہیں ہیں بلکہ اصل توراۃ دنیا سے ناپید ہو چکی ہے۔ اس نظریہ کی تائید خود عہدِ عتیق سے ہوتی ہے۔ اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں حضرت یشوع (یعنی یوشع) کی مدد سے توراۃ کو مرتب کر کے ایک صندوق میں رکھوا دیا تھا[1]۔ ان کے انتقال کے بعد چھٹی صدی ق م میں جب بخت نصر نے بیت المقدس کو آگ لگا دی تو وہ مقدس صندوق ان تمام کتابوں سمیت جل گیا جو حضرت موسیٰؑ کے بعد شریعت موسویہ کے مجددین نے مرتب کی تھیں۔ اس تباہی کے دو ڈھائی سو برس بعد حضرت عُزَیر نے خود بائیبل کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے کاہنوں اور لاویوں کے ساتھ مل کر آسمانی الہام سے اِس کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا[2]۔ مگر حوادثِ زمانہ نے اِس نئے نسخے کو بھی اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہنے دیا۔ سکندرِ اعظم کی عالمگیر فتوحات کا سیلاب جب یونانی حکومت کے ساتھ علوم و آداب کو لے کر شرقِ اوسط پر پھیل گیا تو ۲۸۰ ق م میں توراۃ کی تمام کتابیں یونانی زبان میں منتقل کر دی گئیں، اور رفتہ رفتہ اصل عبرانی نسخہ متروک ہو کر یونانی ترجمہ رائج ہو گیا۔ پس آج جو توراۃ ہمارے سامنے ہے اس کی سند کسی طرح حضرت موسیٰؑ تک نہیں پہنچتی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودہ تورات میں اصل توراۃ کا کوئی جزو بھی شامل نہیں ہے، یا یہ سراسر جعلی ہے۔ دراصل جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس تورات میں اصل

م۔ طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں" (توبہ۔ ۳۴) یعنی ظالم صرف یہی ستم نہیں کرتے کہ فتوے بیچتے ہیں، رشوتیں کھاتے ہیں، نذرانے لوٹتے ہیں، ایسے ایسے مذہبی ضابطے اور مراسم ایجاد کرتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ اپنی نجات ان سے خریدیں۔ اور ان کا مرنا جینا اور شادی و غم کچھ بھی ان کو کھلاتے بغیر نہ ہو سکے۔ اور وہ اپنی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے ٹھیکیدار ان کو سمجھ لیں۔ بلکہ مزید برآں اپنی انہی اغراض کی خاطر یہ حضرات خلقِ خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے ہیں اور جب کبھی کوئی دعوتِ حق اصلاح کے لیے اُٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنی عالمانہ فریب کاریوں اور مکاریوں کے حربے لے کر اس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

[1] استثناء: ۳۱: ۲۴-۲۷۔

[2] ایزدراس، جزدوم۔ باب چہاردہم۔

تورات کے ساتھ بہت سی دوسری چیزیں مل جل گئی ہیں، اور بعید نہیں کہ اُس کی بعض چیزیں اس میں غائب بھی ہو گئی ہوں۔ آج جو شخص بھی محققانہ نظر سے اس کتاب کو پڑھے گا وہ صریح طور پر یہ محسوس کرے گا کہ اس میں خدا کے کلام کے ساتھ یہودی علماء کی تفسیریں، بنی اسرائیل کی قومی تاریخ، اسرائیلی فقہاء کے قانونی اجتہادات اور دوسری بہت سی چیزیں خلط ملط ہو گئی ہیں جنہیں الگ کر کے کلامِ الٰہی کو چھانٹ نکالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے توراۃ کا دین وہی تھا جو خود قرآن کا دین ہے، اور موسیٰ علیہ السّلام اسی طرح اسلام کے پیغمبر تھے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ بنی اسرائیل ابتدا میں اِسی دین کے پیرو تھے، مگر بعد میں انہوں نے اصل دین میں اپنی خواہشات کے مطابق بہت کچھ کمی بیشی کر کے ایک نیا مذہبی نظام "یہودیت" کے نام سے بنا لیا۔[1] ۴۴۵

دراصل تورات سے مُراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران میں ان پر نازل ہوئے۔ ان میں سے دس احکام تو وہ تھے جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کندہ کر کے انہیں دیے تھے۔ باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰؑ نے لکھوا کر اُس کی بارہ نقلیں بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں کو دے دی تھیں، اور ایک نقل بنی لاوی کے حوالے کی تھی تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام تورات تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیتُ المَقدِس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک کاپی جو بنی لاوی کے حوالے کی گئی تھی، پتھر کی لوحوں سمیت، عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی، اور بنی اسرائیل اس کو توریت ہی کے نام سے جانتے تھے۔ اُس سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکل سلیمانی کی مُرمّت ہُوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سجادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) کو ایک جگہ توریت رکھی ہوئی مل گئی، اور اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی منشی کو دیا اور شاہی منشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہے۔[2] یہی وجہ ہے کہ جب بخت نصر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو بنی اسرائیل نے تورات کے وہ اصل نسخے جو ان کے ہاں طاق نسیاں پر رکھے ہوئے تھے، اور بہت ہی تھوڑی تعداد میں تھے، ہمیشہ کے لیے گم کر دیئے۔ پھر جب عزرا کاہن (حضرت عُزَیرؑ) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کھچے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المقدس تعمیر ہوا تو عزرا نے اپنی قوم کے چند دوسرے بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مرتب کی جو اب بائیبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب یعنی

---

[1] یعنی موجودہ توراۃ حضرت موسیٰؑ کے لائے ہوئے اسلام کی نہیں، بلکہ اس دینِ اسلام کی مسخ شدہ صورت "یہودیت" کی آئینہ دار ہے۔ (مُرتّبین)

[2] سلاطین ۲۔ باب ۲۲ : ۸۔۱۳۔

خروج، احبار، گنتی، استثناء، حضرت موسٰی علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں اور اس سیرت ہی میں تاریخ نزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسبِ موقع درج کر دی گئی ہیں جو عزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہو سکیں۔ پس اب تورات اِن منتشر اجزا ہی کا نام ہے جو سیرتِ موسٰیؑ کے اندر بکھرے ہوتے ہیں ہم انہیں صرف اِس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اس تاریخی بیان کے دوران جہاں کہیں سیرتِ موسٰیؑ کا مصنّف کہتا ہے "خدا نے موسٰی سے یہ فرمایا" یا "موسٰیؑ نے کہا خداوند تمہارا خدا یہ کہتا ہے" وہاں سے تورات کا ایک جز شروع ہوتا ہے اور جہاں پھر سیرت کی تقریر شروع ہوتی ہے وہاں وہ جز ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز بائیبل کے مصنّف نے تفسیر و تشریح کے طور پر بڑھا دی ہے وہاں ایک عام آدمی کے لیے یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصّہ ہے یا شرح و تفسیر[1]۔

---

[1] یہی تحریف شدہ تورات یہودیت کا ماخذ تھی۔ مگر غضبناک امر یہ ہے کہ جس شکل میں یہودی تورات کو مانتے تھے اس شکل میں بھی وہ نہ تو اس کی اقامت کے لیے کوشاں تھے اور نہ دیانت داری سے اس کے مندرجہ احکام ہی کی تبلیغ و تعمیل کرتے تھے۔ اسی لیے قرآن نے اعتراض کیا تھا کہ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ ۔ (مرتبین)

فصل ۴

بعثتِ خاتم النبیینؐ کے وقت یہود کے مذہبی و معاشرتی حالات

عرب کے یہودیوں کی مستند تاریخ موجود نہیں

عرب کے یہودیوں کی کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ انہوں نے خود اپنی کوئی ایسی تحریر کسی کتاب یا کتبے کی شکل میں نہیں چھوڑی ہے جس سے اُن کے ماضی پر کوئی روشنی پڑ سکے۔ اور عرب سے باہر کے یہودی مؤرخین و مصنّفین نے اُن کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جزیرۃ العرب میں آ کر وہ اپنے بقیہ ابنائے ملّت سے بچھڑ گئے تھے۔ اور دُنیا کے یہودی سرے سے ان کو اپنوں میں شمار ہی نہیں کرتے تھے، کیونکہ انہوں نے عبرانی تہذیب، زبان، حتیٰ کہ نام تک چھوڑ کر عربیت اختیار کر لی تھی۔ حجاز کے آثارِ قدیمہ میں جو کتبات ملے ہیں اُن میں پہلی صدی عیسوی سے قبل یہودیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا، اور ان میں بھی صرف چند یہودی نام پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہودِ عرب کی تاریخ کا بیشتر انحصار اُن زبانی روایات پر ہے جو اہلِ عرب میں مشہور تھیں، اور ان میں اچھا خاصا حصّہ خود یہودیوں کا اپنا پھیلایا ہوا تھا۔

حجاز کے یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ سب سے پہلے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری عہد میں یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ اس کا قصّہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک لشکر یثرب کے علاقے سے عمالقہ کو نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ اِس قوم کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑیں۔ بنی اسرائیل کے اس لشکر نے یہاں آ کر فرمانِ نبی کی تعمیل کی مگر عمالقہ کے بادشاہ کا ایک لڑکا بڑا خوبصورت جوان تھا، اسے انہوں نے زندہ رہنے دیا اور اس کو ساتھ لیے ہوئے فلسطین واپس پہنچے۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے جانشینوں نے اس بات پر سخت اعتراض کیا کہ ایک عمالیقی کو زندہ چھوڑ دینا نبی کے فرمان اور شریعتِ موسوی کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اِس بنا پر انہوں نے اس لشکر کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا اور اسے مجبوراً واپس یثرب آ کر یہیں بس جانا پڑا (کتاب الاغانی، ج ۱۹، ص ۹۴)۔ اس طرح یہودی گویا اس بات کے مدّعی تھے کہ وہ ۱۲ سو برس قبل مسیح سے یہاں آباد ہیں۔ لیکن درحقیقت اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ اور اغلب یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ افسانہ اس لیے

گھڑا تھا کہ اہلِ عرب پر اپنے قدیم الاصل اور عالی النسب ہونے کی دھونس جمائیں۔

دوسری یہودی مہاجرت، خود یہودیوں کی اپنی روایت کے مطابق ۵۸۷ء قبل مسیح میں ہوئی جبکہ بابل کے بادشاہ بخت نصّر نے بیت المَقدِس کو تباہ کر کے یہودیوں کو دنیا بھر میں تِتّر بِتّر کر دیا تھا۔ عرب کے یہودی کہتے تھے کہ اس زمانے میں ہمارے متعدد قبائل آ کر وادی القریٰ، تیماء، اور یثرب میں آباد ہو گئے تھے (فتوح البلدان، البلاذری)۔ لیکن اس کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ اس سے بھی وہ اپنی قدامت ثابت کرنا چاہتے ہوں۔

درحقیقت جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتلِ عام کیا، پھر ۱۳۲ء میں انہیں اس سرزمین سے نکال باہر کیا۔ اُس دَور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزین ہوئے تھے، کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آ کر انہوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سُود خواری کی وجہ سے اُن پر قبضہ جما لیا۔ اَیلہ، مَقنا، تبوک، تیماء، وادی القریٰ، فَدَک، اور خیبر پر ان کا تسلّط اُسی دَور میں قائم ہوا، اور بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی بَہدل، اور بنی قَینُقاع بھی اُسی دَور میں آ کر یثرب پر قابض ہوئے۔

یثرب میں آباد ہونے والے قبائل میں سے بنی نضیر اور بنی قریظہ زیادہ ممتاز تھے، کیونکہ وہ کاہنوں (Cohens یا Priests) کے طبقہ میں سے تھے۔ انہیں یہودیوں میں عالی نسب مانا جاتا تھا اور ان کو اپنی ملت میں مذہبی ریاست حاصل تھی۔ یہ لوگ جب مدینہ میں آ کر آباد ہوئے اس وقت کچھ دوسرے عرب قبائل یہاں رہتے تھے جن کو انہوں نے دبا لیا اور عملاً اس سرسبز و شاداب مقام کے مالک بن بیٹھے۔ اس کے تقریباً تین صدی بعد ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں یمن کے اُس سیلابِ عظیم کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ سبا کے دوسرے رکوع میں آیا ہے۔ اِس سیلاب کی وجہ سے قوم سبا کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل جانے پر مجبور ہو گئے۔ ان میں سے غسّانی شام میں، لَخمی حِیرہ (عراق) میں، بنی خُزاعہ جدہ و مکّہ کے درمیان اور اَوس و خَزرج یثرب میں جا کر آباد ہوئے۔ یثرب پر چونکہ یہودی چھائے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اوّل اوّل اوس و خزرج کی دال نہ گلنے دی اور یہ دونوں عرب قبیلے چار و ناچار بنجر زمینوں پر بس گئے جہاں ان کو قوتِ لایموت بھی مُشکل سے حاصل ہوتا تھا، آخر کار ان کے سرداروں میں سے ایک شخص اپنے غسّانی بھائیوں سے مدد مانگنے کے لیے شام گیا اور وہاں سے ایک لشکر لا کر اس نے یہودیوں کا زور توڑ دیا۔ اس طرح اَوس و خَزرَج کو یثرب پر پُورا غلبہ حاصل ہو گیا۔ یہودیوں کے دو بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قُریظہ شہر کے باہر جا کر بسنے پر مجبُور ہو گئے۔ تیسرے قبیلے بنی قَینُقاع کی چونکہ ان دونوں یہودی قبیلوں سے اَن بَن تھی، اِس لیے وہ شہر کے اندر ہی مقیم رہا۔ مگر یہاں رہنے کے لیے اسے قبیلۂ خزرج کی پناہ لینی پڑی۔ اور اس کے مقابلہ میں بنی نضیر و بنی قریظہ نے اَوس کی پناہ لی، تاکہ اطرافِ یثرب میں امن کے ساتھ

مدینہ طیبہ کی یہودی بستیاں

شمال
مغرب
مشرق
جنوب
جبلِ اُحُد
وادی القناۃ
مجمع الأسیال
بئر رومہ
باغات
جبلِ سلع
شہر یثرب
مسجد نبوی
البقیع
دیارِ بنی قینقاع
شہر یثرب
دیارِ بنی حارثہ
دیارِ بنی عبدالاشہل
دیارِ بنی ظفر
حرہ واقم
وادی العقیق
حرۃ الوبرہ
باغات
وادی بطحان
وادی مہزور
دیارِ بنی قریظہ
العوالی
باغات
وادی مذینب
وادی رانونا
قبا
دیارِ بنی نضیر
حصن کعب بن اشرف
ذوالحلیفہ
جبلِ عیر
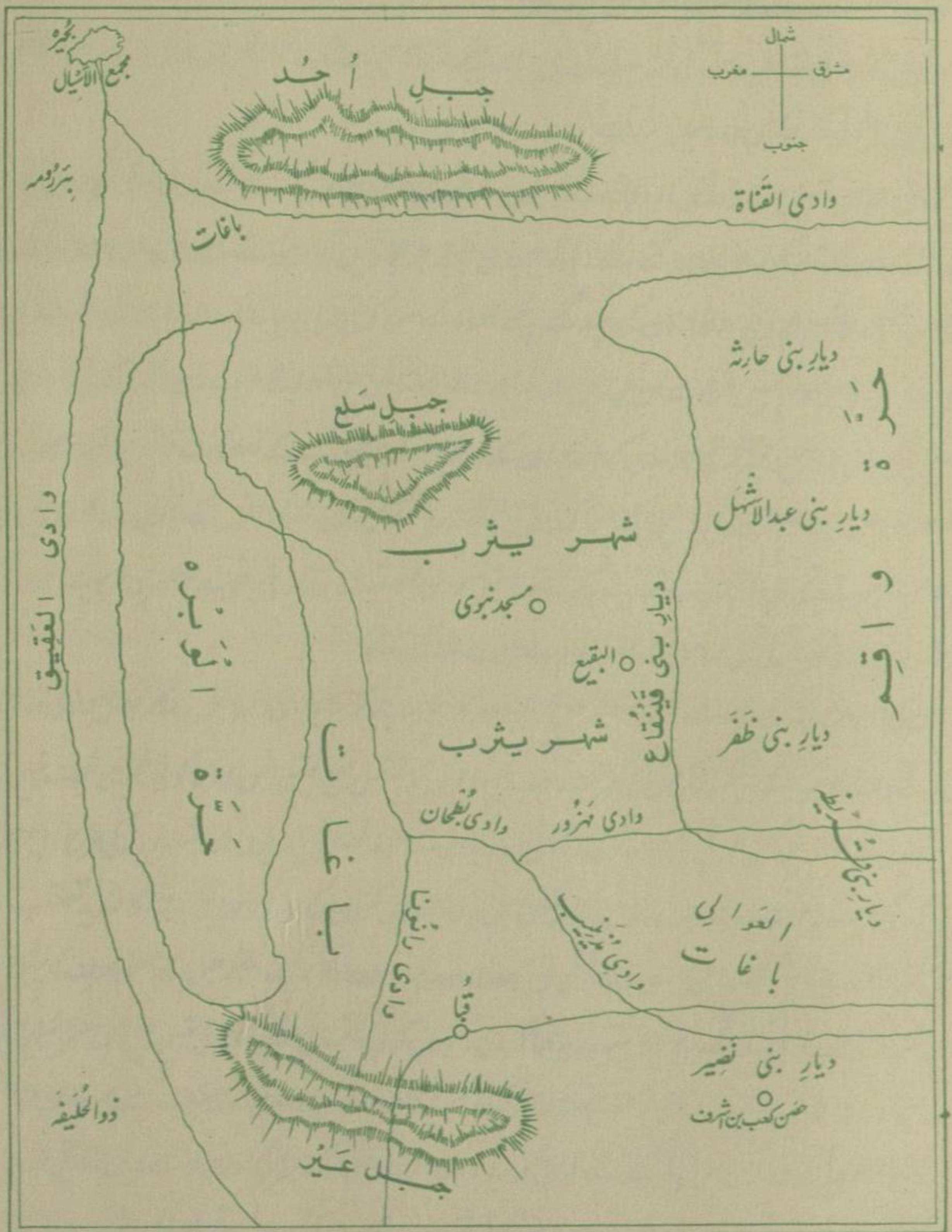
رہ سکیں۔

آنحضورؐ کی بعثت کے وقت یہود کی پوزیشن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے آغازِ ہجرت تک حجاز میں عموماً اور یثرب میں خصوصاً یہودیوں کی پوزیشن کے نمایاں خدوخال یہ تھے:

زبان، لباس، تہذیب و تمدن، ہر لحاظ سے انہوں نے پوری عربیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا حتّٰی کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہو گئے تھے۔ بارہ یہودی قبیلے جو حجاز میں آباد ہوئے تھے، اُن میں سے بنی زَعُوراء کے سوا کسی قبیلے کا نام عبرانی نہ تھا۔ ان کے چند گنے چُنے علماء کے سوا کوئی عبرانی جانتا تک نہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے یہودی شاعروں کا جو کلام ہمیں ملتا ہے ان کی زبان، اور خیالات اور مضامین میں شعرائے عرب سے الگ کوئی امتیازی شان نہیں پائی جاتی جو انہیں ممیّز کرتی ہو۔ ان کے اور عربوں کے درمیان شادی بیاہ تک کے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ درحقیقت ان میں اور عام عربوں میں دین کے سوا کوئی فرق باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود وہ عربوں میں جذب بالکل نہ ہوتے تھے اور انہوں نے شدت کے ساتھ اپنی یہودی عصبیت برقرار رکھی تھی۔ یہ ظاہری عربیت انہوں نے صرف اس لیے اختیار کی تھی کہ اس کے بغیر وہ عرب میں رہ نہ سکتے تھے۔

ان کی اس عربیت کی وجہ سے مغربی مستشرقین کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ شاید یہ بنی اسرائیل نہ تھے بلکہ یہودی مذہب قبول کرنے والے عرب تھے یا کم از کم ان کی اکثریت عرب یہودیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہودیوں نے حجاز میں کبھی کوئی تبلیغی سرگرمی دکھائی ہو۔ یا ان کے علماء نصرانی پادریوں اور مشنریوں کی طرح اہلِ عرب کو دینِ یہود کی طرف دعوت دیتے ہوں۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر اسرائیلیت کا شدید تعصب اور نسلی فخر و غرور پایا جاتا تھا، اہلِ عرب کو وہ اُمّی (Priests Gentiles) کہتے تھے جس کے معنی صرف اَن پڑھ کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان اُمیوں کو وہ انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں جو اسرائیلیوں کے لیے ہیں اور ان کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے مار کھانا اسرائیلیوں کے لیے حلال اور طیّب ہے۔ سردارانِ عرب کے ماسوا، عام عربوں کو وہ اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ ان کو دینِ یہود میں داخل کر کے برابر کا درجہ دے دیں۔ تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، نہ روایاتِ عرب میں ایسی کوئی شہادت ملتی ہے کہ کسی عرب قبیلے یا کسی بڑے خاندان نے یہودیت قبول کی ہو۔ البتّہ بعض افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے جو یہودی ہو گئے تھے۔ ویسے بھی یہودیوں کو تبلیغِ دین کے بجائے صرف اپنے کاروبار سے دلچسپی تھی۔ اسی لیے حجاز میں یہودیت ایک دین کی حیثیت سے نہیں پھیلی بلکہ محض چند اسرائیلی قبیلوں کا سرمایۂ فخر و ناز ہی بنی رہی۔ البتہ یہودی علماء نے تعویذ گنڈوں اور فال گیری اور جادوگری کا کاروبار خوب چمکا رکھا تھا جس کی وجہ سے عربوں پر اُن کے "علم" اور "عمل" کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

ان کی معاشی پوزیشن

معاشی حیثیت سے ان کی پوزیشن عربِ قبائل کی بہ نسبت زیادہ مضبوط تھی۔ چونکہ وہ فلسطین و شام کے زیادہ متمدن علاقوں سے آئے تھے اس لیے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہلِ عرب میں رائج نہ تھے۔ اور باہر کی دنیا سے ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔ اِن وجوہ سے یثرب اور بالائی حجاز میں غلّے کی درآمد اور یہاں سے چھوہاروں کی برآمد اُن کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ مُرغ بانی اور ماہی گیری پر بھی زیادہ تر ان ہی کا قبضہ تھا۔ پارچہ بافی کا کام بھی انہی کے ہاں ہوتا تھا۔ جگہ جگہ مے خانے بھی انہوں نے قائم کر رکھے تھے جہاں شام سے شراب لاکر فروخت کی جاتی تھی۔ بنی قَینُقاع زیادہ تر سُنار اور لوہار اور ظروف سازی کا پیشہ کرتے تھے۔ اس سارے بَنج بیوپار میں یہ یہودی بے تحاشا منافع خوری کرتے تھے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کاروبار سُود خواری کا تھا جس کے جال میں انہوں نے گرد و پیش کی عرب آبادیوں کو پھانس رکھا تھا، اور خاص طور پر عرب قبائل کے شیوخ اور سردار، جنہیں قرض لے لے کر ٹھاٹھ جمانے اور شیخی بگھارنے کی بیماری لگی ہُوئی تھی، ان کے پھندے میں پھنسے ہُوئے تھے۔ یہ بھاری شرح سُود پر قرض دیتے اور پھر سُود در سُود کا چکر چلاتے تھے جس کی گرفت میں آجانے کے بعد مشکل ہی سے کوئی نکل سکتا تھا۔ اس طرح انہوں نے عربوں کو معاشی حیثیت سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ مگر اس کا فطری نتیجہ یہ بھی تھا کہ عربوں میں بالعموم ان کے خلاف ایک گہری نفرت پائی جاتی تھی۔

اُن کے تجارتی اور مالی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ عربوں میں سے کسی کے دوست بن کر کسی سے نہ بگاڑیں اور نہ ان کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لیں لیکن دوسری طرف اُن کے مفاد ہی کا تقاضا یہ بھی تھا کہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیں اور اُنہیں ایک دوسرے سے لڑاتے رہیں۔ کیوں کہ وہ اِس بات کو جانتے تھے کہ جب بھی عرب قبیلے باہم متحد ہُوتے، وہ اُنہیں اُن بڑی بڑی جائیدادوں، باغات اور سرسبز زمینوں پر قابض نہ رہنے دیں گے جو انہوں نے اپنی منافع خوری اور سُود خوری سے پیدا کی تھیں۔ مزید براں اپنی حفاظت کے لیے ان کے ہر قبیلے کو کسی نہ کسی طاقتور عرب قبیلے سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کرنے پڑتے تھے تاکہ کوئی دوسرا زبردست قبیلہ ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اِس بنا پر انہیں نہ صرف عرب قبائل کی باہمی لڑائیوں میں حصّہ لینا پڑتا تھا، بلکہ بسا اوقات ایک یہُودی قبیلہ اپنے حلیف عرب قبیلہ کے ساتھ مل کر کسی دوسرے یہودی قبیلے کے خلاف جنگ آزما ہوجاتا تھا جس کے حلیفانہ تعلقات فریقِ مخالف کے ساتھ ہوتے تھے۔ یثرب میں بنی قُریظہ اور بنی نضیر اَوس کے حلیف تھے۔ اور بنی قَینُقاع خزرج کے۔ ہجرت سے تھوڑی مدت پہلے اَوس اور خزرج کے درمیان جو خونریز لڑائی بُعاث کے مقام پر ہُوئی تھی اس میں یہ اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہُوئے تھے۔ ۴۴۸

مذہبیت کا نمائشی ڈھانچہ

یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اُس ضابطۂ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی

طرف سے اُن کے نبی مُوسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور اصولاً ان کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم دے رہے تھے لیکن صدیوں کے انحطاط نے اُن کو اصل دین سے بہت دُور ہٹا دیا تھا[1]۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہو گئی تھی جن کے لیے توراۃ میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رسُوم اور طریقے رواج پا گئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے توراۃ میں کوئی ثبوت نہ تھا۔ خود توراۃ کو انہوں نے انسانی کلام کے اندر خَلَط مَلَط کر دیا تھا اور خدا کا کلام جس حد تک لفظاً یا معنًی محفوظ تھا اس کو بھی انہوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی رُوح ان میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیّت کا محض ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا جس کو وہ سینہ سے لگاتے ہوئے تھے۔ اُن کے علماء اور مشائخ، اُن کے سرداران قوم اور اُن کے عوام، سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی اور اپنے بگاڑ سے ان کو ایسی محبت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ اُنہیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وُہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، مُوشگافیوں اور فرقہ بندیوں، استخواں گیری و مغزافگنی، خدافراموشی و دُنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصلی نام "مُسلم" تک بھُول گئے تھے، محض "یہُودی" بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انہوں نے محض نسلِ اسرائیل کی آبائی وراثت بنا کر رکھ دیا تھا۔[۲۴۹]

مذہبی اور نسلی عصبیّت

(یہودیوں کا خیال تھا کہ) امانت اور دیانت کا لحاظ صرف یہُودیوں سے معاملہ کرنے میں ہونا چاہیے غیر یہُودیوں کا مال اگر مار لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ محض یہودی عوام کا جاہلانہ خیال ہی نہیں تھا۔ دراصل یہودیّت کا پُورا مذہبی نظام ایسا بنا دیا گیا تھا کہ وہ اخلاقی احکام میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان قدم قدم پر تفریق کرتا ہے۔ ایک ہی چیز اسرائیلی کے ساتھ کی جائے تو ناجائز ہے مگر اسی کا ارتکاب غیر اسرائیلی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہی چیز اسرائیلی کے لیے حق ہے مگر غیر اسرائیلی کے لیے حق نہیں ہے۔ مثلاً بائیبل میں حکم ہے کہ جو قرض ایک شخص نے دوسرے کو دیا ہو وہ سات سال گزر جانے پر ضرور معاف کر دیا جائے مگر "پردیسی سے تو اُس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔" (استثناء ۱۵: ۳)۔ ایک اور جگہ سُود لینے سے منع کیا گیا ہے، مگر تو پردیسی کو سُود پر قرض دے تو

---

[1] اس وقت حضرت مُوسیٰؑ کو گزرے ہوئے تقریباً ۱۹ اُنیس صدیاں گزر چکی تھیں۔ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت مُوسیٰؑ نے ۱۲۷۲ سنہ قبل مسیح میں وفات پائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶۱۰ سنہ بعد مسیح میں منصبِ نبوّت پر سرفراز ہُوئے۔ (مؤلف)

دے باپ بھائی کو سُود پر قرض نہ دینا" (استثناء ۲۳: ۲۰) ایک اور جگہ لکھا ہے "اگر کوئی شخص اپنے اسرائیلی بھائیوں میں سے کسی کو غلام بنانے یا بیچنے کی نیت سے چُراتا ہُوا پکڑا جائے تو وہ چور مار ڈالا جائے (استثناء ۲۴: ۷)۔
تلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کرے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ گری پڑی چیز مل جائے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد و پیش کی آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے، غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔ ربی اشماعیل کہتا ہے کہ اگر امّی اور اسرائیلی کا مقدمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جِتوا سکتا ہو تو اس کے مطابق جتوائے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے۔ اور اگر امیوں کے قانون کے مطابق جِتوا سکتا ہو تو اس کے تحت جِتوائے اور کہے کہ یہ تمہارا قانون ہے۔ اور اگر دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو کرے۔ ربی شموایل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔[۵۰]

اصولوں سے انحراف، جزئیات میں انہماک

علماء یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے بلکہ اُن کا سارا وقت اُن جزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جو اُن کے فقیہوں نے استنباط در استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے، اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں اُنہیں کوئی مضائقہ نظر آتا تھا۔[۵۱]

اکابر کے لیے شریعت میں تحریف

یہود اپنے مذہبی احکام سے جس طرح رُوگردانی کیے ہُوئے تھے اس کی ایک مثال وہ مقدّمہ ہے جو خیبر کے یہُودی فیصلہ کرانے کی غرض سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس لائے تھے۔ مقدمہ یہ تھا کہ۔۔ خیبر کے معزّز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق پایا گیا۔ توراۃ کی رُو سے ان کی سزا رجم تھی، یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے (استثناء، باب ۲۲ آیت ۲۳-۲۴)۔ لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدّمہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پنچ بنایا جائے۔ اگر وہ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کر لیا جائے اور رجم ہی کا حکم دیں تو نہ قبول کیا جائے۔ چنانچہ مقدّمہ آپؐ کے سامنے لایا گیا۔ آپؐ نے رجم کا حکم دیا۔ انہوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا۔ اس پر آپؐ نے پوچھا تمہارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا۔ آپؐ نے اُن کے علماء کو قسم دے کر اُن سے پوچھا کیا توراۃ میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انہوں نے پھر وہی جھوٹا جواب دیا۔ لیکن

ان میں سے ایک شخص ابن صوریا جو خود یہودیوں کے بیان کے مطابق اپنے وقت میں توراۃ کا سب سے بڑا عالم تھا، خاموش رہا۔ آپؐ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں تجھے اُس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور طور پر تمہیں شریعت عطا کی، کیا واقعی توراۃ میں زنا کی سزا یہی لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "اگر آپؐ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زنا کی سزا تو رجم ہی ہے مگر ہمارے ہاں جب زنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انہیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو اُنہیں رجم کر دیا جاتا۔ پھر جب اس سے عوام میں ناراضی پیدا ہونے لگی تو ہم نے توراۃ کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنا لیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور انہیں مُنہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹے مُنہ سوار کیا جائے۔"[۴۵۲]

حلّت و حُرمت کے شرعی احکام میں ردّ و بدل

اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور آپ اپنے شارع بن بیٹھے تو انہوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی موشگافیوں سے خود حرام کر لیا۔ ان اشیاء میں ایک تو ناخن والے جانور ہیں یعنی شتر مُرغ، قاز، بط وغیرہ۔ دوسرے گائے اور بکری کی چربی۔ بائیبل میں ان دونوں قسم کی حُرمتوں کو احکامِ توراۃ میں داخل کر دیا گیا ہے (حالانکہ) یہ چیزیں توراۃ میں حرام نہ تھیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بعد حرام ہوئی ہیں اور تاریخ بھی شہادت دیتی ہے کہ موجودہ یہودی شریعت کی تدوین دوسری صدی عیسوی کے آخر میں ربی یہوداہ کے ہاتھوں مکمل ہوئی ہے۔[۴۵۳]

آنحضورؐ کے متعلق یہود کا نامعقول رویّہ

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا (پ ۱ البقرہ آیت ۸۹)

"اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے، اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ کفّار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی آمد سے پہلے یہودی بے چینی کے ساتھ اُس نبی کے منتظر تھے جس کی بعثت کی پیشنگوئیاں[ل]

[ل] یہ پیشنگوئیاں اِس وجہ سے عیسائیوں کی فصل میں بیان کی گئی ہیں کہ مؤلف کی بحثوں میں تورات اور انجیل کی پیشین گوئیاں باہم دگر مربوط ہیں۔ (مرتبین)

ان کے انبیاء نے کی تھیں۔ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہلِ مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدی سے پہلے یہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پر جیا کرتے تھے اور اُن کا آتے دن کا تکیہ کلام یہی تھا کہ "اچھا، اب تو جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کر لے، جب وہ نبی آئے گا تو ہم ان سب ظالموں کو دیکھ لیں گے۔" اہلِ مدینہ یہ باتیں سنے ہوئے تھے، اسی لیے جب انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں چلو، پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں۔ مگر اُن کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف بن گئے۔

اور یہ جو فرمایا کہ "وہ اس کو پہچان بھی گئے"، تو اس کے متعدد ثبوت اسی زمانے میں مل گئے تھے۔ سب سے زیادہ معتبر شہادت امّ المومنین حضرت صفیہ کی ہے جو خود ایک بڑے یہودی عالم کی بیٹی اور دوسرے عالم کی بھتیجی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو میرے باپ اور چچا دونوں آپ سے ملنے گئے۔ بڑی دیر تک آپ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے تو میں نے اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سُنا:

چچا: کیا واقعی یہ وہی نبی ہے جس کی خبریں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟

والد: خدا کی قسم ہاں۔

چچا: کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

والد: ہاں

چچا: پھر کیا ارادہ ہے؟

والد: جب تک جان میں جان ہے اس کی مخالفت کرونگا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔

(ابن ہشام۔ جلد دوم، صفحہ ۱۶۵، طبع جدید ۱۹۵۵ء)

یہود کی معاندانہ فتنہ پردازیاں

اہلِ عرب بالعموم ناخواندہ لوگ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودیوں میں ویسے بھی تعلیم کا چرچا زیادہ تھا، اور انفرادی طور پر ان میں ایسے ایسے جلیل القدر علماء پائے جاتے تھے جن کی شہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے یہودیوں کا عربوں پر علمی رُعب بہت زیادہ تھا۔ پھر ان کے علماء اور مشائخ نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان جما کر اور اپنی جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا کاروبار چلا کر اس رعب کو اور بھی زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اہلِ مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے، کیونکہ ان کے آس پاس بڑے

بڑے یہودی قبائل آباد تھے، رات دن کا ان سے میل جول تھا، اور اس میل جول میں وہ اُن سے اُسی طرح شدت کے ساتھ متاثر تھے جس طرح ایک اَن پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدن اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قدرتی بات تھی کہ اَن پڑھ عرب اہلِ کتاب یہودیوں سے جا کر پوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں اور ایک کتاب کو مانتے ہیں، آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو ہمارے اندر نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھے ہیں ان کے متعلق اور اُن کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہودی علماء کے پاس جا جا کر یہی بات پوچھتے تھے مگر ان علماء نے لوگوں کو کبھی صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ توحید جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں غلط ہے، یا انبیاء اور کتبِ آسمانی اور ملائکہ اور آخرت کے بارے میں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس میں کوئی غلطی ہے، یا وہ اخلاقی اصول جن کی آپ تعلیم دے رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز غلط ہے، لیکن وہ صاف صاف اِس حقیقت کا اعتراف بھی کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ وہ نہ سچائی کی کھلی کھلی تردید کر سکتے تھے نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ہر سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، آپ کی جماعت کے خلاف اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے، کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے تھے، کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں اور طرح طرح کے اُلجھن میں ڈال دینے والے سوالات چھیڑ دیتے تھے تاکہ لوگ ان میں خود بھی اُلجھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کو بھی اُلجھانے کی کوشش کریں۔ ان کا یہی رویہ تھا جس کی بنا پر ان سے سورۃ بقرہ آیت ۴۲ میں فرمایا گیا ہے کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو، نہ جھوٹے پروپیگنڈے اور شرارتانہ شبہات و اعتراضات سے حق کو دبانے اور چھپانے کی کوشش نہ کرو، اور حق و باطل کو خلط ملط کر کے دنیا کو دھوکہ نہ دو۔[1]

---

[1] یہودیوں کی شرانگیزیوں کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ انہی کی دسیسہ کاریوں سے اسلامی جماعت میں منافقین پیدا ہوئے، پھر انہوں نے حضورؐ کے خلاف ہر اہم موقع پر کوئی نہ کوئی شرارت اٹھائی، آپ کے قتل کے لیے بار بار کوششیں کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جنگ کے فیصلہ کُن لمحوں میں تباہ کُن تخریبی کارروائیاں کیں۔ یہودیوں کی ان شرانگیزیوں کا تذکرہ واقعات کے سلسلے میں مناسب مواقع پر آئے گا۔ (مرتبین)

باب ۱۷

نصاریٰ اور عیسائیت

فصل ۱

عیسائیت کا ظہور اور نشو و نما

لفظ نصاریٰ کی تشریح

بعض لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ "نصاریٰ" کا لفظ "ناصرہ" سے ماخوذ ہے جو مسیح علیہ السلام کا وطن تھا۔ دراصل اس کا ماخذ "نصرت" ہے اور اس کی بنا وہ قول ہے جو مسیح علیہ السلام کے سوال مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں) کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ (ہم اللہ کے کام میں مددگار ہیں)۔ عیسائی مُصنّفین کو بالعموم محض ظاہری مشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ میں ناصریہ (Nazarenes) کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا اور جنہیں حقارت کے ساتھ ناصری اور ابیونی کہا جاتا تھا، انہی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے لیکن قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ انہوں نے خود کہا تھا کہ ہم "نصاریٰ" ہیں (آل عمران-۵۲) اور یہ ظاہر ہے کہ عیسائیوں نے کبھی اپنا نام ناصری نہیں رکھا[۴۵۶]

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروؤں کا نام کبھی "عیسائی" یا "مسیحی" نہیں رکھا تھا کیونکہ وہ اپنے نام سے کسی نئے مذہب کی بناڈالنے نہیں آئے تھے۔ ان کی دعوت اُسی دین کو تازہ کرنے کی طرف تھی جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء علیہم السلام لے کر آتے تھے۔ اس لیے انہوں نے عام بنی اسرائیل اور پیروانِ شریعتِ موسوی سے الگ نہ کوئی جماعت بنائی اور نہ اس کا کوئی مستقل نام رکھا۔ ان کے ابتدائی پیرو خود بھی نہ اپنے آپ کو اسرائیلی ملت سے الگ سمجھتے تھے، نہ ایک مستقل گروہ بن کر رہے، اور نہ انہوں نے اپنے لیے کوئی امتیازی نام اور نشان قرار دیا۔ وہ عام یہودیوں کے ساتھ بیت المقدس ہی کے ہیکل میں عبادت کرنے کے لیے جاتے تھے اور اپنے آپ کو موسوی شریعت ہی پر عمل کرنے کا پابند سمجھتے تھے (ملاحظہ ہو کتاب اعمال ۳: ۱-۱۰: ۱۴-۱۵: ۱-۵ - ۲۱: ۲۱)۔

عیسائیوں کی عامّۂ بنی اسرائیل سے علیحدگی

آگے چل کر جُدائی کا عمل دو جانب سے شروع ہوا۔ ایک طرف حضرتِ عیسیٰؑ کے پیروؤں میں سے پولوس

(سینٹ پال) نے شریعت کی پابندی ختم کر کے یہ اعلان کر دیا کہ بس مسیح پر ایمان لے آنا نجات کے لیے کافی ہے اور دوسری طرف یہودی علماء نے پیروانِ مسیح کو ایک گمراہ فرقہ قرار دے کر عامۂ بنی اسرائیل سے کاٹ دیا۔ لیکن اس جدائی کے باوجود ابتداءً اِس نئے فرقے کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ خود پیروانِ مسیح اپنے لیے کبھی "شاگرد" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کبھی اپنے رفقاء کا ذکر "بھائیوں" (اخوان)، "ایمان داروں" (مؤمنین)، "جو ایمان لائے" (الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) اور "مقدسوں" کے الفاظ سے کرتے تھے۔ (کتاب اعمال ۲:۴۴-۴:۳۲-۹:۲۶-۱۱:۲۹-۱۳:۵۲-۱۵:۱-۲۳، رومیوں ۱۵:۲۵۔ کلسّیوں ۱:۲)۔ بخلاف اس کے یہودی ان لوگوں کو کبھی "گلیلی" کہتے تھے اور کبھی "ناصریوں کا بدعتی فرقہ" کہہ کر پکارتے تھے (اعمال ۲۴:۵۔ لوقا ۱۳:۲)۔ یہ نام دھرنے کی کوشش انہوں نے ازراہِ طنز و تشنیع اس بنا پر کی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا وطن ناصرہ تھا اور وہ فلسطین کے ضلع گلیل میں واقع تھا۔ لیکن یہ طنزیہ الفاظ اس حد تک رائج نہ ہو سکے کہ پیروانِ مسیح کے لیے نام کی حیثیت اختیار کر جاتے۔

ان کا نام "مسیحی" کیسے پڑا؟

اِس گروہ کا موجودہ نام مسیحی (Christian) پہلی مرتبہ ۴۳ء یا ۴۴ء میں انطاکیہ کے مشرک باشندوں نے رکھا تھا جب کہ سینٹ پال اور برنباس نے وہاں پہنچ کر اپنے مذہب کی تبلیغ عام شروع کی (اعمال ۱۱:۲۶)۔ یہ نام بھی دراصل طنز و تمسخر کے طور پر مخالفین کی طرف سے رکھا گیا تھا، اور پیروانِ مسیح اسے خود اپنے نام کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن جب ان کے دشمنوں نے ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا تو ان کے لیڈروں نے کہا کہ اگر تمہیں مسیح کی طرف نسبت دے کر "مسیحی" کہا جاتا ہے تو تمہیں اس پر شرمانے کی کیا ضرورت ہے (۱۔ پطرس ۴:۱۶)۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ لوگ خود بھی اپنے آپ کو اسی نام سے موسوم کرنے لگے جس سے ان کے دشمنوں نے طنزاً انہیں موسوم کیا تھا، یہاں تک کہ آخرِ کار ان کے اندر سے یہ احساس ہی ختم ہو گیا کہ یہ دراصل بُرا لقب تھا جو انہیں دیا گیا تھا۔

قرآن مجید نے اسی لیے مسیح کے ماننے والوں کو مسیحی یا عیسائی کے نام سے یاد نہیں کیا ہے۔ بلکہ انہیں یاد دلایا ہے کہ تم دراصل ان لوگوں کے نام لیوا ہو جنہیں عیسیٰ ابن مریمؑ نے پکارا تھا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللہِ، کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری مدد کرے گا اور انہوں نے جواب دیا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللہِ، ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں؛ اِس لیے تم اپنی ابتدائی اور بنیادی حقیقت کے اعتبار سے نصاریٰ یا انصار ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنری اِس یاد دہانی پر قرآن کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اُلٹی شکایت کر رہے ہیں کہ قرآن نے ان کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے کیوں موسوم کیا ہے۔[۴۵]

عیسائیت کا زمانۂ ظہور

یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ "یہودیت" اپنے اس نام اور مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوتی۔ اور عیسائیت جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیحؑ کے بھی ایک مدّت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسرِ ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے تو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاءؑ اور نیک لوگ جو ان مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے وہ "یہودیت" اور "عیسائیت" نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار اُن مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں بلکہ دراصل اس کا مدار اُس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے۔ جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدا کی صفات و خصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھیرایا جائے۔ لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اُس راہِ راست سے منحرف ہو گئی ہیں جس پر حضرت ابراہیمؑ چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہو گئی ہے۔[۴۵۸]

عیسائیوں کا حضرت عیسیٰؑ کو خدا قرار دینا

عیسائیوں نے ابتداءً مسیحؑ کی شخصیت کو انسانیت اور اُلوہیت کا مرکب قرار دے کر ایک ایسی غلطی کی تھی جس کے نتیجے میں ان کے لیے مسیحؑ کی حقیقت ایک معمّا بن کر رہ گئی۔ ان کے علماء نے لفاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے اس معمّے کو حل کرنے کی جتنی کوشش کی اتنے ہی زیادہ اُلجھتے چلے گئے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر اس مرکّب شخصیت کے جزوِ انسانی نے غلبہ کیا اس نے مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا۔ اور جس کے ذہن پر جزوِ اُلوہیت کا اثر زیادہ غالب ہوا اس نے مسیحؑ کو اللہ کا جسمانی ظہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت ہی سے اس کی عبادت کی۔ ان کے درمیان بیچ کی راہ جنہوں نے نکالنی چاہی انہوں نے سارا زور ایسی لفظی تعبیریں فراہم کرنے پر صرف کر دیا جن سے مسیحؑ کو انسان بھی کہا جاتا رہے اور اس کے ساتھ خدا بھی سمجھا جا سکے۔ خدا اور مسیح الگ الگ بھی ہوں اور پھر ایک بھی رہیں۔[۴۵۹]

حضرت عیسیٰ کے کلمۃ اللہ ہونے کا مفہوم

اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ ج (النساء۔ آیت ۱۷۱)

"مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا۔"

اصل میں لفظ "کلمہ" استعمال ہوا ہے۔ مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مریم علیہا السلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ وہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کرلے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح علیہ السلام کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا، مگر انہوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو "کلام" یا "نطق" (Logos) کا ہم معنی سمجھ لیا پھر اس کلام و نطق سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفتِ کلام مراد لے لی۔ پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کی اُلوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصوّر نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

عقیدۂ تثلیث

سورۂ نساء کی آیت ۱۷۱ میں حضرت مسیحؑ کو رُوْحٌ مِّنْہُ (خدا کی طرف سے ایک روح) کہا گیا ہے۔ اور سورۂ البقرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (ہم نے پاک روح سے مسیح کی مدد کی)، دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی، سراسر حقانیت اور راست بازی تھی اور از سرتاپا فضیلتِ اخلاق تھی۔ یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی۔ مگر انہوں نے اس میں بھی غلُو کیا۔ روحٌ من اللہ کو عین روح اللہ قرار دے لیا اور روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ کی اپنی روحِ مقدس تھی جو مسیحؑ کے اندر حلول کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور مسیحؑ کے ساتھ ایک تیسرا خدا روح القدس کو بنا ڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غلُو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ آج بھی انجیل متی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ "فرشتے نے اُسے (یعنی یوسف نجار کو) خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابن داؤد، اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر، کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے" (باب ۱، آیت ۲) [۲۶۱]

حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ان کے لیے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اصلِ دین ہے۔

مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتدا میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلام اللہ نے مسیحؑ کی شکل میں ظہور کیا اور روح القدس نے اس میں حلول کیا، اس کی وجہ سے انہوں نے مسیحؑ اور روح القدس کی اُلوہیت کو بھی خداوند عالم کی اُلوہیت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ اپنے اُوپر لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے اِلتزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ایک ناقابلِ حل چیستاں بن گیا کہ عقیدۂ توحید کے باوجود عقیدۂ تثلیث کو، اور عقیدۂ تثلیث کے باوجود عقیدۂ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ۱۸ سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں۔ اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے ہیں۔ اسی پر ان کے سارے علمِ کلام کا زور صرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی نہ اُس کے بھیجے ہوئے مسیحؑ نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف اُن کے غلو نے پیدا کیا ہے۔ اس کا صرف یہی حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں، مسیحؑ اور روح القدس کی اُلوہیت کا تخیل چھوڑ دیں، صرف اللہ کو اِلٰہِ واحد تسلیم کر لیں اور مسیحؑ کو صرف اس کا پیغمبر قرار دیں نہ کہ کسی طور پر شریک فی الاُلوہیت۔ ۴۶۲ھ

شرک اور اولیاء پرستی

پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیاء پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا۔ بزرگوں کے آستانے پوجے جا رہے تھے۔ اور مسیحؑ، مریمؑ اور حواریوں کے مجسمے گرجوں میں رکھے جا رہے تھے۔ اصحابِ کہف کے بعث سے چند ہی سال پہلے ۴۳۱ء میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی اِفسوس کے مقام پر منعقد ہو چکی تھی جس میں مسیح علیہ السلام کی اُلوہیت اور حضرت مریمؑ کے "مادرِ خدا" ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ "اَلَّذِیْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓی اَمْرِھِمْ" سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچے پیروانِ مسیح کے مقابلے میں اُس وقت عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہ کار بنے ہوئے تھے۔ اور مذہبی اور سیاسی اُمور کی باگیں جن کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہی لوگ دراصل شرک کے علمبردار تھے۔ اور انہوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحابِ کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنایا جائے۔ ۴۶۳ھ

موجودہ عیسائیت اور سینٹ پال

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے

ؔ یہ الفاظ سورۂ کہف کی آیت نمبر ۲۱ میں وارد ہوتے ہیں اور فاضل مؤلف نے انہیں شرک اور قبر پرستی کے علمبردار عیسائیوں کا قول قرار دیا ہے۔

تھے، عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسیٰ کو مسیح تسلیم کر کے ان پر ایمان لاتے تھے اور وہ ان کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اِس جماعت میں داخل ہُوا تو اس نے رُومیوں، یونانیوں اور دوسرے غیر یہُودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اِس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی، اور اس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد اور اصول اور احکام اُس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے پیش کیا تھا۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰؑ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی بلکہ اُن کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیرووں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہو کر اس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا اُس وقت بھی اس نے حضرت عیسیٰؑ کے کسی قول کی سند نہیں پیش کی بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا۔ اس نئے دین کی تشکیل میں اُس کے پیشِ نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہُودی (Gentile) دنیا قبول کرلے۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی شریعتِ یہُود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام و حلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے خَتنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا جو غیر یہُودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا۔ حتیٰ کہ اس نے مسیحؑ کی اُلُوہیّت اور اُن کے ابنِ خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر اولادِ آدمؑ کے پیدائشی گناہ کا کفّارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت مناسبت رکھتا تھا۔ مسیحؑ کے ابتدائی پیرووں نے اِن بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے غیر یہُودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اِس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھیر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیحؑ کے اُلُوہیّت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔

پولوسی عقاید چھا گئے

مگر چوتھی صدی کے آغاز (۳۲۵ء) میں نِیقیہ (Nicaea) کی کونسل نے پولوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیّت کا مُسلّم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رُومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈوسیس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں، مردُود قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھیرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس (Athanasius) کے ایک خط کے ذریعے معتبر و مسلّم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا۔ پھر اس کی توثیق ۳۸۲ء پوپ ڈمیسیس (Damasius) کے زیرِ صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس (Gelasius)

نے اِس مجموعہ کو مُسلّم قرار دینے کے ساتھ ساتھ اُن کتابوں کی ایک فہرست مُرتّب کردی جو غیر مسلّم تھیں حالانکہ جن پولوسی عقائد کو بنیاد بنا کر مذہبی کتابوں کے مُعتبر اور غیر معتبر ہونے کا یہ فیصلہ کیا گیا تھا، ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کرسکا ہے کہ اُن میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے دی تھی بلکہ مُعتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰؑ کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔ ۱۶۴ھ

رہبانیّت کا ظہُور اور اس کے اسباب

حضرت عیسیٰؑ کے بعد دو سو سال تک عیسائی کلیسا رہبانیت سے ناآشنا تھا۔ مگر ابتدا ہی سے مسیحیت (تحریف شُدہ) میں اس کے جراثیم پائے جاتے تھے اور وہ تخیلات اس کے اندر موجود تھے جو اِس چیز کو جنم دیتے تھے۔ ترک و تجرید کو اخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھنا ہی رہبانیّت کی بنیاد ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں مسیحیّت میں اِبتدا سے موجود تھیں۔ خصوصیّت کے ساتھ تجرُّد کو تقدُّس کا ہم معنی سمجھنے کی وجہ سے کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے لیے یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھی کہ وہ شادی کریں، بال بچّوں والے ہوں اور خانہ داری کے بکھیڑوں میں پڑیں۔ اِس چیز نے تیسری صدی تک پہنچتے پہنچتے ایک فتنے کی شکل اختیار کرلی، اور رہبانیّت ایک وبا کی طرح مسیحیّت میں پھیلنی شروع ہُوئی۔

تین اسباب

تاریخی طور پر اس کے تین بڑے اسباب تھے:

ایک یہ کہ قدیم مُشرک سوسائٹی میں شہوانیّت، بدکرداری اور دنیا پرستی جس شدّت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی اس کا توڑ کرنے کے لیے عیسائی علماء نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے بجائے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے عفّت پر اتنا زور دیا کہ عورت و مرد کا تعلّق بجائے خود نجس قرار پا گیا خواہ وہ نکاح کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو[1]۔ انھوں نے دنیا پرستی کے خلاف اتنی شدّت برتی کہ آخر کار ایک دیندار آدمی کے لیے سرے سے کسی قسم کی اَملاک رکھنا ہی گناہ بن گیا اور اخلاق کا معیار یہ ہوگیا کہ آدمی بالکل مُفلس اور ہر لحاظ سے تارک الدنیا

---

[1] آج اسی انتہا پسندی کا ردِّ عمل یہ دوسری انتہا پسندی ہے کہ عورت و مرد کے درمیان نکاح کے دائرے کے باہر بھی جنسی تعلق کی کھلی چھوٹ ہے، اور اب اس تعلق میں کسی اہتمام رازداری کی ضرورت بھی نہیں (مُرتّبین)

ہو۔ اسی طرح مُشرک سوسائٹی کی لذّت پرستی کے جواب میں وہ اس انتہا تک جا پہنچے کہ ترکِ لذّات، نفس کو مارنا اور خواہشات کا قلع قمع کر دینا اخلاق کا مقصود بن گیا۔ اور طرح طرح کی ریاضتوں سے جسم کو اذیّتیں دینا روحانیت کا کمال اور اس کا ثبوت سمجھا جانے لگا۔

دوسرے یہ کہ مسیحیت جب کامیابی کے دور میں داخل ہو کر عوام میں پھیلنی شروع ہوئی تو اپنے مذہب کی توسیع و اشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اُس بُرائی کو اپنے دائرے میں داخل کرتا چلا گیا جو عام لوگوں میں مقبول تھی۔ اولیاء پرستی نے قدیم بُتوں کی جگہ لے لی۔ ہورس (Horus) اور آئیسس (Isis) کے مجسّموں کی جگہ مسیح اور مریم کے بُت پُوجے جانے لگے۔ سیٹرنیلیا (Saturnalia) کی جگہ کرسمس کا تہوار منایا جانے لگا۔ قدیم زمانے کے تعویذ گنڈے، عملیات، فال گیری، غیب گوئی اور جن بھوت بھگانے کے عمل سب عیسائی درویشوں نے شروع کر دیے۔

اسی طرح چونکہ عوام اُس شخص کو خدا رسیدہ سمجھتے تھے جو گندا اور ننگا ہو اور کسی بھٹ یا کھوہ میں رہے، اس لیے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصوّر مقبول ہو گیا اور ایسے ہی لوگوں کی کرامتوں کے قصّوں سے عیسائیوں کے ہاں تذکرۃ الاولیاء قسم کی کتابیں تیار ہو گئیں۔

تیسرے یہ کہ عیسائیوں کے پاس دین کی سرحدیں متعیّن کرنے کے لیے کوئی مفصّل شریعت اور کوئی واضح سُنّت موجود نہ تھی۔ شریعتِ موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے، اور تنہا انجیل کے اندر کوئی مکمّل ہدایت نامہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس لیے مسیحی علماء کچھ باہر کے فلسفوں اور طور طریقوں سے متاثر ہو کر اور کچھ خود اپنے رُجحانات کی بنا پر طرح طرح کی بدعتیں دین میں داخل کرتے چلے گئے۔ رہبانیت بھی انہی بدعتوں میں سے ایک تھی۔

رہبانیّت کے مآخذ اور اس کے قائدین

مسیحی مذہب کے علماء اور ائمہ نے اس کا فلسفہ اور اس کا طریق کار بدھ مت کے بھکشوؤں سے، ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں سے اور قدیم مصری فقراء (Anchorites) سے، ایران کے مانویوں اور افلاطون اور فلاطینوس کے پیرو اشراقیوں سے اخذ کیا۔ اور اسی کو تزکیۂ نفس کا طریقہ، روحانی ترقی کا ذریعہ اور تقرّب الی اللہ کا وسیلہ قرار دے لیا تھا۔

اس غلطی کے مرتکب کوئی معمولی درجے کے لوگ نہ تھے۔ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک (یعنی نزولِ قرآن کے زمانے تک)، جو لوگ مشرق اور مغرب میں مسیحیت کے اکابر علماء، بزرگ ترین پیشوا اور امام مانے جاتے ہیں ــــ سینٹ اتھاناسیوس، سینٹ باسل، سینٹ گریگوری، سینٹ نازیانزین، سینٹ کرائی سوسٹم، سینٹ ایمبروز، سینٹ جیروم، سینٹ آگسٹائن، سینٹ بینیڈکٹ، گریگوری اعظم ــــ

سب کے سب خود راہب اور رہبانیت کے زبردست علمبردار تھے۔ انہی کی کوششوں سے کلیسا میں رہبانیت نے رواج پایا۔

پہلا راہب اور پہلی خانقاہ

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز مصر سے ہوا۔ اس کا بانی سینٹ اینتھنی (St. Anthony) تھا جو ۲۵۰ء میں پیدا ہوا اور ۳۵۰ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔ اسے پہلا مسیحی راہب قرار دیا جاتا ہے۔ اُس نے فیوم کے علاقے میں پسپیر کے مقام پر (جو اب دیرالمیمون کے نام سے معروف ہے)، پہلی خانقاہ قائم کی۔ اس کے بعد دوسری خانقاہ اس نے بحرِ احمر کے ساحل پر قائم کی جسے اب دیر مار انطونیوس کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں رہبانیت کے بنیادی قواعد اُسی کی تحریروں اور ہدایات سے ماخوذ ہیں۔

جابجا خانقاہوں کا قیام

اس آغاز کے بعد یہ سلسلہ مصر میں سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور راہبات کے لیے خانقاہیں قائم ہوگئیں جن میں بعض میں تین تین ہزار راہب بہ یک وقت رہتے تھے۔ ۳۲۵ء میں مصر ہی کے اندر ایک مسیحی ولی پاخومیوس نمودار ہوا جس نے دس بڑی خانقاہیں راہبین و راہبات کے لیے بنائیں اس کے بعد یہ سلسلہ شام و فلسطین اور افریقہ و یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیلتا چلا گیا۔ کلیسائی نظام کو اوّل اوّل اس رہبانیت کے معاملے میں سخت الجھن سے سابقہ پیش آیا، کیونکہ وہ ترکِ دنیا اور تجرّد اور غربی و مُفلسی کو روحانی زندگی کا آئیڈیل تو سمجھتا تھا مگر راہبوں کی طرح شادی بیاہ اور اولاد پیدا کرنے اور ملکیت رکھنے کو گناہ بھی نہ ٹھہرا سکتا تھا۔ بالآخر سینٹ اتھاناسیوس (متوفّی ۳۷۳ء) اور سینٹ باسل (متوفّی ۳۷۹ء) سینٹ آگسٹائن (متوفّی ۴۳۰ء) اور گریگوری اعظم (متوفّی ۶۰۴ء) جیسے لوگوں کے اثر سے رہبانیت کے بہت سے قواعد چرچ کے نظام میں باقاعدہ داخل ہوگئے۔

سلسلہ رہبانیت کی خصوصیات

اس راہبانہ بدعت کی چند خصوصیات تھیں جن کو ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:[1]

۱۔ سخت ریاضتوں اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کو اذیتیں دینا اُن کی اوّلین خصوصیت تھی۔

۲۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ہر وقت گندے رہتے تھے اور صفائی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ نہانا یا جسم کو پانی لگانا ان کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا۔ جسم کی صفائی کو وہ روح کی نجاست سمجھتے تھے۔

---

[1] مؤلف کے مختصر بیان سے ہم نے عبرتناک مثالیں اور دلچسپ تفصیلات سے ساقط کر کے مزید تلخیص کر دی ہے (مرتبین)

۳۔ اِس رہبانیّت نے اِزدواجی زندگی کو عملاً بالکل حرام کر دیا اور نکاح کے رشتے کو کاٹ پھینکنے میں سخت بیدردی سے کام لیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی کی تمام تحریریں اس خیال سے بھری ہوئی ہیں کہ تجرّد سب سے بڑی اخلاقی قدر ہے اور عفّت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی جنسی تعلق سے قطعی احتراز کرے، خواہ وہ میاں اور بیوی کا تعلق ہی کیوں نہ ہو۔ پاکیزہ زندگی کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنے نفس کو بالکل مار دے اور اس میں جسمانی لذّت کی کوئی خواہش تک باقی نہ چھوڑے۔ ان لوگوں کے نزدیک خواہش کو مار دینا اس لیے ضروری تھا کہ اُس سے حیوانیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ ان کے نزدیک لذّت اور گناہ ہم معنی تھے، حتیٰ کہ مسرّت بھی ان کی نگاہ میں خدا فراموشی کے مترادف تھی۔ سینٹ باسل ہنسنے اور مسکرانے تک کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اِنہی تصوّرات کی بنا پر عورت اور مرد کے درمیان شادی کا تعلق ان کے ہاں قطعی نجس قرار پا گیا تھا۔ راہب کے لیے ضروری تھا کہ وہ شادی کرنا تو درکنار، عورت کی شکل تک نہ دیکھے، اور اگر شادی شدہ ہو تو بیوی کو چھوڑ کر نکل جائے۔ مردوں کی طرح عورتوں کے دل میں بھی یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ وہ اگر آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ کنواری رہیں، اور شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہر سے الگ ہو جائیں۔ سینٹ جیروم جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ جو عورت مسیح کی خاطر راہبہ بن کر ساری عمر کنواری رہے وہ مسیح کی دُلہن ہے اور اس عورت کی ماں کو خدا یعنی مسیح کی ساس (Mother in law of God) ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک اور مقام پر سینٹ جیروم کہتا ہے کہ "عِفّت کی کلہاڑی سے ازدواجی تعلق کی لکڑی کو کاٹ پھینکنا سالک کا اوّلین کام ہے۔ ان تعلیمات کی وجہ سے مذہبی جذبہ طاری ہونے کے بعد ایک مسیحی مرد یا ایک مسیحی عورت پر اس کا پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کی خوشگوار ازدواجی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی تھی۔

کلیسا کا نظام تین صدیوں تک اپنے حدود میں ان انتہا پسندانہ تصوّرات کی کسی نہ کسی طرح مزاحمت کرتا رہا۔ . . . . رفتہ رفتہ چوتھی صدی میں یہ خیال پُوری طرح زور پکڑ گیا کہ جو شخص کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دیتا ہو اس کے لیے شادی شدہ ہونا بڑی گھناؤنی بات ہے۔ ۳۶۲ء کی گنگرا کونسل (Council of Gengra) آخری مجلس تھی جس میں اس طرح خیالات کو خلافِ مذہب ٹھیرایا گیا۔ مگر اس کے تھوڑی ہی مُدّت بعد ۳۸۶ء کی رومن سینوڈ (Roman Synod) نے تمام پادریوں کو مشورہ دیا کہ وہ ازدواجی تعلقات سے کنارہ کش رہیں، اور دوسرے سال پوپ سائیریکیس (Siricius) نے حکم دے دیا کہ جو پادری شادی کرے، یا شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنی بیوی سے تعلق رکھے اس کو منصب سے معزول کر دیا جائے۔

۴۔ سب سے زیادہ دردناک باب اس رہبانیّت کا یہ ہے کہ اس نے ماں باپ، بھائی بہنوں اور اولاد

تک سے آدمی کا رشتہ کاٹ دیا۔ مسیحی ولیوں کی نگاہ میں بیٹے کے لیے ماں باپ کی محبت، بھائی کے لیے بھائی بہنوں کی محبت اور باپ کے لیے اولاد کی محبت بھی ایک گناہ تھی۔ ان کے نزدیک رُوحانی ترقی کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ آدمی ان سارے تعلقات کو توڑ دے۔ (مثالیں ترک کر دی گئیں)

مسیحی رہبانیت کا نقطۂ نظر ان معاملات میں یہ تھا کہ جو شخص خدا کی محبت چاہتا ہو، اسے انسانی محبت کی وہ ساری زنجیریں کاٹ دینی چاہییں جو دُنیا میں اس کو اپنے والدین، بھائی بہنوں اور بال بچوں کے ساتھ باندھتی ہیں۔

۵۔ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ بے رحمی، سنگدلی اور قساوت برتنے کی جو مشق یہ لوگ کرتے تھے اس کی وجہ سے ان کے انسانی جذبات مرجاتے تھے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے اُنہیں مذہبی اختلاف ہوتا ان کے مقابلے میں یہ ظلم و ستم کی انتہا کر دیتے تھے۔ چوتھی صدی تک پہنچتے پہنچتے مسیحیت میں ۸۰، ۹۰ فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ سینٹ آگسٹائن نے اپنے زمانے میں ۸۸ فرقے گنائے ہیں۔ یہ فرقے ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت رکھتے تھے۔ اِس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راہب تھے اور اس میں مخالف گروہوں کو جلا کر خاک کر دینے کی کوششوں میں بھی راہب ہی پیش پیش ہوتے تھے۔ اسکندریہ اس فرقہ وارانہ کشمکش کا بڑا اکھاڑا تھا۔ (ان فرقہ وارانہ تصادموں کی دردناک مثالیں حذف کر دی گئیں)

۶۔ اس ترک و تجرید اور فقر و درویشی کے ساتھ دولتِ دنیا سمیٹنے میں بھی کمی نہ کی گئی۔ پانچویں صدی کے آغاز میں یہ حالت ہو چکی تھی کہ رُوم کا بشپ بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تھی تو اس کے ٹھاٹھ باٹھ قیصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے۔ . . . . خانقاہوں اور کنیسوں کی طرف دولت کا بہاؤ ساتویں صدی (نزولِ قرآن کے زمانے) تک پہنچتے پہنچتے سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا . . . . . خاص طور پر جو چیز اِس تنزّل کی مُوجب ہُوئی وہ یہ تھی کہ راہبوں کی غیر معمولی ریاضتیں اور ان کی نفس کشی کے کمالات دیکھ کر جب عوام میں اُن کے لیے بے پناہ عقیدت پیدا ہو گئی تو بہت سے دنیا پرست لوگ لباسِ درویشی پہن کر راہبوں کے گروہ میں داخل ہو گئے اور انہوں نے ترکِ دنیا کے بھیس میں جلبِ دُنیا کا کاروبار ایسا چمکایا کہ بڑے بڑے طالبینِ دنیا اُن سے مات کھا گئے۔

۷۔ عفت کے معاملہ میں بھی فطرت سے لڑ کر رہبانیت نے بارہا شکست کھائی۔ . . . . خانقاہوں میں نفس کُشی کی کچھ مشقیں ایسی بھی تھیں جن میں راہب اور راہبات مل کر ایک جگہ ہی رہتے تھے اور بعض اوقات ذرا زیادہ مشق کرنے کے لیے ایک ہی بستر میں رات گزارتے تھے۔ (نفس کُشی کا کمال حاصل کرنے والے عورتوں کے ساتھ مل کر نہاتے اور ان کی دید، ان کے لمس اور ان کی ہم آغوشی سے بھی فطرت ان پر غلبہ نہ پا سکتی۔ . . . . .
انسانی فطرت اُن لوگوں سے انتقام لیے بغیر نہیں رہتی جو اس سے جنگ کریں۔ رہبانیت اس سے لڑ کر بالآخر

بداخلاقی کے جس گڑھے میں جا گری اس کی داستان آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی عیسوی تک کی مذہبی تاریخ کا بدنما ترین داغ ہے۔ . . . . . قرونِ متوسطہ کے مصنّفین کی کتابیں ان شکایتوں سے بھری ہوئی ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں بداخلاقی کے چکلے بن گئی ہیں ان کی چار دیواریوں میں نوزائیدہ بچوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ پادریوں اور چرچ کے مذہبی کارکنوں میں مُحرّمات تک سے ناجائز تعلقات اور خانقاہوں میں خلافِ وضع فطری جرائم تک پھیل گئے ہیں۔[۴۶۵]

فصل ۲

انجیلی صحائف کی تاریخی حیثیت

[یہودیوں کی طرح عیسائیوں کے ہاں بھی الہامی کتابِ ہدایت محفوظ نہیں رہ سکی۔ اسی وجہ سے دین میں تحریف کے راستے سے غلط عقاید و احکام داخل ہوئے۔ اصل انجیل اگر محفوظ ہوتی تو عیسائیت اپنی موجودہ شکل میں ظہور نہ پا سکتی۔ ذیل میں اناجیل کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحقیق پیش کی جا رہی ہے۔ (مرتبین)]

مآخذ کی تحقیق

آج ہم جس مجموعہ کو انجیل کہتے ہیں وہ دراصل چار بڑے صحیفوں پر مشتمل ہے، متّی، مرقس، لوقا، یوحنّا۔ لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ بھی حضرت عیسیٰؑ کا نہیں ہے۔ جس طرح قرآن مجید میں وہ تمام منزّل من اللہ آیات اور سورتیں جمع ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئی تھیں اُس طرح کسی کتاب میں وہ وحیاں ہم کو یکجا نہیں ملتیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں۔ پھر وہ مواعظ و نصائح بھی ہم کو خود حضرت عیسیٰؑ کے اپنے الفاظ میں کہیں نہیں ملتے جو انہوں نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے زمانہ میں مختلف مواقع پر ارشاد فرماتے تھے، یہ صحیفے جو ہم تک پہنچے ہیں نہ خدا کا کلام ہیں نہ حضرت عیسیٰؑ کا، بلکہ وہ دراصل حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں بلکہ حواریوں کے بھی شاگردوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جن میں ان لوگوں نے اپنے اپنے علم و فہم کے مطابق حضرت کے حالات اور ان کی تعلیمات کو جمع کیا ہے۔

متی سے منسوب نسخہ

لیکن یہ کتابیں خود اس قدر مجہول الاصل ہیں کہ ان پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی کتاب مسیحؑ کے حواری متّی کی طرف منسوب ہے اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ متّی کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ متّی کی اصل کتاب جس کا نام لوجیا (Logia) تھا، مفقود ہے۔ جو کتاب متّی کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس کا مصنّف کوئی گمنام شخص ہے جس نے دوسری کتابوں کے ساتھ لوجیا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ خود متّی کا ذکر اس میں اس

طرح کیا گیاہے جیسے کسی غیر آدمی کا کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر مرقس کی انجیل سے ماخوذ ہے کیونکہ اس کی ۱۰۶۸ آیات میں سے ۴۰۰ بعینہٖ وہی ہیں جو مرقس کی انجیل میں آئی ہیں۔ حالانکہ اگر اس کا مُصنّف حواری ہوتا تو اس کو ایک ایسے شخص کی کتاب سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہ تھی جو نہ حواری تھا اور نہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی ملا تھا۔ مسیحی علماء کا خیال ہے کہ یہ کتاب ۵۰ء میں یعنی مسیحؑ سے ۲۱ برس بعد لکھی گئی ہے اور بعض کا خیال ہے کہ ۹۰ء کی تصنیف ہے۔

مرقس سے منسوب نسخہ

دوسری کتاب مرقس کی طرف منسوب ہے اور عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرقس خود ہی اس کا مصنّف ہے۔ لیکن یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی نہیں ملا اور نہ اُن کا مُرید ہوا۔[۱] وہ دراصل پطرس حواری (St. Peters) کا مُرید تھا اور جو کچھ اُن سے سُنتا تھا اسے یُونانی زبان میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے عیسائی مُصنّفین اس کو عموماً "پطرس کا ترجمان" کہا کرتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب ۶۳ء اور ۷۰ء کے درمیان کسی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

لُوقا سے منسوب نسخہ

تیسری کتاب لُوقا کی طرف منسوب ہے اور یہ بالکل مسلّم ہے کہ لُوقا نے کبھی مسیحؑ کو نہیں دیکھا اور نہ ان سے استفادہ کیا۔ وہ پولوس (St. Paul) کا مُرید تھا، ہمیشہ اُسی کی صُحبت میں رہا اور اُس نے اپنی انجیل میں اُسی کے خیالات کی ترجمانی کی۔ چنانچہ خود پولوس اِس کی انجیل کو اپنی انجیل کہتا ہے۔ لیکن یہ ثابت ہے کہ سینٹ پال خود بھی مسیحؑ کی صُحبت سے محرُوم تھا اور مسیحی روایات کے مطابق واقعہ صلیب کے ۶ برس بعد اِس مذہب میں داخل ہوا۔ اِس لیے لُوقا اور مسیحؑ کے درمیان سلسلۂ روایت کی ایک کڑی بالکل غائب ہے۔ انجیل لُوقا کی تاریخ تحریر بھی متعیّن نہیں ہے۔ بعض اس کو ۵۷ء کی تصنیف بتاتے ہیں اور بعض ۷۴ء کی، مگر ہارنک میکسگفرٹ اور ریلومر جیسے محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ ۸۰ء سے پہلے نہیں لکھی گئی۔

متی باب ۹ آیت ۹ میں لکھا ہے:

"یسُوع نے وہاں سے آگے بڑھ کر متی نام ایک شخص کو محصُول کی چوکی پر دیکھا" ظاہر ہے کہ مُصنّف خود اپنا تذکرہ اس طرح نہیں کر سکتا تھا۔

[۱] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دیتے جانے کے وقت وہ تماشائی کی حیثیت سے موجود تھا مگر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (مؤلف)

یُوحنّا سے منسُوب نسخہ

چوتھی کتاب جو یُوحنا کی انجیل کہلاتی ہے جدید تحقیقات کے مطابق مشہور یُوحنّا حواری کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ کسی اور مجہول الاحوال شخص کی ہے جس کا نام یُوحنّا تھا۔ یہ کتاب مسیح سے بہت بعد ۹۰ئہ میں یا اس کے بھی بعد لکھی گئی ہے۔ ہارنک اِس مدّت کو ۱۱۰ئہ تک بڑھا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں سے کسی ایک کا سلسلہ بھی مسیح تک نہیں پہنچتا اور ان کی سند پر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مسیح نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا۔ لیکن زیادہ عمیق تحقیقات سے ان کتابوں کی دستاویزی حیثیت اور بھی زیادہ مشکوک ہو جاتی ہے۔

اناجیل کے غیر مستند ہونے کے چھ وجوہ

اوّلاً چاروں انجیلوں کے بیانات میں اختلاف ہے، حتیٰ کہ پہاڑی کے وعظ کو بھی، جو مسیحی تعلیم کا اصل الاصول ہے، متّی، مرقس اور لُوقا تینوں نے مختلف اور متضاد طریقوں سے بیان کیا ہے۔

ثانیاً، چاروں انجیلوں میں ان کے مُصنّفین کے خیالات و تأثرات صاف طور پر نمایاں ہیں۔ متّی کے مخاطب یہودی معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان پر اتمامِ حُجّت کرتا نظر آتا ہے۔ مرقس کے مخاطب رومی ہیں اور وہ ان کو اسرائیلیات سے رُوشناس کرانا چاہتا ہے۔ لوقا سینٹ پال کا وکیل ہے اور دوسرے حواریوں کے خلاف اس کے دعاوی کی تائید کرنا چاہتا ہے۔ یُوحنّا ان فلسفیانہ خیالات سے متأثر نظر آتا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں مسیحیوں کے درمیان پھیل گئے تھے۔ اس طرح ان چاروں انجیلوں کے درمیان معنوی اختلاف، لفظی اختلاف سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

ثالثاً، اناجیل سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں، حالانکہ حضرت عیسیٰؑ اور اُن کے تمام حواریوں کی زبان سُریانی تھی۔ زبان کے اختلاف سے خیالات کی تعبیر میں اختلاف ہو جانا قدرتی بات ہے۔

رابعاً، اناجیل کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش دوسری صدی عیسوی سے پہلے نہیں کی گئی۔ ۱۵۰ئہ تک عام خیال یہ تھا کہ زبانی روایت تحریر سے زیادہ مفید ہے۔ دوسری صدی کے آخر میں لکھنے کا خیال پیدا ہُوا لیکن اِس زمانہ کی تحریروں کو مستند نہیں سمجھا جاتا۔ "عہدِ جدید" (New Testament) کا پہلا مستند متن قرطاجنہ کی کونسل میں منظور کیا گیا جو ۳۹۷ئہ میں منعقد ہُوئی تھی۔

خامساً اناجیل کا قدیم ترین نسخہ جو اِس وقت دنیا میں موجود ہے، چوتھی صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔ دوسرا نسخہ پانچویں صدی کا اور تیسرا ناقص نسخہ بھی جو پاپائے رُوم کے کتب خانہ میں ہے، چوتھی صدی سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ پس یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلی تین صدیوں میں جو انجیلیں رائج تھیں ان سے موجودہ اناجیل کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں۔

سادسًا، اناجیل کو قرآن کی طرح حفظ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کی اشاعت کا انحصار ابتداءً روایت بالمعنی پر رہا جس میں حافظہ کے اختلال اور راویوں کے ذاتی خیالات کا اثر آنا قدرتی امر ہے۔ بعد میں جب کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ نقل نویسوں کے رحم پر تھیں۔ نقل کرتے وقت ہر شخص کے لیے آسان تھا کہ جس چیز کو اپنے عقائد کے خلاف دیکھے حذف کر دے اور جس کی کمی پائے، بڑھا دے[1]۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اناجیلِ اربعہ میں ہم کو مسیحؑ کی اصل تعلیم ملتی ہے۔

---

[1] یہ پوری بحث ذیل کی کتابوں سے ماخوذ ہے:

Dumellow, Commentary on the Holy Bible.

Y. K. Cheyne, Encyclopaedia Biblica,

Millman, History of Christianity.

فصل ۳

حضرت عیسیٰؑ کی حقیقی تعلیمات

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا بہترین ریکارڈ

... حضرت عیسیٰؑ کے صحیح حالات اور آپ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا بھی معتبر ذریعہ وہ چار انجیلیں نہیں ہیں جن کو مسیحی کلیسا نے معتبر و مُسلّم اناجیل (Canonical Gospels) قرار دے رکھا ہے۔ بلکہ اُس کا زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ انجیل برناباس ہے جسے کلیسا غیر قانونی اور مشکوک الصحّت (Apocryphal) کہتا ہے اور عیسائیوں نے اسے چھُپانے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ صدیوں تک یہ دُنیا سے ناپید رہی ہے۔[1]

مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ انگریزی ترجمہ کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، اور مَیں نے اسے لفظ بہ لفظ پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ کتاب ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے عیسائیوں نے محض

---

[1] سولھویں صدی میں اِس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سکسٹس (Sixtus) کے کتب خانے میں پایا جاتا تھا، اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ لگا۔ پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرتا ہوا ۱۷۳۸ء میں ویانا کی امپیریل لائبریری میں پہنچ گیا۔ ۱۹۰۷ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس میں شائع ہو گیا تھا۔ مگر غالباً اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دنیا میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ کتاب تو اُس مذہب کی جڑ ہی کاٹے دے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰؑ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے مطبوعہ نسخے کسی خاص تدبیر سے غائب کر دیئے گئے، اور پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آسکی۔ (یہ ہے مغرب کی علمی کشادہ ظرفی کا حال کہ ایک کتاب کو محض تحقیق کی خاطر یا بہ حیثیت تاریخی ریکارڈ کے بھی موجود نہیں رہنے دیا گیا۔ مرتبین)۔ دوسرا ایک نسخہ اسی اطالوی ترجمہ سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہوا اٹھارویں صدی میں پایا جاتا تھا جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مگر وہ بھی کہیں غائب کر دیا گیا۔ اور آج اس کا بھی کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ (مؤلف)

تعصب[1] اور ضد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

بائیبل میں جو چاروں انجیلیں قانونی اور معتبر قرار دے کر شامل کر دی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسٰیؑ کا صحابی نہ تھا، اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ اُس نے آنحضرت کے صحابیوں سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہیں۔ جن ذرائع سے ان لوگوں نے معلومات حاصل کی ہیں ان کا کوئی حوالہ انہوں نے نہیں دیا ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ راوی نے خود وہ واقعات دیکھے اور اقوال سُنے ہیں جنہیں وہ بیان کر رہا ہے یا ایک یا چند واسطوں سے یہ باتیں اسے پہنچی ہیں[2]۔ بخلاف اس کے انجیل برناباس کا مصنف کہتا ہے

---

[1] مسیحی لٹریچر میں جہاں کہیں اس انجیل کا ذکر آتا ہے، اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برناباس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صرف اس بنا پر بول دیا گیا ہے کہ اس میں جگہ جگہ بصراحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اول تو اس انجیل کو پڑھنے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے، اگر یہ کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت سے پھیلی ہوتی، اور علمائے اسلام کی تصنیفات میں بکثرت اس کا ذکر پایا جاتا۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی مقدمۂ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک کا علم نہ تھا۔ طبری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابنِ حزم اور دوسرے مصنفین جو مسلمانوں میں مسیحی لٹریچر پر اطلاع رکھنے والے تھے ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل برناباس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں، ان کی بہترین فہرستیں ابن ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ہیں۔ اور وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برناباس کا نام تک نہیں لیا ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے ۷۵ سال پہلے گلاسیئس اول (Gelasius) کے زمانے میں جن کتابوں کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا ان میں انجیل برناباس (Evangelium Barnabe) بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت کونسا مسلمان تھا جس نے یہ جعلی انجیل تیار کی تھی؟ (مؤلف)

[2] مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہار الحق کے مشرح ترجمے میں مستند انجیلوں کے مندرجات میں ۱۲۴ اختلافات اور ۱۱۰ غلطیاں برآمد کر کے پیش کی گئی ہیں۔ نیز اناجیل اور متعلقہ خطوں اور نوشتوں میں سے مختلف کی صحت یا الہامی حیثیت کا انکار کرنے والوں میں بے شمار عیسائی اکابر اور ادارے شامل ہیں (ملاحظہ ہو: انجیل سے قرآن تک۔ ج ۱ فصل ۴۔ ترجمہ از مولانا اکبر علی صاحب۔ شرح و تحقیق از محمد تقی عثمانی صاحب)۔ (مرتبین)

کہ میں مسیح کے اوّلین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں۔ شروع سے آخر وقت تک مسیح کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سُنے اقوال اِس کتاب میں درج کر رہا ہوں یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ دُنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت مسیحؑ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور صحیح حالات دُنیا کے سامنے لانا تیری ذمّہ داری ہے۔

انجیل برنباس کی امتیازی خصوصیّات

اِس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصّب کے بغیر کھُلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ان چاروں انجیلوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰؑ کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، اور اس طرح بیان ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص فی الواقع وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا، اور ان واقعات میں خود شریک تھا۔ چاروں انجیلوں کی بے ربط داستانوں کے مقابلے میں یہ تاریخی بیان زیادہ مربوط بھی ہے اور اس سے سلسلۂ واقعات بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی صحیح تعلیمات اور مؤثر پیرایۂ بیان

حضرت مسیحؑ کی تعلیمات اس میں چاروں انجیلوں کی بہ نسبت زیادہ واضح اور مفصل اور مؤثر طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔ توحید کی تعلیم، شرک کی تردید، صفاتِ باری تعالیٰ، عبادات کی رُوح اور اخلاقِ فاضلہ کے

---

[1] یہ برنباس کون تھا؟ بائیبل کی کتاب اعمال میں بڑی کثرت سے اِس نام کے ایک شخص کا ذکر آتا ہے جو قُبرُص کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مسیحیّت کی تبلیغ اور پیروانِ مسیحؑ کی مدد و اعانت کے سلسلے میں اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کب دینِ مسیح میں داخل ہوا۔ اور ابتدائی بارہ حواریوں کی جو فہرست تین انجیلوں میں دی گئی ہے اس میں بھی کہیں اس کا نام درج نہیں ہے۔ اِس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس انجیل کا مصنّف وہی برنباس ہے یا کوئی اور۔ متی اور مرقس نے حواریوں (Apostles) کی جو فہرست دی ہے، برناباس کی دی ہُوئی فہرست اس سے صرف دو ناموں میں مختلف ہے۔ ایک تُوما جس کے بجائے برناباس خود اپنا نام دے رہا ہے۔ دوسرا شمعون قنانی جس کی جگہ وہ یہوداہ بن یعقوب کا نام لیتا ہے لُوقا کی انجیل میں یہ دوسرا نام بھی موجود ہے۔ اِس لیے یہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ بعد میں کسی وقت برناباس کو حواریوں سے خارج کرنے کے لیے تُوما کا نام داخل کیا گیا ہے تاکہ اس کی انجیل سے پیچھا چھڑایا جا سکے، اور اس طرح کے تغیّرات اپنی مذہبی کتابوں میں کر لینا ان حضرات کے ہاں کوئی ناجائز کام نہیں رہا ہے۔ (مؤلّف)

مضامین بڑے ہی پُرزور اور مدلّل و مفصّل ہیں۔ جن سبق آموز تمثیلات کے پیرایہ میں مسیحؑ نے یہ مضامین بیان کیے ہیں ان کا عُشرِ عشیر بھی چاروں انجیلوں میں نہیں پایا جاتا۔ اِس سے یہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کس حکیمانہ طریقے سے فرماتے تھے۔ حضرت عیسٰیؑ کی زبان، طرزِ بیان اور طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر کچھ بھی آشنا ہو تو وہ اِس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ یہ کوئی جعلی داستان نہیں ہے جو بعد میں کسی نے گھڑلی ہو۔ بلکہ اس میں حضرت مسیحؑ اناجیلِ اربعہ کی بہ نسبت اپنی اصلی شان میں زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں، اور اس میں ان تضادات کا نام و نشان بھی نہیں ملتا جو اناجیلِ اربعہ میں آنجناب کے مختلف اقوال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

تمام انبیاء کی تعلیمات سے ہم آہنگی

اِس انجیل میں حضرت عیسٰیؑ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات ٹھیک ٹھیک ایک نبی کی زندگی اور تعلیمات کے مطابق نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، تمام پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں، صاف کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السّلام کی تعلیمات کے سوا معرفتِ حق کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور جو انبیاء کو چھوڑتا ہے وہ دراصل خدا کو چھوڑتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتے ہیں جن کی تعلیم تمام انبیاء نے دی ہے، نماز، روزے اور زکوٰۃ کی تلقین کرتے ہیں، ان کی نمازوں کا جو ذکر بکثرت مقامات پر برنباس نے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا اور تہجّد کے اوقات تھے جن میں وہ نماز پڑھتے تھے اور ہمیشہ نماز سے پہلے وضو فرماتے تھے۔ انبیاء میں سے وہ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کو نبی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کو انبیاء کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کو وہ ذبیح قرار دیتے ہیں۔ اور ایک یہودی عالم سے اقرار کراتے ہیں کہ فی الواقع حضرت اسمٰعیلؑ ہی ذبیح تھے اور بنی اسرائیل نے کھینچ تان کر حضرت اسحٰقؑ کو ذبیح بنا رکھا ہے۔ آخرت، قیامت اور جنّت و دوزخ کے متعلق ان کی تعلیمات قریب قریب وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

مُصنّف کا مقصدِ تصنیف

اس کا مصنّف (جیسا کہ اوپر بیان ہُوا) کتاب کے آغاز ہی میں اپنا مقصدِ تصنیف یہ بیان کرتا ہے کہ "اُن لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جائے جو شیطان کے دھوکے میں آکر یسوع کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں، ختنہ کو غیر ضروری ٹھیراتے ہیں، اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں، جن میں سے ایک دھوکہ کھانے والا پولوس بھی ہے۔"

وہ بتاتا ہے کہ حضرت علیٰؑ جب دنیا میں موجود تھے، اُس زمانے میں اُن کے معجزات کو دیکھ کر سب سے پہلے

مُشرک رُومی سپاہیوں نے اُن کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا۔ پھر یہ جھُوٹ بنی اسرائیل کے عوام کو لگ گئی اس پر حضرت عیسٰیؑ سخت پریشان ہُوئے۔ انہوں نے بار بار نہایت شدّت کے ساتھ اپنے متعلق اس غلط عقیدے کی تردید کی اور اُن لوگوں پر لعنت بھیجی جو اُن کے متعلق ایسی باتیں کہتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو پُورے یہودیہ میں اِس عقیدے کی تردید کے لیے بھیجا اور اُن کی دُعا سے شاگردوں کے ہاتھوں بھی وہی معجزے صادر کرائے گئے، تاکہ لوگ اِس غلط خیال سے باز آجائیں کہ جس شخص سے یہ معجزے صادر ہو رہے ہیں وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔ اِس سلسلے میں وہ حضرت عیسٰیؑ کی مفصّل تحریریں نقل کرتا ہے جن میں انہوں نے بڑی سختی کے ساتھ اِس غلط عقیدے کی تردید کی تھی، اور جگہ جگہ یہ بتاتا ہے کہ آنجنابؑ اِس گمراہی کے پھیلنے پر کس درجہ پریشان تھے۔

مزید براں وہ اس پولوسی عقیدے کی بھی صاف صاف تردید کرتا ہے کہ مسیحؑ نے صلیب پر جان دی تھی۔ وہ اپنے چشم دید حالات یہ بیان کرتا ہے کہ جب یہوداہ اسکریوتی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر حضرت عیسٰیؑ کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آنجناب کو اُٹھا کر لے گئے، اور خود یہوداہ اسکریوتی کی شکل اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو حضرت عیسٰیؑ کی تھی۔ صلیب پر وہی چڑھایا گیا تھا، نہ کہ حضرت عیسٰیؑ۔ اس طرح یہ انجیل پولوسی مسیحیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور قرآن کے بیان کی پوری توثیق کرتی ہے۔ حالانکہ نزولِ قرآن سے ۱۱۵ سال پہلے اس کے ان بیانات ہی کی بنا پر مسیحی پادری اسے ردّ کر چکے تھے۔[1] [۶۶۷]

مروّجہ چار انجیلوں میں تعلیماتِ عیسوی[2]

چونکہ ہمارے زمانے کے موجودہ حالات اُن حالات سے بہت ملتے جُلتے ہیں جن میں سیدنا مسیحؑ نے اہلِ فلسطین کو حکومتِ الٰہیہ کی دعوت دی تھی، اِس لیے ان کے طریقِ عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں ذیل

---

[1] یہ عیسائیوں کی اپنی بدقسمتی ہے کہ اس انجیل کے ذریعے سے اپنے عقاید کی تصحیح اور مسیحؑ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا جو موقع انہیں ملا تھا، اسے محض ضد کی بنا پر انہوں نے کھو دیا (مؤلف)

[2] فاضل مؤلف نے بڑی عرق ریزی سے عیسائیوں کی اختیار کردہ چار انجیلوں میں سے وہ اجزا ڈھونڈ نکالے ہیں جو قرآن کی روشنی میں حضرت عیسٰیؑ کی صحیح پیغمبرانہ تعلیمات کے آئینہ دار ہیں۔ پھر مؤلف نے ان کے استعاراتی اور تمثیلی اندازِ بیان کی حُسن وخوبی سے گرہ کشائی کی ہے۔ نیز ان کو ایسے طریق سے مُرتب کیا ہے کہ یہ تعلیمات حکمت اور نیکی کے متفرق کلمات کی صورت میں سامنے نہیں آتیں بلکہ ایک جامع تحریکِ اصلاح کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔
(مُرتبین)

میں ہم ان کے بعض ارشادات نقل کرتے ہیں:

دعوتِ توحید

"فقیہوں میں سے ایک نے ۔۔ ۔۔ ۔۔ اُس سے پُوچھا کہ سب حکموں میں سے اوّل حکم کونسا ہے۔ یسُوع نے جواب دیا کہ اوّل یہ ہے "اے اسرائیل سُن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ ۔۔ ۔۔ ۔۔ فقیہ نے اس سے کہا۔ اَے اُستاد، کیا خوب! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں" (مرقس۔ ۱۲: ۲۸-۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اُسی کی عبادت کر" (لُوقا: ۴: ۸)

حکومتِ الٰہی

"پس تم اِس طرح دُعا مانگو کہ اَے ہمارے باپ! تُو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پُوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو" (متی: ۶: ۹-۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیحؑ نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد رُوحانی بادشاہت تھی۔ یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ ان کا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکمِ شرعی اُسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اس کا قانونِ طبعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

حق و باطل کی کشمکش کا پیغام

"یہ نہ سمجھو کہ مَیں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ مَیں اِس لیے آیا ہُوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور اس کی بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جُدا کر دُوں۔ اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔"

راہِ حق میں آزمائش ضروری ہے

"اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے[1] اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اُسے کھوئے گا۔ اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اُسے بچائے گا۔" (متی ۱۰: ۳۴-۳۹)

---

[1] اپنی صلیب اٹھانے سے مُراد سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہے جس طرح اُردو محاورہ میں ہے "سر ہتھیلی پر رکھنا۔" (مؤلف)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی[1] سے انکار کرے اور اپنی صلیب اُٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے۔ (متی ۱۶: ۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔" (متی ۱۰: ۲۱-۲۲)

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں ۔۔۔۔ آدمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔" (۱۰: ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں، بھائیوں اور بہنوں اور اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے[2] تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اُٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا۔ ۔۔۔ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ (لوقا ۱۴: ۲۶-۳۳)

ایک انقلابی تحریک

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السّلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں اُٹھے تھے بلکہ پورے نظامِ تمدّن و سیاست کو بدل دینا ان کے پیشِ نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار اور فی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے۔ اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

---

[1] اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراضِ ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔ (مؤلف)

[2] دشمنی کرنے سے مراد اُن کی محبت اور اُن کے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کرنا ہے۔ (مؤلف)

مسلکِ صبر کی تلقین

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔" (متی ۵: ۳۹-۴۱)

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور رُوح کو قتل نہیں کرتے ان سے نہ ڈرو۔ بلکہ اس سے ڈرو جو رُوح اور بدن دونوں کو جہنّم میں ہلاک کر سکتا ہے۔ (متی ۱۰-۲۸)

حُبِّ دُنیا سے اِجتناب اور فکرِ آخرت کی دعوت

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو۔ جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے۔ اور جہاں چور نقب لگاتے اور چُراتے ہیں۔ بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو۔" (متی ۶: ۱۹-۲۰)

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا ...... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پییں گے۔ اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی مَیں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی کی مانند پوشاک پہنے ہُوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو، جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ تم پہلے اس کی بادشاہت اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔

(متی ۶-۲۴-۳۳)

"مانگو تو تمہیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔" (متی-۷:۷)

تحمّلِ شدائد کی تعلیم کا مقصد

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی ہے۔ حالانکہ اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمّلِ شدائد اور توکّل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظامِ تمدّن و سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہُوا ہو اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اس کے قبضۂ اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لیے اُٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبّت دل سے نکال

نہ دے، سختیاں اُٹھانے کو تیار نہ ہو جاتے، اپنے بہت سے نقصانات کو گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہوتا ہے۔ یہ کام جنہیں کرنا ہو انہیں ایک تھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کُرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ ہونا چاہیے۔ اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہونا چاہیے۔ خزائنِ رزق فی الوقت جن کے ہاتھ میں ہیں ظاہر ہے کہ اُن سے لڑ کر رزق پانے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا جو اسباب سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسہ پر اِس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی اُن سے لڑ سکتا ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کا جامع مینی فسٹو

"اے محنت اُٹھانے والو! بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ۔ مَیں تمہیں آرام دُونگا کیونکہ میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔" (متی ۱۱: ۲۸-۳۰)

شاید حکومتِ الٰہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پُر اثر الفاظ میں مُرتّب نہیں کیا جا سکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جُوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اِس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جُوا مَیں تمہارے اُوپر رکھنا چاہتا ہُوں وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

حکومت خدمت ہے

"غیر قوموں کے بادشاہ اُن پر حکومت چلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا، بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کی مانند ہے" (لُوقا ۲۲: ۲۵-۲۶)

حضرت مسیحؑ یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے۔ اِس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جانا۔

یہودی علماء و مشائخ پر تنقید

"فقیہ اور فریسی[1] مُوسیٰ کی گدّی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو۔ لیکن اُن کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اُٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔ مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے ہلانا بھی نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے

---

[1] فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں۔ (مؤلف)

رکھتے اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مُرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو۔ اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنّم کا فرزند بنا دیتے ہو۔"

"اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھّر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس ہے۔ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔" (متی ۲۳: ۲-۲۸)

یہ اُس وقت کے حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے۔ اور اس انقلاب کے راستہ میں رومی قیاصرہ سے بڑھ کر وہی حائل تھے

حضرت عیسٰیؑ کے خلاف مذہبی اکابر کی سازش

"اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اِسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوںؑ کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور (انہوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اَے اُستاد! ہم جانتے ہیں کہ تو سچّا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا۔ ہمیں بتا کہ تو کیا سمجھتا ہے؟ قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسُوع نے اُن کی شرارت جان کر کہا، اَے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکّہ مجھے دکھاؤ۔ وہ دینار اس کے پاس لے آئے۔ اُس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اُس نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو ادا کرو۔"

(متی ۲۲: ۱۵-۲۱)

ؑ مسیحؑ کے زمانے میں فلسطین کے ایک حصّہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنتِ رُوم کی تابع فرمان تھی۔ اس کے بانی ہیرود کے نام پر اس کو عموماً ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اِس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔ (مؤلّف)

اِس قصّہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک چال تھی۔ فریسی اِس تحریک کو ختم کرنے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ حضرت مسیحؑ کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جائے اور تحریک کو جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اُسے کُچلوا ڈالا جائے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے یہ سوال اُٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں؟ جواب میں حضرت مسیحؑ نے جو ذومعنی بات کہی اس کو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانہ میں موجود ہو۔ لیکن دراصل مسیحؑ نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے، کیونکہ ایسا کہنا اُن کی دعوت کے خلاف تھا۔ اور یہ فرمایا کہ اُسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اُس وقت تک اُن کی تحریک اس مرحلے پر نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا۔ اِس لیے انہوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کر دو اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کرو۔ اِس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیحؑ کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دیکر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیحؑ کو گرفتار کرائے جب کہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ اسکریوتی نے مسیحؑ کو پکڑوا دیا۔

حضرت عیسٰیؑ کے خلاف اکابرِ یہود کا مقدمہ

"پھر اُن کی ساری جماعت اُٹھ کر اُسے پیلاطس رُومی حاکم کے پاس لے گئی اور انہوں نے الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکانے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا ہے ...... پیلاطس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ مَیں اس شخص میں کوئی قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے ...... وہ چلّا چلّا کر مصر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلّانا کارگر ہوا۔"

(لُوقا ۲۳: ۱-۲۳)

حضورؐ کے مکّی دورِ دعوت سے مماثلت

اِس طرح دنیا میں مسیحؑ کا مشن اُن لوگوں کی بدولت ختم ہُوا جو اپنے آپ کو حضرت مُوسیٰؑ کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رُو سے حضرت مسیحؑ کی نبوت کا کُل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اس مختصر مدّت میں انہوں نے اُتنا ہی کام کیا جتنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی مکّی زندگی کے ابتدائی تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورہ بالا آیت کا مقابلہ قرآن مجید کی مکّی سُورتوں اور زمانہ قیامِ مکّہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔[۶۸]

فصل ۴

عیسائیوں کی گمراہی کے حقیقی اسباب

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۔ (المائدہ - ۷۷)

"کہو اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور اُن لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور "سواء السبیل" سے بھٹک گئے"۔

عیسائیوں میں غلو اور تقلیدِ اغیار کی بیماری

یہ اشارہ ہے اُن گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے خصوصاً فلاسفۂ یونان کی طرف جن کے تخیلات سے متاثر ہو کر عیسائی اِس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداءً ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اُس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت اور تعظیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دُور کا واسطہ بھی نہ رہا

"ایک عیسائی عالم کا ناقدانہ جائزہ"

اس باب میں خود ایک مسیحی عالمِ دینیات (ایوزنڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابلِ ملاحظہ ہے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں "یسُوع مسیح" (Jesus Christ) کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

"پہلی تین انجیلوں (متی، مرقس، لُوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی رُوح سے فیض یاب ہُوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے

اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو "مسیح تسلیم کرنے کے بعد" الگ ایک طرف لے جا کر اسے ملامت کی " (متی ۱۶: ۲۲) - لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ " وہ خدا اور ساری اُمت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا" (لوقا ۲۴: ۱۹) - یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ مرقس کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لیے لفظ "خداوند" (Lord) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے - یسوع کے ابتلاء کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کے شایانِ شان ہے - مگر مرقس کی " فدیہ" والی عبارت (مرقس ۱۰، ۴۵) اور آخری فسح کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے جو بعد میں پہنائے گئے - حتیٰ کہ اِس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ یسوع کی موت کا انسان کے گناہ اور اس کے کفّارہ سے کوئی تعلق تھا"

آگے چل کر وُہ لکھتا ہے :

" یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا اناجیل کی متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے - مثلاً یہ کہ " مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو" (لوقا ۱۳، ۲۳) - وہ اکثر اپنا ذکر " ابنِ آدم کے نام سے کرتا ہے . . .
. . یسوع کہیں اپنے آپ کو " ابن اللہ" نہیں کہتا - اس کے دوسرے ہم عصر جب اس کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً ان کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو خدا کا ممسوح سمجھتے ہیں - البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً " بیٹے" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے . . . . . . مزید برآں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لیے بھی " باپ" کا لفظ اسی اطلاقی شان میں استعمال کرتا ہے . . . . . .
اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا، بلکہ ابتدائی دَور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اس خاص گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا - البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعہ نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے "

پھر یہی مُصنّف لکھتا ہے :

" عیدِ پنتکُست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ " ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا" یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہمعصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے . . . . انجیلوں سے

ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشوونما کے مدارج سے گزرا۔ اس کو بھوک پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا تھا اور سوتا تھا، اور حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا، اُس نے دکھ اٹھایا اور مرا۔ اُس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے ..... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جاتے تو یہ اس پورے تصوّر کے بالکل خلاف ہوگا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس دعوے کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گزریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی۔ تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے، یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیّت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیّت میں اگر کوئی استثناء تھا تو وہ صرف اُسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادرِ مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اِس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دُعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ "یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں ٹل سکتی" اِس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کے تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اُس زمانہ سے پہلے مکمّل نہ ہوئی تھی جبکہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا، پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیح کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیحؑ اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔"

اس کے بعد یہ مُصنّف پھر لکھتا ہے:

"وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعۂ رفع کے وقت اِسی فعلِ رفع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ "ابن اللہ" کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا .... یہ ابنُ اللہ کا لفظ یقینی طور پر ذاتی ابنیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو "خدا کا اپنا بیٹا" کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال جس نے مسیح کے لیے "خداوند" کا خطاب اصل مذہبی معنی میں استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پُورے معنی میں بولنا شروع کیا، پھر اپنے مدّعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ "خداوند یسوع مسیحؑ" کی طرف بہت سے وہ تصوّرات

اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیئے جو قدیم کتبِ مقدّسہ میں خداوند یہوہ[1] (اللہ تعالیٰ) کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھہرایا۔ تاہم متعدد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔"

ایک دوسرے عیسائی محقق کا تجزیہ

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون "مسیحیت" (Christianity) میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکّب ہے۔ مذہبی خیالات بائبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صورتوں میں۔"

"باپ بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذونادر ہی کبھی استعمال کی تھی، اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا۔ تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت کے اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے۔ (اگرچہ اس مرکّب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا، یعنی یہ کہ ان تینوں اَقانیم (باپ بیٹے اور روح) کے درمیان تعلّق کی حیثیت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدے میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔"

تاریخِ کلیسا سے ایک شہادت

اسی سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک اور مضمون تاریخِ کلیسا (Church History) کی یہ عبارت بھی قابلِ ملاحظہ ہے:

"تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تھا، تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی

---

[1] یہودیوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے یہی لفظ مخصوص تھا (مؤلف)

ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیا کی کونسل نے الوہیتِ مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا لیکن آخری فتح نیقیا ہی کے فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ رُوح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیا میں مسیح کا جو تصوّر قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزوِ لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کہ "بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجسّم ہوئی تھی" ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدّتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلّق ہے؟ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں جمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت، دوسری انسانی طبیعت، اور دونوں متّحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جُداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیّر و تبدّل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیتیں بھی رکھتی ہیں، یعنی مسیح بیک وقت دو مشیتوں کا حامل ہے . . .

. . . . اسی دوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل کے مسئلہ پر بھی خاص توجّہ کی اور یہ سوال مدّتوں زیرِ بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا؟ آخر کار ۵۲۹ء میں اورینج کی دوسری کونسل میں . . . . . . یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہبوطِ آدم کی وجہ سے ہر انسان اِس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک وہ اُس فضلِ خداوندی سے، جو اِصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے، نئی زندگی نہ حاصل کرے۔ اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں اِستمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے، اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اُسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسّط سے حاصل رہ سکتی ہے۔"

حاصلِ بحث

مسیحی علماء کے ان بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداءً جس چیز نے مسیحیوں کو گمراہ کیا وہ عقیدت اور محبت کا غلو تھا۔ اسی غلو کی بنا پر مسیح علیہ السّلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، خدائی صفات ان کی طرف منسوب کی گئیں، اور کفّارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ حالانکہ حضرت مسیح کی تعلیمات

میں ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب فلسفہ کی ہوا مسیحیوں کو لگی تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اِس ابتدائی گمراہی کو سمجھ کر اس سے بچنے کی سعی کرتے، انہوں نے اپنے گزشتہ پیشواؤں کی غلطیوں کو نباہنے کے لیے اُن کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیح کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کیے بغیر محض منطق و فلسفہ کی مدد سے عقیدے پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے۔ یہی وہ ضلالت ہے جس پر قرآن نے اِن آیات میں مسیحیوں کو متنبہ فرمایا ہے۔[۴۶۹]

انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کا عقیدہ

کتبِ آسمانی نے کبھی انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کا وہ تصور پیش نہیں کیا ہے جسے ڈیڑھ ہزار سال سے عیسائیت نے اپنا بنیادی عقیدہ قرار دے رکھا ہے۔ آج خود کیتھولک علماء یہ کہنے لگے ہیں کہ بائیبل میں اِس عقیدے کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ چنانچہ بائیبل کا ایک مشہور جرمن عالم ریورینڈ ہربرٹ ہاگ (Haag) اپنی تازہ کتاب Is Original Sin In Scripture میں لکھتا ہے کہ ابتدائی دَور کے عیسائیوں میں کم از کم تیسری صدی تک یہ عقیدہ سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ انسان پیدائشی گناہ گار ہے۔ اور جب یہ خیال لوگوں میں پھیلنے لگا تو دو صدیوں تک عیسائی اہلِ علم اس کی تردید کرتے رہے۔ مگر آخر کار پانچویں صدی میں سینٹ آگسٹائن نے اپنی منطق کے زور سے اس بات کو مسیحیت کے بنیادی عقائد میں شامل کر دیا کہ "نوعِ انسانی نے آدم کے گناہ کا وبال وراثت میں پایا ہے اور مسیح کے کفّارے کی بدولت نجات پانے کے سوا انسان کے لیے کوئی راہِ نجات نہیں ہے"[۴۷۰]

حضرت مریم کو مادرِ خدا قرار دینا

۴۳۱ء میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اِفِسُس کے مقام پر منعقد ہوئی جس میں مسیح علیہ السلام کی اُلوہیت اور حضرت مریم کے مادرِ خدا ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا۔

عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیح اور رُوح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسیح کی والدۂ ماجدہ حضرت مریم کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی اُلوہیت یا قدوسیّت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائیبل میں موجود نہیں ہے۔ مسیح کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیّل سے بالکل ناآشنا تھی۔ تیسری صدی کے آخری دَور میں اسکندریہ کے بعض علماءِ دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریم کے لیے "اُمّ اللہ" یا "مادرِ خدا" کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُلوہیتِ مریم کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ لیکن اوّل اوّل چرچ اسے باقاعدہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر جب نَسطُورِیَس کے اِس عقیدے پر کہ مسیح کی واحد ذات میں دو مستقل جداگانہ شخصیتیں جمع تھیں، مسیحی دنیا میں بحث و جدال کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تو اس کا تصفیہ کرنے کے لیے ۴۳۱ء میں شہرِ افِسُوس میں ایک

کونسل منعقد ہوئی اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریم کے لیے "مادرِ خدا" کا لقب استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا وہ اس کے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا، حتیٰ کہ نزولِ قرآن کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے حضرت مریم اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ، بیٹا اور رُوح القدس، تینوں ان کے سامنے ہیچ ہو گئے۔ ان کے مجسمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے۔ ان کے آگے عبادت کے جملہ مراسم ادا کیے جاتے تھے۔ انہی سے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ وہی فریاد رس، حاجت روا، مشکل کُشا اور بے کسوں کی پُشتیبان تھیں۔ ایک مسیحی بندے کے لیے سب سے بڑا ذریعۂ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ "مادرِ خُدا" کی حمایت و سرپرستی اسے حاصل ہو۔ قیصر جسٹینین اپنے ایک قانون کی تمہید میں حضرت مریم کو اپنی سلطنت کی حامی و ناصر قرار دیتا ہے۔ اس کا مشہور جنرل نرسیس میدانِ جنگ میں حضرت مریم سے ہدایت و رہنمائی طلب کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہمعصر قیصر ہرَقل نے اپنے جھنڈے پر "مادرِ خدا" کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اِس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریکِ اِصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف سے آواز اٹھائی، لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اِس مسلک پر قائم ہے۔ [۱۷۴]

فصل ۵

تورات وانجیل میں نبی آخر الزماں کی پیشنگوئیاں[1]

"یاد کرو عیسیٰؑ ابنِ مریم کی وہ بات جو اس نے کہی تھی: اَے بنی اسرائیل! مَیں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہُوا رسُول ہُوں، تصدیق کرنے والا ہُوں اُس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہُوئی موجود ہے، اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسُول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا[2]"

(سورۃ الصّف)

.... حضرت عیسیٰؑ کے اِس قول کا اشارہ اُس بشارت کی طرف ہے جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت مُوسیٰؑ نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہُوئے دی تھی[3] اس میں وہ فرماتے ہیں:

ایک نبی برپا کروں گا

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سُننا۔ یہ تیری اُس درخواست کے مطابق ہوگا جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورِب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سُننی پڑے۔ اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ مَیں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں مَیں

---

[1] چاہیے تو یہ تھا کہ تورات میں درج پیشین گوئیوں کو یہود کی فصل میں شامل کیا جاتا اور انجیل کی پیشین گوئیوں کو یہاں الگ لیا جاتا۔ مگر فاضل مؤلف کے ہاں دونوں قسم کی پیشین گوئیاں کچھ اس طرح یکجا بیان کی گئی ہیں کہ ان کو الگ کرنے سے بحث کمزور پڑتی ہے لہٰذا ساری پیشین گوئیوں کو یہاں اکٹھا لے لیا گیا ہے۔ (مُرتّبین)

[2] اس معرکۃ الآرا آیت پر فاضل مؤلف نے بڑی اہم بحث کی ہے جو ذرا آگے چل کر پیش کی جا رہی ہے۔ (مرتّبین)

[3] حضرت مُوسیٰ کی تعلیمات اور الہامی کتاب تورات پر بھی عیسائی ایمان رکھتے ہیں، اس لیے فی نفسہٖ بھی یہ پیشینگوئی ان کے نوشتوں میں محسُوب ہے۔ (مُرتّبین)

ان کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالونگا۔
اور جو کچھ مَیں اُسے حکم دُوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا اور جو کوئی میری اِن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر
کہے گا نہ سُنے تو مَیں ان کا حساب اس سے لُونگا۔" (استثناء، باب ۱۸، آیات ۱۵-۱۹)

تورات کی صریح پیشین گوئی

یہ تورات کی صریح پیش گوئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔ اس میں حضرت
مُوسیٰؑ اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سُنا رہے ہیں کہ مَیں تیرے لیے تیرے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کرونگا۔
ظاہر ہے کہ ایک قوم کے بھائیوں سے مُراد خود اسی قوم کا کوئی قبیلہ یا خاندان نہیں ہو سکتا، بلکہ دوسری
ایسی قوم ہی ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اس کا قریبی نسلی رشتہ ہو۔ اگر مُراد خود بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی آمد
ہوتی تو الفاظ یہ ہوتے کہ مَیں تمہارے لیے خود تم میں سے ایک نبی برپا کرونگا۔ لہٰذا بنی اسرائیل کے بھائیوں
سے مراد لامحالہ بنی اسماعیل ہی ہو سکتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کی بنا پر ان کے نسبی رشتہ دار
ہیں۔ مزید برآں اس پیشین گوئی کا مصداق بنی اسرائیل کا کوئی نبی اِس وجہ سے بھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت مُوسیٰؑ
کے بعد بنی اسرائیل میں کوئی ایک نبی نہیں، بہت سارے نبی آتے ہیں جن کے ذکر سے بائیبل بھری پڑی ہے۔

دوسری بات اِس بشارت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جو نبی برپا کیا جائے گا وہ حضرت مُوسیٰؑ کے مانند ہو گا۔
اس سے مُراد ظاہر ہے کہ شکل و صورت یا حالاتِ زندگی میں مشابہ ہونا تو نہیں ہے۔ کیونکہ اِس لحاظ سے کوئی
فرد بھی کسی دوسرے فرد کے مانند نہیں ہوا کرتا۔ اور اس سے مُراد محض وصفِ نبوّت میں مماثلت بھی نہیں ہے
کیونکہ یہ وصف ان تمام انبیاء میں مشترک ہے جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے ہیں۔ اِس لیے کسی ایک نبی کی یہ
خصوصیت نہیں ہو سکتی کہ وہ اِس وصف میں ان کے مانند ہو۔ پس ان دونوں پہلوؤں سے مشابہت کے
خارج از بحث ہو جانے کے بعد کوئی اور وجہِ مماثلت، جس کی بنا پر آنے والے نبی کی تخصیص قابلِ فہم ہو، اس کے
سوا نہیں ہو سکتی کہ وہ نبی ایک مستقل شریعت لانے کے اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کے مانند ہو اور یہ خصوصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے سوا کسی میں
نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ آپ سے پہلے بنی اسرائیل میں جو نبی بھی آئے تھے وہ شریعتِ موسوی کے پیرو تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایک مستقل شریعت لے کر نہ آیا تھا۔

اس تعبیر کو مزید تقویت پیشین گوئی کے اِن الفاظ سے ملتی ہے کہ "یہ تیری (یعنی بنی اسرائیل کی) اس
درخواست کے مطابق ہو گا جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند
اپنے خدا کی آواز پھر سُننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ مَیں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے
کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا
کروں گا اور اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا۔" اس عبارت میں حورب سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت

موسیٰ کو پہلی مرتبہ احکامِ شریعت دیے گئے تھے۔ اور بنی اسرائیل کی جس درخواست کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ اگر کوئی شریعت ہم کو دی جائے تو اُن خوفناک حالات میں نہ دی جائے جو حورب پہاڑ کے دامن میں شریعت دیتے وقت پیدا کیے گئے تھے۔ (اِن حالات کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے اور بائیبل میں بھی (البقرہ آیات ۵۵-۵۶-۶۳- الاعراف آیات ۱۵۵-۱۷۱- بائیبل کتاب خروج ۱۹-۱۷،۱۸)۔ اس کے جواب میں حضرت مُوسیٰ بنی اسرائیل کو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری یہ درخواست قبول کر لی ہے۔ اُس کا ارشاد ہے کہ مَیں ان کے لیے ایک ایسا نبی برپا کروں گا جس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا یعنی آئندہ شریعت دینے کے وقت وہ خوفناک حالات پیدا نہ کیے جائیں گے جو حورب پہاڑ کے دامن میں پیدا کیے گئے تھے بلکہ اب جو نبی اِس منصب پر مامور کیا جائے گا اس کے مُنہ میں بس اللہ کا کلام ڈال دیا جائے گا۔ اور وہ اسے خلقِ خدا کو سُنا دے گا۔ اِس تصریح پر غور کرنے کے بعد کیا اس امر میں شک کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے سوا اس کا مصداق کوئی اور نہیں ہے۔ حضرت مُوسیٰؑ کے بعد مستقل شریعت صرف آپ ہی کو دی گئی، اس کے عطا کرنے کے وقت کوئی ایسا مجمع نہیں ہوا جیسا حورب پہاڑ کے دامن میں بنی اسرائیل کا ہُوا تھا، اور کسی وقت بھی احکامِ شریعت دینے کے موقع پر وہ حالات پیدا نہیں کیے گئے جو وہاں پیدا کیے گئے تھے۔ ۴۷۲

سُورۂ صف کی متعلقہ آیت پر تفصیلی بحث

سُورۂ صف کی یہ آیت جس کا ترجمہ آغاز میں دیا جا چکا ہے، قرآن مجید کی ایک بڑی اہم آیت ہے جس پر مخالفینِ اسلام کی طرف سے بڑی لے دے بھی کی گئی ہے اور بدترین خیانتِ مجرمانہ سے بھی کام لیا گیا ہے کیونکہ اس میں یہ بیان ہُوا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا صاف صاف نام لے کر آپ کی آمد کی بشارت دی تھی۔ اِس لیے ضروری ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔

۱- اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا اسمِ گرامی احمد بتایا گیا ہے۔ احمد کے دو معنی ہیں۔ ایک وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ دوسرے وہ شخص جس کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو۔ یا جو بندوں میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہو۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ بھی حضورؐ کا ایک نام تھا۔ مُسلم اور ابو داؤد طیالسی میں حضرت ابُو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ حضوؐر نے فرمایا اَنَا مُحَمَّدٌ وَ اَنَا اَحْمَدُ وَ اَنَا الْحَاشِرُ "مَیں محمد ہوں اور مَیں احمد ہوں اور مَیں حاشر ہُوں"۔ اِسی مضمون کی روایات حضرت جُبیر بن مُطعِم سے امام مالکؒ، بخاری، مُسلم، دارمی، ترمذی اور نسائی نے نقل کی ہیں۔ حضوؐر کا یہ اسمِ گرامی صحابہ میں معروف تھا۔ چنانچہ حضرت حسان بن ثابت کا شعر ہے ؎

صلی الالٰہ و من یحف بعرشہ   والطیّبون علی المبارک احمد

"اللہ نے اور اس کے عرش کے گرد جمگھٹا لگاتے ہوئے فرشتوں نے اور سب پاکیزہ ہستیوں نے بابرکت احمد پر درُود بھیجا ہے۔"

تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضورؐ کا نام مبارک صرف محمدؐ ہی نہ تھا بلکہ احمدؐ بھی تھا۔ عرب کا پورا لٹریچر اس بات سے خالی ہے کہ حضورؐ سے پہلے کسی کا نام احمد رکھا گیا ہو۔ اور حضورؐ کے بعد احمد اور غلام احمد اتنے لوگوں کے نام رکھے گئے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ زمانۂ نبوّت سے لے کر آج تک تمام اُمّت میں آپؐ کا یہ اسمِ گرامی معلوم و معروف رہا ہے۔ اگر حضورؐ کا یہ اسمِ گرامی نہ ہوتا تو اپنے بچوں کے نام غلام احمد رکھنے والوں نے آخر کس احمد کا غلام اُن کو قرار دیا تھا؟

"وُہ نبی"

۲۔ انجیل یُوحنّا اِس بات پر گواہ ہے کہ مسیحؑ کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ ایک مسیح، دوسرے ایلیاہ (یعنی حضرت الیاسؑ کی آمدِ ثانی) اور تیسرے "وُہ نبی"۔

انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

"اور یُوحنّا (حضرت یحییٰؑ) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پُوچھنے کو اُس کے پاس بھیجے کہ تُو کون ہے؟ تو اُس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا۔ بلکہ اقرار کیا کہ مَیں تو مسیح نہیں ہُوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا مَیں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ اس نے کہا کہ بیابان میں ایک پُکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔ انہوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟"

(باب ۱۔ آیات ۱۹-۲۵)

یہ الفاظ اِس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیحؑ اور حضرت الیاسؑ کے علاوہ ایک اور نبی کے منتظر تھے۔ اور وہ حضرت یحییٰؑ نہ تھے۔ اُس نبی کی آمد کا عقیدہ بنی اسرائیل کے ہاں اس قدر مشہور و معروف تھا کہ "وہ نبی" کہہ دینا گویا اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ "جس کی خبر توراۃ میں دی گئی ہے"۔ مزید برآں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس نبی کی طرف وہ اشارہ کر رہے تھے اس کا آنا قطعی طور پر ثابت تھا۔ کیونکہ جب حضرت یحییٰؑ سے یہ سوالات کیے گئے تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے، تم کس نبی کے متعلق پوچھ رہے ہو۔

انجیلِ یُوحنّا کی پیشین گوئیاں

۳- اب وہ پیشین گوئیاں دیکھیے، جو انجیلِ یُوحنّا میں مسلسل باب ۱۴ سے ۱۶ تک منقول ہُوئی ہیں

"اور مَیں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابدتک تمہارے ساتھ رہے۔ یعنی رُوحِ حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اُسے دیکھتی ہے نہ جانتی ہے تم اُسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر ہے۔"

(۱۴: ۱۶-۱۷)

"مَیں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی رُوح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا۔ اور جو کچھ مَیں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔" (۱۴-۲۵-۲۶)

"اِس کے بعد مَیں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُس کا کچھ نہیں۔" (۱۴: ۳۰)

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو مَیں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچّائی کا رُوح جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔" (۱۵: ۲۶)

"لیکن مَیں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر مَیں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دونگا۔"

(۱۴-۷)

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ سچّائی کا رُوح آئے گا تو تم کو تمام سچّائی کی راہ دکھاتے گا۔ اِس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہ کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اِس لیے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب میرا ہے اسی لیے مَیں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے اور تمہیں خبریں دے گا۔" (۱۶: ۱۲-۱۵)

آنے والا سرورِ عالم ہو گا

انجیلِ یُوحنّا کی مذکورۂ بالا عبارات میں حضرت عیسیٰؑ اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دے رہے ہیں جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ "دنیا کا سردار" (سرورِ عالم) ہو گا۔ ابدتک رہے گا۔ سچّائی کی تمام راہیں دکھائے گا۔ اور خود اُن کی (یعنی حضرت عیسیٰؑ) کی گواہی دے گا۔ یُوحنّا کی ان عبارتوں میں "رُوح القدس" اور "سچّائی کی رُوح" وغیرہ

الفاظ شامل کر کے مدعا کو نبط کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ مگر اس کے باوجود ان سب عبارتوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس آنے والے کی خبر دی گئی ہے وہ کوئی "رُوح" نہیں ہے بلکہ کوئی انسان اور خاص شخص ہے جس کی تعلیم ہمہ گیر اور قیامت تک باقی رہنے والی ہوگی۔ اس شخصِ خاص کے لیے اُردو ترجمے میں "مددگار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور یُوحنّا کی اصل انجیل میں یُونانی زبان کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے بارے میں عیسائیوں کو اصرار ہے کہ وہ (Paracletus) تھا۔

لفظ پیریکلیٹس کے بارے میں عیسائیوں کی اُلجھن

مگر اس کے معنی متعین کرنے میں خود عیسائی عُلماء کو سخت زحمت پیش آئی ہے۔ اصل یونانی زبان میں (Paraclete) کے کئی معنی ہیں: کسی جگہ کی طرف بلانا، مدد کے لیے پکارنا، اِنذار و تنبیہ، ترغیب، اُکسانا، التجا کرنا، دعا مانگنا۔ پھر یہ لفظ اپنے ہیلینی (Hellenic) مفہوم میں یہ معنی دیتا ہے: تسلّی دینا، تسکین بخشنا، ہمّت افزائی کرنا۔ بائبل میں اس لفظ کو جہاں جہاں استعمال کیا گیا ہے ان سب مقامات پر اس کے کوئی معنی بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اوریجن (Origen) نے کہیں اس کا ترجمہ (Consolator) کیا ہے۔ اور کہیں (Deprecator)۔ مگر دوسرے مفسّرین نے ان دونوں ترجموں کو رد کر دیا۔ کیونکہ اوّل تو یہ یونانی گرامر کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں، دوسرے تمام عبارتوں میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے، یہ معنی نہیں چلتے۔ بعض اور مترجمین نے اس کا ترجمہ (Teacher) کیا ہے۔ مگر یونانی زبان کے استعمالات سے یہ معنی بھی اخذ نہیں کیے جاسکتے۔ ترتولیان اور آگسٹائن نے لفظ (Advocate) کو ترجیح دی ہے۔ اور بعض لوگوں نے (Assistant) اور (Comforter) اور (Consoler) وغیرہ الفاظ اختیار کیے ہیں۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، لفظ "پیریکلیٹس")

ایک لفظی تحریف کا اِمکان

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ یونانی زبان ہی میں ایک دوسرا لفظ (Periclytos) موجود ہے جس کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ یہ لفظ بالکل "محمّد" کا ہم معنی ہے اور تلفّظ میں اُس کے اور (Paracletus) کے درمیان بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیا بعید ہے کہ جو مسیحی حضرات اپنی مذہبی کتابوں میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بے تکلّف ردّ و بدل کر لینے کے خوگر رہے ہیں، انہوں نے یوحنّا کی نقل کردہ پیشین گوئی کے اس لفظ کو اپنے عقیدے کے خلاف پڑتا دیکھ کر اس کے املا میں یہ ذرا سا تغیّر کر دیا ہو۔ اس کی پڑتال کرنے کے لیے یُوحنّا کی لکھی ہوئی ابتدائی یونانی انجیل کہیں موجود نہیں ہے جس سے یہ تحقیق کیا جاسکے کہ وہاں ان دونوں الفاظ میں سے دراصل کونسا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔

اصل سُریانی لفظ

لیکن فیصلہ اس پر بھی موقوف نہیں ہے کہ یُوحنّا نے یُونانی زبان میں دراصل کونسا لفظ لکھا تھا کیونکہ بہرحال وُہ بھی ترجمہ ہی تھا اور حضرت مسیحؑ کی زبان فلسطین کی سُریانی تھی۔ اس لیے اُنہوں نے اپنی بشارت میں جو لفظ استعمال کیا ہوگا وہ لامحالہ کوئی سُریانی لفظ ہی ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے وہ اصل سُریانی لفظ ہمیں ابن ہشام کی سیرت میں مل جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اُسی کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی یونانی لفظ کیا ہے۔ محمد بن اسحاق کے حوالہ سے ابن ہشام نے یُحنّس (یوحنّا) کی انجیل باب ۱۵ آیات ۲۳ تا ۲۷ اور باب ۱۶ آیت ۱ کا پُورا ترجمہ نقل کیا ہے اور اس میں یونانی "فارقلیط" کے بجائے سُریانی زبان کا لفظ "مُنحمنّا" استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ابنِ اسحاق یا ابنِ ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ مُنحمنّا کے معنی سُریانی میں "محمّدؐ" اور یونانی میں برقلیطس ہیں۔

(ابن ہشام جلد اوّل ص ۲۴۸)

اب دیکھیے کہ تاریخی طور پر فلسطین کے عام عیسائی باشندوں کی زبان نویں صدی عیسوی تک سُریانی تھی۔ یہ علاقہ ساتویں صدی کے نصف اوّل سے اسلامی مقبوضات میں شامل تھا۔ ابنِ اسحاق ۷۶۸ھ میں اور ابن ہشام نے ۸۲۸ھ میں وفات پائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کے زمانے میں فلسطینی عیسائی سُریانی زبان بولتے تھے اور ان دونوں کے لیے اپنے ملک کی عیسائی رعایا سے ربط پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ نیز اس زمانے میں یُونانی بولنے والے عیسائی بھی لاکھوں کی تعداد میں اسلامی مقبوضات کے اندر رہتے تھے۔ اس لیے یہ معلوم کرنا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ سُریانی کے کس لفظ کا ہم معنی یونانی زبان کا کونسا لفظ ہے۔ اب اگر ابنِ اسحٰق کے نقل کردہ ترجمے میں سُریانی لفظ مُنحمنّا استعمال ہُوا ہے۔ اور ابنِ اسحاق یا ابنِ ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ عربی میں اس کا ہم معنی لفظ محمّدؐ اور یونانی میں برقلیطس ہے تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عیسٰیؑ نے حضوؐر کا نام مبارک لے کر آپؐ ہی کے آنے کی بشارت دی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یُوحنّا کی یونانی انجیل میں دراصل لفظ Periklytos استعمال ہُوا تھا جسے عیسائی حضرات نے بعد میں کسی وقت Paracletus سے بدل دیا۔

شاہِ نجاشی کی تصدیق

اس سے بھی قدیم تر تاریخی شہادت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کو جب نجاشی نے اپنے دربار میں بُلایا۔ اور حضرت جعفرؓ بن ابی طالب سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات سُنیں تو اس نے کہا:

"مرحبا تم کو اور اس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسُول

ہیں۔ اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰؑ ابن مریم نے دی تھی "

یہ قصہ احادیث میں خود حضرت جعفرؓ اور حضرت امِ سلمہؓ سے بھی منقول ہوا ہے۔ اِس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں نجاشی کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰؑ ایک نبی کی پیش گوئی کر گئے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُس نبی کی ایسی صاف نشاندہی انجیل میں موجود تھی جس کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تأمل نہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی ہیں۔ البتہ اس روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عیسیٰؑ کی اِس بشارت کے متعلق نجاشی کا ذریعہ معلومات یہی انجیل یوحنا تھی یا کوئی اور ذریعہ بھی اس کو جاننے کا اس وقت موجود تھا۔

انجیل برناباس کی بشارتیں

برناباس نے اپنی انجیل میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بشارتیں نقل کی ہیں اُن میں کہیں حضرت عیسیٰؑ حضورؐ کا نام لیتے ہیں، کہیں رسُول اللہ کہتے ہیں، کہیں آپ کے لیے "مسیح" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، کہیں قابلِ تعریف (Admirable.)، اور کہیں صاف صاف ایسے فقرے ارشاد فرماتے ہیں جو بالکل لا الٰہ الا اللہ محمد رسُول اللہ کے ہم معنی ہیں۔ ہمارے لیے ان ساری بشارتوں کو نقل کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ اتنی زیادہ ہیں۔ اور جگہ جگہ مختلف پیرایوں کے سیاق و سباق میں آئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔ یہاں ہم محض بطور نمونہ ان میں سے چند کو نقل کرتے ہیں:

"تمام انبیاء جن کو خدا نے دنیا میں بھیجا جن کی تعداد ایک لاکھ چوالیس ہزار تھی۔ انہوں نے ابہام کے ساتھ بات کی۔ مگر میرے بعد تمام انبیاء اور مقدس ہستیوں کا نُور آئے گا جو انبیاء کی کہی ہوئی باتوں کے اندھیرے پر روشنی ڈال دیگا، کیونکہ وہ خدا کا رسُول ہے۔" (باب ۱۷)

"فریسیوں اور لاویوں نے کہا اگر تُو نہ مسیح ہے نہ الیاس نہ کوئی اور نبی تو کیوں تو نئی تعلیم دیتا ہے اور اپنے آپ کو مسیح سے بھی زیادہ بنا کر پیش کرتا ہے؟ یسوع نے جواب دیا جو معجزے خدا میرے ہاتھ سے دکھاتا ہے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مَیں وہی کچھ کرتا ہوں جو خدا چاہتا ہے ورنہ درحقیقت مَیں اپنے آپ کو اُس (مسیح) سے بڑا شمار کیے جانے کے قابل نہیں قرار دیتا جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔ مَیں تو اس خدا کے رسُول کے موزے کے بند یا اس کی جُوتی کے تسمے کھولنے کے لائق بھی نہیں ہوں جس کو تم مسیح کہتے ہو، جو مجھ سے پہلے بنایا گیا تھا اور میرے بعد آئے گا اور صداقت کی باتیں لے کر آئے گا تاکہ اس کے دین کی کوئی انتہا نہ ہو۔" (باب ۴۲)

"بالیقین مَیں تم سے کہتا ہوں کہ ہر نبی جو آیا ہے وہ صرف ایک قوم کے لیے خدا کی رحمت کا

نشان بن کر پیدا ہوا ہے۔ اس وجہ سے انبیاء کی باتیں اُن لوگوں کے سوا کہیں اور نہیں پھیلیں جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ مگر خدا کا رسُول جب آئے گا، خدا گویا اُس کو اپنے ہاتھ کی مُہر دے دے گا یہاں تک کہ وہ دُنیا کی تمام قوموں کو جو اس کی تعلیم پائیں گی، نجات اور رحمت پہنچا دے گا۔ وہ بے خدا لوگوں پر اقتدار لے کر آئے گا اور بُت پرستی کا ایسا قلع قمع کرے گا کہ شیطان پریشان ہو جائے گا۔ اس کے آگے شاگردوں کے ساتھ ایک طویل مکالمہ میں حضرت عیسیٰؑ تصریح کرتے ہیں کہ وہ بنی اسماعیل میں سے ہوگا۔ باب ۴۳)

"اس لیے مَیں تم سے کہتا ہُوں کہ خدا کا رسُول وہ رونق ہے جس سے خدا کی پیدا کی ہُوئی قریب قریب تمام چیزوں کو خوشی نصیب ہوگی، کیونکہ وہ فہم اور نصیحت، حکمت اور طاقت، خشیت اور محبّت، حزم اور وَرع کی رُوح سے آراستہ ہے۔ وہ فیاضی اور رحمت، عدل اور تقویٰ، شرافت اور صبر کی رُوح سے مُزیّن ہے، جو اُس نے خدا سے اُن تمام چیزوں کی بہ نسبت تین گُنی پائی ہے جنہیں خدا نے اپنی مخلوق میں سے یہ رُوح بخشی ہے۔ کیسا مبارک وقت ہوگا جب وہ دنیا میں آئے گا یقین جانو مَیں نے اُسے دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے جس طرح ہر نبی نے اس کو دیکھا ہے۔ اس کی رُوح کو دیکھتے ہی سے خدا نے ان کو نبوّت دی۔ اور جب مَیں نے اس کو دیکھا تو میری رُوح سکینت سے بھر گئی، یہ کہتے ہوئے کہ اَے محمّدؐ! خدا تمہارے ساتھ ہو۔ اور وہ مجھے تمہاری جُوتی کے تسمے باندھنے کے قابل بنا دے۔ کیونکہ یہ مرتبہ بھی پالُوں، تو میں ایک بڑا نبی اور خدا کی ایک مقدس ہستی ہو جاؤں گا" (باب۔ ۴۴)

"دمیرے جانے سے) تمہارا دل پریشان نہ ہو۔ نہ تم خوف کرو کیونکہ مَیں نے تم کو پیدا نہیں کیا ہے بلکہ خدا ہمارا خالق ہے، جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔ رہا میں، تو اس وقت دُنیا میں اُس رسُولِ خدا کے لیے راستہ تیار کرنے آیا ہُوں جو دُنیا کے لیے نجات لے کر آئے گا۔ اندریاس نے کہا اُستاد ہمیں اس کی نشانی بتا دے تاکہ ہم اسے پہچان لیں۔ یسُوع نے جواب دیا وہ تمہارے زمانے میں نہیں آئے گا بلکہ تمہارے کئی سال بعد آئے گا جبکہ میری انجیل ایسی مسخ ہو چکی ہو گی کہ مشکل سے کوئی تیس آدمی مومن باقی رہ جائیں گے۔ اس وقت اللہ دُنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنے رسُول کو بھیجے گا جس کے سر پر سفید بادل کا سایہ ہوگا۔ جس سے وہ خدا کا برگزیدہ جانا جائے گا اور اس کے ذریعہ سے خدا کی معرفت دُنیا کو حاصل ہوگی۔ وہ بے خدا لوگوں کے خلاف بڑی طاقت کے ساتھ آئے گا اور زمین پر بُت پرستی کو مٹا دیگا۔ اور مجھے اس کی بڑی خوشی ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ سے ہمارا خدا پہچانا جائے گا اور اس کی تقدیس ہوگی۔ اور

میری صداقت دنیا کو معلوم ہو گی۔ وہ ان لوگوں سے انتقام لے گا جو مجھے انسان سے بڑھ کر کچھ قرار دیں گے ۔۔۔۔۔ وہ ایک ایسی صداقت کے ساتھ آئے گا جو تمام انبیاء کی لائی ہوئی صداقت سے زیادہ واضح ہو گی (باب ۷۲)

"خدا کا عہد یروشلم میں، معبدِ سلیمان کے اندر کیا گیا تھا نہ کہیں اور۔ مگر میری بات کا یقین کرو کہ ایک وقت آئے گا جب خدا اپنی رحمت ایک اور شہر میں نازل فرمائے گا۔ پھر ہر جگہ اس کی صحیح عبادت ہو سکے گی۔ اور اللہ اپنی رحمت سے ہر جگہ سچی نماز کو قبول فرمائے گا ۔۔۔۔۔ میں دراصل اسرائیل کے گھرانے کی طرف نجات کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ مگر میرے بعد مسیح آئے گا، خدا کا بھیجا ہوا، تمام دنیا کی طرف، جس کے لیے خدا نے یہ ساری دنیا بنائی ہے۔ اُس وقت ساری دنیا میں اللہ کی عبادت ہو گی اور اس کی رحمت نازل ہو گی۔" (باب ۸۳)

"(یسوع نے سردار کاہن سے کہا) زندہ خدا کی قسم جس کے حضور میری جان حاضر ہے، میں وہ مسیح نہیں ہوں جس کی آمد کا تمام دنیا کی قومیں انتظار کر رہی ہیں، جس کا وعدہ خدا نے ہمارے باپ ابراہیم سے یہ کہہ کر کیا تھا کہ "تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی"۔ (پیدائش ۲۲ : ۱۸)

"مگر جب مجھے خدا دنیا سے لے جائے گا تو شیطان پھر یہ بغاوت برپا کرے گا کہ ناپرہیزگار لوگ مجھے خدا اور خدا کا بیٹا مانیں۔ اس کی وجہ سے میری باتوں اور میری تعلیمات کو مسخ کر دیا جائے گا یہاں تک کہ بمشکل ۳۰ صاحبِ ایمان باقی رہ جائیں گے۔ اس وقت خدا دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنا رسول بھیجے گا جس کے لیے اُس نے دنیا کی یہ ساری چیزیں بنائی ہیں۔ جو قوت کے ساتھ جنوب سے آئے گا اور بتوں کو بت پرستوں کے ساتھ برباد کر دے گا، جو شیطان سے وہ اقتدار چھین لے گا جو اُس نے انسانوں پر حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کی رحمت اُن لوگوں کی نجات کے لیے اپنے ساتھ لائے گا جو اس پر ایمان لائیں گے اور مبارک ہے وہ جو اس کی باتوں کو مانے۔" (باب ۹۶)

"سردار کاہن نے پوچھا کیا خدا کے اس رسول کے بعد دوسرے نبی بھی آئیں گے؟ یسوع نے جواب دیا اس کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے سچے نبی نہیں آئیں گے، مگر بہت سے جھوٹے نبی آ جائیں گے جن کا مجھے بڑا غم ہے کیونکہ شیطان خدا کے عادلانہ فیصلے کی وجہ سے ان کو اٹھائے گا اور وہ میری انجیل کے پردے میں اپنے آپ کو چھپائیں گے۔" (باب ۹۷)

"سردار کاہن نے پوچھا کہ وہ مسیح کس نام سے پکارا جائے گا اور کیا نشانیاں اس کی آمد کو ظاہر کریں گی؟ یسوع نے جواب دیا اس مسیح کا نام "قابلِ تعریف" ہے۔ کیونکہ جب خدا نے اس کی روح پیدا

کی تھی۔ اُس وقت اس کا یہ نام خود رکھا تھا۔ اور وہاں اُسے ایک ملکوتی شان سے رکھا گیا تھا۔ خدا نے کہا اَے محمّد! انتظار کر، کیونکہ تیری ہی خاطر مَیں جنّت، دُنیا، اور بہت سی مخلوق پیدا کروں گا۔ اور اس کو تجھے تحفے کے طور پر دوں گا، یہاں تک کہ جو تیری تبریک کرے گا اُسے برکت دی جائے گی اور جو تجھ پر لعنت کرے گا، اُس پر لعنت کی جائے گی جب مَیں تجھے دُنیا کی طرف بھیجوں گا تو مَیں تجھ کو اپنے پیغامبرِ نجات کی حیثیت سے بھیجوں گا۔ تیری بات سچّی ہوگی یہاں تک کہ زمین و آسمان ٹل جائیں گے مگر تیرا دین نہیں ٹلے گا۔ سو اس کا مبارک نام محمّد ہے۔" (باب ۹۷)

برنا باس لکھتا ہے کہ ایک موقع پر شاگردوں کے سامنے حضرت عیسیٰؑ نے بتایا کہ میرے ہی شاگردوں میں سے ایک (جو بعد میں یہوداہ اسکریوتی نکلا)، مجھے ۳۰ سکّوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھ بیچ ڈالے گا۔ پھر فرمایا:

"اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ جو مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے مارا جائے گا کیونکہ خدا مجھے زمین سے اُوپر اٹھالے گا۔ اور اس غدّار کی صورت ایسی بدل دے گا کہ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ وہ مَیں ہی ہُوں۔ تاہم جب وہ بُری موت مرے گا تو ایک مدّت تک میری ہی تذلیل ہوتی رہے گی[1] مگر جب محمّد خدا کا مقدّس رسُول آئے گا، تو میری وہ بدنامی دُور کر دی جائے گی۔ اور خدا یہ اس لیے کرے گا کہ مَیں نے اس مسیح کی صداقت کا اقرار کیا ہے۔ وہ مجھے اس کا یہ انعام دے گا کہ لوگ یہ جان لیں گے کہ مَیں زندہ ہُوں اور اِس ذلّت کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔" (باب ۱۱۲)

شاگردوں سے حضرت عیسیٰؑ نے کہا:

"بے شک مَیں تم سے کہتا ہُوں کہ اگر مُوسیٰؑ کی کتاب سے صداقت مسخ نہ کر دی گئی ہوتی تو خدا ہمارے باپ داؤد کو ایک دوسری کتاب نہ دیتا۔ اور اگر داؤد کی کتاب میں تحریف نہ کی گئی ہوتی، تو خدا مجھے انجیل نہ دیتا۔ کیونکہ خداوند ہمارا خدا بدلنے والا نہیں ہے۔ اور اس نے سب انسانوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے۔ لہٰذا جب اللہ کا رسُول آئے گا تو وہ اس لیے آئے گا کہ ان ساری چیزوں کو صاف کر دے جن سے بے خدا لوگوں نے میری کتاب کو آلودہ کر دیا ہے۔" (باب ۱۲۴)[۴۷۳]

---

[1] یعنی دنیا یہی کہتی رہے گی کہ یسوعؑ نے صلیب پر جان دی۔ (مؤلف)

فصل ۶

عیسائیت عرب میں

مُرتّبین کی طرف سے اضافہ

[اس عنوان پر جب مواد مُرتّب کیا گیا تو ایک کمی یہ محسوس ہوئی کہ بحث کا آغاز کرنے کے لیے جس طرح کی عبارات درکار ہیں، وہ مہیّا نہیں ہیں۔ اِس خلاء کو پُر کرنا صرف اسی طرح ممکن تھا کہ بعض دوسرے مُصنّفین کے ہاں سے ضروری مواد لے لیا جائے۔ اس مواد کو بہ طورِ اقتباس حاشیہ چھوڑ کر لکھوایا جا رہا ہے۔ — مُرتّبین]

(۱) "تیسری صدی عیسوی میں عیسوی مذہب نے عرب میں دخل پایا جبکہ مشرقی کلیسا میں خرابیاں اور بدعتیں رفتہ رفتہ رواج پذیر ہو گئی تھیں۔ عام مورخین یہ کہتے ہیں کہ یہ زمانہ ذو نواس کا تھا، لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کرتا، کیونکہ وہ تقریباً ۶ سو برس پیشتر گزر چکا تھا۔ اِس مذہب کا شیوع زیادہ نجران میں ہُوا، اور عرب میں اس نے کچھ زیادہ رواج نہیں پایا۔ البتہ بنو ربیعہ وغسّان اور بعض قُضاعہ میں عیسائیت پھیلی ہُوئی تھی۔"

(حاشیہ اُردو ترجمہ تاریخ ابن خلدون ج ۱ - از علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی)

(۲) "عیسائیت کا رواج ربیعہ وغسان میں اور قضاعہ کے کچھ حصے میں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عیسائیت رُومیوں سے اخذ کی تھی، کیونکہ عرب تجارت کی غرض سے ان کے ملک میں اکثر آتے رہتے تھے۔ حیرہ میں عربوں کے متفرق قبائل نے مجتمعاً عیسائیت قبول کر لی۔ انہیں عِباد کہا جاتا تھا۔ ان میں سے عدیؔ بن زید عبادی بھی تھا۔ بنو تَغلِب بھی عرب عیسائی تھے۔"

(بلوغ الارب - اُردو ترجمہ از پیر محمد حسن، ج ۳ - ص ۱۵۲)

(۳) "عیسائیت کو سنہ ۳۳۰ء میں بنو غسان نے قبول کیا۔ اور پھر عراق، عرب، بحرین اور صحرائے فاران و دومۃ الجندل اور فرات و دجلہ کے دوآبہ میں یہی مذہب پھیل گیا، اور اس دین کی اشاعت میں نجاشی اور قیصر نے باہم

مل کر کوشش کی۔ ۳۹۵ء تا ۵۱۳ء میں اس کی اشاعت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور یمن میں اناجیل بکثرت پھیل گئیں۔ (حاشیہ: رحمۃ للعالمین۔ ج ۱۔ ص ۳۱)

(۴) تبابعہ سے پہلے سبا کے تمام طبقے ستارہ پرست تھے۔ سب سے بڑا دیوتا ان کا "شمس" اور "المقہ" تھا۔ المقہ حمیری میں چاند کو کہتے ہیں . . . . . ۳۳۰ء میں یمن کے مقابل افریقی سواحل پر مصری رومیوں کے اثر سے عیسائیت نے پر و بال پیدا کیے۔ شامی رومیوں کے ذریعے یمن کے اطراف میں شہر نجران نے بپتسمہ قبول کیا۔ ان گرد و پیش کے اثر سے تبابعۂ یمن بھی محفوظ نہ رہے۔

ستارہ پرستی نے تو شکست کھائی، گو ستاروں کے ہیکل اب بھی ویران نہ تھے۔ تاہم اب "شمس" اور "المقہ" اور "عشتار" کے پہلو بہ پہلو رحمان کا نام بھی آنے لگا جو قبلِ اسلام یہود و نصاریٰ کے ساتھ مخصوص تھا۔

(۵) یہودیت و نصرانیت، ان اطراف میں دو ہی مہذب اور صاحبِ الہام مذہب تھے، اور باہم میدان میں برابر کے حریف بھی تھے۔ گذشتہ ابواب میں معلوم ہو چکا ہے کہ رومیوں اور حبشیوں کے ساتھ سبائے حمیر کی کس قدر سیاسی کشمکش تھی۔ اس بنا پر تبابعۂ حمیر عیسائیت سے زیادہ یہودیت کو ترجیح دیتے تھے عبد کلیل کے علاوہ اور کسی تبع کا عیسائیت قبول کرنا ثابت نہیں ہے۔ عبد کلیل بروایتِ عرب بھی عیسائی تھا۔ اور ایک کتبہ سے بھی اس کا عیسائی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ بقیہ تبابعہ کم تر ستارہ پرست اور اکثر یہودی تھے۔ تاریخ طبری میں ہے کہ سب سے پہلے اسعد ابو کرب نے یہودیت قبول کی۔ مذہب شاہی نے عام رعایا میں بھی فروغ پایا۔ اور اس طرح عیسائیت اور یہودیت نے یمن میں ٹکر کھائی۔"

(۶) رومیوں نے بحری راستوں کو پیدا کر کے سبا کے بازار سرد کیے تھے، اور تنہا اس سے تسکین نہ ہوئی تو سنہ ق م میں یمن پر حملہ آور ہوئے، اکسومی حبشی جو پہلے رومی مصریوں کے ہم خاک تھے، اور اب ہم مذہب بھی ہو گئے تھے، رومیوں کے اشتعال سے بار بار چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ حمیر بھی موقع سے چوکتے نہ تھے جب موقع ملتا رومی تاجروں کو دریا میں لوٹ لیتے۔ شمالی عرب میں ایران و روم باہم دست و گریباں تھے، اور یہ طبعی تھا کہ حمیر کو ایرانیوں کے ساتھ ہمدردی ہوتی۔ رومیوں کو اس سے وحشت سوا ہوتی تھی۔

رومیوں نے اس نزاع کو صلح و آشتی سے طے کرنا چاہا۔ چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں رومی قیصر جسٹنین نے تبعِ یمن کے دربار میں سفیر بھیجا . . . . . . سفیر نے قیصر کا خط اور اس کی طرف سے دیگر تحائف پیش کیے . . . . . . پیامِ صلح تعصب کی آگ کو کچھ بھی سرد نہ کر سکا (اس وقت ذونواس فرماں روا تھا)۔

(۷) رُومی سوداگر تاجرانہ یمن کے سواحل تک پہنچتے تھے لیکن جہاں جہاں گزرتے تھے، اسباب سوداگری کے ساتھ عیسائیت کی سوغات بھی ساتھ ساتھ بانٹتے جاتے تھے۔ عیسائی راہب بھی مخصوص مقاصد کے ساتھ ملک میں دَورہ کرتے تھے۔ پہلے اثر سے عدن میں، اور دوسری کوشش سے عدنان میں جہاں پہلے شجر پرستی ہوتی تھی، عیسائیت نے برگ و بار پیدا کیے۔ یورپ کے جو اَب ہتھکنڈے ہیں، وہی پہلے بھی تھے، مذہبی اور سیاسی اغراض پر تجارت کا پردہ ہمیشہ ڈالا کیے ہیں۔ یہی پردہ اس وقت بھی ڈال رہے تھے۔ ان تدابیر سے نجران یمن میں عیسائیت کا مرکز قرار پا گیا تھا یعنی رومیوں اور حبشیوں کی مذہبی و سیاسی امیدوں کا وہ ماوٰی بن گیا تھا۔ حمیری یہودی اس کو دیکھتے تھے اور وفورِ جوش سے بھرتے تھے[1]۔

[یہاں سے مولانا مودودی کی اپنی تحریروں کو درج کیا جا رہا ہے]

قصّۂ اصحابِ اُخدُود

گڑھوں میں آگ جلا کر ایمان والوں کو اُن میں پھینکنے کے متعدد واقعات روایات میں بیان ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کئی مرتبہ اِس طرح کے مظالم کیے گئے ہیں۔

حضرت صُہیب رضؓ رومی کی روایت

ان میں سے ایک واقعہ حضرت صہیب رُومیؓ نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔ اُس نے اپنے بڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کر دے جو مجھ سے یہ سِحر سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مقرر کر دیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راہب سے بھی (جو غالباً پیروانِ مسیح علیہ السّلام میں سے تھا) ملنے لگا اور اس کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا حتیٰ کہ اس کی تربیت سے صاحبِ کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے تو اُس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا، پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا۔ مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اس پر کارگر نہ ہوا۔ آخر کار لڑکے نے کہا کہ اگر تو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجمعِ عام میں باسم رب الغلام (اس لڑکے کے رب کے نام پر) کہہ کر مجھے تیر مار، مَیں مر جاؤں گا چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اِس پر لوگ پکار اُٹھے کہ ہم اِس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ

---

[1] ان حالات میں عیسائیوں کو آگ کے گڑھوں میں جھونکنے کے واقعات پیش آتے ہیں جن کا ذکر خود مولانا مودودی کے ہاں سے لیا گیا ہے۔ (مرتّبین)

کے مصاحبوں نے اس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ حالت دیکھ کر غصّے میں بھر گیا۔اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوائے اُن میں آگ بھروائی، اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا، اس کو آگ میں پھکوا دیا۔ (احمد، مسلم، نسائی۔ ترمذی۔ ابن جریر۔ عبدالرزاق۔ ابن ابی شیبہ، طبرانی۔ عبد بن حُمید)

حضرت علیؓ سے مروی واقعہ

دوسرا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایران کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات اُستوار ہو گئے۔ بات کھُلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کرایا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کر دیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اُس شخص کو پھکواتا چلا گیا جس نے اسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ اُس وقت سے مجوسیوں میں محرّمات سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے۔ (ابنِ جریر)

اسرائیلی روایات

تیسرا واقعہ ابن عباسؓ نے غالباً اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ بابل والوں نے بنی اسرائیل کو دینِ موسٰی علیہ السلام سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا، یہاں تک کہ انہوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں اُن لوگوں کو پھینک دیا جو اس سے انکار کرتے تھے (ابن جریر۔ عبد بن حُمید)

واقعۂ نجران

سب سے مشہور واقعہ نجران کا ہے جسے ابن ہشام، طَبَری ابنِ خَلدون، اور صاحب مُعْجم البُلدان وغیرہ اسلامی مؤرخین نے نقل کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حِمیَر (یمن) کا بادشاہ تبان اسعد ابو کرِب ایک مرتبہ یثرب گیا جہاں یہودیوں سے متاثر ہو کر اُس نے دینِ یہود کو قبول کر لیا اور بنی قُریظہ کے دو یہودی عالموں کو اپنے ساتھ یمن لے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیمانے پر یہودیت کی اشاعت کی۔ پھر اس کا بیٹا ذُو نُواس اُس کا جانشین ہوا اور اُس نے نجران پر، جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا گڑھ تھا، حملہ کیا تاکہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کر دے اور اس کے باشندوں کو یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کرے (ابن ہشام کہتا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسٰیؑ کے اصل دین پر قائم تھے)۔ نجران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دینِ یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انہوں نے انکار کیا۔ اس پر اُس نے بکثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلوا دیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا، یہاں تک کہ مجموعی طور پر ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اہلِ نجران میں سے ایک شخص دَوس ذُو ثُعلبان بھاگ نکلا

اور ایک روایت کی رُو سے اُس نے قیصرِ روم کے پاس جاکر، اور دوسری روایت کی رُو سے حبش کے بادشاہ نجاشی کے ہاں جاکر اس ظلم کی شکایت کی۔ پہلی روایت کی رُو سے قیصر نے حبش کے بادشاہ کو لکھا اور دوسری روایت کی رُو سے نجاشی نے قیصر سے بحری بیڑہ فراہم کرنے کی درخواست کی، بہر حال آخر کار حبش کی ۷۰ ہزار فوج اریاط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی۔ ذُو نواس مارا گیا۔ یہودی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصّہ بن گیا۔

عیسائی مشنری یمن میں

اسلامی مؤرخین کے بیانات کی نہ صرف تصدیق دوسرے تاریخی ذرائع سے ہوتی ہے بلکہ ان سے بہت سی مزید تفصیلات کا پتہ چلتا ہے۔ یمن پر سب سے پہلے عیسائی حبشیوں کا قبضہ ۳۴۰ء میں ہُوا تھا اور ۳۷۸ء تک جاری رہا تھا۔ اُس زمانے سے عیسائی مشنری یمن میں داخل ہونے سے شروع ہوئے۔ اسی کے قریب دَور میں ایک زاہد و عابد اور صاحبِ کشف و کرامت عیسائی سیّاح فیمیون (Faymiyun) نامی نجران پہنچا۔ اُس نے وہاں کے لوگوں کو بُت پرستی کی بُرائی سمجھائی اور اس کی تبلیغ سے اہلِ نجران عیسائی ہو گئے۔ ان لوگوں کا نظام تین سردار چلاتے تھے۔ ایک سیّد جو قبائلی شیوخ کی طرح بڑا سردار اور خارجی معاملات، معاہدات اور فوجوں کی قیادت کا ذمّہ دار تھا۔ دوسرا عاقب، جو داخلی معاملات کا نگران تھا۔ تیسرا اُسقف (بشپ)، جو مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔ جنوبی عرب میں نجران کو بڑی اہمیّت حاصل تھی۔ یہ ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ ٹسر، چمڑے اور اسلحہ کی صنعتیں یہاں چل رہی تھیں۔ مشہور حُلّۂ یمانی بھی یہیں تیار ہوتا تھا۔ اسی بنا پر محض مذہبی وجوہ ہی سے نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی وجوہ سے بھی ذُو نواس نے اس اہم مقام پر حملہ کیا۔ نجران کے سیّد حارثہ کو، جسے سُریانی مؤرخین (Arethas) لکھتے ہیں، قتل کیا۔ اس کی بیوی رُومہ کے سامنے اس کی دو بیٹیوں کو مار ڈالا اور اُسے اُن کا خون پینے پر مجبور کیا۔ پھر اُسے بھی قتل کر دیا۔ اُسقف (Paul) پال کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلادیں۔ اور آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں عورت، مرد۔ بچے۔ بوڑھے، پادری، راہب، سب کو پھکوا دیا۔ مجموعی طور پر ۲۰ سے چالیس ہزار تک مقتولین کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۳ء میں پیش آیا تھا۔ آخر کار ۵۲۵ء میں حبشیوں نے یمن پر حملہ کر کے ذُو نواس اور اس کی حِمیَری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی تصدیق حصنِ غُراب کے کتبے سے ہوتی ہے جو یمن میں موجودہ زمانہ کے محققینِ آثارِ قدیمہ کو مِلا ہے۔

واقعۂ اصحاب الاُخدُود کے عینی شاہد

چھٹی صدی عیسوی کی متعدّد تحریرات میں اصحاب الاُخدُود کے اِس واقعہ کی تفصیلات بیان ہُوئی ہیں جن میں سے بعض عین زمانۂ حادثہ کی لکھی ہُوئی ہیں اور عینی شاہدوں سے سُن کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے تین کتابوں

کے مُصنّف اس واقعہ کے ہم عصر ہیں۔ ایک پروکوپیوس۔ دوسرا کوسماس انڈیکوپلیوسٹس (Cosmos Indicopleustis) جو نجاشی ایلسبوعان (Elesboan) کے حکم سے اُس زمانے میں بطلیموس کی یُونانی کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا اور حبش کے ساحلی شہر اُدولیس (Adolis) میں مقیم تھا۔ تیسرا یوحنّس ملالا (Johannes Malala) جس سے بعد کے متعدد مؤرخین نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یوحنّس اِفسوسی (Johannes of Ephesus) متوفی (۵۸۵ء) نے اپنی تاریخ کنیسہ میں نصارٰئ نجران کی تعذیب کا قصہ اس واقعہ کے معاصر راوی اُسقُف مارشمعون (Simeon) کے ایک خط سے نقل کیا ہے جو اُس نے دَیرِ جَبَلہ کے رئیس (Abbot von Gabula) کے نام لکھا تھا اور مارشمعون نے اپنے خط میں یہ واقعہ اُن اہلِ یمن کے آنکھوں دیکھے بیان سے روایت کیا ہے جو اس موقع پر موجود تھے۔ یہ خط ۱۸۸۱ء میں رُوم سے اور ۱۸۹۰ء میں شہدائے مسیحیت کے حالات کے سلسلے میں شائع ہوا ہے۔ یعقوبی بطریق ڈایونیسیوس (Patriarch Dionysius) اور زکریا مدللی (Zacharia of Mitylene) نے اپنی سُریانی تاریخوں میں بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ یعقوب سروجی کی کتاب در "باب نصارٰئ نجران" میں بھی یہ ذکر موجود ہے۔ الرّہا (Edessa) کے اُسقف (Pulus) پولس نے نجران کے ہلاک شدگان کا مرثیہ لکھا جو اَب بھی دستیاب ہے۔ سُریانی زبان کی تصنیف کتاب "الحِمیریین" کا انگریزی ترجمہ (Book of the Himyarites) ۱۹۲۴ء میں لندن سے شائع ہُوا ہے اور وہ مسلمان مؤرخین کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ برٹش میوزیم میں اس عہد اور اس سے قریبی عہد کے کچھ حبشی مخطوطات بھی موجود ہیں جو اس قصّے کی تائید کرتے ہیں۔ فلبی نے اپنے سفرنامے (Arabian Highlands) میں لکھا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے جہاں اصحاب الاُخدود کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اُمِّ خَرَق کے پاس ایک جگہ چٹانوں میں کھُدی ہُوئی کچھ تصویریں پائی جاتی ہیں۔ اور کعبۂ نجران[1] جس جگہ واقع تھا اس کو بھی آج کل کے اہلِ نجران جانتے ہیں۔

کعبہ کی شکل پر ایک عمارت کی تعمیر

حبشی عیسائیوں نے نجران پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کعبہ کی شکل کی ایک عمارت بنائی تھی جسے وہ مکّہ کے کعبہ کی جگہ مرکزی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ اس کے اساقفہ عمامے باندھتے تھے اور اس کو حرم قرار دیا گیا تھا۔ رومی سلطنت بھی اس کعبہ کے لیے مالی اعانت بھیجتی تھی۔ اسی کعبۂ نجران کے پادری اپنے سیّد اور عاقب اور

---

[1] اس کا نام ہی انہوں نے کعبہ رکھا تھا اور یہ کعبۂ نجران کے نام سے معروف تھا (مؤلف)

اُسقف کی قیادت میں مناظرے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور مباہلہ کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر سورۂ آلِ عمران آیت ۶۱ میں آیا ہے۔ ۴۷ئ

یمن پر عیسائیت کا تسلّط

نجران میں یمن کے یہودی فرمانروا ذُو نواس نے پیروانِ مسیح علیہ السّلام پر جو ظلم کیا تھا اُس کا بدلہ لینے کے لیے حبش کی عیسائی سلطنت نے یمن پر حملہ کر کے حِمیَری حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور ۵۲۵ء میں اِس پُورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ یہ ساری کارروائی دراصل قسطنطنیہ کی رُومی سلطنت اور حَبش کی حکومت کے باہمی تعاون سے ہُوئی تھی، کیونکہ حبشیوں کے پاس اُس زمانے میں کوئی قابلِ ذکر بحری بیڑا نہ تھا۔ بیڑا رومیوں نے فراہم کیا اور حبش نے اپنی ۷۰ ہزار فوج اُسی کے ذریعہ سے یمن کے ساحل پر اُتاری۔ آگے کے معاملات سمجھنے کے لیے یہ بات ابتداء ہی میں جان لینی چاہیے کہ یہ سب کچھ محض مذہبی جذبے سے نہیں ہوا تھا بلکہ اِس کے پیچھے معاشی و سیاسی اغراض بھی کام کر رہی تھیں، بلکہ غالباً وہی اس کی اصل محرک تھیں اور عیسائی مظلومین کے خون کا انتقام ایک بہانے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ رومی سلطنت جب سے مصر و شام پر قابض ہوئی تھی اُسی وقت سے اُس کی یہ کوشش تھی کہ مشرقی افریقہ، ہندوستان، انڈونیشیا وغیرہ ممالک اور رُومی مقبوضات کے درمیان جس تجارت پر عرب صدیوں سے قابض چلے آ رہے تھے، اُسے عربوں کے قبضے سے نکال کر وہ خود اپنے قبضے میں لے لے تاکہ اس کے منافع پُورے کے پُورے اُسی کو حاصل ہوں اور عرب تاجروں کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے۔ اِس مقصد کے لیے ۲۴ یا ۲۵ قبل مسیح میں قیصر آگسٹس نے ایک بڑی فوج رُومی جنرل اِلیَس گالوس (Aelius Gallus) کی قیادت میں عرب کے مغربی ساحل پر اُتار دی تھی تاکہ وہ اُس برّی راستے پر قابض ہو جائے جو جنوبی عرب سے شام کی طرف جاتا تھا۔ لیکن عرب کے شدید جغرافی حالات نے اس مہم کو ناکام کر دیا۔ اس کے بعد رُومی اپنا جنگی بیڑہ بحرِ احمر میں لے آئے اور انہوں نے عربوں کی اِس تجارت کو ختم کر دیا جو وہ سمندر کے راستے کرتے تھے، اور صرف برّی راستہ اُن کے لیے باقی رہ گیا۔ اِسی برّی راستے کو قبضے میں لینے کے لیے انہوں نے حبش کی عیسائی حکومت سے گٹھ جوڑ کیا اور بحری بیڑے سے اس کی مدد کر کے اس کو یمن پر قابض کرا دیا۔

اَبرَہَہ یمن کا فرمانروا کیسے بنا؟

یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہُوئی تھی اس کے متعلق عرب مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں۔ حافظ ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ وہ دو امیروں کی قیادت میں تھی، ایک اَریاط، دوسرا اَبرَہَہ۔ اور محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس فوج کا امیر اَریاط تھا۔ اور ابرہہ اس میں شامل تھا۔ پھر دونوں اِس بات پر متفق ہیں کہ اَبرَہَہ اور اریاط باہم لڑ پڑے،

مقابلے میں اَرْیاط مارا گیا، اَبرَہہ ملک پر قابض ہو گیا اور پھر اس نے شاہِ حبش کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اُسی کو یمن پر اپنا نائب مقرر کر دے۔ اس کے برعکس یونانی اور سُریانی مؤرخین کا بیان ہے کہ فتحِ یمن کے بعد جب حبشیوں نے مزاحمت کرنے والے یمنی سرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا تو اُن میں سے ایک سردار السُّمَیْفَع اَشْوَع (جسے یُونانی مؤرخین Esymphaeus لکھتے ہیں) نے حبشیوں کی اطاعت قبول کر کے اور جزیہ ادا کرنے کا عہد کر کے شاہ حبش سے یمن کی گورنری کا پروانہ حاصل کر لیا۔ لیکن حبشی فوج نے اُس کے خلاف بغاوت کر دی اور اَبْرَہہ کو اس کی جگہ گورنر بنا دیا۔ یہ شخص حبش کی بندرگاہ اَدُولیس کے ایک یُونانی تاجر کا غلام تھا جو اپنی ہوشیاری سے یمن پر قبضہ کرنے والی حبشی فوج میں بڑا اثر و رسُوخ حاصل کر گیا تھا۔ شاہِ حبش نے اس کی سرکوبی کے لیے جو فوجیں بھیجیں وہ یا اس سے مل گئیں یا اس نے ان کو شکست دے دی۔ آخرکار شاہ حبش کے مرنے کے بعد اُس کے جانشین نے اس کو یمن پر اپنا نائب السّلطنت تسلیم کر لیا (یونانی مؤرخین اُس کو اَبرامس Abrames اور سریانی مؤرخین ابراہام Abraham لکھتے ہیں۔ ابرہہ غالباً اسی کا حبشی تلفظ ہے، کیونکہ عربی میں تو اس کا تلفُّظ ابراہیم ہے)

یہ شخص رفتہ رفتہ یمن کا خود مختار بادشاہ بن گیا، مگر برائے نام اس نے شاہِ حبش کی بالادستی تسلیم کر رکھی تھی اور اپنے آپ کو مُفوّضُ المُلک (نائب شاہ) لکھتا تھا۔ اُس نے جو اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا اُس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ۵۴۳ء میں وہ سدِّ مارِب کی مرمّت سے فارغ ہوا تو اس نے ایک عظیم الشان جشن منایا جس میں قیصرِ روم، شاہِ ایران، شاہِ حِیرہ اور شاہِ غَسّان کے سفراء شریک ہُوئے۔ اس کا مفصّل تذکرہ اُس کتبے میں درج ہے جو ابرہہ نے سدِ مارب پر لگایا تھا۔ یہ کتبہ آج بھی موجود ہے اور گلیزر (Glaser) نے اس کو نقل کیا ہے۔

اہلِ عرب پر سیاسی، تجارتی اور مذہبی تسلُّط کی مہم

یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد اَبْرَہہ نے اُس مقصد کے لیے کام شروع کر دیا جو اِس مہم کی ابتداء سے رُومی سلطنت اور اُس کے حلیف حبشی عیسائیوں کے پیشِ نظر تھا، یعنی ایک طرف عرب میں عیسائیت پھیلانا اور دوسری طرف اُس تجارت پر قبضہ کرنا جو بلادِ مشرق اور رُومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ یہ ضرورت اس بنا پر اور بڑھ گئی تھی کہ ایران کی ساسانی سلطنت کے ساتھ روم کی کشمکش اقتدار نے بلادِ مشرق سے رومی تجارت کے دوسرے تمام راستے بند کر دیئے۔ اَبْرَہہ نے اس مقصد کے لیے یمن کے دار السلطنت صنعاء میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا جس کا ذکر عرب مؤرخین نے

اُلقُلَیس یا اَلقُلَیس یا اَلقُلَیس کے نام سے کیا ہے (یہ یونانی لفظ Ekklesia کا مُعرّب ہے اور اُردو کا لفظ کلیسا بھی اسی یونانی لفظ سے ماخوذ ہے)۔ محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اُس نے شاہِ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا[1]۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اُس نے یمن میں علی الاعلان اپنے اِس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی مُنادی کرادی۔ اُس کی اِس حرکت کا مقصد ہمارے نزدیک یہ تھا کہ عربوں کو غصّہ دلائے تاکہ وہ کوئی ایسی کارروائی کریں جس سے اُس کو مکّہ پر حملہ کرنے اور کعبے کو منہدم کر دینے کا بہانہ مل جائے۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ اُس کے اِس اعلان پر غضبناک ہو کر ایک عرب نے کسی نہ کسی طرح کلیسا میں گھُس کر رفعِ حاجت کر ڈالی۔ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ یہ فعل ایک قریشی نے کیا تھا۔ اور مُقاتِل بن سُلیمان کی روایت ہے کہ قریش کے بعض نوجوانوں نے جاکر اِس کلیسا میں آگ لگا دی تھی۔ ان میں سے کوئی واقعہ بھی اگر پیش آیا ہو تو کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے، کیونکہ ابرہہ کا یہ اعلان یقیناً سخت اشتعال انگیز تھا اور قدیم جاہلیت کے دَور میں اس پر کسی عرب، یا قریشی کا، یا چند نوجوانوں کا مشتعل ہو کر کلیسا کو گندا کر دینا یا اس میں آگ لگا دینا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ اَبرَہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے خفیہ طور پر ایسی کوئی حرکت کرائی ہو تاکہ اُسے مکّہ پر چڑھائی کرنے کا بہانہ مل جائے اور اس طرح وہ قریش کو تباہ اور تمام اہلِ عرب کو مرعوب کر کے اپنے دونوں مقصد حاصل کرلے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، جب اَبرَہہ کے پاس یہ رپورٹ پہنچی کہ کعبے کے معتقدین نے اس کے کلیسا کی یہ توہین کی ہے تو اُس نے قسم کھائی کہ میں اُس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک کعبے کو ڈھا نہ دوں۔

مکّہ پر اَبرَہہ کی لشکر کشی

اس کے بعد وہ سنہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں ۶۰ ہزار فوج اور ۱۳ ہاتھی (اور بروایت بعض ۹ ہاتھی) لے کر مکّہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں پہلے یمن کے ایک سردار ذُو نَفَر نے عربوں کا ایک لشکر جمع کر کے اس کی مزاحمت کی، مگر وہ شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ پھر خَثعَم کے علاقے میں ایک عرب سردار نُفَیل بن حبیب خَثعَمی اپنے قبیلے کو لے کر مقابلے پر آیا، مگر وہ بھی شکست کھا کر گرفتار ہو گیا اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے اَبرَہہ کی خدمت انجام دینا قبول کر لیا۔ طائف کے قریب پہنچا تو بنی ثقیف نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی طاقت کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے، اور ان کو

---

[1] یمن پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ کعبہ کے مقابلے میں ایک دوسرا کعبہ بنائیں اور عرب میں اُس کی مرکزیت قائم کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے نجران میں بھی ایک کعبہ بنایا تھا جس کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ (مؤلف)

خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ اُن کے معبُود لات کا مندر بھی تباہ نہ کر دے۔ چنانچہ ان کا سردار مسعُود ایک وفد لے کر اَبرَہہ سے ملا اور اُس نے کہا کہ ہمارا بُت کدہ وہ معبد نہیں ہے، جسے آپ ڈھانے آتے ہیں، وہ تو مکّہ میں ہے اس لیے آپ ہمارے معبد کو چھوڑ دیں، ہم مکّہ کا راستہ بتانے کے لیے آپ کو بدرقہ فراہم کیے دیتے ہیں۔ اَبرَہہ نے یہ بات قبول کر لی اور بنی ثقیف نے ابو رِغال نامی ایک آدمی کو اس کے ساتھ کر دیا۔ جب مکّہ تین کوس رہ گیا تو المُغَمَّس (یا المُغَمِّس) نامی مقام پر پہنچ کر ابو رِغال مرگیا اور عرب مُدّتوں تک اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے بنی ثقیف کو بھی وہ سالہا سال تک طعنے دیتے رہے کہ انہوں نے لات کے مندر کو بچانے کے لیے بیت اللہ پر حملہ کرنے والوں سے تعاون کیا۔

اہلِ مکّہ کا جوابی طرزِ عمل

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ المغمّس سے اَبرَہہ نے اپنے مقدمۃ الجیش کو آگے بڑھایا اور وہ اہلِ تہامہ اور قُریش کے بہت سے مویشی لُوٹ لے گیا جن میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دادا عبد المُطَّلِب کے بھی دو سو اُونٹ تھے۔ اس کے بعد اُس نے اپنے ایک ایلچی کو مکّہ بھیجا اور اس کے ذریعہ سے اہلِ مکّہ کو یہ پیغام دیا کہ مَیں تم سے لڑنے نہیں آیا ہُوں بلکہ اِس گھر (کعبہ) کو ڈھانے آیا ہُوں۔ اگر تم نہ لڑو تو مَیں تمہاری جان و مال سے کوئی تعرُّض نہ کروں گا۔ نیز اس نے اپنے ایلچی کو ہدایت کی کہ اہلِ مکّہ اگر بات کرنا چاہیں تو ان کے سردار کو میرے پاس لے آنا۔ مکّے کے سب سے بڑے سردار اُس وقت عبد المُطَّلِب تھے۔ ایلچی نے ان سے مل کر اَبرَہہ کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے کہا کہ ہم میں اَبرَہہ سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے، وہ چاہے گا تو اپنے گھر کو بچالے گا۔ ایلچی نے کہا کہ آپ میرے ساتھ اَبرَہہ کے پاس چلیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور اس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ اس قدر وجیہ اور شاندار شخص تھے کہ ان کو دیکھ کر ابرہہ بہت متاثر ہوا اور اپنے تخت سے اُتر کر ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر پُوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے جو اونٹ پکڑ لیے گئے ہیں وہ مجھے واپس دے دیے جائیں۔ اَبرَہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو مَیں بہت متاثر ہُوا تھا مگر آپ کی اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا کہ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے دینِ آبائی کا مرجع ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ انہوں نے کہا مَیں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہُوں اور انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہُوں۔ رہا یہ گھر تو اس کا ایک رب ہے، وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔ اَبرَہہ نے جواب دیا وہ اس کو مجھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبد المُطَّلِب نے کہا آپ جانیں اور وہ جانے۔ یہ کہہ کر وہ اَبرَہہ کے پاس سے اُٹھ آئے اور اُس نے اُن کے اُونٹ واپس کر دیے۔

ابن عباسؓ کی روایت اس سے مختلف ہے۔ اُس میں اونٹوں کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عبد بن حُمَید

ابن المُنذِر، ابن مَردُویَہ، حاکم، ابو نُعیم اور بَیہقی نے اُن سے جو روایات نقل کی ہیں ان میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب اَبرَہہ الصِفّاح کے مقام پر پہنچا (جو عرفات اور طائف کے پہاڑوں کے درمیان حُدودِ حَرَم کے قریب واقع ہے) تو عبدالمُطَّلِب خود اُس کے پاس گئے اور اس سے کہا آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے، ہم خود لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اُس نے کہا کہ مَیں نے سُنا ہے کہ یہ گھر امن کا گھر ہے، مَیں اس کا امن ختم کرنے آیا ہُوں۔ عبدالمطّلب نے کہا یہ اللہ کا گھر ہے، آج تک اُس نے کسی کو اس پر مُستلط نہیں ہونے دیا ہے۔ اَبرَہہ نے جواب دیا ہم اسے منہدم کیے بغیر نہ پلٹیں گے۔ عبدالمطّلب نے کہا آپ جو کچھ چاہیں ہم سے لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ مگر اَبرَہہ نے انکار کر دیا اور عبدالمُطَّلِب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

دونوں روایتوں کے اس اختلاف کو اگر ہم اپنی جگہ رہنے دیں اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیں تو ان میں سے جو صورت بھی پیش آئی ہو، بہر حال یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکّہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اِس لیے یہ بالکل قابلِ فہم بات ہے کہ قریش نے اُس کی مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ قریش کے لوگ تو جنگِ احزاب کے موقع پر مُشرک اور یہودی قبائل کو ملا کر زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار کی جمعیّت فراہم کر سکے تھے۔ وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے؟

محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ اَبرَہہ کی لشکر گاہ سے واپس آکر عبدالمُطَّلِب نے قُریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچّوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تاکہ ان کا قتلِ عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردار حَرَم میں حاضر ہُوئے اور کعبے کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اُس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اُس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ بُت موجود تھے، مگر یہ لوگ اس نازک گھڑی میں اُن سب کو بھُول گئے اور انہوں نے صرف اللہ کے آگے دستِ سوال پھیلایا۔ ان کی جو دُعائیں تاریخوں میں منقول ہوئی ہیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ ابنِ ہشام نے سیرت میں عبدالمطّلب کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں۔

لا ھُمّ ان العبد یمنع رحلہ فامنع حِلَالك

خدایا، بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما

لا یغلبنّ صلیبھم و محالھم غدوا محالك

کل ان کی صلیب اور ان کی تدبیر تیری تدبیر کے مقابلے میں غالب نہ آنے پائے۔

ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدالك

"اگر تو ان کو اور ہمارے قبلے کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہتا ہے تو جو تو چاہے کر۔"

سُہَیلی نے روض الانف میں اس سلسلے کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

وانصر علیٰ اٰل الصلیب وعابدیہ الیوم آلک

"صلیب کی آل اور اس کے پرستاروں کے مقابلے میں آج اپنی آل کی مدد فرما۔"

ابنِ جریر نے عبد المُطَّلِب کے یہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو اس موقع پر دُعا مانگتے ہوئے اُنہوں نے پڑھے تھے:

یا ربّ لا ارجو لھم سواکا یا ربّ فامنع منھم حِماکا

"اَے میرے رب تیرے سوا مَیں اُن کے مقابلے میں کسی سے اُمّید نہیں رکھتا۔ اَے میرے رب ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر۔"

انّ عدو البیت من عاداکا امنعھم ان یخربوا قراکا

"اس گھر کا دشمن تیرا دشمن ہے۔ اپنی بستی کو تباہ کرنے سے اُن کو روک۔"

حفاظتِ کعبہ کے لیے خدائی معجزہ

یہ دعائیں مانگ کر عبد المُطَّلِب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں میں چلے گئے اور دوسرے روز اَبْرَہَہ مکّے میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا، مگر اس کا خاص ہاتھی محمود جو آگے آگے تھا، یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تبر مارے گئے، آنکسوں سے کچوکے دیئے گئے، یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا، مگر وہ نہ ہلا۔ اُسے جنوب، شمال، مشرق کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا، مگر مکّے کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے بحرِ احمر کی طرف سے آئے اور انہوں نے اس لشکر پر سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ کنکر گرتے اُس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا۔ محمد بن اسحاق اور عِکْرِمہ کی روایت ہے کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بلادِ عرب میں سب سے پہلے چیچک اسی سال دیکھی گئی۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اُسے سخت کھجلی لاحق ہو جاتی اور کھُجاتے ہی جلد پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ ابنِ عباسؓ کی دوسری روایت یہ ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود اَبْرَہَہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا۔ افراتفری میں ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ نُفَیل بن حبیب خَثْعَمی کو جسے یہ لوگ بَدْرَقہ بنا کر بلادِ خَثْعَم سے پکڑ لائے تھے، تلاش کر کے اُنہوں نے کہا کہ واپسی کا راستہ بتائے۔ مگر اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا:

این المفرّ والالٰهُ الطالب والاشرم المغلوب لیس الغالب

اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے جبکہ خدا تعاقب کر رہا ہے اور نکٹا (اَبْرَہہ) مغلوب ہے، غالب نہیں ہے۔

اس بھگدڑ میں جگہ جگہ یہ لوگ گر گر کر مرتے رہے۔ عطاء بن یَسار کی روایت ہے کہ سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہو گئے، بلکہ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے۔ اَبْرَہہ بھی بلادِ خَثْعَم پہنچ کر مرا۔[1]

یہ واقعہ مُزدَلفہ اور مِنیٰ کے درمیان وادیٔ مُحَصَّب کے قریب مُحَسِّر کے مقام پر پیش آیا تھا۔ صحیح مُسلم اور ابوداؤد کی روایت کے مطابق رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حَجۃُ الوداع کا جو قصّہ امام جعفر صادقؒ نے اپنے والد ماجد امام محمد الباقرؒ سے اور انہوں نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے نقل کیا ہے اس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جب مُزدَلفہ سے مِنیٰ کی طرف چلے تو مُحَسِّر کی وادی میں آپ نے رفتار تیز کر دی۔ امام نَوَوِی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصحاب الفیل کا واقعہ اِسی جگہ پیش آیا تھا، اِس لیے سُنّت یہی ہے کہ آدمی یہاں سے جلدی گزر جائے۔ مُؤطّا میں امام مالکؒ روایت کرتے ہیں کہ حضوؐر نے فرمایا کہ مُزدَلفہ پُورا کا پُورا ٹھیرنے کا مقام ہے، مگر مُحَسِّر کی وادی میں نہ ٹھیرا جائے۔

عربی اَدَب میں اس واقعہ کی شہادتیں

نُفَیل بن حبیب کے جو اشعار ابن اسحاق نے نقل کیے ہیں ان میں وہ اس واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے۔

رُدَینۃُ لو رأیتِ ولا تَرِیہ لدی جنب المحصّب مارأینا

اَے رُدَینہ کاش تو دیکھتی، اور تو نہیں دیکھ سکے گی جو کچھ ہم نے وادیٔ مُحَصَّب کے قریب دیکھا۔

حمدتُ اللہ اذ ابصرتُ طیرًا وخفتُ حجارۃ تلقیٰ علینا

"مَیں نے اللہ کا شکر کیا جب مَیں نے پرندوں کو دیکھا اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر نہ آ پڑیں"

---

[1] اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے حبشی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل کے بعد یمن میں اُن کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی۔ جگہ جگہ یمنی سردار علمِ بغاوت لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے، پھر ایک یمنی سردار سیف بن ذی یَزَن نے شاہِ ایران سے فوجی مدد طلب کر لی اور ایران کی صرف ایک ہزار فوج جو چھ جہازوں کے ساتھ آئی تھی، حبشی حکومت کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہو گئی۔ یہ ۵۷۵ء کا واقعہ ہے (مؤلف)

وَکُل القَومِ یسْال عن نُفَیل　　　　کَاَنَّ علیّ للحبشان دَیناً

"ان لوگوں میں سے ہر ایک نُفَیل کو ڈھونڈھ رہا تھا، گویا کہ میرے اُوپر حبشیوں کا کوئی قرض تھا۔"

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہو گئی اور اس پر بہت سے شُعراء نے قصائد کہے۔ ان قصائد میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز قرار دیا اور کہیں اشارۃً و کنایۃً بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں اُن بتوں کا بھی کوئی دخل تھا جو کعبہ میں پُوجے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر عبداللہ ابن الزِّبَعرٰی کہتا ہے ؎

ستون الفاً لم یؤبوا ارضہم　　　　ولم یعش بعد الایاب سقیمہا

"۶۰ ہزار تھے جو اپنی سرزمین کی طرف واپس نہ جا سکے اور نہ واپس ہونے کے بعد ان کا بیمار (ابرہہ) زندہ رہا۔"

کانت بہا عاد و جرھم قبلہم　　　　واللہ من فوق العباد یقیمہا

"یہاں ان سے پہلے عاد اور جُرہُم تھے، اور اللہ بندوں کے اوپر موجود ہے جو اسے قائم رکھے ہوتے ہے۔"

ابو قُیَس بن اَسْلَت کہتا ہے :

فقوموا فصلّوا ربّکم و تمسّحوا　　　　بارکان ھٰذا البیت بین الاخاشب

"اُٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور مکّہ و منیٰ کی پہاڑیوں کے درمیان بیت اللہ کے کونوں کو مسح کرو۔"

فلمّا اتاکم نصر ذی العرش ردّھم　　　　جنود الملیک بین ساف وحاصب

"جب عرش والے کی مدد تمہیں پہنچی تو اُس بادشاہ کے لشکروں نے ان لوگوں کو اس حال میں پھیر دیا کہ کوئی خاک میں پڑا تھا اور کوئی سنگسار کیا ہوا تھا۔"

اس کے متعلق چند اہم روایتیں

یہی نہیں بلکہ حضرت اُمِّ ہانیؓ اور حضرت زُبیرؓ بن العوّام کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قریش نے ۱۰ سال (اور بروایتِ بعض سات سال) تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ اُمِّ ہانی کی روایت امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اور طَبَرانی، حاکم، ابن مَرْدُوْیَہ اور بَیْہقی نے اپنی کتبِ حدیث میں نقل کی ہے۔ حضرت زُبیرؓ کا بیان طَبَرانی اور ابنِ مَرْدُوْیَہ اور ابنِ عساکر نے روایت کیا ہے۔ اور اس کی تائیدِ مزید حضرت سعیدؓ بن المُسَیَّب کی اُس مُرسَل روایت ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ

میں درج کی ہے۔

حضورؐ کی ولادتِ مبارکہ

جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہلِ عرب اسے عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہتے ہیں، اور اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ محدثین اور مؤرخین کا اِس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ محرم میں پیش آیا اور حضورؐ کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپؐ کی ولادت واقعۂ فیل کے ۵۰ دن بعد ہوئی۔

قرآن میں اس واقعہ کا اِجمالی تذکرہ کیوں کیا گیا؟

جو تاریخی تفصیلات اوپر درج کی گئی ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر سُورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس سُورہ میں اس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب الفیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے۔ واقعہ کچھ بہت پُرانا نہ تھا۔ مکّے کا بچّہ بچّہ اس کو جانتا تھا۔ عرب کے لوگ عام طور پر اس سے واقف تھے۔ تمام اہلِ عرب اِس بات کے قائل تھے کہ ابرہہ کے اس حملے سے کعبے کی حفاظت کسی دیوی یا دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اللہ ہی سے قُریش کے سرداروں نے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اور چند سال تک قریش کے لوگ اس واقعہ سے اس قدر متأثر رہے تھے کہ انہوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اِس لیے سُورۂ فیل میں ان تفصیلات کے ذکر کی حاجت نہ تھی، بلکہ صرف اِس واقعے کو یاد دلانا کافی تھا، تاکہ قریش کے لوگ خصوصًا، اور اہلِ عرب عمومًا اپنے دلوں میں اِس بات پر غور کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمام معبُودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے، نیز وہ یہ بھی سوچ لیں کہ اگر اِس دعوتِ حق کو دبانے کے لیے انہوں نے زور زبردستی سے کام لیا تو جس عذاب نے اصحاب الفیل کا تہس نہس کیا تھا اسی کے غضب میں وہ گرفتار ہوں گے۔ [۴۷۵]

فصل ۷

عیسائیت بعثتِ خاتم النبیینؐ کے بعد

[الہامی کتب کے حامل ہونے کے لحاظ سے یہودی اور عیسائی دونوں گروہ اسلام سے اقرب ہونے چاہییں تھے کیونکہ اصلاً ان کا دین بھی اسلام ہی تھا۔ خصوصاً عیسائیوں کا تعلق تو دو وجوہ سے پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے اور بھی زیادہ گہرا ہونا چاہیے تھا۔ ایک یہ کہ حضورؐ کی دعوت حضرت مسیحؑ کے ماباقی کام کی تکمیل کا ذریعہ تھی، دوسرے یہ کہ یہودیوں سے کہیں بڑھ کر عیسائیوں کے مذہبی نوشتوں میں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیش گوئیاں موجود تھیں۔ جن کو جاننے والے بعض لوگ نبیؐ آخر الزماں کے منتظر تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں مشہور عیسائی بزرگ ورقہ بن نوفل بھی شامل ہیں۔ پھر یہ بھی دلچسپ امر ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کو عیسائیوں سے متعدد معاملات ایسے پیش آئے جن کی بنا پر عیسائیوں کا رویہ حضورؐ اور مسلمانوں کے متعلق مختلف ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہودیوں کی یہودیت اور عیسائیوں کی عیسائیت مسلمانوں کے حق میں ایک ایسا خلیج بن گئی جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا اور مسلمانوں کے بہترین رویے کا جواب شدید عناد سے دیا گیا، اور اس عناد کی تکمیلی صورت حروبِ صلیبیہ ہیں، اور حروبِ صلیبیہ کے بعد ملّتِ اسلام کے خلاف یہودیوں سمیت عیسائیوں کی عالمگیر پالیسیاں نہایت درجہ مکروہ رہی ہیں۔ ان تمہیدی اشارات کے ساتھ عنوان سے متعلق ضروری واقعات و احوال پیش کیے جاتے ہیں۔ (مرتبین)]

ورقہ بن نوفل کی تصدیقِ نبوّت[1]

(غارِ حرا میں فرشتے سے پہلی ملاقات کے بعد جب حضورؐ لرزتے اور کانپتے گھر پہنچے تو پہلے حضرت خدیجہؓ نے آپ کو

---

[1] (حاشیۂ مرتبین)۔ ورقہ بن نوفل سے پہلے بعض تاریخی روایات کے بموجب بحیرا راہب نے آنحضورؐ کو سفرِ شام میں دیکھا تو آپؐ میں آثارِ نبوّت کی جھلک پائی۔ اس سلسلے میں ابنِ خلدون نے یہ لکھا ہے:

"جب آپ نے ۱۲ برس کے ہو کر تیرھویں سال میں قدم رکھا تو ابو طالب کے ہمراہ شام کی طرف سفر کیا۔ بحیرا راہب نے آپؐ میں آثارِ نبوت دیکھ کر اپنی قوم کو طلب کیا، اور آپؐ کی نبوّت سے ان کو مطلع

تسکین دی، پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو ان کے چچا زاد بھائی تھے، زمانۂ جاہلیت میں

۴- کیا جس کا قصّہ کتبِ سِیَر میں موجود و مشہور ہے۔ پھر دوبارہ آپؐ حضرت اُمّ المومنین خدیجۃ الکبریٰ بنت خُوَیلد ابن اسد بن عبدالعُزّیٰؓ کا تجارتی سامان لے کر ان کے غلام مَیسرہ کے ہمراہ شام میں تشریف لے گئے۔ نسطورا راہب کی طرف جس وقت آپؐ کا گذر ہُوا، اُس نے آپ میں شانِ نبوّت دیکھ کر میسرہ کو آپؐ کے حالات سے آگاہ کیا۔ اس نے واپسی پر حضرت خدیجہؓ کو کل واقعات سے آگاہ کیا حضرت خدیجہؓ نے یہ سُن کر خود کو آپؐ کی زوجیت میں دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔" (اُردو ترجمہ تاریخ ابنِ خلدون ج ۱- از علامہ حکیم احمد حسن عثمانی- ص ۳۵)

یہ روایت تاریخی تحقیق کے لحاظ سے وقعت حاصل کر سکے یا نہ کر سکے (جیسا کہ مؤلّف رحمۃ للعالمین سرے سے اِس واقعہ کی صحت سے انکار کرتے ہیں، کیونکہ ترمذی کی جس حدیث میں اس کا تذکرہ ہے اس میں دوسری غلط باتیں مذکور ہیں جن پر علّامہ ابنِ قیّم نے گرفت کی ہے) مجرّد یہ بات بعید از امکان نہیں کہ حضورؐ کے چہرۂ وجاہت اور شخصیت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ رائے قائم کرے کہ جس نبیٔ موعود کا تصوّر قدیم نوشتوں میں پایا جاتا ہے وہ یہی ہستی ہے۔ اور دو عیسائی راہبوں (بحیرا اور نسطورا) کا حضورؐ کو بچپن میں دیکھ کر آپؐ میں آثارِ نبوّت محسوس کر لینا عیسائیوں کے لیے کسی نہ کسی درجے کی ایک حُجّت بھی ہے۔ عیسائی اگر اپنے دو راہبوں کی طرف سے حضورؐ میں آثارِ نبوّت محسوس کرنے کی روایت کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر انہیں یہ بھی ماننا چاہیے کہ کسی ہونے والے نبی کو جس پر وحی آنے والی ہو، کسی غیر نبی کی طرف سے کارِ نبوّت کے متعلق کچھ سکھانے پڑھانے کی احتیاج نہیں ہو سکتی۔ بحیرا راہب کی روایت پر عیسائیوں نے ایک غلط بحث کا جو محل کھڑا کیا ہے اس کی تردید مولانا مودودی نے یوں کی ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہم عصر دشمنوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تم بچپن میں جب بحیرا راہب سے ملے تھے اُس وقت یہ سارے مضامین تم نے سیکھ لیے تھے۔ اور نہ یہ کہا کہ جوانی میں جب تجارتی سفروں کے سلسلے میں تم باہر جایا کرتے تھے اُس زمانے میں تم نے عیسائی راہبوں اور یہودی ربّیوں سے یہ معلومات حاصل کی تھیں، اِس لیے کہ اِن سارے سفروں کا حال اُن کو معلوم تھا۔ یہ سفر اکیلے نہیں ہوتے تھے، اُن کے اپنے قافلوں کے ساتھ ہوتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان میں کچھ سیکھ آنے کا الزام ہم لگائیں گے تو ہمارے اپنے ہی شہر میں سینکڑوں زبانیں ہم کو جھٹلا دیں گی۔ اس کے علاوہ مکّے کا ہر عام آدمی پُوچھے گا کہ اگر یہ معلومات اس شخص کو بارہ تیرہ برس کی عمر میں بحیرا سے حاصل ہو گئی تھیں، یا ۲۵ برس کی عمر سے جب کہ اس نے تجارتی سفر شروع کیے تھے، حاصل ہونی شروع ہو گئی تھیں، تو آخر یہ شخص کہیں باہر تو نہیں رہتا تھا۔ ہمارے ہی درمیان بستا تھا۔ کیا وجہ ہے کہ چالیس برس کی عمر تک یہ سارا علم اس سے چُھپا رہا۔

عیسائی ہو گئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا "بھائی جان! ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سُنیے۔" ورقہ نے حضورؐ سے کہا "بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔ ورقہ نے کہا "یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ کاش کہ میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اُس وقت تک زندہ رہوں، جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" ورقہ نے کہا "ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لاتے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔ . . . . . ورقہ بن نوفل مکہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آ رہے تھے اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپؐ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی جب یہ واقعہ سُنا تو اُسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہ تھا۔"[۲۷۶]

عیسائی سلطنت میں مسلمانوں کی ہجرتِ اولیٰ

(مکہ میں) حالات جب ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ عام الفیل (۵ سنہ نبوی) میں حضورؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ لو خرجتم الی ارض الحبشۃ فان بھا ملکا لا یظلم عندہ احد وھی ارض صدق حتّٰی یجعل اللہ لکم فرجا مما انتم فیہ "اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے جب تک اللہ تمہاری اِس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے، تم لوگ وہاں ٹھیرے رہو۔"[۱]

اِس ارشاد کی بنا پر پہلے گیارہ مردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی۔ قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا، مگر خوش قسمتی سے شعیبہ کے بندرگاہ پر ان کو بروقت حبش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی یہاں تک کہ ۸۳ مرد گیارہ عورتیں اور ۷ غیر قریشی

---

[۱] حبش کی عیسائی سلطنت کے متعلق آنحضورؐ نے کیسی کشادہ دلی سے کلماتِ تحسین کہے ہیں، اور وہاں کے حکمراں کی انصاف پسندی کو پیشِ نظر رکھ کر مسلمانوں کو حبشہ میں ہجرت کرنے کا یہی ایک واقعہ اس بات کو کافی تھا کہ عیسائیوں کے تعلقات مسلمانوں کے ساتھ بہترین صورت میں اُستوار ہوتے مگر افسوس کہ ان لوگوں نے تعصبات کی دیواریں کھڑی کر لیں۔ (مرتبین)

مسلمان حبش میں جمع ہو گئے اور مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ صرف ۴۰ آدمی رہ گئے [۲۷۸]

حبشہ کے عیسائی بادشاہ کی حق پسندی

آگے چل کر ہجرتِ حبشہ کا واقعہ تفصیل سے آئے گا۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا مطلوب ہے کہ مسلمان مہاجرین کے خلاف جب ان کے تعاقب میں آنے والے مشرکینِ مکّہ کی سفارت نے اپنا دعویٰ پیش کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت اور دعوت پر انہوں نے اعتراض اٹھائے تو عیسائی بادشاہ نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے حضورؐ پر نازل شدہ کلام کا کوئی حصّہ سنانے کی فرمائش کی۔

حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورۂ مریم کا وہ ابتدائی حِصّہ سُنایا جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السّلام سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سُنتا رہا اور روتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہو گئی۔ جب حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ "یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں[ل]"۔ [۲۷۹]

مکّہ کی اس سفارت نے حبشہ کے درباری مذہبی پیشواؤں کو رشوتیں دے دلا کر اپنے ساتھ ملایا اور اگلے دن دربار میں عمرو بن العاص نے یہ سوال اٹھایا کہ :

"ذرا ان لوگوں کو بلا کر یہ تو پُوچھیے کہ عیسیٰؑ ابن مریم کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے"۔

نجاشی نے پھر مہاجرین کو بلا بھیجا . . . . ۔ اور عمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال ان کے سامنے دوہرایا تو جعفرؓ بن ابی طالب نے اُٹھ کر بلا تامّل کہا کہ ھو عبد اللہ ورسولہ وروحہ وکلمۃ اللہ القاھا الیٰ مریم العذراء البتول"۔

"نجاشی نے یہ سُن کر ایک تنکا زمین سے اُٹھایا اور کہا : خدا کی قسم جو کچھ تم نے کہا ہے، عیسیٰؑ اُس سے اِس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے"۔ [۲۸۰]

ل یُوں تو مکّہ کے مُسلم مہاجرین جس بادشاہ کے دربار میں پیش ہُوئے تھے اُس نے مسلمانوں کے عقیدہ و موقف کی توثیق کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کی تصدیق - اس لحاظ سے شاہِ نجاشی کا موقف اقرب بہ اسلام تھا۔

بعد میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کو مکاتیب کے ذریعے دعوتِ اسلام دی تو ایک نامۂ مبارک بادشاہِ حبش کو بھی روانہ کیا جس کا نام اَصحمہ بن ابجر تھا۔

اس شخص نے حضورؐ کی دعوت قبول کی اور جواباً خط لکھا۔

(رحمۃ للعالمین از قاضی سلمان منصور پوری

ج ۱ - ص ۲۰۹ تا ۲۱۲) (مرتبین)

حبش کے لیے مسلمانوں کا خاص رویّہ

ابو داؤد اور مسندِ امام احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ملتا ہے جس میں حبش کے متعلق آپ نے یہ پالیسی متعین فرما دی تھی کہ دعوا الحبشۃ ما دعوکم دوسری روایت کے الفاظ ہیں اترکوا الحبشۃ ما ترکوکم یعنی "حبش کے لوگ جب تک تمہیں چھوڑے رکھیں تم بھی اُنہیں چھوڑے رکھو"۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خلفائے راشدین کے دَور میں حبش کی طرف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اِس ارشاد میں جو مصلحت تھی ممکن ہے کہ اس میں کسی حد تک اِس بات کا لحاظ بھی ہو کہ اہلِ حبش نے مسلمانوں کو ان کی مصیبت کے وقت جو پناہ دی تھی اس کی رعایت کی جائے اور اپنی طرف سے ان کے خلاف پہل نہ کی جائے تاکہ دنیا کو کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہو سکے کہ مسلمان ایک احسان فراموش جماعت ہیں۔ لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ حبش کی جغرافی پوزیشن، اور اس کی سابق تاریخ کو دیکھتے ہوئے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرمایا گیا کہ اسلام کے جغرافی مرکز یعنی حجاز کے تحفظ کے لیے حبش سے تعلقات کا درست رہنا ضروری ہے۔ اسی مصلحت سے آپ نے یہ ہدایت فرمائی ہو گی کہ جہاں تک اسلام کی دعوت کا تعلق ہے وہ پُرامن طریقہ سے اس ملک میں پھیلائی جاتی رہے، لیکن جنگ سے حتی الامکان پرہیز کیا جائے۔ [۴۸۱]

مُقَوقِسِ مصر کا رویہ

صلح حُدَیبیہ سے فارغ ہونے کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط اطراف و نواح کے بادشاہوں کو[۱]

---

[۱] رحمۃ للعٰلمین جلد اوّل (ص ۲۰۶ تا ۲۲۴) کے بموجب یکم محرّم ۷ھ کو حضورؐ نے جن مختلف حکمرانوں کے نام دعوتی مکاتیب لکھوا کر اپنے سفیروں کے ہاتھ روانہ کیے تھے، ان میں سے بیشتر عیسائی تھے، اور ان کا ردِّ عمل بھی بہتر رہا۔ حبش کے شاہِ نجاشی اَصحمہ بن الجبر نے اسلام قبول کر لیا۔ بحرین کا حاکم منذر بن ساوی مسلمان ہو گیا اور اس کی رعایا میں سے بھی بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ عمان کے حکمرانوں جیفر و عبد فرزندانِ جلیدی نے بھی غور و تامل کے بعد اسلام کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ دمشق کا حاکم منذر بن حارث بن ابو شمر پہلے تو حضورؐ کا خط پا کر بگڑا پھر اپنے اُوپر قابو پا کر سفیر کو باعزاز رخصت کیا۔ یمامہ کے حاکم ہوذہ بن علی نے اسلامی حکومت میں سے نصف حصہ کا مطالبہ کیا اور چند ہی روز بعد ہلاک ہو گیا۔ بیت المَقدِس میں شاہِ قسطنطنیہ کے تحت ہِرَقل فرماں روا تھا۔ اس نے نامۂ نبوی کے موصُول ہونے پر بڑا دربار منعقد کیا۔ آنحضورؐ کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کے لیے پوری تدبیر کی۔ اتفاق سے ابوسفیان تجارت کے لیے وہاں گیا ہوا تھا، اسے دربار میں بُلا کر سرکارِ رسالتمآبؐ کے متعلق ایسے سوالات کیے جن سے وہ ان کے لیے نبی ہونے کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ آخر میں اس نے ابوسفیان کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا تاثر یوں بیان کیا:

(باقی ص۷۰۸ پر)

بھیجے تھے اُن میں سے ایک اسکندریہ کے رُومی بطریق (Patriarch) کے نام بھی تھا جسے عرب مُقَوقس کہتے تھے۔ حضرت حاطب بن ابی بَلْتَعَہ یہ نامۂ گرامی لے کر جب اُس کے پاس پہنچے تو اُس نے اسلام تو قبول نہ کیا، مگر اُن کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور جواب میں لکھا کہ "مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک نبی آنا ابھی باقی ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وہ شام میں نکلے گا۔ تاہم میں آپ کے ایلچی کے ساتھ احترام سے پیش آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں دو لڑکیاں بھیج رہا ہوں جو قبطیوں میں بڑا مرتبہ رکھتی ہیں" (ابن سعد)۔ ان لڑکیوں میں سے ایک سیرین تھیں اور دوسری ماریہ قبطیہ (عیسائی حضرت مریمؑ کو ماریہ (Mary) کہتے ہیں)۔ مصر سے واپسی پر راستہ میں حضرت حاطب نے دونوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ ایمان لے آئیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے سیرین کو حضرت حسّان بن ثابتؓ کی مِلکِ یمین میں دے دیا اور حضرت ماریہؓ کو اپنے حرم میں داخل فرمایا۔ ذی الحجہ ۸ھ میں انہی کے بطن سے حضوؐر کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے (الاستیعاب۔ الاصابہ)۔

آنحضوؐر اور نجران کے عیسائی

۹ھ ہجری میں نجران کی عیسائی جمہوریّت کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے۔ اُس وقت اس علاقے میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی اور تین سرداروں کے زیرِ حکم تھی۔ ایک عاقِب کہلاتا تھا جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی۔ دوسرا سیّد کہلاتا تھا جو ان کے تمدّنی و سیاسی اُمور کی نگرانی کرتا تھا۔ اور تیسرا اُسقف (بشپ) تھا جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ فتح کیا اور تمام اہلِ عرب کو یقین ہو گیا کہ ملک کا مستقبل اب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ میں ہے، تو عرب کے مختلف گوشوں سے آپؐ کے پاس وفد آنے شروع ہو گئے۔ اسی سلسلے میں نجران کے تینوں سردار

(بقیہ حاشیہ ص۷۰۷) "نبیِٔ موعود کی یہی علامتیں ہم کو بتائی گئی ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھتا تھا کہ وہ عرب میں سے ہو گا۔ ابُوسفیان! اگر تم نے سچ سچ جواب دیئے ہیں تو وہ ایک روز اِس جگہ کا جہاں میں بیٹھا ہُوا ہُوں (شام و بیت المَقدِس) ضرور مالک ہو جائے گا۔ کاش میں ان کی خدمت میں پہنچ سکتا اور نبی کے پاؤں دھویا کرتا۔" (رحمۃ للعٰلمین، ج ۱)

فروہ بن عَمرو خُزاعی جو علاقہ شام پر قیصر کی طرف سے گورنر تھا، مسلمان ہو گیا۔ قیصر نے اُسے بُلا کر حکم دیا کہ اسلام چھوڑ دے۔ فروہ نے انکار کیا۔ جس کے نتیجے میں پہلے اسے قید کیا گیا، پھر شہید کر دیا گیا۔ اسی سلسلے میں مُقوقِس مصر کو جو خط لکھا گیا تھا اس کے بارے میں فاضل مؤلف نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ اوپر پیش کر دیا گیا ہے۔ (مُرتّبین)

بھی ۴۰ آدمیوں کا ایک وفد لے کر مدینے پہنچے[1] ۹ھ / ۶۳۱ء

خاتمہ فصل بہ الفاظِ مرتبین

دو چیزیں اور ایسی ہیں جو اس فصل سے متعلق ہیں۔ ایک یہ کہ روم و ایران کی کشمکش میں مسلمانوں کی اخلاقی ہمدردیاں عیسائیوں کے ساتھ تھیں، اور دوسری یہ کہ تبوک میں مسلمان عیسائیوں کے خلاف برسرِ پیکار ہونے پر مجبور ہوئے۔

ان میں سے روم و ایران کی کشمکش کا مفصّل قصّہ تو غلبۂ روم کی پیشین گوئی (ملاحظہ ہو جلد اوّل کا باب: پیشینگوئیاں) کے زیرِ عنوان درج ہے۔ اور غزوۂ تبوک کا بیان غزوات کے سلسلے میں جلد سوم میں شامل ہے۔

---

[1] اس موقع پر وفد کے سامنے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے قرآن کی دعوتِ توحید پیش کی اور سلسلۂ نبوّت کی حقیقت واضح کرتے ہوئے عیسائیوں کے عقیدۂ اُلوہیتِ عیسیٰؑ اور دوسرے غلط تصورات کا ابطال کیا۔ اس دعوت سے وفد کے بعض لوگ متاثر ہو گئے مگر اُن کے سرکردہ اُسقفوں اور پادریوں کی ہٹ دھرمی بیچ میں رکاوٹ بن گئی۔ اس پر خدا کے حکم سے حضورؐ نے ان کو دعوتِ مباہلہ دی کہ اگر تمہیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے ساتھ مل کر خدا سے دُعا کرو کہ جو جھوٹا ہو اُس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی بھی اس کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس سے وفد کے صاف دل ارکان کے علاوہ دوسرے عیسائی اور غیر عیسائی عوام پر بھی یہ حقیقت کھُل گئی کہ مسیحیت کے نجرانی پیشوا ایسے عقائد پر چل رہے ہیں جن پر خود ان کو بھی پورا یقین نہیں ہے۔

آخر کار اہلِ نجران کی درخواست پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک صلحنامہ انہیں لکھ کر دیا جسے ہم واقعاتی حصّے میں درج کر رہے ہیں (مُرتّبین)

جلد اوّل ——————— حصّہ ۴

بعثت سے پہلے کا ماحول

جزیرۃ العرب کی

جُغرافی وتمدّنی اہمیّت

باب ۱۸

مختلف ممالک سے عربوں کے وسیع رابطے

قبل اسلام کے عرب کی معاشی تاریخ اور بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عرب دنیا سے الگ تھلگ پڑا ہوا ایک ملک نہ تھا جس کے باشندے اپنی وادیوں اور صحراؤں سے باہر کی دنیا کو کچھ نہ جانتے تھے۔

وسیع علاقوں کا تجارتی مرکز

زمانۂ قدیم کی تاریخ سے متعلق جو مواد آج دنیا میں موجود ہے۔ اس سے یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ اُس زمانے میں چین، ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک کی اور اسی طرح مشرقی افریقہ کی جتنی تجارت بھی مصر، شام، ایشیائے کوچک، یونان اور رُوم کے ساتھ ہوتی تھی وہ سب عربوں کے واسطے سے ہوتی تھی۔ اس تجارت کے تین بڑے راستے تھے۔ ایکؔ ایران سے خشکی کا راستہ جو عراق اور شام ہوتا ہوا جاتا تھا۔ دوسرؔا خلیج فارس کا بحری راستہ جس سے تمام تجارتی سامان عرب کے مشرقی سواحل پر اُترتا اور دُومۃ الجندل یا تدمُر (Palmyra) ہوتا ہوا آگے جاتا تھا۔ تیسرؔا بحرِ ہند کا راستہ جس سے آنے جانے والے تمام اموالِ تجارت حضر موت اور یمن سے گزرتے تھے۔ یہ تینوں راستے وہ تھے جن پر عرب آباد تھے۔ عرب خود بھی ایک طرف سے مال خرید کرنے جاتے اور دوسری طرف اُسے فروخت کرتے تھے۔ حمل و نقل کا کاروبار (Carrying Trade) بھی کرتے تھے۔ اور اپنے علاقے سے گزرنے والے قافلوں سے بھاری ٹیکس لے کر انہیں بحفاظت گزارنے کا ذمّہ بھی لیتے تھے۔ ان تینوں صورتوں سے ہمیشہ بین الاقوامی تجارت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ ۲۷۰۰ برس قبل مسیح سے یمن اور مصر کے تجارتی تعلقات کا صاف ثبوت ملتا ہے۔ ۱۷۰۰ برس قبل مسیح میں بنی اسماعیل کے تجارتی قافلوں کی سرگرمیوں پر توراۃ شہادت دیتی ہے۔ شمالی حجاز میں مَدین (مدیان)، اور دِدان (Dedan) کی تجارت ڈیڑھ ہزار برس قبل مسیح اور اس کے بعد کئی صدی تک چلتی نظر آتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ و داؤدؑ کے زمانے (ایک ہزار قبل مسیح) سے یمن کے سبائی قبائل اور ان کے بعد حِمیَری قبیلے ابتدائی مسیحی صدیوں تک مسلسل

تجارتی نقل وحرکت کرتے رہے ہیں۔ مسیح علیہ السّلام سے لگ بھگ زمانے میں فلسطین کے یہودی عرب آکر خیبر، وادی القریٰ (موجودہ العُلاء)، تیماء اور تبوک میں آباد ہوئے اور ان کے دائمی تعلقات مذہبی اور ثقافتی بھی اور تجارتی بھی، شام وفلسطین اور مصر کے یہودیوں کے ساتھ برقرار رہے۔ عرب میں شام اور مصر سے غلّہ اور شراب درآمد کرنے کا کام زیادہ تر یہی یہودی کرتے تھے۔ پانچویں صدی سے قریش نے عرب کی بیرونی تجارت میں غالب حصّہ لینا شروع کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد تک ایک طرف یمن اور حبش سے، دوسری طرف عراق سے اور تیسری طرف مصر وشام سے ان کے نہایت وسیع تجارتی تعلقات تھے۔ مشرقی عرب میں ایران کی جتنی تجارت یمن کے ساتھ تھی اس کا بہت بڑا حصّہ حِیرَہ سے یمامہ موجودہ (ریاض)، اور پھر بنی تمیم کے علاقے سے گزرتا ہوا نجران اور یمن جاتا تھا۔

سیاسی اور ثقافتی رابطے

ان تجارتی تعلقات کے علاوہ سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے بھی عرب کے لوگوں کا اپنے گردوپیش کی مہذب دُنیا سے گہرا رابطہ تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں شمالی حجاز کے مقام تیماء کو بابل کے بادشاہ نیبو نیدوس (Nabonidus) نے اپنا گرمائی دارالسلطنت بنایا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ بابل میں جو معاشی قوانین اور طریقے رائج تھے ان سے حجاز کے لوگ بے خبر رہ گئے ہوں۔ تیسری صدی قبل مسیح سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد تک پہلے بطرا (Petra) کی نَبَطی ریاست، پھر تَدمُر کی شامی ریاست اور اس کے بعد حِیرَہ اور غَسّان کی عربی ریاستیں عراق سے مصر کے حدود تک اور حجاز ونجد کے حدود سے الجزیرہ اور شام کے حُدود تک مسلسل قائم رہیں۔ ان ریاستوں کا ایک طرف یونان ورُوم سے اور دوسری طرف ایران سے نہایت گہرا سیاسی، تمدّنی، تہذیبی اور معاشی تعلق رہا ہے۔ پھر نسلی رشتوں کی بنا پر اندرونِ عرب کے قبائل بھی ان کے ساتھ وسیع تعلقات رکھتے تھے۔ مدینہ کے انصار اور شام کے غَسّانی فرمانروا ایک ہی نسل سے تھے اور ان کے درمیان پیہم تعلقات قائم رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد میں خود آپ کے خاص شاعر حضرت حسّان بن ثابت غَسّانی اُمراء کے ہاں آتے جاتے تھے۔ حِیرَہ کے اُمراء سے قُریش والوں کا بہت میل جول تھا حتیٰ کہ قریش کے لوگوں نے لکھنا پڑھنا بھی انہی سے سیکھا اور حِیرَہ ہی سے وہ رسم الخط انہیں ملا جو بعد میں خطِ کوفی کے نام سے مشہور ہُوا۔

مزید برآں عرب کے ہر حصّے میں شیوخ، اشراف اور بڑے بڑے تاجروں کے پاس رومی، یونانی اور ایرانی لونڈیوں اور غلاموں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ایران ورُوم کی لڑائیوں میں دونوں طرف کے جو جنگی قیدی غلام بنائے جاتے تھے ان میں سے زائد از ضرورت تعداد کو کھلے بازار میں فروخت کر دیا جاتا تھا، اور عرب اس مال کی بڑی منڈیوں میں سے ایک تھا۔ ان غلاموں میں اچھے خاصے پڑھے لکھے مہذّب لوگ بھی ہوتے تھے اور

صنعت پیشہ اور تجارت پیشہ لوگ بھی۔ عرب کے شیوخ اور تجار اُن سے بہت کام لیتے تھے۔ مکہ، طائف یثرب اور دوسرے مرکزوں میں ان کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور یہ کاریگروں کی حیثیت سے اپنے آقاؤں کی قیمتی خدمات بجالاتے تھے۔

مخصوص معاشی صورتِ حال

اس کے ساتھ عرب کی معاشی تاریخ کا ایک اور پہلو بھی نگاہ میں رہنا چاہیے۔ عرب کسی زمانہ میں بھی نہ تو خوراک کے معاملہ میں خود کفیل رہا ہے اور نہ وہاں ایسی صنعتوں کو فروغ نصیب ہوا ہے جن سے تمام ضرورت کے سامان ملک ہی میں فراہم ہو جاتے ہوں۔ اس ملک میں ہمیشہ اشیائے خوردنی بھی باہر سے درآمد ہوتی رہی ہیں اور ہر طرح کی مصنوعات بھی حتیٰ کہ پہننے کے کپڑے تک زیادہ تر باہر ہی سے آتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب کے عہد میں یہ درآمدی تجارت زیادہ تر دو گروہوں کے ہاتھ میں تھی۔ ایک قریش اور بنی ثقیف، دوسرے یہود۔ لیکن یہ لوگ مال درآمد کر کے صرف تھوک فروشی ہی کرتے تھے۔ اندرونِ ملک کی چھوٹی چھوٹی بستیوں اور قبائلی ٹھکانوں میں خردہ فروشی کرنا ان کا کام نہ تھا، نہ ہو سکتا تھا، اور نہ قبائل اِس بات کو گوارا کر سکتے تھے کہ سارے تجارتی فائدے یہی لوگ لُوٹ لے جائیں اور ان کے اپنے آدمیوں کو اِس اجارہ داری میں گھُسنے کا کسی طرف سے راستہ نہ ملے۔ اس لیے تھوک فروش کی حیثیت سے یہ لوگ اندرونِ ملک کے خردہ فروش تاجروں کے ہاتھ لاکھوں روپے کا مال فروخت کرتے تھے اور اس کا ایک معتدبہ حصّہ اُدھار فروخت ہوتا تھا۔ [۴۸۴]

سیاسی نقشۂ احوال

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے وقت آپؐ کے وطن کی سیاسی حالت کیا تھی؟ اور اس حالت میں آپؐ نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت عرب ہر طرف ظالم سلطنتوں سے گھرا ہوا تھا اور خود ملک کے اندر ہمسایہ قوموں کا امپیریلزم نفوذ کر چکا تھا۔ آپؐ کی پیدائش سے چند ہی روز قبل حبشی فوجیں یلغار کرتی ہوئی خاص اُس شہر تک پہنچ گئی تھیں جس میں آپؐ پیدا ہوئے۔ عرب کا سب سے زیادہ زرخیز صُوبہ یمن پہلے حبشیوں کے اور پھر ایرانیوں کے تسلط میں جا چکا تھا۔ عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل ایرانیوں کے زیرِ اثر تھے۔ عراقِ عرب کا علاقہ نجد کے حُدُود تک ایرانیوں کے اثر میں تھا۔ شمال میں عَقَبہ اور مَعان تک، بلکہ تَبوک تک سلطنتِ روم کے اثرات پہنچے ہوئے تھے۔ دونوں ہمسایہ سلطنتیں عرب کے قبائل کو اپنی اغراض کے لیے ایک دوسرے سے لڑاتی تھیں اور اندرونِ عرب میں اپنے اثرات پھیلا رہی تھیں۔ متعدد مرتبہ قسطنطنیہ کا قیصر مکہ کی چھوٹی سی ریاست کے معاملات میں مداخلت کر چکا تھا۔ عربی قوم کو ہر ملک گیر طاقت اپنے

قبضے میں لانا چاہتی تھی کیونکہ اس قوم کا ملک بنجر تھا مگر قوم بنجر نہ تھی۔ جہانگیری کے لیے بہترین سپاہی اس سے فراہم ہو سکتے تھے۔[۴۸۵]

باب (۱۹)

سیرت کا پیغام

سیرت کا پیغام*

جناب وائس چانسلر صاحب، صدرِ انجمنِ اتحادِ طلبہ اور طالبین و طالبات

مجھے دعوت دی گئی ہے کہ مَیں آپ کے اِس اجتماع میں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے پیغام پر کچھ عرض کرُوں۔ اِس مضمون پر اگر منطقی ترتیب کے ساتھ کلام کیا جائے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ایک نبی کی سیرت ہی کا پیغام کیوں؟ کسی اور کا پیغام کیوں نہیں؟ اور انبیاء میں سے بھی صرف سیّدنا محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کی سیرت کا پیغام کیوں؟ دوسرے انبیاءؑ اور پیشوایانِ مذاہب کی سیرتوں کا پیغام کیوں نہیں؟ اِس سوال پر آغاز ہی میں بحث کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا ذہن اِس بات پر پُوری طرح مطمئن ہو جائے کہ درحقیقت ہم قدیم اور جدید زمانوں کے کسی رہنما کی سیرت میں نہیں بلکہ ایک نبی کی سیرت ہی میں ہدایت پا سکتے ہیں، اور کسی دوسرے نبی یا پیشوائے مذہب کی زندگی میں نہیں بلکہ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی ہی میں ہم کو وہ صحیح اور مکمل ہدایت مل سکتی ہے جس کے ہم فی الواقع محتاج ہیں۔

خدائی ہدایت کی ضرورت

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ علم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے اِس کائنات کو بنایا ہے، اور اِس میں انسان کو پیدا کیا ہے۔ اُس کے سوا کائنات کی حقیقتوں کا اور خود انسانی فطرت اور اس کی حقیقت کا علم اور کس کو ہو سکتا ہے، خالق ہی تو اپنی مخلوق کو جان سکتا ہے۔ مخلوق اگر کچھ جانے گا تو خالق کے بتانے ہی سے جانے گا۔ اُس کے پاس خود اپنا کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے

---

* یہ مؤلف کی وہ تقریر ہے جو ۲۲ اکتوبر ۷۵ء کو پنجاب یونیورسٹی یونین کی دعوت پر یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں کی گئی تھی (مرتبین)۔

وہ حقیقت کو جان سکے۔

اس معاملے میں دو قسم کی چیزوں کا فرق اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے تاکہ خَلطِ مَبحث نہ ہونے پائے۔
ایک قسم کی چیزیں وہ ہیں جنہیں آپ حواس سے محسوس کر سکتے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی معلومات کو فکر و اِستِدلال اور مُشاہدات و تجربات کی مدد سے مُرتّب کر کے نئے نئے نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اِس نوعیت کی چیزوں کے بارے میں عالمِ بالا سے کوئی تعلیم آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کی اپنی تلاش و جستجو، غور و فکر اور تحقیق و اکتشاف کا دائرہ ہے۔ اِسے آپ پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے گرد و پیش کی دنیا میں پائی جانے والی اشیاء کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں، اُن میں کام کرنے والی قوّتوں کو معلوم کریں، اُن کے اندر کارفرما قوانین کو سمجھیں، اور ترقی کی راہ میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔ اگرچہ اِس معاملے میں بھی آپ کے خالق نے آپ کا ساتھ چھوڑ نہیں دیا ہے۔ وہ تاریخ کے دوران میں بالکل غیر محسوس طریقے سے ایک تدریج کے ساتھ اپنی پیدا کی ہُوئی دنیا سے آپ کا تعارف کراتا رہا ہے، واقفیت کے نئے نئے دروازے آپ پر کھولتا رہا ہے، اور وقتاً فوقتاً ایک الہامی طریقے سے کسی نہ کسی انسان کو ایسی بات سُجھاتا رہا ہے جس سے وہ کوئی نئی چیز ایجاد یا کوئی نیا قانون دریافت کر سکا ہے۔ لیکن بہر حال ہے یہ انسانی علم ہی کا دائرہ جس کے لیے کسی نبی اور کسی کتاب کی حاجت نہیں ہے، اور اِس دائرے میں جو معلومات مطلوب ہیں اُنہیں حاصل کرنے کے ذرائع انسان کو دے دیئے گئے ہیں۔

دوسری قسم کی چیزیں وہ ہیں جو ہمارے حواس کی پہنچ سے بالاتر ہیں۔ جن کا اِدراک ہم کسی طرح نہیں کر سکتے۔ جنہیں نہ ہم تول سکتے ہیں، نہ ناپ سکتے ہیں، نہ اپنے علم کے ذرائع میں سے کوئی ذریعہ استعمال کر کے اُن کو معلوم کر سکتے ہیں۔ فلسفی اور سائنسداں اُن کے متعلق اگر کوئی رائے قائم کرتے ہیں تو وہ محض قیاس پر مبنی ہوتی ہے جسے "علم" نہیں کہا جا سکتا۔ یہ آخری حقیقتیں (Ultimate Realities) ہیں جن کے بارے میں اِستِدلالی نظریات کو خود وہ لوگ بھی یقینی قرار نہیں دے سکتے جنھوں نے اُن نظریات کو پیش کیا ہے۔ اور اگر وہ اپنے علم کی حدود کو جانتے ہوں تو اُن پر نہ خود ایمان لا سکتے ہیں نہ کسی کو ایمان لانے کی دعوت دے سکتے ہیں۔

انبیاء کی پیروی کی ضرورت

اِس دائرے میں علم اگر پہنچتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے پہنچتا ہے کیونکہ وہی حقائق کا جاننے والا ہے۔ اور جس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ علم دیتا ہے وہ وحی ہے جو صرف انبیاء

پر نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آج تک کبھی یہ نہیں کیا کہ ایک کتاب چھاپ کر ہر انسان کے ہاتھ میں دے دی ہو اور اس سے کہا ہو کہ اِسے پڑھ کر خود معلوم کر لے کہ تیری اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور اُس حقیقت کے لحاظ سے دُنیا میں تیرا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ اِس علم کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے اُس نے ہمیشہ انبیاء ہی کو ذریعہ بنایا ہے تاکہ وہ صرف اِس علم کی تعلیم ہی دے کر نہ رہ جائیں بلکہ اسے سمجھائیں بھی، اس کے مطابق عمل بھی کر کے دکھائیں، اس کے خلاف چلنے والوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش بھی کریں، اور اسے قبول کرنے والوں کو ایک ایسے معاشرے کی شکل میں منظّم بھی کر دیں جس کی زندگی کا ہر شعبہ اِس علم کا عملی مَظہَر ہو۔

اِس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم رہنمائی کے لیے صرف ایک نبی کی سیرت ہی کے محتاج ہیں۔ کوئی غیر نبی اگر نبی کا پیرو نہ ہو تو خواہ وہ کیسا ہی مُتبحّر عالم اور دانا و فرزانہ ہو، ہمارا رہنما نہیں ہو سکتا، کیونکہ اُس کے پاس حقیقت کا علم نہیں ہے، اور جسے حقیقت کا علم نہ ہو وہ ہمیں کوئی صحیح و برحق نظامِ حیات نہیں دے سکتا۔

محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سوا دوسرے انبیاء سے ہدایت نہ ملنے کی وجہ

اب اس سوال کو لیجیے کہ جن بزرگوں کو ہم انبیاء کی حیثیت سے جانتے ہیں، اور جن پیشوایانِ مذاہب کے بارے میں گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ نبی ہوں، اُن میں سے ہم صرف ایک محمد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کی سیرت سے کیوں پیغام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟ کیا یہ کسی قسم کے تعصُّب کی وجہ سے ہے یا اس کی کوئی معقول وجہ ہے؟

مَیں عرض کرتا ہُوں کہ اِس کی ایک نہایت معقول وجہ ہے۔ جن انبیاء کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے اُن کو اگرچہ ہم یقینی طور پر نبی مانتے اور جانتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کی تعلیم اور سیرت بھی ہم تک کسی قابلِ اعتماد اور مستند ذریعہ سے نہیں پہنچی ہے کہ ہم اُس کی پیروی کر سکیں۔ حضرت نُوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یُوسف، حضرت مُوسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السّلام بلاشبہ نبی تھے، اور ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر اُن پر نازل ہونے والی کوئی کتاب آج محفوظ شکل میں موجود نہیں ہے کہ اس سے ہم ہدایت حاصل کر سکیں اور اُن میں سے کسی کی زندگی کے حالات بھی ایسے محفوظ اور مُعتبر طریقے سے ہم تک نہیں پہنچے ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کو اپنا رہنما بنا سکیں۔ اگر ان سارے انبیاء کی تعلیمات اور سیرت پر کوئی شخص کچھ لکھنا چاہے تو چند صفحات سے زیادہ نہیں لکھ سکتا اور وہ بھی صرف قرآن کی مدد سے۔ کیونکہ قرآن کے سوا اُن کے بارے میں کوئی مُستند مواد موجود

نہیں ہے۔

دینِ یہود کی کتابوں اور انبیاء کا حال

حضرت موسیٰ اور اُن کے بعد آنے والے انبیاء اور اُن کی تعلیمات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بائیبل کے عہدِ عتیق (Old Testament) میں ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے ذرا بائیبل کا جائزہ لے کر دیکھیے۔ اصل تورات جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی چھٹی صدی قبل مسیحؑ میں بیت المقدس کی تباہی کے وقت ضائع ہو چکی تھی اور اُسی کے ساتھ دُوسرے اُن انبیاء کے صحیفے بھی ضائع ہو گئے تھے جو اُس زمانے سے پہلے ہو گزرے تھے۔ پانچویں صدی قبل مسیحؑ میں جب بنی اسرائیل بابل کی اسیری سے رہا ہو کر فلسطین پہنچے تو حضرت عُزَیر (Ezra) نے چند دُوسرے بزرگوں کی مدد سے حضرت موسیٰؑ کی سیرت اور بنی اسرائیل کی تاریخ مُرتّب کی اور اُسی میں تورات کی وہ آیات بھی حسبِ موقع درج کر دیں جو اُنہیں اور اُن کے مددگاروں کو دستیاب ہو سکیں۔ اُس کے بعد چوتھی صدی قبلِ مسیحؑ سے لے کر دوسری صدی قبلِ مسیحؑ تک مختلف لوگوں نے (جو نہ معلوم کون تھے) اُن انبیاء کے صحیفے (نہ معلوم کن ذرائع سے) تصنیف کر لیے جو اُن سے کئی صدی قبل گزر چکے تھے۔ مثلاً ۳۰۰ قبلِ مسیح میں حضرت یونسؑ کے نام سے ایک کتاب کسی شخص نے لکھ کر بائیبل میں درج کر دی، حالانکہ وہ آٹھویں صدی قبل مسیحؑ کے نبی تھے۔ زَبُور (Psalms) حضرت داؤدؑ کی وفات کے پانچسو برس بعد لکھی گئی اور اُس میں حضرت داؤدؑ کے علاوہ تقریباً ایک سو دوسرے شاعروں کی نظمیں بھی شامل کر دی گئیں جو معلوم نہیں کن ذرائع سے زَبُور مُرتّب کرنے والوں کو پہنچی تھیں۔ حضرت سُلیمانؑ کی وفات ۹۳۳ قبل مسیح میں ہُوئی اور اَمثالِ سُلیمانؑ (Proverbs) ۲۵۰ قبل مسیحؑ میں لکھی گئی اور اُس میں دوسرے بہت سے حکماء کے اقوال بھی شامل کر دیے گئے۔

غرض، بائیبل کی کسی کتاب کی سَند بھی اُن انبیاء تک نہیں پہنچتی جن کی طرف وہ منسوب ہے اِس پر مزید یہ کہ عبرانی بائیبل کی یہ کتابیں بھی ۷۰ء میں بیت المَقدِس کی دوسری تباہی کے وقت ضائع ہو گئیں اور اُن کا صرف یُونانی ترجمہ باقی رہ گیا جو ۲۵۸ قبل مسیح سے پہلی صدی قبلِ مسیحؑ تک کیا گیا تھا۔ عبرانی بائیبل کو دوسری صدی عیسوی میں یہودی عُلماء نے اُن مسوّدات کی مدد سے مُرتّب کیا جو بچے رہ گئے تھے۔ اُس کا قدیم ترین نُسخہ جو اَب پایا جاتا ہے ۹۱۶ء کا لکھا ہُوا ہے۔ اُس کے سوا اور کوئی عبرانی نسخہ اب موجود نہیں ہے۔ بُحیرۂ مُردار (Dead Sea) کے قریب غارِ قُمران میں جو عبرانی خریطے (Scrolls) ملے ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ دوسری اور پہلی صدی قبل مسیحؑ کے لکھے ہوئے ہیں

ور اُن میں بائبل کے صرف چند منتشر اجزاء ہی پائے جاتے ہیں۔ بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کا جو مجموعہ ساریوں (Samaritans) کے ہاں رائج ہے اُس کا قدیم ترین نسخہ گیارھویں صدی عیسوی کا لکھا ہُوا ہے۔ یُونانی ترجمہ جو تیسری اور دوسری صدی قبلِ مسیحؑ میں کیا گیا تھا وہ بے شمار غلطیوں سے لبریز تھا، اور اُس ترجمے سے لاطینی زبان کا ترجمہ دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں ہُوا۔ حضرت مُوسیٰ اور بعد کے انبیاء بنی اسرائیل کے حالات اور تعلیمات کے بارے میں اِس مواد کو آخر کس معیار کے لحاظ سے مُستند (Authentic) کہا جا سکتا ہے؟

اس کے علاوہ یہودیوں میں کچھ سینہ بسینہ روایات بھی پائی جاتی تھیں جنہیں زبانی قانون (Oral Law) کہا جاتا تھا۔ یہ تیرہ چودہ سو برس تک غیر مکتوب رہیں۔ دوسری صدی عیسوی کے آخر اور تیسری صدی کے آغاز میں ربّی یہوداہ ابن شمعُون نے ان کو مِشنا (Mishnah) کے نام سے تحریری شکل دی۔ فلسطینی علمائے یہود نے ان کی شرحیں حَلَقہ (Halakah) کے نام سے اور بابلی عُلماء نے ہگّادہ کے نام سے تیسری اور پانچویں صدی میں لکھیں، اور انہی تین کتابوں کا مجموعہ تلمُود کہلاتا ہے۔ ان کی کسی روایت کی کوئی سند نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ کن لوگوں سے کن لوگوں تک پہنچیں۔

حضرت عیسیٰ اور دینِ نصاریٰ کی کتابوں کا حال

کچھ ایسا ہی حال حضرت عیسیٰ کی سیرت اور تعلیمات کا ہے۔ اصل انجیل جو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعہ اُن پر نازل ہوئی تھی اُسے اُنھوں نے زبانی ہی لوگوں کو سُنایا اور اُن کے شاگردوں نے بھی زبانی ہی اُسے دوسروں تک اِس طرح پہنچایا کہ آنجناب کے حالات اور انجیل کی آیات سب کو خلط ملط کر دیا۔ اُن میں سے کوئی چیز بھی مسیحؑ کے زمانے میں یا ان کے بعد لکھی ہی نہیں گئی۔ لکھنے کا کام اُن عیسائیوں نے کیا جن کی زبان یُونانی تھی۔ حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان سُریانی (Syriac) یا آرامی (Aramaic) تھی۔ اور اُن کے شاگرد بھی یہی زبان بولتے تھے۔ یونانی زبان بولنے والے بہت سے مصنّفین نے اُن روایات کو آرامی زبان میں سُنا اور یُونانی میں لکھا۔ اُن مُصنّفین کی لکھی ہُوئی کتابوں میں سے کوئی بھی ۷۰ء سے پہلے کی نہیں ہے اور اُن میں سے کسی نے بھی کسی واقعہ یا حضرت عیسیٰؑ کے کسی قول کی سند نہیں بیان کی جس سے معلوم ہوتا کہ انہوں نے کون سی بات کس سے سُنی تھی۔ پھر اُن کی لکھی ہُوئی کتابیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔ بائبل کے نئے عہد نامے (New Testament) کے ہزاروں یُونانی نسخے جمع کیے گئے، مگر ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کا نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ تر گیارھویں سے چودھویں صدی تک کے ہیں۔ مصر میں پاپیرس پر لکھے ہوئے جو منتشر اجزاء ملے ہیں اُن میں سے بھی کوئی تیسری صدی سے قدیم تر نہیں ہے۔ یُونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کس نے کب اور کہاں

گیا؟ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ چوتھی صدی میں پوپ کے حکم سے اس پر نظر ثانی کا کام کیا گیا، اور پھر سولھویں صدی میں اسے چھوڑ کر یونانی سے لاطینی میں ایک نیا ترجمہ کر دیا گیا۔ یونانی سے سُریانی زبان میں چاروں انجیلوں کا ترجمہ غالباً ۲۰۰ء میں ہُوا تھا، مگر اس کا بھی قدیم ترین نسخہ جو اب پایا جاتا ہے چوتھی صدی کا لکھا ہُوا ہے، اور پانچویں صدی کا جو قلمی نسخہ ملا ہے وہ اُس سے کافی مختلف ہے سُریانی سے جو عربی ترجمے کیے گئے ان میں سے بھی کوئی ترجمہ آٹھویں صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ستّر کے قریب انجیلیں لکھی گئی تھیں، مگر ان میں سے صرف چار کو پیشوایانِ دینِ مسیحؑ نے قبول کیا اور باقی سب کو رَدّ کر دیا۔ کچھ نہیں معلوم کہ قبول کیا تو کیوں؟ اور رَدّ کیا تو کیوں؟ کیا اِس مواد کی بنا پر حضرت عیسیٰؑ کی سیرت اور ان کی تعلیمات کو کسی درجے میں بھی مُستند مانا جا سکتا ہے؟

زردشت کی سیرت اور تعلیمات کا حال

دوسرے پیشوایانِ مذاہب کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ مثلاً زردشت (Zoroaster) کو لیجیے جس کا صحیح زمانۂ پیدائش بھی اب ٹھیک معلوم نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سکندر کی فتحِ ایران سے ڈھائی سو سال پہلے اُس کے وجود کا پتہ چلتا ہے، یعنی مسیح سے ساڑھے پانچ سو سال قبل۔ اُس کی کتاب اَوِستا اپنی اصل زبان میں اب ناپید ہے اور وہ زبان بھی مُردہ ہو چکی ہے جس میں وہ لکھی یا زبانی بیان کی گئی تھی۔ نویں صدی عیسوی میں اس کے بعض اجزا کا ترجمہ ۹ جلدوں میں تشریح کے ساتھ کیا گیا تھا، مگر اُن میں سے پہلی دو جلدیں ضائع ہو گئیں اور اب اس کا جو قدیم ترین نسخہ پایا جاتا ہے وہ تیرھویں صدی کے وسط کا لکھا ہُوا ہے۔ یہ تو ہے زَرَدشت کی پیش کردہ کتاب کا حال۔ رہا خود اُس کی سیرت کا معاملہ، تو اُس کے متعلق ہماری معلومات اِس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں کہ ۴۰ سال کی عُمر میں اُس نے تبلیغ شروع کی۔ دو سال بعد بادشاہ گُشتاسپ نے اس کی پیروی اختیار کر لی اور اس کا مذہب سرکاری مذہب بن گیا، ۳۵ سال وہ زندہ رہا اور اس کی موت پر جتنا زمانہ گزرتا گیا اس کی زندگی عجیب و غریب افسانوں کا مجموعہ بنتی چلی گئی جن میں سے کسی کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔

بودھ مذہب کی کیفیت

دُنیا کی مشہور ترین مذہبی شخصیّتوں میں سے ایک بودھ تھا۔ زردشت کی طرح اس کے متعلق بھی یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ نبی ہو۔ مگر اس نے سرے سے کوئی کتاب ہی پیش نہیں کی، نہ اس کے پیروؤں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ وہ کوئی کتاب لایا تھا۔ اس کی وفات کے سو سال بعد اس کے اقوال اور حالات کو جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا اور صدیوں تک چلتا رہا۔ مگر اِس طرح کی جتنی کتابیں بُدھ مذہب کی اصل کتابیں

سمجھی جاتی ہیں اُن میں سے کسی کے اندر بھی کوئی سَند درج نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ کس ذریعہ سے اُن احوال و اقوال اور تعلیمات کے مرتّب کرنے والوں کو بُدھ کے حالات اور اس کے اقوال پہنچے تھے۔

صرف محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت اور تعلیمات محفوظ ہیں

اِس سے معلوم ہُوا کہ اگر ہم دُوسرے انبیاء اور مذہبی پیشواؤں کی طرف رجوع کریں بھی تو اُن کے بارے میں کوئی مُستند ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے ہم اُن کی تعلیمات اور ان کی زندگیوں سے اطمینان اور یقین کے ساتھ رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد ہمارے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم کسی ایسے نبی کی طرف رجُوع کریں جس نے کوئی قابلِ اعتماد اور تحریف و آمیزش سے پاک کتاب چھوڑی ہو اور جس کے مفصّل حالات و اقوال اور اعمال مُعتبر ذرائع سے ہم تک پہنچے ہوں تاکہ ہم ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ ایسی شخصیت پُوری دُنیا کی تاریخ میں صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات ستودہ صفات ہے۔

قرآن کا محفوظ ترین کتابِ الٰہی ہونا

اُنہوں نے ایک کتاب (قرآن) اِس صریح دعوے کے ساتھ پیش کی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو مجھ پر نازل ہُوا ہے۔ اِس کتاب کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یقینی طور پر محسُوس ہوتا ہے کہ اِس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اپنا کوئی قول بھی اس میں شامل نہیں ہے، بلکہ آپؐ کے اقوال کو اس سے بالکل الگ رکھا گیا ہے۔ بائیبل کی طرح آپؐ کی زندگی کے حالات اور عربوں کی تاریخ اور زمانۂ نزولِ قرآن میں پیش آنے والے واقعات کو اِس میں کلامِ الٰہی کے ساتھ خَلط مَلط نہیں کر دیا گیا ہے۔ یہ خالص کلام اللہ (Word of God) ہے۔ اس کے اندر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا ایک لفظ بھی شامل نہیں ہوا ہے۔ اس کے الفاظ میں سے ایک لفظ بھی کم نہیں ہُوا ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے سے جُوں کا توں یہ ہمارے زمانے تک منتقل ہُوا ہے۔

یہ کتاب جس وقت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہونی شروع ہوئی تھی اُسی وقت سے آپؐ نے اِسے لکھوانا شروع کر دیا تھا جب کوئی وحی آتی اُسی وقت آپ اپنے کسی کاتب کو بُلاتے اور اُسے لکھوا دیتے تھے۔ لکھنے کے بعد وہ آپؐ کو سُنایا جاتا تھا اور جب آپ اطمینان کر لیتے تھے کہ کاتب نے اسے صحیح لکھا ہے تب آپؐ اسے ایک محفوظ جگہ رکھ دیتے تھے۔ ہر نازل شُدہ وحی کے متعلق آپؐ کاتب کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے کس سُورہ میں کس آیت سے پہلے اور کس کے بعد درج کیا جائے۔ اس طرح آپ قرآن کو ترتیب بھی دیتے رہے تھے یہاں تک کہ وہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

نماز کے متعلق آغازِ اسلام ہی سے یہ ہدایت تھی کہ اُس میں قرآن مجید پڑھا جائے۔ اِس لیے صحابہ کرام

اُس کے نزُول کے ساتھ ساتھ اُس کو یاد کرتے جاتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اسے پُورا یاد کرلیا اور ان سے بہت زیادہ بڑی تعداد ایسے اصحاب کی تھی جنہوں نے کم و بیش اس کے مختلف حصّے اپنے حافظے میں محفوظ کرلیے تھے۔ ان کے علاوہ وہ متعدد صحابہؓ جو پڑھے لکھے تھے قرآن کے مختلف حصّوں کو بطورِ خود لکھ بھی رہے تھے۔ اِس طرح قرآن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ ہی میں چار طریقوں سے محفوظ ہو چکا تھا۔

(۱) آپؐ نے خود کاتبینِ وحی سے اس کو از اوّل تا آخر لکھوالیا۔

(۲) بہت سے صحابہؓ نے پُورے کا پُورا قرآن لفظ بلفظ یاد کرلیا۔

(۳) صحابۂ کرامؓ میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے قرآن کا کوئی نہ کوئی حصّہ، تھوڑا یا بہت یاد نہ کرلیا ہو، کیونکہ اُسے نماز میں پڑھنا ضروری تھا۔ اور صحابہؓ کی تعداد کا اندازہ اس سے کرلیجیے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ آخری حج میں ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہؓ شریک تھے۔

(۴) پڑھے لکھے صحابہؓ کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اپنے طور پر قرآن کو لکھ بھی لیا اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو سُنا کر اس کی صحت کا اطمینان بھی کرلیا تھا۔

پس یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ آج جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے یہ لفظ بلفظ وہی ہے جسے رسولؐ اللہ نے کلام اللہ کی حیثیت سے پیش فرمایا تھا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے تمام حافظوں اور تمام تحریری نوشتوں کو جمع کر کے اس کا ایک مکمّل نسخہ کتابی صُورت میں لکھوالیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اُسی کی نقلیں سرکاری طور پر دنیائے اسلام کے مرکزی مقامات کو بھیجی گئیں۔ ان میں سے دو نقلیں آج بھی دُنیا میں موجود ہیں، ایک استنبول میں اور دوسری تاشقند میں۔ جس کا جی چاہے قرآن مجید کا کوئی مطبُوعہ نسخہ لے جا کر ان سے ملالے، کوئی فرق وہ نہ پائے گا۔ اور فرق ہو کیسے سکتا ہے جبکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے سے لے کر آج تک ہر پُشت (Generation) میں لاکھوں اور کروڑوں حافظ موجود رہے ہیں۔ ایک لفظ بھی اگر کوئی شخص بدلے تو یہ حفاظ ان کی غلطی پکڑ لیں گے۔ پچھلی صدی کے آخر میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے ایک انسٹی ٹیوٹ نے دنیائے اسلام کے مختلف حصّوں سے ہر زمانے کے لکھے ہُوئے قرآن مجید کے قلمی اور مطبوعہ ۴۲ ہزار نسخے جمع کیے تھے۔ پچاس سال تک ان پر تحقیقی کام کیا گیا۔ آخر میں جو رپورٹ پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ ان نسخوں میں کتابت کی غلطیوں کے سوا کوئی فرق نہیں ہے، حالانکہ یہ پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی تک کے نسخے تھے اور دُنیا کے ہر حصّے سے فراہم کیے گئے تھے۔ افسوس کہ دوسری جنگِ عظیم میں جب جرمنی پر بمباری کی گئی تو وہ انسٹی ٹیوٹ تباہ ہو گیا لیکن اس کی تحقیقات کے نتائج دنیا سے ناپید نہیں ہُوئے۔

ایک اور بات قرآن کے متعلق یہ بھی نگاہ میں رکھیے کہ جس زبان میں یہ نازل ہُوا تھا وہ ایک زندہ زبان ہے۔ عراق سے مراکو تک تقریباً ۱۲ کروڑ انسان آج بھی اسے مادری زبان کی حیثیت سے بولتے ہیں اور غیر عرب دُنیا میں بھی لاکھوں آدمی اسے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ عربی زبان کی گرامر، اس کی لُغت، اس کے الفاظ کے تلفظ اور اس کے محاورے ۱۴ سو برس سے جُوں کے تُوں قائم ہیں۔ آج ہر عربی داں اسے پڑھ کر اسی طرح سمجھ سکتا ہے جس طرح ۱۴ سو برس پہلے کے عرب سمجھتے تھے۔

یہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک اہم خصوصیت جو اُن کے سوا کسی نبی اور کسی پیشوائے مذہب کو حاصل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے جو کتاب اُن پر نازل ہُوئی تھی وہ اپنی اصل زبان میں اپنے اصل الفاظ کے ساتھ بلا تغیّر و تبدُّل موجود ہے۔

سیرت وسُنّتِ رسُول کا پایۂ استِناد

اب دُوسری خصوصیت کو دیکھیے جس میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تمام انبیاء اور پیشوایانِ مذاہب میں یکتا ہیں۔ وہ یہ کہ آپؐ کی لائی ہُوئی کتاب کی طرح آپؐ کی سیرت بھی محفوظ ہے جس سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ بچپن سے لے کر آخری سانس تک جتنے لوگوں نے آپؐ کو دیکھا، آپؐ کے حالاتِ زندگی دیکھے، آپؐ کے اقوال سُنے، آپؐ کی تقریریں سُنیں، آپ کو کسی چیز کا حکم دیتے سُنا یا کسی چیز سے منع کرتے سُنا، اُن کی ایک عظیم تعداد نے سب کچھ یاد رکھا اور بعد کی نسل تک اسے پہنچایا۔ بعض محققین کے نزدیک ایسے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچتی ہے جنہوں نے آنکھوں دیکھے اور کانوں سُنے ہُوتے واقعات بعد کی نسل تک منتقل کیے تھے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بعض احکام خود لکھوا کر بھی بعض لوگوں کو دیے یا بھیجے تھے جو بعد کے لوگوں کو ملے۔ صحابہ میں سے کم از کم چھ اصحاب ایسے تھے جنہوں نے آپؐ کی احادیث لکھ کر آپؐ کو سُنا دی تھیں تاکہ ان میں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ یہ تحریریں بھی بعد کے آنے والوں کو ملیں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد کم از کم پچاس صحابہ نے آپؐ کے حالات، واقعات اور اقوال تحریری صورت میں جمع کیے اور یہ ذخیرۂ علم بھی اُن لوگوں تک پہنچا جنہوں نے بعد میں احادیث کو جمع اور مرتب کرنے کی خدمت انجام دی۔ پھر جن صحابہؓ نے سیرت کی معلومات زبانی روایت کیں ان کی تعداد، جیسا کہ ابھی مَیں عرض کر چکا ہُوں، بعض محققین کے نزدیک ایک لاکھ تک پہنچتی ہے۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کیونکہ آخری حج جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ادا فرمایا، جسے حَجّۃُ الوداع کہا جاتا ہے اس میں ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی موجود تھے۔ اتنے آدمیوں نے آپؐ کو حج کرتے ہُوتے دیکھا۔ آپؐ سے حج کا طریقہ سیکھا۔ وہ تقریریں سُنیں جو اِس حج کے موقع پر آپؐ نے کی تھیں۔ کیسے ممکن ہے کہ اتنے لوگ جب ایسے اہم موقع پر آپؐ کے ساتھ حج میں شریک ہونے کے بعد اپنے

اپنے علاقوں میں واپس پہنچے ہونگے تو وہاں اُن کے عزیزوں، دوستوں اور ہم وطنوں نے اُن سے اِس سفر کے حالات نہ پُوچھے ہوں اور حج کے احکام دریافت نہ کیے ہوں۔ اِسی سے اندازہ کر لیجیے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جیسی عظیم شخصیت کے اِس دُنیا سے گزر جانے کے بعد لوگ کس اشتیاق کے ساتھ آپؐ کے احوال و اقوال اور احکام و ہدایات اُن لوگوں سے پُوچھتے ہونگے جنہوں نے آپؐ کو دیکھا تھا اور آپؐ کے ارشادات سُنے تھے۔

صحابہؓ سے جو روایات بعد کی نسلوں کو پہنچی تھیں ان کے بارے میں ابتدا ہی سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ جو شخص بھی رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسُوب کر کے کوئی بات کہتا اُس کو یہ بتانا پڑتا تھا کہ اُس نے وہ بات کس سے سُنی ہے اور اُوپر سلسلہ بہ سلسلہ کون کس سے وہ بات سُنتا اور آگے بیان کرتا رہا ہے۔ اس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تک روایت کی پُوری کڑیاں دیکھی جاتی تھیں تاکہ یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ صحیح طور سے حضورؐ سے منقول ہوتی ہے۔ اگر روایت کی پُوری کڑیاں نہ ملتی تھیں تو اس کی صحت مُشتبہ ہو جاتی تھی۔ اگر کڑیاں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچ جاتیں لیکن بیچ میں کوئی راوی ناقابلِ اعتماد ہوتا تو ایسی روایت بھی قبول نہ کی جاتی تھی۔ آپ ذرا غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ دُنیا کے کسی دوسرے انسان کے حالات اِس طرح سے مرتّب نہیں ہُوئے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو حاصل ہے کہ آپؐ کے بارے میں کوئی بات بھی سند کے بغیر تسلیم نہیں کی گئی۔ اور سند میں بھی صرف یہی نہیں دیکھا گیا کہ ایک حدیث کا سلسلۂ روایت رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچتا ہے یا نہیں، بلکہ یہ بھی دیکھا گیا کہ اس سلسلے کے تمام راوی بھروسے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اس غرض کے لیے راویوں کے حالات کی بھی پُوری جانچ پڑتال کی گئی اور اس پر مفصّل کتابیں لکھ دی گئیں جن سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون قابلِ اعتماد تھا اور کون نہ تھا۔ کس کی سیرت و کردار کا کیا حال تھا۔ کس کا حافظہ ٹھیک تھا اور کس کا ٹھیک نہ تھا۔ کون اُس شخص سے ملا تھا جس سے اُس نے روایت نقل کی ہے اور کون اُس سے ملاقات کے بغیر ہی اس کا نام لے کر روایت بیان کر رہا ہے۔ اِس طرح اتنے بڑے پیمانے پر راویوں کے متعلق معلومات جمع کی گئی ہیں کہ آج بھی ہم ایک ایک حدیث کے متعلق یہ جانچ سکتے ہیں کہ وہ قابلِ اعتماد ذرائع سے آئی ہے یا ناقابلِ اعتماد ذرائع سے۔ کیا انسانی تاریخ میں کوئی دُوسرا شخص ایسا پایا جاتا ہے جس کے حالاتِ زندگی اس قدر مُستند طریقے سے منقول ہُوتے ہوں؟ اور کیا اِس کی کوئی مثال ملتی ہے کہ ایک شخص کے حالات کی تحقیق کے لیے اُن ہزارہا آدمیوں کے حالات پر کتابیں لکھ دی گئی ہوں جنہوں نے اُس ایک شخصیت کے متعلق کوئی روایت بیان کی ہو؟

موجودہ دَور کے عیسائی اور یہودی علماء احادیث کی صحت کو مشتبہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی

کا جو زور صرف کر رہے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ حسد ہے کہ ان کے دین کی کتابوں اور اُن کے پیشوایانِ دین کے حالات کی سرے سے کوئی سند ہی نہیں ہے۔ اسی جَلَن کے باعث انہوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر تنقید کے معاملہ میں علمی دیانت (Intellectual Honesty) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

حضورؐ کی زندگی کا ہر پہلو معروف و معلوم ہے

سیرتِ رسُولِ اکرمؐ کی صرف یہی ایک خصوصیّت نہیں ہے کہ وہ ہمیں نہایت مستند ذرائع سے پہنچی ہے، بلکہ اس کی یہ بھی امتیازی خصوصیّت ہے کہ اس میں آپؐ کی زندگی کے ہر پہلو کی اتنی تفصیلات ملتی ہیں جو تاریخ کے کسی دُوسرے شخص کی زندگی کے بارے میں نہیں ملتیں۔ آپؐ کا خاندان کیسا تھا۔ آپؐ کی نبوت سے پہلے کی زندگی کیسی تھی۔ آپ کو نبوّت کس طرح ملی۔ آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی تھی۔ آپؐ نے اسلام کی دعوت کس طریقے سے پھیلائی۔ مخالفتوں اور مزاحمتوں کا مقابلہ کس طرح کیا۔ اپنے ساتھیوں کی تربیت کیسے کی۔ اپنے گھر میں آپؐ کس طرح رہتے تھے۔ اپنی بیویوں اور بچّوں سے آپؐ کا برتاؤ کیسا تھا۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں سے آپؐ کا معاملہ کیسا تھا۔ کس اخلاق کی تعلیم آپؐ دیتے تھے اور آپؐ کا اپنا اخلاق کیسا تھا۔ کس چیز کا آپؐ نے حکم دیا۔ کس کام سے آپؐ نے منع کیا۔ کس کام کو آپؐ نے ہوتے دیکھا اور منع نہ کیا اور کس چیز کو ہوتے دیکھا اور منع فرمایا۔ یہ سب کچھ ذرا ذرا سی تفصیلات کے ساتھ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ آپؐ ایک فوجی جنرل بھی تھے اور آپؐ کی قیادت میں جتنی لڑائیاں ہوئیں ان سب کا مفصل حال ہمیں ملتا ہے۔ آپؐ ایک حاکم بھی تھے اور آپؐ کی حکومت کے تمام حالات ہمیں ملتے ہیں۔ آپؐ ایک جج بھی تھے اور آپؐ کے سامنے پیش ہونے والے مقدمات کی پُوری پُوری رُودادیں ہمیں ملتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس مقدمے میں آپؐ نے کیا فیصلہ فرمایا۔ آپؐ بازاروں میں بھی نکلتے تھے اور دیکھتے تھے کہ لوگ خرید و فروخت کے معاملات کس طرح کرتے ہیں۔ جس کام کو غلط ہوتے ہُوئے دیکھتے اس سے منع فرماتے تھے اور جو کام صحیح ہوتے دیکھتے اس کی توثیق فرماتے تھے۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق آپؐ نے تفصیلی ہدایات نہ دی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بے جا تعصُّب کے بغیر، پُورے علم و یقین کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ تمام انبیاء اور پیشوایانِ مذاہب میں سے صرف ایک محمد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی وہ ہستی ہیں جن کی طرف نوعِ انسانی ہدایت و رہنمائی کے لیے رجُوع کر سکتی ہے، کیونکہ آپؐ کی پیش کی ہوئی کتاب اپنے اصل الفاظ میں محفوظ ہے، اور آپؐ کی سیرت اُن تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ، جو ہدایت کے لیے درکار

ہیں، نہایت مُستَنَد و مُعتبَر ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آپؐ کی سیرتِ پاک ہمیں کیا پیغام اور کیا ہدایت دیتی ہے۔

حضورؐ کا پیغام تمام انسانوں کے لیے ہے

اوّلین چیز جو ہمیں آپؐ کی دعوت میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ رنگ و نسل اور زبان و وطن کے سارے امتیازات کو نظر انداز کر کے انسان کو بحیثیت انسان مخاطب کرتے ہیں اور چند اُصول پیش کرتے ہیں جو تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے ہیں۔ اُن اُصولوں کو جو بھی مان لے وہ مُسلمان ہے اور ایک عالمگیر اُمّتِ مُسلِمہ کا فرد ہے، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، عربی ہو یا عجمی۔ جہاں بھی کوئی انسان ہے، جس ملک یا قوم یا نسل میں بھی وہ پیدا ہُوا ہے، جو زبان بھی وہ بولتا ہے اور جو رنگ بھی اس کی کھال کا ہے، وہ محمد رسُول اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کا مخاطَب ہے۔ اور اگر وہ آپؐ کے پیش کردہ اُصولوں کو مان لیتا ہے تو بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اُمّتِ مُسلِمہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ کوئی چھُوت چھات، کوئی اُونچ نیچ، کوئی نسلی یا طبقاتی امتیاز، کوئی لسانی یا قومی یا جغرافی افتراق، جو عقیدے کی وحدت قائم ہو جانے کے بعد ایک انسان کو دوسرے انسان سے جُدا کرتا ہو، اِس اُمّت میں نہیں ہے۔

رنگ و نسل کے تعصّبات کا بہترین علاج

آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جو محمّد عربی صلی اللہ علیہ وسلّم کی بدولت انسانیّت کو میسّر آئی ہے۔ انسان کو سب سے بڑھ کر جس چیز نے تباہ کیا وہ یہی امتیازات ہیں جو انسان اور انسان کے درمیان قائم کیے گئے ہیں۔ کہیں اُس کو نجس قرار دیا گیا اور اَچھُوت بنا کر رکھ دیا گیا، اُس کے وہ حقوق نہیں ہیں جو برہمن کے حقوق ہیں۔ کہیں اُس کو فنا کر دینے کے قابل قرار دیا گیا کیونکہ وہ آسٹریلیا اور امریکہ میں ایسے وقت پیدا ہو گیا تھا جب باہر سے آنے والوں کو اس سے زمین خالی کرانے کی ضرورت تھی۔ کہیں اُس کو پکڑ کر غلام بنایا گیا اور اس سے جانوروں کی طرح خدمت لی گئی، کیونکہ وہ افریقہ میں پیدا ہُوا تھا اور اس کا رنگ کالا تھا۔ غرض نوعِ انسانی کے لیے قوم، وطن، نسل، رنگ اور زبان کے یہ امتیازات قدیم ترین زمانے سے لے کر اِس زمانے تک بہت بڑی مُصیبت کا ذریعہ بنے رہے ہیں۔ اِسی بنیاد پر لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ اِسی بنیاد پر ایک مُلک دُوسرے ملک پر چڑھ دوڑا ہے۔ ایک قوم نے دُوسری قوم کو لُوٹا ہے۔ اور پُوری پُوری نسلیں تباہ و برباد کر دی گئی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اِس مرض کا ایسا علاج فرمایا کہ دشمنانِ اسلام بھی مان گئے کہ رنگ، نسل اور وطن کے امتیازات کو جس کامیابی سے اسلام نے حل کیا ہے ایسی کامیابی کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

امریکہ کے افریقی النسل باشندوں کا مشہور لیڈر میلکم اکس، جو ایک زمانے میں گوری نسل کے خلاف کالی نسل کے شدید ترین تعصب کا علمبردار تھا، اسلام قبول کر کے جب حج کے لیے گیا اور اس نے دیکھا کہ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، ہر طرف سے ہر نسل کے لوگ، ہر رنگ کے لوگ، ہر وطن کے لوگ، ہر زبان بولنے والے لوگ چلے آرہے ہیں، سب نے ایک جیسا احرام کا لباس پہن رکھا ہے، سب ایک ہی زبان میں لبیک لبیک کے نعرے لگا رہے ہیں، ایک ساتھ طواف کر رہے ہیں، اور ایک ہی جماعت میں ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں، تو وہ پکار اُٹھا کہ رنگ و نسل کے مسئلے کا یہی صحیح حل یہی ہے، نہ کہ وہ جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں۔ اُس مرحوم کو تو ظالموں نے قتل کر دیا، مگر اس کی خود نوشت سوانح عمری شائع شدہ موجود ہے۔ اُس میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ حج سے کیسا گہرا اثر اُس نے قبول کیا تھا۔

یہ حج تو اسلام کی عبادات میں سے صرف ایک عبادت ہے۔ اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر اسلام کی تعلیمات کو بحیثیتِ مجموعی دیکھے تو کسی جگہ بھی اُنگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ چیز کسی خاص قوم یا کسی قبیلے یا کسی نسل یا طبقے کے مفاد کے لیے ہے۔ یہ تو پُورا کا پُورا دین ہی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لیے ہے اور اس کی نگاہ میں وہ سب انسان یکساں ہیں جو اس کے اصول قبول کر کے اس کی بنائی ہوئی عالمگیر برادری میں شامل ہو جائیں۔ بلکہ یہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کرتا جو گوروں نے کالوں کے ساتھ کیا، جو سامراجی قوتوں نے اپنی محکوم قوموں کے ساتھ کیا، جو کمیونسٹ حکومتوں نے اپنے دائرۂ اقتدار میں رہنے والے غیر کمیونسٹوں کے ساتھ، حتیٰ کہ خود اپنی پارٹی کے غیر مرغوب ارکان کے ساتھ کیا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسانیت کی فلاح کے لیے وہ کیا اصول ہیں جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے پیش فرماتے ہیں اور ان میں کیا بات ایسی ہے جو نہ صرف فلاحِ انسانیت کی ضامن ہے بلکہ تمام انسانوں کو ایک وحدت کی لڑی میں پرو کر ایک اُمّت بھی بنا سکتی ہے۔

اللہ کی وحدانیت کا وسیع ترین تصوُّر

ان میں سب سے مقدم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا ہے۔ صرف اِس معنی میں نہیں کہ اللہ ہے اور محض اِس معنی میں بھی نہیں کہ اللہ بس ایک ہے۔ بلکہ اِس معنی میں کہ اِس کائنات کا واحد خالق، مالک، مُدبّر اور حاکم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کوئی دوسری ہستی پُوری کائنات میں ایسی نہیں ہے جس کے پاس حاکمیت کا اقتدار ہو، جس کو حکم دینے اور منع کرنے کا حق ہو، جس کے حرام کرنے سے کوئی چیز حرام اور جس کے حلال کرنے سے کوئی چیز حلال ہو سکتی ہو۔ یہ اختیارات اُس کے سوا کوئی نہیں رکھتا۔ کیونکہ جو خالق اور مالک ہے اُسی کو یہ حق پہنچتا ہے

کہ اپنے بندوں کو اپنی پیدا کردہ دُنیا میں جس چیز کی چاہے اجازت دے اور جس سے چاہے منع کر دے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ اللہ کو اِس حیثیت سے مانو۔ اُس کو اِس حیثیت سے مانو کہ ہم اُس کے سوا کسی کے بندے نہیں ہیں اور اس کے قانون کے خلاف کسی کو ہم پر حکم چلانے کا حق نہیں ہے۔ اِس حیثیت سے مانو کہ ہمارا سر اُس کے سوا کسی کے سامنے جُھکنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ اِس حیثیت سے مانو کہ ہمارا جینا اور مرنا بالکل اُس کے اختیار میں ہے، جس وقت چاہے ہمیں موت دے سکتا ہے اور جس وقت تک چاہے ہمیں زندہ رکھ سکتا ہے۔ اس کی طرف سے موت آئے تو دُنیا کی کوئی طاقت بچا لینے والی نہیں اور وہ زندگی عطا کرے تو دُنیا کی کوئی طاقت ہلاک کر دینے والی نہیں۔ یہ ہے اِسلام کا تصوّرِ خُدا۔

اِس تصوُّر کے مطابق زمین سے لے کر آسمانوں تک ساری کائنات خدا کی تابعِ فرمان ہے اور انسان جو اِس کائنات میں رہتا ہے، اُس کا بھی یہی کام ہے کہ خُدا ہی کا تابعِ فرمان بن کر رہے۔ اگر وہ خود مختار بنے یا خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت اختیار کرے تو اس کی زندگی کا نظام پُورے نظامِ کائنات کے خلاف ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں اِس بات کو یُوں سمجھیے کہ ساری کائنات خدا کے حکم کے تحت چل رہی ہے۔ یہ ایک امرِ واقعی ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ اب اگر ہم خدا کے سوا کسی اور کے حکم کے تحت چل رہے ہوں، یا اپنی مرضی کے مختار بن کر جدھر جی چاہے چل رہے ہوں، تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہماری زندگی کی گاڑی پُوری کائنات کی گاڑی کے خلاف سمت میں چل رہی ہے۔ ایک مستقل تصادُم ہے جو ہمارے اور نظامِ کائنات کے درمیان ہو رہا ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ اِس تصوُّر کے مطابق انسان کے لیے صحیح طریقۂ حیات (Way of Life) صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے، کیونکہ وہ مخلوق ہے اور اللہ اس کا خالق ہے۔ مخلوق ہونے کی حیثیت سے اس کا خود مختار بن جانا بھی غلط ہے، اور اپنے خالق کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا بھی غلط۔ ان دونوں راستوں میں سے جو راستہ بھی وہ اختیار کرے گا وہ حقیقت سے متصادم ہوگا، اور حقیقت سے ٹکرانے کا نقصان خود ٹکرانے والے ہی کو پہنچتا ہے۔ حقیقت کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔

بندگیٔ رب کی دعوت

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت یہ ہے کہ اِس تصادُم کو ختم کرو۔ تمہاری زندگی کا قانون اور ضابطہ بھی وُہی ہونا چاہیے جو پُوری کائنات کا ہے۔ تم نہ خود قانون ساز بنو اور نہ کسی دوسرے کا یہ حق تسلیم کرو کہ وہ خدا کی زمین میں خدا کے بندوں پر اپنا قانون چلائے۔ قانونِ برحق صرف خداوندِ عالم کا قانون ہے، باقی سب قوانین باطل ہیں۔

اطاعتِ رسُول کی دعوت

یہاں پہنچ کر ہمارے سامنے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کا دُوسرا نکتہ آتا ہے، اور وہ آپؐ کا یہ دوٹوک بیان ہے کہ مَیں اللہ تعالیٰ کا نبی ہُوں، اور نوعِ انسانی کے لیے اُس نے اپنا قانون میرے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ مَیں خود بھی اِس قانون کا پابند ہُوں۔ خود مجھے بھی اِس میں تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ مَیں اتباع کرنے پر مامُور ہوں۔ اپنی طرف سے کوئی نئی چیز اختراع کرنے کا مجاز نہیں ہُوں۔ یہ قرآن وہ قانون ہے جو مجھ پر خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اور میری سُنّت وہ قانون ہے جو خدا کے حکم و ارشاد کی بنا پر مَیں جاری کرتا ہُوں۔ اِس قانون کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے والا سب سے پہلے مَیں ہُوں (اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْن)۔ اِس کے بعد تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہُوں کہ ہر دُوسرے قانون کی پیروی چھوڑ کر اِس قانون کی پیروی کریں۔

اللہ کے بعد اطاعت کا مستحق اللہ کا رسُول ہے

کسی کو یہ شُبہ لاحق نہ ہو کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم خود اپنی سُنّت کی اطاعت و پیروی کیسے کر سکتے تھے جبکہ وہ آپؐ کا اپنا ہی قول یا فعل ہوتا تھا؟ اِس معاملے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ قرآن جس طرح خدا کی طرف سے تھا اُسی طرح رسُول ہونے کی حیثیت سے جو حکم آپؐ دیتے، یا جس کام سے آپؐ منع فرماتے، یا جس طریقے کو آپؐ مقرر کرتے تھے، وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اسی کا نام سُنّتِ رسُول ہے، اور اس کی پیروی آپؐ خود بھی اُسی طرح کرتے تھے جس طرح سب اہلِ ایمان کے لیے اس کی پیروی لازم تھی۔ یہ بات ایسے مواقع پر پُوری طرح واضح ہو جاتی تھی جب صحابۂ کرامؓ کسی معاملے میں آپؐ سے پوچھتے تھے کہ یا رسُول اللہ، کیا آپؐ یہ اللہ کے حکم سے فرما رہے ہیں یا یہ آپؐ کی اپنی رائے ہے، اور آپؐ جواب دیتے تھے کہ اللہ کا حکم نہیں ہے بلکہ میری رائے ہے، اور یہ معلوم ہونے کے بعد صحابہؓ حضوؐر کی رائے سے اختلاف کر کے اپنی تجویز پیش کرتے تھے، اور آپؐ اپنی رائے چھوڑ کر ان کی تجویز قبول فرما لیتے تھے۔ اِسی طرح یہ بات اُن مواقع پر بھی کُھل جاتی تھی جب آپؐ کسی معاملے میں صحابہؓ سے مشورہ طلب فرماتے تھے۔ یہ مشاورت خود اِس امر کی دلیل ہوتی تھی کہ اُس معاملے میں خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا ہے، کیونکہ خدا کا حکم ہوتا تو اس میں مُشاورت کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ ایسے مواقع رسُول اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے عہد میں بارہا پیش آئے ہیں جن کی تفصیلات احادیث میں ہم کو ملتی ہیں۔ بلکہ صحابہؓ کا تو یہ بیان ہے کہ ہم نے حضوؐر سے زیادہ مشاورت کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ اس پر آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہو گا کہ یہ بھی حضوؐر کی سُنّت ہی تھی کہ جس معاملہ میں اللہ کا حکم نہ ہو اس میں مشورہ کیا جائے، اور کوئی دوسرا حاکم تو درکنار، اللہ کا رسول تک

اپنی ذاتی رائے کو لوگوں کے لیے فرمانِ واجب الاذعان نہ قرار دے۔ اِس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُمّت کو شوریٰ کے طریقے سے کام کرنے کی تربیت دی، اور لوگوں کو یہ سکھایا کہ جس معاملہ میں حکمِ الٰہی ہو اُس میں بے چُون وچرا اطاعت کرو، اور جہاں حکمِ الٰہی نہ ہو وہاں آزادیٔ رائے کا حق بے خوف و خطر استعمال کرو۔

آزادی کا حقیقی چارٹر

یہ نوعِ انسانی کے لیے آزادی کا وہ چارٹر ہے جو دینِ حق کے سوا دُنیا میں کسی نے اُس کو نہیں دیا۔ اللہ کے بندے صرف ایک اللہ ہی کے بندے ہوں اور کسی کے بندے نہ ہوں، حتیٰ کہ اللہ کے رسُول کے بندے بھی نہ ہوں، اِس نے انسان کو ایک خدا کے سوا ہر دوسرے کی بندگی سے آزاد کر دیا اور انسان پر سے انسان کی خدائی ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔

اس کے ساتھ ایک عظیم ترین نعمت جو اس پیغام نے انسان کو عطا کی وہ ایک ایسے قانون کی بالاتری ہے جسے توڑنے مروڑنے اور ردّ و بدل کا تختۂ مشق بنانے کا اختیار کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر یا جمہُوری مجلسِ قانون ساز یا اسلام قبول کرنے والی کسی قوم کو حاصل نہیں ہے۔ یہ قانون خیر و شرّ کی مستقل قدریں (Permanent Values) انسان کو دیتا ہے جنہیں بدل کر کبھی کوئی خیر کو شر اور شر کو خیر نہیں بنا سکتا۔

خُدا کے حضُور جواب دہی کا تصوُّر

تیسری بات جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بندگانِ خدا کو بتائی وہ یہ ہے کہ تم خدا کے سامنے جوابدہ ہو۔ تم اِس دُنیا میں شُترِ بے مُہار بنا کر نہیں چھوڑ دیے گئے ہو کہ اپنی مرضی سے جو چاہو کرتے رہو، جس کھیت میں چاہو چرتے پھرو، اور کوئی تمہیں پوچھنے والا نہ ہو۔ بلکہ تم اپنے ایک ایک قول، اور اپنی پُوری اختیاری زندگی کے اعمال کا حساب اپنے خالق و معبُود کو دینے والے ہو۔ مرنے کے بعد تمہیں اُٹھنا پڑے گا اور اپنے رب کے سامنے باز پُرس کے لیے پیش ہونا پڑے گا۔

یہ ایک ایسی زبردست اخلاقی طاقت ہے جو اگر انسان کے ضمیر میں جاگزیں ہو جائے تو اُس کا حال ایسا ہو گا جیسے اُس کے ساتھ ہر وقت ایک چوکیدار لگا ہُوا ہے جو بُرائی کے ہر ارادے پر اُسے ٹوکتا اور ہر اِقدام پر اُسے روکتا ہے۔ باہر کوئی گرفت کرنے والی پولیس اور سزا دینے والی حکومت موجود ہو یا نہ ہو، اس کے اندر ایک ایسا محتسب بیٹھا رہے گا جس کی پکڑ کے خوف سے وہ کبھی خَلوت میں، یا جنگل میں، یا اندھیرے میں یا کسی سُنسان جگہ میں بھی خدا کی نافرمانی نہ کر سکے گا۔ اِس سے بڑھ کر انسان کی اخلاقی اصلاح اور اس کے اندر

ایک مستحکم کردار پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ دوسرے جتنے ذرائع سے بھی آپ اخلاق سنوارنے کی کوشش کریں گے، اِس سے آگے نہ بڑھ سکیں گے کہ بھلائی دُنیا میں فائدہ مند اور بُرائی نقصان دِہ ہے۔ اور یہ کہ ایمان داری ایک اچھی پالیسی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ پالیسی کے اعتبار سے اگر بُرائی اور بے ایمانی مفید ہو اور اُس سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو اُسے بلا تکلّف کر ڈالا جائے۔ اسی نقطۂ نظر کا تو یہ نتیجہ ہے کہ جو لوگ اپنی انفرادی زندگی میں اچھا رَوِیّہ رکھتے ہیں وہی اپنے قومی کردار میں انتہا درجے کے بے ایمان، دغاباز، لُٹیرے اور ظالم وجابر بن جاتے ہیں۔ بلکہ انفرادی زندگی میں بھی وہ اگر بعض معاملات میں اچھے ہوتے ہیں تو بعض دوسرے معاملات میں بہت بُرے ہوتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک طرف وہ کاروبار میں کھرے اور برتاؤ میں خوش اخلاق ہیں تو دوسری طرف شرابی، زانی، جُواری، اور سخت بدکار و سیاہ کار ہیں۔ ان کا مقولہ یہ ہے کہ آدمی کی پبلک زندگی اور چیز ہے اور پرائیویٹ زندگی اور چیز۔ نجی زندگی کے کسی عیب پر کوئی ٹوکے تو ان کا گھڑا گھڑایا جواب یہ ہوتا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو (Mind Your Business)۔ اِس کے بالکل برعکس آخرت کا عقیدہ ہے جو کہتا ہے کہ بُرائی ہر حال میں بُرائی ہے خواہ دُنیا میں وہ مفید ہو یا نقصان دِہ۔ جو شخص خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس رکھتا ہو اُس کی زندگی میں پبلک اور پرائیویٹ کے دو شعبے الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ وہ ایمانداری اختیار کرتا ہے تو اِس وجہ سے نہیں کہ یہ اچھی پالیسی ہے، بلکہ اُس کے عین وجود میں ایمانداری شامل ہوتی ہے اور وہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ اُس کا کام کبھی بے ایمانی کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ اُس کا عقیدہ اُسے یہ سکھاتا ہے کہ تم اگر بے ایمانی کرو گے تو جانوروں کی سطح سے بھی نیچے جا پڑو گے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہُوا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ؕ "ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اُسے اوندھا کر سب نیچوں سے نیچ کر دیا"۔

اس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رہنمائی سے انسان کو صرف ایک مستقل اَخلاقی اَقدار رکھنے والا ناقابلِ تبدیل قانون ہی نہیں ملا، بلکہ انفرادی اور قومی اخلاق و کردار کے لیے ایک ایسی بنیاد بھی مل گئی جو کبھی متزلزل ہونے والی نہیں ہے، جو اس بات کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی حکومت موجود ہو، کوئی پولیس موجود ہو، کوئی عدالت موجود ہو تو آپ سیدھے راستے پر چلیں، ورنہ مُجرم بن کر رہیں۔

رہبانیت کے بجائے دُنیا داری میں اَخلاق کا استعمال

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت ایک اور اہم سبق ہمیں دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق راہبوں کے گوشۂ عزلت کے لیے نہیں ہے، درویشوں کی خانقاہوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ دُنیا کی زندگی کے ہر شعبے میں برتنے کے لیے ہے۔ جس رُوحانی اور اخلاقی بلندی کو دُنیا فقیروں اور درویشوں میں تلاش کرتی تھی،

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اُسے حکومت کی مسند پر اور عدالت کی کرسی پر اٹھا لاتے۔ آپؐ نے تجارت کے کاروبار میں خدا ترسی اور دیانت سے کام لینا سکھایا۔ آپؐ نے پولیس اور فوج کے سپاہیوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کا سبق دیا۔ آپؐ نے انسان کی اِس غلط فہمی کو دُور کیا کہ خدا کا ولی وہ ہوتا ہے جو تارکُ الدنیا ہو کر بس اللہ اللہ کرتا رہے۔ آپؐ نے بتایا کہ ولایت اِس کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل ولایت یہ ہے کہ آدمی ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک تھانیدار، ایک تاجر و صنعتکار، اور دوسری تمام حیثیتوں سے ایک پُورا دنیادار بن کر بھی ہر اُس موقع پر اپنا خدا ترس اور دیانتدار ہونا ثابت کر دے جہاں اس کے ایمان کو آزمائش سے سابقہ پیش آئے۔ اِس طرح آپؐ اخلاق و روحانیت کو رہبانیت کے گوشوں سے نکال کر معیشت و معاشرت، سیاست و عدالت اور صلح و جنگ کے میدانوں میں لے آئے اور یہاں پاکیزہ اخلاق کی حکمرانی قائم کی۔

حضورؐ کی ہدایت کا فیض

یہ اسی رہنمائی کا فیض تھا کہ اپنی نبوّت کے آغاز میں جن لوگوں کو آپؐ نے ڈاکو پایا تھا ان کو اِس حالت میں چھوڑا کہ وہ امانت دار اور خلقِ خدا کی جان و مال اور آبرو کے محافظ بن چکے تھے۔ جن لوگوں کو حق مارنے والا پایا تھا اُنہیں حق ادا کرنے والا، حقوق کی حفاظت کرنے والا، اور حقوق دلوانے والا بنا کر چھوڑا۔ آپؐ سے پہلے دُنیا اُن حاکموں سے واقف تھی جو ظلم و جَور سے رعیّت کو دبا کر رکھتے تھے اور اُونچے اونچے محلّوں میں رہ کر اپنی خدائی کا سکّہ جماتے تھے۔ آپؐ نے اُسی دنیا کو ایسے حاکموں سے روشناس کرایا جو بازاروں میں عام انسانوں کی طرح چلتے تھے اور عدل و انصاف سے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ آپؐ سے پہلے دُنیا اُن فوجوں سے واقف تھی جو کسی ملک میں گھستی تھیں تو ہر طرف قتلِ عام برپا کرتی، بستیوں کو آگ لگاتی، اور مفتوح قوم کی عورتوں کو بے آبرو کرتی پھرتی تھیں۔ آپؐ نے اُسی دُنیا کو ایسی فوجوں سے مُتعارف کرایا جو کسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوئیں تو دشمن کی فوج کے سوا کسی پر دست درازی نہ کرتی تھیں اور فتح کیے ہوئے شہر سے وصول کیے ہوئے ٹیکس تک انہیں واپس کر دیتی تھیں۔ انسانی تاریخ مُلکوں اور شہروں کی فتح کے قِصّوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر فتحِ مکّہ کی کوئی نظیر آپ کو تاریخ میں نہ ملے گی۔ جس شہر کے لوگوں نے تیرہ برس تک رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ظلم و ستم ڈھایا تھا اُسی شہر میں آپؐ کا فاتحانہ داخلہ اس شان سے ہُوا تھا کہ آپؐ کا سر خدا کے آگے جُھکا جا رہا تھا، آپؐ کی پیشانی اُونٹ کے کجاوے سے لگی جا رہی تھی، اور آپؐ کے طرزِ عمل میں غرور و تکبّر کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہی لوگ جو ۱۳ برس تک آپؐ پر ظلم و ستم

کرتے رہے تھے، جنہوں نے آپؐ کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا، اور جو ہجرت کے بعد بھی آٹھ برس تک آپؐ سے برسرِ جنگ رہے تھے، جب مغلوب ہو کر آپؐ کے سامنے پیش ہوئے تو انہوں نے آپؐ سے رحم و کرم کی التجا کی اور آپؐ نے انتقام لینے کے بجائے فرمایا کہ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ، تم چھوڑ دیے گئے۔"

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اِس نمونے کا جو اثر آپؐ کی اُمّت پر پڑا ہے اس کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو تاریخ میں خود دیکھ لے کہ مسلمان جب اسپین میں داخل ہوئے تو ان کا رویّہ کیا تھا، اور جب عیسائیوں نے ان پر فتح پائی تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں جب عیسائی بیت المَقدِس میں داخل ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور مسلمانوں نے جب بیت المقدس کو ان سے واپس لیا تو عیسائیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا تھا۔

حضرات، رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت ایک بحرِ ذخّار ہے جس کا احاطہ کرنا کسی بڑی کتاب میں بھی ممکن نہیں ہے، کجا کہ ایک تقریر میں کیا جا سکے۔ تاہم مَیں نے زیادہ سے زیادہ ممکن اختصار کے ساتھ اُس کے چند نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اِس واحد ذریعۂ ہدایت سے رہنمائی حاصل کریں۔

وآخر دعوانا اَنِ الحمد للہ ربّ العٰلمین۔

تصاویر

نقشہ جات

حوالہ جات

۱۔ تحریکِ آزادئ ہند اور مسلمان، حصّہ دوم، صفحہ ۱۷۷ تا ۱۷۸۔

۲۔ مقدمۂ تفہیم القرآن، جلد اوّل

۳۔ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۱۳۵

۴۔ تفہیمات، حصّہ اوّل، صفحہ ۹ تا ۱۷

۵۔ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ نحل، حاشیہ ۹

۶۔ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ نحل، حاشیہ ۱۰

۷۔ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ نحل، حاشیہ ۱۴

۸۔ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ طٰہٰ، حاشیہ ۲۳

۹۔ دینیات، صفحہ ۳۹ تا ۵۲

۱۰۔ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۳۰

۱۱۔ دینیات، صفحہ ۵۲ تا ۵۵

۱۲۔ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یونسؑ، حاشیہ ۴۷

۱۳۔ تحریکِ آزادئ ہند اور مسلمان، حصّہ دوم، صفحہ ۱۰۵-۱۰۶

۱۴۔ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ آلِ عمران، حاشیہ ۴۸

۱۵۔ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ نساء، حاشیہ ۲۰۸

۱۶۔ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ نساء، حاشیہ ۹۴

۱۷؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ توبہ، حاشیہ ۳۲

۱۸؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اَعراف، حاشیہ ۴۴

۱۹؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اَعراف، حاشیہ ۴۴

۲۰؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اَعراف، حاشیہ ۸۸

۲۱؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ قَصَص، حاشیہ ۶۶

۲۲؎ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ نِساء، حاشیہ ۹۴

۲۳؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورہ کہف، حاشیہ ۵۳

۲۴؎ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ آلِ عمران، حاشیہ ۱۷

۲۵؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۹۱

۲۶؎ رسائل و مسائل، حصّہ اوّل، صفحہ ۲۵ تا ۲۷

۲۷؎ رسائل و مسائل، حصہ اوّل، صفحہ ۳۴ تا ۳۶

۲۸؎ تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۂ تحریم

۲۹؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱

۳۰؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یوسفؑ، حاشیہ ۶۶

۳۱؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سُورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۴۹

۳۲؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سُورۂ ہودؑ، حاشیہ ۵۰

۳۳؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یوسفؑ، حاشیہ ۲۲

۳۴؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۷۰

۳۵؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۸۷

۳۶؎ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ نِساء، حاشیہ ۲۰۴

۳۷؎ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ شوریٰ، حاشیہ ۱

۳۸ھ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ نحل، حاشیہ ۵۶

۳۹ھ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ شوریٰ، حاشیہ ۸۱

۴۰ھ رسائل و مسائل، حصۂ سوم، صفحہ ۳۴۸ تا ۳۵۱

۴۱ھ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ صٰفّٰت، حاشیہ ۶۰

۴۲ھ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ نَحل، حاشیہ ۵۶

۴۳ھ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ قَصَص، حاشیہ ۱۰

۴۴ھ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سُورۂ نِساء، حاشیہ ۲۰۴

۴۵ھ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یونسؑ، حاشیہ ۲۰

۴۶ھ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ ہودؑ، حاشیہ ۱۳

۴۷ھ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ شُوریٰ، حاشیہ ۸۳

۴۸ھ قادیانی مسئلہ اور اُس کے سیاسی، دینی اور تمدّنی پہلو، صفحہ ۲۴۷ تا ۲۵۰

۴۹ھ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یُونسؑ، حاشیہ ۲۱

۵۰ھ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ قَصَص، حاشیہ ۶۴

۵۱ھ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ رعد، حاشیہ ۳۱

۵۲ھ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ حج، حاشیہ ۱۱۰

۵۳ھ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ ہودؑ، حاشیہ ۳۴

۵۴ھ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ نَحْل، حاشیہ ۳

۵۵ھ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۳

۵۶ھ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ شوریٰ، حاشیہ ۸۳

۵۷ھ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ اَنعام، حاشیہ ۶۱

۵۸ھ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ شوریٰ، حاشیہ ۲۵

۵۹ے تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سجدہ، حاشیہ ۵

۶۰ے تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ فاطر، حاشیہ ۱۷

۶۱ے تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ بَیِّنَہ، حاشیہ ۳

۶۲ے تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ بَیِّنَہ، حاشیہ ۶

۶۳ے تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۂ بَیِّنَہ

۶۴ے دینیات، صفحہ ۵۷ تا ۶۰

۶۵ے تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ زُخرُف، حاشیہ ۴

۶۶ے تفہیمات، حصّہ اول، صفحہ ۲۳۸ تا ۲۵۵

۶۷ے تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ عَنکَبُوت، حاشیہ ۹۱

۶۸ے تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ عَنکَبُوت، حاشیہ ۸۸

۶۹ے تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ عَنکَبُوت، حاشیہ ۸۹

۷۰ے تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ عَنکَبُوت، حاشیہ ۹۱

۷۱ے تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یونسؑ، حاشیہ ۲۱

۷۲ے تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ شُوریٰ، حاشیہ ۸۴

۷۳ے تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ قصص، حاشیہ ۱۰۹

۷۴ے تفہیم القرآن، جلد ششم، سورہ بَیِّنَہ، حاشیہ ۴

۷۵ے تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سجدہ، حاشیہ ۱

۷۶ے تفہیم القرآن، جلد پنجم، سورۂ صف، حاشیہ ۷

۷۷ے تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اَعراف، حاشیہ ۱۱۳

۷۸ے تفہیم القرآن، جلد پنجم، سورۂ صف، حاشیہ ۸

۷۹ے نشری تقریریں، صفحہ ۱۳ تا ۱۹

۸۰ے نشری تقریریں، صفحہ ۲۸ تا ۳۸

۸۱ــہ رسائل و مسائل، حصۂ سوم، صفحہ ۱۴۹

۸۲ــہ دینیات، صفحہ ۵۵ تا ۵۷، ۷۱-۷۲

۸۳ــہ دینیات، صفحہ ۷۲ تا ۷۵

۸۴ــہ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سبا، حاشیہ ۴۷

۸۵ــہ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ فاطر، حاشیہ ۴۴-۴۵

۸۶ــہ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۱۰۰

۸۷ــہ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یونسؑ، حاشیہ ۵۵

۸۸ــہ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ فرقان، حاشیہ ۶۶

۸۹ــہ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ فرقان، حاشیہ ۴

۹۰ــہ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۱

۹۱ــہ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ آلِ عمران، حاشیہ ۶۹

۹۲ــہ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۲۸

۹۳ــہ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ احزاب، حاشیہ ۱۵

۹۴ــہ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یونسؑ، حاشیہ ۲۳

۹۵ــہ رسائل و مسائل، حصۂ دوم، صفحہ ۳۲۱ تا ۳۲۹

۹۶ــہ رسائل و مسائل، حصۂ دوم، صفحہ ۳۲۹ تا ۳۳۵

۹۷ــہ رسائل و مسائل، حصہ اوّل، صفحہ ۳۰-۳۲، تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ احزاب حاشیہ ۷۷

۹۸ــہ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ احزاب، ضمیمہ بسلسلۂ حاشیہ ۷۷

۹۹ــہ رسائل و مسائل، حصہ سوم، صفحہ ۱۶۴ تا ۱۶۷

۱۰۰ــہ رسائل و مسائل، حصہ سوم، صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۴

۱۰۱ــہ رسائل و مسائل، حصۂ سوم، صفحہ ۱۵۴ تا ۱۵۷

۱۰۲ہ رسائل و مسائل، حصّہ سوم، صفحہ ۱۵۸ تا ۱۶۲

۱۰۳ہ تلخیص از تفہیمات، حصّہ اوّل، صفحہ ۲۵۹ تا ۲۷۱

۱۰۴ہ تفہیمات، حصّہ اوّل، صفحہ ۹۸ تا ۱۱۳

۱۰۵ہ تفہیمات، حصّہ اوّل، صفحہ ۲۸۸ تا ۳۱۷

۱۰۶ہ تفہیمات، حصّہ اوّل، صفحہ ۲۷۳ تا ۲۸۱۔

۱۰۷ہ سُنّت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۴۷ تا ۸۰، تفہیم القرآن جلد دوم، سُورۂ نحل، حاشیہ ۴۰

۱۰۸ہ سنّت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۷۸، ۸۵

۱۰۹ہ اسلامی ریاست، صفحہ ۴۶۵ - ۴۶۶

۱۱۰ہ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ نساء، حاشیہ ۸۹

۱۱۱ہ تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ قیٰمہ، حاشیہ ۱۳

۱۱۲ہ سنّت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۹۳ تا ۹۵

۱۱۳ہ سنّت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۱۲۱

۱۱۴ہ سُنّت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۵

۱۱۵ہ تفہیم القرآن، جلد پنجم، سورۂ جُمعہ، حاشیہ ۱۴

۱۱۶ہ تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ عَلَق، حاشیہ ۱۰

۱۱۷ہ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ بنی اسرائیل حاشیہ ۱۰۷

۱۱۸ہ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ فرقان، حاشیہ ۴ تا ۱۶

۱۱۹ہ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ اَنعام، حاشیہ ۳۱

۱۲۰ہ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ نَحل، حاشیہ ۴۰

۱۲۱ہ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۸

۱۲۲ہ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اَعراف، حاشیہ ۱۰

۱۲۳؎ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ ہُودؑ ، حاشیہ ۳۷

۱۲۴؎ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ مومنون، حاشیہ ۲۶

۱۲۵؎ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ ہُودؑ ، حاشیہ ۳۱

۱۲۶؎ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ مومنون ، حاشیہ ۳۶

۱۲۷؎ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ ابراہیمؑ ، حاشیہ ۲۱

۱۲۸؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ ابراہیمؑ ، حاشیہ ۱۹

۱۲۹؎ تفہیم القرآن ، جلد چہارم، سورۂ یٰسٓ، حاشیہ ۱۱ ، جلد دوم، سُورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۷

۱۳۰؎ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل ، آیت ۹۵

۱۳۱؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ یوُسفؑ ، حاشیہ ۷۹

۱۳۲؎ تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سورۂ اَنعام ، حاشیہ ۳۲

۱۳۳؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ رعد ، حاشیہ ۵۶

۱۳۴؎ تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سورۂ حٰم سجدہ ، حاشیہ ۱۹

۱۳۵؎ تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سورۂ زُخرُف ، حاشیہ ۳۰

۱۳۶؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ فرقان ، حاشیہ ۱۴

۱۳۷؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ فرقان، حاشیہ ۲۹

۱۳۸؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ انبیاءؑ ، حاشیہ ۹

۱۳۹؎ ماخوذ از تحریکِ آزادئ ہند اور مُسلمان، حصّہ اوّل، صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۵

۱۴۰؎ دینِ حق، صفحہ ۳ تا ۳۸

۱۴۱؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سُورۂ ہودؑ ، حاشیہ ۹۷

۱۴۲؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ ہودؑ ، حاشیہ ۶۹

۱۴۳؎ تجدید و احیائے دین، صفحہ ۱۳ تا ۱۴۳

۱۴۴ ماخوذ از تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ شوریٰ، حاشیہ ۲۰ - جلد دوم، سورۂ یوسف حاشیہ ۶۰
جلد چہارم، سورۂ زمر: حاشیہ ۳ - قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۳، ۱۵۲-۱۵۶

۱۴۵ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۸۷

۱۴۶ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ کہف، حاشیہ ۲۳

۱۴۷ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ عنکبوت، حاشیہ ۲۲

۱۴۸ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۵۸

۱۴۹ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۹۳ تا ۲۹۵

۱۵۰ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ صٓ، حاشیہ ۴۳

۱۵۱ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ مومنون، حاشیہ ۳۹

۱۵۲ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۹۰

۱۵۳ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۹۴

۱۵۴ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۹۵

۱۵۵ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۹۶

۱۵۶ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۱۳

۱۵۷ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۱۵

۱۵۸ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ طٰہٰ، حاشیہ ۵۳

۱۵۹ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ شعراء، حاشیہ ۴۷

۱۶۰ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ طٰہٰ، حاشیہ ۵۹

۱۶۱ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ نمل، حاشیہ ۲۱

۱۶۲ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ مومنون، حاشیہ ۳۴

۱۶۳ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ مریم، حاشیہ ۱۶

۱۶۴؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ مریم، حاشیہ ۱۷

۱۶۵؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ مریم، حاشیہ ۱۹-الف

۱۶۶؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ مریم، حاشیہ ۲۰

۱۶۷؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ مریم، حاشیہ ۲۰-الف

۱۶۸؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ مریم، حاشیہ ۲۱

۱۶۹؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۱۵۱-۱۵۲

۱۷۰؎ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ انعام، حاشیہ ۲۳

۱۷۱؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ طٰہٰ، حاشیہ ۱۱۶

۱۷۲؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ عنکبوت، حاشیہ ۸۸

۱۷۳؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ عنکبوت، حاشیہ ۹۱

۱۷۴؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ رعد، حاشیہ ۴۷

۱۷۵؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ شعراء، حاشیہ ۳

۱۷۶؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ شعراء، حاشیہ ۵

۱۷۷؎ تفہیم القرآن، جلد پنجم، سورۂ قمر، حاشیہ ۱

۱۷۸؎ تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ مدثر، حاشیہ ۳۶-جلد اوّل، سورہ بقرہ، حاشیہ ۲۸۱

۱۷۹؎ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۸۲

۱۸۰؎ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ انعام، حاشیہ ۳۳

۱۸۱؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یونسؑ، حاشیہ ۲۴

۱۸۲؎ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ مومن، حاشیہ ۳۲

۱۸۳؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ مریم، حاشیہ ۵۲

۱۸۴؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ طٰہٰ، حاشیہ ۸۵-۸۶

۱۸۵ـہ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ کوثر، حاشیہ ۱

۱۸۶ـہ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ نبأ، حاشیہ ۲۵

۱۸۷ـہ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۲۷

۱۸۸ـہ تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ سبا، حاشیہ ۴۰

۱۸۹ـہ تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ سبا، حاشیہ ۴۱

۱۹۰ـہ تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ دخان، حاشیہ ۳۷

۱۹۱ـہ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ ہودؑ، حاشیہ ۸۴

۱۹۲ـہ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ ہودؑ، حاشیہ ۱۰۶

۱۹۳ـہ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ ہودؑ، حاشیہ ۱۰۶

۱۹۴ـہ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ نحل ، حاشیہ ۶۴

۱۹۵ـہ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ نحل ، حاشیہ ۷۹

۱۹۶ـہ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ حج ، حاشیہ ۱۲۴-۱۲۵

۱۹۷ـہ تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سورۂ زمر، حاشیہ ۶۲

۱۹۸ـہ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ نجم، حاشیہ ۲۱

۱۹۹ـہ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ رعد، حاشیہ ۱۹

۲۰۰ـہ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ منافقون، حاشیہ ۱۳

۲۰۱ـہ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ منافقون، حاشیہ ۱۴

۲۰۲ـہ رسائل و مسائل، حصۂ دوم ، صفحہ ۳۴۹ - ۳۵۰

۲۰۳ـہ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ ضحیٰ، حاشیہ ۴

۲۰۴ـہ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ ضحیٰ، حاشیہ ۵

۲۰۵ـہ تفہیم القرآن، جلد پنجم ، سورۂ جمعہ، حاشیہ ۶

۲۰۶ـ تفہیم القرآن، جلد ششم ، دیباچہ سورۂ ضحیٰ

۲۰۷ـ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ اَلَم نَشرَح، حاشیہ ۲

۲۰۸ـ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ اَلَم نَشرَح، حاشیہ ۳

۲۰۹ـ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ اَلَم نَشرَح، حاشیہ ۱

۲۱۰ـ تفہیم القرآن، جلد ششم ، دیباچہ سورۂ کوثر

۲۱۱ـ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ کوثر، حاشیہ ۴

۲۱۲ـ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ کوثر، حاشیہ ۳

۲۱۳ـ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ کوثر، حاشیہ ۱

۲۱۴ـ تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ لہب، حاشیہ ۱

۲۱۵ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۸۹

۲۱۶ـ تفہیم القرآن، جلد پنجم ، سورۂ قمر، حاشیہ ۲۴

۲۱۷ـ تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ صٰفّٰت، حاشیہ ۹۴

۲۱۸ـ تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ صٓ، حاشیہ ۱۲

۲۱۹ـ تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ حٰم سجدہ، حاشیہ ۷۰

۲۲۰ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ قصص، حاشیہ ۱۰۸

۲۲۱ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۸

۲۲۲ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، دیباچہ سورۂ رُوم

۲۲۳ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ روم، حاشیہ ۳

۲۲۴ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ یونس، حاشیہ ۹۲-۹۳

۲۲۵ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ کہف، حاشیہ ۶۹

۲۲۶ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۹۳

۲۲۷ ؎ رسائل و مسائل حصّہ سوم ، صفحہ ۱۸۹ تا ۱۹۱

۲۲۸ ؎ تفہیم القرآن، جلد سوم ، دیباچہ سورۂ مریم

۲۲۹ ؎ تفہیم القرآن، جلد چہارم ، دیباچہ سورۂ صٓ

۲۳۰ ؎ رسائل و مسائل، حصّہ اوّل ، صفحہ ۶۶

۲۳۱ ؎ رسائل و مسائل، حصّہ اوّل ، صفحہ ۱۷۷

۲۳۲ ؎ رسائل و مسائل، حصّہ اوّل ، صفحہ ۵۳

۲۳۳ ؎ تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۵۶

۲۳۴ ؎ خلافت و ملوکیّت ، صفحہ ۱۴۸

۲۳۵ ؎ تجدید و احیائے دین ، صفحہ ۴۹ تا ۵۱

۲۳۶ ؎ خلافت و ملوکیّت ، صفحہ ۷۹ تا ۸۰

۲۳۷ ؎ تجدید و احیائے دین ، صفحہ ۴۲-۴۳

۲۳۸ ؎ رسائل و مسائل ، حصّہ اوّل ، صفحہ ۵۴

۲۳۹ ؎ رسائل و مسائل، حصّہ اوّل ، صفحہ ۵۵-۵۶

۲۴۰ ؎ رسائل و مسائل، حصّہ اول ، صفحہ ۵۶-۵۷

۲۴۱ ؎ رسائل و مسائل، حصّہ اوّل ، صفحہ ۶۱

۲۴۲ ؎ تجدید و احیائے دین ، صفحہ ۴۹ تا ۵۴

۲۴۳ ؎ تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ احزاب، ضمیمہ بسلسلۂ حاشیہ ۷۷

۲۴۴ ؎ رسائل و مسائل، حصّہ اوّل ، صفحہ ۴۷ تا ۵۰

۲۴۵ ؎ رسائل و مسائل، حصّہ سوم ، صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵

۲۴۶ ؎ خلافت و ملوکیّت ، صفحہ ۱۳۶ تا ۱۳۸

۲۴۷ ؎ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۹۳

۲۴۸؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ فرقان، حاشیہ ۱۲

۲۴۹؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ کہف، حاشیہ ۵۷

۲۵۰؎ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ مومن، حاشیہ ۴۱

۲۵۱؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ کہف، حاشیہ ۹، ۲۵

۲۵۲؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۱۷

۲۵۳؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ فرقان، حاشیہ ۵۴

۲۵۴؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یوسفؑ، حاشیہ ۷۹

۲۵۵؎ تفہیم القرآن، جلد پنجم، سورۂ ذٰریٰت، حاشیہ ۲۱

۲۵۶؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ ہُودؑ، حاشیہ ۱۱۵

۲۵۷؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، دیباچہ سورۂ شعراء

۲۵۸؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یونسؑ، حاشیہ ۱۸

۲۵۹؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۷۴

۲۶۰؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ ہُودؑ، حاشیہ ۴۶

۲۶۱؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اَعراف، حاشیہ ۴۸۔ جلد ششم، سورۂ نوحؑ، حاشیہ ۱۶

۲۶۲؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اَعراف، حاشیہ ۴۸

۲۶۳؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورہ شُعَراء، حاشیہ ۸۵

۲۶۴؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورہ ہُودؑ، حاشیہ ۴۲

۲۶۵؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورہ ہُودؑ، حاشیہ ۴۶

۲۶۶؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ عَنکبَوت، حاشیہ ۲۵۔ جلد پنجم، سورۂ قمر، حاشیہ ۱۴

۲۶۷؎ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اَعراف، حاشیہ ۵۱

۲۶۸؎ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورہ اَحقاف، حاشیہ ۲۵

۲۶۹ے تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ اَحقاف ، حاشیہ ۲۵

۲۷۰ے تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ اَعراف ، حاشیہ ۵۶

۲۷۱ے تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ شُعَراء، حاشیہ ۸۹

۲۷۲ے تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ توبہ ، حاشیہ ۷۹

۲۷۳ے تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سورہ حٰم سَجدہ ، حاشیہ ۲۰

۲۷۴ے تفہیم القرآن، جلد پنجم ، سورۂ قَمَر ، حاشیہ ۱۶

۲۷۵ے تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورہ قَمَر ، حاشیہ ۱۶

۲۷۶ے تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ عَنکبوت ، حاشیہ ۶۵

۲۷۷ے تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ اَعراف ، حاشیہ ۵۷

۲۷۸ے تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ اَعراف، حاشیہ ۵۹

۲۷۹ے تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ حِجْر ، حاشیہ ۴۵

۲۸۰ے تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ اَعراف ، حاشیہ ۵۷

۲۸۱ے تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ شُعَراء ، حاشیہ ۹۵

۲۸۲ے تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ قَمَر، حاشیہ ۱۷

۲۸۳ے تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ نَمل ، حاشیہ ۵۸

۲۸۴ے تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ قَمَر ، حاشیہ ۱۹

۲۸۵ے تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ اَعراف ، حاشیہ ۵۸

۲۸۶ے تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ شُعَراء ، حاشیہ ۱۰۵

۲۸۷ے تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ اَعراف ، حاشیہ ۶۱

۲۸۸ے تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ اَعراف، حاشیہ ۵۸

۲۸۹ے تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ اَعراف ، حاشیہ ۶۱

۲۹۰ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ نمل، حاشیہ ۶۵

۲۹۱ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ شعراء، حاشیہ ۱۰۶

۲۹۲ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ ہود، حاشیہ ۴۷

۲۹۳ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ شعراء، حاشیہ ۹۹

۲۹۴ـ تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۲۳

۲۹۵ـ تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ انعام، حاشیہ ۵۲

۲۹۶ـ تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، آیت ۲۵۸، حاشیہ ۲۹۱-۲۹۲

۲۹۷ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۶۲

۲۹۸ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۶۲

۲۹۹ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ شعراء، حاشیہ ۷۳

۳۰۰ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ عنکبوت، حاشیہ ۴۹

۳۰۱ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۶۶

۳۰۲ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ انبیاءؑ، حاشیہ ۶۳

۳۰۳ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ اعراف، حاشیہ ۶۳

۳۰۴ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ اعراف، حاشیہ ۶۳

۳۰۵ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ حِجر، حاشیہ ۴۲

۳۰۶ـ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ عنکبوت، حاشیہ ۵۱-۵۲

۳۰۷ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ اعراف، حاشیہ ۶۴

۳۰۸ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ ہودؑ، حاشیہ ۸۶ تا ۸۸

۳۰۹ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ حِجر، حاشیہ ۳۹

۳۱۰ـ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ حِجر، حاشیہ ۳۹

۳۱۱؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ شعراء ، حاشیہ ۱۱۱

۳۱۲؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ عنکبوت حاشیہ ۵۳

۳۱۳؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ عنکبوت ، حاشیہ ۵۵

۳۱۴؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ عنکبوت ، حاشیہ ۵۶

۳۱۵؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ عنکبوت ، حاشیہ ۵۷

۳۱۶؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ عنکبوت ، حاشیہ ۵۸

۳۱۷؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ عنکبوت ، حاشیہ ۵۸

۳۱۸؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ ہودؑ ، حاشیہ ۸۶ ، آیت ۷۸-۷۹

۳۱۹؎ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ قمر ، حاشیہ ۲۲

۳۲۰؎ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ ذٰریٰت ، حاشیہ ۳۲

۳۲۱؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ ہودؑ ، حاشیہ ۹۱

۳۲۲؎ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ ذٰریٰت ، حاشیہ ۳۴

۳۲۳؎ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ ذٰریٰت ، حاشیہ ۳۴

۳۲۴؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ شعراء ، حاشیہ ۱۱۴

۳۲۵؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ عنکبوت ، حاشیہ ۵۹

۳۲۶؎ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ ذٰریٰت ، حاشیہ ۳۵

۳۲۷؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ نمل ، حاشیہ ۲۹

۳۲۸؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ نمل ، حاشیہ ۳۰

۳۲۹؎ تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سورۂ سبا ، حاشیہ ۳۵

۳۳۰؎ تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سورۂ سبا ، حاشیہ ۳۳

۳۳۱؎ تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سورۂ سبا ، حاشیہ ۳۷

۳۳۲؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ شعراء ، حاشیہ ۱۱۵

۳۳۳ھ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ اعراف، حاشیہ ۶۹

۳۳۴ھ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ اعراف، حاشیہ ۷۴

۳۳۵ھ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ اعراف، حاشیہ ۷۵

۳۳۶ھ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ شعراء ، حاشیہ ۱۱۷

۳۳۷ھ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ انبیاءؑ ، حاشیہ ۸۳

۳۳۸ھ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ یونسؑ ، حاشیہ ۹۸ تا ۱۰۰

۳۳۹ھ تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ ، حاشیہ ۱۲۳

۳۴۰ھ تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ ، حاشیہ ۴۲

۳۴۱ھ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۶-۷

۳۴۲ھ تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۰۴ تا ۱۰۶

۳۴۳ھ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۸

۳۴۴ھ تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۹

۳۴۵ھ تفہیم القرآن، جلد اول ، سورۂ آلِ عمران، حاشیہ ۵۱

۳۴۶ھ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ مریم ، حاشیہ ۱۲

۳۴۷ھ تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ مریم ، حاشیہ ۱۴ تا ۱۹، ۲۱

۳۴۸ھ تفہیم القرآن، جلد پنجم ، سورۂ قٓ ، حاشیہ ۱۲

۳۴۹ھ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ صفحہ ۲۴-۲۵

۳۵۰ھ الجہاد فی الاسلام، صفحہ ۲۷-۲۸

۳۵۱ھ تفہیم القرآن، جلد ششم ، دیباچہ سورۂ اخلاص

۳۵۲ھ تفہیم القرآن، جلد پنجم ، سورۂ حُجُرات، حاشیہ ۲۸

۳۵۳ھ تفہیمات حصّہ اوّل ، صفحہ ۲۳۹ تا ۲۴۱

۳۵۴ تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سورۂ اَنْعام ، حاشیہ ۱۰۹

۳۵۵ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ نَجْم ، حاشیہ ۱۵

۳۵۶ تفہیم القرآن ، جلد ششم ، سورۂ نُوحؑ ، حاشیہ ۱۷

۳۵۷ تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سورۂ صٰفّٰت ، حاشیہ ۱۷

۳۵۸ تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سُورۂ اَنْعام ، حاشیہ ۱

۳۵۹ تفہیم القرآن ، جلد ششم ، سورۂ اِخلاص ، حاشیہ ۲

۳۶۰ تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سورۂ اَنْعام ، حاشیہ ۱۰۵

۳۶۱ تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سورۂ اَنْعام ، حاشیہ ۱۰۶

۳۶۲ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ نَحْل ، حاشیہ ۶۴

۳۶۳ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ فُرقان ، حاشیہ ۸۴

۳۶۴ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ فُرقان ، حاشیہ ۸۴

۳۶۵ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ نَحْل ، حاشیہ ۱۹

۳۶۶ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ نَحْل ، حاشیہ ۱۹

۳۶۷ تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، دیباچۂ سورۂ زُخْرُف

۳۶۸ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ اَعْراف ، حاشیہ ۱۴۸

۳۶۹ تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سُورۂ اَحقاف ، حاشیہ ۶

۳۷۰ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ یونسؑ ، حاشیہ ۳۷

۳۷۱ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ نُور ، حاشیہ ۵۹

۳۷۲ تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ ، حاشیہ ۱۴

۳۷۳ تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سورۂ اَنعام ، حاشیہ ۱۱۱

۳۷۴ تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سورہ اَنعام ، حاشیہ ۱۱۲

۳۷۵ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ انعام، حاشیہ ۱۱۴

۳۷۶ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ، حاشیہ ۱۱۸

۳۷۷ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۹۹

۳۷۸ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۱۸

۳۷۹ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۲۱

۳۸۰ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء، حاشیہ ۸۸

۳۸۱ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ

۳۸۲ء تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ جن، حاشیہ ۷

۳۸۳ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء، حاشیہ ۴

۳۸۴ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء، حاشیہ ۸۸

۳۸۵ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء، حاشیہ ۹۴

۳۸۶ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۵۰

۳۸۷ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء، حاشیہ ۴

۳۸۸ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء، حاشیہ ۱۵۵

۳۸۹ء تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ ماعون، حاشیہ ۵

۳۹۰ء تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ ماعون، حاشیہ ۵

۳۹۱ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ انعام، حاشیہ ۱۰۷

۳۹۲ء تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ فجر ، حاشیہ ۱۳

۳۹۳ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء، حاشیہ ۵۵

۳۹۴ء تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ تکویر، حاشیہ ۹

۳۹۵ء تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ تکویر، حاشیہ ۹

۳۹۶ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۷۷

۳۹۷ء تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ اعراف، حاشیہ ۱۵

۳۹۸ء تفہیم القرآن، جلد ششم ، دیباچہ سورۂ عادیات،

۳۹۹ء تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ عادیات، حاشیہ ۳

۴۰۰ء تفہیم القرآن، جلد ششم ، سورۂ قریش، حاشیہ ۵

۴۰۱ء تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ سجدہ، حاشیہ ۵

۴۰۲ء تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ فرقان، حاشیہ ۸۴

۴۰۳ء تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ حج، حاشیہ ۲۵

۴۰۴ء تفہیمات، حصّہ دوم، صفحہ ۳۲۲-۳۲۳

۴۰۵ء تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ حج، حاشیہ ۲۷

۴۰۶ء تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ لقمان، حاشیہ ۶۱

۴۰۷ء تفہیم القرآن، جلد پنجم ، سورۂ رحمٰن، حاشیہ ۱۳

۴۰۸ء تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ شعراء، حاشیہ ۵۷

۴۰۹ء تفہیم القرآن، جلد چہارم ، سورۂ سبا، حاشیہ ۷۶

۴۱۰ء رسائل و مسائل، حصّہ اوّل، صفحہ ۳۰۸

۴۱۱ء تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ نمل، حاشیہ ۷۳

۴۱۲ء تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ نمل، حاشیہ ۷۴

۴۱۳ء تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ نمل، حاشیہ ۸۰

۴۱۴ء تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورہ روم، حاشیہ ۶

۴۱۵ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۲۳

۴۱۶ء تفہیم القرآن، جلد پنجم ، سورۂ حشر، حاشیہ ۴

۴۱۷؎ تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ ، حاشیہ ۴۲

۴۱۸؎ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ حشر ، حاشیہ ۴

۴۱۹؎ تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ جمعہ ، حاشیہ ۱۰

۴۲۰؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، دیباچہ سورۂ یوسفؑ

۴۲۱؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ یوسفؑ ، حاشیہ ۶۹

۴۲۲؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ یوسفؑ ، حاشیہ ۶۸

۴۲۳؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ یوسفؑ ، حاشیہ ۶۸

۴۲۴؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ قصص ، حاشیہ ۵

۴۲۵؎ تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سورۂ سجدہ ، حاشیہ ۳۶

۴۲۶؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ اعراف ، حاشیہ ۸۶

۴۲۷؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ یونسؑ ، حاشیہ ۸۰

۴۲۸؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ یونسؑ ، حاشیہ ،

۴۲۹؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ اعراف ، حاشیہ ۹۳

۴۳۰؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ یونسؑ ، حاشیہ ۷۹

۴۳۱؎ تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ طٰہٰ ، حاشیہ ۵۳-۵۴

۴۳۲؎ تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ ، حاشیہ ۴۶ ، نقشہ بنی اسرائیل کی صحرا نوردی

۴۳۳؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ ابراہیم ، حاشیہ ۱۲

۴۳۴؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ اعراف ، حاشیہ ۹۸

۴۳۵؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل ، حاشیہ ۷

۴۳۶؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل ، حاشیہ ۷ ، نقشہ فلسطین حضرت موسیٰؑ کے بعد

۴۳۷؎ تفہیم القرآن ، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل ، حاشیہ ۷

۴۳۸ء تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۷

۴۳۹ء تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل حاشیہ ۸

۴۴۰ء تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۸

۴۴۱ء تفہیم القرآن، جلد دوم ، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۹

۴۴۲ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ آل عمران، حاشیہ ۱۳۲

۴۴۳ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۶۰

۴۴۴ء تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۹۰۔ جلد دوم، سورہ توبہ، آیت ۲۴، حاشیہ ۲۲

۴۴۵ء الجہاد فی الاسلام صفحہ ۳۸۰ تا ۳۸۲

۴۴۶ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ آل عمران، حاشیہ ۲

۴۴۷ء تفہیم القرآن، جلد پنجم ، دیباچہ سورۂ حشر

۴۴۸ء تفہیم القرآن، جلد پنجم ، دیباچہ سورۂ حشر

۴۴۹ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، دیباچہ سورۂ بقرہ

۴۵۰ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ آلِ عمران، حاشیہ ۴۶

۴۵۱ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء، حاشیہ ۸۰

۴۵۲ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ، حاشیہ ۷۰

۴۵۳ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ انعام، حاشیہ ۱۲۲

۴۵۴ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۹۵

۴۵۵ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۵۸

۴۵۶ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ، حاشیہ ۳۶

۴۵۷ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ، ضمیمہ بسلسلۂ حاشیہ ۳۶

۴۵۸ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۳۵

۴۵۹ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ ، حاشیہ ۳۹

۴۶۰ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء ، حاشیہ ۲۱۲

۴۶۱ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء ، حاشیہ ۲۱۳

۴۶۲ء تفہیم القرآن، جلد اوّل ، سورۂ نساء ، حاشیہ ۲۱۵

۴۶۳ء تفہیم القرآن، جلد سوم ، سورۂ کہف ، حاشیہ ۲۰

۴۶۴ء تفہیم القرآن، جلد پنجم ، سورۂ صف ، حاشیہ ۸

۴۶۵ء تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ حدید ، حاشیہ ۴۵

۴۶۶ء الجہاد فی الاسلام ، صفحہ ۴۰ تا ۴۱۰

۴۶۷ء تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ صف ، حاشیہ ۸

۴۶۸ء تحریکِ آزادئ ہند اور مسلمان ، حصّہ دوم ، صفحہ ۱۹۱ تا ۱۹۹

۴۶۹ء تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ ، حاشیہ ۱۰۱

۴۷۰ء تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ تغابُن ، حاشیہ ۵

۴۷۱ء تفہیم القرآن ، جلد اوّل ، سورۂ مائدہ ، حاشیہ ۱۳

۴۷۲ء تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ صف ، حاشیہ ۷

۴۷۳ء تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، سورۂ صف ، حاشیہ ۸

۴۷۴ء تفہیم القرآن ، جلد ششم ، سورۂ برُوج ، حاشیہ ۴

۴۷۵ء تفہیم القرآن ، جلد ششم ، دیباچہ سورۂ فِیل

۴۷۶ء تفہیم القرآن ، جلد ششم ، دیباچہ سورۂ عَلَق

۴۷۷ء تفہیم القرآن ، جلد سوم ، سورۂ فُرقان ، حاشیہ ۱۲

۴۷۸ء تفہیم القرآن ، جلد سوم ، دیباچہ سورۂ مریم

۴۷۹ء تفہیم القرآن ، جلد سوم ، دیباچہ سورۂ مریم

۴۸۰؎ تفہیم القرآن، جلد سوم، دیباچہ سورۂ مریم

۴۸۱؎ رسائل و مسائل، حصّۂ اوّل، صفحہ ۲۹۰

۴۸۲؎ تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ تحریم، حاشیہ ۲

۴۸۳؎ تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۂ آلِ عمران، حاشیہ ۲۹

۴۸۴؎ سُود، ۲۷۸ تا ۲۸۲

۴۸۵؎ تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان، حصّۂ اوّل، صفحہ ۹۵

۴۸۶؎ سیرت کا پیغام، صفحہ ۳ تا ۳۶

ادارہ ترجمان القرآن لاہور